

ماہنامہ  
نہ ختم ہو ملت  
نہ ختم ہو ملت

# امیر شریعتہ نمبر

حصہ دوم



بیاد

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ

۱۹۶۱—۱۸۹۲ء

ممدیر

سید محمد کفیل بخاری



# ماہنامہ نقیبِ نبوت

۸۷۵۵ ایل

رجسٹرڈ نمبر

مولانا محمد عبد الحق مدظلہ  
حکیم محمود احمد ظفر مدظلہ  
ذوالکفل بخاری، قمر الحسنین  
شمس الاسلام باقرہ ابوسفیان نائب  
محمد عرفاروق، عبد اللطیف خالد  
خادم حسین، سید خالد مسعود

حضرت مولانا خواجہ خان محمد مدظلہ

سید عطاء المحسن بخاری

سید محمد کفیل بخاری

اندرون ملک: ۱۰۰ روپے بیرون ملک: ۱۰۰ روپے پاکستانی

دارِ نبی ہاشم، مہربان کالونی، ملتان۔ فون: ۵۱۱۹۶۱

تحریر و تصفیہ: نبوت (شعبہ تبلیغ) مجلس احرار اسلام پاکستان

ناشر: سید محمد کفیل بخاری، طابع: تشکیل احمد اختر، مطبع: تشکیل لاہور، مقام اشاعت: دارِ نبی ہاشم، ملتان

ولادت :

یکم ربیع الاول ۱۳۱۰ھ

۲۳ ستمبر ۱۸۹۲ء

جمعۃ المبارک - بوقتِ سحر



انتقال ،

۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء

بعد العصر بروز پیر



۱۷	سید کفیل بخاری	چہرہ
۱۹	ادارہ	تبرکات امیر شریعت
۲۴	ادارہ	اخباری بیانات
۲۸		
۲۹	شورش کاشمیری	جامع الصفات انسان
۳۴		
۳۵	شورش کاشمیری	سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد
۳۵	شورش کاشمیری	مولانا آزاد بنام شاہ جی (مکتیب)
۵۲	بنت امیر شریعت مدظلہا	توضیحات بسلسلہ امیر شریعت اور ابوالکلام آزاد
۵۵	سید عزیز حسن بٹانی	زندہ باد سمر البیان بخاری
۵۶		
۵۷	مولانا عزیز الرحمن لدھیانوی جامی	تحریک نمکین ستیہ گرہ
۵۹	ماسٹر تاج الدین انصاری	وہ دن کہاں گئے وہ زمانے کدھر گئے
۶۲	شیخ حسام الدین	قافلہ سالار
۶۵	حلاۃ عرشی امر تسری	برق و رعد آسودہ بستر شدہ
۶۶		
۶۷	ابن امیر شریعت سید عطاء الحسن بخاری	وہ عمر رفتہ کی چند گھڑیاں
۷۱	اداریہ ہفت روزہ چٹان لاہور	ایک ایسا مہمور.....
۷۳	تغزیتی شذرہ روزنامہ جنگ کراچی	ملک کی تاریخ انہیں کبھی نہیں بھلا سکتی
۷۴	مولانا عبدالرحمن میانوی	حرف عقیدت
۷۵	مولانا مجاہد الحسنی	دیوانے یاد آتے ہیں
۸۸		
۸۹	پروفیسر خالد شبیر احمد	آتا ہے بہت محرم اسرار و فایاد
۱۲۰		
۱۲۱	حافظ عبدالرشید ارشد	ترس گئے ہیں تری آواز دل کشا کے لئے
۱۳۰		

اشاعت خاص



سید محمد کفیل بخاری  
سید محمد ذوالکفل بخاری



## انتساب

۱۹۳۰ء ہے! اس سال برصغیر میں سول نافرمانی کی تحریک عروج پر تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس، مسلم نیشنلسٹ پارٹی، جمیعت طلبائے ہند، مجلس احرار اسلام، خدائی خدمت گار تحریک اور دیگر آزادی پسند جماعتیں، تحریک میں پیش پیش تھیں۔ "مظاہر" کانہو سوز یقین سے گیا اور ساراج دشمنی سے کھولایا جا رہا تھا۔ سرکاری عدالتوں کے بائیکاٹ، شراب و منشیات کی دکانوں پر پکٹنگ اور ولایتی مال اور ولایتی کپڑے کے بائیکاٹ کی مہم، ملک گیر مقبولیت حاصل کر رہی تھی۔ اس پہ مستزاد، "کامل آزادی" کا مطالبہ..... فرنگی کی نیندیں حرام کیے ہوئے تھے۔ مسلمان..... شامان رسول کی سرکاری سرپرستی پر سخت مضطرب اور مشتعل تھے اور "شاردا ایکٹ" کو مسلم پرست لاء کی قوانین اور مخالفت فی الدین قرار دے رہے تھے۔ صوبہ سرحد میں پشاور کا قہر خوانی بازار، بیک وقت پانچ سو سے زائد فرزند ان وطن کے خون ناحق سے لالہ زار ہو چکا تھا۔ عین ان دنوں، لاہور میں طلبائے ہندوستان کے تاریخی اجتماع میں وقت کے سب سے بڑے محدث..... علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ یہ تاریخی اعلان فرما رہے تھے کہ

"دین کی قدریں بگڑ رہی ہیں۔ کچر چاروں طرف سے یلغار کر چکا ہے۔ اس دعت مسلمانوں کو اپنے لیے ایک امیر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس کے لئے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو منتخب کرتا ہوں۔ وہ نیک بی بی ہیں اور بہادر بھی!"

خطیب الامت و قائد سالار حریت کو..... "امیرِ حریت" بنا دیا گیا تو حق بلا خیز کے قائدِ سنت جاں کی مشکلیں اور منزلیں کچھ اور بڑھ گئیں! مشکلیں اتنی کہ، آساں ہو گئیں۔ منزلیں اتنی کہ، ہدم کے عار گل گئے! امیرِ حریت..... پنجاب میں سول نافرمانی کا آغاز کر چکے تھے۔ حکومت ان کی گرفتاری کے لئے سرگوداں تھی۔ لیکن وہ امر و ہر، الد آباد اور آگرہ سے ہوتے ہوئے بمبئی چاہتے۔ بندر روڈ بمبئی پر لاکھوں کا مجمع گوش بر آواز تھا۔ امیرِ حریت نے خطبہ مسنونہ کے بعد تقررِ ضرور کی.....

"ظلمی سب سے بڑا گناہ ہے۔ اگر اس گناہ سے نکلا ہے تو اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ ہم انگریز کے خلاف پُر اس لڑائی میں شریک ہو جائیں"

ابھی یہ پہلا فقرہ ہی ادا کر پائے تھے کہ تیز دھار کا ایک خبر لہر اتان کی طرف آیا۔ کوہاٹ کا ایک انکسیر پٹھان نوجوان بچہ نور خان..... جلی کی سی تیزی سے آگے بڑھا اور خبر اپنے سینے پر روک لیا۔

ع..... سنبل اسے دل کے اظہار و فاکر نے کا وقت آیا!

خبر، زہر میں بجا ہوا تھا، اس لیے بچہ نور خان فوراً ہی دم توڑ گیا۔  
جان دی رلو محبت میں الہی مدد کر  
بات جو ہم نے سچی تھی، سونہا ہی مدد کر  
جرات و رسالت، طہیرت و محبت، شجاعت و شہادت اور لڑاؤ قربانی کے پیکر

## بچہ نور خان کے ناہم

اس کی عظمت کو سلام!

سلام اسکی محبت پر سلام اس کے قرینے پر  
کہ سینہ تان کر سمجھتا تھا خبر آئے سینے پر!

۱۳۱	حافظ عبدالرشید ارشد	شاہ جی کی زندہ تحریک
۱۳۷	حافظ لدھیانوی	دلوں کو چیر گئی اسکی شوخی گفتار
۱۶۶		
۱۶۷	محمد عمر فاروق	شاہ جی اور مولانا گل شیر شہید
۱۷۶		
۱۷۷	حفیظ رضا پسروری	شاہ جی کی باتیں خوبصورت یادیں
۱۸۶		
۱۸۶		
۱۸۷	حفیظ رضا پسروری	حضرت رائے پوری اور شاہ جی
۱۹۰		
۱۹۱	حکیم محمد احمد ظفر	باتیں شاہ جی کی
۱۹۸		
۱۹۹	قاری ظہور رحیم	شاہ جی ایک متحرک شخصیت
۲۲۰		
۲۲۱	منظور احمد بھٹی مرحوم	شاہ جی کی باتیں
۲۲۳		
۲۲۵	حکیم مختار احمد المبینی	شاہ جی اور تحریک آزاد کشمیر
۲۲۷	اقبال اسد	یزدال کی اک نشانی
۲۳۱	بیرسٹر کے ایل گابا	امیر شریعت کا مقدمہ عدالت
۲۳۹		
۲۴۱		
۲۴۲		
۲۴۳		
۲۴۵	ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ	بخاری کی یادیں
۲۴۶		
۲۴۷	ملک امجد حسین ایڈووکیٹ	مرد حق پرست

صفحہ	تاریخ	موضوع
۲۴۹	بہار کاشمیری	وہ ایک طرف از ..... نظم
۲۵۰	نسل سیدی	گری سے حرمت کی اک آتش کردہ تھالی نظم
۲۵۰	نیرت دھانی پوری	دو خیر محبت و خیرت نہیں رہا نظم
۲۵۱	سید بدر الدین مرحوم	پیشہ کی یادیں، بچپن کی باتیں
۲۵۸	شذرہ، ماہنامہ الصدق	عقیدت اور ارادت
۲۵۹	بنت امیر شریعت مدظلہا	کچھ پریشان تذکرے
۲۶۶	نور محمد (کاتب شاہ)	سیر کاہل نظم
۲۶۷	سید محمد وکیل شاہ بخاری	شاہ جی، ابراہیم لیکن اور پاکستان
۲۶۸	اشرف شاہی	از ایک طرف، ایک طرفت نسل پاک نظم
۲۶۹	سید ماجد علی شاہ	مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا
۲۷۱	سید عطاء الحسن بخاری	سید الاحرار کی قرآن فہمی
۲۷۳	پہلو شہزادہ محمود کاشمیری	سب سے پہلی میں روزے لڑاں نظم
۲۷۵	ابوطاہر قادری	باطل کا رنگ اس کے صفائی سے دور تھا نظم
۲۷۶	نور محمد انور (کاتب شاہ)	خیر، رحمت سے ہوا ظلم اور باگلی جہانم نظم
۲۷۷	سید عطاء الحسن بخاری	مجلس احرار اسلام اور مجلس شغف ختم نبوت
۲۷۹	سید سنان گیلانی	ایران کی صبا سے چہرہ درخشاں شدہ نظم
۲۸۰	ماہنامہ صوفیہ	آفت، آفتاب نہ دیکھیں ہو گیا سب آدمی نظم
۲۸۱	.....	شریعت نبوی کا تصور تھا جس سے نظم
۲۸۳	سید محمد کفیل بخاری	کیا حضرت امیر شریعت نے مجلس احرار اسلام کو ختم کر دیا تھا؟
۲۹۵	رشید کامل	نہلا گیا، غزل کا مستعار بہاراں نظم
۲۹۶	.....	نکاح سے دور گار بخاری بھی بنا ہے نظم
۲۹۷	سید محمد کفیل بخاری	شاہ جی اور مولانا محمد الیاس دہلوی
۲۹۹	سید محمد کفیل بخاری	احرار تبلیغ کا نفرنس قادیان
۳۰۰	.....	کوئی، ٹوکے گا تو یہ بوجہ جی باغی، کوئی نظم
۳۰۱	سید محمد کفیل بخاری	انگریز پہلی مرتبہ پکڑا گیا

صفحہ	تحریر	عنوان
۳۰۲	عزیز الرحمن بجنوری	ہو جسکی فقیری میں ہوتے آند الہی
۳۰۴	جانباز مرزا	کہاں ڈھونڈیں گے؟ (نظم)
۳۰۵	مولانا عبد المنان	ہمہ صفت موصوف
۳۰۶	جانباز مرزا	سرزمین مثنان سے (نظم)
۳۰۷	مولانا محمد عثمان فاروقی	بے لوث مجاہد
۳۰۹	قرنل حیا نوبی	جسکی گفتار میں تھا نغمہ پیکار حیات (نظم)
۳۱۰	عبد الغفور ریاض	وہ جسکی قوت کردار نے دنیا بدل ڈالی (نظم)
۳۱۱	مولانا عید اللہ انور	وہ زندہ جاوید رہے گا
۳۱۵	عبد الرحمن نادم	در خطابت بے نظیر و در عبادت بے ریا (نظم)
۳۱۶	محمد علی بنوی	ہمہ عرش عزیمت خویش بنداشت (نظم)
۳۱۷	قاضی محمد زاہد الحسنی	حضرت امیر شریعت کا نعرہ رستاخیز
۳۱۹	مولانا عنایت اللہ (پورے والا)	مقدس قافلے کی مانت
۳۲۱	مولانا عبد الغفار حسن	شاہ جی کی صدارت میں مولانا آزاد کی ایک یادگار تقریر
۳۲۲	غلام قادر خاتم	جذبات غم (نظم)
۳۲۳	مولانا سید احمد شاہ بخاری	امیر شریعت کی زندگی کے عملی پہلو
۳۲۵	نور احمد خان آفریدی	آفتاب خطابت
۳۲۹	مولانا عبد الکریم (کھلچہ)	شاہ جی کی پانچ باتیں
۳۳۳	مولانا سعید الرحمن علوی	شاہ جی کے علمی امتیازات
۳۳۷	مولانا مدرار اللہ مدرار	شاہ جی اور تحریک پاکستان
۳۴۰	سائیں محمد حیات پسروری	شاہ جی - سب دے پیارے (نظم)
۳۴۱	علامہ شمس الحق افغانی	عزم آہن گداز اور قلب گریہ بار کا حامل
۳۴۲	استاد دامن مرحوم	مکڑے جن جن ابدی تقریر والے (نظم)
۳۴۳	ایک تاریخی دستاویز	تحریک خلافت و ترک والات
۳۴۵	حضرت امیر شریعت کی ایک یادگار تقریر	(التماس)
۳۴۷	سیال شریعت کی یادگار تقریر	حضرت خواجہ ضیاء الدین سیالوی سجادہ نشین
۳۵۵	حضرت پیر حافظ عبد اللہ سیالوی	نظم

۳۵۸		
۳۵۹	غلام رسول مہر	وہ آدمی تھا مگر.....
۳۶۳	ڈاکٹر سید عبداللہ	شاہ جی اور فتنہ راجپال
۳۶۹	ڈاکٹر عبادت بریلوی	خطابت کا معجزہ
۳۷۰		
۳۷۱	جو گند رپال	مثالی خطیب
۳۷۲		
۳۷۲		
۳۷۳	سیف الدین سیف	حسین یادیں
۳۷۹		
۳۸۰		
۳۸۱	کوثر نیازی	امیر خیریت سید عطاء اللہ شاہ بخاری
۳۸۷	پروفیسر خالد بزی	اک مرد باکمال وہ بھی تھا
۳۹۳	منتہار مسعود	داستان اشتیاق
۳۹۷	پروفیسر سید محمد وکیل شاہ بخاری	شاہ جی کی منتہار مسعود سے ملاقات
۴۰۰		
۴۰۱	باسم میواتی	ثبت است برجیدہ عالم دوام
۴۱۳	الیاس رشیدی	شاہ جی کا سحر خطابت
۴۱۳		
۴۱۵	حکیم آزاد شیرازی	امیر خیریت کے ساتھ چڑھے
۴۱۷	ریاض رحمانی	حضرت امیر خیریت
۴۲۵	منظف مہدی ہاشمی	دیاردل کی رات میں چراغ سا جلا گیا
۴۲۸		
۴۲۹	رازہ پاکستانی	شاہ جی سے وابستہ یادیں
۴۳۱		
۴۳۲		



صفحہ	تحریر	عنوان
۴۳۲	شورش کاشمیری	آل بار تولوٹ آکر مصائب کا سماں ہے (نظم)
۴۳۳	سید نذیر احمد شاہ بخاری	شاہ جی سے ایک ملاقات
۴۳۵	شریف شوق امرتسری	مغل بخاری کے چند لمحات
۴۳۷	اعجاز چشتی	دیکھنا تقریر کی لذت
۴۴۱	گوہر ملیانی	کہاں سے آئیں گے ایسے خلوص کے بیکر
۴۴۳	لال دین انگر	مجاہد تحفظ ختم نبوت
۴۴۶	شورش کاشمیری	آج بھی روح بخاری یہ صد اوستی ہے (نظم)
۴۴۷	طالب مجازی	درویش صفت عالم
۴۴۹	زاہد عکاسی	قافلہ سالار خطابت
۴۵۱	شورش کاشمیری	سوز دردوں (نظم)
۴۵۲	آزاد شیرازی	امیر شریعت سے (نظم)
۴۵۳	مولانا عبد الکریم صابر	گا ہے گا ہے باز خواں ایں قصہ پارہ را
۴۵۵	حافظ صفوان محمد	شب سیاہ غلامی میں نور کی قندیل
۴۶۱	علامہ انور صابری	عصر نو کی ظلمتوں میں روشنی کی موت ہے (نظم)
۴۶۳	میاں محمد شفیع	تحفظ ختم نبوت کا داعی
۴۶۵	اشرف عطاء	آزادی کا داعی - ایک مجاہد عالم دین
۴۷۳	عبد اللہ ملک	آفتاب خطابت
۴۷۸	سرور میداتی	عزم تیرا کوہ کن، جرات تیری باطل شکن (نظم)
۴۷۹	حافظ سلیم تابانی	وہ مرد درویش
۴۸۳	غریزہ سندھو	شاہ جی دے ناں (نظم)
۴۸۴	پروفیسر نذیر احمد خواجہ	ظلم کے آگے ترا سر خم ہوا؟ ہرگز نہیں (نظم)
۴۸۵	مقبول انور داؤدی	حامل سنت نبوی
۴۸۶	مولانا محمد علی پاسلوی	اک ضرب کلیسا ز (نظم)
۴۸۷	حمید اصغر بنید	شاہ جی اور ان کا شش
۴۸۹	فانی مراد آبادی	وہ ایک مومن، جو لطف احمد کی برکتوں سے قربان تھا (نظم)
۴۹۰	پروفیسر خالد بڑی	جاں نثار سید الاحرار وہ درویش تھا (نظم)

صفحہ	تحریر	عنوان
۴۹۱	شاہ محمد عثمانی	سپاہی بھی سپہ سالار بھی
۴۹۳	عمر فاروقی	یاد میں باتیں شاہ جی کی
۴۹۴	جعفر بلوچ	عندلیب نغمہ پیرا (نظم)
۴۹۵	علیم نامری	سید والا خشم (نظم)
۴۹۷	نذیر حق	شاہ جی! کچھ یادیں کچھ باتیں
۵۰۰	جعفر بلوچ	توحید اور رسالت کا انسک سناد (نظم)
۵۰۱	اختر کاشمیری	عندلیبوں کا سوز اور شیروں کی گرج
۵۰۲	ریاض رحمان	اب تک دل و جاں اسی کی محبت سے ہیں سرشار (نظم)
۵۰۳	علامہ لطیف انور	بول بالا رہے بخاری کا (نظم)
۵۰۶	ندیم انبالوی	اگر دعاؤں سے کام چل سکتا تو.....
۵۰۹	اقبال راہی	پیشانی: فکار کا جھومر (نظم)
۵۱۰	پروفیسر ڈاکٹر حسین فراقی	وہ شمس جو نہ دیکھ دیں کی بہار نہ (نظم)
۵۱۱	سید محمد ذوالکفل بخاری	جبر کی سائنس سے صبر کی سائنس تک
۵۱۷	محمد عمر فاروق	جناب الطاف گوہر کی خدمت میں
۵۲۴	اداریہ روزنامہ جنگ لاہور	عجب آزاد مرد تھا
۵۲۵	سید محمد ازہر شاہ قیصر	اور شاہ جی نے غزل سنائی
۵۲۶	ظہیر الدین نقش بندی	ساجد حسن و جاں اور صاحب فضل و کمال (نظم)
۵۲۹	توزیتی شذری	بزم صحافت ماتم ماتم
۵۳۵	ناصر کرمی	ایک شعاعِ دوست بے تاب و برہم ہو گیا (نظم)
۵۳۷	عاصی کرنالی	امیر شریعت قلندر فقیر
۵۳۹	سرور میواتی	نطق کا سیل رواں (نظم)
۵۵۰	عبد الستار نجم	سرخ طوطی تھا جس کا نشین (نظم)
۵۵۱	سید کفیل بخاری	تمہارے ہر سوال کا جواب قرآن میں موجود ہے
۵۵۲	حافظ رشاد محمد دیوبندی	ندو ہائے محمد کا شکاری دیکھتے جاؤ (نظم)
۵۵۳	منظور سعید حمد	سن تک ہے مک دماغوں میں (نظم)
۵۵۴	نعیم آسی	”ڈیما گاگ؟“

صفحہ	تحریر	عنوان
۵۵۵	سید عطاء الحسن بخاری	وہ ایک تنقص (نظم)
۵۵۶	خطوط ابصرے	امیر شریعت نمبر (جلد اول) آراء و افکار کی روشنی میں
۵۶۱	ادارہ	امیر شریعت کا خطبہ مسنونہ
۵۶۵	ادارہ	سلاسلِ طریقت



شاہ جی کو ہم سے رخصت ہوئے چونتیس برس ہونے کو ہیں۔ ہمیں تسلیم ہے کہ ان چونتیس برسوں میں ہم، اُن کے کارہائے نمایاں اور خدمات کا احاطہ نہیں کر سکے۔ بلکہ ان کی گرد پا کو بھی نہیں پہنچ سکے۔ ان کا وجود حقیقتہً قدرت کا عطیہ تھا۔ اللہ جل شانہ نے تنہا ان کے وجود سے وہ کام لیا جو ایک جماعت اور ایک ادارے کا کام تھا۔

ع..... وہ آدمی نہیں یزداں کی اک نشانی تھا۔  
انہوں نے جب اپنی اجتماعی زندگی کا آغاز کیا تو انگریز سامراج کو لٹکا رہے ہوئے کہا تھا۔  
"آپ میرا ملک چھوڑ جائیے، آپ غاصب حکمران ہیں۔"  
تب اس کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا اور اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔  
ٹھیک تیس برس بعد انگریز خود کمرہ رہا تھا۔

"میں آپ کا ملک چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"  
اس کے اقتدار کا سورج غروب ہو چکا تھا، غلامی کی زنجیریں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکی تھیں اور آزادی کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔

اگر غور کریں تو یہ تیس برس پلک بھینکنے میں نہیں گزر گئے۔  
ع..... اک آگ کا دریا تھا اور ڈوب کے جانا تھا۔

شاہ جی اور ان کے رفقاء نے مجلس احرار اسلام کی بنیاد رکھی اور اک نئے انداز میں آزادی کے سفر کا آغاز کیا۔ جیل کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے قبول کیں، طوق و سلاسل کو جوا اور ان سے آشنائی پیدا کی۔ قید کی طویل رات کے سناٹوں میں مضر بپا کیا۔ انگریز کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور غلامی کے سکوت و جمود کو اپنی نگار، نگار اور نقضوں سے توڑ کر خاموش فضاؤں میں ارتعاش پیدا کیا۔ سینکڑوں احرار وفادار اس راہ میں جان ہار گئے..... مگر ہارناٹے سے انکاری رہے۔

آج شاہ جی ہم میں موجود نہیں۔ مگر ان کے زریں کارنامے، ان کی اُجلی سیرت کے نقوش، ان کا عقیدہ و فکر اور ان کی جماعت مجلس احرار اسلام ہم میں موجود ہے۔ فکر و عمل کا یہ تسلسل اور توارث، ایک نعمت بھی ہے اور امانت بھی!

شاہ جی کی شخصیت و کردار، سوانح و خدمات اور آثار و افکار کے حوالہ سے جتنا بھی تحریری کام کیا گیا، اس میں اکثر و بیشتر ایک ادھورے پی، ایک تنگی، ایک کمی اور ایک خلا کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے کہ محض تاثر، محض تبصرے، محض تذکرے اور محض "نفسیاتی مطالعے" سے کچھ خاکے اور کچھ عکس تو ضرور برآمد ہو سکتے ہیں لیکن ایک مکمل شخصیت اپنے پورے گرد و پیش اور مقام و مرتبہ کے ساتھ، بہر حال سامنے نہیں آسکتی۔ اور وہ ہنوز سامنے آ ہی نہیں سکی۔ اس کے اسباب و محرکات اور علل و عوامل سے بحث کی جائے تو بات طویل بھی ہو سکتی ہے اور مختصر بھی!..... مختصر یہ کہ شاہ جی کی لسانی اور ادبی جذبات، شاہ جی کے تاریخی شعور، شاہ جی کی سیاسی بصیرت، شاہ جی کی دینی جدوجہد

اور سب سے بڑھ کر شاہ جی کی خطابت کے حوالہ سے جو کام کیا جانا چاہیے تھا، وہ ہنوز نہیں ہو سکا۔

شاہ جی عمر بھر کون کون سے سماجی، ثقافتی، طبقاتی، گروہی، تفرقاتی، تہذیبی، سیاسی، تعلیمی، نظریاتی، عوامی، قومی اور اجتماعی رجحانات اور رویوں کی بیخ کنی اور سرکونی کرتے رہے اور ان کے مقابلے میں کون کون سے احسن و اکمل رجحانات اور رویوں کے نقیب و داعی اور امین و پاسدار رہے، اس کا بیان کمہیں نہیں ملتا۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ اس کام میں بنیادی شرط ”دیانت“ ہے اور تاریخ کے ترازو، تجزیے کی خوردبین اور جائزے کی دور بین کی حیثیت بہر حال ثانوی ہے۔

”نقیب ختم نبوت“ کا یہ خصوصی سلسلہ اشاعت، ایسی ہی کتابوں کے ازالے اور ایسی ہی ضرورتوں کی تکمیل کی جانب ایک بروقت پیش رفت ہے۔ اور سراسر خلوص و دیانت پر مبنی کاوش! جنوری ۱۹۹۲ء میں ہم آپ کی خدمت میں نقیب ختم نبوت کا امیر شریعت نمبر پیش کر چکے ہیں۔ الحمد للہ ہماری اس کاوش و محنت کو سبیدہ و مخلص حلقوں میں پزیرائی ملی اور ہم ان کی دعاؤں کے مستحق ٹھہرے۔

آج ۱۹۹۵ء ہے اور امیر شریعت نمبر حصہ دوم منصفہ شود پر جلوہ لگن ہو رہا ہے۔ میرے عزیز بھائی سید محمد ذوالکفل بخاری اس اشاعت خاص کی ترتیب و تہذیب میں اگر میری معاونت نہ کرتے تو شاید یہ گلدستہ، میں آپ کی خدمت میں اس طرح سجا کر پیش نہ کر سکتا۔ عزیز بی احمد معاویہ نے حروف خوانی کر کے میرا ابوجہلکا کیا۔ براہرم محمد عمر فاروق اور عبداللطیف خالد چیمہ کے مخلصانہ مشوروں نے حوصلہ بڑھایا۔ عزیزیم ابویسوں نے لہسنی نگرانی میں طباعت کے مراحل طے کرائے۔ اللہ جل شانہ ان سب رفقاء فکر کو جزاء خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

اس نمبر میں شامل بیشتر مواد، پروفیسر خالد شبیر احمد کی کتاب ”شاہ جی“، جانیاز مرزا مرحوم کے ماہنامہ ”تبصرہ“، شورش کاشمیری مرحوم کے ہفت روزہ ”چٹان“، روزنامہ ”مشرق“ لاہور اور روزنامہ ”امروز“ لاہور کی خصوصی اشاعتوں سے افادہ کیا گیا ہے۔ شاہ جی کی شخصیت، خدمات اور افکار کے حوالے سے ملک کے موثر رسائل و جرائد میں بے پناہ مواد موجود ہے۔ جن احباب کے پاس شاہ جی اور احرار سے متعلقہ مواد کا مجموعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے وہ ادارہ سے تعاون کریں اور یہ تاریخی لمانت نئی نسل کو منتقل کرنے کا موقع فراہم کریں۔ ہمیں مطلع کریں تو ہم ممنون ہوں گے اور خود حاضر ہو کر استفادہ کریں گے۔

ان شاء اللہ بشرط زندگی، یہ سلسلہ جاری رہے گا اور ہم اپنے وعدہ کے مطابق شاہ جی کی خدمات و سوانح پر پانچ جلدیں مکمل کریں گے۔ قارئین ہمارا حوصلہ بڑھائیں اور ہمارے لئے دعا کریں، اللہ تعالیٰ ہمیں سرخرو کرے

(آمین)

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سر اپا احرار

د. ر. نبی ہاشم ملتان

۹ ذوالقعدہ ۱۴۱۵ھ

۱۰ اپریل ۱۹۹۵ء

## دل کی بات

زندگی کی بہار یہ ہے کہ زندگی میں کوئی کام ہو جائے، کوئی معرکہ سر کر لیا جائے یا کوئی معرکہ بپا کیا جائے۔ وہ اعمال جن کی اساس حسن نیت پر ہو وہی حاصل زندگی ہیں۔ وگرنہ.....  
"ساری گھڑیاں، سارے لمحے، ایک جیسے ہیں۔"

والد ماجد حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی یادیں تازہ کرنا اور ان کو محفوظ کرنا ایسا کام ہے جو دل و جان کو تازگی، بہشتا، حیات مستعار کی کٹھنائیوں کو سہل بنانا اور زندگی کو دوام عطاء کرتا ہے۔

ہر چند یہ کام ان لوگوں کا تھا جو سفر و حضر میں ان کے رفیق تھے، جو ان کی رفاقت پہ ناز کرتے تھے، جنہوں نے وفا کے دیپ جلائے، جنہوں نے قربانی و ایثار کے نقوش جریدہ عالم پہ ثبت کئے، جو قلم کے دھنی تھے، جو شعر و ادب، تاریخ و سیرت، دینیات اور جدید سیاسی نظریات پر بہت اثاثہ دے گئے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اس کا حسن و بالکلین آج ۶۵ سال بعد بھی ماند نہیں ہوا۔ جو لکھا وہ سچ ہوا، جو کما وہ پتھر یہ نقش ہو گیا۔ مگر احرار کے یہ بزرگ لکھاری جو جو یہ کام نہ کر سکے۔

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ کی قربانی، ایثار، جدوجہد اور اخلاص ہی کا ثمر ہے کہ ہم اصاغر، یہ قوی و جماعتی فریضہ اداء کرنے کا اعزاز حاصل کر رہے ہیں۔

ماہنامہ نقیب ختم نبوت کو فرہے کہ اس نے اپنی سات سالہ مختصر صحافتی زندگی میں احرار کی بقا اور دینی اجتماعیت کے لئے زبردست کام کیا ہے، نقیب ختم نبوت کا ہی یہ طرہ امتیاز ہے کہ اس نے امیر شریعت نمبر کی ضخیم جلد اول کے بعد جلد دوم بھی پیش کی ہے۔ جو سیکڑوں دلوں کی بے تابی و ناخوشگوبائی کا درمان ہے، سکون قلب و نظر ہے، راحت جان ہے اور کتاب خانہ ملی میں ایک بے بہا اور انمول اضافہ ہے۔ ہم اپنی بے بضاعتی، بعض اہم لوگوں کی بے توجہی، ماضی مرحوم کے دفتینوں پر غاصبانہ قبضہ جمانے والے بنیوں کے رونوں کے باوجود یہ قومی ورثہ، ملی اثاثہ نئی نسل کو منتقل کرنے میں شاد کام و کامران ہو رہے ہیں۔ اگر روحانی و قلبی محبت و کیفیت کی کوئی حقیقت ہے تو ہماری روح میں حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ کی محبتوں کا جو پیکر جمیل چاند کی طرح چمکتا دکھتا ہے یہ اسی کی ضیا باریاں ہیں، یہ اسی کی کرنیں ہیں، یہ اسی ماہ و جدان کی روشنی ہے، جس نے قلب و روح کو مسور کر دیا ہے، افکار و اذہان کی بے آب و گیاہ وادی کو رشک چمن بنا دیا ہے۔

اس اشاعت خاص کی تکمیل حضرت امیر شریعت قدس سرہ کا روحانی و وجدانی فیض ہے۔ دعا ہے کہ یہ فیض جاری و ساری رہے اور اللہ سے ہمیں اسکی قدر کرنے کی توفیق ملتی رہے (آمین)  
گیر این ہمہ سرمایہ بہار ازمن!

۹۵  
سید عطاء الحسن بخاری  
دارِ نبی ہاشم، ملتان

قال النبي صلى الله عليه وآله وسلم

# وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ

حديث پاک : بخاری





## چہرہ

کشادہ پیشانی، بھرا ہوا روشن گول چہرہ..... قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا نقشِ ثانی۔ شریستی غلافی آنکھوں میں سرخ ڈورے، بھنویں، مکی، پلکیں لمبی، نظر عقابی..... جن سے غیرت و خودداری اور مؤمنانہ فراست کی کرنیں بھوٹ رہی ہوں۔ دراز قامت، دوہرا جسم، چوڑا سینہ اور مضبوط شانے۔ جرأت و شجاعت کے غماز سرخ گندمی رنگ، گھنے اور گنگریالے بال، مگر..... سنتِ نبوی کی مثال سفید داڑھی جیسے انوارِ صبح کا سماں، سیاہ زلفوں میں روشن چہرہ جیسے ظلمتِ شب میں ماہتاب۔

طبیعت میں جلال و جمال کا حسین امتزاج، پیکرِ جرأت و قناعت، دل کے غنی، فراخ دست، غمگسار، مہمان نواز، خوئے وفا، خوش مزاج و خوش مذاق، سخنِ فہم و سنجی طراز  
ع نگہ بلند، سخنِ دلنواز، جاں پر سوز

دوستوں کے دوست، دشمنوں کے شریف دشمن، چائے اور پان کے رسیا، حسن و شعر کے دلدادہ، بذلہ سنج، عرب کی جھلک، سادات کی آبرو، سر قند و بخار کی یادگار، سراپا احرار

ہو حلقہ یاراں تو برشم کی طرح نرم  
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

شیریں کلام، جادو گفتار، اثرِ جبریل، تملوت و ترتیل، قرأت میں حسن، لے مجازی، لہجہ گداز، آواز پاٹ دار، خرمنِ باطل پر برقِ شرربار۔

اسلام کا مبلغ، قرآن کا مناد، عالم دیں، نکتہ آفریں، صبا کی چال، سمندر کا خوش، پھولوں کی مہک، بجلی کی چمک، شیر کی گرج، فصیح و بلیغ، خطابت میں یکتاہتے، میں لوگ ایسے خال خال  
القصد ایک عمد صحابہ کی یادگار

تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو چھیاسٹھ کھربریں، صبح کہیں، شام کہیں، دن کہیں، رات کہیں، ہستی بستی، نگر نگر، وہ گھوم گئے دیوانہ وار

اکھتر برسوں میں اکٹالیس برس ریل اور جیل کی نذر کر دیئے۔ برصغیر کے کروڑوں انسانوں کو انگریز کے خلاف بغاوت پُر اکسایا، شعور، بنشا، علامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزادی کا صورت پھونکا، عمر بھر اسلام کے ناموس اور وطن کی آزادی کے لئے جہاد کیا۔ فرنگی اور اس کے خود کاشتہ پودے قادیانیوں کے ازلی دشمن، عقیدہ ختم نبوت کے سچے محافظ، منکرینِ ختم نبوت کے لئے برقِ عتاب، خود فروشوں کے لئے ہبستِ احرار، کچے مسلمان، کھرے

اک عالم کو گر گیا بیدار

قیام پاکستان کے وقت امرتسر سے ہجرت کی اور ملتان کے محلہ ٹنڈی شیر خان میں کرایہ کے کچے مکان میں گوشہ نشین ہو گئے  
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔  
پے پے حوادث نے بڑھا پے کی رخسار کو تیز تر کر دیا۔ بیماری نے حملہ کیا تو افلاس کی قوت سے اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ مگر۔۔۔۔۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی اداس شام یہ آفتابِ خطابت ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

ان اللہ وانا الیہ راجعون۔ برق و رعد آسودہ بستر شدہ  
شعلہ جوالہ خاکستر شدہ۔۔۔۔۔

فریاد دوست زندانی مصائب سنانے میں لذتِ موس کرتے ہیں اور میں عیب، یہ اپنا اپنا زاویہ نظر ہے۔  
میں ان مصیبتوں کو رسوا کرنے کا عادی نہیں۔ میرے لئے جیل خانہ صرف قتل مکانی ہے۔ اپنے گرو پیش باغ و بہار فراہم کر لیتا ہوں۔ اور قیدیوں گزر جاتی ہے جیسے صراوے سے بادل۔

اک شب جیل خانہ میں سورہ یوسف کی تلاوت کر رہا تھا۔ چودھویں رات کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا مجھے محسوس ہوا کہ وہ خوات کی تاثیر میں ڈوب کر ٹھہر گیا ہے۔ ایک گھنٹہ اسی تلاوت میں گزر گیا اتنے میں پنڈت رام لال جی سپرٹنڈنٹ جیل نے پیچھے سے پکارا۔ دیکھا تو وہ کھڑا ہے اور رخسار اس کے آنسوؤں سے تر ہیں۔ کھینے لگا، شاہ جی خدا کے لئے بس کرو۔ میرا دل قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ اب مجھ میں رونے کی سکت نہیں۔ اللہ اللہ یہ قرآن کی محبت کا اعجاز تھا۔ ایک دن گورنمنٹ آف انڈیا کا برطانوی نژاد ہوم منسٹر معائنہ کے لئے آ پہنچا۔ میں بیٹھا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ کھینے شاہ جی! آپ لپچے ہیں۔ میں نے کبھا خدا کا شکر ہے۔

دوبارہ پوچھا۔ کوئی سوال۔

میں صرف اللہ سے سوال کیا کرتا ہوں۔ یہ میرا جواب تھا۔ وہ فوراً بولا۔ نہیں میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟ جی ہاں! آپ ہمارے ملک سے نقل جائیں۔

# تبرکات امیر شریعت

لطف پر دھوکے نئے نمایاں کیسے جلوے مسکانا ہے  
 محبت آئینہ سوچا کی غصے وجودِ بزمِ جہان کے ہے  
 دکھا جو منہا بکشت ساقی رہی نہ عورتا ب ضبط باقی  
 ہر اک مہکشی لپکا دکھا بہانے ہے پہانے ہے

لائنوں میں سے گواہا چاروں طرف سے مہل  
 پور میں کھلا ہے پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے  
 شان و عظم آبادی

علی بن علی  
 علی

۱۰ اربریل ۶۶  
 مکان شہر

ہے یہ حسن کا پہنچا سیاں ناچ سس  
 ہر سہا قند کا گہرا ہٹا ناچ سس  
 غمزد احس کی کو تو لا ہٹا  
 عشاق رسوا سیاں ناچ سس

خمنہ / سر شمع      رات گزر بیگی  
 جانے بچھنے      حیات گزر بیگی

علمائے دیوبند کے نمائندے تھے۔ علامہ حافظ کفایت حسین صاحب صدر "ادارہ تحفظ حقوق شیعہ" پاکستان کے تقریباً ۱۰۰ فیصد شیعہ ملت کی نگرانی فرما رہے تھے۔ ان اکابر ملت کے علاوہ وہ تمام مسلم لیگی زعماء جن میں علامہ علاؤ الدین صدیقی صدر شعبہ دینیات پنجاب یونیورسٹی اور مسلم لیگ کے کونسلر اور عہدیدار اور پنجاب اسمبلی کے ارکان موجود تھے۔ مجھے تعجب ہے کہ "ڈان" کا نمائندہ خصوصی ان حضرات کے بعد کون سے ممتاز علماء کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اور بالآخر الفضل کے ایڈیٹر سے مل کر بیک وقت "ڈان" اور "الفضل" میں یہ رپورٹ شائع کی اسلامیان پاکستان توجہ فرمائیں کہ قائد اعظم کا یہ اخبار کس طرف رخ کر رہا ہے۔ جن علمائے کرام اور مشائخ عظام کی مساعی جمیلہ سے یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت منصفہ شہود پر آئی ہے۔-----

کیا یہ ان سب کی بے حرمتی، بے عزتی اور توہین نہیں ہے؟ کہ ان سب کو غیر معروف اور غیر ممتاز سمجھ کر اس کنونشن کو ناکام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے نام نہاد کہا گیا ہے۔ "ڈان" کو چاہیے کہ اپنی اس روش کو بد لے اور ان تمام بزرگوں سے فوری طور پر معافی مانگے ورنہ ان مرزائیت نوازیوں کے جو نتائج رونما ہوں گے ان کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ "ڈان" کی اشتعال انگیز نیوں کا احتساب کرے۔ مسئلہ ختم نبوت پر آل مسلم لیگ پارٹی کنونشن کی خبروں کو مسخ کر کے شائع کرنا مسلمانان عالم کے ایمانی جذبات سے استہزا ہے۔

روزنامہ "آزاد" لاہور

۲۰ جولائی ۱۹۵۲ء





## اخباری بیانات

### ① روزنامہ "ڈان" کی ایک خبر پر امیر شریعت کا تردیدی بیان

"آل مسلم پارٹیز کنونشن کے متعلق جو رپورٹ "ڈان" کراچی کی خبر ۱۳ جولائی میں شائع ہوئی اسے پڑھ کر مجھے انتہا درجہ کی حیرت ہے اور افسوس بھی دن دھاڑے کسی کی آنکھوں میں دھول ڈالنا دراصل اسی کو کہتے ہیں۔ لاہور ایسے مرکزی شہر میں دن کے اجالوں میں صبح نو بجے سے شام کے چھ بجے تک برکت علی محمد ہال میں اس کنونشن کے دو اجلاس منعقد ہوئے اس اجلاس میں مغربی پاکستان کے قابل احترام مشائخ عظام، ممتاز علماء کرام اور زعمائے ملت نے شرکت فرمائی۔

حضرت صاحبزادہ سید آل رسول صاحب سجادہ نشین امیر شریعت، حضرت صاحبزادہ غلام محمد الدین صاحب سجادہ نشین گولڑہ شریف جن کے متعلق مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ وہ یقیناً پہلی مرتبہ کسی جلسہ میں شریک ہوئے۔ وہ آل مسلم پارٹیز کنونشن کا اجلاس تھا۔ مغربی پاکستان کے مسلمانوں میں سے جن لوگوں کا ہاتھ دامن حضرات چشتیہ اہل بہشت سے وابستہ ہے۔ ان میں گولڑہ شریف اور سیال شریف اور تونسہ شریف ہیں۔ حضرت مولانا حافظ قر الدین صاحب سجادہ نشین سیال شریف، صاحبزادہ سید اصغر علی شاہ صاحب علی پوری، صاحبزادہ محمد جان صاحب عثمانی نقشبندی سجادہ نشین موسیٰ زئی شریف ضلع ڈیرہ اسماعیل خان اور سجادہ نشین جدوہ شریف کی موجودگی کئی کروڑ جنتی مسلمانوں کی نمائندگی تھی۔ ایک اور صرف ایک مولانا ابوالمنات مولانا محمد احمد صاحب قادری کی موجودگی اور صدارت ۸۰ فیصد علماء بریلی کی نمائندگی تھی۔ اور اہل حدیث حضرات میں سے حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب روپڑی اور حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی، حضرت مولانا اسماعیل صاحب گوجرانوالہ ۱۰۰ فیصد اہل حدیث کے نمائندہ تھے۔ علمائے دیوبند میں سے حضرت مفتی محمد حسن صاحب قبلہ صدر جمعیت علمائے اسلام پنجاب حضرت مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری ۱۰۰ فیصد

”شہدائے مِثْلان کے حضور“

(۲)

(حضرت امیر شریعت کا ایمان افروز بیان)

”ترجمہ:- کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ مضیٰ ایمان لانے سے ہی نجات حاصل کر لیں گے اور ان کی کوئی آزمائش نہ ہوگی۔ حالانکہ وہ تمام لوگ آزمائے جا چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ پس معلوم کرے گا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو حق و صداقت پر ہیں اور ان لوگوں کو جو کاذب و مفتری ہیں۔“ (القرآن)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں جب مسئلہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کر کے اسلام کے بنیادی عقیدہ کو گزند پہنچانے کی ناپاک کوشش کی تو حضرت صدیق اکبرؓ نے اس کاذب و مفتری سے کسی قسم کا مناظرہ کر کے دعویٰ نبوت کے جواز میں دلیل طلب نہیں کی۔ اگر کیا تو یہ کہ سات ہزار سے زائد حافظ قرآن صحابہ کرامؓ ناموس رسالت اور تاج و تخت ختم نبوت پر قربان کروائے اور اس طرح مسلمانوں کی متاع دین و ایمان کو ایک مکار اور عیار کی دست و برد سے بچالیا اور آئندہ کے لئے ملت اسلامیہ کو سبق دیا کہ جو شخص اس قسم کی ناپاک کوشش کرے اس کے متعلق اسلام اور ملت اسلامیہ کا فیصلہ کیا ہے۔ مِثْلان کے غیور اور صاحب ایمان مسلمانوں نے بھی اس دور پر آشوب میں جب کہ کفر و ارتداد کی سیاہ گھٹاؤں نے ایمان و ایقان کو پریشان کر رکھا ہے اسلام کی لاج رکھ لی ہے اور اپنے جگر گوشوں کو شمع رسالت ﷺ پر دیوانہ وار نثار کر کے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان آج بھی خاتم النبیین ﷺ کی عزت و ناموس کی خاطر گولیوں کی بارش میں مسکراتا ہے۔

رتبہ شہید ناز کا گر جان جانیے

قربان جانے والے کے قربان جانیے

اور اپنے ارشاد اور اخلاص سے جمہور مسلمین کے دینی اور ملی مطالبہ میں روح پھونک دی۔ خدا کی رحمتیں نچھاور ہوں تم پر شہیدان ناموس رسالت سلام ہو تم پر۔ اسے ختم المرسلین کی عزت و آبرو پر قربان ہونے والو۔ مبارک ہیں ان کے والدین، ان کے نذرانے سرکار رسالت ماب میں شرف قبولیت حاصل کر گئے۔

یوں تو اس دنیا میں ہزاروں بچے جنم لیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ہزاروں کلیاں

کھلتی ہیں اور بادِ سموم کے تھپڑوں کی تاب نہ لا کر مرجھا جاتی ہیں۔۔۔۔۔ مگر وہ موت جو حق اور راستی کی راہ میں آئے حیاتِ جاوداں بن کر آتی ہے  
جو موت آئے تو زندگی بن کے آئے  
قصا کی زالی ادا چاہیے!!

روزنامہ "آزاد" لاہور

۲۸ جولائی ۱۹۵۲ء

(۳)

۱۹۵۲ء کے سانحہ ملتان کے متعلق حضرت امیر شریعت کا بیان

اخبارات میں ملتان کے اندوہناک حادثہ کے متعلق جو سرکاری رپورٹ شائع ہوئی ہے اسے پڑھ کر ہمیں انتہائی صدمہ پہنچا اس وقت ہماری کیفیت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ راعیوں کے ہاتھوں سے رعایا کے چمے افراد شہید ہو جانا کوئی معمولی حادثہ نہیں۔

"انا لله وانا اليه راجعون"

ہمیں شہدا کے لواحقین سے دلی ہمدردی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صبر اور استقامت کی توفیق بخئے

"انما اشکر بشی و حزنی الی اللہ"

ترجمہ۔ اب سوائے اس کے نہیں کہ ہم اپنی فریادیں اور اپنا حزن و ملال خداوند کریم کے حضور پیش کر دیں۔

سانحہ ملتان کے متعلق جو سرکاری رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ وہ اتنی مبہم اور گول مول ہے کہ اسے پڑھ کر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے۔ اور سب سے بڑی دکھ کی بات یہ ہے کہ افسرانِ ملتان نے انتہائی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی ہے۔ کیا ہجوم گولیاں چلائے بغیر واپس نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یقیناً ملتان کے مخدوم حضرات معززین شہر علماء کرام اور ذمہ دارانِ مسلم لیگ کی وساطت سے بھی جلوس اور حادثہ کے درمیانی عرصہ میں اقام و تقسیم کے ذریعے حالات پر قابو پایا جاسکتا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہمیں اس پر بے حد افسوس ہے"

۲۴ جولائی ۱۹۵۲ء

(روزنامہ "آزاد" لاہور)

عطا اللہ خان عطاء ایڈووکیٹ مرحوم  
ڈیرہ اسماعیل خان

سید عطا اللہ شاہ بخاری  
(در حین حیاتش نوشتہ شد)

تو اے غواص دریائے معانی  
تو اے سر البیان الف ثانی  
بخاری، سیدی، قاری، خطیبی  
اویسی، فاضلی، جادو، بیانی  
ز ذکر دو دانت این قدر بس  
ز صلب سید آخر ربانی  
ہے ہشام سخن چوں لب کثافی  
شکر ریزی و گوہرے فثافی  
بر آری از دل خارا نصیرے  
ہے تریلے کہ تو تر آن خوانی  
نہ چوں باشد خلوت در کلاست  
ستائش گوئے شاہ انس و جانی  
امیر حزب احرار گرامی  
ہے عزم و حزم چوں کوہ گرامی  
کنی "لا" راہ استشنا مقید  
کہ رمز لا والا اللہ دانی  
توی عین مسلمان این قدر بس  
چہ گویم من فلائی یا فلائی  
تو خادم بودا قوم وطن را  
ہے طیب خاطر و باجانشانی  
ولے ملت نہ پرسیدت کہ چونی  
پریشاں طاری یا شادمانی  
چہ میری گنبدے بر تربت تو  
بے فرازند تو ہر گز ندانی  
عطاء کم دیدہ ام نظم و قصائد  
بدیں خوبی و معنی و روانی

## جامع الصفات انسان

سید عطاء اللہ شاہ بخاری بلاشبہ ایک جامع الصفات انسان تھے۔ قدرت نے انہیں دل و دماغ کی بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ انسان الفاظ کے استعمال میں عموماً فیاض ہوتا ہے۔ مدح ہو یا قدح۔ قلم و زبان اکثر بے روک ہو کر چلتے ہیں لیکن شاہ جی کا معاملہ یہ تھا کہ کمالات و محاسن کے جتنے الفاظ بھی فراہم ہو سکتے ہیں انہیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور دوسرے پلڑے میں شاہ جی کے حسن و خوبی کا سراپہ ہو تو یقیناً دوسرا پلڑا ہی جھکے گا۔ شاہ جی ایک خاص سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ یہ سانچہ اب ٹوٹ چکا ہے۔ اور اس عہد کے لوگ بھی رفتہ رفتہ اٹھتے چلے جاتے ہیں۔

اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ شخصیتیں ہی تہذیبی و معاشی حالات کے تقاضوں اور ضرورتوں کا مظہر ہوتی ہیں۔ ان کا وجود عوام سے کمپیں بلند ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ عوام کی پیروی کے لئے نہیں عوام کے رہنمائی کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ اور زمانہ سے ماورائی نہ ہو کر بھی اس سے مستثنیٰ ضرور ہوتے ہیں۔ شاہ جی فکر و نظر اور جہد و عمل کے ایک خاص عہد کی پیداوار تھے۔ اس عہد نے واقعہً ہماری قومی صفوں میں بڑے بڑے آدمی پیدا کئے۔ شاہ جی گویا اس مظل کا آخری چراغ تھے۔ ایک دو نشانیاں اور ہوں گی لیکن وہ بھی مہمانِ نفس یک دو نفس ہیں۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں!

یہ لوگ جس زمانے میں اپنے بلند آہنگ حوصلوں کے ساتھ سامنے آئے تھے جب تک ہمارے سامنے اس دور کی صحیح تصویر نہ ہو اس وقت تک ہم اس مٹی کے محاسن کا اندازہ ہی نہیں کر پاتے جس مٹی سے ان لوگوں کے ہیکر تیار ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ماضی اپنی خاص روایتوں کے ساتھ گور کنار سے اچکا تھا اور اس کے روبرو ایک نیا دور اپنی تمام شدتوں کے ساتھ نشو و نما پا رہا تھا۔ جہاں تہاں برطانوی سامراج کے خلاف خیالات برہمی تیزی سے کرٹھیں لے رہے تھے دماغوں میں بہمد وجود احتجاج موجود تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے نتائج نے اس احتجاج کا راستہ صاف کر دیا۔ پورے ملک کی خواہش آزادی رولٹ ایکٹ، جلیا نوالہ باغ اور تحریک خلافت کے داخلی و خارجی اثرات کے تحت ایک مرکز پر آگئی اس مرکز نے رہنمائی اور اس کے مظاہر کا ایک نیا قافلہ پیدا کیا شاہ جی اسی قافلے کے ممتاز حدی خوانوں میں سر فہرست تھے۔ اور حور کرنے سے یہ عجیب و غریب بات نکلتی ہے کہ جو لوگ اس قافلہ میں شمرک تھے وہ کسی تنہا خوبی ہی میں منفرد نہیں تھے۔ بلکہ ان کی ذات بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ احوال کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ زندگی کا ہر گوشہ تبدیلیوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ نہ صرف دنیا نے ایک نیا سانچہ قبول کر لیا بلکہ فکر و نظر کے سبھی دوائر ایک نیا روپ اختیار کر رہے تھے۔ شاہ جی معاً ان عقائد و صلحاء کے وارث تھے جنہوں نے اسلام کی اساس پر انگریزوں کی بیخ کنی کا عہد کیا تھا۔ اور دیوبند کا مدرسہ جن کے امتیازی معیارات کی علامت تھا۔ اس ذہن کی تعمیر میں بہت سے عوامل کا

ہاتھ کار فرما رہا۔ اب جو قومی احتیاج کی اجتماعی روح عدم تشدد کے طریق اور عدم تعاون کی تکنیک سے پر جم کٹا ہوئی تو عثمانی خلافت کا سکوت اور عرب ملکوں کے حصے بخرے اس ذہن کے لئے مہمیز ثابت ہوئے۔ اسلامیت اور وطنیت کے ملے جلے جذبات نے ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۱۹ء میں آزادی کا ایک ایسا ولولہ پیدا کیا کہ ذہنی طور پر انگریز مارے ملک کے دماغوں اور دلوں سے ٹکل گیا۔ رہا تو ان لوگوں کے دلوں میں جو انگریزی بساط کے مہروں کی حیثیت رکھتے اور اپنے گرد و پیش انسانوں کی ایک اقلیتی کھپ کے وفاداری بشرط استواری کے تحت سودا کرتے۔

انگریزی حکومت کے دبدبے نے ۱۸۵۷ء کے بعد اس برصغیر کو نہ صرف مفتوح کر لیا بلکہ مغلوب لوگوں کے ساتھ مرعوب دماغوں کا بازار بھی رونق پر تھا۔ مگر تحریک لاتعاون کے برگ و بار نے مسلمانوں کی عیان رہنمائی دفعۃً ان لوگوں کے حوالے کر دی جنہیں قدرت نے شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، اور فطرت اعرابی دے کر پیدا کیا تھا اور جن میں اکثر ماضی مرحوم کے خلوت خانہ قتل میں زندگیاں بسر کرنے کے عادی تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ اسی ماضی کا تعمیلی پیکر تھے۔ ان کا ہر وار ایک بانگے پیکیت کی طرح چوک رہا۔ وہ کسی نہ بچنے والی روح لے کر آئے تھے آج چونکہ دنیا بہت آگے ٹکل چکی ہے اور اس عہد کی اواشناس پود بھی قریب قریب ختم ہو چکی یا ہو رہی ہے پھر قلم و زبان کے نئے نئے رسم و اسفند یا پیدا ہو رہے ہیں۔ لہذا یہ سمجھنا یا سمجھنا ذرا مشکل ہے کہ ان لوگوں نے ملک و قوم کو کیا کچھ عطا کیا؟

صبح ضرور ہوتی ہے اور سورج بھی وقت پر نکلتا ہے۔ لیکن طلوع و غروب کا فاصلہ یونہی ملے نہیں ہوتا پہلے ستارے اجڑتے، رات کٹتی پھر پو پٹتی ہے۔ اس حقیقت کو جاننا اور پہچانا اشد ضروری ہے کہ قومی آزادی تاریخی اعتبار سے کبھی کسی فرد واحد کی تنہا فراست اور تنہا ہمت کا نتیجہ نہیں ہوتی اور نہ اس کا پودا آنا فانا بار آور ہوتا ہے۔ یہ حکایت ایک طویل عمل اور ایک طویل عہد سے مرتب ہوتی ہے یہ صبح ہے کہ قومی خواہشوں اور ملکی ولولوں کا مظہر بسا لوقات ایک ہی وجود ہوتا ہے اور عامۃ الناس کے قدم اُس کھد موں کے ساتھ اٹھنے لگتے ہیں۔ لیکن اصلاح و حریت و استقلال کا یہ قہر بے شمار لوگوں کی جگہ کاری، سر فروشی اور فراست و دانائی سے اٹھتا اور بنتا ہے۔

مثلاً بھوک ہے۔ اس کے کھانا پھر انسان روٹی کھاتا ہے۔ لیکن بھوک پہلے قہر سے نہیں مٹتی۔ بلکہ یکے بعد دیگرے بہت سے قہرے کھانا پڑتے ہیں۔ آخر میں ایک قہر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھوک نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ یہ آخری قہر ہی بھوک کا دوا نہیں ہوتا بلکہ پہلے قہر سے لے کر آخری قہر تک جتنے قہرے بھی پیٹ میں جاتے ہیں ان کی اجتماعی طاقت سے پیٹ بھرتا ہے۔ بھونڈی مثال آزادی کی ہے۔ کہ یہ عمارت سنگ و خشت کی نہیں ہوتی لیکن سنگ و خشت سے بنی ہوئی عمارتوں ہی کے اصول اس پر عائد ہوتے ہیں۔ بنیادیں کمود نے بنیادیں بھرے، دیواریں اٹھانے، اینٹیں لگانے، گارا بنانے اور رنگ و روغن کرنے کے بیسیوں مرحلے پیش آتے ہیں تب ایک عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

شاہ جی بیالیس سال قبل جس ہر اول دستے کے ساتھ ٹکے تھے وہ لازماً قومی آزادی اور قومی استقلال کی

جدوجہد کا مقدمہ ابیش تھا۔ ان کے سامنے صرف آخری مرحلہ ہی نہ تھا بلکہ وہ ابتدائی مرحلے میں تھے اور اس مرحلے کو پیدا کرنا بھی ان کے ذمہ تھا۔ انہوں نے، خبریوں میں بل جوتا انہیں ہموار کیا۔ پھر بیج بویا، کھیت سینچا، موافق موسم کی تجدیداشت کی، مخالفت موسم کے تاؤ سے، آخر فصل پکی۔ اب کیا ضروری تھا کہ بجائی کرنے والے ہی کٹائی کے وقت موجود ہوتے۔ قافلہ چلتا اور بڑھتا رہا حتیٰ کہ منزل سامنے آگئی اور ہم آزاد ہو گئے۔ اب نصف صدی پہلے مڑ کر دیکھیں تو ان، خبریوں کو سیراب کرنے کی مشکلات کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے!

غرض پاکستان اور ہندوستان کا کوئی گوشہ ہو گا جہاں شاہ جی کی آواز نہ گونجی ہو۔ ان کی آواز کا علم ہر کہیں لہرا رہا ہے۔ برصغیر کے ایک عظیم رہنما کا قول ہے کہ یہاں کا چپہ چپہ شاہ جی کے جہد آشتیوں کا شکر گزار ہے مگر مغربی پاکستان چونکہ ان کا مسکن اور ان کے بزرگوں کا مولد رہا اس لئے مرحوم دلی سے لے کر مرحوم پنجاب کے دور افتادہ علاقوں ہی کو انہوں نے اپنی نوابیوں کے لئے منتخب کیا اور یہیں اکثر و بیشتر انگریزی حکومت کے مختلف الاصل قتلوں کو مسمار کرتے رہے۔ پنجاب اور اس طرف کے علاقے ایک خاص عسکری ضرورت کے تحت برطانوی سامراج کا بازوئے شمشیر بن گئے۔ انگریزوں نے ان علاقوں میں مختلف مفادات کی پخت و پز کر کے یہاں کبھی سیاسی شعور اور قومی آزادی کے ولولوں کو بڑھنے یا پھینے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہم اس علاقے کی صحیح صحیح سیاسی معاشی اور معاشرتی صورت حال سے واقف نہ ہوں اس وقت تک ہم ان محرکات کو جاننے سے قاصر رہیں گے جن کا منطقی نتیجہ ہماری قومی آزادی کا وجود ہے۔ یا جس معنوی طاقت کی اساس پر یہ ساری عمارت کھڑی ہے۔

حالت یہ تھی کہ انہماکی ہندوستان میں مرحوم پنجاب ہی ایک ایسا صوبہ تھا جہاں انگریزی مفادات کی بوقلمونیاں مضبوط بنیادوں پر قائم تھیں اور انگریز کسی حالت میں بھی یہ گوارا نہ کرتا تھا کہ اس صوبے کے لوگوں میں حریت خواہی کا جذبہ پیدا ہو۔ اس مقصد کے لئے اس صوبہ پنجاب کے تین فرقوں یا قوموں (ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں) کو مفادات کے خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ہندوستان کا مسئلہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ تھا تو پنجاب میں یہ مسئلہ سکھوں کی موجودگی کے باعث سر رکھا تھا۔ اور تینوں کے معاشی و معاشرتی مفادات کچھ اس طرح بٹ گئے تھے کہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونا ہی ان کا سب سے بڑا کمال تھا۔ پھر چونکہ ہندوستان کی حکومت انگریزوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ اس لئے ان کا ذہن ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور بعد کے اثرات سے متسمتا نہ ہو چکا تھا۔ علماء کے خلاف جنگ اہلیہ (۱۸۶۳ء) کے بعد خان غزن خان کی قہمیری پر جو پانچ مقدمہ ہائے سازش انہاں (۱۸۶۳ء) پٹنہ (۱۸۶۵ء) راج محل (۱۸۷۰ء) مالوہ (۱۸۷۰ء) اور پٹنہ (۱۸۷۱ء) قائم کئے گئے۔ ان کے عمیق مطالعہ سے انگریز نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے معاملہ میں خوفزدہ ہو چکے تھے بلکہ وہ نہیں مختلف واسطوں سے زید کرنے کی فکر میں تھے۔

اس ضمن میں تاریخ کا یہ افسوسناک پہلو ہے کہ مرحوم پنجاب نہ صرف ان کا سب سے بڑا معاون ہو گیا بلکہ بہت سے راستے ان کے حق میں ہموار ہوتے چلے گئے۔ خود مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ ان کا سوا عظیم ان مسیٰ بھر مسلمانوں کے قبضہ قدرت میں تھا جو برطانوی اسپر یلزم کے شعوری یا غیر شعوری طور پر فرستادہ تھے حتیٰ کہ

برطانوی شاطروں نے خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مذہب کی ان بنیادوں کو اکھڑوانا چاہا اور اس میں برہی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ جن بنیادوں پر برطانوی ملوکیت کے خلاف جدوجہد کا قلعہ! استاد تھا۔ ایک بڑا ہی دردناک سانحہ ہے کہ علمائے حق کے خلاف۔ ہمیں سے فتنے جاری ہوئے۔ جہاد کی تہجیح کا الہام (مرزا غلام احمد قادیانی) بھی۔ ہمیں تصنیف کیا گیا۔ دنیا نے اسلام کے خلاف تعویذوں کا انہار بھی۔ ہمیں تیار ہوتا رہا اور خلافت عثمانیہ کی شکست پر اس صوبے ہی کے خاندان زادوں نے چراغاں کیا۔

اب غور کیجئے جو صوبہ برطانوی ملوکیت کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہو جہاں کے لوگ تین قومی دائروں میں مختلف و متضاد مفاد رکھتے ہوں اور مفاد ان کے لئے موت و حیات کا مسئلہ ہو حتیٰ کہ قومی بیداری یا علی الاستقلال کے راستے میں سب سے برہی روک خود مسلمانوں کی معاشی اور دینی گدیوں کا وجود ہو۔ اور پست ہمتی کے پہلو یہ پہلو دینی گمبھیاں ان کے خون میں سرایت کر چکی ہوں۔ اس فضا میں شاہ جی کا لعرہ جہاد بلاشبہ قدرت کے انعامات میں سے تھا اور ان کا وجود آیات من اللہ۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ محل نہیں لیکن اس تاریک دور میں مولانا ظفر علی خاں کا ”زمیندار“ و ”ستارہ صبح“ اور دو چار برس کے فاصلے سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت اور ایک خاص موڑ پر ان کے ہمنواؤں کی جماعت ایسی بے مثال طاقت اور گراں بہا سرمایہ، ہیں کہ تاریخ ان کے اعتراف کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔

ادھر یہ بات بڑے زور سے کھی گئی ہے کہ شاہ جی اردو کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ ان کے بیان میں جادو اور ان کی زبان میں سحر تھا۔ ان کے حرف حرف پر لوگ سر دھتے اور موتی چنتے تھے۔ ان کے خدا، رسول اور اسلام سے عشق کی حکایتیں بھی زبان زد عام ہیں اور لوگ مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ مگر ان کی خطابت نے جن بتوں کو توڑا اور ان کی فراست نے جن فوجوں کو پسپا کیا ان کا ذکر پس منظر میں چلا گیا ہے۔ حالانکہ دوسری اہم چیزیں پس منظر کی تھیں۔ ان کا سب سے بڑا کمال جی ہی تھا کہ انہوں نے ملک کے مجدد کو توڑا اور قوم کی سیاست میں مردانگی کا جوہر پیدا کیا۔ فی الجملہ ان کا وجود منعمات میں سے تھا۔ انہیں پورے ملک میں وہ لہجہ پھر گہر خوبوں کے باعث ایک عہد اور ایک ادارہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ قیادت و سیادت اور خطابت و سیاست کی ایک انجمن تھے۔ شاید ہی کوئی ایک شخص ان خصائص کے اعتبار سے ان کا ہمسر ہو۔ انہوں نے پچاس سال کا عرصہ صلہ و اجر کی ہر خفی و جلی خواہش کے بغیر بسر کیا اور یہ شرف صرف انہی کو حاصل رہا کہ:

۱۔ اس برصغیر میں ان کی آواز کا جادو سر کرتا رہا اور خلاف سامراج ذہن نے ان کے آتش کدے سے تشو و نما کی حرارت پائی۔

۲۔ مسلمان نوجوانوں میں برطانوی ملوکیت سے وابستہ رہنے کا جذبہ ایک عرصہ سے راہ پار تھا۔ انہوں نے اس جذبے کو ریخ و بن سے اکھاڑا۔ جن نوجوانوں نے ان کی آواز پر لہیک سمجھا وہ زیادہ تر درمیانے طبقے کے لوگ تھے جن بے عوامی تحریکوں میں لیڈر شپ پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ غریبوں کی ایک ایسی جماعت (مجلس احرار اسلام) تیار کی جو امراء کے استعمالات سے براہ و خستہ ہو



کر نہ صرف طبقاتی شعور کی راہ پر آگئی بلکہ بازار سیاست کے معرکہ ہائے خرید و فروخت سے بلند و بالا ہو کر کام کرتی چلی گئی۔

۴۔ مسلمانوں میں فعال سیاسی کارکنوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کیا جس کا عام حالات میں قسط تھا۔ اس کھسپ ہی سے اعلیٰ پایہ کے وہ مقرر پیدا ہوئے جنہوں نے انقلابی ذہن کی نقش آرائی میں قابل قدر حصہ لیا۔

۵۔ عوام کے دلوں میں نہ صرف استحصالی گروہ کے خوف کو دور کیا بلکہ ان کے جوہر خودی کو یہاں تک پروان چڑھایا کہ قربانی و ایثار کا تاریک راستہ روشن ہو گیا۔

۶۔ مسلمانوں میں جن سیاسی و دینی بدعات کو بالائزمام رائج کیا جا رہا تھا ان کا سانچہ توڑ ڈالا اور بعض معاشرتی خرابیوں کا سد باب کیا۔

۷۔ خطابت میں نئی نئی راہیں پیدا کیں قیادت کے کارہ لیس ذہن کو ختم کیا۔ سیاست کو امراء کی جیبی گھڑی یا ہاتھ کی چھڑی بننے سے روک دیا اور اس کا ایک عوامی مزاج بنا ڈالا۔ اگر تحقیق کی جائے تو یہ بات بھی ٹکھ کر سامنے آجائے گی کہ تشوہ نما کے اعتبار سے اردو کا دامن ان کی خوبی گفتار کا مست پذیر ہے۔

یہ حقائق اتنے واضح ہیں کہ نعت صدی کے سیاسی شب و روز کا دقائع نگار خود شاہ جی کے سونخ و افکار میں سے تاریخ کی بعض گمشدہ کڑیاں تلاش کر سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس فرض سے کون عمدہ بر آہوتا ہے۔

فرمایا: میں ان سووروں کا ریوڑ بھی چرانے کو تیار ہوں جو برٹش امپریلزم کی کھیتی کو ویران کرنا چاہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا۔ ایک فقیر ہوں۔ اپنے ناناکي سنت پر مٹنا چاہتا ہوں۔ اور اگر کچھ چاہتا ہوں تو صرف اس ملک سے انگریزوں کا انخلا۔ دوہی خواہشیں ہیں۔ میری زندگی میں یہ ملک آزاد ہو جائے۔ یا پھر تختہ دار پر لٹا دیا جاؤں۔ میں ان علماء حق کا پرچم لئے پھرتا ہوں۔ جو ۱۸۵۵ء میں فرنگیوں کی تیج بے نیام کا شکار ہوئے تھے۔ رب ذوالجلال کی قسم مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔

قریباً دنیا میں ایک چیز سے محبت کرتا ہوں اور وہ ہے قرآن! مجھے صرف ایک چیز سے نفرت ہے۔ اور وہ ہے انگریز! میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں نے میرے ان دو جذبوں میں بلا کی شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ محبت اور نفرت کے یہ دو زاویے ایسے ہیں کہ جن دماغوں میں ان کا سودا ہوا ان کے لئے پابہ زنجیر ہندوستان میں جیل خانہ زندگی کے سفر کا ایک ایسا موڑ ہے۔ جہاں کبھی طلب کے خیال سے رکنا پڑتا ہے کبھی فرض کی کشاکش لے آتی ہے اور کبھی جستوں نے منزل کا تھکاہٹا پہنچا دیتا ہے۔ یہ صبح ہے کہ اب جیل خانے کی آبرو پر ابوالہوسوں نے پیش دستی شروع کی ہوئی ہے۔

شورش کاشمیری

جرات تری احرار کا عنوانِ جلی ہے

قربانی و ایثار کی تفسیر بھاری  
ایمان کے گلزار کی ہے باد بھاری!  
یہ ایک حریفوں کے ہزاروں ہے بھاری  
واللہ زبان اس کی ہے شمشیر دودھاری  
گفتار کی گرمی سے خیالات بدل دے!  
چاہے تو غلامی کی روایات بدل دے  
اے قافلہ ملت بیٹنا کے عیاں گہر  
جذبوں میں پھلتی ہے ترے جرات شیر  
ہیں کوثر و کشمیر کی موجیں تری تھری  
لہجہ میں تڑپتی ہے ترے برز شمشیر  
روشن ہوئی یہ بات ترے حسنِ عمل سے  
ڈرتے نہیں توحید کے فرزندِ آہل سے  
فطرت تری دامنِ شجاعت میں پٹی ہے  
جرات تری احرار کا عنوانِ جلی ہے  
غیرت تری ایمان کے سانچے میں ڈھلی ہے  
لاریب کہ تو تختِ دل ابنِ علیؑ ہے  
نگراں تری عزت کا زمانے میں خدا ہے  
اولادِ شر معرکہ آرا ہے تو کیا ہے؟

## سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے درمیان محبت و خلوص اور ارادت کا ایک تعلق خاص تھا۔ اس حوالے سے کئی تذکروں میں مواد ملتا ہے۔ ذیل میں جناب آغا شورش کاشمیری مرحوم کی تین کتابوں "مولانا ابوالکلام آزاد"، "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" اور "بوئے گل نالہ دل" کے مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آغا صاحب مرحوم نے اپنی یادداشتوں میں اس موضوع پر قلم اٹھا کر بہت سے واقعات کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے، ان شاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں مختلف تذکروں، آپ بیتیوں اور سوانحی کتابوں سے مولانا اور شاہ جی کے حوالے سے موجود مواد کو یکجا کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ (مدیر)

شاہ جی ہندوستانی مسلمانوں کے ویرانہ آباد میں قدرت کا عطیہ تھے وہ خود ایک عہد، ایک تاریخ، ایک ادارہ، ایک تحریک اور جماعت تھے، ان سے بڑا عوامی خطیب نہ اردو زبان نے پیدا کیا اور نہ مستقبل قریب میں اس کے آثار ہی نظر آتے ہیں، ان کے کلام و بیان کی تاثیر و سحر کا یہ حال تھا کہ دلوں کی سنگینی موم کی طرح پگھلتی اور دماغوں کا انجماد رواں ہو جاتا۔ انہیں ہوا کے جھونکے اور سمندر کی موجیں بھی گونج برآواز ہو کر۔ سنتی تھیں، ان کا بیان تھا کہ وہ مسجد ہی کے حجرے میں اپنی زندگی گزار دینا چاہتے تھے اور اس بیج ہی سے ان کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی لیکن "الملال و زیندار" انہیں جدوجہد کے میدان میں لائے اور "ستارہ صبح" نے ان کے بگڑے میں آگ لگا دی۔ الملال کے بارے میں فرمایا۔

"الملال نے ان کی شریانوں میں لہو دوڑایا اور وہ محرک انسان کی طرح قرن اول کی طرف لوٹ گئے پھر وہاں سے بال و پر لے کر ہندوستان کے افق پر پرواز کی۔ الملال نے قرآن فہمی کے ذوق میں انہیں وسعت و تنوع دیا اور ان کی کایا کلب ہو گئی۔ ان کی خطابت کا اسلوب اور اس کے مختلف زاوے الملال کے مرہون ہیں۔ آزاد..... ان کے ذہنی مرشد تھے۔ ان سے بہت سی افلاقتوں میں فیضان حاصل کیا، ہر ملاقات علم و نظر کی ایک نئی دریافت ہوتی۔ آزاد جس موضوع پر بولتے، معلوم ہوتا انہیں کا خانہ زاد ہے، انہیں قرآن کی تفسیر میں منفر د پایا، ترجمے میں یکسا، حدیث میں یگانہ، فقہ میں بے مثال، ادب میں بحر ناپید اکثار، شاعری کا معدن اور نشر میں مہتمم و اسفندیار۔

گھنٹوں بولتے لیکن تکرار عتقا، فنون لطیفہ میں ان کا جوڑ نہ تھا۔ امام الہند فی موسیقی پر زبان کھولتا تو گلشنِ فی گفتار سے لالہ زار کھل جاتا۔ ”خبرِ خاطر“ کا آخری خط ان کے اسی ذوقِ عظیم کی نشان دہی کرتا ہے۔ ہندوستان کے وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے مختلف تصویروں پر ان کے تشریحی حاشیہ لاجواب ہیں، میں نے ایک تقریب میں مصوری سے متعلق ان کی ایک تقریر سنی ہے، ملکِ بحر کے نامور مصور جمع تھے اور وہ ان کی معلومات پر سر دھن رہے تھے۔ سنگ تراشی کے بارے میں ایک دن تاج محل کا ذکر کیا تو دنیا بھر میں گھماتے پھرے، سنگ تراشی و معماری کے ارتقاء، تہذیب کی تاریخ اس طرح بیان کی کہ مخصوص اصطلاحوں کے ساتھ خوبصورت الفاظ کی لہریں اچھل اچھل کر بہ رہی تھیں۔ ایک دن مختلف قوموں کے فوکہات و مشروبات کی طلسم ہو ضرر با بیان کی تو گفتگو کئی گھنٹوں تک پھیل گئی۔ ہم حیران تھے کہ جاپان اور میکسیکو کے فوکہات و مشروبات کی جزیات تک سے بھی آشنا ہیں۔ ایک دفعہ کبوتروں کا ذکر پھر گیا تو ان کی نسلوں اور خوبیوں کا مرقع سننا ڈالا، پھر جرند و پرند کی حادثوں پر روشنی ڈالی تو ایک تہائی دن اس کی نذر ہو گیا، کسی نے غالب کا ذکر چھیڑا تو سبحان اللہ گویا خود غالب ہیں، یا ان کے ساتھ عمر گزاری ہے، وہ ولی دکنی سے لے کر عصر حاضر کے ہر شاعر کو چلتے اور ان کے بعض چیدہ چیدہ اشعار بھی حفظ تھے، ادب کے ہر شعبہ میں ان کی نگاہ تھی۔ ایک دن رسمِ نال گا ماں پہلوان ملنے آگئے ہم لوگ وہیں تھے، اب جو پہلوانی کی تاریخ بیان کی تو ہم دمگ رہ گئے گویا رستم و اسفندیار کے ساتھ ڈنڈے پلٹے رہے ہیں۔ ہنٹ پر گفتگو کی تو پوری کتاب کچھ ڈالی۔ مولانا محمد علی الہ آباد میں سنگم پر کبھی رانی کے لئے چلے گئے واپس آئے تو ان سے یہی موضوع چھیڑ دیا، وہ گرتا کہ فن کی پوری تاریخ سامنے آگئی۔ تمباکو پر روشنی ڈالی تو کھماں سے کھماں نکل گئے۔ پان کا تذکرہ کیا تو پتے سے لے کر کتھے تک فوراً پھاری سے لے کر قوام تک، جانے کیا کچھ بیان کیا۔ ہم شدر تھے، الہ العالمین ابوالکلام ہیں کہ صیفہ کائنات۔

ایک دن مختلف ملکوں کی خواتین پر اس شائستگی سے اظہارِ خیال کیا کہ عباسی عہد کے ان داستان گو عبقریوں کی یاد تازہ ہو گئی جو اس موضوع میں عربی زبان کے بالکل کی رعایت سے یگانہ عصر تھے۔ مولانا کے طرزِ کلام کا عظیم پہلو یہ تھا کہ ان کی زبان پر کبھی مبتذل الفاظ نہ آتے، وہ ان الفاظ ہی سے نا آشنا تھے۔ فرماتے رنگِ لکھنؤ غریب الاخلاق قوموں کا سندھ اس ہوتے ہیں۔“

راقم وزارتِ قریب مشن کے زمانے میں شاہ جی کے ہمراہ دہلی میں تھا ایک دن وقت لے کر مولانا کے ہاں پہنچے تو اس جلے کا ذکر آگیا، جو گئی رات دہلی میں جامع مسجد کے سامنے ہوا تھا اور کوئی ڈیڑھ لاکھ آدمی شریک تھے، پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس جلے میں آئے تھے۔ اور کرپس نے بھی تھوڑی سی دیر جلے کے بے پناہ ہجوم پر نگاہ کی تھی۔



"شاہ صاحب، جب تک انہیں میری سیاست سے اختلاف ہے اس وقت تک میرا اسلام ان کے ہاں مشکوک ہے۔ اور اگر میں ان کی سیاست کا ہوجاؤں تو پھر اسلام سے میرا ہولو لعب بھی عین اسلام ہوگا۔ انہیں اسلام کی آڑ میں اپنی سیاست سے دلچسپی ہے۔" (۲)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک دفعہ مولانا کی نازک مزاجی پر تبصرہ کرتے ہوئے خوب فقرہ بکھا تھا کہ "آپ کے تلوے میں انسانی سر کا بال آجائے تو پاؤں میں موج آجائے گی۔ پھر ہفتوں لیٹے رہیں گے کہ سید ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ عزیز خلیہ تھا اور سب سے زیادہ پریشان بحیرہ سے ہوتے۔ وہ عادتاً طلاق فی طبیعت کے آدمی نہ تھے۔ ان کا موقف تھا۔

فرغتے و کتا بے و گوشہ چمنے۔ (۳)

وزارتی مشن کے زمانے میں شاہ جی دہلی میں تھے۔ ہم کوئی دو ماہ دہلی میں اکٹھے رہے تھے اور وہ زمانہ اپنی بوقلمونیوں کے باعث تاریخ کا ایک یادگار حصہ تھا۔ میں نے شاہ جی سے عرض کیا کہ میری بعض یادداشتیں ادھوری ہیں اگر اپنے خاندانی حالات پر روشنی ڈالیں تو یہ یادداشتیں مکمل ہو سکتی ہیں لیکن وہ طرح دے گئے۔

"بھائی میرے حالات لکھ کر کیا کرو گے۔"

"مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں ابوطالب کلیم کی زبانی اپنی ہی نہیں، ہماری بھی سرگزشت لکھ دی ہے۔

بدنامی حیات دو روزے نہ بود و بیش  
آں ہم کلیم یا تو چلوئم چاں گزشت  
یک روز صرف بستی دل شد بایں و آں  
روزے دگر بکند دل زین و آں گزشت"

تفصیل طلب کیجئے تو مسکرا دیں گے، آغا فہیدیم اور بس..... لیکن مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا روپ قطعی مختلف ہے۔ مولانا اپنے سے باہر جھانکتے نہیں اور شاہ جی نے اپنے کو دیکھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ مولانا کے لئے خلیہ صحبت عیش ہے اور شاہ جی کے لئے جاں کنی،

ما قصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

از مابجز حکایت مہرو وفا میرس

عمر بھر ایک ہی تصویر کھنچوائی ہے۔ دوچار تصویریں اور بھی ہیں لیکن سب چوری چھپے کی۔ جب ان سے یہ کہیں کہ فلاں فلاں بزرگ کی تصویر بن چکی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (جن سے شاہ جی کو خصوصی ارادت ہے) کی تصویریں عام ہیں تو وہ مسکرا دیں گے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں سیاست میں ان کا مقلد ہوں شریعت میں نہیں۔ میرے لئے ان کا کوئی فعل حجت نہیں، بابو! میرے میاں شیخ علیہ السلام نے منع فرمایا ہے ان کے قول کے بعد سب ہموال

پیچ ہیں" (۴)

اسی زمانہ میں ملک فیروز ذی نون نے دہلی میں کہا تھا کہ  
 ”پاکستان نہ بنا تو ہم چنگیز خان و ہلاکو خان بن جائیں گے“  
 شاہ جی نے وہیں ایک بڑے جلسے میں سنت نکتہ جیسی کی اور فرمایا  
 ”فیروز خان کو شاید اپنے نام کی مناسبت سے چنگیز خان اور ہلاکو خان کے مسلمان ہونے کا  
 گمان ہوا ہے“

اگلے روز شاہ جی مولانا سے ملے تو مولانا نے ایک موضوع اٹھا کر کئی موضوع پیدا کئے۔

دعا دے مجھے اے زمین سنی  
 کہ میں نے تجھے آسمان کر دیا  
 مولانا گفتگو کرتے تو الفاظ سلک مروارید ہوتے یار نگارنگ پھولوں کا سبدہ اور تمام اجزاء طبی لسنے کی طرح  
 ہوتے۔ (۵)

شاہ جی نے فرمایا ”مولانا مسلمانوں کے عہد گم گشتہ کی ذہانت و فراست کا مجسمہ اور دہلی و بغداد کے  
 علم و نظر کا مرقع ہیں۔ وہ آیتِ ربانی ہیں۔ فی الجملہ وہ مسلمانوں کے گمشدہ اقبال کی ترت پُرت  
 تصویر ہیں۔“ (۶)

لاہور میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ایک معتقد کارخانہ دار تھے۔ (حاجی دین محمد صاحب مرحوم) انہیں لوہے  
 کی ضرورت تھی اور لوہا ان دنوں مرکزی حکومت کے پرمٹ سے ملتا تھا۔ وہ شاہ جی کو اٹھا کر اور شاہ جی راقم کو  
 لیکر دہلی گئے۔ وہاں بن بلائے مولانا نے ملنے سے انکار کر دیا۔ شاہ جی کو اپنے تعلق خاطر پر اعتماد تھا۔ اصرار کیا۔  
 مولانا انکار کر چکے تھے۔ شاہ جی نہ ملے تو مولانا اندر سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ اُن کا چہرہ غصے سے  
 رہا تھا۔ شاہ جی کی بات سنی تو آگ بگولہ ہو گئے۔ فرمایا۔

”۱۹۳۷ء سے مسلمان صوبوں کی کانگریسی وزارتوں اور ہندو صوبوں کے مسلمان وزیروں کا  
 انچارج ہوں۔ ان کا محاسبہ ضرور کیا ہے لیکن ان سے سفارش کبھی نہیں کی۔ آپ نے میرے  
 بارے میں غلط اندازہ کیا ہے اور اس کے بعد جھٹ سے اندر لوٹ گئے۔“

شاہ جی کے ساتھ مولانا کا سلوک فی الواقع غلط تھا، مولانا اگر بے نیاز تھے تو شاہ جی بھی غیرت مند تھے۔  
 مولانا کے متعلق انہیں اپنے ذہنی اعتماد کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ بہر کیف مولانا آزاد اس قسم کی سفارشوں کے  
 معاملے میں آخری عمر تک بے لحاظ تھے۔ (۷)

کرپس مشن کی آمد کے دنوں میں شیخ حسام الدین شاہ جی کی ملاقات کے لئے مولانا سے وقت لے  
 آئے، اڑھائی بجے۔ پھر سے سارے چھ بجے شام تک کا اور یہ شاہ جی سے ہم سنی کے لئے کافی تھا لیکن شاہ جی  
 گھر ہی سے چالیس منٹ لیٹ چلے، گھنٹہ بھر تاخیر سے پہنچے، مولانا کو ٹھہری کے دروازے پر پریشان کھڑے تھے،

موثران کا بگڑا ہوا تھا، ہمیں دیکھتے ہی کہا:

"ہاں تو ذرا آپ کا موثر مجھے چھوڑ آئے اور آپ یہاں میری واپسی تک بیٹھیں۔"

شاہ جی نے آگے بڑھ کر کندھا جھکاتے ہوئے کہا۔

حضرت، شانے حاضر ہیں،

"ہاں میرے بھائی! وہ بوجھ تو آپ اٹھائے ہوئے ہیں۔ (مولانا نے مسکراتے ہوئے کہا)

تھوڑی سی دیر میں واپس آگئے۔

فرمایا:۔ وائرس لگ لگ گیا تھا کہ پس سے کہا ہے جو فیصلہ بھی کرنا ہے جلد کیجئے یہاں دہلی میں گرمی کا زور ہو گیا ہے، چنانچہ گفتگو شمد منسل ہو گئی ہے۔"

شاہ جی نے پوچھا، حضرت! "غبار خاطر" چھپ گئی ہے؟

فرمایا:۔ "ہاں میرے بھائی، لیکن جلد سازی مکمل نہیں ہوئی، کچھ کاپیاں ناشر نے بمبوائی میں، ان میں سے ایک جواہر لال کو بمبوا دی ہے۔"

عبداللہ کو آواز دی، غبار خاطر کی دو کاپیاں لے آؤ،

ایک کاپی شاہ جی کو دستخط کر کے دی، (اس پر مولانا نے لکھا برائے صدیق عزیز مسد عطاء انٹر شاہ بخاری۔ ابوالکلام) دوسری مجھے، اس پر لکھا:

"پیاں خاطر عزیز بنی عبدالکریم شورش۔"

یہ میرے لئے ایک بڑا افتخار تھا، شیخ حام الدین پریشان سے ہوئے، مولانا ٹاٹ گئے، ایک کاپی اور سنگوا کے ان کی نذر کی، ہمارے ساتھ نوا بڑا دہ نصر اللہ خاں بھی تھے، انہیں آٹو گراف دیا،

ہے آج جو سرگذشت اپنی

کل اس کی کہانیاں بنیں گی

اب جو ملک کے مختلف مسائل پر باتیں چھڑیں تو گلشنائی گفتار کا نقشہ کھنچ گیا، طبع رواں کا دریا موجیں

مار رہا تھا، فرمایا:

"ملک میں غیر ملکی استبداد کا رہنا ممکن نہیں رہا، حکومت کے لئے ایک ہی چارہ کار ہے کہ ہندوستان کی حکومت ملکی نمائندوں کو سپرد کر کے چلی جائے، اب اگر حکومت نے یہاں رہنے پر اصرار کیا تو اس کے نتائج خطرناک ہونگے اس کی حکمرانی کے دن پورے ہو چکے ہیں اور کوئی ساداس بھی اسے پناہ دینے کے لئے باقی نہیں رہا۔ ساری روک اب اس بات کی ہے کہ جائیں تو کس طرح اور اختیارات منسل کریں تو کیسے اور کیونکر؟

"لیگ سے کیسے نمٹا جائے گا،" شیخ صاحب نے پوچھا،

"لیگ سے معاملہ تو بھر حال طے ہونا ہے، رہنا تو یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کو ہے، پاکستان



بنالیں تو بھی ہندوستان کے ان مسلمانوں کا مسئلہ حل نہیں ہوتا جو یہاں رہیں گے اور جن کے لئے یہاں سے اٹھ کے جانا مشکل ہو گا نہ تو پاکستان جو بنے گا۔ اس کے لئے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو سمانا اور کھپانا ممکن ہے اور نہ عام لوگوں ہی کے بس میں ہے کہ پاکستان بنتے ہی ان کی آنکھ پاکستان میں کھلے گی، یہ کام جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ کھٹن ہے، کھننے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ جناح کا نگرس سے غایت درجہ بدظن ہیں، ہر چند میں نے چاہا ان سے معلوم کروں کہ مصالحت ممکن ہو تو کس نقطہ پر ہو سکتی ہے یا وہ کس مقام پر ٹھہر سکتے ہیں لیکن ان کے جواب سے آپ لوگ آگاہ ہیں، گاندھی نے کئی دفعہ کوشش کی، جواہر لال بھی ہو آئے، لیکن وہ پٹھے پر ہاتھ ہی دھرنے نہیں دیتے، ظاہر ہے ہندوستان تقسیم ہوا تو پاکستان بھی تقسیم ہو گا۔ جوش و غضب میں ہوش و خروکھاں رہتے ہیں، اب صورت حال یہ ہے کہ ہر فریق اس کوشش میں ہے کہ پانا کیا ہے؟ جہاں تک اختیارات کی منتقلی کا تعلق ہے، انگریز چاہیں بھی تو روک نہیں سکتے، وہ ہندوستان کو واقعی چھوڑ رہے ہیں، کانگریس چاہتی ہے یہ کام اس کی خواہش کے مطابق ہو، اور مصالحت اس سے ہو، لیگ چاہتی ہے کہ اس کا موقف پورا ہو اور بہر قیمت پورا ہو، اختیارات تو کانگریس اور لیگ ہی کو منتقل ہونگے لیکن مفاہمت کے فقدان اور اس سے پیدا شدہ آویزش نے انتقال اختیارات کی نوعیت اور اس کا تعین حکومت کے ہاتھ میں دے دیا ہے، ظاہر ہے فریقین راضی نہ ہوں تو فیصلہ تیسری جماعت کو دینا پڑتا ہے۔"

شاہ جی نے کہا..... اس کا مطلب ہے کہ لیگ سے صلح کی ہر کوشش ناکام ہو گئی ہے۔ مولانا نے

فرمایا

"فی الحال تو ناکام ہی ہو گئی ہے۔ آئندہ کامیابی کا امکان نہیں، بلکہ حالات اور خراب ہوتے چارے ہیں۔"

شاہ جی نے چاہا۔ مولانا کی طبیعت کا رخ ادبیات کی طرف پھیر دیا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ٹکے ہوئے ہیں اور ان کی طبیعت پر کوئی بوجھ ہے۔ البتہ وہ چیزیں جو گھنٹہ بھر کی اس صحبت میں معلوم ہوئیں یہ تھیں کہ:

(۱) صورت حالات سے خوش نہ تھے، ہندوستان کی آزادی کا نقشہ جو کبھی ان کے ذہن میں تھا اور حورارہا جا رہا تھا، آزادی آرہی تھی مگر اس طرح نہیں جس طرح وہ چاہ رہے تھے جو کچھ ان کا دل محسوس کرتا مکمل کے

نہیں سمجھتے تھے، انسانوں میں رہ کر بھی آخر تک انہیں اپنی تنہائی کا احساس اور اس پر اصرار رہا۔

(۲) اس ملاقات سے بہت پہلے ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو وزارتِ شن کا پلان ان کے ذہن میں تھا،

اور وہ چاہتے تھے مسلمان اس کو من و عن قبول کر لیں، اس سے بہتر نتائج پیدا ہونگے، مولانا کے الفاظ جو میری یادداشتوں میں درج ہیں، تقریباً یہ تھے کہ:

"جو حل میں نے تجویز کیا ہے اگر جانہیں نے اس کو مان لیا تو جس انتہا پر سیاسی پہچان ہے

یا جس سطح پر حالات کھول رہے ہیں اس حل سے وہ پہچان بھی ختم ہوگا اور حالات بھی معمول پر آجائیں گے۔ اس طرح غن و نعمین، شک و شبہ، اور تکرار و تصادم کا مطلع صاف ہو جائے گا۔"

"وزارتی مشن جو سکیم پیش کر رہا ہے آپ کی ہے؟ شیخ صاحب نے پوچھا،  
 "نہیں بھائی! سیاسیات میں کوئی خیال، تبویز، نقشہ یا موقف کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں ہوتا، یہ چیزیں باہمی سوچ، بچار اور گفت و شنید سے وضع ہوتی ہیں، میں نے ایک خاکہ تبویز کیا تھا، میرا خیال ہے وزارتی مشن نے اس پر صاف کیا ہے، اب اس کی تفصیلات اور جزئیات کا انحصار ان کے اپنے فکر اور اپنی دسترس پر ہے کہ وہ اس کو کس طرح آخری شکل دیتے ہیں۔  
 مولانا قدرت کا عطیتے لیکن

### مصنف درمیان زندیقان

پنڈت نہرو ان دنوں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مولانا حبیب الرحمن خبر لائے کہ وہ شاہ جی سے ملنا چاہتے تھے اور میں انہیں میر احمد حسن کی دکان پر کل پانچ بجے شام مدعو کر آیا ہوں۔ پنڈت جی وعدہ کے مطابق پہنچ گئے، شاہ جی سے معاف کیا ہم سے مصافحہ، میں تھا، شیخ صاحب تھے، ماسٹر تاج الدین انصاری تھے، مولانا حبیب الرحمن تھے اور میر احمد حسن، تعارف ہوا، پنڈت جی کوئی سہاگنٹہ ٹھہرے، کھل کے باتیں کیں، ہندی سنسکرت کا ایک لفظ بھی استعمال نہ کیا، سیاسی بات چیت میں انگریزی ضرور ٹپک پڑتی ہے، چال ہے کسی اصطلاح یا کسی خیال میں انگریزی کا لفظ آیا ہو، صاف ستھری بے عیب اردو بولتے رہے جیسے کوئی فیض لکھنوی ہو، خود الہ آباد کے تھے اور ظاہر ہے کہ ان کی اپنی زبان اردو تھی۔ جو کس فقرے، روزمرہ کا غازہ، محاورے کی سرخی، سلاست کا زور، دانائی کا عمق، انشاء کی زیبائی، بول چال کی صفائی، غرض اردو ان کی زبان پر قربانت شوم کی صدا دے رہی تھی..... پنڈت جی سیاسی، معاشی اور مجلسی بحثوں پر گفتگو کرتے رہے، انہیں شدید احساس تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا، اور ہر گفتگو کے بعد مزید الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

"تقسیم ناگزیر ہو چکی ہے تو مان لیں:" میں نے پنڈت جی سے کہا،

"بظاہر تو ناگزیر ہو چکی ہے لیکن ایک دوسرا حل بھی سامنے آگیا ہے، مولانا آزاد نے وزارتی مشن کو ایک خاکہ دیا ہے، شاید اس کے مطابق کوئی صورت نکل آئے، کہ پس نے تو مجھ سے یہی کہا کہ وزارتی پلان کے لئے مولانا کی تجاویز ایک عمدہ بنیاد ہیں۔"  
 "وہ خاکہ کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

پنڈت جی مسکرائے۔ "ہفتہ عشرہ میں سامنے آجائے گا، کوئی چیز بجا۔ نہ خود راز نہیں ہوتی، صرف وقت کی اڑچن ہوتی ہے کہ اب بیان کی جائے یا وقت پر لور جو چیز راز ہوتی ہے اس کا عوام سے تعلق نہیں ہوتا۔"

شیخ صاحب کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پنڈت جی نے کہا

"جناب کا ماننا اور ہمارا ماننا دونوں بیکار ہو چکے ہیں، اپنی سی سب کو ششیں کر لی ہیں۔"

ماؤنٹ بیٹن پلان کے بعد بھی پنڈت جی کا یہی خیال تھا کہ بٹوارہ نہیں ہوگا، کیونکہ تقسیم کا ماننا اور چیز ہے اور تقسیم کا ہونا دوسری چیز، لیکن ملک تقسیم ہو گیا، پنڈت جی نے اس روز ایک عجیب سا "انکشاف" کیا کہ سکندر حیات نے قرارداد پاکستان کے فوراً بعد انہیں ایک خط لکھا تھا کہ وہ تقسیم کے حامی نہیں ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا آپ نے تو قرارداد لاہور کی تائید کی ہے؟

جواب دیا کہ "اسٹیج کی بات اور ہوتی ہے۔"

شاہ جی نے کہا وہ خط کہاں ہے؟ پنڈت جی نے کہا الہ آباد میں کہیں پڑا ہوگا، آپ ذکر کرنا چاہیں تو میرا نام لے دیں، میں وہ خط آپ کو بھجوا دوں گا۔

پنجاب کا ذکر پھر کیا تو پنڈت جی جھنبلا گئے۔

"پنجاب نے ہمیشہ ہی رو کاوٹیں پیدا کی ہیں۔!"

میں نے کہا۔ "پنڈت جی آپ نے جو لیڈر صوبہ کے لئے منتخب کئے ہیں ان کی سزا عوام کو نہ دیں۔"

مسکراتے، "نہیں صاحب، یہ بات نہیں اول تو ہم نے لیڈر منتخب نہیں کئے، لیڈر تو عوام منتخب کرتے ہیں، ہم نے تو انہیں کام سونپا ہے، لیکن پنجاب کا مزاج ہی ایسا ہے کہ جب تک آپس میں چغلی نہ کھائیں یا ایک دوسرے کو گرائیں نہیں، ان کی طبیعت ہی آسودہ نہیں ہوتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ پنجاب کے بیشتر کام رکے رہتے ہیں اور پنجاب کا مسئلہ ہم سب کے لئے دردِ سر بن گیا ہے، کوئی سا گوشہ اطمینان کا نہیں رہا۔"

"یہ پنجاب ہی تھا جہاں راوی کے کنارے آپ کی صدارت میں کامل آزادی ریپبلیشن پاس ہوا اور

صدارت کا پہلا شرف آپ نے پنجاب ہی کو بخشا تھا۔" میں نے کہا۔

"یوں تو پنجاب سے میرا تعلق بہت گہرا ہے، میری والدہ پنجاب کی تھیں۔ لاہور چو نے منڈی میں ان کا مکان تھا لیکن پنجاب کا سیاسی مزاج ہمیشہ قابو سے باہر رہا ہے، وہاں سیاسیات سے زیادہ ذاتیات کے جھگڑے رہتے ہیں، ہم نے بہت چاہا کہ احرار کانگریس میں شامل ہو جائیں، صوبہ کانگریس کو دو سال کے لئے معطل کر کے احرار کے حسبِ منشاء ایک کمیٹی بنا دینا چاہی جو صوبائی کانگریس کے ہر کام کی انچارج ہوتی لیکن احرار ہی راضی نہ ہوئے۔"

پنڈت جی نے یہ بات کہہ کر شاہ جی کی طرف دیکھا شاہ جی طرح دے گئے،

پنڈت جی جانے لگے تو میں نے ان سے عجیب سا سوال کیا۔

"پنڈت جی، لوگ آپ سے محبت کیوں کرتے ہیں؟"

پنڈت جی مسکرائے..... بھئی یہ بھی کوئی سوال ہے؟

میں نے اصرار کیا تو شاہ جی نے کہا، "یہ لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور لوگ ان سے محبت کرتے ہیں۔" (۸) پنڈت جی رک گئے۔

"جی نہیں! وجہ یہ ہے کہ لوگ آوارہ گرد ہوتے ہیں اور میں بھی آوارہ گرد ہوں، لہذا دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

مسلم لیگ نے مولانا کے خلاف جو طوفان کھڑا کیا وہ گالی گشتار کی انتہا پر تھا۔ نیاز مند ہدرت اس پر برہم تھے۔ ترجمان احرار روزنامہ آزاد (لاہور) بھی جواباً طعن و طنز کی زبان استعمال کرنے لگا مولانا کو پتہ چلا تو راقم کو بلا بھیجا احتقر دہلی پہنچا، فرمایا

"زندگی نہ بھرک اٹھنے کا نام ہے نہ بھج جانے کا  
بلکہ سلگتے رہنا ہی زندگی کا نام ہے"

لیگ کی لپٹی زبان ہے اور وہ ہماری زبان نہ ہونی چاہیے۔  
سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو راقم کی موجودگی میں کہا:

"شاہ جی خطابت آپ کو عطیہ الہی ہے۔ اور جو چیز عطیہ الہی ہو اس میں درشتی نہ ہونی چاہیے۔ جو لوگ حریف بذلہ نہیں ان کے ذکر سے اجتناب ہی بہتر ہے۔ آپ ماشاء اللہ خطابت کے سمندروں سے موتی نکال لاتے ہیں۔ آپ کو ان چھوٹی موٹی نندیوں سے کیا نسبت؟ جو صرف سنگریزے اگتی اور ریت پھینکتی ہیں۔" (۹)

خلافت کی تحریک ۱۹۱۹ء میں شروع ہوئی لیکن ۱۹۳۰ء کا زمانہ لنگے برگ و بار کا زمانہ تھا۔ جس طرح بہار کے موسم میں پھول آگ آتے اور چمستان لالہ و گلاب سے لاپھند جاتے ہیں۔ اسی طرح اس زمانے میں سیاسی کارکنوں، سیاسی رہنماؤں اور سیاسی خطیبوں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی۔ سارا ملک ان سے متحرک ہو گیا۔ کوئی سی ہندوستانی قوم اس سے خالی نہ رہی۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، ہر جماعت میں شخصیتیں دھلنے لگیں۔ فی الجملہ یہی زمانہ اردو میں جاندار سیاسی خطابت کا عہد آغاز تھا۔ مولانا آزاد، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا احمد سعید دہلوی کے علاوہ خطیبوں کی ایک لہری ڈوری لگ گئی۔ احرار رہنماؤں کی پوری جماعت خطباء کی جماعت تھی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری آغاز میں صرف خطیب تھے۔ ان کی سیادت کا چراغ ان کی خطابت کے چراغ سے مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اردو زبان نے ان سے بڑا عوامی خطیب پیدا نہ کیا۔ ان میں ید اللہی یا نکلیں تھا کہ مجمع ہائے عوام کے خیر آن واحد میں سر کر لیتے تھے۔

مولانا آزاد میں محمد علی کے مبارزت، ظفر علی خان کی مقابست، عطاء اللہ شاہ کی شہادت اور احمد سعید دہلوی کی نزاکت کے عناصر نہ تھے۔ لیکن وہ ہر رعایت سے اتنے جامع الصفات خطیب تھے کہ خطابت ان کے بیان کا

ہاں تھی۔ اکثر خطباء و زعماء ان کے محاسنِ خطابت اور مجاہد نگارش سے فیضیاب ہونے کا اعتراف کرتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری قرنِ اول کے فقر و استغناء کی تصویر تھے۔ ہندوستانِ خطابت میں ان کا کافی نہیں رکھتا تھا۔ خود مولانا آزاد نے ان سے متعلق کہا تھا کہ:

"اس باب میں قومی جدوجہد کا ہر گوشہ ان کا شکر گزار ہے"

مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے تھے کہ:

شاہ جی کی باتیں عطاء اللہی ہوتی ہیں۔"

ان کا حال یہ تھا کہ گاندھی و نہرو سے بھی ایفو کے ساتھ ملتے لیکن مولانا آزاد سے اس طرح ملتے گویا ان کے جُود ہوتے اور ان کی بزرگی سے مرعوب ہیں۔ (۱۰)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے پاس مولانا کے کئی ایک خطوط تھے۔ شیخ حسام الدین کے پاس بھی چند مکتوب تھے۔ لیکن وہ تقسیم کے خرابہ میں ضائع ہو گئے۔ (۱۱)

مجلسِ احرارِ اسلام کے نوے فیصد زعماء مولانا آزاد اور الملل کی دعوت پر جنگِ آزادی میں شریک ہوئے۔ (۱۲)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری خطابت کے ہادشاہ تھے۔ جس طرح الملل کی صحافت میں قرآن کی آیتیں اور شاعری کے تیرو نشتر ہر پیرے یا فقرے کے موڑ پر ہوتے اسی طرح شاہ جی کی خطابت میں قرآن کا جلال اور شاعری کا جمال ہوتا۔ سامعین ان کے سر کا شمار ہوتے۔ شاہ جی الملل کے ذہنی شاگرد تھے۔ الملل کا جادو تھا کہ سارا ملک اسی کا ہو گیا۔ اس نے خطیبوں اور رہنماؤں کی ایک سیاسی جماعت پیدا کی جس نے استعمار دشمن ہندوستان طیار کیا۔ الملل کے اس فیضان سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مجلسِ احرارِ اسلام کے ذہنی پس منظر میں اسلام کے شغف کی حد تک الملل ہی کے دورِ اول کا ولولہ ہے۔ (۱۳)

علامہ انور شاہ کا شمیری سے متعلق مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی (رئیس الاحرار) نے بتایا کہ مولانا آزاد دیوبند میں حضرت قاسم نانوتوی اور حضرت شیخ الہند کی قبروں کے پاس ٹہل رہے تھے۔ علامہ انور شاہ نے دور سے دیکھا تو فرمایا:

"وہ دیکھو علم ٹہل رہا ہے۔"

فرمایا:

"ابوالکلام نے الملل کا صور پھونک کر ہم سب کو جگایا ہے۔"

احرارِ زعماء الملل و زمیندار کی پکار پر ملک کی سیاسی جدوجہد میں شامل ہوئے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۱۹۵۳ء میں تحریکِ تحفظ ختم نبوت کے ایک جلسے میں مولانا ظفر علی خان کے دونوں گالوں پر عقیدت کے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا:

"ظفر علی خان! تیرے ستارے صبح نے میرے جگر میں آگ لگادی تھی۔"

لیکن مولانا آزاد سے شاہ جی کی ارادت کا یہ حال تھا کہ اپنی سیاسی زندگی کو ان کی تصنیف سمجھتے۔ فرماتے:

"الہلال نے مجھے خطابت سکھائی، سیاست پڑھائی اور زبان و بیان کی ندرت بخشی ہے۔"

الہلال نہ ہوتا تو نہ جانے کب تک ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں غلہ رہتا۔

چودھری افضل حق، احرار کا شہ دماغ تھے۔ شاہ جی انہیں مجلس احرار کا مہاتما سمجھتے۔ چودھری صاحب مولانا آزاد کو ملک علم کا شہنشاہ اور تدبر کے اعتبار سے بے پناہ سمجھتے تھے۔ فرماتے:

"ابوالکلام نے مجھے اس راہ پر ڈالا اور شاہ جی نے تائیدار کی وردی اتروادی۔"

مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے مولانا آزاد کو ہمیشہ اپنا مرشد کہا، فرماتے:

"ابوالکلام میں مدلیق کا عشق، فاروق کا دبدبہ، عثمان کی حیاء، علی کا استغنا، ابوذر کا فقر اور

احمد بن حنبل کی استقامت رچی ہوئی ہے، وہ ان خصوصیات کا مجسمہ ہیں۔"

شیخ حسام الدین، احرار کا بازو تھے۔ مولانا سے ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ ان کے خلاف اختلافی بول تک نہ سنتے۔ کسی زبان پر ایسا کلمہ ہوتا تو اس سے الجھ پڑتے۔ فرماتے:

"ہم لوگ انسانی وجود میں ابوالکلام کی تحریریں ہیں۔" (۱۴)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مولانا آزاد سے متعلق موتی لال نہرو کے یہ الفاظ راقم سے بیان کئے کہ:

"مولانا کے عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی اور ہوا انہیں بلکہ علم، فکر، فہم اور تدبر ہیں۔" (۱۵)

ایک دفعہ راقم نے شاہ جی سے کہا:

"شاہ جی آپ نے زندگی میں کتنی دفعہ مولانا سے ملاقاتیں کی ہیں؟"

فرمایا:

"یاد تو نہیں لیکن بیسیوں دفعہ ان سے فیض حاصل کیا ہے ہم نشین رہا، ہم سفر رہا، (جیل میں لکھتے رہے) اور بارہا ملاقاتیں کی ہیں۔"

"ان ملاقاتوں کو خود لکھتے، نہیں تو کسی سے لکھوا دیجئے۔ اس طرح ایک عمدہ کتاب ہو جائیگی۔"

"بھائی میں قلم کا آدمی نہیں۔"

"میں حاضر ہوں آپ بولتے اور سناتے رہیئے میں لکھتا جاؤں گا۔"

"خامہ فرسائی بھی تو ایک روگ ہے، پھر یہ چیزیں سکون دل سے ہوتی ہیں۔ فرصت میں قلمبند کی جا سکتی یا کرائی جا سکتی ہیں۔ آج زمانہ وہ ہے کہ سکون و فرصت دو نوعتہ ہیں۔"

"اس طرح ان گفتگوؤں کے اکارت ہو جانے کا احتمال ہے۔ ایسا شخص جو آپ کے نزدیک اسلامی معاشرے کے اس قطب الرجال میں سب سے بڑا عبقری ہے اس کی گفتگوئیں قلمبند کرنا آئندہ نسلوں کی ایک امانت انہیں سونپنا ہے۔"

”ہاں بجائی ٹھیک ہے، لیکن مولانا کی زبان کہاں سے لاؤں ہم لوگ مولانا کے انکار کے سوانح ہیں۔  
شاہ جی ٹال گئے لیکن صبح وشام کی بچائی کے باعث مولانا کا ذکر چھڑا رہتا، کئی باتیں معلوم ہوتیں، مولانا کے  
عظیم فقرے شاہ جی کے نوکِ زبان تھے۔

شاہ جی نے فرمایا:

”احرار کی بنیاد مولانا ہی کے مشورے پر رکھی گئی۔ لیکن ہم لاہور میں وہ ٹکلتے ہیں، ہم جلوت کے وہ  
خلوت کے، انہیں ملنا سرخ گندھک ڈھونڈ لانے کے مصداق تھا، ہم ان سے دوستانہ بے تکلفی نہ  
رکھتے، ہمارے اور ان کے درمیان علم کا فاصلہ تو تھا ہی لیکن ان کا ادب و احترام بھی ایک طبعی  
فاصلہ تھا۔ ہمارے سامنے روزمرہ کے عوارض تھے۔ اور وہ ان کی طرف نگاہ ہی نہ کرتے تھے۔ تاہم یہ  
کہنا غلط نہ ہوگا کہ احرار الہلال کی بازگشت ہیں۔“

”مولانا مسلمانوں سے اس قدر مایوس کیوں ہیں؟“ راقم نے شاہ جی سے پوچھا۔

فرمایا:

”وہ تو نہیں لیکن مسلمان ان سے مایوس ہیں۔ مولانا نہ ان کی سطح پر اترتے ہیں اور نہ ان کے دماغوں

کی پستیوں سے ہملکام ہوتے ہیں۔ مسلمان شاعری کی پیدوار ہیں، وہ لیڈر شپ سے اپنی خواہشوں  
کا اتباع چاہتے اور خود لائحہ عمل تبویز کر کے اسے تختہ دار پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں  
برطانوی اقتدار کی مضبوطی کے بعد مسلمانوں کی لیڈر شپ سرکاری امراء کی تعویذ میں چلی گئی، اور  
وہ اجتماعی طور پر بڑے بڑے جاگیرداروں، زمینداروں، تعلقہ داروں اور تہداروں کی ملکیت ہو گئے،  
مسلمان زندہ ہوتے تو مولانا مایوس نہ ہوتے اور مولانا تعلقہ دار ہوتے تو مسلمان ان سے بد دل نہ  
ہوتے۔“

”مولانا کی عبقریت کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟“

”مولانا چونکہ مسلمان ہیں اس لئے ہر جہتی اعتراف مفقود ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ابوالکلام  
کانگریس کی سب سے بڑی خرافات کا نام ہے وہ کانگریس کو طوفانوں سے ٹکالتے اور مخالفین کے  
دلوں میں اتارتے ہیں۔“

شاہ جی نے سر دھڑ بھرتے ہوئے کہا۔

”مسلمانوں نے انہیں گر بلا میں کھڑا کیا ہے ان کے لئے مسلمانوں کی اکثریت خرافات کا کنارہ ہے،  
آج مسلمان صرف مسلمان ہوتے اور انہیں اپنی تاریخ کا علم ہوتا تو ان کی عقیدت کا مرجع ہوتے، یہ  
کوئی معمولی چیز ہے کہ جس ہندوستان کو انگریزوں نے مسلمانوں سے چھینا تھا اس ہندوستان کی  
آزادی کے لئے ابوالکلام انگریزوں سے گفتگو کر رہا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو کو اپنی

متاع سمجھتے ہیں اور مسلمان اردو پر سیاست پیچھے جاتے ہیں گو مجھے خدشہ ہے کہ مسلمانوں کی اس عصبیت کے باعث اردو نہ صرف ہندوستان میں زخم کھائے گی بلکہ ایک عظیم ابتلاء کا شکار ہوگی۔ لیکن مولانا دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے نمائندوں سے، کہ ان کی زبان ہی اس وقت دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے، اردو میں مذاکرات کرتے اور اردو میں، ہیکلام ہوتے ہیں۔ افسوس نہ بابائے اردو اس پر فر کر رہے اور نہ مسلمانوں کو اس سے خوشی ہوتی ہے۔ یہ ایک جذباتی بات ہی سی لیکن جذباتی قوم جب سیاسی طور پر ناپید ہوجائے تو وہ حسن پر قبح کو ترجیح دیتی اور زیاں پر سود کا گمان کرتی ہے۔ مسلمانوں کی سرگزشت انہی حادثوں سے آئی ہوئی ہے۔

شاہ جی نے کہا..... ابوالکلام:

۱۔ اس زمانے میں ملت اسلامیہ کے سب سے بڑے عبرتی ہیں اور فی الواقعہ ابوالکلام ہیں۔

۲۔ ان کا وجود قدرت کا عطیہ اور ان کا دماغ معجزہ الہی ہے۔

۳۔ وہ مسلمانوں کی اس لیڈر شپ کے میر قافلہ ہیں۔ جو تحریک خلافت کے زمانے میں ابھری اور قربانی و استقامت کی مظہر ہو گئی اور اب بھی مسلمانوں کی ناقدری کے باوجود ہندوستان میں سرگرم جد ہے۔

۴۔ وہ قرن اول کے حجاز کی آواز ہیں جو صدیوں کی مسافت کے بعد ہندوستان پہنچ کر خود مسلمانوں کے لئے اجنبی ہو گئی۔

۵۔ ان کے ذہنی کمالات صرف اس وجہ سے عوام میں نہیں آتے کہ مسلمان ہیں، مسلمان انہیں مانتے نہیں اور ہندوؤں کے لئے ایک مسلمان کی پوجا (ور شپ) کیونکر ممکن ہے؟

۶۔ وہ ہندوستان میں اسلام کی صدائے رستخیز تھے، لیکن برطانوی عہد میں مسلمانوں کو رزم کے حدی خوان کی نہیں بزم کے نغمہ خوان کی ضرورت رہی ہے اور وہ ہمیشہ گفتار کے غازی ہی کا اتباع کرتے ہیں۔

۷۔ مولانا نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے، ممکن تھا ہندوستان کوئی اور کروٹ لوٹتا اور مسلمانوں کی سیاسی رفتار بیا بانوں کی سمت مڑ جاتی۔ (۱۶)

- |   |  |
|---|--|
| (۱) مولانا ابوالکلام آزاد، از شورش کاشمیری، صفحات ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳ | (۹) مولانا ابوالکلام آزاد، از شورش کاشمیری صفحہ ۸۹ |
| (۲) ایضاً صفحہ ۵۱   | (۱۰) ایضاً، صفحات ۲۳۳ تا ۲۳۵                       |
| (۳) ایضاً صفحہ ۵۲   | (۱۱) ایضاً صفحہ ۳۶۵                                |
| (۴) (سید عطاء اللہ شاہ بخاری ص ۱۹-۱۶-۱۵)                        | (۱۲) ایضاً صفحہ ۳۰۵                                |
| (۵) مولانا ابوالکلام آزاد، شورش کاشمیری، صفحہ ۵۹                | (۱۳) ایضاً صفحہ ۳۱۵                                |
| (۶) ایضاً صفحہ ۷۰، ۶۹   | (۱۴) ایضاً صفحہ ۳۵۸، ۳۵۹                           |
| (۷) ایضاً صفحہ ۸۲، ۸۳   | (۱۵) ایضاً صفحہ ۳۶۱                                |
| (۸) بوئے گل نال دل، از شورش کاشمیری صفحہ ۳۰۲ تا ۳۰۸             | (۱۶) ایضاً صفحہ ۳۹۳ تا ۳۹۶                         |



SAVOY HOTEL

MUSCOVIE.

TELE { GRAMS "SAVOY"  
PHONE NO. 10

سید احمد  
د. شمس

جی فرشتہ  
میں پاتا ہوں کہ آپ دوقین دن کی  
بہت نکال کر آئیں اور مجھ سے ملیں میں بیان ہو۔ تمہیں  
بیر دہر بادشاہ اور دہر سے ایک اطلاع دوں گا کہ میرا پیام  
کہاں ہوگا۔ امید ہے کہ آپ زحمت سوارا کر گئے  
اور اگر ملے گئے۔ بہت سی خدوئی باتیں کرنی ہیں  
دوست علی علیکم

ابراہیم علی

علی شاہ صاحب بخاری

اسریر

دہلی ۱۰ فروری ۱۹۴۷ء



فرز ہی آپ اس دن آئے لیکن کاموں کی  
تفویض سے یہیہ باکسل جس سو رہا تھا اسٹیشن  
نگویشن کئی سا وقت ساڑھے نو تھا اور  
میں دس گھنٹے بھی طیارہ نہ ہوکا ایلے غرض  
کے سو چارہ کا رنہ دکھا خیال تھا کہ آپ پھر  
اور دیگر دن مل سکتے لیکن آپ پھر نہ سکا۔

اگر کمر اس واقعہ نہ ہو تو آئندہ پہنچے  
دن آسے تاکہ کچھ وقت ملاقات کے لئے نکال  
سکوں۔ مجھے زبردستی آج کے لئے دن وقت نہ نکال  
واحد ملے گی ورنہ تندرستی نہ

برائے صلح

اگر

سید علی شاہ صاحب بخاری

## توضیحات بہ سلسلہ امیر شریعتؒ اور ابوالکلامؒ

۲۰ ستمبر ۱۹۶۶ء کا خط ایکشن سے پہلے کا ہے اور یقیناً ”ضروری باتیں“ اسی سے متعلق تھیں اباجی نہ مسوری گئے تھے نہ دلی۔ اور مولینا حبیب الرحمن لدھیانوی صاحب نے ماسوائے اباجی کے باقی حضرات کی رضامندی و علم سے ”ضروری معاملہ“ طے کر لیا تھا کافی احسان احمد صاحب اور شورش صاحب مرحومین بھی سمجھتے تھے ہم لاعلم تھے، (”اصرار یونیٹ انتخابی مہابہمت“ کا معاملہ تقاضا)

واللہ اعلم بالصواب

۱۰ فروری ۱۹۷۷ء کے خط کا سبب ورود یہ واقعہ بنا۔

ایم۔ اے۔ ایس اینڈ کمپنی حبیب گنج لاہور کے مالک حاجی دین محمد صاحب مرحوم و مغفور حضرت مولانا احمد علی رحمہ اللہ کے مرید خاص تھے اور اباجی کا بھی ازحد اکرام و احترام کرتے تھے بقول شورش صاحب مرحوم انہیں لوہے کا کوثر درکار تاجھے یوں یاد ہے انہیں کوئی پرمٹ درکار تھا ہر حال انکے شریک کار کوئی اور صاحب تھے، جن سے اباجی قطعاً واقف نہ تھے ان صاحب کو لیکر حاجی صاحب دہلی گئے۔ اور حضرت مولانا آزاد سے ملاقات کی کوشش کی۔ اتنے بھگامی دور میں مولانا کے پاس وقت بھی نہ ہوگا۔ اجمل خاں صاحب (مولانا کے پرائیوٹ سیکرٹری) سے ان حضرات نے ملاقات کا وقت مانگا، انہوں نے عذر کر دیا۔ یہ بیٹھ گئے کہ وقت لیکر جائینگے۔ اجمل خاں بھی اڑ گئے اور صاف انکار کر دیا۔ مایوس ہو کر یہ حضرات اباجی کے پاس آئے اور مذکورہ واقعہ کا قطعاً کوئی ذکر نہ کیا بلکہ بنا معاملہ یوں پیش کیا کہ آپکی سفارش مولانا مان لیں گے ہمارے ساتھ شریعت لے چلیئے۔ اب حاجی صاحب سے صرف سرمایہ دار ہونے کی وجہ سے تو تعلق نہ تھا وہ سرمایہ دار ایسے تھے کہ انکے کارخانے میں نمازوں کے اوقات میں کام بالکل بند ہو جاتا اور حاجی صاحب متولی ملازمین کے ساتھ جس صف میں جگہ مل جاتی کھڑے ہو جاتے اور جس روز حضرت مولانا شریعت فرما ہوتے نماز کے فوراً بعد وہ انکے جوتوں کے پاس آکر کھڑے ہو جاتے۔ اور حضرت مولانا جب فارغ ہوتے تو وہ جوتے اٹھا کر انکے آگے رکھ دیتے۔ ان وجوہ سے اباجی انکی قدر کرتے تھے۔ انکے اصرار پر اباجی مان تو گئے مگر کہا کہ شورش کو ساتھ لے لیتے ہیں۔ حاجی صاحب کو اتنی جھلجت تھی کہ اس زمانہ میں انہوں نے دو سیٹیں ہوائی جہاز کی ریزرو کرائیں ایک اپنے لئے اور ایک اباجی کے لئے لیکن اباجی نے شورش صاحب اور حاجی صاحب سے فرمایا کہ آپ لوگ ہوائی جہاز پر جائیں میں گاڑی میں آؤں گا۔ وہ اپنے کارکنوں سے یہی سلوک کرتے تھے۔ شورش صاحب کی اللہ بال بال مغفرت فرمائے، جاتے ہوئے روزنامہ آزاد میں آٹھ کالمی سرخی لگا گئے کہ حضرت امیر شریعت مولانا آزاد سے اہم مذاکرات کے لئے بذریعہ طیارہ دہلی روانہ ہو گئے۔ حضرت امیر شریعت شورش صاحب کے بعد ریل

دہلی سلا- فرسٹ



جی فرسٹ اس بندر فرسٹ کی بائیں فرسٹ نہ تھی  
مجھے خور افروز ہوا تھا کہ آپ آئے اور  
ایک سالہ کی نسبت آپ اور میں جبرور  
یکجہ نے کر کے

میں ایک خط درک کے ذریعہ بھیجے گا کہ  
کہ سنچریا اوار کو دہلی آئے تاکہ اطمینان  
مل سکوں

والسلام

دولت علی

گاڑی میں دہلی پہنچے وہاں سب کا قیام میر احمد حسن شملوی کے ہاں ہوتا یا دفتر احرار میں۔ صبح جب مولانا کے ہاں پہنچے جیسا کہ مولانا نے تحریر فرمایا ہے انہیں کسی کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے جانا تھا اور بروقت تیار نہ ہو پائے تھے۔ جب یہ حضرات پہنچے تو اجمل خاں صاحب نے جا کر بتلایا کہ وہی لوگ اب شاہ صاحب کو لیکر آئے ہیں اباجی نے فرمایا جب مولانا باہر آئے تو منہ پوچھتے ہوئے آ رہے تھے معلوم ہوتا تھا ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی آ رہے ہیں میں نے تو ماتا دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ غصہ چڑھا ہوا ہے آج خیر نہیں سلام و مصافحہ کے بعد عرض آمد دریافت فرمائی جو اباجی نے حاجی صاحب کی روایت سے بیان کر دی مولانا کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے کہا میرے بھائی یہ لوگ پہلے بھی آئے اور دھرنا دے کر بیٹھ گئے کہ ملے بغیر نہیں جائینگے۔ اسکے بعد اس سلسلہ میں کچھ بھی کرنے سے انکار فرمایا اور موٹر میں بیٹھ کر دفتر چلے گئے۔ اباجی کو بہت افسوس تھا کہ حاجی صاحب نے اخفاء کر کے بات بگاڑ دی۔ دوسرے مولانا نے حد سے زیادہ ہی بے نیازی کا مظاہرہ فرمایا اور یہی ملاقات زندگی کی آخری ملاقات ثابت ہوئی پھر اباجی نہ کسی دہلی گئے نہ ملے۔ حاجی صاحب سے اباجی نے گلہ کیا کہ اگر تم نے مجھے لاہور بتا دیا ہوتا کہ تم لوگ پہلے کوشش کر چکے ہو تو میں کبھی ساتھ نہ آتا۔ بعد میں مولانا کو احساس ہوا۔ تو ۱۰ اور ۱۳ فروری کو یہ مکتوب لکھے۔

ایک خط میں نے امرتسر میں بھی اباجی کے

نام دیکھا تا عید کی امت کا مسند تا گلگتہ کے کچھ لوگ ان سے درخواست کرتے تھے انہوں نے انکار فرمایا۔ غالباً دو آدمی امرتسر آئے اور اباجی سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ چلیے اور سوارش کیجئے اباجی نے پوچھا مولانا کے علم میں ہے کہ آپ لوگ مجھے لینے آئے ہیں؟ انہوں نے انکار کیا اباجی نہ گئے۔ لیکن مولانا کو معلوم ہو گیا کہ کوئی صاحب اباجی کو لینے گئے ہیں۔ مجھے خط کا اتنا فقرہ یاد ہے "یوں آپ گلگتہ آئیں تو مجھ سے زیادہ خوشی کس کو ہوگی؟ لیکن اس مسند کے لئے نہ آئیں۔"

اور اباجی تو پہلے ہی انکار کر چکے تھے۔ ۵۔ میں ملتان میں ایک شب میں نے ریڈیو لگایا تو اچانک دلی لگ دیا حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کی کارروائی نشر ہو رہی تھی۔ اعلان ہوا کہ مولانا آزاد تقریر فرمائیں گے انہی آواز کبھی نہ سنی تھی۔ میں بھاگ بھاگ گئی اور بیٹھک کے دروازے پر زور سے دستک دی بھائی جان آئے تو بتایا کہ مولانا آزاد کی تقریر ہونے لگی ہے۔ میرے آتے جاتے تقریر شروع ہو گئی۔ اتنا یاد ہے آیہ مبارک ومن الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات اللہ

پڑھی تھی اباجی کی آنکھوں میں آنسو تھے ایک آہ بھری اور کہا چلو آواز ہی سن لی۔ حضرت مولانا کی تقریر میں خطاب یہ جملے کچھ اس انداز کے تھے کہ "آپ دیکھو گے" "آپ سنو گے" اباجی فرمانے لگے کہ یہ ہے تلخہ پھٹی کی زبان اور اب ابوالکلام کے بعد یہ کون بولے گا؟

"وزارتی مشن کے دنوں میں ایک روز مولانا سے ملاقات کے لئے گئے تو شیخ حسام الدین اور شورش صاحب ساتھ تھے۔ میر احمد حسن صاحب کی موٹر میں گئے مولانا

وائسریگل لاج جانے کے لئے کوٹھی کے باہر کھڑے تھے اور پریشان۔ انکی موٹر سٹارٹ نہ ہو رہی تھی۔ اباجی بیٹھے تو سلام و مصافحہ کے بعد مولانا نے فرمایا کہ میں آپکی موٹر لئے جاتا ہوں اباجی نے کہا حضرت دوش حاضر ہیں۔ فرمایا۔ ”وہ بوجہ تو آپ اٹھائے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر بعد واپس تشریف لے آئے اور گھنٹہ بھر ملاقات رہی جائے بھی پلائی۔“ غبار خاطر ”چھپ چکی تھی اسکا ایک نسخہ اپنے دستخط کے ساتھ دیدیا۔ لکھا تھا۔ ”برائے صدیق عزیز سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری“ اسی ملاقات میں اباجی نے فرمایا مولانا اللہ آپکو عمرِ خضر عطاء فرمائے تو فرمانے لگے نہیں میرے بھائی تھوڑی ہو کر قرینے کی ہو۔“ اس سے پہلے ”تذکرہ اور ترجمان القرآن“ بھی اباجی کو ہدیہ ”ہی دی تھیں۔ ان پر لکھا تھا برائے ”عزیز“ سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب۔ غبار خاطر پر ”صدیق عزیز“ دیکھ کر میں نے کہا اباجی اب آپکے مرتبہ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اباجی مسکرانے لگے۔ (یہ تمام کتابیں تقسیم کے وقت امرسر میں ہی رہ گئیں)

ولی جیل کا واقعہ ”اباجی نے سنایا تھا۔ مولانا آزاد بھی اسی جیل میں تھے مولانا احمد سعید صاحب مرحوم و مغفور بھی۔ ایک روز موقع پا کر اباجی اور مولانا احمد سعید صاحب ملاقات کے لئے مولانا کے کمرے میں بیٹھے ہی تھے کہ جیلر یا سپرنٹنڈنٹ راولڈ کڑتا ہوا ادھر آتا دکھائی دیا مولانا نے فرمایا میرے بھائی آپ بیٹھے میں انہیں ”مصروف“ کرتا ہوں باہر تشریف لے جا کر اس سے گفتگو شروع فرمادی پھر اسنے کیا ادھر آتا تھا میں سے واپس ہو گیا۔ مولانا احمد سعید سنا ہوا ہے بڑے بے دھڑکے بزرگ تھے مولانا آزاد سے کہنے لگے۔ لاجل و لا لاقوہ آپکے پاس آنا تو ایسے ہے جیسے کوئی شریف آدمی دن دھاڑے ”اس بازار“ میں پکڑا جائے۔ بے چارے مولانا یہ ریمارک پئی گئے۔ پھر چائے بنائی اور پوچھا کیسی ہے؟ اباجی نے تعریف کے ساتھ کہا۔ حضرت ایک کمی رہ گئی۔ اباجی کہتے اب مولانا سے کوئی یہ کہے کہ آپ کی چائے میں کمی رہ گئی؟ بڑی بڑی ایرانی آنکھیں اٹھا کر تعجب اور حیرت سے پوچھا وہ کیا میرے بھائی؟ میں نے کہا دوپٹی زعفران بھی ہوئی۔ فرمایا آپ اضافات کی بات کرتے ہیں۔ پھر کسی روز آئیے آپ کو مرعزہ بلالہ لگا۔ چنانچہ پھر ایک روز زعفرانی چائے بھی پلائی۔

قرآن مجید سے متعلق شاہ جی فرمایا کرتے تھے۔ کہ میں قرآن مجید کے سوا کسی دوسری کتاب کے پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہوں جو کچھ ہے قرآن و سنت میں ہے۔ اور جو کچھ اس کے باہر ہے وہ باطل ہے۔ اور ایک باطل کے مطالعہ کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر آج دنیا قرآن چھوڑ کر دوسری کتابوں کی طرف لگا کر سکتی ہے تو میں کیوں نہ دوسری کتابوں سے روگردانی کر کے اپنی تمام تر توجہ قرآن پر مرکوز کروں۔ میں تو قرآن کا مبلغ ہوں۔ میری باتوں میں اگر کوئی تاثیر ہے تو وہ صرف قرآن کی وجہ سے ہے۔ جو چیز مجھے قرآن سے الگ کرے اسے اگل لادوں۔

## زندہ بادِ سحر البیان بخاری

حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری ۱۹۱۶ء سے جہاد آزادی میں مصروف ہیں۔ عمر کا بڑا حصہ قیدِ فرنگ میں گزاریا ہے۔ ان کی تقریر سرسبز کی طرح دماغ پر اثر کرتی ہے۔ وہ بلا مبالغہ تقریر کے ذریعہ جادو کرتے ہیں ان کی تقریر کے بعد دس فیصدی سامعین اپنی ذاتی رائے سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ وہ آٹھ گھنٹہ تک مسلسل بول سکتے ہیں اور یہ کمال ہے کہ مجمع پُر سکون پُر جوش، جس طرح یہ چاہیں بیٹھا رہتا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو بیدار کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ غرضیکہ وہ اس دور کے بہترین اور ایشیا پیشہ مسلمان ہیں۔ چونکہ بد قسمتی سے اس زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں اس لئے مفلس ہیں۔ اگر ہندو قوم میں ہوتے تو لالوں کے لال ہوتے، سونے میں تو لے جاتے اور امیرانہ زندگی بسر کرتے۔ مگر چونکہ آزاد خیال مسلمان ہیں۔ اس لئے منافقوں اور سامراج کے لہجنوں کے نزدیک یہ قابلِ گردن زونی ہیں۔ مگر لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں ان کے لئے بے پناہ جذبہ عقیدت ہے۔

سالِ گذشتہ پنجاب کی مسلم لیگی حکومت نے ان کے خلاف دو مقدمے قائم کئے جن میں سے ایک گجرات (پنجاب) کی تقریر کی بنیاد پر جس میں سرکاری ریپورٹر (لدھارام) نے اپنی شہادت میں بے حد شرمناک الزام حکومت پنجاب کے وزیرِ اعظم پر (جو مسلم لیگ ہائی کمانڈ کے رکن ہیں (۱)) لگائے اور ہائی کورٹ سے شاہ صاحب بری ہوئے۔ اس مقدمہ میں چٹانسی اور کالے پانی کی سزا ہو سکتی تھی۔ ایسا ہی دوسرا مقدمہ راولپنڈی کی تقریر پر چلا۔ جس سے لاہور کے سیشن جج نے بری کر دیا۔ الحمد للہ علی احسان۔

میں مصممِ قلب سے اپنے دوست حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ کو اس حیاتِ نو پر مبارک دیتا ہوں۔ ان کی رہائی کے لئے رات کے سناٹے میں کتنی دعائیں مانگیں۔ تب جا کر کہیں یہ رہا ہوئے۔ اگرچہ دھاکے ساتھ مقدمہ کی پیروی بھی زبردست ہوئی اور ہزار ہا روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن لوگوں نے شہادتیں دیں اور جنہوں نے حضرت شاہ صاحب کو اپنی شہادت سے چٹانسی کے تختہ پر پہنچا دیا۔ کیا ان سے کوئی باز پرس نہ ہوگی؟

میری رائے میں اس معاملہ کو یہیں تک نہ ختم کرنا چاہیئے بلکہ پنجاب اسمبلی، مرکزی اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبران کے پاس اس مقدمہ کی سرری بھیجینی چاہیئے۔ اور ان تمام مقامات پر سوالات کرا کے گورنمنٹ ہند کو مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ آزادانہ تحقیقات کرے اور شاہ صاحب کو ہرجہ اور خرچہ کا مقدمہ فوراً احکام متعلقہ کے خلاف شروع کر دینا چاہیئے۔ تاکہ ہمیشہ کے لئے اس قسم کے مقامات کا خاتمہ ہو جائے۔

(اداری شذرہ، ماہنامہ "پیشوا" دہلی جمادی الاول ۱۳۵۹ھ، جون ۱۹۳۰ء، شمارہ ۳۔ جلد ۱۷)

۱۔ سر سکندر حیات، وزیرِ اعظم پنجاب

## بخاری تقریر کر رہا ہے

فضا کو تنخیںہ کر رہا ہے  
نیا تصور ابھہ رہا ہے  
جہان چنگیز مر رہا ہے

— بخاری تقریر کر رہا ہے —

جلال پیغمبری نہ پوچھو  
کمال جاوگری نہ پوچھو  
خطیب کی ساحری نہ پوچھو

— بخاری تقریر کر رہا ہے —

گلاب لالہ کا سلسلہ ہے  
بلند آواز حوصلہ ہے  
قرون اولیٰ کا ولولہ ہے

— بخاری تقریر کر رہا ہے —

عروس انکار کا چمن ہے  
خیال تازہ کا باغچن ہے  
نوائے اسلام ہم سخن ہے

— بخاری تقریر کر رہا ہے —

خیال کوٹ بدل رہے ہیں  
غزل کچے نچے بول رہے ہیں  
جدید الفاظ چل رہے ہیں

— بخاری تقریر کر رہا ہے —

مجھے بھی تیغ اُچھالنے دو  
مجھے بھی الفاظ اُچھالنے دو  
مجھے بھی راقی اُچھالنے دو

— بخاری تقریر کر رہا ہے —

وطن کی لٹنے نہ اس لوگو!

مژکونہ اب اے ادا اس لوگو!

کہاں ہو معنی شناس لوگو!

— بخاری تقریر کر رہا ہے —

شورش کاشمیری



## تحریک نمکین ستیہ گرہ

کانگریس (سول نافرمانی) تحریک کے سلسلہ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے طوفانی دورہ لاہور سے شروع کیا۔ وہ لاہور، امرتسر میں تقریریں کرتے ہوئے چاندھر پیچھے۔ تو میں نے اپنے لڑکے مولوی حلیل الرحمن اور اپنے خاص رازدار والنشیر عبدالرحمن غازی عرف مانا کے ذریعے شاہ جی کو کھلا بھیجا کہ وہ لدھیانہ جیل میں مجھ سے مل کر اروہرہ کے اجلاس جمعیت العلماء ہند میں شرکت کریں۔ جس میں کانگریس تحریک میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا جانا تھا۔ چنانچہ شاہ جی تشریف لائے۔ اس موقع پر پنڈت من موہن سپرٹنڈنٹ لدھیانہ جیل نے ملاقات کا موقع دیا۔ شاہ جی پر ہر طرف سی آئی ڈی تھی۔ ہر قدم پر شاہ جی کو گرفتار کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ پنڈت من موہن نے سکیم کے مطابق شاہ جی کو اپنے مکان پر ٹھہرایا اور چاندھر سے آنے والی موٹر کار کو گریج میں بند کر کے چھپا دیا۔ رات کو جیل میں خاموشی سے ملاقات ہوئی اور دو گھنٹے تک جمعیت العلماء کے اجلاس میں کانگریس کی شرکت کے بارے میں تبادلہ خیال ہوتا رہا۔

میں نے شاہ جی سے کہا کہ جمعیت کے اجلاس میں ایسے لوگ بھی آئیں گے جو مسلمانوں کے دستوری تحفظ کا دروازہ کھول کر جمعیت العلماء ہند کو کانگریس کی تحریک میں شرکت کرنے سے روکنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن آپ یہ کوشش کیجئے گا کہ دستوری تحفظ کی بحث کا دروازہ نہ کھل سکے۔ اور جمعیت العلماء ہند غیر مشروط طور پر ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک ہو جائے۔

شاہ جی اس گفتگو کے بعد پنڈت من موہن کی کار میں بیٹھ کر انبالہ چلے گئے۔ انبالہ سے سیدھے سہارنپور ہوتے ہوئے ۲ مئی ۱۹۳۰ء کو جمعیت العلماء کے اجلاس اروہرہ میں پہنچ گئے۔ جمعیت العلماء نے جوان پارٹی کے لیڈر مولانا حفظ الرحمن سیوہاری کی تجویز کہ جمعیت العلماء ہند کانگریس کی تحریک سول نافرمانی میں شریک ہو جائے۔ پر شاہ جی نے مجلس مضامین میں سرگرم حصہ لیا اور کانگریس میں شرکت کے خافضین کو آخر کار شاہ جی کے دلائل کے سامنے جھکنا پڑا۔ اور متفقہ طور پر مولانا حفظ الرحمن کی تجویز مولانا حسین احمد دہانی کی تائید سے منظور ہو گئی۔ رات کو جمعیت کے کھلے اجلاس میں مولانا شاہ معین الدین امیر کی صدارت میں شاہ جی نے سات گھنٹے تک تقریر کی۔ اس اجلاس میں ایک ہزار علماء شامل تھے۔ ۵۰ ہزار سے زیادہ عوام کا مجمع تھا۔ اجلاس اروہرہ کی کامیابی کا سہرا مولانا حفظ الرحمن اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے سر بندھا۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اروہرہ کے بعد یوپی بہار کا دورہ کرتے ہوئے بنگال جا پہنچے۔ اور دیناج پور میں جا کر گرفتار ہو گئے۔ اس دورہ میں ایک لاکھ آدمی شاہ جی کی تقریروں سے متاثر ہو کر گرفتار ہونے والوں میں ۳۰ ہزار مسلمان تھے۔ آکر آباد میں جب شاہ جی پہنچے تو پنڈت موتی لعل کے ہاں ٹھہرے۔ پنڈت جی نے خود شاہ جی کے کھانے کا انتظام کیا اور اپنے ہاتھ سے دونوں وقت چائے بنا کر پلائی۔ پنڈت جی بار بار شاہ جی سے کہتے کہ کانگریس ستیہ گرہ کی

کامیابی صرف آپ ہی سے وابستہ ہے۔" پنڈت موتی لعل نہرو شاہ جی کی سربانی کے عاشق تھے۔ کانگریس تحریک میں پنجاب کے احرار رہنماؤں کی شرکت اور شاہ جی کے دورہ کا یہ اثر ہوا کہ گاندھی اردن پیکٹ کے بعد جب بھی احرار رہنما گاندھی جی سے ملنے گئے تو گاندھی جی اٹھ کر خود دروازے تک چھوٹے آتے۔ یہ امتیازی بات تھی۔ جو زندگی میں گاندھی جی نے صرف احرار رہنماؤں کی عزت و تکریم میں کی۔

اس واقعہ سے حضرت شاہ جی کا جذبہ آزادی اور انگریز کے خلاف نفرت و حقارت کا ولولہ ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح وہ ملک کے ایک کونہ سے دوسرے کونے تک تحریک نمک کے حق میں انگریزی حکومت کے خلاف تقریریں کرتے ہوئے دسناچ پور میں گرفتار ہو گئے۔ لاہور سے چل کر یہ مرد مجاہد امرتسر، جالندھر، لدھیانہ، سہارنپور، امرہہ اور پیر ساری یوپی، سی پٹی، بہار اور بنگال کو روندتا ہوا دسناچ پور چا پٹنہا اور کس طرح انہوں نے اپنے فنی خطابت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک لاکھ انسانوں کے جذبات کو انگیزوں کی مخالفت پر آمادہ کر لیا۔ ان میں ۷۰ ہزار کے قریب ہندو اور دیگر غیر مسلم بھی شامل تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ آپ کی صلاحیتوں کا شمار عقیدت مندوں میں ہندو اور دوسرے غیر مسلم بھی برابر کے شامل تھے۔ یہی کام کرنے کا صلہ اور انگریز کی مخالفت کا جنون تھا کہ پنڈت موتی لعل نہرو گاندھی جی اور خود تمام کانگریس جماعت حضرت شاہ جی کے محتاج تھے۔ اور ان کی دل و جان سے قدر کرتے تھے۔ اور شاہ جی کی خدمت کرنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے تھے۔ جیسا کہ پنڈت موتی لعل نے کہا کہ "شاہ صاحب کانگریس میں ستیہ گرہ کی کامیابی صرف آپ ہی سے وابستہ ہے"

یہ تھا حضرت شاہ جی کے کام کرنے کا طریقہ جس کے آگے ہندوستان جیسے وسیع ملک کے طول و عرض سکڑے ہوئے دکھانے دیتے تھے۔ یہ تھا جذبہ حریت کہ جس کی دھاک بڑے بڑے ہندو لیڈروں پر پوری سطوت و شوکت کے ساتھ مسلط تھی۔ اللہ! اللہ حضرت شاہ جی کا تحریک آزادی میں جو حصہ ختمہ اس پر زمانہ فخر و ناز کرے گا۔ اور تاریخ اپنی جبین ناز حضرت شاہ جی کے اسی جذبہ کے آگے خم کرتی ہوئی فرموس کرے گی۔ (منقول از "رئیس الاحرار اور جنگ آزادی")

لے کے ڈنڈا ہاتھ میں نکلے عطاء اللہ شاہ  
جب نہ دیکھا کام چلتا وعظ سے اور پسند سے  
(ظفر علی خان)

## وہ دن کہاں گئے وہ زمانے کدھر گئے

پروردگار عالم نے ابن آدم کو عجیب عجیب نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ یہ نشت خاک مجموعہ کمالات ہے۔ غور فرمائیے کہ انسان حافظے کی کمندیں ڈال کر اپنے ماضی کو کس آسانی سے کھینچ لیتا ہے۔ تیس چالیس سال پہلے کے گزرے ہوئے واقعات آن واحد میں اس طرح سامنے آجاتے ہیں گویا ابھی وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے آج سے تقریباً چالیس سال قبل جب میں روزنامہ زمیندار کا مطالعہ کرتا تو ترکوں پر برطانیہ کے مظالم پڑھ کر مجھے دکھ ہوتا تھا۔ پھر رہہ کر یہ خیال بھی آتا تھا کہ اسی برطانیہ نے ہمیں غلام بنا رکھا ہے۔ اور اسی کے ہاتھوں آج ترکوں کی تباہی اور بے آبروئی ہو رہی ہے۔ پھر سوچتا کہ ہم بالکل بے بس ہیں اور کبھی کیا سکتے ہیں۔ ایک دن مایوسی ناامیدی اور بے کسی کے خیالات میں گھبراہٹ گھر سے تھوڑی دور باہر چوک پر پہنچا تو میرے بچپن کے دوست میر محمد فیضی نے بتایا کہ وہ امرکسر سے آرہے ہیں وہاں گزشتہ رات ایک جلسہ عام تھا۔ اس میں ایک نوجوان مولوی نے ایسی پیاری تقریر کی سہاواں اللہ! ایمان تازہ ہو گیا۔ پوچھا کیا نام تھا مولوی کا؟ میر محمد فیضی نے جواب دیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ پھر کہنے لگا مولوی کیا ہے فرشتہ ہے سید زادہ بڑا ہی خوبصورت نوجوان ہے۔ اللہ نے لہن داؤدی عطا فرمایا ہے۔ قرآن پڑھتا ہے تو سامعین پر وجد طاری ہوتا ہے۔ بولتا ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں تقریر ایسی دل پذیر کہ دلوں میں اتر جاتی ہے۔ مجھے تو اب تک نشہ ہے۔ امرکسر سے مسرور ہو کر آیا ہوں۔ "اس ظالم نے بخاری کی باتیں سنا سن کر مجھے ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کیا کہ جہاں طبعتیں نیا راستہ تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ میں اپنے دوست سے حضرت شاہ جی کی تعریف سن کر سوچنے لگا کہ ایسی تقریر تو ضرور سنا چاہیئے میں امرکسر پہنچوں یا انہیں لدھیانے بلوں چنانچہ میر محمد فیضی سے مشورہ کئے بعد ملے ہوا کہ شاہ جی کو لدھیانے بلا کر جلسہ عام کیا جائے۔ جلسہ کیسے ہو گا۔ انتظام کون کرنے گا۔ جلسہ کس جگہ کیا جائے؟ جوانی کے جوش نے کچھ سوچنے سمجھنے نہ دیا۔ دوسرے دن میر فیضی کو امرکسر روانہ کر دیا۔ اور تاکید کر دی کہ شاہ جی لدھیانے تشریف لانے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو مجھے تار کے ذریعے اطلاع کر دی جائے۔

میر فیضی بڑے ذہین اور جوشیلے نوجوان تھے وہ امرکسر پہنچے اور شاہ جی سے دوسرے دن لدھیانے آنے کا وعدہ لے کر واپس آگئے۔ پہلے جلے کا اعلان بھی ہم نے خود ہی کیا۔ گیس کے ہنڈے، فرش اور ٹھنڈے پانی کا بندوبست غرضیکہ جلے کے لوازمات اور انتظامات سے فارغ ہو کر ہم نے دوستوں کو ہمراہ لیا اور شاہ صاحب کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ گاڑی لدھیانہ اسٹیشن پر آکر رکی۔ تو میں شاہ جی کو ہچانتا نہ تھا۔ فیضی نے انہیں دیکھا ہم سب یک کر ان کے کمپارٹمنٹ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ مڈول جسم کا خوبصورت نوجوان جس کی پیشانی شرافت، نہایت اور شجاعت کا پتہ دے رہی تھی۔ نہایت سادہ لباس

میں گاڑی سے مسکراتا ہوا پلیٹ فارم پر اترا۔ میں نے معزز مہمان کو غور سے دیکھا پھر برہم جوانی کی خوبصورت آنکھوں میں مستی کے بجائے حیا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہ تھے بخاری جن سے میرا تعارف کرایا گیا۔ بخاری خرمال خرمال دو ستون عقیدت مندوں اور اجنبیوں کے جھرمٹ میں ریلوے اسٹیشن سے باہر تشریف لائے۔ ہم انہیں گھوڑا گاڑی میں بٹاکر میر فیضی کے مکان پر لے گئے۔ انہیں کمرے میں بٹاکر میں نے اپنے دوست سے کہا فیضی میرے دل میں سید زادے کو دیکھ کر اتنا اثر ہوا ہے۔ تقریر سنوں گا تو کیا ہو گا؟ فیضی نے ہنس کر کہا جلدی کے بعد دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ ہم نے شاہ جی کو کھانا کھلایا اور عشاء کی نماز کے لئے سامنے والی مسجد میں چلے آئے۔ اور نماز سے فارغ ہو کر جلسہ گاہ کی طرف چل دیئے۔

خصوص میں برکت ہے۔ ہمارے ساتھ کون تھا۔ ہم نوجوانوں کی حیثیت ہی کیا تھی مگر لدھیانے میں پہلا جلسہ اس شاٹھ کا ہوا کہ دریا کے کنارے کا بہت وسیع میدان ہندو اور مسلمانوں سے کچھا کچھ بھر گیا۔ لوگوں کے دلوں میں نیا نیا شوق اور جوش تھا۔ وہ بخاری کی تقریر سننے کے لئے جوق در جوق چلے آ رہے تھے جلسہ شروع ہوا۔ بخاری نے خطبہ مسنونہ پڑھا۔ قرآن پاک کی تلاوت شروع کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے آیات ابھی ابھی نازل ہو رہی ہیں۔ مجمع پر سکوت طاری تھا قرآن پاک کی تلاوت دل کی آکودگیوں کو صاف کر کے نور ایمان سے جگلا رہی تھی۔ سامعین پر وہ طاری تھا۔ جلسہ گاہ میں مکمل سکوت تھا۔ جب بخاری نے بولنا شروع کیا تو گویا لاندہ زار کھل گیا۔ اور جب اپنے خاص انداز اور نرم سے بر محل شعر پڑھتے تو سامعین پھر کھٹکتے۔ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کی صدائیں بلند ہوتیں۔ تکبیر کے نعروں سے فضا گونج اُٹتی۔ رات کے ایک بجے تک جلسہ رہا۔ بخاری نے پہلی تقریر ہی سے اپنی دھماک بٹادی۔ تحریک کے لئے میدان ہموار ہو گیا۔ تقریر بخاری نے کی مگر اپنے شہر میں ہمیں عقیدت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ یعنی لکڑی کے ساتھ لوہا بھی تیرنے لگا۔ ہزار ہا لوگوں کی زبانوں پر بخاری کا قصیدہ تھا۔ میرے ساتھیوں اور ہاتھ بٹانے والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ بہادر اور فخلص نوجوان میرے گرد جمع ہو گئے۔ شہر والوں نے پھر تقاضا کیا کہ بلاؤ بخاری کو ہم نے دوبارہ درخواست کی جسے بخاری نے قبول فرمایا۔ بخاری کی بار بار تشریف آوری سے ہمارے ہاں کے اکثر نوجوان صبح رنگ میں رنگے جا چکے تو ایک روز جلسے کے اختتام پر وہ مجھے الگ لے گئے۔ وہ فرمانے لگے کہ لدھیانہ تو علماء کا زبردست تاریخی مرکز ہے۔ یہ دوسرا دیوبند ہے۔ تم مولوی حبیب الرحمنؒ جانتے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے عرض کیا کہ ہم تو ایک ہی محلے کے رہنے والے ہیں۔ بچپن میں ایک ساتھ کھیلتے رہے ہیں۔ بخاری نے فرمایا کہ پھر مجھے کیوں بلاتے ہو۔ وہ تو بڑی خوبیوں کے مولوی ہیں خاندانی وجاہت کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے مقرر ہیں۔ ان کا خاندان تو انگریز دشمنی میں نمبر ایک پر شمار ہوتا ہے۔ تم ان سے ملو۔ اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ تم ہر ہفتے مجھے بلالیتے ہو۔ مجھے امر کسر اور لاہور ہی میں کام کرنے دو۔ مگر مجھے چونکہ بخاری سے بے پناہ عقیدت اور غایت درجہ کی محبت تھی۔ میری درخواست پر وہ لدھیانے آ ہی جاتے تھے حقیقت یہ ہے کہ مجھے سیاسی میدان میں کھینچ کر لانے اور غلامی سے نفرت اور بیزاری پیدا کرنے میں انہیں کا ہاتھ ہے۔ ورنہ میں تو قطعی دنیا دار اور کھنڈرا نوجوان تھا۔ شکار سے فرصت ملی تو کرکٹ کھیل کر دن ضائع کر دیا۔ بخاری کی محبت

بھری ملاقاتوں نے میری زندگی کو یکسر بدل ڈالا۔ آزادی وطن کے لئے قربانی کا جذبہ بخاری نے میرے دل میں اس طرح کوٹ کوٹ کر بھر دیا کہ مجھے حال کے درپے سے ماضی کو جھانکنے ہی کی فرصت نہ ملی۔ جیل جس کے تصور سے دل کانپ اٹھتا تھا کچھ مصبوب بن گیا۔

طواف کوچہ مصبوب اپنا مشغلہ ٹھہرا  
جانا ہو کھیں مگر جانا اور ہو کر

۱۹۱۹ء میں جب بخاری نے خداداد قابلیت اور آتش بیانی سے برطانوی سامراج کا انگریز ہنر و مہیلا کرتا شروع کیا تو فرہنگی نے کان کھڑے کئے اور بھانپ لیا کہ اس جادو بیاں نوجوان کو آہنی پٹے سے دیوچ نہ لیا تو یہ دل جلاہر ہندوستانی کے دل میں ایسی آگ لگائے گا جس پر قابو پانا محال ہو جائے گا چنانچہ کسی ایک تقریر کی بنا پر حضرت شاہ صاحب کو گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ بمبئی میں جب انہیں تین سال قید سخت کا حکم سنایا تو انہوں نے فقرہ چست کرتے ہوئے فرمایا

”واہ بھئی واہ تین خداؤں کو ماننے والی حکومت نے سزا بھی تین سال ہی کی دی۔“

بخاری کو امرتسر سے لاہور اور لاہور سے میانوالی جیل میں بھیج دیا گیا۔ میرے ایسے ہزاروں عقیدہ مندوں نے بخاری کی جدائی کو سختی سے محسوس کیا۔ دل بے تاب ہونے لگے۔ سلگنے والی آگ بھڑکنے لگی۔ میں اس وقت ”گوٹھا مجاہد“ تھا۔ فنِ تقریر سے قطعی نا آشنا۔ جیل جانے کے لئے بے تاب تھا مگر اندر جانے کا کوئی طریقہ کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی کے رہنما سول نافرمانی کی راہیں تلاش کر رہے تھے مگر ان کو بھی مناسب طریقہ اور صحیح راستہ نظر نہ آتا تھا۔ اس مشکل کو برطانوی کارندوں نے آسان کر دیا چنانچہ حکومت کی جانب سے لائسنسڈ ایکٹ نافذ کر دیا گیا۔ بمبئی کے بھاگوں چھیٹا ٹوٹا۔ میں دوڑا دوڑا لاہور پہنچا تو صوبائی رہنماؤں کی مجلس مشاورت ہو رہی تھی۔

مجھے بخاری کی یاد نے تڑپا رکھا تھا۔ میں نے رہنماؤں کے سامنے استدعا کی اور آٹھ سو رضا کاروں کے حلف نامے پیش کرتے ہوئے سول نافرمانی کی اجازت حاصل کر لی۔ گھر پہنچا شہر میں اعلان کیا، بہت بڑا جلوس نکلا اور گرفتار ہو گیا۔ میری خوش قسمتی ملاحظہ فرمائیے کہ میں لائسنسڈ ایکٹ کا پہلا قیدی تھا۔ اور اس قدر حاصل کرنے میں بھی بخاری کی مہربانیوں کا بہت بڑا حصہ تھا۔

میں جب گرفتار ہونے کے لئے زیادہ بے تاب تھا تو میرے دل میں ایک جذبہ کار فرما تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ پکڑا جاؤں گا تو بخاری کے پاس پہنچا دیا جاؤں گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مہینہ بھر میرا دل کروٹیں لپٹتا رہا بالآخر قدرت نے یہ آرزو بھی پوری کر دی۔ لداھیانے سے انبالہ اور انبالہ سے میانوالی جیل پہنچ گیا۔ دیکھا زندگی میں میل ملاپ کی کس قدر کشادہ راہیں موجود ہیں مگر اب.....

”ہم کہاں بیٹھ کے اب نالہ و فریاد کریں“

حضرت شاہ جی اپنے خدا کے پاس وہاں پہنچ گئے جہاں بلاوے کے بغیر کوئی جا بھی نہیں سکتا اور جو چلا جائے وہ واپس نہیں آتا۔

اب انہیں دھونڈھ جراثیم رخ زبائے کر



شاہ جی مرحوم کے اختیار کردہ اس لائحہ عمل پر ثابت قدمی کے ساتھ چلتے رہیں گے۔ پاکستان کے قیام کے بعد کئی سالوں تک ہمارے برسرِ اقتدار مختلف سیاسی رہنماؤں نے باہمی چپقلش کا جو تباہ کن ڈرامہ رچائے رکھا اور ہماری قوم اور ملک جن غیر یقینی حالات سے دوچار رہے۔ وہ آپ سب حضرات پر واضح ہے۔ میں اس وقت ان مایوس کن تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔

انگریز نے دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اور اہل اسلام کی ترقی کی راہ میں ہمیشہ کانٹے بچھائے ہیں۔ اسی بات کو محسوس کرتے ہوئے انگریز کی غلامی کے دور میں ۱۸۵۷ء سے قربانیاں دینے کا تانا باندا دیا گیا۔ اور اس راہ میں بڑے بڑے جید علماء بھی کام آئے۔ جس کی آخری آواز مدرسہ دیوبند کے بانی شیخ الحدیث مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اسیرِ بلا جیل تھے۔ آپ نے سمجھا کہ انگریز کی غلامی سے نہات حاصل کرنے کے لئے قربانیاں دینے کا تمام سلسلہ علمائے ہند کی وجہ سے قائم رہا جنہوں نے جمع ہو کر انگریز سے عدم تعاون کے پیمانہ پر دستخط کئے ہم کون تھے کابلوں کے پڑھے ہوئے نوجوان، نہ آگاہ نہ پچھا۔ ڈگری حاصل کر لی۔ اور ملازمت حاصل کرنے کے لئے دفاتر کے گرد کتوں کی طرح چکر لگاتے رہے۔ انگریز نے کلچر اور سکول ملک میں اس لئے جاری نہیں کئے تھے کہ ہم لوگ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوں۔ بلکہ انگریز کا مقصد یہ تھا کہ اس کی حکومت چلانے والی شیرازی کے پرزے تیار ہوں۔ آپ نے اس موقع پر اکبر اللہ آبادی کا یہ شعر پڑھا۔

یوں قتل سے بھوں کے وہ بدنام نہ ہوتا  
افسوس کہ فرعون کو کلچر کی نہ سوجھی

دفاعِ پاکستان کے ضمن میں اسیرِ شریعت مرحوم نے پاکستان میں بڑی بڑی کافر نہیں منعقد کیں اور لاکھوں جانا ناز رضا کاروں سے قربانیاں پیش کرنے کے حلف لئے۔ ان کافروں کی صدائیں سرکاری اعلیٰ حکام نے بھی کیں۔ استقامت ملک کے لئے شاہ جی مرحوم نے انفرادی اور اجتماعی طور پر جتن بھر پورا انداز سے خدمات انجام دی ہیں۔ اس طریقے پر کسی دوسرے نے عملی ثبوت نہیں دیا۔ اسی سلسلہ میں ان دنوں لکھی گئی سرکاری خفیہ رپورٹوں کو ایک نظر دیکھ لینے سے میری بات کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ کے بعد جو پیمانہ پیدا ہوا اور بین الاقوامی طور پر انگریز نے مسلمانوں کی تباہی کے لئے جو کردار ادا کیا۔ اس کے شاید ترکوں کے حالات ہیں۔ آج کیا ہو رہا ہے۔ کل کے ترک حاکم آج پھانسیاں پارہے ہیں۔ آپ نے سمجھا ان دنوں انگریز کو کمزور کرنے کے لئے متحدہ ہندوستان میں ہندو رہنماؤں اور علمائے اسلام نے مشترکہ معاہدے پر دستخط کئے۔ مسلم علماء اور عوام انگریز کی بین الاقوامی اسلام دشمن پالیسی کا مقابلہ کرنے کے لئے دیوانہ وار سامنے آئے۔ ان دنوں اسیرِ شریعت مرحوم طالب علم تھے۔ صورتِ حالات کو سمجھتے ہوئے شاہ جی پھر سے ہوئے شیر کی طرح میدانِ جہاد میں آئے۔ اور اس وقت سے لے کر زندگی کے آخری ایام تک "شیر" نے کبھی پلٹ کر ہی نہیں دیکھا۔ شاہ جی ۱۹۱۴ء میں ایک واعظ کی حیثیت سے سامنے آئے۔ جس کو بچے کی سبھ کے وہ امام ہونے لطف کی بات یہ ہے اگر سر میں اس کو بچے

کا نام بھی "کوچہ جیل خانہ" تھا۔ شاہ جی نے اس زمانے سے قوم و ملک کی خدمت شروع کی اور پوری زندگی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ مگر ان کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ شاہ جی نے اپنے اعلیٰ کردار کی بدولت ایک ایسی شاندار تاریخ بنائی ہے جو شاید کسی دوسرے قومی رہنما کو نصیب نہ ہوگی۔ شاہ جی مرحوم اپنی قوم میں جس زندگی کو پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انگریزی سامراج اس کی راہ میں بہت بڑی دیوار بن کر حائل رہا۔ جس کا مقابلہ کرنے میں شاہ جی نے کبھی کمزوری نہیں دکھائی۔

شاہ جی مرحوم نے مذہب و ملت کی خدمت کے لئے جو فائدہ اٹھایا تھا۔ اس میں یہ گنجائش تھی کہ جب کوئی چاہے نکل جائے اور جب کوئی چاہے شامل ہو جائے۔ انہوں نے کبھی جاتے ہوئے کو روکا نہیں اور آنے والے کو منع نہیں کیا۔ شاہ جی ہم سے ہمیشہ کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔ ہمارے ہاں شخصیتوں کی پوجا نہیں ہوتی۔ بلکہ دلوں میں ایک دوسرے کے لئے اخلاص اور محبت تھی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس چالیس پچاس سالہ تاریخی دور کی یادگار تھے۔ جس میں انگریز کی حکومت کے خلاف لگتی جاتی رہی۔ شاہ جی وطن و ملت کی خدمت کی راہ میں بڑے جری اور پاکیزہ قافلہ سالار تھے جنہوں نے بڑے خلوص کے ساتھ خدمت کی اور قربانیاں دیں۔

کسی صاحب نے شاہ جی سے سوال کیا۔ شاہ صاحب ملکی سیاست میں آپ کا نظریہ کیا ہے جس کے لئے آپ ہندوستان کی آزادی کے لئے اتنے کوشاں ہیں؟ امیر خریعت نے فرمایا۔ میرے اس نظریہ سے متعلق تم خود ہی فیصلہ کر لو۔ مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ میں نے لاکھوں ہندوستانیوں کے ذہنوں سے انگریزوں کو نکال پھینکا ہے۔ میں نے گلگتہ سے خیبر تک اور سرئی نگر سے اس بھاری تک دوڑ لگائی ہے۔ میں تو وہاں بھی گیا ہوں۔ جہاں کہ دھرتی پانی پینے سے عاجز تھی۔ اب سوال یہ رہا۔ کہ میں آزادی کے کس تصور کے لئے لڑ رہا ہوں۔ تو اس کے متعلق سمجھ بیٹے۔ کہ اپنے ملک میں اپنا راج۔ تم میرے پاپو مجھ سے شاید کوئی کتابی ایڈیٹوری پوچھ رہے ہو۔ یہ کتابی نظریے عام طور پر روگ ہوتے ہیں۔ فی الحال جو مرحلہ درپیش ہے وہ کسی مثبت کا نہیں۔ منفی تصور کا ہے۔ ہم سب سے پہلے تو غیر ملکی طاقت سے گلو خلاصی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس ملک سے انگریز نکل جائیں۔ نکلیں کیا؟ نکالے جائیں۔ اس کے بعد آزادی کے خطوط پر غور کیا جائے گا۔ بابو تم نکاح سے پہلے چھوڑے بانٹنا چاہتے ہو۔ پھر میں دستوری نہیں سپاہی ہوں۔ تمام عمر انگریزوں سے لڑتا رہوں گا۔

اور اگر ایسے وقت سور بھی میری مدد کریں گے۔ تو میں ان کا بھی منہ چوم لینے کے لئے تیار ہوں۔ میں تو ان چیونٹیوں کو کھانڈ کھلانے کے لئے تیار ہوں۔ جو صاحب بہادر کو کاٹ کھائیں۔ خدا کی قسم میرا صرف ایک دشمن ہے وہ ہے فرنگی جس ظالم نے مسلمان ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بلکہ خیرہ چشتی کی بھی حد ہو گئی کہ تشریف کے لئے مسلمانوں میں جھلی نبی پیدا کیا پھر اس خود کاشتہ پودے کی آبیاری کی۔ اب اس کو چھتیس پچے کی طرح پال رہا ہے۔



# برق و رعد آسودہ بستر شدہ شعلہ جو الہ خاکستر شدہ

(علامہ محمد حسین غرشی امرتسری..... بنام..... حکیم محمد موسیٰ امرتسری)

سید بخاری علیہ الرحمۃ میں بہت سی خوبیاں تھیں جو اخباروں کے ذریعہ شہیر ہو چکی ہیں۔ ایک خاص خوبی یہ بھی تھی کہ مذہباً فراخ دل اور روادار تھے۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ مولوی طبّے میں صحیح ذوقِ شعر کا کوئی آدمی میں نے ایسا نہیں دیکھا۔ ان دونوں خوبیوں کے متعلق اپنا تجربہ عرض کرتا ہوں۔ جب کبھی قیدِ فرنگ سے رہا ہو کر آتے تھے تو مجھ سے ملنے کے لیے دکان پر ضرور تشریف لاتے۔ ایک مرتبہ غریب خانے پر بھی آئے اور دیر تک اپنی صحبت سے لطف اندوز کرتے رہے۔ ان کے عقیدت مند مجھ سے ملنے کے لیے روکتے تھے تو جواب دیتے تھے کہ میرے عرشی کے ساتھ خاص تعلقات ہیں جنہیں تم نہیں جانتے۔

وہ تعلقات ادبی تھے جن میں مذہبی فروعی اختلافات کو مائل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ بعض دفعہ ان سے گفتگوں اور پہروں ادبی صحبتیں رہتیں، جس انداز سے وہ اچھے شعر کی داد دیتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شعر زمین سے اٹھ کر آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ ان کے ساتھ مل کر شبِ دیگ اور ہریے کی دعوتیں بھی کھائیں۔ انوارِ نعمت سے زیادہ لطف ان کی صحبت کا ہوتا تھا۔ خواجہ عبدالکریم نانک رحمتہ اللہ علیہ یاد آتے ہیں۔ ایسی مجلس باقاعدہ ہر سال ان کے دولت کدہ پر ہوتی تھی۔ اور کبھی صوفی تبسم کے ہاں۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں اپنے چند تازہ شعر سنائے۔ بہت متاثر ہوئے۔ اور اسی وقت اپنی بیاض میں لقل کر لئے۔ جن کی بیاض بہترین منتجب اشعار پر مشتمل تھی۔ کاش وہ حوادث سے بچ گئی ہوتی اور اشاعت پزیر ہو سکتی۔

مجھے اس وقت اپنے ان شعروں میں سے صرف ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ باقی دوسری چیزوں کے ساتھ نذرِ حوادث ہو گئے

بجز از اسم در مسیٰ  
حرف و لفظ و کتاب را بگزار (۱)

ان کی آخری حالت سے متاثر ہو کر میں نے جو شعر کہا تھا وہ حاضر خدمت ہے۔

برق و رعد آسودہ بستر شدہ  
شعلہ جو الہ خاکستر شدہ

میں عیادت کو گیا تو مولانا بہاء الحق قاسمی پہلے سے وہاں موجود تھے، انہوں نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ آپ ان کو پہچانتے ہیں؟ نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر کہا گیا کہ یہ عرشی ہیں۔ اس پر بھی انہوں نے لاعلمی ظاہر

کی۔ زبان کام نہیں کر رہی تھی۔ آہ: وہ لالوڈ اسپیکر سے بے نیاز پھروں گونجنے والی زبان۔ تقسیم ملک کے بعد مجھے ان سے ملاقات کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس طویل فصل کے ساتھ مرض کی شدت نے حلقے کو بھی متاثر کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔ (انانند وانا الیہ راجعون)!

(۱)

بی خم و جام نشہ نی ہم بہت  
خم و جام و شراب را بگزار  
بی نی و چنگ نغمہ نی ہم بہت  
نے و چنگ و رہاب را بگزار  
بند از اسم در مسی رو  
حرف و لفظ و کتاب را بگزار!  
(از نقش ہائے رنگ رنگ ص ۱۳۱)



ہے شریعت کا امیر، اور ہے طریقت کا سفیر

راستہ جس نے دکھایا ہے ہمیں اللہ کا  
ہم سمجھتے ہیں اسے نائب رسول اللہ کا  
ہے شریعت کا امیر اور ہے طریقت کا سفیر  
جس طرف جانا ہو، دانا ہے یہ ہر اک راہ کا  
جس نے سلائی ہے چُنڈیا قادیانی دجل کی  
فرق سمجھایا ہے جس نے کوہ کا اور کاہ کا  
نو کروڑ اسلامیان ہند کے قائد ہیں یہ  
دم بھریں کیونکہ نہ ہم سید عطاء اللہ کا  
(علامہ طالوت رحمۃ اللہ علیہ)

## ”وہ عمر رفتہ کی چند گھڑیاں جو ان کی سمیت میں کٹ گئی ہیں“

(حضرت امیر شریعت کے مدوح و مداح..... علامہ عرشی امرتسری سے ایک یادگار ملاقات کا تذکرہ)

علامہ محمد حسین عرشی امرتسری (۱۹۸۵ء..... ۱۹۹۳ء) حضرت امیر شریعت کے ہم عصر بھی تھے، ہم عمر بھی، ہم نوا بھی، ہم نہیں بھی اور ہمدم دیرینہ بھی! ایام شباب کی یکجائی اور مغل آرائی، عمر بھر کے تعلق خاطر پر منتج ہوئی۔

عرشی..... ہفت زبان تھے۔ محقق و نقاد تھے۔ ادیب و فلسفی تھے اور کسی حد تک..... مفسر قرآن اور عالم دین بھی۔ وہ ”اہل قرآن“ تھے، لیکن نیبری، منکر حدیث یا متجدد نہیں تھے۔ علامہ اقبال سے ان کی نیاز مندی ایسی تھی جیسے دوستی بھی کہنا چاہتا ہے۔ مولانا حسین علی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (تلمیذ شیخ الحدیث محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ) سے باقاعدہ بیعت کا تعلق تھا۔

عرشی کی تالیفات و تصانیف کی تعداد سولہ تک پہنچتی ہے۔ اور یہ کوئی معمولی تعداد نہیں۔ بعض جریدوں اور مجلوں کے لئے ان کی ادارتی خدمات اور سرکردہ اشاعتوں کی تدوین اس کے علاوہ ہے۔ ان کی فارسی، اردو اور پنجابی شاعری بلاشبہ اپنے رنگ میں بہت منفرد اور اپنے اسلوب میں بہت جھلکا ہے۔ حکیمانہ بھی، عارفانہ بھی اور عاشقانہ بھی! زندہ رہنے اور یاد رہنے والی شاعری۔

۲۵ جنوری ۱۹۷۵ء کو لاہور کے سفر میں، محترم حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے مطب میں ملاقات کے لئے جانا ہوا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے ہمیشہ کی طرح مختلف موضوعات پر گفتگو کا آغاز ہو گیا۔ مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی ایک میٹنگ اور اس کے احوال واقعی کا تذکرہ کر رہا تھا کہ ایک صاحب..... منہنی مگر صحت مند وجود، سادہ سا لباس، چہرہ پر لمکی، لمکی ڈاڑھی، کپڑے کی ایک پوٹلی سی ہاتھ میں تھا۔ ایک گوشہ میں آکر فروکش ہوئے۔

میری گفتگو میں مغل ہوئے بغیر ہی حکیم محمد موسیٰ صاحب کو ایک کارڈ پڑھنے کے لئے دے کر بے نیاز ہو کر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب کارڈ نا مکمل چھوڑ کے میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ شاید آپ کا ان بزرگوار سے تعارف نہیں۔ ابھی یہ الفاظ انہوں نے ادا ہی کئے تھے کہ میں نے کہا عرشی صاحب! میں اٹھ کے بڑے تپاک سے بغل گیر ہو گیا۔ اپنا نام عرض کیا تو برہمی شفقت و محبت سے مجھے سینہ سے چمکایا۔ عرشی صاحب سے کوئی تیرہ برس قبل دوران سفر ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی سرسری سی۔ میرے چہرے کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے۔

جب میں نے شاہ صاحب کو پہلی مرتبہ دیکھا تو بالکل بے ریش تھے اور بغل میں چند کتابیں لئے پڑھنے کے لئے جا رہے تھے۔

اتنا فرمایا..... اور پھر سوچ کی نگہ انہوں میں کھو گئے۔ بہت دیر تک یہ افسردہ سا سکوت طاری رہا۔ پھر عرشی نے امرتسری کی یادگار مغلوں کا ذکر چھیڑ دیا کہ..... میں اور شاہ صاحب اکثر مغل شعر و ادب میں اکٹھے ہوتے تھے۔ حافظ جالندھری کا وہ دور اول تھا اور وہ اپنا کلام لہک لہک کے سنایا کرتے تھے۔ سراج نظامی، جوڈا کٹر تاثیر کے بہت قریب تھے، خوش رو اور خوش گو تھے میری ایک غزل گایا کرتے تھے اس کا ایک شعر یاد ہے۔

کعبہ و دیر بے نصیب ماندہ و سنگ در گئے

دولت سجدہ یافتہ از سر پر غرور من

پھر حافظ کی کمزوری کا اظہار فرمانے لگے۔ اس پر ایک بڑا عجیب و غریب واقعہ سنایا کہ میرا ایک ہی بیٹا تھا جو پھٹپھٹے میں انکسٹال کر گیا۔ محمد سعید نام تھا اس کا۔ اس کی بیماری کے دنوں میں بہت پریشان و مضطرب تھا تو ایک شعر کہا مگر وہ حافظ سے مومن ہو گیا۔ اسٹریٹج عبداللہ امر کسری لے تو انہوں نے وہی شعر سنایا۔ میں نے داد دی اور پوچھا۔۔۔ یہ شعر کس کا ہے تو انہوں نے کہا آپ کا ہے! وہ شعر یہ ہے۔

یا رب سعید من کہ نعمت است جان او

چند استخوان من از استخوان او

گفت گو کار خدائے کے لئے میں نے ایک سوال کیا کہ عرشی صاحب! آپ بھی "اہل قرآن" ہیں اور غلام احمد پرویز بھی "اہل قرآن" کہلاتا ہے۔ اُس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اب ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ کیا بلیغ تبصرہ فرمایا۔ کہنے لگے۔

"میرا خیال ہے اگر شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ قرآن کا عربی ترجمہ کیا جائے تو

عبارت قرآن کے قریب قریب ہو جائیگی اور جو "مضمون القرآن" پرویز لکھ رہا ہے۔ اسکی عربی کجائے تو کوئی اور ہی کتاب تیار ہو جائیگی۔"

اس پر ایک قلم بلند ہوا اور پرویز تہ فضا میں تحلیل ہو گئی۔ میں نے جب طبیعت کچھ بحال دیکھی تو پھر امر کسری کی مجالس شعر و ادب کا ذکر جمیر دیا اور پوچھا کہ عرشی صاحب! آپ کی مجالس میں شوق اندرابی نام کے کوئی صاحب تھے؟ تو انہوں نے یاد نہ ہونے کا اظہار کیا میں نے سید محمد مقیم شاہ صاحب (والد صاحب کے، رشتہ میں چچا) کے حوالہ سے ایک فارسی غزل کا ذکر کیا جو شعری کاشمیری آخر تسلی کی تھی اور مقیم شاہ صاحب کے بقول وہ غزل شوق اندرابی کہ خود بھی شاعر تھے گا کے سنایا کرتے تھے۔ سوچ کر فرمایا کہ ہاں، اس غزل کا ایک شعر یاد آ گیا ہے۔

جالِ دلم بہ دانی ازمن ، بہ دانی ازمن ،

ناگفتہ دانا، ناگفتہ دانا، نہ نوشتہ خوانا، نہ نوشتہ خوانا

مگر غالب اس سے بہت بہتر انداز کہہ گیا ہے۔

حیف کہ من بنوں تہم وز تو سخن رود کہ تو

نالہ بسینہ بگری اشک بدیدہ بشری

اب طبیعت جو حاضر ہوئی تو پھر مسلسل یادوں کے نقوش ابھرتے گئے اور یہ عرشی صفت اشعار میں نے قارئین کی حظِ طبع کے لئے نقل کر لئے ملاحظہ فرمائیے۔

سار      ہاں      ناقد      را      بجانب      نجد  
کز      دروہام      اوغیز      د      وجد

ایں      مایر      کع      القمر      و      الشمس  
ایں      مایسجد      العلّی      والمجد

صدموسی      و      ہزار      صبح      است      زیر      بام

کس      را      گمر      درون      حریم      تو      راہ      نیست  
ان کی شفقت و محبت کا دامن پھیلا ہوا دیکھ کر میں نے عرض کیا کہ میں بھی شعر کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ کو سنانا چاہتا ہوں تاکہ مستند ہو جائے۔ اجازت پا کر، میں نے عرض کیا۔

سو      بار      تجربات      کی      بھٹی      میں      میں      جلا

محبوب      کی      رضا      کی      نہ      گھرائیاں      ملیں

مستاب      کی      جبین      پہ      بھی      آرا      ہے      آدمی

وا حسرتا      کہ      وال      بھی      نہ      رعنائیاں      ملیں

ان دو شعروں پر مجھے بہت تمسین و آفرین تھی اور ساتھ ہی اپنا اور شیخ سعدی کا ایک شعر اسی

مضمون پر سنایا

بماز      بیروی      شیخ      و      برصن      نہ      رسی

ہزار      درود      مازم      زم      است      و      صد گنگ      است

دلے      کہ      عاشق      و      صابر      بود      گمر      سنگ      است

ز عشق      تابہ      صوری      ہزار      فرسنگ      است

میں نے پھر جرأت کی اور عرض کیا کہ تاثیر مرحوم سے حضرت شاہ جی کی آخری ملاقات ہوئی تو تانگہ پہ سوار کرا کے تاثیر نے یہ تین شعر سنائے تھے جو میں نے حضرت شاہ جی سے سنے تھے۔

دل      است      بندہ      احرار      و      جاں      اسیر      فرنگ

نہ      چارہ      ہمہ      صلح      و      نہ      بہرہ      ہمہ      جنگ

میانِ کعبہ و بت خانہ عرصہ یک گام  
 میانِ شیخ و برہمن ہزار ہا فرسنگ  
 نمود سر بسر اظہار و کوہن یک تن  
 ہزار پیکر شیریں فسرد و بزرگ سنگ

سن کے وجد میں آگئے اور سوالیہ انداز میں پوچھا، یہ تاثیر کئے ہیں؟..... "بڑی بات کہہ گیا تاثیر!  
 عجیب آدمی تھا۔" اس کے ساتھ ہی یہ یادگار محفل اختتام پذیر ہوئی۔ عرش فرمانے لگے..... آج شاہ صاحب  
 کی یاد ہمہ جہت تازہ ہو گئی۔

علامہ عرشی کا آٹو گراف..... سید عطاء الحسن بخاری کے لئے

الیں اللہ بکاف عیدہ

گر بہ ریاضی توانی راہ یافت  
 ہر یک شبنم چرا باید شتافت

عرشی

۱۲ - محرم الحرام  
 ۱۳۹۵ھ  
 ۲۵/۱  
 ۷۵

ہفت روزہ "چٹان" ادارہ

ایک ایسا محور، جس کے گرد افراد ہی نہیں محاسن بھی گھومتے تھے۔

تو نظیری زلفک آمدہ بودی چوں مسیح  
باز پس رفتی و کس قدر تو شناخت دربلغ

جی چاہتا ہے آج جی بھر کر رولوں، بالا خروہ بھی رخصت ہو گیا جو اس زمانے میں اللہ کی آیات میں سے  
ایک آیت تھا۔ جس نے مرتے دم تک فقر و استغناء کے پرچم کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جس کی زندگی بہت  
سی زندگیوں کی مجموعہ تھی۔ جس کا وجود ایک تاریخ تھا۔ جو ایک عہد تھا ایک ادارہ تھا۔ ایک انجمن تھا ایک  
تحریک تھا۔ غرض ایک ایسا محور تھا جس کے گرد افراد ہی نہیں محاسن بھی گھومتے تھے۔ وہ اس پائے کا خطیب  
تھا کہ اس کی آتش بیانی کا لوہا اسکے حریف بھی ماننے لگے۔ اردو زبان نے اس مرتبہ کا خطیب نہ کبھی پیدا کیا اور  
نہ آئندہ کبھی کر سکے گی۔

وہ ایک مجاہد عظیم ہے۔ انہوں نے علامۃ کلۃ الحق سے کبھی گریز نہیں کیا۔ ۷۲ برس کی عمر مستعار  
میں انہوں نے ۱۲ سال قید و بند کی صعوبتیں بھیلنے میں بسر کئے اور ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ  
آئی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہیں شائد ان کے ارادوں کی بابت شک رہا ہو۔ مگر انہیں اپنے فیصلوں کے  
بارے میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔ وہ اس مدرسہ فکر کے علمبردار تھے جن کی بنیادیں محمد قاسم نانوتوی اور محمود حسن  
کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی تھیں۔ تمام زندگی ایک ہی مشن رہا کہ برصغیر سے انگریز کی حکومت کیونکر  
ٹکا لی جاسکتی ہے۔ وہ ملی الاعلان کہا کرتے تھے کہ میرے سامنے دو چیزیں ہیں اولاً انگریز کی حکومت یہاں سے  
ختم ہو جائے۔ ثانیاً وہ ختم نہیں ہوتی تو میں اس کے خلاف تبلیغ کرتے کرتے تھمتہ دلیہ پر ٹپک جاؤں۔

پھر ان کا دل عشق رسول ﷺ کی جلوہ گاہ تھا۔ حضور ﷺ کے عشق میں وہ اس قدر سرشار تھے کہ انہوں  
نے اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ ان کا اورटना پھوٹنا ہی عشق تھا۔ اس عشق ہی نے انہیں ختم  
نبوت کے عقیدہ کی حفاظت کا مجاہد بنا دیا۔ پھر جس عشق و ایثار کے ساتھ انہوں نے اس راستے کا سفر کیا اس  
کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ بہت سی غلطیوں کو معاف کرتے رہے مگر دو چیزوں سے نہ وہ کبھی سمجھوتے پر آمادہ  
ہوئے اور اس کے مقابلے میں وہ عفو و درگزر کو پسند کیا کرتے۔

اول..... انگریز کی غلامی اور اس کے گماشتوں کا دوستانہ۔

دوم..... ختم نبوت کے قزاقوں کا تعاقب۔

وہ کہا کرتے تھے میں تو شہ آشخت کے طور پر یہی ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے ساتھ وہ

یہی لے گئے۔

وہ اپنے عہد کے ابوذر غفاری تھے۔ فقر و فاقہ ان کا شعار تھا۔ انہوں نے کبھی کسی تحریک و تنظیم کے قائد

وجہ امت کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ وہ خطاب و ضمیر کی سودا بازی کے بازار سے ہی نا آشنا تھے۔ ان پر زمانے نے بہت سا گرد و غبار پھینکا۔ اور خود فروشوں نے الزامات کے چولے سے چنگاریاں لے کر بارہا ان کی دستار فضیلت پر پھینکیں۔ مگر وہ تہمتوں کے بازار سے لنگریاں کھاتے ہوئے نکل گئے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں سرخرو ہو گئے ہیں۔ انشاء اللہ قیامت کے روز بھی سرخرو ہی اٹھیں گے۔

تذکروں میں ہے کہ جب امام ابن تیمیہ کا جنازہ اٹھا تھا تو پورا شہر انگبار ہو کر نکل آیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی مظلومیت نے لوگوں کے دلوں کو احاطہ کر لیا ہے اور بے چین عوام وقت کی اس عظیم الشان دولت کو آخری خراج ادا کرنے کے لئے جمع ہو گئے ہیں۔

شاہ جی کا جنازہ بھی اسی دھوم دھام سے اٹھا۔ ایک انسان جو عمر بھر مہاجر رہا اور جب امر سر سے مہاجرت کر کے ملتان میں پنہاں ہو گیا تو ایک کچا مکان کرائے پر لے کر بارہ برس اس میں رہا۔ آخر وہیں اس کی روح نے قفسِ عنصری سے پرواز کیا۔ وہیں سے اس کا جنازہ اٹھا۔ لیکن فقیر کا جنازہ شاہوں کے جنازے کو مات دے گیا۔ ایک شخص جو بالطبع فقیر تھا۔ جس کے دامن میں اللہ کے خوف اور رسول ﷺ کے عشق کے سوا کچھ نہ تھا۔ جس کو ہمیشہ زنجیروں نے سلام کیا۔ جس کا سیم وزر کے بت خانوں میں ذکر تک مفقود رہا۔ جس نے ایک لفظ کے لئے بھی اخباروں اور کتابوں کے صفحوں میں اپنا نام ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ جو آخر تک چائی پر بیٹھا، لیٹا اور سوتا رہا۔ جو اس مقام میں بھی رسول ﷺ کی زندگی کی عکس تھا اور جب اس نے داعیِ اجل کو لبیک کہا تو ایک اور ڈیڑھ لاکھ کے درمیان لوگ انگبار چہروں کے ساتھ اس کی میت کے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں ایک تہائی لوگ دعا پڑھ رہے تھے۔ لوگوں نے سینے پیٹ لئے۔ کیا اس فقیر نے یہ آنسو خریدے تھے؟ وہ تو شاید دوسرے وقت کی روٹی خریدنے پر بھی قادر نہ تھا۔

یہ سب کچھ اس کی بے غرضی اور بے نفسی کا صلہ تھا۔ وہ اگر لاہور، لاکپور، گوجرانہلہ، سیالکوٹ میں رحلت فرماتے تو ہجوم کئی لاکھ تک پہنچ جاتا۔ لیکن دور افتادہ اور پسماندہ ملتان میں بھی ان کا ماتم اس شدت سے کیا گیا کہ ملتان کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں۔ ہم نے اپنے اس وطن عزیز میں بہت سے جنازے دیکھے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے علماء اور فضلا آغوشِ لہ میں اتارے گئے۔ لیکن شاہ جی کی میت کے گرد عشاقِ کجاو ہجوم تھا اور لوگوں نے جس بے احتیاری کے ساتھ ان کا ماتم کیا۔ فقرا و علماء کی پوری صفِ اس سے خالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحبِ داغوں اور دلوں کے حکمران تھے۔ اپنی بے سرو سامانی کے باوجود انہیں اس اقلیم میں جو وقار اور اقتدار حاصل تھا۔ اس کا اقرار و اعتراف ہر جگہ موجود ہے۔ پاکستان میں وہ ایک ہی شخص تھے جو سیاسی اقتدار، جماعتی رفاقت اور تنظیمی خطوط کے بغیر اپنی ذات میں ایسا جادو رکھتے تھے کہ لوگ سر دینے کے لئے تیار ہو جاتے۔ ان کے فدا نیوں کا قبیلہ ملک کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔ ان کے اٹھ جانے سے جو غلہ پیدا ہو گیا وہ کبھی پر نہ ہو گا۔ خطابتِ بیوہ ہو گئی۔ لوگ کبھی اس طرف سے گزریں گے جہاں شاہ جی



گرجتے اور گونجتے رہے ہیں تو دلوں سے ہوک اٹھا کرے گی کہ یہاں کبھی وہ مرد مجاہد مصر پر آشوب راتوں میں اپنا چراغ جلایا کرتا تھا جس کی نوپیر اسیوں پر قیاس ہوتا تھا کہ قرون اولیٰ کا کوئی غزوہ نقاب اُٹھ کر سامنے آگیا ہے یا پھر لوگ غار حرا کے ارد گرد کھڑے ہیں۔ قرآن اتر رہا ہے اور قند و نہات کی طرح گھلتا ہوا کانوں کے راستے سے دلوں کی انگوٹھی میں نگینے کی طرح بیٹھتا چلا جا رہا ہے لیکن اب وہ رعنائی خیال کہاں؟  
(شورش کاشمیری)



روزنامہ "جنگ" کراچی، تعزیتی شذرہ

## ملک کی تاریخ انہیں کبھی نہیں بھلا سکتی

ممتاز احرار لیڈر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات حسرت آیات کی اطلاع کو ملک کے صرف مذہبی حلقے میں ہی نہیں قومی حلقوں میں بھی بڑے رنج و غم اور بڑے افسوس و حد سے کے ساتھ سنا جائے گا۔ امیر شریعت گزشتہ چار سال سے برابر علیل چلے آ رہے تھے۔ ان کے آخری ایام جن الناک اور اندوہناک مشکلات میں گزرے وہ اپنی جگہ ایک الناک داستان سید عطاء اللہ شاہ بخاری جن کا ۷۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ اس پورے برصغیر کی ممتاز اور محترم شخصیت کی حیثیت سے لاکھوں انسانوں کی محبت اور عقیدت کا مرکز رہے۔ وہ ایک جادو بیاں مقرر اور برصغیر کی تاریخ کے سب سے زیادہ موثر خطیبوں میں شامل تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ساری عمر قومی خدمت میں گزری۔ پندرہ سال تک قید و غم میں رہے اور سامراجی طاقت کے ساتھ لڑنے میں اپنا تن من دھن لٹاتے رہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ ایک مخلص، دیانتدار، اصول پرست اور عوام دوست رہنما کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔ حق یہ ہے کہ ایک عظیم شخصیت تھی جو ہم سے جدا ہو گئی۔ ایک مخلص رہنما سے یہ قوم محروم ہو گئی لیکن ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اور انہوں نے قوم کو آزاد کرنے اور ملک کو ترقی کے منازل تک پہنچانے کے لئے جو کام کیا ہے وہ دوسروں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے گا۔ ان کی جماعت مجلس احرار نے آزادی سے پہلے جس خلوص اور جذبہ سے کام کیا وہ برصغیر کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا اور اسے اس ملک کی تاریخ کبھی نہیں بھلا سکتی۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو اعلیٰ علین نہیں جگہ دے اور اس قوم کے نوجوانوں میں وہ خلوص و جذبہ اور وہ کردار پیدا کرے جس کا مظاہرہ اس مجاہد نے عمر بھر کیا۔

## حرف عقیدت

جو مخلصین و مبین بانی احرار حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ ان کے لئے یہ بے حد باعث زیادتی ایمان و عمل ثابت ہوگا کہ وہ اپنے وقت کے عظیم خطیب، بے مدیل بہادر اور لامثال مربی نبی کریم ﷺ کی ذات ستودہ صفات اور محافظ عقیدہ ختم نبوت کا ذکر خیر پڑھیں گے۔ اس کے مطالعہ کرنے سے جذبہ خلوص ایمانی اور عقیدہ دینی اسلام کے ساتھ والہانہ عقیدت مستحکم ہوگی جیسے پھولوں کی نیکت اور خوشبو سے دل و دماغ معطر اور شگفتہ ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا کے خاص مقبول و برگزیدہ انسانوں کی سیرت و عمل کردار کے پڑھنے سے انسان کی روح مستفید و محفوظ ہوتی ہے اور اس سے جذبہ عمل میں اضافہ ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے یارانِ عقیدت و محبت کے متعلق خود خالق کون و مکان نے شہادت دی  
اشداء علی الکفار رحماء بینہم۔

لہذا آپ ﷺ کی امت جس کو خیر الامم کہا گیا اس میں جو لوگ نبوت و صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نور عقیدت اور حسن اعمال سے مستفیض ہوتے ہیں ان میں بھی اس شان کا پایا جانا لازمی ہے۔ میرے حضرت امیر شریعت میں دونوں باتیں کہ کفار کے افراد سے نفرت کاملہ اور سرکارِ دو عالم کے قدسیوں کے ساتھ مخلصانہ والہانہ محبت و الفت تھی۔ لہذا اس سے بہتر مسلمان کے لئے کیا تمذعہ عقیدت و اخلاص ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے مجاہدِ اعظم حضرت بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے ذکر خیر سے آج پھر بہرہ ور ہو رہے ہیں اور افرادِ قوم کے لئے یہی واحد ذریعہ ہے کہ مسلمان نبی اکرم ﷺ کی صفات کے قریب اور حضور پر نور کے برکات و فیوضات سے مستفیض و منور ہوں اور وہ خدا کے خاص بندے کی سیرت و اعمال کو پڑھ کر استقامت و دیانت کی شاہراہ پر گامزن رہیں اور اسی کی جہاد و تحفظ کے لئے جان دے دیں۔ کسی نے کیا ہی خوب کہا:

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں  
آدمی آدمی بناتے ہیں

مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں اور نہ ہی اس میں مبالغہ ہے کہ حضرت بخاری قدس سرہ نے اپنے وقت کے ساتھیوں اور مخلصوں سے محبت کی ہے اس میں راقم الحروف کو جو مقام اور مرتبہ حاصل ہے وہ بھی بے مدیل و لامثال ہے اور مجھ فقیر کے لئے باعث ناز ہے کہ راقم کو جو قرب بخاری حاصل ہوا تھا اور ان کے گھر کے تمام افراد یعنی بخاری صاحب کی اہلیہ محترمہ (جنہیں میں اپنی اماں کہتا ہوں) اور فرزند ان ارجمند کے قلوب میں بھی میرے متعلق وہی جذبہ محبت ہے اور سبھی میری عاقبت کے دعا گو ہیں۔ میری گودِ عقیدت انہیں موتیوں سے بھر پور معمور ہے جو ان شاء اللہ تعالیٰ عاقبت میں میرے کام آئیں گے۔

## دیوانے یاد آتے ہیں

### لاہور کی آخری جیل کے آخری قیدیوں کی سرگزشت

حضرت مولانا محمد الحسینی مدظلہ ایک کمزور مثنیٰ، قہر عالم دین اور وسیع الطرف شخصیت کے مالک ہیں۔ ماضی میں وہ مجلس احرار اسلام کے سرگرم رہنما رہے ہیں۔ مجلس احرار کے ترجمان روزنامہ آزاد اور روزنامہ نوائے پاکستان (لاہور)، ہفت روزہ ساربان لاہور اور ہفت روزہ خدام الدین لاہور کے ایڈیٹر رہے ہیں اور سر روزہ مستقبل ملتان کے ادارہ تحریر میں بھی شامل رہے ہیں۔ آجکل فیصل آباد سے "صوت الاسلام" کے نام سے ایک ماہنامہ شائع کر رہے ہیں۔ زیر نظر مضمون دراصل تحریک تحفظ ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے ایام اسیری کی سرگزشت ہے۔ اس میں تحریک کے مرکزی رہنماؤں کے حوالے سے اُن کی خوب صورت یادیں ہیں۔ جو حقیقتاً ہماری تاریخ کا سرمایہ ہیں۔ مولانا کا وجود ایسی بے شمار یادوں کا ذخیرہ ہے اگر وہ اس موضوع پر مسلسل لکھیں تو تاریخ کے ان گنت خفیہ گوشے منظر عام پر آسکتے ہیں ہم مولانا کے کھر گراہ میں کہ ہماری خواہش پر ذیل کا مضمون انہوں نے خاص طور پر تیب کے لئے لکھا۔ (مدیر)

اللہ تعالیٰ نے امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو بہت سی خوبیوں اور محاسن سے نوازا تھا۔ برصغیر پاک و ہند ہی نہیں غالباً پورے کردار ارضی پر اردو زبان کا سر طراز خلیف اور وجد آفریں قاری قرآن ان جیسا موجود نہ تھا۔

اردو، پنجابی میں ان کے خطاب کے جادو سے وہی صبح طور پر واقف ہیں جنہوں نے سنت گرم اور ٹھنڈی سرد راتوں میں اذانِ فربنگ سر اپا گوش بر آواز ان کی خطابت کی معرکہ آرائی کا مشاہدہ کیا ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بیان و خطاب کی سر آفرینی اور اثر خیزی کیا تھی درحقیقت افصح العرب والعمم علیہم السلام کی آلالِ سادات کے خونی اثر کی جلوہ نمائی تھی، آپ کی شخصیت سید ولد آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد

"وان من البیاب لسحراً"

کا پورا مصداق اور آئینہ دار تھی۔

آپ کی خطابت تو اکثر موضوع سن رہتی ہے لیکن امیرِ شریعت کی کتاب حیات کے بعض اوراق ایسے بھی ہیں جو ابھی تک لوگوں کے مطالعے میں نہیں آئے ہیں۔ آج اسی کی ورق گردانی ہے۔ اور وہ یہ کہ جن دنوں ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت پورے شباب پر تھی، سارا ملک مسلم لیگ حکومت کی قادیانیت نوازی کے خلاف سر اپا احتجاج بن چکا تھا، ہڑتالوں اور احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ دراز اور ملک گیر ہو رہا تھا۔ تمام دینی سیاسی جماعتیں شانہ بشانہ اور ہمدرد تھیں، دوسری طرف پنجاب مسلم لیگ کی مجلسِ عالمہ کی طرف سے مطالبات کی تائید میں قرارداد منظور کر لینے کے باوجود اسکی حکومت انگریز کے خود کاشتہ پودے کی حفاظت

پر کمر بستہ تھی۔ اس تحریک کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ ٹیلیگراف، ٹیلیفون، ریلوے کے محکموں اور سول سکرٹیریٹ لاہور میں پہلی مرتبہ ہر شمال ہوئی تھی۔

تحریک تحفظ ختم نبوت کے مطالبات واضح تھے، علامہ اقبال کی تحریک اور تجویز کے مطابق قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ناموس رسالت ﷺ کا تحفظ، اور حکومت پاکستان کی وزارت خارجہ کا فرض منصبی ادا کرنے کے بجائے سرکاری خرچ پر قادیانیت کی تبلیغ کرنے اور مختلف ممالک میں قادیانی جماعت کے دفاتر قائم کرنے کی مہم کا امداد کرنے کے لئے قادیانی وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں کی وزارت سے طعیدگی اس کا مقصد تھا۔

مسلم لیگی حکمرانوں نے مطالبات تسلیم کرنے کے بجائے ناموس رسالت ﷺ کے تحفظ کی خاطر تحریک میں حصہ لینے والوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے، چوک داگلراں اور چوک دہلی دروازہ لاہور، چوک بازار ملتان مسجد پھول ہٹ اور مسجد ولی محمد اور سیالکوٹ، لائل پور (فیصل آباد) وغیرہ کئی شہروں میں ناموس رسالت ﷺ کے محافظوں کو خاک اور خون میں ترپا دیا گیا تھا۔

کئی لاکھ فرزندان اسلام اور عشاق رسول ﷺ پس دیوار زنداں کر دیئے گئے تھے، جیل خانوں کے احاطے قیدیوں سے بھر گئے تو خاردار تاریں بچھا کر قید خانے بنائے گئے اور ان میں عقیدہ ختم نبوت کی بابت اپنا ایمان ظاہر کرنے والوں اور حضور خاتم الانبیاء ﷺ کی ذات اقدس کو اللہ کا آخری نبی و رسول ﷺ تسلیم کرنے والے پابند سلاسل کر دیئے گئے تھے۔

یہ تحریک کسی ایک دینی یا سیاسی جماعت کی جانب سے نہ تھی بلکہ تمام مکاتب فکر، دیوبندی، بریلوی، اجدیث، اور مشائخ حضرات کے نمائندوں پر مشتمل ایک مجلس عمل کی تحریک تھی، للہ تعالیٰ مجلس احرار اسلام اس تحریک کی داعی جماعت تھی اور اسی کی کوششوں سے یہ مجلس عمل معرض وجود میں آئی تھی۔ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری خطیب مسجد وزیر خاں لاہور اس مجلس عمل کے سربراہ تھے، تحریک تحفظ ختم نبوت کی مجلس عمل کی جانب سے ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء مطالبات تسلیم کرنے کے لئے حکومت کو آخری تاریخ کا نوٹس دیا گیا تھا۔ حکومت نے مطالبات تسلیم کرنے یا اس سلسلے میں مذاکرات کرنے کے بجائے ۲۸ فروری کو مجلس عملی کے تمام قائدین کو کراچی میں گرفتار کر لیا، ان میں صدر مجلس عمل مولانا ابوالحسنات، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا عبدالغلام بدایونی صدر جمیعت علماء پاکستان، ماسٹر تاج الدین انصاری صدر مجلس احرار اسلام پاکستان، صاحبزادہ سید فیض الحسن سجادہ نشین آکوہار شریف، مرکزی مبلغ ختم نبوت مولانا لال حسین اختر، اور سید مظفر علی شمس جنرل سیکرٹیری تحفظ حقوق شیعہ پاکستان اور دیگر شخصیات شامل تھیں۔

اسی تاریخ کو رات گیارہ بجے تحریک تحفظ ختم نبوت کے ترجمان روزنامہ آزاد لاہور اور اس تحریک کی

تائید و حمایت کرنے کی پاداش میں مولانا غفر علی خاں کی زیر ادا رت موثر روزنامہ زمیندار لاہور کی اشاعت ایک ایک سال کے لئے حکومت پنجاب نے ممنوع قرار دیدی تھی۔ اور روزنامہ آزاد کا ایڈیٹر ہونے کے جرم میں راقم الحروف کو گرفتار کر کے جیل خانے میں نظر بند کر دیا تھا۔

مجھے ایک ماہ مظفر گڑھ جیل میں رکھا گیا، سالار معراج الدین سالار جیوش احرار اسلام پاکستان میرے رفیق جیل خانہ تھے ایک ماہ بعد انہیں ڈیرہ غازی اور مجھے لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا اور وہاں کے سیاست خانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں محبوس کیا گیا تھا۔ میرے ساتھ کی کوٹھڑی میں مولانا محمد اسماعیل سلفی ناظم اعلیٰ جمعیت اہلحدیث پاکستان اور مولانا غلام محمد ترنم خطیب جامع مسجد سول سیکرٹریٹ حکومت پنجاب لاہور مظفر گڑھ کے حکیم نور محمد اور سٹی مسلم لیگ کے رہنما مظفر علی حصاروی اور دیگر حضرات پابند کر دیئے گئے تھے۔ یاد رہے کہ سیاست خانے میں ہمیں مرزائی آئی جی جیل خانہ جات کرنل بشیر جمیل کے حکم سے رکھا گیا تھا۔ میری کوٹھڑی کے مقابل ”شوکت ڈاکو“ قید تھا۔ اسے روزانہ مار مار کر ادھ موا کیا جاتا تھا۔ وہ کیوں ڈاکو بنا؟ (اسکی کفاحیل پھر بیان ہو چکی انشاء اللہ)

بہر نوع ایک ماہ بعد سیاست خانے سے ہم کیس وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ وارڈ تحریک آزادی کے مشہور رہنماؤں بگت سنگھ اور دت کی یاد میں متحدہ پنجاب کے وزیر مجیم سہین سپر نے تعمیر کرایا تھا۔ جنہیں اسمبلی ہال میں ہم پھینکنے کے الزام میں گرفتار کر کے اس جگہ رکھا گیا تھا۔ اس وارڈ میں پاکستان کی عظیم شخصیات موجود تھیں، جن میں شیخ انصاری مولانا احمد علی امیر انجمن خدام الدین لاہور، نامور مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی نائب امیر جماعت اسلامی، میاں محمد طفیل قیّم جماعت اسلامی، نعیم صدیقی ایڈیٹر ترجمان القرآن لاہور اور مولانا کوثر نیازی (جماعت اسلامی) کے اسماء گرامی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ حضرت شیخ لاہوری کے ساتھ راقم الحروف کو جیل میں رفاقت اور اکتساب فیض کا شرف حاصل ہوا، ہفت روزہ خدام الدین کے اجراء کا فیصلہ بھی اسی دوران جیل خانے میں ہوا تھا۔

حضرت شیخ لاہوری کی صحت طبعی عمر کے کھانسنے کے علاوہ ملتان جیل میں حکومت کے کارندوں کی معرفت مینڈ ”زہر خورانی“ سے بھی نہایت خراب تھی مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے بھی ربائی کے بعد اس سازش کا ذکر کیا تھا کہ حضرت کے ساتھ مجھے بھی ”زہر“ سے ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر مارنے والے سے بچانے والی ذات قویٰ تر ہے۔

بہر نوع حضرت شیخ لاہوری کی بابت ان کے ”مینڈ“ مرید ملک فیروز خاں نون وزیر اعلیٰ پنجاب کو ان کی خرابی صحت اور سنت طاعت کا پتہ چلا تو ان کی ربائی کے فوری طور پر احکام جاری کر دیئے گئے تھے۔ بعد ازاں شیخ حسام الدین جنرل سکریٹری مجلس احرار اسلام پاکستان کو گرفتار کر کے جب لاہور سنٹرل

جیل میں لایا گیا تو انہوں نے جیل کے عملے سے تحریک کے قیدیوں کی بابت معلومات حاصل کیں کہ کون کس وارڈ میں مہبوس ہے۔

اسیران تحریک کی خاصی تعداد چونکہ ہم کیس وارڈ میں موجود تھی ان میں سے جب میرا نام لیا گیا تو شیخ صاحب نے کہا کہ ہم دونوں کو جیل کے کسی وارڈ میں اکٹھا کر دیا جائے۔ چنانچہ ہمیں دیوانی احاطے میں منتقل کر دیا گیا دیوانی احاطے میں قبل ازیں سرخوش رہنما، الغفار نان، فیض احمد فیض اور سید سبط حسن مہبوس تھے۔

تحریک کی مقبولیت اور ہمہ گیری کے باعث گرفتار شدگان کی تعداد روز افزوں تھی جیل کے احاطے تنگ ہو گئے تھے۔ ان تینوں حضرات کو مختلف جیلوں میں منتقل کر دیا گیا۔ دیوانی احاطے میں دیوانی مقدمات کے قیدی رکھے جاتے تھے اس میں جیل کے روایتی انداز میں سلاخوں کا وجود نہ تھا بلکہ دیہات کے کھلے ماحول میں آبادی کی مانند اس کے درمیان میں کھرے تعمیر تھے اور ان کے ارد گرد کی جگہ میں روشیں بنا کر گارڈ کیا گیا دیا گیا تھا، گروڈ میں سایہ دار درخت بھی موجود تھے، ہم نے دیوانی احاطے میں قدم رکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ”قد آور مرغ“ ٹہل رہا ہے۔ اور کھرے کے اندر سامنے دیوار کے ساتھ انجیروں کی ایک قریع نما لڑھی لٹک رہی تھی، ارباب جین سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دونوں عبدالغفار خاں کی امانت ہیں چند روز تک انہیں پہنچا دی جائیں گی۔ ادھر حالات پنجاب کی عدالتی تحقیقات کا آغاز ہو چکا تھا تحقیقاتی کمیشن کی طرف سے مختلف جماعتوں کو اپنا اپنا موقف پیش کرنے کو کہا گیا تو اس بناء پر مختلف جیلوں میں نظر بند قائدین تحریک کو لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس پر احرار رہنما مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد حیات فاتح قادیان، مولانا محمد شریف جالندھری اور ملک عبدالغفور انوری ملتان سے بارے احاطے میں پہنچا دیئے گئے تھے۔

تحریک کے مرکزی قائدین کراچی سنٹرل جیل سے چونکہ حیدر آباد اور سکھر کی جیلوں میں منتقل کر دیئے گئے تھے اس لئے انہیں بچا کرنے میں غیر معمولی تاخیر سے کام لیا گیا۔ ادھر تحقیقاتی کمیشن کی جانب سے شدید تقاضا ہونے لگا کہ تحریک کے ”روح رواں“ اور مرکزی قائدین کی لاہور میں غیر موجودگی سے تحقیقات کا نظام متاثر ہو رہا ہے لہذا تمام رہنماؤں کو بلا تاخیر لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا جائے۔

ان شخصیات کی تشریف آوری سے قبل ایک شب نماز عشاء کے بعد ہمارے احاطے میں ایک نیا قیدی لایا گیا۔ جیل کے افسر نے تعارف کرایا کہ یہ مشہود ادیب اور علمی شخصیت ”سید سبط حسن“ ہیں۔ ان کے نام سے تو متعارف تھا اور مختلف ادبی رسائل میں ان کے مضامین بھی نگاہ سے گزر چکے تھے۔ بالمشافہ ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔

شیخ حسام الدین صاحب اور راقم نے ان کا بڑی گرموشی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل امتیاز حسین نقوی صاحب ان دنوں مجھ سے قرآن کریم مع ترجمہ پڑھ رہے تھے، انہوں نے خصوصی

اختیارات اور احترام استاد کے تمت ہمیں چار پائیاں فراہم کر دی تھیں، سبط حسن صاحب چونکہ عشاء کے بعد آئے تھے صابلی کے مطابق ان کا بستر زمین پر بچا جانا تھا۔

میں نے سوچا یہ نامور ترقی پسند ادیب اور ممتاز علمی شخصیت ہیں آج اگر صرف یہی اکیلے زمین کے فرش پر سوئے اور ان کی موجودگی میں ہم چار پائیاں پر مواستراحت رہے تو دوسری حلقے اور علماء کے خلاف انہی نفرت میں زبردست شدت آجائے گی۔ چنانچہ میں نے اپنے مشتقی فتح دین صاحب سے کہا کہ میرا بستر تو زمین پر بچا دیا جائے اور میری چار پائی پر سبط حسن صاحب کا بستر! لیٹنے سے قبل سبط حسن صاحب کی نگاہ میرے بستر پر پڑی تو دریافت کیا کہ آپ یہاں پتیتی زمین پر لیٹے کیوں لیٹے ہیں؟ یہ تو مناسب نہیں ہے۔ میں نے کہا۔ میری کمر میں کچھ ٹکلیف رہتی ہے اس لئے زمین پر لیٹنے میں سکون ملتا ہے۔

میری اس توجیہ سے وہ پورے مطمئن نظر نہ آتے تھے۔ "اچھا جی"..... کہا اور اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔!

صبح کو سبط صاحب نے مجھے بتایا کہ اس مشتقی نے مجھے آپ کے زمین پر لیٹنے اور مجھے چار پائی عطا کرنے کی ساری تفصیلات بتادی ہیں۔ آپ کے اس اخلاق و محبت سے میں بہت متاثر ہوا ہوں، میں جذبات شکر نوک زباں پر لا کر اسکی خوشبو فضا میں تحلیل کرنا نہیں چاہتا۔

بہر نوع۔ یہ طرز عمل اور معمولی اخلاقی مظاہرہ سبط حسن کے ساتھ گھرنے روابط کا موجب بن گیا۔ اسی اثناء میں مشہور لنگی رہنماء عطاء اللہ جانیایں بھی سٹر ممتاز دولتانہ وزیر اعلیٰ پنجاب کی مخالفت کی پاداش میں گرفتار ہو کر ہمارے ہی دیوانی احاطے میں لائے گئے۔ چند روز بعد ڈپٹی سپرٹنڈنٹ جیل نے خوشخبری سنائی کہ سکھر جیل سے مرکزی قاعدین آج لاہور جیل کے اسی احاطے میں لائے جا رہے ہیں۔ ۲۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو ۱۱ بجے صبح امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر مجلس عمل، اور سید مظفر علی شمسی سکھر جیل سے اور ۲ جولائی کو ماسٹر تاج الدین انصاری صدر مجلس احرار اسلام پاکستان، مولانا عبدالحامد بدایونی صدر جمیعت علماء پاکستان اور صاحبزادہ سید فیض الحسن سجادہ نشین آکوہار شریعت حیدر آباد جیل سے یہاں تشریف لائے۔

لاہور سٹرل جیل میں ان عظیم المرتبہ اور جلیل القدر شخصیات کا اجتماع تاریخی نوعیت کا تھا۔ مختلف مکاتب فکر کے دینی اور ملی رہنماؤں کی اتنی برسی تعداد کو شاید ہی قبل ازیں یکجا ہو کر پیش آمدہ مسائل پر اجتماعی فکر و تدبر کا موقع ملا ہو۔ سبط حسن صاحب کو تحریک سے اگرچہ کوئی دلچسپی نہ تھی مگر ہماری شب و روز کی مصروفیات، باجماعت نمازوں کی یکجا ادائیگی (کیونکہ باہر تو باجماعت نمازیں مکاتب فکر کی اساس پر الگ الگ آئندہ کی اقتداء میں ادا ہوتی ہیں) اور مسند ختم نبوت کی بابت یگانگت فکر اور باہم دیگر احترام عقلت، محبت و اخوت کے ساتھ میل ملاقات وغیرہ سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔

باجماعت نمازوں کے حوالے سے اس حقیقت کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تحریک تحفظ ختم نبوت کے یہ مرکزی قاعدین جب دیوانی احاطے میں تشریف لائے تھے تو حضرت شاہ جی نے امامت کے لئے

مولانا ابوالحسنات کا بازو پکڑ کر یہ کہتے ہوئے مصلے پر کھڑا کر دیا، بڑے میاں! یہ فریضہ مستقل طور پر آپ انجام دیں گے۔

مولانا ابوالحسنات نے مقتدیوں کی جانب ایک نگاہ ڈالی۔ میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔ انہوں نے میرا بازو پکڑا اور اپنی جگہ مصلے پر کھڑا کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ خدمت مستقل طور سے آپ انجام دیں گے۔ چنانچہ ان بزرگوں کی موجودگی میں امامت کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ اور جب تک لاہور سنٹرل جیل میں رہا فقیر اس سعادت سے سرفراز رہا۔

مقتدیوں میں مندرجہ بالا مرکزی قائدین کے ساتھ مولانا محمد علی جالندھری، مولانا لال حسین اختر، مولانا محمد حیات فاتح قادیان، مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری جنرل سیکرٹری تنظیم اہلسنت والجماعت پاکستان، ملک عبدالغفور انوری، مولانا محمد شریف جالندھری، سائیں محمد حیات پسروری اور دیگر شخصیات دوش بدوش تھیں۔ تعصب یا شکس کا کوئی تصور بھی موجود نہ تھا۔ دیوبندی مکتب فکر کے امام کے پیچھے سب متحد و متفق تھے۔

غرضیکہ اس مجلس زندانیاں اور مفضل روحانیاں میں سبط حسن خوب ٹھل ٹھل گئے تھے۔ ہمارے روابط میں نگہرائی اور گیرائی کا اضافہ ہو رہا تھا ایک روز تقوی صاحب کو مجھ سے ترجمہ قرآن کریم پڑھنے دیکھ کر کہنے لگے مجاہد صاحب! علماء اور دینی پیشواؤں کی بابت قبل ازیں میری رائے کوئی اچھی نہ تھی۔ مگر آپ کے ان بزرگوں کی زیارت کر کے اور آپ حضرات کو بہت قریب سے دیکھ کر میری رائے یکسر تبدیل ہو گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں بھی آپ سے عربی زبان سیکھنے کے لئے آپ کی شاگردی اختیار کر لوں۔

میں نے کہا اس سے بڑی سعادت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھ سے عربی اور میں نے ان سے انگریزی پڑھنا شروع کر دی۔ رات کو عشاء کے بعد اور صبح کی سیر کے وقت ہم دونوں جیل کے احاطے میں چہل قدمی کرتے وقت باہم دگر و گزنی اور انگریزی میں ہی گفتگو کیا کرتے تھے، سبط حسن نے چند ماہ کے اندر عربی زبان پر خاصا عبور حاصل کر لیا تھا۔

## دلچسپیاں:

جیل خانے کی تنگ و تاریک فضا اور ٹھٹھے ٹھٹھے ماحول میں دلچسپی پیدا کرنا بھی خاصا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ رفقاء زنداں غصیلے، تند خو، اور سرٹیل مزاج ہوں تو دلچسپ گفتگو اور ہنسی مزاج کی بات بھی ناگواری طبع کا باعث ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر کہ ہمارے احاطے میں بزرگوں سے لے کر خوردوں تک سبھی خوش مزاج اور کھلے دل و دماغ کی شخصیات موجود تھیں، ہر ایک کا ظرف و سبع، اپنا اپنا ذوق اور اپنی اپنی دلچسپیاں تھیں،

سبط حسن اور راقم المعروف دونوں پھولوں کی کیاریاں بنانے اور سنپنے سجانے میں لگے رہتے، شیخ حسام الدین نے پھولوں کی کیاری کے ساتھ آم کی گٹھلیاں کاشت کیں تو میں نے ازراہ تھن طبع عرض کیا شیخ صاحب! لگتا ہے آپ جیل خانے میں طویل مدت تک ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، جیسی تو آپ نے یہ



”ہزار سالہ“ منصوبہ شروع کیا ہے۔ میرا یہ جملہ سن کر مغل زندانیوں زعفران زار بن گئی۔

شام کے وقت دوسری بار کون اور جیل کے دیگر احاطوں کے نظربند بھی درباب جیل کی اجازت سے بغرض ملاقات آسکتے تھے۔ ایک شخصیت ہمارے احاطے میں جب بھی قدم رنجہ فرماتی۔ تو ”رہائی“ کا موضوع سنہن ہوتا تھا، آج فلاں صاحب کی رہائی آگئی ہے، کل فلاں صاحب جا رہے ہیں۔ اور ان شاء اللہ ایک روز ہماری ”رہائی“ کی باری بھی آجائے گی۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ جیل خانے کے اوپر سے شہری ہوا بازی کا چھوٹا سا طیارہ نیچی پرواز سے گزرا۔ تو اس شخصیت نے حیرت ناک لمحے میں پوچھا!

مجاہد صاحب! دیکھا آپ نے یہ جہاز کس قدر نیچی پرواز سے گزرا ہے۔ ضرور کوئی خاص بات ہے۔

میں نے کہا ہاں دراصل حکومت کے کارندے اس میں سوار ہو کر جیل میں ہونے والی ہماری گفتگو سننے آتے ہیں۔ اور یہ دیکھتے ہیں کہ جیل کے اندر اب ہماری سرگرمیاں کیا ہیں؟ کیونکہ رہائی کے احکام ہمارے طرز عمل کی بنیاد پر ہی صادر ہونگے۔ اسکی یہ رپورٹ تیار کرتے ہیں۔

بس آپ مطمئن رہیے۔ بہت جلد آپ کی رہائی کے احکام بھی صادر ہو جائیں گے۔ کیونکہ سال گزر جانے کے بعد اب جس بنیاد پر حکومت ہماری نظربندی میں توسیع کرے گی؟

میں نے انہیں پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ یہ جواب دیا۔ سبط حسن صاحب ہنسی ضبط نہ کر سکے تو لوٹ پوٹ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اتنے میں ”وہ صاحب“ اپنے وارڈ کی جانب واپس چلے گئے تو سبط صاحب نے کمرے سے باہر آ کر پوچھا یہ کون صاحب تھے؟

میں نے انکا تعارف کراتے ہوئے مزاحیہ کیا یہ صاحب! محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر ہیں اور ہمیں جیل سے رہائی کی بشارتیں۔ اور تسلیاں دینے عموماً تشریف لاتے رہتے ہیں۔ سبط حسن نے میری اس توجہ پر زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا یہ تعلقات عامہ اور بشارتوں کی اصطلاح بھی خوب رہی بہر نوع۔ جیل کے دن اور جیل کی راتیں ہم نے ہنسی خوشی، اور خوش مزاجی کے ساتھ بسر کی تھیں، اور بزرگ و خورد سب حضرات خوب سے خوب تر تھے۔

نیز یہ بشارت بھی مسرت افزا ہوگی کہ جیل خانے میں ہماری بیڈ منٹیں اور والی بال کی ٹیم بھی موجود تھی۔ اور جماعت اسلامی کے رہنماؤں اور کارکنوں پر مشتمل بم کیس وارڈ کی ٹیم کے ساتھ بروز جمعہ ہمارا میچ ہوتا تھا۔ نتیجہ جماعت اسلامی کو اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا جو باہر سیاسی میدان اور الیکشن کے نتائج کی صورت میں اسے درپیش ہوتی ہے۔

جیل خانے کے لطافت و ظرافت کی بات چھڑی ہے تو ایک دلچسپ بات اور بھی سن لیجئے۔!

جماعت اسلامی کے بانی امیر سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جمیعت علماء پاکستان کے رہنما مولانا عبدالستار خاں نیازی کو مارشل لاہ کے تحت پہلے پھانسی کی سزائیں سنائی گئی تھیں جو بعد ازاں ۱۳-۱۴ سال قیدداشت میں

تبدیل ہو گئی تھیں۔ جیل خانے کے اندر قید مضمّن گزارنا مشکل اور قید باشت اچھی رہتی ہے۔ مولانا مودودی کو یہ مشقت دی گئی تھی کہ روزانہ لہجے ہوئے ٹیک (کاغذ باندھنے کے دھاگے) کی گتیاں سلجھا کر صاف کر کے الگ الگ باندھ دیا کریں۔ اور مولانا عبدالستار خاں نیازی کو چرذہ کا تنے کی مشقت دی گئی تھی۔ جیل کا ایک افسر راوی ہے کہ

ہمارے سپرنٹنڈنٹ جیل شیخ اکرام صاحب انگلستان کے دورے سے خالی ہی میں آئے تھے، انگریز حکمرانوں کے طور طریقے اور ان کے لب و لہجے کی جھلک ان میں رچ بس گئی تھی۔ آتے ہی جیل خانے کا معائنہ کیا۔ اس دوران مولانا مودودی صاحب کے وارڈ میں چلے گئے، مولانا کے ساتھ تو نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ پیش آئے۔ البتہ مولانا عبدالستار خاں نیازی کے ساتھ ان کی گفتگو کا انداز فرنگیوں جیسا تھا۔ مولانا نیازی چرذہ کا تنے کی مشقت فرما رہے تھے روئی کی اٹیا پکڑتے اور موٹا سا سوت کات کر بے ہنگم سے دھاگے کا ڈھیر لگا دیتے تھے۔

شیخ صاحب :-! (صاحبوں کے لہجے میں) نیازی صاحب۔ دیکھیے آپ موٹا سوت کات رہے ہیں۔!  
مولانا عبدالستار خاں نیازی نے اپنے رواستی پائدار لہجے میں جواب دیا ہاں شیخ صاحب..... تاکہ تمہاری سمجھ میں آجائے۔

### جیل سے رہائی

بہر نوع سال گزرنے پر حکومت نے اندازہ لگایا کہ باہر تحریک کا زور ختم ہو گیا ہے۔ اور حالات پنجاب کا تحقیقاتی کمشنر اپنا کام کر رہا ہے۔ تو سیفٹی قوانین کے تحت نظر بندوں کی مدت میں توسیع کے بجائے رہائی کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔

حسب ترتیب میری نظر بندی کی مدت بھی ختم ہو گئی تو ارباب جیل نے صبح ناشتہ کے وقت اطلاع دی کہ آپ کی رہائی کے احکام بھی آگئے ہیں۔ میں نے اسے مذاق سمجھا۔ اور اپنے معمولات میں لگ گیا۔ اتنے میں ڈیورمچی سے پھر طلبی ہوئی کہ جلدی کرو۔ ہم نے جیل کا سب اچھا کھانا ہے (اس کا مطلب یہ ہے کہ رہا ہونے والے کو احاطہ جیل سے باہر کر کے قیدیوں کی گنتی پوری ہونے پر سب اچھا کا اعلان کیا جاتا ہے) چنانچہ سامان سیٹھا بزرگوں اور رفقاء زنداں سے علیک سلیک اور دھاواں کے ساتھ جیل خانے سے باہر آ گیا اور

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

قیام پاکستان کے بعد چونکہ مظفر گڑھ میں رہائش تھی۔ گھر گیا۔ اور چند روز کے بعد ہی واپس لاہور آ کر حضرت شاہ جی اور سبط حسن صاحب کی خدمت میں کچھ چیزیں جیل خانے میں بھجوائیں۔ وصول کر کے سبط حسن صاحب نے لکھا

”الحمد اور میٹھی روٹیاں ملیں، ایک نے دیدہ و عقل کو روشن کیا تو دوسرے نے کام و دہن کو لذت -

بھئی! بھائی آپ کا اور آپ کی پر خلوص محبتوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ کہاں سے لائیں، صبح چار بجے اٹھتا ہوں، چائے کے ساتھ میٹھی روٹیاں خوب مزہ دیتی ہیں، کھاتا ہوں اور بھائی کو دعائیں دیتا ہوں۔ پھر عربی پڑھتا ہوں اور النجد کی ورق گردانی کرتا ہوں، میٹھی روٹیوں کے بارے میں شاہ صاحب کا فرمانا ہے کہ ان کے مقابلے میں تو محکم دین لاہور کے بکٹ گوبر کے اوپلے معلوم ہوتے ہیں۔

امید ہے آپ یونیورسٹی کی زکوٰۃ نکالتے رہیں گے۔" (اقتباس)

سبط حسن صاحب کے ساتھ سلسلہ خط و کتابت جاری رہا، ان کے مکتوبات علم و ادب کا شاہکار اور گراں قدر ادبی سرمایہ ہے۔ ان شاء اللہ پھر کسی وقت ان کی اشاعت کا اہتمام ہوگا۔ بہر نوع۔ سبط حسن صاحب بھی رہا ہو گئے اور پروگریسو پیپرزم لیڈنگ کی مطبوعات پاکستان ٹائمز اور امروز کے دوش بدوش ایک منفرد معیار کے ساتھ شائع ہونے والے ہفت روزہ ٹیل و نہار لاہور کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے تھے۔ تحریک تحفظ ختم نبوت کا ترجمان مجلس احرار کا روزنامہ آزاد لاہور چونکہ سال بھر کے لئے جبراً بند کیا گیا تھا اسکی تجدید ڈیکلریشن کے لئے کسی طور پر بھی حکومت آمادہ نہ ہو سکی۔

اندریں حالات میں نے لاہور سے "ساربان" کے نام سے ہفت روزہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ کئی ماہ

کی صبر آزما کوشش کے بعد ڈیکلریشن مل گیا۔ تو اس کے پہلے شمارے کے لئے میں نے سبط حسن صاحب سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی۔ جس پر انہوں نے ایک فکر انگیز مختصر مضمون تحریر کر کے عنایت فرمایا۔ جو "ساربان" کے شمارہ اول اگست ۱۹۵۸ء میں پرانی ہدیریں کے زیر عنوان شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

## پُرانی ہدیریں

میرے دیرینہ کرم فرما اور استاد جناب مجاہد المسینی صاحب "ساربان" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کر رہے ہیں۔ استاد محترم نے مجھے حکم دیا ہے کہ ساربان کی پہلی اشاعت کے لئے میں بھی کچھ لکھوں۔ میں پرانی وضع کا آدمی ہوں۔ اس لئے استاد کی حکم عدولی کو معیوب سمجھتا ہوں استادی شاگردی کا رشتہ اگر اس کا احترام کیا جائے تو ہوتا بڑا پیارا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل نہ استادوں میں وہ پرانی شفقت اور محبت باقی رہی ہے۔ اور نہ شاگردوں میں استاد کے احترام کا احساس رہ گیا ہے، نہ استاد کو شاگرد سے ہمدردی ہوتی ہے نہ شاگرد استاد کی باتوں پر کان دھرتے۔ مگر میں تو پرانی وضع کا شاگرد اور میرے استاد بھی خوش قسمتی سے پرانی ہدیروں ہی کے پرستار ہیں!

ہماری شاگردی استادی کا قصہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سکيورٹی آف پاکستان ایکٹ کے تحت نظر بندی کے دن لاہور جیل میں گزارا رہا تھا۔ دفعتاً سارے ملک میں ایک ہلچل مچ گئی۔

میں ان دنوں منگھری جیل میں تھا۔ اخبار پڑھتا تو ذہن کی عجیب کیفیت ہوتی۔ پھر نعروں سے جیل کی دیواریں ہلنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے جیل کی پیست ناک اور سنان فضا میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ آس پاس کے دیہات اور قصبوں سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں نظر بند ہو کر آنے لگے۔ ان میں سفید ریش بزرگ بھی تھے۔ جوانی کے خوں میں سرشار سورا بھی، اور خوردسال لڑکے بھی۔ ان کی اکثریت زراعت پیشہ تھی سیدھے سادے لوگ، بھولے بھالے لوگ، نہ سیاست کی شطرنجی چالوں سے واقف، نہ رموز مملکت سے آگاہ، ان کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس جرم کی سزا میں اندر لائے گئے ہیں، ان میں سے شاید ہی کسی نے جیل کی زندگی گزاری ہو۔ پھر وزارتیں ٹوٹنے لگیں اور مارشل لاء کی مسموم ہوائیں چلنے لگیں اور فضا تاریک سے تاریک تر ہوتی گئی، ملک میں قادیانیت کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ (تحریک تحفظ ختم نبوت)

اسی درمیان میں مجھے منگھری جیل سے لاہور جیل منتقل کر دیا گیا یہاں چھ مہینے ایسے گزرے جن کی یاد مجھے برابر تڑپاتی رہتی ہے۔ حسن اتفاق دیکھیں کہ پاکستان کے چوٹی کے عاملوں کو اسی بارک میں لایا گیا جہاں میں مقیم تھا۔ مولانا ابوالسنات، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا محمد علی جالندھری وغیرہ اس مغل روحانیاں میں مجھ جیسے گنگار کی رسائی میرے لئے فیض و برکت کا پیغام لے کر آئی۔ مولانا

اعطاء اللہ شاہ بخاری کے کارناموں سے تو میں مدت سے واقف تھا۔ لیکن ان کی خدمت میں نیاز جیل ہی میں حاصل ہوا، اور پہلی ملاقات کے بعد ہی یوں موسوس ہوا گویا اپنے کسی عزیز ترین بزرگ کے سایہ عاطفت میں پناہ ملی ہے۔ یوں تو سبھی اس شمع مغل کے پروانے تھے، لیکن میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان مولوی صاحب کو ان سے بڑی عقیدت و وابستگی ہے، اور شاہ صاحب بھی ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ یہ نوجوان اتنا خوش مزاج اور نیک طبع تھا کہ رقابت کے بجائے اسے محبت کرنے کو جی چاہا اور رفتہ رفتہ ہم دوست ہو گئے، اس کا نام مجاہد الحسینی تھا۔ مگر شاہ صاحب اسے یوسف کچھ کر پکارتے تھے۔ (۱)

یہاں مجاہد الحسینی صاحب میرے استاد بنے۔ اور چھ مہینے کے اندر انہوں نے مجھے آہنی عربی پڑھادی کہ میں قرآن شریف کی عبارت کو بلا ترجمے کے آسانی سے سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ یوں تو ہر استاد خواہ وہ سخت گیر ہو یا نرم دل، لائق احترام ہوتا ہے لیکن ایسا مشفق استاد جس نے جیل کے اندر غریب زبان سکھائی ہو مجھے کتنا عزیز ہو گا۔ اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ یہ چند سطریں دراصل اعتراف محبت اور اظہار عقیدت کے طور پر لکھ رہا ہوں ورنہ اپنی مصروفیتوں کے باعث نہ میرے پاس مضمون لکھنے کے لئے وقت ہے۔ اور نہ مولانا مجاہد الحسینی کو ساربان کے صفحات خراب کرنے کی ضرورت۔

میری دعا ہے کہ ساربان اپنے مقاصد میں کامیاب ہو اور قوم کے گم کردہ راہ کارواں کو ترقی اور آزادی کی منزل کی طرف رہبری کرنے کا فرض خوش اسلوبی سے ادا کرے۔ (مطبوعہ حسن ۱۳ اگست ۱۹۵۸ء)

ایک دوسرا خط ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں حضرت امیر شریعت کی خلافت کا سن کر ان کی صحابی کے لئے دعا

کی اور حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں خط بھی ارسال کیا تھا۔

بتوسط - نواب زادہ امتیاز علی خاں

۳۹ روڈ لاهور

استاد محترم سلام شوق

نوازش نامہ ملا۔ میں نے کیمبل پور کی جیل سے آپ کو کسی خط لکھے لیکن غالباً مصروفیت کے سبب سے آپ نے جواب ہی نہ دیا۔ اب صورت یہ ہے کہ جب تک فیدرل کورٹ فیصلہ نہیں کرتی زندگی پونہ اعراف میں گزرے گی۔ دو ٹوک فیصلہ ہو جائے اور انشاء اللہ ہمارے حق میں ہو گا۔ تو پھر کچھ سوچا جائے۔ اب کے سیرا حتی ارادہ کھیتی باڑی کا ہے چنانچہ اس کوشش میں ہوں کہ کہیں تھوٹھی سی زمین الاٹ ہو جائے۔ تیل میں سہی۔ تو پھر ایک جمونپٹری بنا کر زراعت شروع کروں۔

کل شیخ صاحب (۱) سے ملنے گیا تاکہ لیڈر لوگ گھر پر کب ملتے ہیں خط چھوڑ آیا۔ پھر کسی دن جاؤں گا۔ سنا ہے شاہ صاحب قبلہ علیل ہیں۔ خدا انہیں جلد صحت دے۔ ان کا پورا پتہ معلوم نہیں پھر بھی ملتان کے پتہ پر خط لکھ رہا ہوں۔ غالباً مل جائے گا۔ آپ ملیں یا خط لکھیں تو میرا بہت بہت آداب کہیںے گا۔ آپ لاهور آنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے۔ میں رہائی کے دوسرے دن ہی بیمار ہو گیا۔ یہی نزلہ زکام بخار اگر اب بالکل اچھا ہوں۔ پرسوں یہاں بارش ہوئی جس نے موسم کو نہایت خوشگوار بنا دیا ہے۔ سردی کم ہو گئی ہے اور دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ کیمبل پور میں تو قیامت کی سردی پڑتی تھی۔ مفصل خط پھر لکھوں گا۔

آپ کا سبط حسن ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ

امیر شریعت کی دفتر سبط حسن میں تشریف آوری:

چند سال بعد لیل و نہار بند ہو گیا۔ سبط حسن صاحب تصنیف و تالیف کے کام میں انہماک کی وجہ سے بیمار پڑ گئے تھے۔ ان دنوں میں وہ میکوڈ روڈ پر واقع علامہ اقبال اکیڈمی کی گلی میں کمیونٹی پارٹی کے دفتر میں مقیم تھے۔

مجھے ان کی سخت بیماری کی خبر ملی تو حضرت شاہ جی کی خدمت میں اسکا تذکرہ کیا۔ شاہ جی ان دنوں حاجی دین محمد صاحب کے کارخانے واقع بادای باغ لاهور میں ٹھہرے ہوئے تھے شاہ جی نے سبط حسن کی بیماری کا سن کر فرمایا۔

اسکی عیادت کو جانا چاہیے۔ وہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟ میں نے رہائش گاہ کی معلومات فراہم

کلیں۔ تو شاہ جی نے توقف کے بعد فرمایا۔ تیمارداری منسوخ ہے۔ ہمارا اخلاقی فرض بھی ہے کہ اپنے جیل کے اچھے ساتھی کی عیادت کریں!۔ چنانچہ شاہ جی! حاجی دین محمد کے بڑے بڑے کٹے حاجی محمد احمد کی کار میں میٹروڈروڈ اس بلڈنگ میں پہنچ گئے۔!

بلڈنگ کی پہلی منزل میں روزنامہ کوہستان لاہور کا دفتر تھا، اخبار کے عملے نے شاہ جی کو دیکھتے ہی چیف ایڈیٹر جناب نسیم مجازی کو مطلع کیا، انا فانا سارا عملہ شاہ جی کے لئے سراپا استقبال تھا۔ نسیم صاحب نے سمجھا شاید شاہ جی کوہستان کا دفتر دیکھنے اور ان سے ملاقات کو تشریف لائے ہیں اتنے میں شاہ جی نے میری جانب دیکھا تو میں نے اوپر کے حصے میں جانے کا اشارہ کیا۔ کوہستان کے ایک رکن ادارہ نے کہا۔ کہ اوپر تو کمیونٹی پارٹی کا دفتر ہے شاہ جی نے فرمایا۔ مجھے مکان سے نہیں لیکن سے غرض ہے۔ اور میرا تو یہ دینی فریضہ ہے کہ

علیٰ حفرة من النار

جہنم کے کنارے پر بھی کوئی کھڑا ہو گا تو اسے بچانے کی کوشش کروں۔

چنانچہ حضرت شاہ جی اوپر دفتر میں تشریف لے گئے۔ کوہستان کے عملے کے بعض اہم ارکان بھی ہمراہ تھے۔ سبط حسن صاحب بیماری سے نڈھال بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ شاہ جی کو دیکھتے ہی چارپائی سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ والہانہ انداز میں شاہ جی سے جھک کر سلام کیا۔ اور گلو گری لہجے میں کہا شاہ جی! بڑی شفقت فرمائی آپ نے۔ نہایت مہربانی، آپ کی کرم فرمائی کا بے حد ممنون ہوں۔ پھر میری جانب متوجہ ہو کر سبط حسن صاحب نے کہا

آپ نے خواہ مخواہ شاہ جی کو زحمت دی، مجھے شرمندہ کیا۔ مجھے حکم دیا ہوتا اسی حالت میں شاہ جی کا نیاز حاصل کرنے حاضر ہوتا۔ اور سبط حسن کی آنکھوں میں عقیدت و احترام، اور محبت کے آنسو تیر گئے تھے۔

## رہائشی الاٹمنٹ کی پیشکش

میاں افتخار اللہ بن تحریک آزادی کے ممتاز رہنما اور شاہ صاحب کے حلقہ احباب و اراکین میں سے تھے وہ پاکستان کی مرکزی وزارت بحالیات پر فائز ہوئے تو ایک روز شاہ صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لائے، ہدم سجاد حسین قریشی (سابق گورنر پنجاب) سید ملہار حسین گیلانی، میاں محمد شفیع ناظم بلدیہ ملتان اور دوسرے رہنما ہمراہ تھے۔ شاہ صاحب بکھری روڈ محلہ ٹی شیر خاں ملتان میں واقع ایک کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ یہ مکان تنگ گلی میں واقع تھوڑے لمبے پہنچے کا راستہ تھا اور اینٹوں پر ہدم رکھ کر پہنچا جاسکتا تھا۔ کسی لڑکے نے آکر اطلاع دی کہ ایک کار جمنڈی والی آئی ہے وہ آپ (شاہ صاحب) کا نام لے رہے ہیں۔ شاہ صاحب نے مجھے فرمایا دیکھو! کوئی وزیر آیا ہو گا۔

میں نے باہر لگی میں دیکھا تو میاں افتخار الدین مقامی عمامہ میں اور استقامت کے ہمراہ آ رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی علیک سلک کے بعد متنب ہو کر شاہ صاحب سے کہا شاہ جی۔۔۔۔۔ آپ یہ کہاں آ کر بیٹھ گئے؟ آپ ایک درخواست لکھیں میں ابھی آپ کے نام کوئی بری کوٹھی یا اچھا وسیع مکان الاٹ کر دیتا ہوں۔ شاہ صاحب نے میاں افتخار الدین کو جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

بابو افتخار۔۔۔۔۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو میں گنگار اور خطا کار ہوں میرا ب ستار و غفار ہے۔ میں نے زندگی میں ایک گناہ ہر گز نہیں کیا ہے اس سے میرا دامن پاک ہے۔ اور وہ یہ کہ۔۔۔۔۔ میں نے کبھی کسی مکران کے حضور یہ نہیں لکھا۔

”فدوی کی درخواست یہ ہے“ اگر میں نے یہی گناہ کرنا ہوتا تو پھر ”انگریز بہادر“ کے حضور درخواست پیش کرنا میری بے شمار وسیع و عریض کوششیں ہوتیں۔ کئی مرتبے زمین کا مالک ہوتا نوکر چاکر میرے لود گرد ہوتے، کئی دربان میری چو کھٹ پر دست بستہ ایستادہ رہتے۔ اور تمہارے سمت کوئی بدوں اجازت میرے آگلی میں جھانکنے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔

شاہ صاحب کا جواب سن کر میاں افتخار الدین اور ان کے ساتھی سرنگوں رہ گئے۔ برصغیر کا یہ سربیاں خلیفہ اعظم سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔۔۔۔۔ اپنی خلافت کا ہادو اگر اپنی ذات کے لئے جھگڑتا تو واقعی ان سے بڑا کوئی دولت مند اور صاحب جائیداد نہ ہوتا۔ مگر وہ قناعت پسند اور اپنی خاندانی روایات کے امین تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جس خانوادے کا خون میری رگ و پے میں گردش کر رہا ہے ان کے گھر سے بھی کئی کئی روز تک دھواں نہ اٹھتا اور چوباسر در ہوتا تھا۔

یہ تو ہمارا سرمایہ افتخار اور خاندانی ورثہ ہے۔ انظر فری۔ غرضیکہ نہ تو شاہ صاحب نے کسی بھی حکومت سے کچھ لیا نہ اس کے سامنے دست سوال دراز کیا تھا اور نہ ہی کسی نے آپ کی عظیم دینی و ملی خدمات کے صلے میں کوئی منصب عطا کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔

ترے	وجود	کے	سلئے	کو	پا	نہیں	سکتا
دروغ،	صدق	ے	آنکھیں	ملا	نہیں	سکتا	
تو آدمی	نہیں	یزداں	کی	اک	نشانی	ہے	
ترے	بڑھاپے	میں	احرار	کی	جوانی	ہے	

(عبدالحمید عدم)

# عطاء اللہ شاہ بخاری

(۲۶ فروری ۱۹۵۶ء کو سید عطاء اللہ شاہ بخاری لاہور میں تفریکرہ میں)

خطیبِ اعظمِ عرب کا نعمِ عجم کی لے میں نہا رہا ہے      سرچین چھپا رہا ہے، سروغما سکر رہا ہے  
 حدیثِ مرفوعہ میں نچاؤ، زبانِ ششیر اس پہ قرباں!      میلہ ایسے جلسوں کی نیچ و بنیا ڈھکا رہا ہے  
 قرونِ اولیٰ کی رزم گاہوں کے مرنے کا جلال لے کر      دینِ نیندیں بھنجھو رہا ہے، مجاہدوں کو بگا رہا ہے  
 ہیں اس کی لکڑی سے ہر اسان محمد مصطفیٰ کے باغی      ونگ کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں غنیم پر ہنسا رہا ہے  
 میں اس کے چہرے کی مکرانیت ایسا محسوس کر رہا ہوں      کہ جیسے کوثر پہ شام ہو تے کوئی دیا جھلا رہا ہے  
 خدا فرشتوں کی خانقاہوں پہ ایک بجلی سی کوندتی ہے      نہولے گوتند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

”وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ“

اسی کی صورت کو تک رہا ہے سفر سے ٹوٹا ہوا زمانہ



## آتا ہے بہت محرم اسرار و فایاد

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو ہم سے رخصت ہوئے قریباً چوبیس برس ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں ایک لمحہ بھی شاید ایسا نہیں آیا جس لمحے ان کی شخصیت کی گرفت و دھلی پڑی ہو یا ان کی شخصیت کا سرکھم ہوا ہو، یا پھر وہ یاد نہ آئے ہوں۔ اس بات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی شخصیت کتنی عظیم، کتنی پُر اثر اور کتنی پُر کشش تھی۔ گزرنے والا ہر لمحہ ہمیں ان کے زیادہ قریب کرتا جا رہا ہے۔ قطر الزہال کے اس دور میں جب ہم اپنے چاروں طرف ایسی کوئی دوسری شخصیت نہیں پاتے جو اتنی اہم، اتنی پُر کشش، اور پروقار ہو یا کم از کم ان کے قریب تر ہو، تو پھر وہ اور زیادہ یاد آتے ہیں اور دل و داغ کو تڑپا جاتے ہیں۔ غرضیکہ ان کی جدائی میں گزرتے ہوئے یہ ماہ و سال ہمیں بجائے ان سے دور لے جانے کے اور نزدیک لے آئے ہیں۔

یوں دل نشیں ہوا ہے وہ روشن ضمیر شخص  
جاتا نہیں ہے دل سے روایات کی طرح

حضرت امیر شریعت سے میرا تعلق خاطر میری زندگی کا وہ سرمایہ ہے جس پر مجھے بجا طور پر فخر ہے۔ انہیں مضطرب دیکھا ہی نہیں ہے بلکہ انہیں قریب ہو کر جانچا اور پرکھا بھی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک بلند شخصیت تھے۔ جنہیں انسانوں سے بے پناہ محبت تھی۔ کسی کا دل توڑنا ان کے مسک میں نہیں تھا۔ ہر قریب آنے والا یہی سمجھتا تھا کہ جتنا شاہ جی اسے چاہتے ہیں اور کسی کو نہیں چاہتے اور جتنا اس کے قریب ہیں اور کسی کے قریب نہیں۔ جس فرد نے انہیں جتنا قریب سے دیکھا وہ ان سے اتنا ہی متاثر ہوا۔ پھر یہ تاثر عارضی نہیں بلکہ مستقل ہوتا ہے۔ یہ ان کے خلوص کی توثیق ہے کہ آج جب ان کے جاننے والا اور ان کے پاس بیٹھنے والا فرد جب ان کی بات کرتا ہے یا انہیں یاد کرتا ہے تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہونے لگتی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے ہم نے انہیں اتنی شدت سے چاہا کہ آج ان کی فرقت میں تڑپ تڑپ جاتے ہیں اور بے اختیار لبوں پہ یہ اشعار رواں ہو جاتے ہیں۔

کہاں گئے وہ جنوں آشنا وہ دیوانے  
بڑے اداس ہیں یارو خرد کے ویرانے  
عجب سزا ہے تیری مختصر رفاقت کی  
بھرے جہاں میں اکیلے ہیں تیرے دیوانے

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کو جب میں نے پہلی دفعہ چنیوٹ میں دیکھا تو مضحکہ سات برس کا بچہ تھا۔ الٰہی بخش شید (تربیک کشمیر ۱۹۳۱ء) کے بیٹے خالد (جوان کی شہادت کے بعد پیدا ہوئے تھے) میرے ساتھ تھے ہم دونوں احرار یونیفارم میں ملبوس تھے۔ مجھے یاد ہے شاہ جی نے ہمیں بہت پیار کیا تھا اور ڈھیریوں دعائیں دی تھیں۔ وہ اس وقت الٰہی بخش شید جو احرار کی تربیک کشمیر ۱۹۳۱ء کے پہلے شید تھے۔ کا ذکر کر کے ان کی جرأت اور بہادری کو اپنے معیار کے الفاظ میں خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ اور ہم ان کے منہ کی طرف ٹک ٹک دیکھ رہے تھے۔ یوں موسس ہو رہا تھا جیسے ایک مانتاب مجسم انسان کی شکل اختیار کر کے آسمان سے زمین پر اتر آیا ہے۔ شاید چاند میں وہ رعنائی نہ ہو جو اس مشکل چاند میں موند تھی۔ آپ سے اس پہلی ملاقات کا اثر آج تک میرے وجدان اور میرے دل و دماغ کی گھمرائیوں میں موجود ہے۔ وہ کیفیت وہ سرور شاید میں اپنے الفاظ میں بیان نہ کر سکوں جو میں موسس کرتا ہوں۔ شاید کیفیت نام ہی ایسی شے کا ہے جو الفاظ کے نرنے سے ماورا ہو۔

آپ سے دوسری ملاقات بھی تقسیم ملک سے پہلے چنیوٹ ہی میں ہوئی تھی جب ۱۹۴۶ء کا انتخابی یُدھ اپنے عروج پر تھا۔ وہ چنیوٹ تشریف لائے تو مجلس احرار اسلام کا ایک جلسہ عام شاہی مسجد کے عقب میں غلہ منڈی میں تھا۔ خان مظہر نواز درانی کو آپ ملتان سے اپنے ساتھ لائے تھے وہ سٹیج پر آپ کے ہمراہ تشریف فرما تھے مظہر نواز درانی احرار کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شاہ جی کی تقریر سے پہلے خواجہ عبدالرحیم عاجز مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں پنجابی کی نظم پڑھی تھی۔

"لڑناں لڑناں احرار نے ہن ایشن والا جنگ"

بے پناہ مجمع تھا لیکن اتنی ہی خاموشی بھی۔ سب کی نظریں امیر شریعت پر لگی ہوئی تھیں۔ آپ نے اپنی باری پر حسب معمول آخری تقریر فرمائی اور لوگ عین عین کر گئے۔ یہ تقریر بھی اگرچہ ایک انتخابی تقریر تھی لیکن آپ نے انتخابی سیاست پر بہت کم تبصرہ کیا تھا اور انگریز کے ذلّت خواروں کو زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے دل میں انگریز دشمنی کا پودا کاشت ہوا اور آج خدا کے فضل و کرم سے جب میں بوڑھا ہو رہا ہوں یہ پودا تناور درخت بن چکا ہے۔ ساری عمر جو کچھ پڑھا اور جو کچھ بھی میرے شاہدہ اور تجربہ میں آیا وہ سب کچھ اس بات کی تائید میں ہے کہ "اس دھرتی پر ملت اسلامیہ اور امت محمدیہ ﷺ کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہی ہے۔ جس سے خیر کی توقع کا تصور بھی گناہِ عظیم ہے۔ جو کچھ آپ نے اس وقت کہا، وقت کے ساتھ ساتھ درست ثابت ہوا۔"

ہے حقیقت بس وہی جو تو نے کر دی تھی عیاں  
اور سب کچھ وقت کی آنکھوں میں تھا مثلِ سراب  
تجہ پہ جو الزام تھا رد ہو گیا ہے وقت سے  
تیرے نکتہ چیں ہوئے ہیں شرم سے اب اب آپ

اس دفعہ بھی حضرت شاہ جی کا قیام اسلامیہ ہائی سکول چنیوٹ میں ہی تھا۔ جہاں پر ہر وقت لوگوں کا ایک جم غفیر موجود رہتا تھا۔ کچھ لوگ اگر آپ کی محفل سے چلے جاتے تو کچھ آ بھی جاتے تھے۔ اسی طرح حضرت شاہ جی کی محفل ہر وقت اپنے عروج پر رہتی تھی۔ میں بھی اس محفل میں اکثر موجود رہتا اور اپنی بساط کے مطابق آپ کی باتوں سے مستفیض ہوا کرتا تھا۔ نہ جانے وہ کیا جاذبیت تھی جو مجھ جیسے ناسمجھ کو بھی ان کی محفل سے اٹھنے نہیں دیتی تھی۔ ان کی گفتگو میں بلا کی چاشنی تھی۔ لوگ ان باتوں پر اکثر سر دھنتے تھے۔ محفل میں بھی بعض اوقات کیا اکثر اوقات تقریر جیسی کیفیت پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ شاہ جی کبھی سنبیدہ موضوع پر گفتگو کرتے تو لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جایا کرتی اور جب کبھی ہنسنے ہنسانے پر آ جاتے تو ارد گرد بیٹھنے والے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی محفل میں آنجنابی سر سکندر حیات وزیر اعلیٰ پنجاب کا ذکر بھی آیا۔ مجھے اب تک یاد ہے شاہ جی فرما رہے تھے۔

میں نے زندگی بھر کسی کے لئے بددعا نہیں کی۔ میری عادت ہے کہ لوگوں کے قصور معاف کر دیا کرتا ہوں۔ میری فطرت کے ہی خلاف ہے کہ میں ذاتی انتقام کے بارے میں سوچوں۔ میری کوئی ذاتی دوستی یا ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ میری دوستی بھی خدا کے لئے ہے اور میری دشمنی بھی خدا کی رضا کے لئے ہی ہے لیکن اگر میں نے زندگی میں کسی کے لئے بددعا کی ہے تو وہ سکندر حیات اور اس جیسے دو تین آدمیوں کے لئے جس نے انتہائی سازشی انداز میں میرے خلاف سر اسر جھوٹا بغاوت کا مقدمہ دائر کر رکھا مجھے پانسی دلوانے کی ناکام کوشش کی۔

یہ بات سکندر حیات کی زندگی کی ہے۔ اس کی موت اس واقعہ کے بعد ہوئی اور آج تک جو کچھ اس خاندان سے ہو رہا ہے۔ آپ کے سامنے ہے۔

شاہ جی جب بھی چنیوٹ تشریف لاتے تھے مجھے اطلاع ہو جایا کرتی تھی۔ کیونکہ ان کی قیام گاہ اور جلسہ گاہ میرے گھر کے قریب ہی واقع تھی۔ پھر شاہی بازار کے احرار رضا کاروں کے ساتھ میرا رابطہ ہوتا تھا۔ جن کے ذریعہ سے شاہ جی کے آنے کے پروگرام کا مجھے پہلے سے ہی علم ہو جاتا۔ شاہ جی جب بھی چنیوٹ تشریف لاتے تو آپ کی دو فرمائشیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک سعید کے چھوٹے دوسرے بخش الہی کو کھیں سے لاؤ۔ سعید ہمارے شہر میں چنے بنایا کرتا تھا۔ مسلم بازار میں اسکی دکان تھی۔ یہ چنے اتنے مزے دار ہوتے کہ جو کھانا بس ہونٹ چاٹتا رہ جاتا۔ شاہ جی کو یہ چنے بڑے ہی مرغوب تھے۔ چونکہ میں عمر میں چھوٹا تھا بڑے احرار رضا کار ان فرمائشوں کے لئے مجھے ہی دوڑایا کرتے تھے۔

”بخش الہی“ ہمارے شہر کے ایک مشہور مجذوب تھے۔ چنیوٹ کی شیخ برادری سے ان کا تعلق تھا۔ بخش الہی اپنی حالت میں مست گلیوں اور بازاروں میں اکثر گھومتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی لوگ بخش الہی کو تقریر کے لئے کہتے تو وہ کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر تقریر کرتا۔ تقریر میں مسلمانوں کو ان کی غیرت و حمیت کا

حساس دلالتا اور بے پردہ خواتین کی مذمت کیا کرتا۔ اکثر اوقات یہ تقریر مرزائیوں کے خلاف ہوتی۔ لوگ اس پر اسے داد دیتے اور وہ داد و وصول پا کر خوشی کا اظہار کرتا۔ کبھی کبھی یہ تقریر وہ اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی کیا کرتا تھا۔ جب وہ مرزائیوں کے خلاف تقریر کرتا تو مخالفت بھی یک دیا کرتا تھا۔ لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو کر اس کی ان تقریروں کو بڑے غور اور دلچسپی سے سنتے تھے اور کہتے تھے کہ مجذوب لیکن بات درست کرتا ہے۔ حضرت شاہ جی جب بھی چنیوٹ تشریف لاتے، بخش الہی سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔ نہادھو کر جب اپنی قیام گاہ پر تشریف فرما ہوتے تو بخش الہی کو تلاش کرنے کو کہتے تھے کہ اسے بلاؤ مجھے اس سے ملنا ہے۔ یہ فریضہ بھی عموماً مجھے ہی ادا کرنا ہوتا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے جب میں تلاش کرنے کے لئے نکلتا تو سوچتا کہ ایک مجذوب آدمی جس کا کوئی ٹھکانا ہے نہ کوئی پتا؟ گھر پر وہ بیٹھتا نہیں اسے کیسے تلاش کروں گا، وہ نہ ہائے کہاں ہو گا؟ میں ہر مرتبہ اسے ایک مشکل کام تصور کرتا۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ جب بھی میں ایسا سوچتا وہ مجھے کہیں نزدیک سے ہی مل جایا کرتا تھا۔ میں خوشی سے اچھل کر اسے کہتا "اوش بخش الہی! عطاء اللہ شاہ بخاری آئے ہوئے ہیں مجھے بلاتے ہیں چلو؟" وہ عجیب انداز میں میری طرف دیکھتا اور پھر ہنس کر کہتا۔

"ہاں ہاں چلو چلو، بخارا، بخارا یار ہے یار ہے۔ بخاری کی بجائے وہ ہمیشہ شاہ جی کو بخارا کہتا تھا۔ میں نے کبھی اس کے منہ سے بخاری نہیں سنا۔ میں اسے لیکر شاہ جی کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ شاہ جی جب اسے دیکھتے تو اٹھ کر کھڑے ہو جایا کرتے تھے اور اسے بغل گیر ہو کر بڑے اہتمام کے ساتھ پلٹے تھے۔ بڑے انہماک کے ساتھ اس سے گفتگو فرماتے تھے۔ بعض اوقات یہ گفتگو خاصی طویل بھی ہو جایا کرتی تھی لیکن کیا مجال کہ پاس بیٹھے ہوئے ذرہ بھی بور ہوں۔ برمی ہی دلچسپ باتیں ہوا کرتی تھیں۔ بخش الہی شاہ جی کی ہر تقریر میں موجود ہوتا تھا۔ وہ بڑے غور سے آپ کی تقریر کو سنتا تھا۔ لوگ اس بات پر بھی حیران ہوتے کہ ایک مجذوب آدمی جس کو کسی لمحے چین نہیں۔ کئی گھنٹوں تک مسلسل ایک جگہ بیٹھ کر شاہ جی کی تقریر کیسے سن لیتا ہے؟

مجھے یاد ہے کہ ایک بار شاہ جی نے "مارٹی انڈس" ٹرین سے چنیوٹ پہنچنا تھا۔ جورات کو تقریباً ایک بجے سٹیشن پر آتی تھی۔ میں اگر بچہ تھا تاہم صد کے اپنے بڑے رصا کاروں کے ہمراہ اسٹیشن پر استقبال کے لئے موجود تھا۔ میں حیران ہو گیا جب میری نگاہ بخش الہی پر پڑی جو ہم سے پہلے رات کو ایک بجے سٹیشن پر موجود تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "بخش الہی" شاہ جی آرہے ہیں۔ کہنے لگا۔ "ہاں ہاں بخارا بخارا اپنا یار ہے۔ یار ہے آرہا ہے۔" راہ پلٹے ہوئے جب بھی لوگ سید عطاء اللہ شاہ بخاری "کا نعرہ لگاتے تو وہ جواب میں زور سے زندہ باد کا نعرہ بلند کرتا اس کی آواز سے ایک گونج سی پیدا ہوتی تھی۔ ان دونوں (امیر شریعت اور بخش الہی مجذوب) کے درمیان جو وجدانی اور روحانی تعلق تھا کسی کو معلوم نہیں۔

چنیوٹ میں شاہ جی کے سب سے قابل اعتماد ساتھی، ملک اللہ دتہ مرحوم تھے۔ جو برمی مدت تک مجلس احرار اسلام کے مقامی صدر بھی رہے۔ بلوچ خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ انتہائی زبرد اور بہادر انسان تھے۔

اپنے وقت کی پوری سیاسی تاریخ ان کے دماغ میں محفوظ تھی۔ کوئی اہم سیاسی واقعہ ایسا نہیں تھا جو ملک اللہ دتہ مرحوم کی یاد سے باہر ہوتا۔ حضرت شاہ جی کے شیدائی تھے۔ ملک کی آزادی تک شادی نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ چنانچہ آپ کی شادی ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ ملک رب نواز ایڈووکیٹ ان کے فرزند ہیں جو ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ملک اللہ دتہ تحریک تحفظ ختم نبوت میں قید و بند کی صعوبتیں بھیل رہے تھے۔ ملک صاحب کے حلوہ سالار ”نذر محمد“ ”شیر محمد آزاد“ ”ظہور احمد“ ”شیر محمد وسیر“ ”نذر محمد کیتھ“ ”محمد حسینی ہمارے بازار کے نڈرا حرار رضا کار تھے۔ جو سارے شہر میں جماعتی کام کے لئے مشہور و معروف تھے۔

ایک دفعہ شاہ جی چنیوٹ قصر یف لائے تو ملک اللہ دتہ صاحب کے گھر پر ہی مقیم ہوئے۔ دوران قیام شاہ جی نے ملک صاحب کو کہا کہ کوئی دلچسپ بات سناؤ؟ ”ملک صاحب نے انہیں اپنے بزرگ کا واقعہ سنایا کہ جب فیصل آباد (لاٹل پور) نیا بنا رہا تھا تو وہ اپنے ایک کم عمر بیٹے کو لیکر شہر چلا گیا۔ کہ نیا شہر دکھائے شہر میں گھومتے پھرتے بچہ باپ سے الگ ہو گیا۔ باپ نے اپنے بچے کو انتہائی پریشانی کی حالت میں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لیکن بچہ نہ ملا۔ اب یہ بھی اتفاق ہے کہ جب بھی وہ بزرگ کسی سمت سے گھوم گھام کر آتا تو سامنے اس کے فیصل آباد کا گھنٹہ گھر آجاتا تھا۔ ایک طرف بے پیے کی گمشدگی کی پریشانی اور دوسری جانب سے یہ صورت حال کہ گھنٹہ گھر ہر بار سامنے آجاتا۔ اسے مزید پریشان کر رہا تھا۔ بالاخر وہ گھنٹہ گھر کے سامنے کھڑے ہو کر غصہ میں بولا۔ اے گھنٹہ گھر میرے بچے کو تو نے ہی گم کیا ہے۔ اسے تو نے ہی کہیں چھپا رکھا ہے۔ جب بھی میں اسے تلاش کرنے لگتا ہوں تو تو میرے سامنے آجاتا ہے۔ اور میرے راستے کی رکاوٹ بن جاتا ہے؟“ بس ملک صاحب نے یہ واقعہ کیا سنایا کہ شاہ جی مارے، ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے اور دیر تک اس لطیف سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ رات کو جلیہ گاہ پہنچے تو اپنی پوری تقریر کو اس واقعے کے تناظر میں بیان کر دیا، پہلے جلسہ میں یہ واقعہ سنایا اور پھر انگریزی سامراج کو لاٹل پور کے گھنٹہ گھر سے تشبیہ دی اور بچے کو عظمت رفتہ کے ساتھ اور مسلمانوں کو باپ کے ساتھ تشبیہ دیکر بات بنالی کہ

”ہم ایک مدت سے اسلام کی عظمت رفتہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں لیکن اس راستے کی عظیم رکاوٹ برطانوی سامراج ہے جو ہمارے راستے کو روکے کھڑا ہے۔ ہماری ہر ترکیب، ہماری ہر کوشش، ہماری ہر کاوش اس سامراج کی وجہ سے بہ ظاہر ناکام ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر ہمیں عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کرنا ہے تو پھر اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے پورے وسائل کے ساتھ برطانوی سامراج کے ساتھ ٹکرا جائیں۔ اس کی طاقت کو پاش پاش کر کے رکھ دیں جس کے بعد ہمارا راستہ صاف ہو جائے گا۔ اور ہمارا اپنی منزل مقصود پہنچنا آسان اور سہل ہو جائے گا۔“

۱۹۳۵ء کا اواخر تھا یا پھر غالباً ۱۹۳۶ء کا آغاز کہ ہم لوگ چنیوٹ سے دہلی نقل مکانی کر گئے۔ قبلہ والد ماجد محترم نذیر احمد جمیدی مرحوم وہاں پر کاروبار تھا۔ انہوں نے ہمیں بھی دہلی بلوایا۔ ہم لوگ ”چاندنی چوک“ اور

"بلی ماراں" کے سنگم پر ایک مکان پر مقیم ہوئے۔ جہاں سے فتح پوری مسجد چند قدم کے فاصلہ پر تھی۔ فتح پوری مسجد کے اوپر "فتح پوری مسلم ہائی سکول میں مجھے ساتویں جماعت میں داخلہ ملا۔ ان دنوں مسجد پر مجلس احرار اسلام کا جنون پورے جوہن سے طاری تھا۔ یہ پورا علاقہ مسلم لیگ کا گڑھ شمار ہوتا تھا۔ فتح پوری مسجد میں جمعہ کے روز مسلم لیگ کا پرچم لہرایا کرتا تھا۔ جبکہ جامع مسجد دہلی میں مجلس احرار اسلام کا سرخ ہٹلی پرچم لہرایا کرتا۔ فتح پوری مسلم سکول میں بھی مسلم لیگ ہی چھائی ہوئی تھی۔ لڑکوں کی اکثریت بھی مسلم لیگی ہی تھی۔ میں نے بھی باوجود اس صورت حالات سے واقفیت کے پہلے دن جب سرخ قمیض پہن کر سکول جانے کا قصد کیا تو قبیلہ والد صاحب نے مجھے ٹوکا اور کہا کہ: "وہاں سکول میں سب لڑکے لیگی ہونگے۔ اور وہ پھر تجھے تنگ کریں گے۔" لیکن میں نے ان کی ہدایت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پہلے دن تو ہر لڑکے نے مجھے روک کر میری سرخ قمیض کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "ابے تو احراری ہے کیا؟" میں نے سینہ چوڑا کر کے ہر ایک کو جواب میں کہا ہاں میں حراری ہوں دوسرے دن چھٹی کے بعد لڑکوں نے اکٹھے ہو کر مجھے گھیرا اور باقاعدہ پٹائی کی۔ میں اکیلا اور وہ بے شمار، اب ہر روز یہ ان کا معمول ہو چکا تھا۔ تعداد میں کثرت کی وجہ سے پلڑا ہمیشہ ان کا ہی بھاری رہتا تھا اگرچہ میں بھی اپنی ہمت کے مطابق کچھ نہ کچھ تو مدافعت کرتا تھا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ والد صاحب نے صبح کہا تھا۔ اور یہ میری غلطی تھی۔ تاہم اب کیا ہو سکتا تھا ایک دن انہیں باقاعدہ منصوبہ کے تحت جوش دلا کر میں اپنے ہمراہ گھر تک لایا جو سکول سے کچھ زیادہ دور نہ تھا اور اپنے چچا جان کو اوپر سے بلا لایا۔ چچا جان اس وقت ٹیڈی پٹجانی لباس میں تھے۔ پاؤں میں سلیپر، دھوٹی، لمبے بال، سفید دھڑی کرتا۔ انہوں نے جو لڑکوں کو لٹکرا تو لڑکے ڈر کے مارے کتابیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دوسرے دن لڑکوں کو سکول میں سرگوشیوں کے اندر یہ کہتے ہوئے سنا۔

"اس کے پاس بد معاش ہے اس کے قریب مت جائیو، نہیں تو قتل کروادے گا۔ ہم نے پٹھان کی قسم اپنی آنکھوں سے بد معاش دیکھا ہے"

در اصل جس لباس میں لڑکوں نے چچا جان کو دیکھا تھا وہاں بد معاش پہنتے تھے اور دہلی کے لوگ بد معاشوں سے بہت ڈرتے تھے۔ خدا نے اس طرح میری مدد کی کہ اب اسی سکول میں سیرا رب تھا۔ اور کوئی لڑکا میری ہوا کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

دہلی میں جاتے ہی ہم نے اپنے مکان پر مجلس احرار اسلام کا پرچم لگا دیا تھا اور ہر جمعہ کو جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے جاتے۔ ہم سارے بھائی پیدل بلی ماراں سے چاوڑی بازار ہوتے ہوئے جامع مسجد پہنچ جایا کرتے تھے۔ جمعہ کے روز جامع مسجد کے محراب کے قریب اور باہر صحن میں مجلس احرار اسلام کے پرچم لہراتے ہوئے نظر آتے تھے جس سے یہ تاثر عام تھا کہ اس علاقہ میں مجلس احرار اسلام کے کامیوں کی اکثریت ہے۔ ویسے بھی احرار کے تمام جملے بالعموم اسی جامع مسجد میں ہی ہوا کرتے تھے۔ شورش کشمیری مرحوم کو سب سے پہلے اسی

مسجد میں دیکھا اور سنا۔ میرے خیال میں وہ فوجی بھرتی بائیکاٹ کی تحریک ۱۹۳۹ء سے سات سال کی قید کاٹ کر جو رہا ہوئے تو سب سے پہلے دہلی شریعت لائے۔ ان دنوں دہلی میں سب احراری اکٹھے ہوتے تھے۔ شورش سے پہلے امیر شریعت نے خطاب فرمایا۔ ملکی سیاست پر احرار کا موقف تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا۔ آپ نے اپنی تقریر کے بعد شورش کو بلایا جو اس وقت مسجد کے ہال میں مراب کے قریب بیٹھے تھے۔ لیکن شورش شاہ جی کے بعد تقریر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس نے برابر اٹھ کر رہے تھے۔ بالآخر شاہ جی کے شدید اصرار پر شورش آئے اور انہوں نے شاہ جی کے بعد تقریر کی۔ یہ شورش کی وہ پہلی تقریر تھی جو میں نے سنی۔

پھر جب "آزاد ہند فوج" رہا ہوئی۔ ان سب فوجیوں نے اپنی پچھی پرانی وردیوں میں لمبوس دہلی کے بازاروں میں مارچ کیا۔ آزادی اور سبھاس چندر بوس کے نعرے لگائے۔ ایک عجیب سماں تھا وہ جدھر بنے بھی گزرتے لوگ سراپا عقیدت بن جاتے تھے۔ آزاد ہند فوج کے سپاہی جوش و خروش کی مثال بنے۔ اطمینان قلب، اعتماد، عزم راسخ کی تصویر، قدم سے قدم ملا کر مارچ کر رہے تھے۔ میں اس فوج کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ جدھر جاتے میں بھی ان کے ساتھ قدم ملاتا نعرے لگاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں کہاں گئے، لیکن وہ جہاں جہاں بھی گئے میں ان کے ہمراہ تھا۔ دل میں ایک عجیب جذبہ تھا۔ ہائے وہ کیفیت، آج بھی جب اس کیفیت کا احساس کرتا ہوں تو مزاج عجیب رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اس رنگ میں فقط ایک ہی رنگ موج زن نظر آتی ہے۔ اور یہ انگریز دشمنی کی رنگ ہے۔ آزادی وطن کی آرزو، جس کا پودا امیر شریعت نے دل و دماغ میں بچھن ہی میں لگا دیا تھا۔

کیپٹن ڈھلون، کیپٹن سگل اور کیپٹن شاہنواز کی رہائی کے موقع پر ایک جلسہ عام کانگریس کے زیر اہتمام گاندھی گارڈن میں ہوا تھا۔ یہ بڑا عظیم الشان اجتماع تھا۔ تاحد نگاہ انسان ہی انہاں تھے۔ انگریز دشمنی کا اتنا عظیم مظاہرہ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

مجلس احرار اسلام دہلی نے بھی کیپٹن شاہنواز کو انہی دنوں شاہی مسجد کے سامنے ننگی تلواروں سے سلامی دی حالانکہ احرار رصا کاروں پر پابندی تھی کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے باوجود جامع مسجد میں مجلس احرار اسلام کا جلسہ بھی ہوا اور ننگی تلواروں سے سلامی بھی دی گئی۔ جس سے کیپٹن شاہنواز نے خطاب کیا۔ میں اس جلسے میں شریک تھا۔ سٹیج کے بالکل قریب کیپٹن شاہ نواز کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ کیا خوبصورت جوان تھا۔ چہرے کی سرمئی میں ہلا کی رعنائی تھی۔ ہدو قامت و دلکش، نگاہ میں عتابی عزائم کی تصویر جھلک رہی تھی۔ انداز تقریر بے خوف اور بے باک تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تقریر نہیں کر رہا بلکہ میدان جہاد میں کھڑا کوئی بہادر تلوار چلا رہا ہے۔ تقریر کا آغاز ہی اس نے اس شعر سے کیا تھا۔

غازیوں میں ہو رہے گی جب تک ایمان کی  
تغ لندن تک چلے گی اہل ہندوستان کی

آزاد ہند فوج کے اس مندر اور بہادر کیپٹن نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمارے خلافت یہ محض پراپیگنڈا ہے کمرہ کانگریس کے دبشت میں، ایسا نہیں ہے۔ ہم انگریزوں کے خلافت کانگریس کے ساتھ ہیں۔ اگر کبھی حالات کا بہاؤ ہمیں اس مقام پر لے گیا کہ مسلمانوں کے مفاد کے لئے کانگریس سے لڑنا ضروری ہو گیا تو جس دلجمعی کے ساتھ آج ہم انگریزوں کے ساتھ لڑ رہے ہیں اسی دلجمعی کے ساتھ ہم آپ کو کانگریس کے ساتھ بھی لڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ہم پہلے مسلمان ہیں بعد میں ہندوستانی"

اس جلسے کے بعد احرار رضا کاروں کے خلافت مقدمات بھی بنائے گئے کہ انہوں نے دفعہ ۱۴۳ کی خلافت ورزی کی ہے۔ شاہ نواز کو تنگی تلواروں سے سلائی دی ہے۔ اس کے اعزاز میں جلوس مرتب کیا اور جلسہ منعقد کیا ہے۔ بہر حال یہ کھیل تو احرار رضا کار مدت سے کھیلتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے لئے یہ کوئی نیا شغلہ نہیں تھا۔

جامع مسجد دہلی کے جنوبی دروازے کے سامنے تمام سیاسی جماعتوں کے دفاتر تھے۔ ہر دفتر پر اس جماعت کا پرچم لہراتا تھا۔ ایک عجیب سماں تھا جو دیکھنے کے قابل ہوتا۔ مجلس احرار اسلام کا دفتر بھی یہیں پر تھا۔ ایک دن میں سرخ وردی میں ملبوس دفتر احرار میں اکیلا بیٹھا تھا کہ ضمیمہ احرار حضرت شیخ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ دفتر میں تشریف لائے۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ شیخ حسام الدین ہیں انہوں نے قریب آکر السلام علیکم کہا اور خود اپنا تعارف کرایا۔ نہایت دھیمے اور نرم لہجے میں فرمایا "مجھے حسام الدین کہتے ہیں"۔ میں سراپا عقیدت ایسی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو انہوں نے مجھے بیٹھے رہنے کو کہا۔ میں انہیں اپنے قریب پا کر نہایت خوش تھا کہ وہ بھی ان شخصیتوں میں سے ایک ہیں جن کے زندہ باد کے نعرے عموماً ہم لگایا کرتے تھے۔ یہ ان سے پہلی ملاقات تھی وہ کچھ اس طرح ملے کہ جیسے وہ مجھ سے کم تر شخصیت ہیں۔ ان کی عمر نو انکساری سے مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ شاید مجھ سے خوفزدہ ہیں۔ وہ اس طرح آہستہ آہستہ مجھ سے بات کرتے کہ جیسے مجھ سے مرعوب ہوں۔ لیکن بعد میں دہلی میں منعقد ہونے والے جلسوں میں جوا نہیں دیکھا اور سنا تو ان کی تقریر کی گھن گرج سے دہلی کے درو دیوار لرزتے ہوئے دکھائی دیئے۔ انگریزی سامراج کے خلافت ایک للکار جوزین سے آسمان تک کی فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیتی تھی۔ ایسے میں اکثر یہی سوچتا کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو مجھے دفتر احرار میں ملا تھا۔ اپنوں کے لئے نرمی اور کفر کے لئے اس بلا کی سستی تو دفعتاً ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر ذہن میں ابھرتا ہے۔

ہو حلقہ یاراں تو برہم کی طرح نرم  
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن



نبی ماراں کے عقب میں مشرق کی جانب ایک بہت ہی مشہور کوچہ "کوچہ رحمان" ہے جس میں ایک بہت ہی بڑے وسیع مکان میں تمام احرار رہنما قیام پذیر تھے۔ یہیں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی تشریف فرما تھے۔ میں اکثر چھٹی کے بعد گھر پر بستہ رکھ کر چلا آتا یہاں اکابر احرار کی گفتگو سے محظوظ ہوتا اور حضرت امیر شریعت کی محافل کا لطف اٹھایا کرتا۔ شاہ جی اب مجھے میرے نام سے پکارتے۔ شیریں پوٹا کہتے اور بعض اوقات کسی کام کے لئے بھی کہہ دیتے جیسے گھر میں بڑے بچوں کو بازار کے کام کے لئے کہہ دیتے ہیں۔ یہ روز کی ملاقاتیں مجھے ان کے بہت قریب لے آتی تھیں۔ اکثر جب آپ گفتگو سے فارغ ہوتے تو مجھے جسم دبانے کے لئے کہتے۔ میں ان کی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پکڑ کر ان کی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر انہیں دبایا کرتا تھا۔ اس دوران وہ اپنی ہلکی پھلکی باتوں سے مجھے محظوظ فرمایا کرتے۔ ایک دن ٹاٹے ہوئے اچانک میرا پاؤں ان کے پیٹ پر پڑا تو مسکرا کر فرمانے لگے "یوں نہیں بیٹا! یہ چوری وار کرتے ہو۔ چوری وار کرنا مردوں کا شیوا نہیں ہے۔ مرد تو لٹکار کر حملہ آور ہوتے ہیں" مجھے فرمانے لگے اب میرے پیٹ پر اپنے دونوں پاؤں رکھو۔ میں نے تعمیل ارشاد میں جب اپنا پاؤں ان کے پیٹ پر رکھا تو آپ نے اپنا پیٹ اس اثنا میں پھلا کر کس لیا تھا جو میرے پاؤں رکھنے کے باوجود مجھ سے نیچے نہ دبایا جاسکا۔ پھر انہوں نے مجھے دوسرا پاؤں بھی اپنے پیٹ پر رکھنے کے لئے کہا میں نے اپنا دوسرا پاؤں بھی ان کے پیٹ پر رکھ دیا۔ حکم ہوا کہ اب میرے پیٹ کو نیچے دباؤ لیکن میرے زور لگانے کے باوجود بھی پیٹ نیچے نہ دبا تو ہنس دینے اور دیر تک میرے ساتھ باتوں میں مصروف رہے۔ اب میری سجدہ میں آتا ہے یہ سب کچھ وہ میرے لئے کرتے تھے۔ یہ ان کا مزاج تھا کہ وہ اپنے مخاطب کی عمر کے مطابق اس سے ہم کلام ہوتے تھے۔ اسے اس دوران کبھی یہ احساس نہ ہوتا یا پھر وہ کسی کو یہ احساس نہ دلاتے کہ وہ کتنے عظیم انسان ہیں؟ وہ بچوں کے ساتھ بچوں والی حرکتیں کر کے یہ تاثر دیتے کہ گویا وہ بھی ان جیسے ہی ہیں۔ میں نے اکثر و بیشتر ان کی مجالس میں دیکھا کہ جب بھی ان کی محفل میں کوئی بچہ آجاتا تو وہ سب سے توجہ بٹا کر اس بچے کی طرف متوجہ ہوتے اپنی زبان کو توند کر کے اس سے باتیں کرتے۔ وہ خواہ جتنی بھی اہم بات کر رہے ہوتے اسے روک کر آنے والے بچے کے ساتھ باتیں کرتے یہ باتیں بعض اوقات کافی وقت لے لیتی تھیں۔ یہ باتیں ایسی پیاری ہوتی تھیں کہ سننے والا ان باتوں سے کئی سبق حاصل کرتا تھا۔ اور کبھی بور نہ ہوتا تھا۔ کوئی عالم دین شریعت لے آتے تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری بطور عالم دین اس کے ساتھ ہیکلام ہوتے تھے۔ اب سیرت، فقہ، حدیث، قرآن، تفسیر موضوع گفتگو بن جاتے امیر شریعت کو کئی مفسرین و مترجمین کے قرآن کے تراجم از برتے۔ وہ ایک آیت کا ترجمہ مختلف مترجمین کے حوالے سے کرتے اور کہتے کہ جو اس مفسر و مترجم حضرت صاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمے میں بات پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے کے ترجمہ میں نہیں ہے۔ علماء حضرات جو اس دوران آپ سے ہیکلام ہوتے تو متاثر ہوتے بغیر نہ رہتے۔ اب میں اکثر سوچتا ہوں یہ سب کچھ وہ بیان کرتے جو کہا کرتے تھے

کہ "میں نے تو اپنی کتابوں کی گرد جھاڑ کر بھی دیکھی۔ جو احترام علماء حضرات کا آپ کرتے تھے وہ فقط آپ کا ہی حصہ ہے۔ آپ کی محافل کا عجیب رنگ ہوتا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا۔ اسی دوران شاعر اگر آجاتے تو اب سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک شاعر نظر آتے۔ نظم، غزل، مرثیہ، قطعہ، دوبہ، رباعی، نعت، منقبت غرضیکہ شاعری کی وہ کوئی صفت ہے جو زیر بحث نہ آئی۔ اور سننے والے اس سے لطف اندوز نہ ہوتے۔ علم و ادب کا ایک خوبصورت بازار سج جاتا تھا۔ دیکھنے سننے والا حیران و شذر رہ جاتا کہ امیر شریعت ادب و فلسفہ میں بھی ایسی مہارت تامہ رکھتے ہیں کہ بڑے بڑے ادیب و شاعر آپ کی ہر بات اور آپ کی نکتہ آفرینیوں پر سر دھننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں نے انہیں شعراء کا کلام سناتے ہوئے بھی دیکھا اور شعراء کو اپنا کلام سناتے ہوئے بھی دیکھا۔ بڑے بڑے شاعر ان کے سامنے کلام پڑھتے تو ایک عجیب کیفیت میں مغموم ہو جاتے۔ امیر شریعت کچھ اس انوکھے انداز سے داد دیتے کہ شاعر تڑپ اٹھتا ایک اچھے شعر کے بارے میں دس پندرہ منٹ تک گفتگو ہوتی رہتی فرماتے کہ یہ شعر آپ کا بہت ہی عمدہ ہے۔ غالباً غالب نے اسی مفہوم کو اس طرح سے ادا کیا ہے لیکن جو بات نظیری کے اس شعر میں ہے وہ کسی میں بھی نہیں ہے۔ فارسی شعراء میں غالب، اقبال کے ساتھ ساتھ حافظ، فردوسی، اور بیدل کے سینکڑوں شعر آپ کو زبانی یاد تھے۔ آپ شعر پڑھتے تو سننے والا حیرت میں ڈوب جاتا کہ یہ وہی شخص ہے جو کچھ تصویریں دیر پہلے علم فقہ، حدیث اور تفسیر پر علماء کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فیصل آباد میں مدرسہ اشرف المدارس کے سالانہ جلسہ پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ گورو نانک پورہ گلی نمبر ۱۱ کے ایک مکان کی پیشک میں تشریف فرما تھے۔ حافظ لدھیانوی تشریف لائے تو آپ کے چہرے پر ایک خاص چمک دیکھی۔ چند منٹ تو خیریت معلوم کرنے میں گزر گئے بعد میں آپ نے فرمائش کی کہ حافظ بیٹے کچھ سناؤ" حافظ لدھیانوی انہیں اپنا کلام سناتے رہے اور شاہ جی اپنے انداز میں انہیں داد دیتے رہے۔ اتفاقاً میں اور حافظ لدھیانوی ایک ہی وقت میں ان کی پوچھتلف مفضل سے اٹھ کر باہر آئے تو حافظ لدھیانوی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کچھ رہے تھے۔

"نہ جانے یہ کیا شخصیت ہے کہ انسان کو مبہوت کر دیتی ہے اور کچھ بہت نہیں چلتا کہ کہاں بیٹھے اور کیا کر رہے ہیں۔ شعر کو سمجھنا اور شعر پر داد دینا کچھ شاہ جی پر ختم ہے۔ یہ انداز بہت ہی عجیب اور انتہائی منفرد ہوتا ہے۔ ایسی کیفیت میں شاعر مغموم ہو جاتا ہے جس کو الفاظ میں بیان کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔"

کوچہ رحمن کے اسی مکان جس کا تذکرہ اوپر ہو رہا تھا میں نے امیر شریعت اور علامہ انور صابری مرحوم کو آئے سانسے بیٹھے فی البدیہہ شعر کہتے بھی دیکھا ہے۔ علامہ انور صابری اپنے سامنے سگریٹوں کا ایک ڈھیر لگائے بیٹھے تھے۔ کاغذ آپ کے سامنے دھرا تھا اور کش پہ کش لگاتے ہوئے شعر پہ شعر لکھتے جا رہے تھے۔ شاہ جی ان کے سامنے بیٹھے ان کے اشعار پر داد دیتے جا رہے تھے۔ باقی سب لوگ یہ نظارہ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ مجھے

اس دن پتہ چلا کہ انور صابری شعر کس طرح کہتے ہیں۔ ان کے دماغ میں گویا کوئی شعر راز فیکٹری ہے جس میں شعر دھل دھل کر ان کی زبان پر منتقل ہوتے جا رہے ہیں۔ میں ایک بچہ تھا دیکھ کر حیران تھا کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو شعر گوئی جیسے مشکل فن پر اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ گویا شعر کھنانا ان کے لئے کوئی کام ہی نہیں ہے؟

شعر گوئی اور شعر فہمی سے حضرت امیر شریعت کو ایک فطری اور خصوصی لگاؤ تھا۔ غالب اور اقبال از بر تھے۔ تقریر کے دوران شعر پڑھنا کوئی ان سے سیکھے۔ یوں محسوس ہوتا کہ شاعر نے یہ شعر اسی موقع کے لئے لکھا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ فیصل آباد جو اس وقت لائل پور ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں سکھر جیل سے ایک سل قید کے بعد رہا ہو کر آئے تھے تقریر کے دوران سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اس بیان پر تنقید کر رہے تھے جو انہوں نے منیر انکوائری کمیشن کے سامنے دیا تھا جو کچھ اس طرح کا تھا۔

”میں نے تو انہیں (مجلس عمل والوں کو) منع کیا تھا کہ تحریک نہ چلائی جائے لیکن انہوں نے تو میری مافی ہی نہیں۔ میں تحریک چلانے کے خلاف تھا۔ میری مثال تو اس مسافر کی سی ہے جو سرک کے کنارے چلا جا رہا ہو ایک ٹرک پیچھے سے آئے اسے اپنی لپیٹ میں لے کر روندنا ہوا آگے نکل جائے۔“

شاہ جی نے اپنی تقریر کے دوران مودودی صاحب کے اس بیان پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ جس وقت ہم نے مجلس عمل کے تحت تحریک چلانے کا فیصلہ کیا تھا مودودی صاحب اس فیصلے میں موجود تھے۔ یوں ان کے گھٹنے کے ساتھ میرا گھٹنا تھا۔ وہ اس فیصلے میں میرے اور میرے دوسرے ساتھیوں اور تمام علماء کے ساتھ شریک مشور تھے۔ اب اس بات سے اگر وہ مکر گئے ہیں تو ہم کیا کریں؟“ اس پر آپ نے ایک شعر پڑھا۔

حضرت ناصح نے مے پی کے یہ اچھی چال چکی  
”مختب“ سے جا ملے رندوں کے ”مختبر“ ہو گئے

غالب کے شعر آپ کو خاص طور پر بڑے پسند تھے۔ اکثر و بیشتر اپنی تعاریر اور نجی محافل میں پڑھتے اور کچھ اس انداز سے کہ سننے والوں پر سرطاری ہو جاتا۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کافی عرصہ تک دہلی میں مقیم رہے۔ روزانہ کسی نہ کسی جگہ پر مجلس احرار اسلام اور جمعیت العلماء ہند کا ایک مشترکہ اجتماع ہوتا تھا۔ جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے۔ ان جلسوں میں میں بھی مجلس احرار اسلام کے ایک رصنا کار کے طور پر شریک ہوتا تھا۔ ایک ایسے ہی جلسے میں احرار رصنا کاروں نے مسلم لیگیوں کی پٹائی بھی کی تھی۔ یہ جلسہ لیگ کے گڑھ ”پل بنگش“ کے علاقے ”جناح پارک“ میں ہوا تھا۔ ایک مسجد کے سامنے ایک بڑا ہی وسیع میدان تھا۔ جسے پنڈٹال کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس کے ارد گرد کچی دیوار تھی۔ دیوار کے ارد گرد احرار اسلام کے جاں نثار ہزاروں باوردی رصنا کار اپنی

اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ میری ڈیوٹی مسجد کے اوپر اس کی چھت پر لاؤڈ سپیکر کے ایک ہائیک پر تھی۔ میں چونکہ بلندی پر تھا اس لئے پوری جلسہ گاہ میرے سامنے تھی اور میں ایک بڑی ہی اچھی جگہ سے سارے جلسے کا نظارہ کر رہا تھا۔ جلسے سے شوش کاشمیری، مولانا احمد سعید دہلوی اور مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہم کے علاوہ امیر شریعت نے بھی خطاب کیا تھا۔ مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی کو پہلی مرتبہ اسی جلسہ میں دیکھا اور سنا تھا۔ وہ کیا تقریر تھی کہ آج تک اس کی گونج میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ بڑے ہی تیز بولنے والے مقرر تھے۔ احرار میں اتنی تیز بولنے والا کوئی مقرر نہیں تھا۔ صاحبزادہ فیض الحسن کے بارے میں یہ بات بھی جاتی ہے کہ احرار مقررین میں سب سے زیادہ تیز بولتے تھے لیکن مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی کے مقابلے میں وہ بھی ماند تھے کیا غضب کے مقرر تھے۔ اتنی تیزی کے ساتھ تقریر کرنے والا میں نے ساری زندگی میں نہیں سنا۔ تقریر کیا کرتے یوں محسوس ہوتا کہ کوئی مرد مجاہد میدان کارزار میں اپنے دونوں ہاتھوں سے تلوار چلا رہا ہو۔ الفاظ آپ کی زبان سے اتنی تیزی اور تسلسل کے ساتھ نکلتے تھے جیسے کوئی مشین گن گولیوں کی بوچھاڑ کر رہی ہو۔ بلا کی کشش اور غضب کی گرفت تھی۔ مولانا احمد سعید دہلوی کو بھی پہلی مرتبہ اسی جلسے میں ہی سنا اور دیکھا۔ کیا خوبصورت چہرہ تھا۔ شرافت اور متانت کی بولتی تصویر دکھائی۔ جلسے کے ارد گرد مسلم لڑکی بھی ہزاروں کی تعداد میں موجود تھیں جو مخالفانہ نعرہ بازی کر رہے تھے جس کی وجہ سے مقررین کو تقریر کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ مولانا حفیظ الرحمن اور مولانا احمد سعید نے تو ان حالات میں اپنی تقریر جاری رکھی لیکن جب آغا شورش کاشمیری نے تقریر شروع کی تو وہ بلا مخالفت میں نعرہ بازی کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ آغا صاحب نے صورت حالات پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے احرار رضا کاروں کو انہیں بھاگ دینے کا حکم صادر فرمایا۔ بس پھر کیا تھا۔ میں اوپر چھت سے اس پٹائی کا نظارہ کر رہا تھا جو احرار رضا کاروں نے ان لڑکی نعرہ زن افراد کی کی تھی۔

آغا صاحب کے بعد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر تھی۔ اس جلسے میں بھی آپ نے قیام پاکستان کے حوالے سے اپنے ان خدشات کا اظہار کیا جو آپ عموماً ان دنوں کی تقریر میں کیا کرتے تھے۔ یہ خدشات قیام پاکستان کے بعد مسلم لڑکی قیادت نے اپنی ضد اور حماقت سے پورے کر کے دکھا دیئے ہیں اور جو باقی رہتے ہیں وہ بھی ان سے توقع ہے کہ خدا نخواستہ ضرور پورے کریں گے۔

اسی طرح کا ایک جلسہ ہمارے محلہ ملی ماراں میں بھی ہوا۔ جس کو اس وقت کے سپرنٹنڈنٹ پولیس "مسٹر ٹیل" نے انک اور گیس اور لاٹھی چارج کے ذریعہ سے درہم برہم کر دیا تھا۔ یہ انگریز افس۔ پی بیوٹا وہی ہے جس نے ۱۹۳۹ء کی تحریک قومی بھرتی بائیکاٹ کے دوران ملتان کے جلسہ عام میں شورش کاشمیری کو دوران جلسہ تقریر کرتے ہوئے گرفتار کیا تھا۔ یہ لاٹھی چارج بھی انتہائی شدید تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ لوگ بچارے جوتے اتار کر اور قمیض اتارے ہوئے ذریعوں پر بڑے آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہ جی اچھی جلسہ گاہ

میں تشریف نہیں لائے تھے۔ انور صابری سٹیج پر اپنی نظم پڑھ رہے تھے۔ کہ پولیس نے بلا منہ کئے مجمع پر لاشی چارج کر دیا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگ گئے۔ کئی افراد زخمی بھی ہوئے جس کو جہاں پناہ ملی اس جگہ کو غنیمت سمجھ کر وہیں دبک گیا۔ میں بھی ایک مکان کی سیر معیوں میں پناہ گزین ہوا۔ اتفاق کی بات ہے کہ انور صابری بھی وہیں پر مجھ سے پہلے موجود تھے۔ موٹے جسم کے آدمی گرمی بے تحاشان کاسانس اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ تمام لوگوں کو بڑی آسانی سے آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرا حال پولیس جب اپنا کام کر کے وہاں سے رخصت ہوئی تو ہم لوگ سیدھے اس مکان پر پہنچے جہاں اسیر شریعت قیام پذیر تھے۔ وہاں پر موجود سب لوگوں کو پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کہ جلسہ پولیس تشدد کی نذر ہو چکا ہے۔ میرے بعد جلد ہی انور صابری صاحب بھی اسی مکان پر تشریف لائے۔ ہانپتے کانپتے ہوئے، ش سانس پھول رہی تھی۔ گرمی سے برا حال تھا۔ شاہ جی کو خطاب کرتے ہوئے کہا

”مروادیا شاہ جی آج تو آپ نے واقعی ہی مروادیا۔ پولیس ظالم نے اتنا شدید لاشی چارج کیا ہے کہ خدا کی پناہ۔ ظالموں کو ذرہ ترس نہیں آیا نہ جانے کتنے لوگ زخمی ہو گئے ہیں۔ آپ تو غالباً پہلے ہی بھانپ گئے تھے اسی لئے جلسہ گاہ میں تشریف نہیں لائے؟“

شاہ جی انور صابری کی اس تقریر پر مسکرا رہے تھے اور کہہ رہے تھے

”احرار کے جلسوں میں نظمیں پڑھتے ہو تو ذرا ہمت سے کام لو ہمارے ساتھ تو نہ جانے کب سے یہ کام ہو رہا ہے اور نہ جانے کب تک ہوتا رہے گا؟“

ہم جلسہ کے درہم برہم ہونے کے بعد کافی دیر تک شاہ جی کے ساتھ اس مکان میں موگفتگور رہے اور بھی بہت سے لوگ وہاں پر موجود تھے۔ میرے والد محترم جناب نذیر جمیدی مرحوم بھی میرے ساتھ اس وقت موجود تھے۔ ہم گھر سے اکٹھے ہی جلسے میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ جب بھی ہم اٹھ کر جانے کی کوشش کرتے تو لوگ یہ کہہ کر ہم دونوں کو روک دیتے کہ باہر پولیس والے موجود ہیں اور لوگوں کو تنگ کر رہے ہیں۔ بعض لوگوں کو گرفتار بھی کر چکے ہیں۔ لہذا ذرا کچھ دیر اور رک جاؤ! ہم پھر بیٹھ جاتے لیکن آخر جب رات و محل گئی تو مجھے والد صاحب نے کہا کہ ”آؤ اب چلیں“ کوچر وطن سے ہمارا گھر کچھ زیادہ دور نہیں تھا لیکن حالات کی کشیدگی کی وجہ سے ایک ان جانا سا خوف میرے دل و داغ پر ضرور تھا۔ میں ساتویں جماعت کا طالب علم بولا کہاں تک بہادر ہو سکتا تھا؟ جب ہم باپ بیٹا دونوں مکان سے باہر آئے تو ایک آدمی ہمیں سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ جس نے ہمارے قریب آتے ہی میرے والد صاحب سے کہا پچے کو سرخ قمیض پہنا کر کہاں لئے جا رہے ہو پولیس تو سرخ قمیض والوں کو تلاش کر رہی ہے کیلپے کو گرفتار کروانے کا ارادہ ہے؟ میں ڈر کر رک گیا اور فوراً باجی سے کہا کہ اباجی میں قمیض اتار دوں ”مجھے والد صاحب کا جواب آج تک یاد ہے فرمانے لگے۔

”یا تو سرخ قمیض پہنتے نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ سرخ قمیض اب انگریز دشمنی

کی علامت بن چکا ہے اور اگر ایک مرتبہ پہن لی جائے تو اسے اتارتے نہیں۔ لہذا اب خواہ کچھ ہو جائے تم اسے نہیں اتار سکتے، خدا پر بھروسہ رکھو اور چلو؟“

چنانچہ ہم پولیس والوں سے بچ بچا کر بغیریت اپنے گھر پہنچ گئے لیکن میں نے وہ سرخ قیض اس وقت اتاری اور نہ ہی آج تک اسے اتارا ہے وہ یوں کہ میں آج بھی تحریک احرار سے اسی طرح متاثر ہوں جس طرح اس وقت تھا بلکہ اب میں زیادہ پہنچتی کے ساتھ اس پر قائم ہوں، میرا ایمان ہے کہ احرار کی یہ اسلامی تحریک برصغیر کی وہ پہلی اسلامی انقلابی تحریک ہے جس نے بڑی بہادری کے ساتھ اپنی لڑائی لڑی۔ اس کے دو بڑے محاذ تھے۔ ایک جنگ آزادی دوسرا احیاء و نفاذ اسلام، اس تحریک کو بہ ظاہر ختم کرنے میں دو بڑی سرمایہ دار جماعتوں کا یکساں کردار ہے جن کو عرف عام میں مسلم لیگ اور کانگریس کہتے ہیں۔ جن کو نہ تو اسلام قبول تھا اور نہ ہی غریب، احرار آج بھی اسی مقام پر موجود اور اسی موقف پر قائم ہیں جو ان کے اکابر نے ان کے لئے منتخب کیا تھا۔ ان عزائم اب بھی بلند ہیں۔

وہ اپنی خون چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدل لیں

سبک سر ہو کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

یا پھر میرا اپنا ایک شعرا سی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے۔

ہے ناؤ شکستہ سی اور بادِ مخالفت بھی

پر عزمِ جوان اپنا آئے تو بھنور آئے

ایک دن میں کوچہ رحمن کے اسی مکان میں موجود تھا۔ اس وقت احرار کابینہ کے تمام مقتدر رہنما

میرے سامنے موجود تھے۔ جن میں شیخ حسام الدین، شورش کاشمیری، قاضی احسان احمد شجاع تھلوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہاں البتہ آج ان میں ایک شخصیت کا اضافہ تھا۔ یہ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی تھے جن کو میں نے پہلی دفعہ اسی روز دیکھا تھا۔ کیا پر رعب شخصیت تھی۔ عینک کے بجاری شیشوں کے نیچے سے بڑی عتابی آنکھیں اتنی پُر ہول تھیں کہ ان پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ یہ سب رہنما ایک دائرہ میں فرش پر بھی دریوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص متفان کچھ خر بوزے لیکر آیا۔ خر بوزے اس کے اپنے کھیت کے تھے۔ اور تھے بھی اعلیٰ قسم کے۔ ایک ایک خر بوزہ کے آگے رکھ دیا گیا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے خر بوزے کو کاٹا اور کھانا شروع کیا۔ شورش کاشمیری نے بھی اپنا خر بوزے کو کاٹا اور کھانا شروع کیا تو میں بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہرے کے تاثرات کچھ ایسے تھے۔ شاید خر بوزہ میٹھا نہ تھا۔ اسی دوران حضرت امیر شریعت نے اپنا خر بوزہ کاٹ کر کھایا تو آپ نے پچھتے ہی اپنے مخصوص انداز میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا شروع کر دیا۔ شورش بھانپ گئے کہ شاہ جی کا خر بوزہ بہتر ہے۔ خوشبو سے سارا کمرہ معطر ہو رہا تھا۔ شورش نے بھی اپنے خر بوزے کی تعریف شروع کر دی۔ واہ کیسا میٹھا ہے اور کیسا خوشبودار اس کے ساتھ ہی شورش اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنے

خربوزے کو اٹھا کر شاہ جی کے سامنے رکھ دیا اور شاہ جی کے سامنے سے ان کا خربوزہ اٹھا کر اپنے آگے رکھ کر کھانا شروع کر دیا۔ اب جو شاہ جی نے شورش والے خربوزے کو کاٹ کر چکھا تو سب کچھ بھانپ گئے۔ مجھے اچھی طرح اب یاد ہے کہ شاہ جی کے منہ کے ساتھ خربوزے کی پھانک لگی ہوئی ہے اور شاہ جی کی آنکھیں شورش کے پھرے پر اور پنچائی میں کھڑے ہیں۔

”پٹر پیونال وی داکھید گیاں ناں؟“

شاہ جی کا یہ کہنا تھا کہ شورش کھکھلا کر ہنس پڑا جس کے ساتھ ہی ساری مفل کت زعفران بن گئی۔ لب سوچتا ہوں کہ یہ سب کیسے عظیم لوگ تھے اور کیسی مغفیل تھیں آپس میں کس طرح شیر و شکر اور دشمنوں کے مقابلے میں سیدہ پلائی ہوئی دیوار۔ یقیناً جو لوگ آپس میں محبت کرنے والے ہوتے ہیں وہی کفار کے مقابلے میں سخت جان ثابت ہوتے ہیں۔ اکابر احرار اشداء علی الکفار رحماء بینہم کی عملی تفسیر تھے

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم  
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اسی طرح ایک دوسرے روز کی بات ہے کہ ہم سب اسی مکان میں بیٹھے تھے کہ شورش نے بار بار کھانا شروع کر دیا۔ کہ ”چلو شاہ جی چلیں“ دو ایک بار تو شاہ جی نے شورش کی بات پر کچھ توجہ نہ دی لیکن جب شورش کا اصرار زیادہ ہو گیا تو کہنے لگے ”اچھا بھائی چلتے ہیں“ جیسے شاہ جی کا اپنا جی نہ ہو اور مجبوراً ہاں کہہ رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ شورش شاہ جی کو کہیں لیکر جانا چاہتے ہیں۔ پھر شورش نے کہا کہ شاہ جی ملاقات کا وقت قریب آ گیا ہے اٹھیں اور تیار ہو جائیں۔ شاہ جی اٹھے اور اپنے موٹے کھدر کی شلوار قمیض کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔

”اس گاندھی کی بھی سن لو، لوگوں کو کہتا پھرتا ہے کہ کھدر پہنو۔ اور خود اس نے ساری زندگی کھدر کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ پوری زندگی لمبل کی ایک لنگوٹی میں بسر کر دی۔ اب لوگ ہیں کہ موٹا کھدر پہن رہے ہیں۔ میری طرف ہی دیکھو یہ قمیض تقریباً چار سیر کی تو ہوگی اور اتنی ہی بھاری یہ میری شلوار ہے“  
حضرت شاہ جی شلوار قمیض پہن کر شورش کے ساتھ چلے گئے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی کے ساتھ ملاقات کا وقت ہے۔ اس لئے شاہ جی اسے ملنے کے لئے شورش کے ساتھ گئے ہیں۔ شورش نے اپنی کتاب ”سید عطاء اللہ شاہ بخاری“ کے دوسرے ایڈیشن میں یہ واقعہ ذرا تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے جس سے تائید ہو گئی ہے کہ آپ دونوں گاندھی کو ہی ملنے گئے تھے۔ دہلی میں ان دنوں تقریباً ہر مشہور مقام پر جمعیت العلماء ہند اور مجلس احرار اسلام کے اشتراک سے جلسے منعقد ہو رہے تھے۔ غالباً مدنی فارمولا کی حمایت میں ان جلسوں کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ ”مدنی فارمولا“ کے بارے میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ جب ان دنوں جماعتوں کی جانب سے اتفاق رائے کے ساتھ بجائے پاکستان مدنی فارمولا ہنڈت نہرو کو پیش کیا گیا

تو اس نے اسے مسترد کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

”اس سے بہتر یہ ہے کہ ہم پاکستان کی تبویز تسلیم کر لیں کیونکہ یہ فارمولا تو ہندوستان کے ہندوؤں کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوگا!“

دہلی کے یہ متحدہ اجتماعات اسی تبویز کو شاید موثر بنانے کے لئے کئے جا رہے تھے۔ یہ وقت ہندوستان کی سیاست میں انتہائی مشکل، تیز اور نہایت اہم مرحلہ تھا۔ ہر سیاسی جماعت اپنی حیثیت کے مطابق پہلے سے زیادہ فعال تھی اور اپنے اپنے موقف کے بارے میں بڑی تنگ و دو میں مصروف نظر آتی تھی۔ تاکہ ہندوستان کے مستقبل کو اپنی خواہشات کے مطابق اپنے حق میں فتح کر سکیں۔

مجلس احرار کا آخری اور سب سے بڑا جلسہ دہلی کے اردو پارک میں اپریل ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کی اہمیت اور حیثیت کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ اس میں کبھی گئی باتیں آج حرفِ صبح اور درست ثابت ہوئی ہیں۔ سب سے اہم تقریر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تھی۔ اردو پارک کے وسیع و عریض میدان میں شاہی مسجد کے عین سامنے سٹیج لگایا گیا تھا۔ سٹیج کی پشت پر دہلی کے لال قلعے کی عظیم الشان فصیل ایک عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔ لوگوں کا بے مثال اجتماع جیسے بلاشبہ انسانوں کا سمندر کہا جا سکتا ہے۔ شاید میری زندگی کا یہ سب سے بڑا جلسہ تھا تاہم لگا ہوا انسان ہی انسان تھے۔ جن کو احرار کے ہزاروں رضا کاروں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ سٹیج بہت اونچا اور بڑا وسیع بنایا گیا۔ مجلس احرار اسلام کے تمام اکابر سٹیج پر فوکش تھے۔ شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی انصاری، ماسٹر تاج الدین انصاری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، شورش کاشمیری، نواب زادہ نصر اللہ خان، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی (اگرچہ وہ جماعت کو چھوڑ چکے تھے۔ لیکن جلسہ سننے کے لئے تشریف لائے۔ وہ کبھی کبھار کوچہ رحمان میں احرار رہنماؤں کے پاس تشریف لاتے تھے)۔ لیکن یہ سب رہنماء ایک عظیم رہنما کا انتظار کر رہے تھے اور وہ تھے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ شاہ جی سب سے آخر میں تشریف لائے تو شرکاء جلسہ جموں لٹھے عجیب و غریب سار ان کی آمد پر دیکھنے میں آیا پورا مجمع اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لوگوں کے چہرے خوشی سے دھک لٹھے۔ امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے پوری فضاء گونج اٹھی۔ اسی گونج میں شیخ حسام الدین (جو سٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہے تھے) کی آواز بلند ہوئی جیسے کوئی شیر دھاڑ رہا ہو آپ نے کہا!

”میں احرار رضا کاروں کو حکم دیتا ہوں کہ جلسے کے انتظام و فرائض میں کوئی کوتاہی نہ ہو، جس شر پسند کا سر جہاں سے لٹھے اسے وہیں کھل دیا جائے اور ہاں یاد رہے کہ کلہاڑی سیدھی پٹنی چاہیے حالات کا میں خود ذمہ دار ہوں“

یہ آواز پورے ماحول میں ایک ارتعاش پیدا کر گئی۔ شاہ جی نے چند تھاریر کے بعد لوگوں سے مخاطب ہو کر درود شریف پڑھنے کے لئے کہا۔ خود بھی درود شریف پڑھتے رہے، لوگ حیران تھے کہ شاہ جی کا یہ آغاز ان کے معمول کے مطابق نہیں تھا۔ دفعتاً امیر شریعت نے فرمایا کہ میں نے دانستہ درود شریف پڑھوایا ہے



کیونکہ مجھے یقین ہے کہ صبح کو ہمارے مخالفین نے اپنے اخباروں میں بھی کچھ لکھنا ہے کہ عطاء اللہ شاہ نے اگرچہ لاکھوں کے مجمع کو خطاب کیا لیکن ان میں مسلمان ایک بھی نہیں تھا۔ سب غیر مسلم اکٹھے کر رکھے تھے۔ اب کم از کم وہ یہ بات نہیں لکھ سکیں گے۔ لاکھوں نے خود درود شریف پڑھا اور سنا ہے۔ جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مجددہ مجمع مسلمانوں کا ہے جو بخاری کی باتیں سننے کے لئے آیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی تاریخی تقریر کا آغاز باقاعدہ خطبہ مسنونہ کے ساتھ کیا اور یوں پوری رات آپ نے اس عظیم الشان اجتماع سے خطاب کرنے میں بسر کر دی۔ تقریر کیا تھی شاہ جی کی سیاسی بصیرت اور روحانی عظمت کا ایک حصہ مرقع جس میں آپ نے آنے والے سیاسی حالات کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار فرمایا تھا۔ جو وقت نے صبح اور درست ثابت کر دیے ہیں۔ پاکستان بنے ۷۳ سال بیت پکے ہیں لیکن کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں ایک بات بھی ایسی ہوئی ہو جس سے بخاری کی تردید ہوئی ہو۔ میں خود جلسہ گاہ میں موجود تھا۔ مجھے سٹیج کے ایک گوشے میں بڑی اچھی جگہ مل گئی تھی۔ جہاں بیٹھ کر میں جلسہ گاہ کا نظارہ کر رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے شاہ جی کا چہرہ تھا۔ جس سے مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میرے بالکل قریب بیٹھ کر تقریر کر رہے ہوں۔ خطبہ مسنونہ کے بعد شاہ جی کے پہلے فقرے کچھ اس طرح تھے۔

”مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے جیسے اس بات پر کہ صبح کو مشرق سے سورج طلوع ہونے والا ہے۔ جو اس وقت مسلمانان پاک و ہند کے دل و دماغ میں پاکستان کا جو نقشہ موجود ہے۔ وہ حقیقت سے بالکل مختلف ہوگا۔“

وہ پاکستان کیا ہوگا؟ اس پر ساری رات آپ نے تقریر فرمائی۔ لوگ سنتے رہے اور سر دھنتے رہے۔ وہ تاریخی لمحات گزر گئے لیکن جو باتیں آپ نے فرمائیں وہ ایک ایک پوری ہو کر رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جو نتائج سامنے آئے ہیں ان سے شاہ جی کی کبھی ہوئی باتوں کی تائید ہوتی ہے۔ قلمبند تریک پاکستان چاہتے تو ان خدشات کو سامنے رکھ کر اس دھرتی پر حکومت کر سکتے تھے۔ اور ان خطرات سے ملک محفوظ بھی رہ سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔

ہے حقیقت بس وہی جو تو نے کر دی تھی عیاں  
اور سب کچھ وقت کی آنکھوں میں تھا مثل سراب  
تجھ پہ جو الزام تھا رد ہو گیا ہے وقت سے  
تیرے نکتہ چیں ہوئے ہیں شرم سے اب اب اب

اس تاریخی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا

”بنائی بات لڑنے اور جگڑنے کی نہیں سمجھنے کی ہے۔ تم ایک ملک پر اسلام کی حکومت کی بات کرتے ہو۔ مجھے تم اس بات کا یقین دلادو کہ کل کو کسی گاؤں کے کونے پر اسلام نافذ ہونے والا ہے۔ تو میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن جو لوگ اپنی ڈھائی من کی

لاش اور چھ فٹ کے قد پر اسلام نافذ نہیں کر سکتے۔ جن کا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا، وضع قطع، لین دین، شکل و صورت، لباس و معاملات، طور طریقے، کچھ بھی اسلام کے مطابق نہیں ہے ان سے میں کیسے توقع رکھوں کہ وہ ایک ملک پر اسلام کی حکومت قائم کر دیں گے۔ یہ ایک فریب ہے اور میں یہ فریب کھانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

تم یہ ملک چلاؤ گے کیسے۔ مجھے یہ تو سمجھا دو (کلماشی ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے اسے بلند کر کے کہا) یہ ہمارا مشرقی پاکستان ہو گا۔ اور یہ مغربی پاکستان۔ درمیان میں ہزاروں میلوں پر مشتمل ہندوؤں کی حکومت ہو گی۔ ہندو، کون ہندو؟ مکار ہندو، عیاش ہندو جن کو تم نے اتنے لمبے عرصے تک غلام بنائے رکھا وہ تم سے اس کا انتقام لیں گے۔ تمہیں طرح طرح سے تنگ کریں گے۔ کبھی تمہارے دریاؤں کا پانی بند کر دیا جائے گا۔ کبھی تمہاری سرحدوں پر فوج کھڑی کر دی جائے گی اور تمہاری حالت یہ ہو گی کہ بوقت ضرورت مشرقی پاکستان والے مغربی پاکستان کی مدد نہیں کر سکیں گے اور مغربی پاکستان والے مشرقی پاکستان کی مدد نہیں کر سکیں گے۔ جناح سے کچھ دو۔ یہ بات مجھے سمجھا دے کہ یہ ملک کیسے قائم رہے گا۔ بس ایک بار مجھے سمجھا دو۔ پھر تم گھر بیٹھ جانا میں اور میرے رضا کار تمہاری اس تحریک کو اکیلے کامیاب کر دیں گے۔ لیکن یہ تم سے نہ ہو سکے گا۔

"پاکستان کے اندر کیا ہو گا۔ چند خاندانوں کی حکومت ہو گی۔ وہ خاندان جو ٹوڈی خاندان کہلاتے ہیں۔ جاگیردار اور سرمایہ دار خاندان، ان کی لوٹ کھسوٹ سے پاکستان کے خرب، دن بہ دن غریب سے غریب تر ہوتے چلے جائیں گے اور امیر، امیر سے امیر تر یہی چند خاندان اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر پورے ملک پر حکومت کریں گے اور غریبوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا۔ اسلام ایک مسافر کی طرح ہو گا"

شاہ جی کی یہ تاریخی تقریر صبح تک جاری رہی۔ نماز فجر کی اذان کے ساتھ جلے کے اختتام کا اعلان ہوا۔ قیام پاکستان سے پہلے دہلی میں شاہ جی کی یہ آخری تقریر تھی۔

دہلی میں سیاسی فضا میں ہلاکی کنیدگی تھی۔ ایک زبردست تنوع تھا۔ جلے جلوس روزمرہ کا معمول بن چکے تھے۔ منم لیک، کانگرس، مجلس احرار اسلام اور دوسری سیاسی جماعتیں برہمی فعال نظر آتی تھیں۔ انگریزی حکومت نے یہ بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان میں ان کے اقتدار کے دن اب تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اگرچہ سیاسی جماعتوں کا موقف اور مشن ایک دوسرے سے جدا اور مختلف تھا۔ تاہم ایک بات سب میں مشترک تھی کہ ہندوستان کو آزادی دی جائے۔ اختلاف اگر تھا تو اس بات پر کہ آزادی کی شکل کیا ہو، دوسری جنگ عظیم میں فتح انگریزوں کا مقدر ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں ہندوستان میں اپنی شکست بھی سامنے نظر آرہی تھی۔ محکمہ ڈاک کی ہرمیٹل، نیوی کے اندر زبردست ہرمیٹل، لوگوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی اور انگریزوں

کے خلاف ان کا اظہار نفرت، ان حکمرانوں پر عیاں ہو چکا تھا۔ دہلی کے حالات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انگریز اپنا بوریا بستر باندھ رہا ہے۔ حکومت نے جاپان کی فتح پر جشن قہج منانے کا اعلان کر دیا۔ جشن فتح کی تیاریاں حکومت کی طرف سے بڑی دھوم دھام سے شروع ہو گئیں۔ لیکن اس جشن کو ناکام بنانے کے لئے بھی پروگرام وضع کر لئے گئے۔ جس روز جشن قہج کا اعلان تھا۔ اس روز شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ چاندنی چوک اور مارال کی پوری آبادی جس میں ہندو، سکھ اور مسلمان سبھی شامل تھے سڑکوں پر نکل آئے۔ لوگوں کی ٹولیاں، ادھر ادھر انگریزوں کے خلاف نعرے لگاتی پھر رہی تھی۔ سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں گئیں تاکہ پولیس کے تعاقب سے محفوظ رہا جاسکے۔ عوام نعرے لگاتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ ہر سرکاری عمارت جس کو سجایا گیا تھا عوامی توڑ پھوڑ کا شکار ہو رہی تھی۔ درختوں پر لگائے گئے برقی قہجے لوگوں کے ڈنڈوں کی زد میں تھے۔ رفتہ رفتہ جذبات میں شدت پیدا ہو گئی۔ سرکاری عمارتوں پر حملے کئے گئے، بجلی گھروں کو جلادیا گیا۔ پولیس نے اشک آور گیس کی بارش کر دی تھی۔ لوگ اس پر بھی باز نہ آئے تو پھر کئی جگہوں پر گولی چلائی گئی کئی افراد ہلاک ہوئے اور سیکڑوں زخمی۔ ٹیلی فون اور بجلی کے تار کاٹ دیئے گئے۔ بجلی کے کھمبے دوہرے کر دیئے گئے۔ غرضیکہ پورا دن پولیس اور لوگوں کے درمیان ایک مسلسل جنگ کی صورت برقرار رہی اور اسی کشمکش میں شام ہو گئی۔ لیکن روشنی کا کھمیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ پورا شہر دہلی تاریکی میں ڈوبا ہوا انگریزی ظلم و ستم پر ماتم کناں تھا۔ لیکن اس بات پر ہر شخص خوش بھی ضرور تھا کہ انگریزوں کا جشن چراغاں اندھیرے میں ڈوب چکا ہے۔ شاید یہ کیفیت ویسی ہی ہو، یہ اندھیرا اپنی نوعیت اور کیفیت کے اعتبار سے ویاہی ہو جو ان دنوں تاج بھٹن کی قیادت میں دہلی والوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی تھی۔ بے پناہ تشدد اور بے پناہ قتل و غارت کر کے دہلی والوں کو عتاب کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ لیکن آج کے اندھیرے اور ۹۰ سال پہلے کے اندھیرے میں ایک فرق ضرور تھا۔ کہ ظلم کی رات کے آغاز کا اندھیرا تھا اور یہ صبح صادق سے ذرا پہلے کا اندھیرا تھا اس غلامی کے اندھیرے کو آزادی کی روشنی میں تبدیل کرنے کے لئے ایک طویل اور انسٹیک جدوجہد، کو عمل دخل حاصل رہا۔ پاک و ہند کی غلام فضا میں سانس لینے والوں کو آزاد فضاؤں سے روشناس کرانے کے لئے نہ جانے کتنی قربانیاں دینا پڑیں۔ اس ننگ و دو میں کتنی جوانیاں کام آئیں۔ کتنے بڑھاپے بے سہارا ہوئے اور نہ جانے کتنے سہاگ اجڑ گئے اور اس کوشش اور کاوش میں اللہ کے فضل و کرم سے مجلس احرار اسلام کا حصہ وافر ہے۔ مجلس احرار نے حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ولولہ انگیز قیادت میں ایک نیا جوش پیدا کیا، انگریز دشمنی کا وہ بیج بویا کہ تشدد کے سانے میں بھی وہ اب تناور درخت بن چکا تھا۔ جس کو اکھاڑنا انگریزوں کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد ہم نے یہ سب کچھ بھلا دیا۔ کہ کتنی بڑی قربانیوں کے بعد اللہ نے ہمیں یہ نعمت عطاء کی تھی۔ اسے کاش آزادی کی یہ نعمت اچانکے اسلام اور اتحاد بین المسلمین کا ذریعہ بنتی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس پر جتنے بھی آنسو گرائے جائیں کم ہیں۔

جس صبح کا وعدہ تھا اس دیں کے لوگوں سے  
اسے کاش کبھی خالد وہ بھی تو سر آئے

۱۹۳۶ء کے آخر میں ہم پنجاب (چنیوٹ) چلے آئے۔ چند روز رشتہ داروں کے درمیان رہ کر واپس دہلی جانے کا پروگرام تھا۔ والد محترم نذیر جمیدی دہلی میں اچھا بھلا کام کر رہے تھے۔ مکان اور کارخانہ جہاں ہمارے کاریگر جنت سازی کا کام کرتے تھے وہیں چھوڑ آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو ہمارا دوبارہ دہلی جانا منظور نہیں تھا۔ مجھے تب مرقہ ہوا اور طویل ہو گیا۔ میری تیمارداری اور بیماری دہلی واپس جانے کے راستے میں حائل ہو گئی۔ پھر فسادات تیز ہو گئے اور قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا۔

قیام پاکستان کے بعد غالباً ۱۹۴۷ء میں فیصل آباد (جو اس وقت لائل پور تھا) میں ایک بہت بڑی احرار کانفرنس منعقد ہوئی۔ چنیوٹ جسے پنجاب میں مجلس احرار اسلام کے اہم مرکز کی حیثیت حاصل تھی اس کانفرنس کی تیاریوں میں پیش پیش تھا۔ گردو نواح کی بستیوں سے بھی احرار رضا کار چنیوٹ پہنچ گئے اور ایک بہت بڑا جمیٹ لائل پور کے لئے روانہ ہوا۔ دھوبی گھاٹ جواب اقبال پارک کے نام سے موسوم ہے میں کانفرنس کا اہتمام تھا۔ وسیع پنڈال میں ہر جگہ مختلف شہروں سے آنے والوں جیوش کے خیمے لگے ہوئے تھے یہ پورا علاقہ احرارستان کا سماں پیش کر رہا تھا۔ غالباً دو روزہ کانفرنس تھی۔ صبح کو رضا کاروں کے مظاہرے شہر میں پریڈ اور رات کو اجتماع ہوئے۔ جلسہ گاہ میں داخلہ بذریعہ گٹ تھا ہمارے شہر کے ایک رضا کار محمد حسین اور چند دوسرے رضا کاروں کی گیت پر ڈیوٹی تھی شاہ جی جب اپنے ساتھ کافی لوگوں کے ہمراہ گیت پر اندر داخل ہونے کے لئے تشریف لائے تو محمد حسین نے شاہ جی سے داخلہ گٹ طلب کر لیا جو غالباً ایک روپے کے عوض دستیاب تھا۔ شاہ جی نے کہا کہ بھائی گٹ تو میرے پاس نہیں ہے جواب میں محمد حسین نے کہا کہ پھر جائیے اور گٹ لے کر آئیے شاہ جی نے رضا کار کے حکم کی تعمیل کی اور جا کر باقاعدہ گٹ خریدا جس کے ساتھ ہی ان تمام لوگوں کو بھی گٹ خریدا پڑا جو آپ کے ہمراہ تھے بعد میں شاہ جی نے محمد حسین کو شاباش دی اور اس کے اس کام کو سراہا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رضا کار اور احرار رہنما ڈسپلن کے معاملے میں کتنے پابند تھے۔ رضا کار کا اعتماد اور رہنما کی تعمیل دونوں قابل ستائش ہیں۔ اسی نظم و ضبط اور رضا کارانہ تنظیم نے مجلس احرار اسلام کو کو ایک زبردست قوت بنا دیا تھا۔ اجلاس میں شورش کا سمیری اور جنرل شاہنواز (آزاد ہند فوج) بھی تشریف لائے اور انہوں نے بھی احرار کانفرنس کو خطاب فرمایا۔ نور محمد دستکاری سکول کی عمارت میں حرار کی مجلس عالمہ کی میٹنگ ہوئی۔ دروازے پر میری ڈیوٹی تھی۔ سالار اعلیٰ کا مجھے حکم تھا کہ کوئی شخص اوپر نہ جائے چنانچہ میں نے اسی حکم کے تحت صاحبزادہ فیض الحسن شاہ اور مولانا محمد علی جالندھری کو روک دیا۔ یہ دونوں احرار لیڈر اس وقت تک میرے حکم پر رکے رہے جب تک سالار اعلیٰ نے انہیں اجازت نہیں دی۔ یہ تھا ہماری جماعت کا رضا کارانہ نظام جو ہماری قوت کی اصل بنیاد تھی۔ وہ

رضناکار جو باہر اپنے رہنما کے حکم پر جیل جانے اور گولی کھانے تک کو تیار ہو جاتے تھے۔ جماعتی ڈسپلن میں وہی رہنما رضناکاروں کے حکم کی تعمیل میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ جس سے رضناکاروں میں اعتماد اور نظم و ضبط کی خوبی پیدا ہوتی تھی۔ جو دین کے عسکری نظام کا ایک بہت اہم رکن ہے۔ لائل پور کی یہ کانفرنس قیام پاکستان کے بعد مجلس احرار کی سب سے اہم کانفرنس تھی۔ جو ہر لحاظ سے کامیاب رہی۔ رضناکارانہ تنظیم کو ہر لحاظ سے اپنے عروج پر تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ایک نیا ولولہ نیا جذبہ، نرا انداز کار دیکھا گیا۔ جذبہ جہاد سے سرشار ہر رضناکار عزم و استقلال کا نشان بنے اپنے اپنے بانی کمانڈ کے حکم پر جان نچاؤ کرنے کے لئے پوری طرح تیار نظر آتا تھا۔

اس کانفرنس کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں لاہور کی دفاع کانفرنس کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ جو دہلی دروازے کے باہر منعقد ہوئی۔ ربیع الاول کے مہینے میں عید میلاد النبی کے جلوس میں پاکستان بھر سے آنے والے احرار رضناکاروں نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ جماعت کا یہ عسکری نظام قابل دید تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں احرار سرخیوش سارا دن لاہور کی سڑکوں پر مارچ کرتے رہے، لاہور، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ لائل پور کے احرار بینڈ فوجی دھنوں کے ساتھ ایک عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔ فوجی بینڈ کی دھنوں پر رضناکاروں کی عسکری پریڈ نے لوگوں کو مبہوت کر دیا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ ٹریننگ احرار رضناکاروں نے کیسے حاصل کی۔ مجھے یاد ہے کہ لاہور قلعہ کے جنوبی دروازے پر اس وقت کے پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ کو احرار رضناکاروں نے سلامی بھی دی تھی۔ دفتر احرار میں احرار رہنماؤں کی اہم میٹنگ جاری تھی اور اسی میٹنگ کے نتیجے میں احرار نے اپنی نئی حکمت عملی وضع کی۔ احرار کو عارضی طور پر سیاست سے علیحدہ کر لیا گیا۔ اور سیاسی کام کے لئے مسلم لیگ سے تعاون کا فیصلہ ہوا۔ جبکہ جماعت کو دینی، سماجی اور تبلیغی سرگرمیوں تک محدود کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ رہنماؤں نے یہ فیصلہ تو کر لیا لیکن اس کے بعد مرحلہ یہ تھا کہ جلسہ میں اس فیصلے کا اعلان کون کرے گا۔ تاثر یہ تھا کہ رضناکار اس فیصلے کو شاید تسلیم نہ کریں کیونکہ ان کی اکثریت پاکستان میں مسلم لیگ کے لئے حزب اختلاف کی حیثیت میں کام کرنے کے لئے ذہنی طور پر ہر طرح سے تیار تھی۔ جب کوئی بھی رہنما اس اہم اعلان کے لئے تیار نہ ہوا تو شاہ جی نے یہ کام بھی اپنے ذمے لے لیا۔ چنانچہ رات کے اجتماع میں جب جلسہ گاہ میں شاہ جی نے احرار کی سیاسی حیثیت کو ختم کر کے سیاسی کام کے لئے مسلم لیگ سے تعاون کے فیصلہ کا اعلان کیا تو میں نے رضناکاروں کو اپنے اپنے خیموں میں بے تحاشہ روئے ہوئے دیکھا اور بعض اوقات تو سکیوں کی یہ آواز بھی جلسہ گاہ میں سنائی دیتی تھی۔ اس کے باوجود فیصلے کی تعمیل کی گئی احرار رضناکاروں اور رہنماؤں کی ایک محدود تعداد نے مسلم لیگ میں شمولیت بھی اختیار کی۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلم لیگ سے عوامی لیگ اور عوامی لیگ کا چکر کاٹ کر کچھ لوگ دوبارہ احرار میں شامل ہو گئے۔ اسی اجتماع میں امیر شریعت نے پاکستان کے بارے میں کہا کہ

”قیام پاکستان سے پہلے ہماری رائے ایک اصول پر مبنی تھی۔ وہ قصہ اب ختم ہو گیا۔ قیام پاکستان کے بعد ہم اپنی رائے کی شکست کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ ملک ہمارے لئے بھی اتنا ہی مقدس ہے جتنا کسی دوسرے کے لئے ہو سکتا ہے اس ملک کے ساتھ وفاداری میں جزو ایمان سمجھتا ہوں۔ اختلاف کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ اب اسے مرتے دم تک برقرار رکھا جائے اب اسے ختم کر دو۔ پاکستان کی بہتری اور بقا کے لئے ہماری خدمات تمہارے سپرد ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

”میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صدایتے پھرتے ہیں کہ میں توشہ وفاداری لئے پھرتا ہوں میری انگلی پکڑ کر ساتھ لے چلا اور جس مقتل میں جا ہونے کے بعد فرار کر دو۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا ہرگز نہیں ہو گا۔ میں خوش ہوں۔ میری خوشی بیکراں ہے کہ اس ملک سے انگریز نکل گیا۔ میں دنیا کے کسی بھی حصے میں سامراج کو نہیں دیکھ سکتا۔ میں اسکو قرآن اور اسلام کے خلاف سمجھتا ہوں۔“

تم میری رائے کو خود خوشی کا نام نہ دو۔ میری رائے ہر گئی اب اس بھائی کو یہیں ختم کر دو۔ اب پاکستان نے جب بھی پکارا اللہ باللہ اس کے ذرے ذرے کی حفاظت کرو گا۔ مجھے یہ اتنا ہی عزیز ہے جتنا کوئی اور اس کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ میں قول کا نہیں عمل کا آدمی ہوں۔ اس طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو آنکھ پھوڑ دی جائے گی، کسی نے ہاتھ اٹھایا تو ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ میں اس وطن اور اس کی عزت کے مقابلے میں نہ اپنی جان عزیز رکھتا ہوں نہ اولاد۔ میرا خون پہلے بھی تمہارا تھا اور اب بھی تمہارا ہے۔“

اس موقع پر شیخ پر ہی شاہ جی سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ انتہائی مختصر ملاقات تھی۔ میرے ہاتھ میں شاہ جی کا فوٹو تھا۔ خیریت پوچھی بعد میں فرماتے لگے یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے میں نے کہا حضرت آپ کی تصویر ہے۔ کہنے لگے تمہیں بھی تصویر کی ضرورت ہے۔ تم نے میری تصویر کیوں خریدی ہے۔ تصویریں بنانا اور تصویر بیچنا خریدنا چونکہ شرعی طور پر منع ہے۔ اس لئے ان سے منع فرمائے تھے۔ چند لمحوں کی یہ مختصر ملاقات تھی لیکن اس ملاقات میں بھی وہی خلوص وہی محبت جو کہ آپ کی شخصیت کا لازمہ تھی۔ مجھے ان چند لمحوں کی ملاقات سے بھی بے پناہ خوشی ہوئی کیونکہ جب میں چنیوٹ سے کانفرنس میں شرکت کے لئے چلا تھا تو جہاں پر مجھے کانفرنس میں شمولیت کی خوشی تھی وہیں اس سے بھی بڑھ کر خوشی اس بات کی بھی تھی کہ حضرت شاہ جی سے ملاقات ہو گی۔

دوسرے روز قومی اخبارات میں مجلس احرار اسلام کا اہم سیاسی فیصلہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا۔ پورے ملک میں اس فیصلے کو بظہر استمان دیکھا گیا۔ اخبارات نے اس پر ادارے لکھ کر اسے قومی استقام اور ملکی فلاح و بہبود کے لئے نیک فال قرار دیا۔ مجلس احرار اسلام نے اس فیصلہ کے بعد رد قادیانیت کے کام کو مزید تیز کر دیا۔ احرار سیاسی امور میں مسلم لیگ کے ہمنوا تو ہو گئے لیکن وہ قادیانیت کے بارے میں مسلم لیگ کی حکمت عملیوں کے صریحاً خلاف بھی تھے۔ جس سے اس بات کا خدشہ موجود تھا کہ یہ اتحاد کبھی عارضی

ثابت نہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب ملک کے اندر ضمنی انتخاب کا مرحلہ آیا تو مسلم لیگ نے احرار کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے بعض قادیانیوں کو بھی مسلم لیگ کے ٹکٹ دیے۔ جس پر احرار نے سخت رد عمل کا اظہار کیا۔ اور اعلان کر دیا کہ وہ قادیانی امیدواروں کی مخالفت کرے گی خواہ ان کے پاس مسلم لیگ کا ہی ٹکٹ کیوں نہ ٹکٹ ہو۔ ہر اس قادیانی کی مخالفت ہوگی جو الیکشن میں مسلمانوں کے نمائندہ بن کر اسمبلی کا ممبر بننے کی کوشش کرے گا چنانچہ احرار اسلام نے چک جمہرہ کے حلقے سے بھی ایک قادیانی امیدوار عصمت اللہ کی مخالفت کا اعلان کر دیا اس کے علاوہ کئی دوسرے حلقوں میں بھی قادیانی امیدوار کھڑے کئے گئے۔ ہر جگہ ہر قادیانی کے مقابلے میں احرار ڈٹ گئے اور انہیں ناکام بنانے کے لئے کوششیں شروع کر دی گئیں۔ چک جمہرہ کے حلقے میں قادیانی امیدوار کے خلاف وسیع پیمانے پر عوامی جلسوں کا اہتمام کیا گیا جن میں سے کئی جلسوں کو امیر شریعت نے بھی خطاب فرمانا تھا۔ شاہ جی نے ریل گاڑی کے ذریعے فیصل آباد ریلوے سٹیشن پر اترنا تھا۔ انسانوں کا عجم وغیرہ آپ کے استقبال کے لئے وہاں پر موجود تھا۔ استقبال کرنے والے خوش نصیبوں میں میں بھی تھا۔ جب آپ کی گاڑی ریلوے سٹیشن پر آکر رکی تو فضا نعرہ تکبیر کی صداؤں سے گونج اٹھی۔ امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے ماحول تھرا گیا۔ گاڑی کے جس ڈبے میں امیر شریعت موجود تھے اس کے ساتھ والے ڈبے میں علاقے کے بہت بڑے پیر جو مولوی قطبی کے نام سے معروف تھے بھی موجود تھے۔ انہیں بھی کسی کام کے سلسلے میں فیصل آباد میں ہی اترنا تھا۔ ان کی نگاہ جب امیر شریعت پر پڑی تو انہوں نے ارزاہ احترام شاہ جی سے فرمائش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ کا بستر میں اٹھا لیتا ہوں۔ شاہ جی (جو غالباً انہیں پہلے سے ہی جانتے تھے) نے جواب میں فرمایا کہ یہ بوجھ تو میں اکیلا بھی اٹھاؤں گا تم اس بوجھ میں میرا ہاتھ بٹاؤ جو رد قادیانیت کے سلسلے میں مجھ پہ آن پڑا ہے آؤ میرے ساتھ ملکر قادیانی امیدوار کے خلاف تقریریں کرو اور اسے ناکام بنانے میں میرا ساتھ دو سنا ہے اس علاقے میں تمہارے پیروں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ انہیں منع کرو کہ قادیانی امیدوار کو ووٹ نہ دیں تاکہ قادیانیوں کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہو کہ وہ مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت میں ان کے ووٹوں کے ذریعے اسمبلی کے رکن ہیں۔ چنانچہ پیر قطبی نے حامی بھری اور دوسرے روز زم نے دیکھا کہ جلسہ گاہ میں وہ بھی موجود تھے۔ یہ خوبی تو حضرت شاہ جی میں بدرجہ اتم موجود تھی کہ وہ راہ جاتے ایک فرد کو اپنے ساتھ ملا لیتے تھے اور اس سے دین کی خدمت کا کام لیتے تھے۔ چنانچہ یہ انتخابی معرکہ آج تک لوگوں کو یاد ہے، میں خود روزانہ سائیکل پہ سوار ہو کر علاقے کے اندر ہمیشہ جلسوں میں احرار رضا کاروں کے ساتھ شریک ہو کر لوگوں کے جذبہ ایمانی سے اپنے ایمان کو تازہ کرتا۔ مسلمانوں کا جذبہ ان کا ولولہ اور جوش و خروش دیدنی تھا۔ شاہ جی پر پختاور ہوتے جاتے اور کہتے کہ انشاء اللہ ہم اس قادیانی کو مسلمانوں کا نمائندہ نہیں بننے دیں گے۔ مجھے یاد ہے کہ چک جمہرہ کے ریلوے سٹیشن پر قادیانیوں اور احرار رضا کاروں کے درمیان ایک زبردست لڑائی بھی ہوئی تھی۔ جس میں قادیانی امیدوار عصمت اللہ خود بھی زخمی ہوا تھا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تائید امور  
جراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اسی انتخابی معرکہ کے دوران اس وقت کے وزیراعظم خان لیاقت علی خان لائل پور ریلوے سٹیشن پر ایک سپیشل سیلون کے ذریعے پہنچے ان کے پروگرام میں قادیانی، مسلم لیگی امیدوار کے حق میں تقریر کرنا تھی۔ اس پروگرام پر علاقے کے مسلمان اچھے خاصے مشتعل تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لیاقت علی خان عصمت اللہ کے حق میں انتخابی تقریر کریں۔ لیکن احراری حلقے اس بات پر متفکر بھی تھے کہ اگر لیاقت علی یہ تقریر کر گئے تو ایکشن میں ہمارے خلاف ایک غلط تاثر قائم ہو گا۔ اور شاید قادیانی امیدوار جیت بھی جائے اس طرح امیر شریعت کی اس تحریک کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ادھر احراری حلقے اس سوچ میں تھے اور ادھر قدرت کاملہ بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ انہوں نے ریلوے سٹیشن پر خان لیاقت علی خان کے ساتھ علیحدگی میں ملاقات کی۔ تاکہ وزیراعظم کو قادیانیت کے ضدوخال سے آگاہ کر کے انہیں جلے میں خطاب سے باز رکھیں چنانچہ اس کوشش میں وہ کامیاب ہو گئے۔ دس منٹ کی ملاقات تقریباً ایک گھنٹے کی ملاقات میں تبدیل ہو گئی، قاضی صاحب نے اتنی خوبصورتی کے ساتھ قادیانیت کا تاروپود ان کے سامنے بکھیرا کہ وہ اس بات پر متفق ہو گئے اور تقریر کے بغیر واپس چلے گئے خان لیاقت علی خان نے قاضی صاحب سے وعدہ کیا کہ وہ نہ صرف اس حلقے میں بلکہ ملک بھر میں کسی قادیانی امیدوار کے حلقے میں نہیں کریں گے۔ انہیں قادیانیت اور اسکی درپردہ سازشوں سے واقفیت ہو چکی تھی ان دونوں رہنماؤں کے درمیان کچھ ایسے وعدے بھی ہوئے جو مستقل قریب میں قادیانیت کے لئے نقصان دہ ہو سکتے تھے۔ اس بات کا علم جب قادیانیوں کو ہوا تو وہ پھر خبردار ہو گئے یہی وجہ ہے کہ قادیانی اس سازش میں برابر کے شریک تھے جو لیاقت علی خان کو شہید کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ اگر اس مقدمہ شہادت میں دیا ندر ارجح سے کام لیا جاتا اور مقدمہ کی ساری فائل کو صنائع نہ کیا جاتا تو قادیانی سازش اسی وقت ہی ملت از بام ہو جاتی۔ بھر حال وزیراعظم خان لیاقت علی خان کے واپس چلے جانے سے قادیانی حلقے پر اس پڑ گئی اور وہ بری طرح مایوس ہو گئے۔ انتخاب کے نتائج کا جب اعلان ہوا تو پورے ملک کے اندر ایک قادیانی بھی منتجب نہ ہو سکا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا کرم اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی قیادت میں مجلس احرار اسلام کا پاکستان میں قادیانی اور قادیانی نواز حکمرانوں کے خلاف پہلا کارنامہ تھا جس پر ملت اسلامیہ امیر شریعت کی ممنون ہے۔

چنانچہ اس عظیم کارنامے پر لاہور کے اندر مجلس احرار اسلام پاکستان کی جانب سے یوم لشکر منایا گیا۔ یوم لشکر کی اس تقریب میں میں بھی شامل تھا۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی تقریر کے دوران خداوند تعالیٰ کے شکر ادا کرتے ہوئے قادیانیوں کی عبرتناک شکست کو مسلمانوں کی ایک عظیم فتح قرار دیا۔ دہلی دروازے کے باہر احرار کا یہ عظیم الشان اجتماع مسلمانوں کے جوش و خروش کی عکاسی کر رہا تھا۔ ان کے



چہروں پر خوشی کے آثار ہویدلتے۔ انہیں مجلس احرار اسلام کی اس تحریک کی اہمیت کا اب شدت کے ساتھ احساس ہو چکا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی یہ عظیم فتح قادیانی مذہب پر ضرب کاری ہے جس کا سارا "کریڈٹ" سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ذات کو جاتا ہے۔ شاہ جی نے فرمایا جب تک میری زندگی ہے اس فرقہ وارانہ کی مخالفت کرتا رہوں گا۔ اور اسے کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔

ہائے وہ بھی کیا سماں تھا، جسے آج بھی چشم تصور سے دیکھتا ہوں تو دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ ایک عجیب قسم کی کیفیت محسوس کرتا ہوں۔ اسیر شریعت شیخ پر فروکش ہیں اور ان کا نورانی چہرہ ہنس رہا ہے۔ سامنے لاکھوں کا مجمع، ارد گرد سرخ وردیوں میں ملبوس ہزاروں کی تعداد میں احرار کے بہادر، مخلص، انصاف رصا کار ہر پانچ منٹ کے بعد نعروں کی لڑا دینے والی آواز گونجتی ہے۔

قادیانی ہیں علیحدہ ملت اسلام سے  
اس میں شامل ہے تیری کاوش مثال آفتاب  
دہر سے تھا مختلف آواز کا جادو تیرا  
تیرے لب پہ دیدنی تھی زینت ام الکتاب

اسی جیلے میں مولانا ظفر علی خان ضعیف العمری کے باوجود اسیر شریعت کو اس عظیم کامیابی پر مبارک باد دینے کے لئے بہ نفس نفیس تشریف لائے ان کے جسم پر اور لکھی طاری تھی۔ لیکن قادیانیوں کے خلاف ان کے جذبات اب بھی جوان نظر آتے تھے۔ ان کی جگہ گاہ میں آمد پر ایک عجیب سماں تھا۔ کیف و سرور، جوش و جذبہ سے فضا معمور نظر آتی تھی۔ ان دو بزرگ رہنماؤں کو ایک مدت کے بعد اکٹھا دیکھ کر کئی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ شاہ جی نے شیخ پر اپنے مخصوص انداز میں مولانا ظفر علی خان کا استقبال کیا اپنے دونوں ہاتھوں میں مولانا کے رخسار لیکر انہیں خوش آمدید کہا اور عقیدت و احترام کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔ اور پھر مصروف گفتگو ہو گئے۔ جب میں یہ پرانی یادیں سمیٹ رہا ہوں تو مولانا ظفر علی خان کا قادیانیوں کے خلاف صحافت کے میدان میں ایک طویل جہاد نظروں کے سامنے ابھر کر آ جاتا ہے۔ روزنامہ زمیندار پوری قوت کے ساتھ قادیانیت کا محاسبہ کر رہا ہے۔ مولانا کی نظموں کا ایک لامتناہی سلسلہ۔ کیا خوب اور کیا نرالا انداز تھا۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

سنا ہے قادیاں میں بانسری بجتی ہے گوگل کی  
مگر یہ بانسری والا کنیا ہو نہیں سکتا  
ظلام احمد کو کیا نسبت مجدد الف ثانی سے  
شرعی جتنا بھی بڑھ جائے ثریا ہو نہیں سکتا

میں دیر تک شاہ جی پاس بیٹھا رہا ابھی باتیں سننا رہا۔ بلکہ دل پر نقش کرتا رہا میں نے زندگی میں ان کی باتوں

سے ہی رہنمائی حاصل کی ہے۔ اس کے بعد بھی مختلف اوقات میں ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور تعلق خاطر کا یہ رشتہ وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ ہم لوگ چینیٹ سے لائل پور (فیصل آباد) آگئے۔ جب بھی آپ لائل پور تشریف لاتے میں سب کچھ چھوڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاتا۔ گوردانانک پورہ کے مدرسہ اشرف المدارس کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے آپ ضرور تشریف لاتے تھے۔ فیصل آباد کا یہ مشہور دینی مدرسہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس جلسہ کے موقع پر تشریف لائے تو دعویٰ گھاٹ گراؤنڈ میں آپ کی تقریر کا اہتمام تھا۔ تقریر کے دوران بڑے زوروں سے آندھی آئی۔ شامیانے اڑاڑا جاتے تھے۔ لوگ ہانس پکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ تقریر جاری تھی۔ کہ آندھی کے بعد بارش شروع ہو گئی بارش بھی بے تحاشہ تھی چند منٹوں میں گراؤنڈ پانی سے بھر گیا۔ شاہ جی نے تقریر ختم کرنے کا اعلان کیا تو لوگوں نے پرزور انداز میں تقریر جاری رکھنے کا مطالبہ کیا۔ کہ حضرت تقریر جاری رہے ہم پانی میں بیٹھ کر بھی بھریر سنیں گے۔ شاہ جی نے چند منٹ تقریر جاری رکھنے کے بعد اس وعدہ پر جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا کہ کل پھر اس جگہ جلسہ ہو گا۔ لوگوں نے اس وعدہ پر جلسہ کے خاتمے پر اتفاق کیا۔

غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے جب میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں زیر تعلیم تھا۔ کالج کی ہاکی ٹیم کے ہمراہ ملتان جانا ہوا۔ ملتان میں ہمارا قیام کالج کے ہوسٹل میں تھا۔ جہاں چند قدموں کے فاصلے پر حضرت شاہ جی کی رہائش گاہ تھی۔ آپ سے ملاقات کا شوق بے چین کئے ہوئے تھا۔ چند دوستوں کے ساتھ شاہ جی کے پاس حاضر ہو گیا۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے شاہ جی کی ہی آواز آئی آجائیے۔ چنانچہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندر بیٹھ گیا۔ داخل ہو گیا۔ آپ زمین پر تشریف فرما تھے۔ چند افراد بیٹھے تھے۔ یہ غالباً ان دنوں کی بات ہے جب آپ پر فالج کا پہلا حملہ ہو چکا تھا۔ کمزوری کے علاوہ گفتگو میں فالج کا اثر نمایاں تھا۔ لیکن چہرہ ویسے ہی شگفتہ اور طبیعت پر کوئی طال نہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بہت خوش ہوئے اور فریاد کرنے لگے یہ میرا بیٹا کہاں سے آ گیا ہے۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ آپ کے ملتان والوں سے ہاکی میچ کھیلنے آیا ہوں۔ فوراً سر اٹکی زبان کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اچھا توں بن "اساں ملتانیاں۔ کول ہراون آئیں۔ اینویں نہ تعیی" ("اچھا تو اب تم ہم ملتانہوں کو ہرانے کے لئے آگئے ایسا نہیں ہو گا") جس کے بعد دوسری باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے طبیعت کا پوچھا فرمانے لگے بھئی طبیعت کا کیا پوچھتے ہو بس میں تمہارے سامنے موجود ہوں دیکھ لو، اب میرا جسم میرے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو چکا ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں، دل، دماغ، انکھیں، زبان غرضیکہ جسم کا ایک ایک عضو میری رعایا ہے اور میں اس کا حاکم۔ میں نے اپنی رعایا سے زیادہ کام لیا۔ اتنا زیادہ کہ ان کا بھرکس نکال دیا ہے۔ کیا اب انہوں نے میرے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ چند روز پہلے فالج کا حملہ ہوا تو سمجھ گیا کہ یہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بڑا مضبوط جسم لیکن میں نے ستر برسوں میں اسے دین پر قربان کر دیا۔ اب اس میں جسم کا کیا قصور ہے۔ بہر حال میں الحمد للہ! اس وقت تمہارے سامنے بٹھا ہوں۔

شکر ہے اللہ کا جس حال میں رکھے۔ میں خوش ہوں اس کی خوشی میں، اس طرح وقت گزرتا رہا۔ اور ہم باتوں میں مصروف رہے۔ بالاخر میں نے اجازت طلب کی۔ آپ نے مجھے دعاؤں سے رخصت کیا۔ باہر آکر میں نے اپنے دوستوں سے پہلی بات یہی کی کہ یار یہ اچھی بات نہیں ہوئی شاہ جی نے ہمیں ہماری شکست کی پیٹھ پیچھے دے دی ہے۔ چنانچہ دوسرے روز جب ہمارا میچ ہوا تو ہم واقعی ملتان میں سے میچ ہار گئے۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک میں ایم اے کے سلسلے میں لاہور مقیم رہا۔ ان دو برسوں میں دودھہ امیر ان سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ملاقات جیل روڈ پر صوفی عبدالحمید کی کوٹھی پر اور دوسری لاہور ریلوے سٹیشن پر۔ صوفی عبدالحمید کی کوٹھی پر تو آپ سے اس وقت ملاقات ہوئی جب وہاں شاہ جی کے مرشد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری قیام پذیر تھے اور شاہ جی ان سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ انہی دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات ہوئی۔ میں ۳۴ مزننگ روڈ پر خضر سیمسی ایڈووکیٹ کے دفتر پر قیام پذیر تھا وہ میرے والد محترم کے دیرینہ دوست تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات پر شہر میں منادی بھی ہوئی اور اخبار میں ایک اشتہار بھی چھپا کہ مولانا داؤد غزنوی موچی دروازے کے باہر آپ کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائیں گے چنانچہ میں نے اپنے ایک ساتھی ممتاز سہارن کے ساتھ مزننگ روڈ سے پیدل چل کر موچی دروازے پہنچا۔ جنازے سے فارغ ہی ہوا تھا۔ کہ کسی جاننے والے نے بتایا کہ حضرت شاہ جی شملہ پہاڑی کے قریب حاجی عبدالستین صاحب کے ہاں قیام پذیر ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھی ممتاز سہارن سے ان کے پروگرام کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بھی شاہ جی سے ملنے کا کہا تو ہم دونوں وہاں سے پیدل حاجی عبدالستین کی کوٹھی پر پہنچے۔ لیکن وہاں سے ہمیں پتہ چلا کہ شاہ جی صوفی عبدالحمید کی کوٹھی جیل روڈ پر اپنے پیرومرشد کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں شملہ پہاڑی سے جیل روڈ پر صوفی صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو حضرت شاہ جی کوٹھی کے مشرقی لان میں اپنے عقیدت مندوں کے درمیان تشریف فرما تھے۔ جبکہ کوٹھی کے اندر ایک وسیع کمرے میں حضرت عبدالقادر رائے پوری کی محفل تھی۔ حضرت شاہ جی کو میں نے سلام عرض کیا اور کہا کہ حضرت آج تو آپ کے لئے بہت پیدل چلا ہوں۔ آپ سے ملاقات کا اشتیاق تھا شکر ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ پھر میں نے اپنے سفر کی کہانی بھی کچھ ڈالی جواب میں فرمانے لگے۔ تو کیا یہ تیرا محمد پر کوئی احسان ہے۔ اپنے بیٹے ہو ملنے کے لئے آئے ہو۔ آؤ بیٹھو۔ میری طرف بھی تو دیکھو اس عمر میں تین منزلیں ہسپتال میں اوپر گیا اور دانت لگوا کر آ رہا ہوں۔ میں وہیں آپ کے پاس بیٹھ گیا اور تذکرہ جاری تھا مولانا ابوالکلام آزاد کا۔ زبان امیر شریعت کی بات ابوالکلام کی۔ مولانا ابوالکلام کا کردار، آپ کا علم و فضل شاہ جی کی زبان سے بیان ہو رہا تھا اور وہاں پر موجود تمام لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ فرمانے لگے۔

یہ حکومت ہندوستان کا مولانا ابوالکلام پر احسان تھا کہ انہوں نے مولانا کو وزیر اعظم بنایا ہوا تھا۔ بسا یہ تو مولانا ابوالکلام آزاد کا ہندوستان کی حکومت پر احسان تھا کہ وہ ان کے وزیر تعلیم تھے۔ میری تمام زندگی پڑھے لکھے لوگوں میں بسر ہوئی ہے ایسا عالم فاضل شخص شاید ہی کوئی اور میری نظروں سے گزرا ہو۔ عربی

جنکی مادری زبان ہو، اردو جس کے ہاتھ کی پھڑکی اور فارسی جس کے گھر کا پانی بھرتی ہو اور انگریزی بھی ایسی خوب جانتے تھے (مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا) کہ بابو اتنی اچھی انگریزی تم بھی کیا جانتو، وہ ہمارے دور کے واقعی امام ابن تیمیہ تھے۔ کیا کیا خوبیاں تھیں جو خدا نے ان کے دل و دماغ میں سدا دی تھیں۔

اب بڑی اچھی باتیں ہو رہی تھیں۔ شاہ جی ابوالکلام آزاد کی شخصیت و کردار پر اپنے مخصوص انداز میں ابھی باتیں کر رہے تھے۔ کہ ایک آدمی نے آپ سے کہا کہ حضرت رائے پوری آپ کو اندر کمرے میں یاد فرما رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ جی فوراً کھڑے ہو گئے آپ پر یکسر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر سے کارنگ بدل گیا سرخی کی بجائے اب چہرے پر زردی کے آثار ہوید لگتے۔ متانت اور سنجیدگی پہلے سے وافر تھی۔ پہلے ننگے سر بیٹھتے تھے اندر جانے کے لئے باقاعدہ سر پر رومال باندھا اور اس طرح عجز و انکسار کی تصویر بنے ایک سعادتمند مرید ایک باکمال پیر کی بارگاہ میں حاضری کے لئے ہم سے جدا ہو گیا۔ ہم آپ کے پیچھے پیچھے کمرے کے دروازے تک تو آئے۔ اندر تو جانے کی گنجائش نہیں تھی۔ کمرہ پہلے ہی کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ ہاں دروازے سے حضرت رائے پوری کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ پہلی اور آخری زیارت تھی جو مجھے نصیب ہوئی۔ اس کے بعد حضرت رائے پوری کو کبھی نہ دیکھ سکا البتہ ان کے جنازے میں شرکت کی سعادتمند نصیب ہوئی یہ جنازہ خالصہ کالج لائل پور کی وسیع گراؤنڈ میں ہی ہوا تھا۔ کمرے کے اندر ایک جانب کونے میں حضرت رائے پوری پلنگ پر لیٹے میں تشریف فرما تھے۔ انتہائی کمزور اور نحیف و ناز جیسے ہڈیوں کی ایک چھوٹی سی ڈھیری کسی نے بستر پر رکھ دی ہو۔ شاہ جی جیکے سے اندر داخل ہوئے۔ سلام کیا اور چارپائی کے ایک طرف جیکے سے بیٹھنے لگے تو حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ نہیں شاہ جی یہاں میرے پاس چارپائی پر تشریف رکھیں ان لوگوں کو کچھ وعظ کریں حضرت شاہ جی نے اپنے پیر و مرشد کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وعظ کرنا شروع کر دیا دیر تک ہم بھی دروازے باہر کھڑے شاہ جی کی باتوں سے مستفیض ہوتے رہے۔ جس کے بعد ہم وہاں سے روانہ ہوئے ہمیں دیر ہو رہی تھی۔ اور پھر پیدل ہی اپنی منزل مقصود ۳۴ فرنگ روڈ پر پہنچنا تھا۔

غالباً ۱۹۵۸ء کا سن تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب منقری پاکستان کے وزیر اعلیٰ تھے جنہوں نے مجلس احرار اسلام سے پابندی اٹھا دی۔ یہ پابندی ۱۹۵۳ء میں تحریک تحفظ ختم نبوت کے دوران لگائی گئی تھی۔ پابندی اٹھتے ہی بہت جلد شاہ جی کے حکم پر مجلس احرار اسلام نے جماعت کی تنظیم نو کے ضمن میں لاہور میں مولانا داؤد غزنوی کے مدرسہ میں احرار کنوینشن طلب کیا تھا اس وقت میں ایم اے فائنل کا سٹوڈنٹ تھا اور کنوینشن میں شریک تھا۔ ملک بھر سے سرخ قمیصوں میں ملبوس ماسٹر تاج الدین انصاری اور شیخ حسام الدین بھی کنوینشن میں شریک تھے۔ رضا کاروں اور رہنماؤں کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے کہ قافلہ اہل جنون پھر سوائے منزل روانہ ہونے والا ہے۔ نیا ولولہ، نیا جذبہ عجیب ترنگ، انوکھی اسنگ دیکھائی دے رہی تھی۔ قہید احرار ایک

مرتبہ پھر صفوں کو درست کر کے میدان کار راز میں کودنے کے لئے بے تاب تھا۔ وہی ولولہ، جنہیں دیکھ کر نظیری کا وہ شعر یاد آگیا جو شاید نظیری نے احرار کے لئے ہی کہا تھا کہ اس دور میں انہی پر منطبق ہوتا ہے۔

گریز از صفِ باہر آنکہ مردِ غوغا نیست  
کے کہ کشتہ نہ شد از قبلہ بانیت

کنوٹن میں محترم شیخ حسام الدین کو چیف آرگنائزر کے طور پر منتخب کیا گیا۔ تاکہ وہ پاکستان بھر میں مجلس احرار اسلام کو دوبارہ منظم کریں اسی کنوٹن کے فاسٹے پر ایک اعلان کے ذریعے احرار رضا کاروں کو مطلع کیا گیا کہ امیر شریعت عثمان سے ایک برین کے ذریعے رات کو لاہور پہنچ رہے ہیں۔ لہذا تمام احرار رضا کار حضرت شاہ جی کے استقبال کے لئے گاڑی سے پہلے پلیٹ فارم پر پہنچ جائیں۔ اعلان میں نے بھی سنا، خوشی ہوئی کہ شاہ جی کی زیارت کا ایک اور موقع مل رہا ہے۔ چنانچہ پلیٹ فارم پر استقبال کے لئے پہنچ گیا۔ ہر طرف سرخ پوش پھیلے ہوئے تھے۔ عزم و ہمت کے نشان جب بھی نعرہ زن ہوتے تو درو دیوار گونج اٹھتے۔ ایک عجیب سماں تھا۔ امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے فضاء میں لٹل بھی ہوئی تھی۔ ایک جم غفر، فقیر کے استقبال کو بے تاب ہوا جاتا تھا۔ اسی سوچ میں مستغرق تھا کہ شاہ جی کی گاڑی پلیٹ فارم پر آتی دیکھائی دی۔ اب اتفاق ہے کہ شاہ جی کا ڈیوٹ فیس آکر رکابوں میں کھڑا تھا میں سب سے پہلے اندر داخل ہوا اور سب سے پہلے آپ سے ملا۔ شاہ جی نے نظر میں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور فرمایا بیٹا یہ میرا سامان ہے میں نے وہ سامان اٹھایا اور باقی کچھ دوسرے رضا کاروں نے ہم ڈبے سے پلیٹ فارم پر حضرت شاہ جی کے جلو میں باہر آئے ہر طرف سر ہی سر تھے بل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ برہی مشکل سے شاہ جی کے لئے راستہ بنا۔ لوگ باری باری آپ سے ملے جاتے اور آپ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جاتے تھے۔ اس بار شاہ جی پر خاموشی کا غلبہ تھا۔ بے نیازی اس قدر کہ محال ہے کہ آنکھ اٹھا کر بھی پورے استقبال کو کمزوری بھی پہلے سے زیادہ تھی۔ شگفتگی پر سنجیدگی اور متانت کا غلبہ تھا۔ میں تو جیسے شاہ جی کے ساتھ تھی ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ مجمع کے ساتھ چل عبور کر کے باہر ڈیوٹ فیس میں آئے تو آگے ایک کار کھڑی تھی جس پر آپ نے سامان رکھ دیا اور آپ اپنے پیرو مرشد کی قیام گاہ صوفی عبد الحمید کی کوٹھی کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں بھی دوسرے رضا کاروں کے ساتھ شاہ جی کی کار کو دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ اور سوچتا رہا کہ اب شاہ جی کسی اور کیفیت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور ہم انہی محفلوں سے شاید اس طرح لطف اندوز نہ ہو سکیں گے۔ جیسے عمر بھر ہوتے رہے ہیں اور اسی سوچ کے دوران آپ کی کار میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

یہ میری آپ سے آخری ملاقات ہے۔ مقام ملاقات جامع مسجد فیصل آباد میں اپنے سب سے بڑے فرزند مولانا سید ابومعاویہ ابوذری کے نکاح کے موقع پر آپ یہاں تشریف لائے۔ میں اپنے چھوٹے بھائی باقر صغیر احمد کے ہمراہ مسجد میں پہنچا تو آپ مسجد کے شمالی حصہ میں تشریف فرما تھے۔ ذرا قریب ہوئے تو سنا کہ کسی سے کہہ رہے تھے کہ بھائی ذرا امیر سے لئے پیسے کا پانی مٹی کے اس برتن میں لے آؤ اتنے میں ہم دونوں پر

نظر پڑ گئی تو اسے کھمارہنے دو میرے اپنے بیٹے آگئے ہیں۔ یہ فقرہ خلوص اور محبت میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ آج بھی اس کی حلاوت سے دل و دماغ معطر ہو جاتے ہیں۔ میرے اپنے بیٹے آگئے۔ چھوٹا بھائی صغیر جلدی جلدی پانی لینے چلا گیا اور میں شاہ جی کے پاس بیٹھ کر ان سے ہمکلام ہوا۔ شاہ جی آپ کی طبیعت کبسی ہے۔ جواب میں فرمایا۔ جاؤ میں تم سے کلام نہیں کرتا۔ تم تو بڑے نالائق بیٹے ہو۔ میری یہ حالت ہو رہی ہے تم نے کبھی ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر پتہ کیا ہے کہ تیرے ابا کا کیا حال ہے۔ پس یہ فقرہ آپ نے کہا کہ مجھ پر جیسے بجلی کوند گئی۔ پاؤں تلے سے زمین ٹکل گئی معاً خیال آیا کہ شاہ جی تو میرے خط کا انتظار کرتے رہے ہیں اور یہاں میرے تصور میں بھی نہیں ہے کہ انہیں خط لکھ کر حال پوچھوں کہ ان کے اور میرے درمیان اگرچہ ایک تعلق تو ہے ہی لیکن مقام و مرتبہ کا اتنا فرق ہے کہ اس فرق کی موجودگی میں میں اسے ایک جبارت ہی خیال کرتا رہا وہ میرے خط کا انتظار کریں۔ اللہ اللہ کتنا بڑا انسان کتنی بڑی خوبیوں کا مالک جس میں سب سے بڑی خوبی انسانوں سے محبت کرنا ہے۔ بہر حال معذرت کی معافی مانگی اور انہوں نے معاف کر دیا۔

شاہ جی دعا کے لئے مائیک پر تشریف لائے۔ آپ ابھی مائیک پر آئے ہی تھے کہ لوگوں نے تقریر کا تھانہ شروع کر دیا۔ بظاہر تو یہ مطالبہ درست تھا۔ لیکن اب شاہ جی کچھ بے نیاز سے تھے۔ تقریروں کا شوق و ذوق وقت کے ساتھ ساتھ ان کی طرح جیسے بوڑھا ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تھانہ تقریر بڑھا تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

"بس بھائی بہت ہو چکی تقریریں۔ اب دل میں کوئی حسرت باقی نہیں ہے۔ میں تو اپنے بیٹے کے کھاج کے سلسلے میں آپ کے شہر میں موجود ہوں۔ بس دعا کریں۔ ہمارے دو خاندانوں کے درمیان یہ کھاج باعث خیر و برکت ثابت ہو اور یہ معاملہ بخیر و خوبی انجام پائے۔ اسی دوران لوگوں نے دوبارہ تقریر کی فرمائش کی تو آپ نے کہا۔ تقریر تو نہیں لیکن اب بھی ایک ترنگ اور انگ سی دل میں ضرور پیدا ہوتی ہے کہ خدا مجھے توفیق دے تو میں اپنے یار ناصر (صدر ناصر کی طرف اشارہ تھا) کے قصیدے بیان کروں کہ اس نے کس طرح سے انگریزوں کو جوئے مار مار کے سوزے کھلا ہے۔"

یہ آپ کی زندگی کی مختصر ترین تقریر تھیں جو اس روز آپ نے کی تھی۔ بظاہر تو یہ ایک فقرے میں ختم ہو گئی۔ لیکن اس ایک فقرے میں بھی انگریزوں کے خلاف بلا کی نفرت جھلک رہی تھی سوز نہر کا۔ عمران اور مصر کا انقلاب آپ کے سامنے تھا۔ جس ہزیمت کا سامنا انگریزوں کو اس عمران میں اٹھانا پڑا اس کی طرف ہی آپ کا اشارہ تھا۔ چنانچہ کھاج کے بعد جب شاہ جی واپس جانے لگے تو میں آپ کا ہمراہ تمام مسجد کے شمالی جانب کا دروازہ تھا۔ سامنے گلی میں تاحد نظر لوگ ہی لوگ تھے۔ آپ رک گئے اور آپ نے مولانا ابوذہری صاحب کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا۔

"حافظ جی دیکھ رہے ہو لوگوں کا اکٹھے یہ سب میرے پاس کیا لینے آ جاتے ہیں۔ میں تو ایک فقیر ہوں دوسرے وقت کی روٹی پر بھی قادر نہیں ہوں۔ یہ لوگ انتہائی مخلص ہیں مجھ سے مت

کرتے ہیں مجھ سے محبت لینے آجاتے ہیں میں نے بھی ان سے زندگی بھر محبت ہی کی ہے۔ یہ میرے خلوص کی کھائی ہیں لوگ مرنے سے پہلے جائیدادیں چھوڑ کر مرتے ہیں۔ میری جائیداد بھی لوگ ہیں جسے میں تمہارے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔ واللہ باللہ میں نے جب بھی زندگی میں ان لوگوں کو دین کے تحفظ کے لئے کھارا یہ لوگ سروں پر کنٹن باندھ کر اپنے بسنے گھروں سے نکل آئے میرے کہنے پر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور سینے پر گولیاں کھا گئے۔ اگر تم نے بھی ان کے ساتھ مخلصانہ برتاؤ جاری رکھا تو دین کے لئے یہ تمہارے کام بھی آئیں گے ان شاء اللہ۔

یہ وہ تاریخی چند فقرے ہیں جو تمام عمر کے تجربات کا بخور ہیں۔ شاید زندگی بھر یہ محبت، یہ خلوص کا مظاہرہ بھی اسی لئے تھا۔ اس کے ذریعے لوگوں سے دین کے تحفظ اور ناموس رسالت کے لئے کام لینا چاہتے تھے۔ اور انہوں نے یہ کام لیا۔ وہ اس میں سو فیصد کامیاب و کامران تھے۔ اس کے بعد ایک بزرگ صورت غالباً جتہرال ہاؤس والے بزرگ جن کی دکان مسجد کے قریب ہی تھی شاہ جی سے اصرار کر رہے تھے کہ شربت کے ایک گلاس کے لئے دکان پر تشریف لائیں۔ اور شاہ جی برابر معذرت کر رہے تھے۔ کہ وہ ذیابیطیس کے مریض ہیں۔ پھر وہ ہم سے پیپلز کالونی کے لئے رخصت ہو گئے اس کے بعد پھر ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ۳۱ اگست ۱۹۶۱ء کی شام وہ ہم سب کو داغِ مفارقت دیکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ لیکن وہ اب بھی دل و داغ میں موجود ہیں۔ اور موجود نہیں گئے۔

ہر گر . میرو آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق  
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما۔

وہ سید کہ تھا صدر احرار ملت  
جسے لوگ کہتے تھے شاہِ خطابت  
یہ دنیا کہ موسیٰ کا ہے قید خانہ  
اسے چھوڑ کر رہ گیا سونے جنت  
ہوئی جتو اختر واصفی کو  
چھ از ہر ارقام تاریخ رخت  
ندا آئی کیوں ہو نہ تاریک عالم  
گیا مہر تاباں اسیر شریعت  
۱۹۶۱ء اختر واصفی

## گئے دور کا فسانہ

میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیکھا کہ اردو زبان کا سب سے بڑا خطیب ایک بوسیدہ مکان کے ملہ میں اپنے بڑھاپے کی فراسٹ بھرتی ہوئی عمر گزار رہا ہے۔  
شاہ جی نے کھجور کی چٹائی پر اپنے ماتھے کی سبکی ہاری ٹکٹیں بکھیرتے ہوئے جو کچھ کہا میں نے اس خوبصورت گفتگو کو اشعار کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ (شورش کاشمیری)

ہمارا ذکر گئے دور کا فسانہ ہوا  
لگا کے آگ ہمیں کارواں روانہ ہوا  
کبھی مصائبِ منزل سے آشنائی کی  
کبھی نوشتہٴ تقدیر قید خانہ ہوا  
ہر ایک موج بہر رنگ ہم کلام ہوئی  
ہر ایک پھول بہر شاخِ آشیانہ ہوا  
یہ ایک بات زبانِ قلم تک آپہنچی  
یہ ایک حرفِ دلاویزِ محمانہ ہوا  
ہوا کہ دوش پہ اڑتا رہا کلامِ خطیب  
اگرچہ گوشِ برآواز یہ زمانہ ہوا  
اٹھے تو شاخِ چمن سے کہانیاں اٹھیں  
گئے تو برق کا مرہونِ آشیانہ ہوا  
ہم ایسے لوگ بھلا کس سے آشنا ہوتے؟  
مُجھ تو گردشِ دوراں سے دوستانہ مُجھ  
(شورش کاشمیری)



## ترس گئے، میں تری آواز دل کشا کے لئے

موضوع میں بغیر کسی تکلف یا انکسار کے عرض ہے کہ راقم آئٹم نہ تو صاحبِ علم ہے اور نہ ہی صاحبِ قلم۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ کی حد تک صاحبانِ علم و قلم اور اپنے دائرہ و حالات کی حد تک اہم خطیب حضرات کو سنا پڑھا جائے اور بہت قریب سے دیکھا۔ زیرِ قلم مضمون میں چونکہ اُردو اور برصغیر کی علاقائی زبانوں کے سب سے بڑے خطیب کا تذکرہ ہے۔ لہذا میں کوشش کروں گا کہ اپنے واردات و مشاہدات پیش کروں، متعلقات پر اس نمبر میں اور بہت مضمون ہوں گے۔۔۔۔۔ اختر شیرانی نے کہا تھا "کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ادبیات نے تین جامع شخصیات پیدا کیں، ابو الفضل، اسد اللہ خاں غالب اور ابوالکلام آزاد۔۔۔۔۔" میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ خطابت میں جامع الصفات۔۔۔۔۔ وجاہت، خوبصورتی، مردانگی، آواز، اثر اور قرائنی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس کے معانی اور پھر موزوں اشعار عام فہم بیان و خطاب اور ایسا لہجہ اور انداز کہ ایک دیہاتی اور تانگہ بان سے لے کر ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، محمد علی جوہر، علامہ شبیر احمد عثمانی، صلح الدین احمد، مولانا احمد علی، مولانا محمد ابراہیم جگرانوی رحمہم اللہ، غرضیکہ ہر طبقہ و خیال اور کند ذہن اور عبقری، دیہاتی، شہری، علماء، صوفیاء، انگریزی دان، فلسفی و دانشور سبھی بیک وقت مستفید و مستفیض ہوں۔۔۔۔۔ ایسا خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کے علاوہ شاید کسی بھی اُمت، کسی بھی ملک میں نہ پیدا ہوا ہو۔۔۔۔۔ جلال و جمال، حسنِ صورت اور حسنِ صوت جس لحاظ سے بھی دیکھیں یہ کھانا پڑتا ہے کہ آپ اُمتِ مسلمہ کے فردِ وحید خطیب تھے۔

میں نے "بیس بڑے مسلمان" کتاب میں لکھا ہے کہ میں نے سات آٹھ سال کی عمر میں امیرِ شریعت رحمہ اللہ کی پہلی تقریر سنی لیکن اس کے بعد کئی دفعہ غور کیا، سوچا، تو محسوس ہوا کہ اس عمر کی تو مجھے بہت سی ایسی باتیں یاد ہیں جن کا تعلق فہم و شعور سے ہے اگر یہ تقریر اس عمر میں سنی ہوتی تو بہت سی باتیں یاد ہوتیں۔ لاعلمی یہ پانچ برس کی عمر کے لگ بھگ کی بات ہو گی جب ۱۹۳۷ء کے الیکشن ہو رہے تھے کہ ایسے ہی حالات میں زعمائے احرار کا دورہ دیہات میں ہوا ہو گا کہ جس میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی رحمہ اللہ اور حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ اور خواجہ عبدالرحیم عاجز، کمودر (صلح جاندھر) تحصیل مرکز سے چھ میل دور مٹھم پور میں تشریف لائے ہوں گے کہ مجھے اس جلسہ میں سوائے "بخاری و حبیب" کے پھر سے اور عاجز مرحوم کی پنجابی نظم کے مطلع کے اور کچھ یاد نہیں۔

رہیں سُنیاں پیاں جنوں اک خواب آ گیا

گئے بدیشی ایتھوں، ایتھے انقلاب آ گیا

انہی دنوں عاجز مرحوم کی ایک اور نظم بہت مشہور تھی جس کے چند شعر یاد رہ گئے ہیں:

او مسلماناں کدھر گئی اج مسلمانِ تری  
دیں لئی ہندی وقت سی کدی زندگانی تری  
لے گئی سی روہڑ کے پربت کفر دے بے شمار  
آئی سی بد عرب وٹوں چڑھ کے طغیانی تری  
رکھ دتی توں راہ مولا فرزند دے گل تے بھری  
بہل نہیں سکدی کدی دنیا نوں موبانی تری  
نس گئے سن تحت چھڈ کے کئی بہادر سورے  
جس جگہ بھی جا کے چمکی تیغ برآنی تری  
عاجزاں وانگوں کیوں جھکدا جانناں ایں ہر جگہ  
نہ جھکی سی کسری دے اگے پیشانی تری

عاجز مرحوم سے متعلق ایک اور بات یاد آئی کہ ۱۹۲۹ء میں کانگریس کاروائی کنارے جو اجلاس ہوا تھا اس میں موصوف نے جب ایک ولولہ انگیز نظم پڑھی تو مولانا ابوالکلام آزاد مائیک پر آئے اور کہا کہ جب میں جنت میں جاؤں گا اور اللہ کے فضل سے اُمید ہے ایسا ہوگا تو عاجز کا بازو پکڑ کر ساتھ لے جاؤں گا۔

اس طرح گویا میں نے اس نوعمری میں تین عظیم المرتبت شخصیتوں کی زیارت کی۔ رئیس الاحرار رحمہ اللہ، امیر شریعت رحمہ اللہ اور عاجز مرحوم کی نسبت سے یہ یاد میری زندگی کا اتنا بڑا سرمایہ ہے کہ اس پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں۔ شہروں سے دور ستیج کے کنارے ایک گاؤں میں ان حضرات کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

امیر شریعت رحمہ اللہ کی دوسری زیارت نکودر میں ہوئی جہاں عید گاہ میں مجلس احرار اسلام کی ڈسٹرکٹ کانفرنس تھی اور یہ بھی اس دور کے لگ بجگ کی بات ہے اس میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ایک بات یاد ہے کہ ایک دہاتی عورت آٹا گوندھ رہی تھی کہ کبھی دور سے ڈھول کی آواز آئی وہ عورت آٹا گوندھنے کی بجائے کھڑے ہو کر دھال ڈالنے لگی۔ گھر والوں نے کہا کہ یہ کیا حرکت ہے تو اس نے کہا مٹھتے نہیں کہ ڈھول کی آواز آ رہی ہے انہوں نے کہا کہ آواز تو کبھی بہت دور ہے تو اس نے اس کیفیت میں کہا:

ایتھے کی تے او تھے کی

چونکہ یہ بات ایسی تھی کہ ایک چھوٹا بچہ یاد رکھ سکتا ہے لہذا یاد ہے لیکن یہ یاد نہیں کہ یہ مثال کس بات کو سمجھانے کے لیے دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ سوائے اس کے اور کچھ یاد نہیں کہ اس کانفرنس کے صدر استقبالاہ علاءپور کے صاحبزادہ سید سلیمان صاحب تھے جو قیام پاکستان کے بعد ساٹھ میں آباد ہوئے انہوں نے طویل سپانسامہ یا خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ میں موسس کر رہا تھا کہ لوگ اس طویل تحریر سے بور ہو رہے ہیں کہ سامعین اور مخاطب

تقریباً دیہاتی تھا۔ اس کانفرنس میں صاحبزادہ سید فیض الحسن بھی تھے۔ مذکورہ بالا دونوں جلسوں کے متعلق میں نے بہت احباب سے دریافت کیا، کب تھے لیکن کسی نے کسلی بخش جواب نہیں دیا کہ جس سے میں صبح سن کا تعین کر سکوں۔

اس کے بعد تیسرا جلسہ تلون صلیع چاندھر میں ہوا کہ جہاں کے مشہور لیڈر حبیب اللہ سعدی مرحوم خاکساری تھے اور اگر میری یادداشت کام کرتی ہے تو مولانا ضیاء الرحمن فاروقی کے والد ماجد مولانا محمد علی جانباڑ بھی اس قصبہ کے تھے۔ میں ان دنوں پرائمری کرنے کے بعد مدرسہ عربیہ رائے پور گوجران میں قرآن مجید یاد کر رہا تھا اس جلسہ میں بھی رئیس الاحرار ساتھ تھے۔ رائے پور میں ہمارے استاد و مربی حضرت مولانا عبدالعزیز رحمہ اللہ، جو قیام پاکستان کے بعد چک نمبر ۱۱ چیمپو وطنی میں آباد ہوئے، لیم شمیم اور ہمارے نزدیک خاصے وجیہ تھے اور واقعتاً وجیہ تھے لیکن اب بات جب ہو رہی ہے تو لکھنا پڑتا ہے کہ حضرت مولانا جب حضرت شاہ صاحب کے ساتھ سٹیج کی طرف بڑھ رہے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گو حضرت مولانا وجیہ ہیں لیکن حضرت شاہ صاحب کے ساتھ آتے ہوئے شاہ صاحب ہی نظر آ رہے تھے کہ ان کے علاوہ کسی پر نظر نہ نکلتی تھی یہ ان دنوں کی بات ہے جب ۱۹۴۶ء کے انتخابات کی توقع کی جا رہی تھی۔ ان دنوں چونکہ میں قرآن مجید حفظ کر رہا تھا لہذا پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ ہم تو قرآن پنجابی میں پڑھ رہے ہیں۔ عربی قرآن مجید تو یہ ہے جس کی حکومت شاہ صاحب فرما رہے ہیں۔۔۔۔۔ یہاں اچھی خاصی سیاسی تقریر تھی۔ چونکہ یہ بھی علاوہ دیہاتی تھا لہذا ایسی عام فہم تقریر تھی کہ جس کو گھاس کھودنے والے دیہاتی بھی سمجھ سکیں۔۔۔۔۔ اور ان تینوں جلسوں کی حاضری کا حال یہ تھا کہ آج لاہور ایسے شہر میں بھی اتنے بڑے جلسے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ میں ساری تقریریں مسلسل گنگنی ہاندے حضرت شاہ صاحب کی طرف دیکھتا رہا اب سب باتیں سمجھ آ رہی تھیں۔۔۔۔۔ رئیس الاحرار اور امیر شریعت رحمہ اللہ کی تقریریں ایک ہی شست میں ہونیں رعد کی کرکڑ اور بجلی کی چمک تھی۔

اس کے بعد ۱۹۴۶ء کا الیکشن آگیا اور نکودر کی صوبائی شست پر مجلس احرار اسلام کی جانب سے حضرت مولانا محمد علی چاندھری، مسلم لیگ کی جانب سے میرے رشتہ میں پھوپھا چودھری ولی محمد گویر اور یونینسٹ پارٹی کی جانب سے چودھری اسد اللہ خاں (آنریری مجسٹریٹ) کھڑے تھے ہمارے علاقے میں ایک بہت بڑا گاؤں سنگوال تھا جس میں ہمارے ایک بزرگ چودھری اسد اللہ خاں کے بہت قریبی دوست تھے باقی سارا گاؤں احرار کا حامی تھا۔ گویر صاحب مرحوم یہاں کے ایک بڑے قریبی گاؤں پر جیاں کے تھے اور اسد اللہ خاں مرحوم کا قصبہ مت پور بھی دو میل پر تھا لہذا اس جلسے کی بہت دھوم تھی۔ ہم جلسہ گاہ جا رہے تھے اور مجاہد ملت مولانا محمد علی چاندھری رحمہ اللہ اور امیر شریعت رحمہ اللہ پیدل گاؤں کی جانب آ رہے تھے لوگ مصافحوں کے لیے ٹوٹے پڑتے تھے۔۔۔۔۔ حضرت شاہ صاحب کی عتابی دانیں دانیں لوگوں کو دیکھ رہی تھیں آپ نے دیکھا کہ ایک دو آدمی راستے سے ایک طرف گم گم کھڑے ہیں شاہ صاحب ادھر کھڑے گئے اور ان سے پنجابی میں مخاطب ہونے کہ "تسیں اک پاسے کیوں

کھلوتے ہو" انہوں نے بڑی مدہم آواز میں کہا کہ "اسیں جوڑے آں" ہم خاکروب ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر کیا ہوا آؤ گے لگو اور اُن سے پرزور انداز میں معافہ و مصافحہ کیا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ وہ ہمرے بلے میں پورے خاندان کو لائے اور مسلمان ہو گئے۔۔۔۔۔ میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ ہندوؤں کو ہم گالیاں دیتے ہیں لیکن اُن کے رسوم و رواج ہماری تہذیب و تمدن میں رہے بے ہیں وہ اچھوتوں اور مسلمانوں کو اپنے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے ہم نے ہندوؤں کو تو کچھ نہ کہا لیکن اچھوتوں سے وہی برتاؤ کیا جو ہندو ہم سے کرتے تھے۔ اگر ہم ان سے وہ برتاؤ کرتے جس کا اسلام نے ہمیں سبق دیا ہے تو ہندوستان کے سب اچھوت مسلمان ہو جاتے مسٹر گاندھی نے تو ان کو قریب کیا لیکن ہم اسی طرح ان سے نفرت کرتے رہے قیام پاکستان کے بعد سب خاکروب عیسائی ہو گئے اور ہمارا معاملہ اب بھی ان سے وہی ہے اور یورپ سے انگریز پادری آکر ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا ہے ہم پادری اور انگریزوں کو اب تک گئے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ لیکن اپنے ملک کے عیسائیوں کو اسی طرح اچھوت سمجھتے ہیں جس طرح قیام پاکستان سے پہلے سمجھتے تھے۔ اگر متحدہ ہندوستان میں ہم ان سے انسانی اسلامی سلوک کرتے تو ہندو اکثریت میں نہ ہوتے مسلمان اکثریت میں ہوتے اور پاکستان کے مطالبہ کی نوبت ہی نہ آتی۔ اکبر نے ہندو راجاؤں سے تو رشے ناطے کئے مگر اچھوتوں کو قریب نہ کیا اور افسوس زیادہ علما پر ہے کہ انہوں نے بھی ادھر توجہ نہ دی۔

یہاں ایک واقعہ لکھنا ضروری ہے جن دنوں مسٹر گاندھی ہندوؤں کو کبھ رہے تھے کہ اچھوتوں کو اپنے مندروں میں آنے دو اور کنوؤں پر جانے دو اور خود اچھوتوں کی بستی میں رہنے لگے تو محمد دوم و محترم حضرت مولانا محمد ابراہیم بکرا نومی رحمہ اللہ نے خیال کیا کہ مسٹر گاندھی کی تو یہ سیاسی چال ہے ہمارا تو دین اس کا حکم دیتا ہے کہ انسانیت کا احترام کیا جائے چنانچہ انہوں نے اپنے علاقے میں یہ مہم چلانا چاہی اور ایک گاؤں کے خاکروبوں سے کہا کہ ہم تمہارے گھر میں کھانا کھائیں گے لیکن اس طرح کہ تم ہمارے سامنے ہاتھ دھو کر برتن صاف کر کے ان میں کھانا پکاؤ۔ انہوں نے ایسا ہی کیا حضرت مولانا رحمہ اللہ نے کھانا کھا یا کھاری عصمت اللہ مرحوم ان کے ساتھ تھے وہ سُنا تے تھے کہ مولانا تو بڑے سکون اور جمعیتِ خاطر سے کھانا کھا رہے تھے۔ بڑا اچھا گوشت اور حلوہ پکا تھا لیکن میں جب قلمہ سن میں ڈالتا تھا تو وہ بجائے حلق کے نیچے جانے کے معدہ میں پہلی چیزوں کو بھی اوپر لارہا تھا حضرت مولانا رحمہ اللہ سے بھی میں نے یہ قصہ سُنا، فرماتے تھے کہ لوگ ارد گرد جمع ہو گئے اور یہ خبر آنا غنائی علاقے میں پھیل گئی اور اگر میں کسی گاؤں میں جاتا تھا تو اس گاؤں کے لوگ خصوصاً میری طرف اشارہ کر کے کہتے تھے "ایہہ اومولوی آ، جیٹھرا چوہڑا ہو گیا۔۔۔۔۔" اگر سب علماء ایسا کرتے تو وہ صورت ہوتی جو سنگووال میں ہوئی۔

سنگووال کی جگہ گاہ ایک بڑا میدان تھی میں اب ایسا موس کر رہا ہوں کہ جیسے لوگ موسیٰ دروازہ یا بینار پاکستان کو ٹولیوں اور قطاروں کی صورت میں جگہ گاہ کو جا رہے ہوں۔۔۔۔۔ میں سٹیج کے قریب اتنا قریب بیٹھا کہ شاہ صاحب کا قریب سے بغور مشاہدہ کر سکوں اس علاقے میں چونکہ یونیٹیٹ پارٹی کے امیدوار کا آئری میسٹرٹ

ہونے کا رعب تھا لہذا حضرت شاہ صاحب کی تمام تر توجہ یونیٹیٹ پارٹی اور اسد اللہ خاں کی طرف رہی اور شاہ صاحب ان صاحب کو پہلے سے جانتے تھے کیونکہ وہ صاحب دو دفعہ پہلے احرار اسلام اور راعی برادری کے اُمیدوار کے مقابلہ میں علی الترتیب ڈسٹرکٹ کونسل، اور صوبائی سیٹ پر کھڑے ہو کر ہار چکے تھے۔ لیکن اب پھر کھڑے تھے، اور زخم خوردہ سانپ کی طرح تھے لہذا شاہ صاحب نے اس جلسہ میں انہی کے متعلق تقریر کا زیادہ حصہ صرف کیا اور مشہور کلمات

موتیاں دے لو نگ والے تیری ہر مسیاد نامی

پڑھ کر اس کی خوب تشریح کی کہ ہمارے علاقے میں ہندو نام کو تھے اور "منیا" کا مضمون نہ سمجھتے تھے لہذا اس کا سابق و سابق بیان کیا۔ اب بھی شاید اکثر احباب اس کا مضمون نہ سمجھ سکیں۔ "منیا" سکھوں کا ایک توار ہے جس میں مرد عورتیں رات کو کسی ندی، دریا یا چشے پر نہانے جاتے ہیں۔ آماں سنسکرت میں مہینہ کو کہتے ہیں، اس سے "منیا" بنا۔ ایک شخص نے شاہ جی کو چٹ دی کہ گدشتہ صوبائی انتخاب میں مولوی پیر محمد کے لڑکے میاں عبدالرب کو آپ نے مجلس کے ٹکٹ پر کامیاب کرایا تھا۔ لیکن وہ سکندر حیات کے ساتھ مل گئے تو اگر اب مولانا محمد علی جیت کر کسی دوسری پارٹی میں چلے گئے تو پھر کیا ہوگا۔ اس پر شاہ صاحب نے آدھ پون گھنٹہ زمینداروں کے فہم کے مطابق مختلف مثالیں دیں کہ اگر ایک سال میٹھی دل کھیتی چٹ کر جائے تو کیا تم اگلے سال گندم بونا چھوڑ دیتے ہو۔ اگر ایک سال یا دو سال مسلسل بھاد کو کیٹر لگ جائے تو کیا بھاد کی کاشت کرنا ترک کر دیتے ہو۔ اگر کسی سال خربوزے کی فصل ابھی نہ ہو تو کیا اگلے سال خربوزے کا خیال چھوڑ دیتے ہو۔ اور پھر آخر میں کہا کہ اگر تمہارے ایک دو بچے پیدا ہو کر مر جائیں تو کیا بیوی کے پاس جانا چھوڑ دیتے ہو۔۔۔ نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ جدوجہد و سعی کرتے ہو کہ پہلی تکلفی بھی ہو اور پھر مولانا محمد علی کی جانب متوجہ ہو کر کہا کہ اس دفعہ ہم نے ایک ایسا جانا "جو اندر" کھڑا کیا ہے کہ جس کے متعلق سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ وہ جیت کر کسی اور پارٹی سے مل جائے گا، اور مولانا کے متعلق خاصی عمر بڑی تقریر کی "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" مثالیں دے کر خطاب کرنا شاہ صاحب پر ختم تھا۔

چند دن بعد چودھری ولی محمد گوہر کے گاؤں "پر جیاں" میں جلسہ تھا اور جلسے کا اہتمام سکول کی وسیع گراؤنڈ میں تھا جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کا خطبہ اور نماز حضرت مولانا محمد عبداللہ رحمہ اللہ شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ ساہی وال نے پڑھائی جو ان دنوں خیر المدارس جالندھر میں استاد حدیث تھے۔ "پر جیاں کھان" بہت بڑا گاؤں تھا پورا علاقہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تقریر سننے کے لئے اکٹھا آیا تھا۔ اس زمانہ میں کسی گاؤں میں پندرہ بیس ہزار کا مجمع آج کے لاکھوں کے برابر تھا اور پھر جبکہ آج کل کے اخبارات پانچ سات ہزار کے جلسے کو لاکھوں کا مجمع بنا دیتے ہیں۔ وہ جلسہ آج کل لاہور کے بڑے جلسوں کے برابر تھا۔ جمعہ کے بعد مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ کی تقریر تھی۔ ایک جانب گوہر صاحب کرسی پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے کوئی اعتراض کیا۔ چونکہ تحریک پاکستان کا زور تھا لہذا مخالفت موافق دونوں کا اجتماع تھا گو دہستانی علاقہ تھا تاہم شرافت تھی تو رونا بہت شور و غل ہوا شاہ صاحب سکول کے کمرے میں تھے شور سنا

تو فوراً جلسہ کی جانب آئے مجھے خوب یاد ہے کہ سواری (براون) رنگ کی چادر باندھے ہاتھ میں لمبے دستے کی کھمباری لئے جیسے پنہانی میں "بگنوا" سمجھتے ہیں جلسہ کی طرف ذرا تیزی سے آئے مولانا جالندھری رحمہ اللہ کو فرمایا کہ تم تقریر ختم کرو انہوں نے آخری کلمات کہے اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تقریر شروع کی۔ بہت مختصر خطبہ پڑھا کہ وقت بھی کم تھا، اور تحریک پاکستان کے موضوع پر تنقیدی تقریر کی۔ آپ نے اپنی اس کھمباری کو صر کے برابر بلند کیا اور لکڑی کے دستے کے دونوں سروں کے متعلق کہا کہ یہ پاکستان ہے اور درمیان میں طویل ترین علاقہ ہندوستان ہے۔ اگر ادھر کی جانب کوئی ضرورت ہوئی تو ادھر سے امداد نہیں پہنچ سکے گی اور ایسا ہی اس کے برعکس ہوگا اور یہ کہنا کہ ہندوستان بچی کے دو پاؤں کے درمیان ہوگا محض طفل نسلی اور غلط فہمی ہے۔ نقصان ہمارا ہوگا چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے۔ چار کروڑ دوطرف تقسیم ہوں گے اور درمیان میں تیس کروڑ کی آبادی کا ملک ہندوستان ہوگا۔ تقریر اس قدر مدلل اور موثر تھی کہ سنایا چا گیا بغیر وعالیت جلسہ اختتام کو پہنچا ہاں سنگووال سے واپسی پر "مست پور" کار پر پستر اوٹھا کہ وہ اسد اللہ خاں کا قصبہ تھا۔۔۔۔۔

دو تقریریں خیر المدارس کے سالانہ جلسہ میں سنیں، اور وہ بھی اسی زمانے کی تھیں اور اس میں بھی باوجود احتیاط کے سیاسی مسائل آگئے ایک تقریر میں "ما اصابکم من مصیبة فبما کسبت اید یکم" کی آیت کریم پڑھی۔ تین ساڑھے تین گھنٹے تشریح کی علوم و معارف کا ایک سمندر تھا جو اس آیت کی تشریح کے ضمن میں بیان ہوا۔ اور خیر المدارس کے جلسہ میں حضرت شاہ صاحب نے "چکدش" والی نعت سنائی تھی اور نعت میرا خیال ہے کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کی موجودگی میں سنائی تھی۔ یہ نعت شاہ صاحب کے کلام "سواطع الالہام" اور اب "ماہنامہ الرشید" کے تاریخی "نعت نمبر" میں شائع ہوئی ہے جس کا مطلع ہے:

ہزار صبح بہار از نگاہ می چکدش

جنوں زسایہ زلف سیاہ می چکدش

خیر المدارس کے سالانہ جلسے اسی طرح اپنے زمانے میں معروف تھے جس طرح کبھی "ابن حمایت اسلام" کے لاہور میں ہوتے تھے۔ عموماً جمعہ کے بعد تقریر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کی ہوتی اور تیسرے دن آخری تقریر رات کو عشاء کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی۔ بھتان میں ابتدائی سالوں میں خیر المدارس کے جلسے اسی دھوم دھام سے ہوتے لیکن ان سب جلوں کی رونق حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اور ان اکابر کی وجہ سے ہوتی تھی۔ اب مدارس میں جلوں کا رواج تو ہے لیکن رسم نبھانے والی بات ہے وہ رونق تو کیا اس کا عشر عشر بھی نہیں ہوتا۔۔۔۔۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ کے ایک شاگرد حضرت فاضل رشیدی رحمہ اللہ نے سابی وال میں سالانہ جلسہ کی طرح ڈالی اس جلسہ میں بھی ملک کے تمام بڑے علما تشریف فرما ہوتے۔۔۔۔۔ شروع کے سالوں میں پہلی تقریر جمعہ کے بعد صاحبزادہ فیض الحسن صاحب کی ہوتی اور آخری شاہ صاحب کی۔ خیر المدارس کے جلسے عام خاص

باغ میں اور جامعہ رشیدیہ کے کمیٹی باغ میں میں ہوتے اور حاضری دیدنی ہوتی۔۔۔۔۔ بعد میں دونوں جگہ مدرسہ کے احاطہ میں ہونے لگے۔

میں نے اور میرے بڑے بھائی حکیم حافظ محمد اسلم نے اپنے گاؤں ہرلی پور میں پہلا جلسہ کرایا۔ قیام پاکستان کے بعد مئی ۱۹۵۰ء کے پہلے ہفتے میں میاں جنوں مجلس احرار اسلام کی کانفرنس کرائی۔ مٹان کا ڈپٹی کمشنر مرزا قیام میاں جنوں میں کوئی جلسہ کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ میری عمر تصویر تھی لہذا ناظم اعلیٰ مجلس احرار اسلام میاں جنوں کے نام سے دو دن کا جلسہ کرایا، اپنا نام نہ لکھا کہ جگہ حسنائی نہ ہو کہ مجلس احرار اسلام کو میاں جنوں میں ناظم اعلیٰ ایک لڑکا ملا حالانکہ بڑی عمر کے لوگ موجود تھے۔ ماسٹر تاج الدین صاحب، قاضی احسان احمد صاحب، جاناہز مرزا، مولانا محمد علی چاند حری اور امیر شریعت رحمہ اللہ تشریف لائے۔۔۔۔۔ اس جلسہ کا سارا اہتمام میں نے کیا۔

میاں جنوں کے ساتھ ایک چمک نمبر ۱۳۰ تھا (اب وہ میونسپلٹی میں آگیا ہے) اس میں ایک مستری صاحب بنام محمد دینی رہتے تھے شہر میں لکڑی کا اچھا کاروبار تھا۔ وہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے مرید تھے ۵۰-۵۱ میں انہوں نے شاہ صاحب رحمہ اللہ کو بیس ہزار روپیہ پیش کیا کہ آپ اپنا مٹان میں مکان بنوالیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا میاں صاحب آپ کی بھیاں ہیں ان کا نکاح کرنا ہے یہ روپیہ ان کے لئے محفوظ رکھیں۔ البتہ لاہور ساہی وال (اس وقت منگڑی) آتے جاتے ان کی دکان پر گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے تشریف لاتے بشرطیکہ کار پر لاہور ساہی وال جانا ہوتا۔ ایک دفعہ ۵۷-۱۹۵۶ء میں دس بارہ دن ان کے گلوں میں ان کے گھر قیام فرمایا ان دنوں مکتبہ رشیدیہ کے نام سے میں میاں جنوں میں دکان کرتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ تیس چمک سے پیدل یا تاکہ پر سیدھے مکتبہ رشیدیہ تشریف لے آتے اور باہر بیچ پر یا دکان کے پچھلے کمرے میں چار پانی پر تشریف رکھتے اور لوگ زیارت کے لئے آتے۔ انہیں دنوں ربیع الاول تھا پانی سکول میں اسی صاحب (ہیڈ ماسٹر) نے جلسہ رکھا اور کوشش کی کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ تشریف لائیں لیکن آپ نہ مانے پھر ایک استاد حاضر ہوئے اور عرض کیا تشریف لے چلیں آپ نے انکار فرمایا انہوں نے کہا حضرت چمکے شاید اسی صاحب بھی آتے ہوں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فوراً فرمایا کہ اس کے چمکے تائیدار صاحب بھی آتے ہوں گے۔۔۔۔۔ اسی سفر کی بات ہے چمک نمبر ۱۳۰ کی مسجد میں تقرر پر ضرور آمادہ ہو گئے۔ مسجد بھر گئی صحن میں جلسہ تھا۔ ایک نوجوان مشور نظم پڑھ رہا تھا۔

دلا غافل نہ ہو یکدم یہ دنیا چھوڑ جانا ہے

میں اندر گیا تو دیکھا حضرت شاہ صاحب سر جھکائے رو رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو کی بھرمار لگی ہوتی ہے۔ اس کے بعد باہر تشریف لائے اور مختصر تقریر فرمائی جو پسند و نصیحت اور ختم نبوت کے متعلق تھی۔ ایک دن مکتبہ میں تشریف رکھتے تھے کہ رازی پاکستانی کے چھوٹے چھوٹے بھائی آصفی نے کیرہ سے تصویر بنانا چاہی لیکن رعب کے مارے ہاتھ کانپ گیا اور تصویر نہ بنا سکا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور شاہ صاحب کے بتائے ہوئے وظیفہ سے مستری محمد دین کے کئی لڑکیوں کے بعد لڑکا پیدا ہوا۔ میں نے سنا ہے کہ وہ آج کل امریکہ میں ہے اور بہت

اجا کاروبار ہے۔۔۔۔

میاں جنوں سے آگے کسوال کے تین چار میل ادھر ایک چک میں میاں محمد شفیع رہتے تھے وہ شاہ صاحب کے عاشق تھے اور تقریباً ہر سال شاہ صاحب وہاں جلسہ پر تشریف لے جاتے اور مزارِ نبوت و ختم نبوت کے متعلق تقریر کرتے۔

میں مثنان خیر المدارس میں دو دفعہ داخل ہوا ایک دفعہ ۱۹۳۸ء میں اور دوسری دفعہ ۱۹۵۳ء میں اکثر جمعہ مسجد "سراجاں" بازار حسین آگاہی میں پڑھتا جہاں مولانا محمد علی جالندھری تقریر کیا کرتے تھے، اور اس کے بعد حضرت شاہ صاحب کو سلام کرنے حاضر ہوتا۔۔۔۔ ایک دفعہ حاضری ہوئی تو مرتضیٰ احمد میکیش، ملک نور الہی مالک اخبار "احسان" اور ابوسعید بڑی بیٹھے تھے گفتگو ہو رہی تھی یہ لوگ کہہ رہے تھے کہ شاہ صاحب اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ سچ کہتے تھے (یہ ابتدائی سالوں کی بات ہے) شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایک سائنس دان نے کہا کہ زمین گول ہے اور اس کو اس پر زہر کا پیالہ پینا پڑا لیکن اب سب لوگ کہتے ہیں کہ زمین گول ہے اس کے بعد مختلف باتیں سنیہ سنی ہوئی رہیں پھر یہ لوگ ہانے لگے شاہ صاحب نے پوچھا کہ اب کدھر کارادہ ہے میکیش نے کہا کہ (ایک مولوی صاحب کا نام لے کر) فلاں طرف۔ آپ نے فرمایا میں تو سمجھتا تھا کہ اس شہر میں ہی آپ کا شناسا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اور بھی ہیں یہ صاحب مولوی نواب دین مرحوم کے لڑکے مولوی غلام ربانی تھے۔ جب یہ لوگ ہانے کے لئے کھڑے ہوئے تو شاہ صاحب نے شر پڑھا۔

وہ آئے تو آئے نشیب و فراز دیکھ کر

اور جب چل دیئے تو بہر حال چلائے

اس پر وہ لوگ پھر بیٹھ گئے اور شعر و شاعری کی مجلس جم گئی۔

ایک دفعہ میں، رازی پاکستانی، آصفی پاکستانی حاضر ہوئے حضرت شاہ صاحب نے نفیس چائے پلائی۔ میں نے عرض کیا یہ لوگ تو لمبی کے عادی ہیں فرمایا یہ تو تیری حسن طلب معلوم ہوتی ہے۔ آصفی سے نام پوچھا تو اس نے کہا کہ آصفی۔ فرمایا رازی کے وزن پر تو نازی چاہیے تھا۔۔۔۔ پھر آصفی سے سلطنت آصفیہ دکن کی طرف ذہن منتقل ہو گیا اور آپ نے سورۃ ہمزہ لمن کے ساتھ تلاوت فرمائی اور جمع مالا وعدہ یحسب ان ما لہ اخلدہ۔ اور ان سے اگلی آیات پر زور دے کر پڑھا اور فرمایا کہ آصفی سے تو ذہن ادھر ہی منتقل ہوتا ہے آصفی نے آٹو گراف کے لئے گاٹی پیش کی تو اس پر شر لکھا:

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا ہاروں طرف سے پھول

پھر بھی کھلا ہی پڑنا ہے کیا خوش مزاج ہے

یعنی وقت رازی صاحب کو فرصت کا ملا اور انہوں نے جھٹ آپ کی تصویر لے لی آپ نے فرمایا کہ ضرارت سے باز نہیں آئے یہی وہ تصویر ہے جو آغا شورش مرحوم نے آپ کی سونخ کے پہلے ایڈیشن کے مہرودع میں گاٹی تھی کہ شاہ



صاحب کچھ لکھ رہے ہیں بہت خوبصورت پوز ہے

۱۹۵۲ء میں لیاقت علی کی شہادت ہو چکی تھی اور احرار دفاع کانفرنسیں کر رہے تھے۔ اوکاڑہ میں دفاع پاکستان کانفرنس تھی میں ان دنوں جامعہ رشید یہ منگواہ شریعت پڑھ رہا تھا حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۸۵ء) نے ازراہ کرم مجھے کتب خانہ میں سونے کی اجازت دی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ ایک رات تقریباً ایک بجے کا عمل ہو گا میں جاگ رہا تھا کہ میرے کانوں میں آواز آئی مولوی عبداللہ، مولوی حبیب اللہ، میں چونکا کہ یہ تو شاہ صاحب کی آواز ہے۔ غلامی کی طرف گیسٹ سے آواز آرہی تھی میں دوڑ کر گیا اور دروازہ کھولا تو شاہ صاحب کے ساتھ مختصر سامان ٹوکری وغیرہ تھی، وہیں کتب خانہ میں لے آیا، ان دنوں محمودیہ ہائی سکول والی جگہ میں جامعہ رشید یہ تھا تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں یہ جگہ ضبط کر لی گئی۔ میں نے عرض کیا میرے پاس سوجی گھی وغیرہ ہے حلوہ بنا لیتا ہوں آپ نے فرمایا کہ یہ جمعہ کی شب ہے جامعہ میں کوشت پکا ہوگا بوٹیاں وغیرہ تو نہیں ہوں گی دیکھ میں بچا ہوا شور بہڑا ہوگا اور روٹیاں بھی ہوں گی وہ لاؤ۔۔۔۔۔ میں اٹھ لایا اس کو کرم کیا اور دو تین روٹیاں اس میں رشید بنا کر کھائیں اور کہا کہ لطف آگیا ایسا مزہ حلوے میں کہاں ہوتا۔۔۔۔۔ صبح کو شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ صاحب، حضرت ناظم صاحب، حضرت مفتی صاحب، رحمہم اللہ اصعبین اور مولانا مقبول احمد سبھی فجر کی نماز کے بعد حضرت شاہ صاحب کے پاس آگئے اور بڑی علی مجلس ہوئی میں چائے بنا رہا تھا۔ شاہ صاحب چائے دانی، غمدہ چائے، پان اور لوزمات ساتھ رکھنے کے عادی تھے۔ میں نے پتی چائے دانی میں ڈال کر اُبلتا ہوا پانی نوپر ڈال۔ دل و دماغ تو باتوں کی طرف تھے صرف ہاتھ کام کر رہے تھے شاہ صاحب گفتگو بھی فرما رہے تھے اور مجھے چائے بناتے ہی دیکھ رہے تھے پانی زیادہ پڑ گیا اور کیتلی سے باہر آگیا شاہ صاحب نے فوراً دمایا واکٹر ہم لا یعقلون۔

حضرت شاہ صاحب ۱۹۵۰ء سے مجھ سے متعارف تھے کہ جسوں کا شوق قلم ہے مجھ سے پوچھا کہ جلسے میں چلو گے میں نے کہا ضرور لیکن حضرت مولانا سے اجازت لینا ہے شاہ صاحب نے میری سفارش کی تو حضرت مولانا نے شفقت سے ہنستے ہوئے فرمایا کہ آپ سفارش کریں یا نہ کریں میں اجازت دوں یا نہ دوں یہ تو ضرور جلسہ میں جائے گا۔ دل تو شاہ صاحب کے خدام کی حیثیت سے جانے کو ہمارا تھا لیکن میرے کپڑے دھلنے گئے ہوئے تھے لہذا عرض کیا کہ شام کو حاضر ہوگا۔۔۔۔۔ اوکاڑہ میں پہلی نشست کی صدارت ڈپٹی کمشنر منٹگہری (ساجی وال) نے کی اور احرار رصنا کاروں نے سلائی دی۔ پورے صوبہ سے رضا کار سینکڑوں کی تعداد میں آئے ہوئے تھے، اور ورلنگ کمیٹی کا اجلاس بھی تاقبضہ کے دن ہائی سکول میں میٹنگ ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ دیکھوں کہ میٹنگ میں کون کون شریک ہیں اور کس طرح کی بحث ہوتی ہے۔ لیکن باہر گیسٹ پر پھر یہ ار تلواریں تانے کھڑے تھے۔ میں ادھر سے ادھر گزر جاتا ایک دفعہ دیکھا شاہ صاحب صحن میں ٹہل رہے ہیں میں دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا شاہ صاحب کی نظر بڑی اور آواز دی۔ رضا کاروں نے تلواریں نیچی کر لیں اور میں اندر چلا گیا۔ میٹنگ میں سبھی لیڈر شریک تھے مجھے بڑی ہوش ہوئی کہ اتنی بڑی میٹنگ کو ہوتے دیکھا عصر کی نماز کے بعد ویسے ہی ایک مجلس ہوئی جس میں خاص خاص اصحاب

شریک تھے چودھری افضل حق رحمہ اللہ کے بیٹے چودھری ظہور الحق بھی موجود تھے۔ میں بھی جا کر بیٹھ گیا۔ لیاقت علی کے قتل کا حادثہ ہو چکا تھا حضرت شاہ صاحب نے اس پر تبصرہ فرماتے ہوئے شعر پڑھا۔

نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خونِ دل

بے دست و پا کو دیدہ بینا نہ بھابھی

رات کو اے ڈی ایم ساہی وال کی صدرات اور حضرت شاہ صاحب کی تقریر تھی۔ اے ڈی ایم کہ میں پہلے سے جانتا تھا کہ اچھا مقرر ہے۔ اس نے شروع میں تقریر کی اور کہا کہ ہدایت کے کام میں کہ آج مجھے ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا ہے کہ میں احرار کا شکر یہ ادا کروں کہ انھوں نے دفاع کا فرس نہیں کر کے ملک کو بیدار کیا اور خون کو گرنایا لیکن تقسیم سے قبل میں فاضلکامیں تحصیل دار تھا اور وہاں شاہ صاحب کی تقریر تھی ڈی سی فیروز پور نے مجھے حکم دیا ہوا تھا کہ تمہارے شہر میں ایسا مقرر آ رہا ہے کہ اس کی تقریر میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اگر وہ لوگوں کو کچھ کہہ کر دیا میں چلا نکلیں گا دو تو وہ اس پر عمل کریں گے اور اگر کچھ کہے کہ آگ میں کود جاؤ تو لوگ اس پر عمل کریں گے۔ جب تقریر اس نقطہ پر پہنچے تو تم نے تقریر بھیجی ہے کہ تقریر ختم کر دو، اگر ختم نہ کریں تو گرفتاری کرنا ہے۔ ڈپٹی کمشنر انگریز تھا میں حیران تھا کہ اس کی معلومات کس قدر ہیں بہر حال میں جلسہ گاہ میں گیا اور تقریر جب شہاب پر پہنچی تو واقعی ایسا وقت آیا کہ میرے ضمیر اور نفس میں کشمکش شروع ہو گئی۔ ضمیر کہتا تھا کہ تقریر جاری رہنا چاہیے کہ ملک اور قوم کے مفاد میں ہے لیکن نفس کہتا تھا کہ اپنے حاکم کا حکم یا نور نہ ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے کئی منٹ یہ کشمکش رہی بالآخر نفس غالب آیا کہ تو نے ترقی کر کے نہانے کہاں تک جانا ہے اپنے افسر کی بات مانو میں نے رکھ بھیجا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا حکم ہے کہ تقریر بند کر دیں اور جلسہ ختم کر دیں شاہ صاحب نے کہا پندرہ منٹ اور۔۔۔ میں نے کہا کہ نہیں احرار کا فیصلہ تھا کہ حکومت نے ہنگرانے کا ابھی موقع نہیں ہے لہذا شاہ صاحب نے تقریر ختم کر دی اور آج ڈپٹی کمشنر کا حکم ہے کہ شکر یہ ادا کروں اس طرح قریباً آدھ گھنٹہ باتیں کر کے اے ڈی ایم بیٹھ گیا اور شاہ صاحب نے تقریر شروع کر دی۔ میرا خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی یہ تقریر پاکستان میں سنی جانے والی تقریروں میں میرے لیے سب سے اہم تھی کہ اس میں خطابت کا وہ تمام شکوہ اور انداز موجود تھا کہ جس کی ہر کوئی تعریف کرتا تھا۔ اس تقریر میں زیادہ حصہ مرزائیت، ظفر اللہ اور لیاقت علی کا قتل تھا آپ نے فرمایا کہ عدالت کی کرسی ہو اور فیصلہ میں نے کرنا ہو تو پھر میں تفصیل سے وہ تمام باتیں مدلل لکھ کر کتابت کروں کہ اس قتل میں اصل ہاتھ ظفر اللہ کا ہے۔ اس لئے کہ احرار کی کوششوں سے وزیراعظم لیاقت علی خاں پر مرزائیوں کے تمام منصوبے اور عزائم منکشف ہو چکے تھے۔ آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ یہ مرزائی وزیر خارجہ آج تک

۱- احرار کا سب سے پہلا رابطہ مسلم لیگ سے جو ہوا وہ میاں جنوں مسلم لیگ کے دفتر میں ہوا کہ میر غلیل الرحمان سیکرٹری پاکستان مسلم لیگ کی زمیں میاں جنوں کے قریب تھی قاضی احسان احمد صاحب غلیل الرحمان سے ملے دونوں کی تقلید میں بات چیت ہوئی اس کے بعد خواجہ ناظم الدین اور وزیراعظم لیاقت علی خاں مرحوم سے مفصل ملاقاتیں ہوئی۔

افغانستان کیوں نہیں گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت افغانستان نے دو مرزائی مبلغوں کو ختم نبوت کے انکار پر شرعی سزا دی تھی ہمارا وزیر خارجہ افغانستان کو اس کی سزا دے رہا ہے، اور پاکستان اور افغانستان جو آپس میں جاتی ہیں ان کو اس نے ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا ہے، اور فرمایا کہ افغانستان کے لوگ پاکستان کے خلاف اس طرح مشغول ہیں گویا ہماری ان سے کفر و اسلام کی جنگ ہے اور یہاں شاہ صاحب نے سر سے ٹوٹی تھاری، بالوں کو بڑھا دیا اور ڈاڑھی کو منہ میں لیا اور کلمہ شہی کو کندھے پر رکھا اور فرمایا کہ اس مرزائی کی وجہ سے افغانستان کے لوگ ہمارے خلاف اس طرح مشغول بیٹھے ہیں اور یہاں پھر وہی شعر پڑھا جو شام کی مجلس میں پڑھا تھا اُس وقت تو عام لہجہ میں تھا مگر اب یہ شعر پورے درد و حسرت اور ترنم سے پڑھا۔ مجمع کی یہ حالت تھی کہ اگر سوئی گرسے تو اس کی آواز آئے۔ ہر شخص اس المیہ کا درد اپنے جسم میں محسوس کر رہا تھا۔

سردیوں کا آغاز تھا اور اس دن بارش بھی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود فٹ بال گراؤنڈ لوگوں سے بھری ہوئی تھی حضرت شاہ صاحب کی یہ تقریر تقریباً تین گھنٹہ جاری رہی۔۔۔۔۔

آپ نے خطبہ مسنونہ کے بعد قرآن پاک کی آیت کریمہ واعدوا لهم... استطعتم من قوة ومن رباط الخیل ترهبون به عدو الله وعدوكم و آخرین من دونهم۔ پڑھ کر اس کا ترجمہ اور تشریح کی و اعدوا لهم ما استطعتم من قوة کے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کے مقابلے میں اپنی پوری قوت جمع کر لو اپنی طاقت کی حد تک۔ جبکہ کسی اور فرض اور رکن کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ پوری قوت خرچ کر لیکن جہاد کے متعلق یہ فرمایا ترهبون۔ بہ کے متعلق کہا کہ اس کا معنی ہے کہ "اونہاں نوں یرکا دیو" "اوہ یرک جان۔" پھر فرمایا میں کہ آپ کو بتاؤں کہ "یرکنے" کا مفہوم کیا ہے اور سوال کیا کہ کیا تم بنے کبھی دو ساندلوں کو لڑتے دیکھا ہے فرمایا کہ دونوں خوب زور آزمائی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو پیچھے ہٹ ہٹ کر ٹھکریں مارتے ہیں بالآخر ایک میدان چھوڑ دیتا اور بھاگنا شروع کرتا ہے دوسرا اس کا تعاقب کرتا ہے بھاگنے والے کو "موک" (اسہال) لگ جاتی ہے اور وہ ہرا ہرا ہٹلا گوبر بھاتا، مسلم لیگ کا جھنڈا بھاتا ہوا سر پٹ بھاگتا ہے (یہ بات شاہ صاحب نے ازراہ لفظی کھن) اسے کہتے ہیں "یرکان" فرمایا ترهبون۔ بہ کا ترجمہ اُردو میں یہ ہے کہ اتنی تیاری کرو کہ اللہ کے دشمنوں پر تہداری دھاک بیٹھ جائے اس دھاک بیٹھنے کو پنہائی میں فرمایا "یرکا دیو" اس کے بعد ہے و آخرین۔ من دونہم۔ لا تعلمونہم اللہ یعلمہم۔ اور دوسروں پر ان کے سوا۔ جن کو تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے۔ فرمایا کہ یہ ہمارے ملک کے فقہ کالم ہیں اور سب سے بڑے فقہ کالم مرزائی ہیں۔۔۔۔۔ جن لوگوں نے اوکاڑہ کی یہ تقریر سنی ہے ان میں سے بہت سے زندہ ہوں گے وہ گواہی دیں گے کہ اس تقریر میں شاہ صاحب کی جوانی کی جھلک نظر آتی تھی۔ افسوس کہ شاہ صاحب کے زمانے میں ٹیپ ریکارڈر نہیں تھے اگر ہوتے تو آج لوگوں کو پتہ چلتا کہ خطابت کس کو کہتے ہیں اور شاہ صاحب کیسے خلیفہ تھے آخر کوئی بات تو ہے کہ ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، بہادر یار جنگ، جیسے یگانہ روزگار خطیبوں نے آپ کی خطابت کا اعتراف کیا۔

آج بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ بتاؤ شاہ صاحب کی تقریر کیسی تھی ان کو کیا بتایا جائے اور کیا مثال دی جائے۔۔۔ میرا احساس ہے کہ دعوت و عزیمت میں ابوالکلام، قومی شاعری میں علامہ اقبال اور عوامی خطاب میں امیر شریعت رحمہ اللہ کی مثال شاید اردو زبان میں کبھی پیدا ہو۔ جیسا شاہ صاحب خطیب تھے اس کے دس پندرہ فیصد کے قریب بھی کسی کو نہیں دیکھا۔

میں نے اپنے استاد حضرت مولانا عبداللہ دھرمکوٹی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ شاہ صاحب کی جوانی کیسی تھی آپ نے مختصر سا فقرہ کہا فرمایا شاہ صاحب کی جوانی تھر تھی۔ (آپ کا فقرہ تھا "جوانی سی؟ تھر سی؟") پنجابی زبان کے مشہور واعظ حضرت مولانا عبدالعزیز ملیا نوی سے میں نے یہی سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ ابتدا میں قصبات میں بجلی نہیں ہوتی تھی گیس لیمپ ہوتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب دور ان تقریر جب سر سے ٹوپی اُتار کر سر کو جنبش دیتے تھے تو آپ کے بالوں کی حرکت کے ساتھ لوگوں کے دل حرکت کرتے تھے

گدشتہ سطور میں رازی صاحب، آصفی صاحب کی شاہ صاحب سے ملاقات کا ذکر گذرا اس میں ہم میں سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت سنا ہے آپ کی تقریر مسعود کھدر پوش نے ریکارڈ کی تھی آپ نے فرمایا کہ ہاں میرے علم کے بغیر ایسا ہوا تھا۔۔۔ اس کی کچھ تفصیل سنائی یہ مفصل قصہ مولانا مجاہد الحسنی کی زبانی میں نے سنا تھا۔۔۔ مظفر گڑھ میں ایسی ہی کوئی دفاع کا نفرنس تھی اور مسعود کھدر پوش بحیثیت ڈی سی صدر تھے۔ مسعود مرحوم کسی غیر ملک سے اس زمانے کی ٹیپ ریکارڈ لائے تھے یہ ٹیپ مشین خاصی برمی ہوتی تھی اور اس کا مائیک لٹوڈ سہیکر کے ساتھ باندھنا پڑتا تھا اس کی چرخی بھی (کیسٹ) خاصی برمی ہوتی تھی شاہ صاحب کے سٹیج پر تشریف لانے سے قبل مائیک کے ساتھ ٹیپ ریکارڈ کا مائیک باندھ دیا گیا تھا۔ شاہ صاحب آئے تو پوچھا کہ یہ کیا ہے بتایا گیا کہ آپ کی تقریر ریکارڈ کریں گے شاہ صاحب سنت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تم میری تقریر کے ریکارڈ تیار کر کے "دینے قوال" کی طرح سنا اور سنا یا کرو گے۔ (دنا قوال اپنے زمانے کا بہت بڑا قوال تھا اور اس کی نظیر آج تک نہیں ہوتی) اسے اُتارو۔ قبل و قال کا کوئی سوال نہ تھا فوراً وہ مائیک اُتار لیا گیا اور شاہ صاحب کچھ دیر خاموش سوچتے رہے اور منتظمین نے ٹیپ کا مائیک ایک سچیکر کے ساتھ رکھ دیا اور ساری مشین بھی اُٹا کر وہاں رکھ دی۔ شاہ صاحب کو اس کا علم نہ ہوا آپ نے اپنے مخصوص انداز میں خطبہ مسنونہ پڑھا اور تقریر کی۔۔۔ اگلے دن یہ طے ہوا کہ شاہ صاحب کو یہ تقریر سنائی جائے نوابزادہ نصر اللہ صاحب نے کہا کہ شاہ صاحب ذرا سیر کر آئیں۔۔۔ کار پر باہر نکلے تو ایک برمی کوٹھی کے سامنے کار جار کی اور وہاں مسعود مرحوم استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ تم نے بہت بُرا کیا میں ساری زندگی کسی افسر کے مکان پر نہیں گیا لیکن مسعود صاحب سے پرانی شناسائی بھی تھی انہوں نے بڑھ کر سلام کیا۔ شاہ صاحب کار سے اُترے اور اندر ڈرائیونگ روم میں جا بیٹھے۔ انہوں نے پہلے سے رات والی تقریر کا گھر میں سنانے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ بیٹھے ہی تھے کہ اچانک ایک جانب سے لمن داؤدی میں الحمد للہ کی بلند آواز آئی۔ حضرت شاہ صاحب الحمد للہ کہہ کر کچھ دیر کے لئے خاموش رہ کر پھر دوسری دفعہ الحمد للہ کے ساتھ

نحمدہ پڑھنا شروع کرتے تھے۔ کاش صرف "الحمد للہ" ہی (ریکارڈ) محفوظ ہو جاتا تو اس سے خطاب اور تملوت کا اندازہ ہوتا۔ اب جب یہ آواز آئی تو آپ ایک دم متوجہ ہوئے معلوم ہونے پر آواز کی جانب جا کر پاؤں پر بیٹھ کر دونوں ہتھیلیاں رخساروں پر رکھ لیں اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور فرمایا کہ گلگتہ سے پشاور تک کروڑوں انسانوں نے میری بارہا تقریریں سنی ہیں لیکن میں آج پہلی دفعہ اپنی آواز سن رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ سن کر خوشگوار حیرت ہوئی ہوگی اور کہا کہ میں نے محسوس کیا کچھ تھوڑا بہت بول لیتا ہوں۔

جب شاہ صاحب سے ہماری یہ گفتگو ہو رہی تھی اب مجھے یاد نہیں مولانا سید عطاء العظیمین پاس بیٹھے تھے یا سید عطاء المومن، کم عمر تھے انہوں نے تبصرہ کیا کہ آج کل اکثر و بیشتر مقرر حضرات کی تقریر اگر ان کو سُنائی جائے تو وہ گالی دے کر پوچھیں گے کہ یہ کون بکواس کر رہا ہے۔

اس کے بعد ایک دفعہ لاہور میں قطب الارشاد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ تشریف لائے ہوئے تھے ان دنوں مسعود مرحوم لاہور تھے پھر پروگرام بنا کہ آج شاہ صاحب کی مجلس گفتگو ریکارڈ کی جائے چنانچہ طے ہوا کہ صبح کا ناشتہ ان کے ساتھ کیا جائے۔ باہر نکلے کار پر بیٹھے لیکن تھوڑی دُور جا کر ڈانے لگے کہ طبیعت رک رہی ہے جی نہیں جانتا کہ اپنے شیخ کے پاس سے اُٹھ کر کسی افسر یا دنیا دار کے پاس جایا جائے۔ کار واپس کرو اور واپس تشریف لے آئے اور وہ تقریر جو مظفر گڑھ میں ریکارڈ ہوئی تھی کسی خال خال شخص کو اس کا پتہ تھا۔ میں نے ایک دو دفعہ لاہور آنے پر مسعود مرحوم سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میرے پاس بہت سی ریلیں ہیں کسی دن تلاش کروں گا۔ پھر بت کیا تو فرمانے لگے کہ وہ گرمی سے جڑ گئی ہیں۔ میں ۱۹۷۸ء میں انگلستان گیا تو وہاں بہت سے دوستوں نے کہا کہ وہ ریل ان سے لو اب تو میٹنالوجی نے بہت ترقی کر لی ہے اس کو کسی صورت درست کر لیں گے اور ۸۳ء میں تو بہت اصرار سے دوستوں نے توجہ دلائی لیکن اسی دور ان میں مسعود مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ ع

آلِ قدح و بکشت و ساقی نہماند

اللہ کو منظور نہیں تھا کہ امیر شریعت رحمہ اللہ کی تقریر عام ہو اس طرح آج کل کے خطبا کا بہرہ رو گیا ورنہ کوئی کسی کو نہ پوچھتا۔ کس نے پرسد کہ بھیا کیستی؟

جیسا کہ معلوم ہوا میری حضرت شاہ صاحب سے ہڈرے بے ٹکھنی تھی میں نے ایک دن شاہ صاحب سے پوچھا کہ حضرت کبھی آپ نے ایسا بھی محسوس کیا کہ آپ تقریر کرنے میں بے بس ہیں آپ نے فرمایا کہ ہاں دو دفعہ ایسی صورت حال پیش آئی ایک دفعہ تو ایسا ہوا کہ الہ آباد میں جو اہر لال نہرو کے والد موقی لال نہرو کی صدارت میں جلسہ تھا اور سامنہ کمیشن آیا ہوا تھا کانگریس نے اس کا بائیکاٹ کیا تھا اور اسی سلسلے کا جملہ تھا۔ موقی لال کی تقریر پہلے تھی۔ خالص سیاسی مسکد تھا۔ سامعین میں ہندو زیادہ تھے موقی لال نے اس قدر مدلل اور مسکت تقریر کی کہ میں سوچ رہا تھا کہ اس کے بعد میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ حیران تھا اور سر جھکائے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ لوگ کہیں گے مولوی کو دو تین تقریریں یاد تھیں وہ یہاں کر گیا اب کچھ پاس نہیں ہے کہ موقی لال نہرو نے یہ کچھ کر تقریر ختم کی کہ

اب میں آپ کے محبوب مقرر کے درمیان زیادہ دیر حائل نہیں رہنا چاہتا۔ اس پر میں نے سر اٹھایا دیکھا تو پنڈال کے آخری سرے پر کچھ رضا کاروں (والنیشنروں) نے سائن کمیشن کی ارٹھی (جنازہ) اٹھائی ہوئی ہے اور وہاں رکھ کر اس کو آگ لگانا تھا، جو نبی میری اس پر نظر پڑی مجھے یہ شعر یاد آگیا

ہوئے مَر کے تم جو رُسا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا  
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کبھی مزار ہوتا

بس میں نے بلند آواز سے یہ شعر پڑھا تو موسیقی لال نہرو نے اپنے زانوؤں پر دو ستر مارا اور کہا کہ شاہ صاحب آپ نے میری ساری تقریر کا بیڑا غرق کر دیا (پاستیناس کر دیا) بس پھر اللہ دے اور ۔۔۔ لے۔ موضوع یکسر پلٹ گیا تھا میں نے تین چار گھنٹہ تقریر کی۔

اور ایک واقعہ آگرہ کا ہے کہ بہت بڑا جلسہ تھا پنڈال کے درمیان سٹیج تک جانے کا راستہ بنا ہوا تھا میں وہاں سے گزر کر سٹیج کی جانب جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ لوگوں کے چہرے پر ہنسا جا رہا تھا یہ کھنکھنے کی ضرورت نہیں کہ لوگوں کے چہروں سے موضوع کا انتخاب کرتا ہوں اور چہروں کو دیکھ کر بے باپ لیتا ہوں کہ کیا صورت حال ہے ہر سو پچاس آدمیوں میں سے ایک کے پاس اخبار تھا میں دیکھتا سوچتا آگے بڑھتا رہا اور سٹیج پر پہنچ گیا۔ وہاں میز پر انقلاب اخبار کی ایک کاپی پڑی تھی جس میں میرے متعلق ایک بے سرو پا بات لکھی ہوئی تھی کہ اس نے فلاں جگہ یہ تقریر کر، (کہ گاندھی کا پیشاپیش کوثر و زمزم کے پانی سے پوتر ہے) بات ایسی تھی کہ کوئی مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا میں یہ اخبار پڑھ کر سوچنے لگا کہ میں پہل کروں یا مجمع پہل کرے کہ اتنے میں پنڈال کے آخر میں سے ایک شخص نے مجھے گالی دے کر کہا کہ اس کی ڈاڑھی پکڑو اور سٹیج سے اتار دو میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "خبر ابی ہے بکواس کرتا ہے۔" لوگوں نے اس کا منہ مٹو لکھا تو شراب کی بو آ رہی تھی بس پھر کیا تھا اس کی پٹائی ہوئی اور امیر شریعت زندہ باد کے نعرے لگے اور میں نے گھنٹوں تقریر کی۔۔۔۔۔ کارٹین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ صحابہ صاحب اپنے متعلق اس قسم کی باتیں کرنے یا سنانے کے عادی نہ تھے اور نہ ہی کبھی بعد از تقریر کسی سے پوچھتے کہ سناؤ کبھی تقریر رہی اور نہ ہی کسی کو یہ جرات ہوتی تھی کہ تقریر کی تعریف کرے جیسا آج کنی کا معمول ہو چلا ہے۔۔۔۔۔ یہ تو میری بے تکلفی یا یوں کہیے کہ اس طرح کی باتوں میں دلچسپی دیکھ کر ہات سُنادی۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ یہ دونوں واقعات یا پہلا واقعہ آغا شورش مرحوم کی کتاب میں بھی موجود ہے۔

اسی طرح میں نے ایک دفعہ پوچھا کہ حضرت کوئی بزرگ یا رہنما ایسے بھی تھے کہ جہاں آپ اپنے آپ کو محسوس کرتے ہوں کہ یہاں بات کرنا مشکل ہے فرمایا وہاں دو جگہیں ایسی تھیں کہ ایک جگہ تو دو تین دلعز ہی جانا ہوا دوسری جگہ البتہ بار بار گیا بار بار اکتھے خطاب کیا تاہم ایک رعب اور محاب رہا میں نے عرض کیا یہ کون حضرات تھے فرمایا ایک حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اور دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد

حضرت تھانوی رحمہ اللہ و لاؤ اقدس میں نے ہاں تفصیل اپنے استاد حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ سے بھی سنا تھا وہ یہ کہ جب علامہ انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کا انتقال ہو گیا تو احساس ہوا کہ کوئی اور جگہ ہونا چاہیے کہ جہاں جا کر دُعا کرائی جائے ان دنوں قادیان کا نفرنس والی تقریر پر مقدمہ چل رہا تھا اور سنگین نوعیت کی دفعات کے تحت کیس قائم ہوا تھا شاہ صاحب حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ کے پاس چاند مر گئے اور کہا کہ تھانہ بھون جانا ہے انہوں نے کہا کہ ہمارا یہ قاعدہ ہے کہ جانے سے پہلے اطلاع دیتے ہیں اور ویسے بھی میں چند دنوں پہلے حاضری دے کر آیا ہوں۔ شاہ صاحب نے کہا کہ نہیں میرے ساتھ چلیں چنانچہ دونوں حضرات نے تھانہ بھون جانے کا قصد کیا۔ سہارنپور جا کر شاہ صاحب نے پوچھا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کھانے کی کوئی چیز پسند کرتے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ سنگترے مرغوب ہیں چنانچہ ایک ٹوکری سنگتروں کی لے لی۔ سہارنپور کے احباب نے رات واپسی پر تقریر کا وعدہ لے لیا اب جب تھانہ بھون جانے والی گڑھی پر بیٹھے تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ میرا تو دل گھبرا رہا ہے واپس ہو جائیں مولانا نے کہا کہ اتنی دُور سے مجھے لانے میں اب چلنا چاہیے۔ تھانہ بھون پہنچے تو حضرت گھر جا چکے تھے مولانا حضرت کو اطلاع دینے گھر گئے اور حضرت سے ملتے ہی فرمایا کہ آیا نہیں لایا گیا ہوں اور ساری روڈ اور پھر گاڑی والا قہہ سُنا۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ چلیں میں آتا ہوں۔ مولانا اور شاہ صاحب تالاب کے پاس اپنے دھیان کھڑے تھے کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ شریف لے آئے اور ساتھ اپنے کمرے میں لے گئے شاہ صاحب دوڑا نو بیٹھ گئے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شاہ صاحب بے تکلفی سے بیٹھیں اس طرح تا دیر بیٹھنا آپ کے لئے مشکل ہو گا کوئی تکلف یا حجاب کی بات نہیں ہے۔ دیکھئے میں ٹوپی پہن کر آیا ہوں گڑھی نہیں، اور پھر آتے ہی چارپائی پر لیٹ گیا ہوں تاکہ بے تکلفی کا ماحول پیدا ہو۔ چند منٹ اور دھر کی باتیں ہوئیں اور پھر شاہ صاحب نے کچھ اشعار سُنائے اور دُعا کی درخواست کی۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے پوچھا کہ آپ کی جماعت کا چندہ کتنا ہے آپ نے کہا کہ ایک روپیہ سالانہ۔۔۔۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے غالباً ۲۵ روپے نکال کر دیے اور کہا ہاں تھی ھ کے لئے تو میرے بھئیے لو اس کے بعد زندہ رہا تو پھر سہی اور فرمایا کہ خط و کتابت رکھئے لیکن اس کے لئے اپنا موز نام بتایا اور شاہ صاحب کو بھی فرمایا کہ آپ اس نام سے خط لکھا کریں۔۔۔۔ فرمایا اپنا اپنا کام کرنے کا انداز ہے ہم دونوں ایک ہی کام کر رہے ہیں۔۔۔۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا کہ حضرت۔۔۔۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ سمجھ گئے اور فرمایا کہ ہاں شاہ جی آپ میرے لئے کیا لائے ہیں شاہ جی نے بتایا تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آپ شریف رکھیں میں کسی کو بھیج کر منگواتا ہوں ایک دو دفعہ گئے اصرار و انکار کے بعد حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اچھا آپ ہی لائیں۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ بہت بڑے خطیب ہیں میں آپ کی چال سے پہچانوں گا۔ اب شاہ صاحب اپنے ال بھول گئے۔ پاؤں رکھتے کھیں میں اور پڑیا کھیں ہے بہر حال ٹوکری لائے اور لا کر کھڑے سوچتے ہیں کہ کہاں رکھوں۔ حضرت تھانوی خاموش ہیں آپ نے پانہنیتی کی جانب رکھ دی تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا او ہوا شاہ صاحب یہ تو سر پر رکھنے کی چیز تھی۔۔۔۔ حضرت مولانا خیر محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کے بعد کسی ایک موقع پر

جب شاہ صاحب کا ذکر چھڑا تو حضرت تانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ان کی باتیں تو عطاء اللہی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ یہاں ضما ایک بات ذکر کرتا چلوں کہ حضرت شاہ صاحب بزرگوں کا بہت ادب کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جب کسی اللہ والے کے پاس جاؤ تو کچھ نہ کچھ بد یہ ضرور لے کر جاؤ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق میں نے تفصیل نہیں پوچھی آغا شورش نے ”چٹان“ میں لکھا تھا کہ ایک دفعہ شاہ صاحب مولانا آزاد کی قیام گاہ پر حاضر ہوئے تو مولانا باہر کھڑے تھے اور کہیں جانے کی تیاری تھی لیکن کار میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ مولانا جب کسی عجلت میں ہوتے تھے تو ان کے کندھے جنبش کیا کرتے تھے۔ علیک سلیک کے بعد فرمایا کہ میرے بھائی! اس گم بہت کو اسی وقت خراب ہونا تھا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ حضرت میرے کندھے حاضر ہیں تو مولانا نے فرمایا کہ میرے بھائی ان پر تو پہلے ہی بہت بوجھ ہے۔

ایک دفعہ کانگریس کی حائلہ کا اجلاس ہو رہا تھا کہ شاہ صاحب مولانا آزاد سے ملنے گئے اندر چٹ بھیجی تو مولانا باہر تشریف لے آئے شاہ صاحب صوفے پر بیٹھے تھے اُٹھ کھڑے ہوئے مصافحہ ہوا اور شاہ صاحب قالین پر بیٹھنے لگے تو مولانا نے ہاتھ پکڑا شاہ صاحب نے ابھی اتنا ہی کہا کہ حضرت۔۔۔۔۔ (یعنی میں قدموں میں بیٹھوں گا) تو مولانا نے فرمایا کہ ”میرے بھائی! وہ بات تو ہو گئی۔“ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔

یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ میرے تایا زاد بھائی کا فون آیا جو علیک میں اور کٹر مسلم لگی۔ پوچھا کہ اگر ہے ہو میں نے بتایا کہ شاہ صاحب پر مضمون لکھ رہا ہوں تو انہوں نے بتایا کہ میں نے آپ کی دو تقریریں سنی ہیں ایک ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں کسی گاؤں میں اور ایک نکودر، جب وہ نکودر بانی سکول میں پڑھتے تھے انہوں نے کہا کہ آپ کا قوآن مجید پڑھنا ایسا تھا کہ ہندو تک مسخ ہو جاتے تھے اور پھر نکودر میں جو تقریر کی اس میں انگریز کے مظالم کا ذکر کیا تو سارا مجمع ہندو مسلم دھڑا اٹھ مار مار کر رو رہا تھا۔

مضمون طویل ہو گیا لیکن ایک دو باتیں مزید سنئے مولانا صاحب رحمہ اللہ فاضل رشیدی رحمہ اللہ ناظم جامعہ رشیدیہ کی روایت ہے کہ لاہور میں جمعیت علماء ہند کا جلسہ تھا اور احرار رضا کار سرخ وردیاں پہنے جلسہ گاہ میں بطور حفاظت موجود تھے کہ جمعیت کے ایک بزرگ نے (مولانا مفتی محمد نعیم) حضرت مدنی سے فرمایا کہ یہ لوگ سرخ قمیضیں پہنے پھر رہے ہیں۔ لوگ کہیں گے کہ احرار نے جلسہ کروایا۔ جمعیت جلسہ نہیں کر سکتی تھی۔ حضرت ساتھیوں کی رائے کا بہت احترام کرتے تھے فرمایا کہ میں شاہ صاحب کو کئے دیتا ہوں چنانچہ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے شاہ صاحب سے فرمایا کہ رضا کاروں سے کہہ دیں کہ وہ وردی اُتار دیں۔ شاہ صاحب جانتے تھے کہ حضرت سے کسی نے کہا ہے ورنہ آپ از خود ایسی بات نہیں فرما سکتے تاہم ادب ملحوظ رکھتے ہوئے دل پر جبر کر کے رضا کاروں سے کہا کہ وردیاں اُتار دو۔ اس کے بعد جلسہ شروع ہو گیا۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کا خطبہ صدارت تھا آپ مائیک پر آئے ہی تھے کہ مسلم لگی نوجوانوں کا ایک جم غفیر سٹیج کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ اس پر حضرت شاہ صاحب نے فرستاد مفتی صاحب سے کہا



کہ جلسہ کا انتظام سنبھالے اب وہ مگر نگر دیکھ رہے ہیں اور پریشان ہیں۔ تب حضرت شاہ صاحب اٹھے اور حضرت مدنی رحمہ اللہ سے کہا کہ آپ تشریف رکھیں اور خود کھڑے ہو کر گرجہ دار آواز میں کہا کہ تمام احرار رضا کار اپنے فرائض سرانجام دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔ پھر کہا کہ کوئی سپاہی جلسہ کے ارد گرد نظر نہ آئے تیسری بات یہ بھی کہ جو عنصر ضرورتی ہے ان کو میں تنبیہ کرتا ہوں کہ جہاں کھڑا ہے وہاں بیٹھ جائے ورنہ میں اپنے رضا کاروں کو بزمن کا حکم دوں گا۔ کچھ لوگ آگے بڑھتے رہے اور باقی بیٹھ گئے یا سر اسید ہو کر چپے ہٹ گئے اب جب کچھ لوگوں کو شاہ صاحب نے کھڑے دیکھا تو احرار رضا کاروں سے کہا کہ اپنی ذمہ داری پوری کریں۔ بس پھر کیا تھا پانچ چار منٹ میں سب لوگوں کی بٹانی ہو گئی۔ فاضل رشیدی فرماتے تھے کہ ضرورتی لوگوں کو بھاگنے کا راستہ نہ ملا اور کئی ایک افراد کو موچی دروازے کے ساتھ گندے نالے میں گر پڑنے پر نکالا گیا۔ جن لوگوں کو نکالا گیا ان میں مشہور سیاسی رہنما مولانا عبدالباقی بھی تھے۔ حضرت شاہ صاحب اور رئیس احرار مولانا حبیب الرحمان رحمہ اللہ کی وجہ سے احرار رضا کاروں کی ایسی تربیت اور انتظام تھا کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ۱۹۴۰ء سے پہلے جناح صاحب کی ایک تقریر ان کی درخواست پر احرار رضا کاروں نے اپنی حفاظت میں کرائی جبکہ سر فضل حسین وغیرہ جیلے میں گڑبڑ کرنا چاہتے تھے۔ اسی تنظیم اور مقبولیت کی وجہ تھی کہ سر فضل حسین نے مسجد شہید گنج کا ملبہ احرار پر گرایا۔

حضرت شاہ صاحب مشکل سے مشکل مسئلہ کو عام دیہاتیوں کو، پڑھے لکھے لوگوں کو اس طرح سمجھا دیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ ایک دفعہ معراج پر تقریر کر رہے تھے کہ لکھ بھر میں سب کچھ کیسے ہو گیا۔ مختلف توجہات و تشریحات کرتے رہے کہ حضور ﷺ کائنات کی روح تھے جب اس روح نے مرکز کی جانب سفر شروع کیا تو ہر چیز اپنی جگہ رگ لگی، قسم لگئی۔۔۔ پھر دیکھا کہ کچھ ان پڑھ دیہاتی لوگ سمجھ نہیں رہے تو فرمایا:

ترے لونگ داپٹا نکال دے ہل ڈک لئے

(محبوبہ کے لونگ کی چمک پڑی تو ہل چلانے والوں کے ہاتھ ہل چلانے سے رک گئے) اور مسئلہ نظری کی بجائے ہدیہی بن گیا اور روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا۔ کوئی تو بات تھی کہ آغا شورش مرحوم جیسا خطیب اکثر دورانِ تقریر رندھی ہوئی آواز میں آپ کا ذکر کرتا تھا آغا مرحوم لاہور موچی دروازہ ہی میں ایک بہت بڑی اہل حدیث کانفرنس جو خاص پس منظر میں منعقد ہوئی تھی تقریر کر رہے تھے کہ شاہ جی یاد آگئے بے اختیار پنجابی میں کہا کہ عطا اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کہتے یاد آگئیں آج تری بڑی لڑوسی۔ ترا ایک کالا کوا آج موچی دروازے میں کائیں کائیں کر رہا ہے۔۔۔ کیا یہ کچھ کم خراج عقیدت ہے آخر میں آپ کی ذہانت اور حاضر جوابی کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں روزنامہ "جنگ" راولپنڈی میں ایک عالم حافظ ریاض اصرافی مرحوم کام کیا کرتے تھے۔ میں ان کی زندگی میں جب بھی پنڈی جاتا تو ان سے ضرور ملتا۔ بہت بڑے عالم خطیب تھے میرا خیال ہے کہ اگر وہ خطاب کو ہمہ وقت اختیار کرتے تو شاید حضرت شاہ صاحب کی خطابت کا کچھ اندازہ ہو سکتا۔ انہوں نے ایک دفعہ کہا کہ میں ایک دفعہ غلام احمد پرویز کی تقریر سُننے گیا۔ پرویز صاحب نے بڑا رو کر تقریر کی، میں بہت متاثر ہوا اور حضرت شاہ صاحب سے ذکر کیا تو حضرت شاہ

صاحب نے فوراً فرمایا:

"ہاں حافظا صرف رون تو متاثر ہو گیاں اور پھر لہن داودی میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی و جا ذابہام عشاء۔ بیسکوں۔ یوسف کے بھائی اس کو کنویں میں گرا کر رات کو روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس آئے۔"

حافظ صاحب کہتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کا یہ آیت پڑھنا تھا کہ میرا دل آئینے کی طرح صاف ہو گیا، اور پرویز کی باتوں کا ذرا بھی اثر نہ رہا۔

پکار وادی خاموش سے خدا کے لئے  
تس گئے ہیں تری آواز دل کشا کے لئے

حضرت شاہ صاحب جیسا عاشق رسول ﷺ میں نے کیا کسی نے بھی نہیں دیکھا ہو گا۔۔۔۔۔ من بچکا ہے۔ جسم کی توانائی ختم ہو چکی ہے زبان ساتھ نہیں دیتی پھر بھی راولپنڈی مولانا غلام اللہ خاں رحمہ اللہ کے جلسہ میں ختم نبوت کے موضوع پر تقریر کی یہ تقریر بوجہ صنائع ہو گئی یا کر دی گئی القہر اس کا ساتھ آٹھ منٹ کا حصہ باقی محفوظ رہ گیا ہے اکثر لوگوں کے پاس ہے۔ میں نے برطانیہ لے جا کر اس کو تصویراً صاف کرایا لیکن پھر بھی ضعف زبان کی وجہ سے بمثل سمجھ آتی ہے اور وہ جتنی بھی ہے بوڑھے شیر کی ایسی لٹکار ہے کہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخصیت جب صحت مند ہوگی تو کیا قیامت ہوگی۔ ختم نبوت کا مسند گو ۱۹۷۴ء میں حل ہو گیا لیکن اس کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے میں امیرِ شریعت رحمہ اللہ کا سب سے زیادہ کردار ہے۔ آپ نے عوام و خواص میں مرزائیت کو گالی بنا دیا۔ آخری عمر میں آپ کو سوائے ختم نبوت کے کچھ کام نہیں تھا کچھ یاد نہ تھا حتیٰ کہ آپ نے انتہائی ضعف کی حالت میں چار پائی پر لیٹے لیٹے اس مشن کی خاطر تقریریں کیں اور کون کہتا ہے کہ سید بخاری رحمہ اللہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ انہی کی لگائی ہوئی آگ تھی کہ جس میں انگریز کا یہ خود کاشتہ پودا خشک ہو کر جل گیا۔ آپ کے دو مشن تھے ہندوستان کی آزادی اور مرزائیت کا خاتمہ الحمد للہ ایک آپ کی زندگی میں پورا ہو گیا اور دوسرے کے متعلق فرمایا کہ میں نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں شام بم رکھ دیا ہے جو اپنے وقت پر پھٹا، اور اس نے مرزائیت کے قلعہ میں شگاف کر دیے۔

مجھے بار بار یہ خیال آیا کہ اگر سید بخاری رحمہ اللہ مکہ معظمہ حاضر ہوتا اور کعبہ کو دیکھتا تو اس کی کیا کیفیت ہوتی اور اس کے بعد مدینۃ الرسول ﷺ پر وضعِ اطہر پر حاضری ہوتی تو اس سید زادے کی کیفیت دیدنی ہوتی۔ آپ حسان بن ثابتؓ کے قطع کو وہاں جا کر پڑھے اور درود و سلام کا ہدیہ پیش کرتے تو درود یوار وجد میر، آجاتے اور شاید یہ سید وہیں اپنی جان اپنے نانا ﷺ پر پھراور کرتا لیکن آپ کے پاس پوری زندگی میں کبھی اتنی رقم نہیں آئی کہ آپ پر زکوٰۃ فرض ہوتی، حج کا سفر تو دور کی بات ہے۔۔۔۔۔ یاد آیا، ابھی اگلے روز میں جناب احمد ندیم کاسمی کے ہاں گیا تو وہاں مولانا گرامی رحمہ اللہ کا دیوان رکھا تھا۔ میں نے اُسے دیکھنا شروع کیا کہ معاً شاہ جی رحمہ اللہ کی شان میں کبھی گئی رہا می سامنے آگئیں۔ دیکھئے کتنی بر محل ہے۔

شیخِ اکمل آل بخاری مردِ راہ      حضرت سید عطاء اللہ شاہ  
 مینود آل نازشِ فخرم کہ چید      میوہٴ مُحبِ حضور از شاخِ آہ!

میں نے آپ کی آخری زیارت مولانا محمد اکرم کی کوٹھی (ماڈل ٹاؤن لاہور) پر کی اس دن آپ کے استاد حضرت مفتی محمد حسن رحمہ اللہ کی کراچی میں وفات ہوئی تھی شیخِ حام الدین نے آپ کو یہ خبر سنائی اور اس کو سُن کر آپ بچوں کی طرح ہلکے ہلکے گئے لیکن آواز نہیں نکلتی تھی۔ آپ کا جسم ایسا کسرتی اور اعصاب اتنے مضبوط تھے کہ شاید وہاں لیکن حساس بہت تھے اور پھر اپنے جسم و جان سے اتنا کام لیا کہ اس کو دیکھ کر شیروں کا پٹا پانی ہو جائے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اگر آپ اپنے جسم سے اتنا کام نہ لیتے تو آپ کے اعصاب اتنے مضبوط تھے کہ سو سال سے زیادہ تک جیتے۔ لیکن بات تو وہی ہے جو آپ سے مولانا آزاد نے کہی۔ شاہ صاحب نے مولانا سے کہا کہ خدا کرے کہ میری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔ اللہ آپ کو عمرِ خضر عطا فرمائے۔ مولانا نے فرمایا "نہیں میرے بھائی! تمور مٹی ہو مگر قرینے کی۔" سو آپ نے اپنی زندگی ایک مشن میں بتادی۔ ۲۱- اگست ۱۹۶۱ء کو ملتان میں آپ کی وفات ہوئی۔

ایرسن کلچ کی گراؤنڈ نے ایسا کثیر اجتماع کسی جنازے میں کا ہے کہ دیکھا ہوگا۔ اگر آپ کا جنازہ لاہور ہوتا تو اگلے پچھلے سارے ریکارڈ ٹوٹ جاتے۔ گوجرانوالہ، سیالکوٹ، فیصل آباد، شیخوپورہ اور لاہور سے اتنے لوگ اکٹھے ہوتے کہ دنیا دیکھتی۔

نہ تحت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے      جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے  
 رات کو ملتان قاسم باغ میں جلسہ ہوا۔ تمام احرار اکابر نے ہتھار کیں اور مولانا مظہر علی اظہر نے رندھی ہوئی آواز میں کہا کہ "امیرِ شریعت رحمہ اللہ نے اس دنیا سے جاتے ہوئے ہم سب کو ایک دفعہ پھر اکٹھے کر دیا ہے یہ ان کا بعد از مرگ کرامت ہے۔"

جلسہ احرار اسلام کے قائدین اور عوام سبھی مخلص تھے دو ایک جو جدا بھی ہوئے تو انہوں نے مجلس یا باقی حضرات کے متعلق کئی ایسی بات نہیں کہی جو دیانتِ امانت اور اخلاص یا نظریہ پر حملہ ہو۔ چنانچہ میں برابر احترام رہا۔۔۔ ایسے ہی دُور بین کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے:

وہی ہے بندہٴ حرج جس کی ضرب ہے کاری      نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری  
 ازل سے فطرتِ احرار میں بدوش بدوش      قلندری و قباپوشی و کلداری  
 زمانہ لے کے جیسے آفتاب کرتا ہے      انہیں کی خال میں پوشیدہ ہے وہ چٹکاری  
 وجود انہیں کا طوافِ بتاں سے ہے آزار      یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری

## تیرے قدموں میں رہا تاج فرنگی کا وقار

تیری آواز سے ہے زلزلہ کھماروں میں تیری آواز سے ہے حشر جہانداروں میں  
 تو نے آباد کئے سینکڑوں ایماں کے دیار تیرے قدموں میں رہا تاج فرنگی کا وقار  
 تو نے دیکھا تو زمانے کی نگاہیں بدلیں اک قدم تیرا اٹھا، کفر نے راہیں بدلیں  
 تیرا انداز خطابت ہے پیسبر کا سنگھار تجھ سے وابستہ رہا ختم نبوت کا وقار  
 تیری اک ضرب سے زنجیر کھن ٹوٹ گئی عہد آفرنگ کی ہر شاخ چمن ٹوٹ گئی  
 شاہ گفتار ہے تو صاحبِ کردار ہے تو وقت اک قافلہ ہے، قافلہ سالار ہے تو  
 جب بھی نکلایا کبھی کفر کے ایوانوں سے ہاتھ الجھے ترے شاہوں کے گربانوں سے  
 تیری تقریر سے تقدیر بدل جاتی تھی آئینہ لاکھ ہو تصویر بدل جاتی تھی  
 پھر سے منصور کا انداز سن پائیں گے تیرے نغمات کبھی دار و رسن گائیں گے  
 گرچہ فرعون رہے تیرے خریداروں میں تو خریدا نہ گیا مصر کے بازاروں میں  
 تجھ سے تاریخ کے عنوان بدل جائیں گے تو نہ ہو گا تو مسلمان نکل جائیں گے

وقت دہرائے گا اس دور کے افسانے کو

عقل خود چاہے گی جانہاز سے دیوانے کمر



## شاہ جی کی زندہ تحریک

ہر خاندان یا جماعت کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ برصغیر کی سیاسی جماعتوں میں مجلس احرار اسلام ایسے سرفروشن کی جماعت تھی کہ جو ہر وقت جان بستی پر اور کفن، کندھے پر لیے پھرتے تھے۔ "احرار" نام کا پوری جماعت میں اثر تھا کہ حریت و جرأت چھوٹے سے چھوٹے رصا کار کی گٹھی میں پڑی تھی اور خوف نام کا چیز ان کی چمڑی میں نہ تھی اور نہ ہے۔ یہ لوگ اس لکڑی کی طرح ہیں جو ٹوٹ تو سکتی ہے لیکن لچک نہیں کھا سکتی۔ اور یہ سب کچھ زعمائے احرار، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، منکر احرار چوہدری افضل حق اور دوسرے احرار رہنماؤں کی تربیت کا اثر تھا کہ اب بھی کہیں اگر کوئی پرانا احراری مل جائے تو اس کی باتیں اور حالات پر بغیر کسی خوف اور لومۃ لاتم کے رواں دواں تبصرہ سن کر محسوس کر سکتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں جب ان کی یہ حالت ہے تو اس وقت جب جماعت ہاقاعدہ پنجاب میں انگریز کے خلاف اپنا کردار ادا کر رہی تھی اس وقت کیا ہوگی۔ اپنے وقت کے شیخ اور مجلس احرار اسلام اور تحریک تحفظ ختم نبوت کے مرئی و سرپرست حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ کی مجلس میں کسی شخص نے کسی احرار رہنما کے متعلق کچھ نامناسب الفاظ کہے تو حضرت رحمۃ اللہ جو ش میں آگئے اور فرمایا کہ خبردار کوئی ان لوگوں کے متعلق میری مجلس میں اس طرح کی کبھی بات نہ کرے اور فرمایا کہ تم لوگوں میں کوئی ان سا جانہاز بھی ہے۔

ہمارے ایک دوست ازراہ کفن کما کرتے تھے کہ کسی عام احرار مقرر کی تقریر سنو تو اس کا انداز یہ ہوتا تھا کہ گرجدار آواز میں خطاب کرتے ہوئے سمجھتا کہ چرچل تو بھی سُنے، ہٹلر تو بھی سُنے، مولینی تو بھی سُنے اور جاپان..... تو بھی سُنے گویا وہ ان لوگوں کو ایسا خطاب کرتے کہ وہ اُن کے برابر کے حریف اور مقابل ہیں۔۔۔۔۔ یہ تو ایک لطیفہ تھا واقعہ یہ ہے کہ مجلس احرار اسلام جب شہاب پر تھی تو ان کی تقریروں کی بازگشت برطانیہ کے ایوان پارلیمنٹ میں سُنی جاتی تھی مسجد شہید گنج کے واقعہ کے لگ بھگ مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ نے دہلی دروازے کے باہر برطانوی ایسپائر (سلطنت) کے متعلق اتنی زور دار تقریر کی کہ پنجاب کی حکومت کے درو دیوار بل گئے سر فضل حسین کی سی آئی ڈی ہی بہت مضبوط تھی اور اس کو بل پل کی خبر ملتی تھی سر فضل حسین نے کہا کہ مولوی حبیب الرحمان لدھیانویؒ نے یہ تقریر کی ہے اور اس سے پہلے احرار کے دفتر میں کھانے کے لیے کچھ نہ تاجند آنے کے بے بنے چنے کھا کر احرار لیڈر طے میں گئے اور ایسی آسپاہر تقریر کی اگر خدا نخواستہ ان کو کچھ سرا یا اقتدار فراہم ہو جائے تو معلوم کیا حال ہو۔

مام لوگوں میں ہی مشہور ہے کہ سید اگر آگ میں چھلانگ لگا دے تو اس کو آگ نہیں جلائی، لفظاً یا ذابراً یہ ہر سید کے لیے صیح ہو یا نہ ہو لیکن امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ واقعاً ساری عمر آگ میں گھرے رہے لیکن ان کے حوصلے میں کبھی ہوتی نہ ہست نے ساتھ چھوڑا۔ شاہ صاحب جلال و جمال کا مجموعہ تھے ان کا جمال رصا کاروں کو ان کے گرد پروانوں کی طرح اکٹھا رکھتا تھا اور ان کا جلال دشمنوں کے لیے خصوصاً برطانوی استعمار اور اس کے عکاشوں کے لیے تیغِ بڑاں تھا جس کی کاٹ کا کوئی جواب نہ تھا۔ فرمایا کرتے کہ میری عمر جیل یا ریل میں گزرتی گئی ہی مجھ سے ایک شخص پوچھ رہا تھا کہ قلندر کے کھتے ہیں اور ساتھ کہا کہ لوگ کھتے ہیں اس زمانہ کا قلندر اقبال تھا۔ میں نے کہا اقبال کو تو نہیں دیکھا لیکن شاہ صاحب کو قریب سے دیکھا ہے سنا ہے پڑھا ہے جانتا ہے آپ کو جس طرح اور جس سمت سے دیکھیں محسوس ہوتا تھا کہ قلندر ایسے ہوتے ہیں وہ قلندر کہ جس کے متغیٰ کسی نے کہا ہے:

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

علامہ اقبال مرحوم بھی آپ کی بے حد قدر کیا کرتے تھے، اور آپ اقبال کے مداح تھے لیکن یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ جو لوگ کبھی دو ہار دفعہ اقبال کے پاس گئے انھوں نے خود بتواتر اور دوسروں نے بھی یہ کھنا شروع کر دیا کہ فلاں شخص اقبال کے بہت قریب تھا۔ تاریخ کو سخ اور معرفت کرنے کے باوجود سہائی کی روشنی تاریکی کی دبیز تنوں کو سہاڑتی ہوئی نمودار ہو جاتی ہے پھر اقبال جناب جسٹس ریشا رڈ جاوید اقبال نے تین جلدوں پر اقبال کی زندگی پر ایک کتاب بنام "زندہ رود" لکھی ہے۔ حق یہ ہے کہ اس میں خاصے متغیٰ آگئے ہیں کہ جن کی روشنی میں بہت کچھ دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ علامہ اقبال ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں پنجاب اسمبلی میں بطور امیدوار کھڑے ہوئے ان انتخابات کے متعلق جاوید اقبال صاحب لکھتے ہیں:

"جلسوں کا سلسلہ اکتوبر ۱۹۳۶ء سے شروع ہوا ان جلسوں میں مولانا غلام ہر شاہ اور ملک لعل دین حیدر کے علاوہ جو معروف شخصیتیں تقریریں کیا کرتی یا نظمیں پڑھتی تھیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں مولانا محمد بخش مسلم، حفیظ ہالند حری، ڈاکٹر سیف الدین کھلو، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر۔ بڑے بڑے جلسوں میں ٹکٹے جن میں اقبال شامل ہوتے۔" (زندہ رود جلد ۳ صفحہ ۳۰۰)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر کے ۱۹۳۶ء میں اقبال سے گھرے تعلقات تھے جسے تو جاوید اقبال صاحب نے ان کا معروف شخصیتیں کہہ کر ذکر کیا ہے۔ اور پھر سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور علامہ اقبال دونوں شخصیتیں ایسی تھیں کہ سہما بھی نہیں جاسکتا کہ دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق نہ ہو اور پھر جب اقبال خود بیٹھ کر بخاری کی تقریر سنتا ہوگا تو اس کا کیا احساس ہوتا ہوگا

اس امر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بخاری کی عمر ان دنوں ۳۶، ۳۵ سال ہو گئی اور اقبال کی ۵۰ سال۔  
 اب تصوراً سال دو سہری طرف کا بھی سُن لیجیے، کہ جو لوگ آج اقبال کے ہمارے بننے کے دعویدار ہیں وہ اقبال  
 کی زندگی میں اقبال پر کلمہ کے لئے لکھے رہے اس کتاب کے صفحہ نمبر ۳۰۳ پر جاوید اقبال رقم طراز ہیں:  
 ”تک محمد دہلی کی ناگہانی کاذا کہتے ہیں، ”لے لے لے لے“ نے لادائی فٹ لکھا کہ جی مسلمانوں نے ملک  
 محمد دین کے حق میں اپنے دوٹ ڈالے ان میں دو ہزار تو ناخاندہ ارائیں تھے جو اقبال کی ملی قابلیت  
 سے ناواقف تھے باقی چار پانچ سو پر چیاں غالباً ان حضرات نے ڈالیں جنہیں ”بریلوی حنفیت“ کا  
 بیعت تھا اور جو ایک مثالِ متصل مقامی اخبار اور حزب الاحناف کے اسلام فروشانہ پروپیگنڈے سے متاثر ہو  
 گئے۔“

اب علامہ اقبال کے متعلق پورا اثر-مجر پڑھ جائیے آپ کو سوائے اس حوالے کے یا جہاں سے یہ لیا گیا ہے  
 اس کے سوا کہیں سے یہ پتہ نہیں چل سکے گا کہ بخاری و اقبال کے کیا تعلقات تھے آغا شورش کاشمیری نے ”چٹان“  
 کے مختلف شماروں میں ضرور روشنی ڈالی ہے کہ بخاری و اقبال کی اکثر ملاقاتیں ہوتیں۔ بخاری، اقبال کے پاس جاتے  
 تو بخاری ”یا مرشد“ محمد کو اپنی آمد کا اعلان کرتے اقبال کہتے ”آج بھی پیرا بہت دنوں بعد آیاں ایں۔۔۔۔۔“ اس کے  
 بعد اقبال حق بٹھا دیتے۔ سیدھے ہو کر بیٹھ کر کھلی کرتے رکوع سنتے پھر بخاری سے اپنا کلام سنتے لیکن اس کے متعلق یہ  
 محمد دیا جانے لگا کہ یہ تو احرار کے سالاروں میں سے تھے لیکن یہ بھول جائیں گے کہ ”یوم اقبال“ کو سچ دمج سے منانے  
 کی جو طرح آغا شورش کاشمیری نے ڈالی اور تا مگر جس آن بان شان اور کزوف کے ساتھ وہ مرکزی مجلس اقبال کے  
 سیکرٹری جنرل رہے اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی کہ بخاری کے ایک والد و شیدائے ”یوم اقبال“ کو ہر  
 سال منانے کو انتہائیک پہنچا دیا اور یہ تقریب لاہور میں اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے علاوہ کئی اور تقریبیں یہ وہ رونق  
 اور وافقی نہیں ہوتی جو ”یوم اقبال“ میں ہوتی ہے اور آغا صاحب نے آمریت کے ادوار میں بھی حریت کی روح کو  
 زندہ رکھنے کے لیے اس شیخ سے کام لیا۔ مجھے یاد ہے کہ محمد ایوب خاں کے مارشل لاہ کے اوائل میں ”یوم اقبال“  
 جناح ہال میں منایا گیا۔ اس کے مقررین میں جسٹس کیانی اور چودھری محمد علی بھی تھے کیانی نے تو اپنے طنز و مزاح  
 کے انداز میں مارشل لاہ کی مخالفت کی کہ پہلے لوگ سبز باغ دکھاتے تھے آج کل کالا باغ دکھاتے ہیں لیکن چودھری محمد  
 علی مرحوم نے بڑے جذبے اور جرأت سے گفتگو کی اس پر آغا شورش کاشمیری نے چودھری صاحب کو اپنے  
 مخصوص انداز اور مترادف الفاظ میں جو خراجِ تحسین پیش کیا اور خود جس قلندر کی کا مظاہرہ کیا وہ آغا صاحب کی بے  
 مثال جرأت اور شہادت کی حیران کن مثال تھی کہ اس پر سہری عدالت قائم کر کے کوڑے بھی لگائے جاسکتے تھے اور  
 انہماقِ محنت دار بھی ہو سکتا تھا۔ اس پر شیخ پریشیٹے ہوئے مارشل لاہ ایڈمنسٹریٹر جنرل، ہتھیار صاحب ہار ہار ہلہ بولتے  
 تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس جلسہ میں چیف جسٹس کیانی (غالباً) مہمان خصوصی یا صدر تھے ورنہ شاید دورانِ اجلاس

ہی گرفتاری عمل میں آجاتی تو یہ احراری کردار تاجو آغا صاحب کو "احرار" سے ملتا۔ اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ شورش جیسے نڈر اور بے ہاک شخص کی جگہ "احرار" ہی میں ہو سکتی تھی۔

ہات اقبال و قاری کی بورہی تھی کہ ان کے تعلقات کا ثبوت ۱۹۲۶ء میں تو دستاویزی ہے اور اس سے پہلے یہ مراسم کب قائم ہوئے اس کا اقبالیات کے ماہرین ہی بتا سکتے تھے لیکن وہ اس معاملے میں مہربلب رہتے ہیں کہ کسی طرح یہ پتہ نہ چل جائے کہ مجلس احرار اسلام کے برصغیر کے ان چوٹی کے لیڈروں سے کیسے تعلقات تھے جو بعد میں سیاسی حالات و نظریات کی بناء پر ایک دوسرے سے دور ہو گئے اور قیام پاکستان کے بعد جدید معتقین اور مورخین نے تو کمال ہی کر دیا کہ ایک گئے بندھے منصوبے کے تحت آزادی پسند جماعتوں کو عوام سے روپوش کرنے کا بطور خاص اہتمام کیا گیا لیکن قدرت کا اپنا انتظام ہے اللہ تعالیٰ نے مجلس احرار اسلام کے ایک شاعر جاناہز سے "کاروانی احرار" کی آٹھ جلدیں تحریر کروائیں کہ جس میں برصغیر کی گذشتہ تمام تحریکوں کا حال پڑھا جاسکتا ہے۔ اور اسی جاناہز نے کتاب "تحریک مسجد شہید گنج" لکھ کر تحریک شہید گنج کا پورا لمبہ کھدوایا کہ وہ اس کے عینی گواہ تھے۔ اور ایسے ہی ایک مسما، محترمہ روزنہ پروین صاحبہ سے "جمعیت علماء ہند کے خطبات مدون کروا کر حکومت کے ایک ادارے سے شائع کروادیے۔ اور اسی طرح جناب ایچ بی خاں صاحب نے "برصغیر پاک و ہند میں علماء کا کردار" نامی کتاب لکھی جو "قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت" اسلام آباد نے شائع کی۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مجلس احرار اسلام کے متعلق ایک احتیاس کار نہیں کرام کے سامنے پیش کیا جائے:

### مجلس احرار اسلام اور کشمیری مسلمانان

"مجلس احرار اسلام ۱۹۲۹ء میں قائم ہوئی تھی جمعیت احرار کی تاسیس اور تشکیل میں، جن لوگوں نے حصہ لیا وہ زیادہ تر علماء تھے۔ الایہ کہ بقول چودھری ظلیق الزمان، چودھری افضل حق ایک سچے پوہیں لازم تھے۔ مگر بہت ہی دیانت دار اور بڑی مسجد بوجہ کے حامل تھے، اور ثانیاً غازی عبدالرحمان بھی علماء میں سے نہ تھے۔ باقی تمام موسسین حضرات میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالقادر قصوری، وغیرہ طبقہ علماء میں سے تھے۔<sup>(۱)</sup> ان کے علاوہ بعد میں جو لوگ اس جماعت میں شریک ہوئے یا اس جماعت سے متعلق تھے ان میں زیادہ تر علماء ہی تھے۔ مثلاً مولانا غلام غوث ہزاروی، اس جماعت کے شرکاء میں جو لوگ طبقہ علماء میں سے نہ تھے، ان کا عمل و کردار بھی صلح اور متدین تھا۔"<sup>(۲)</sup>

"اسی جذبہ مساوات و اخوت نے، احرار اسلام کو کشمیری مسلمانوں کی حالت زار کی طرف متوجہ کیا، جو

۱۔ مسلمانوں کا روشنی مستقبل ص ۵۴۶ پیام شرق "۱۳-۱۴ اگست ۱۹۵۳ء ص ۲۸ (اداریہ) Path Way to Pakistan

۲۔ تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص ۳۹۶-۳۹۷ "خطبات احرار" ص ۵۵-۵۷ مسلمانوں کا روشنی مستقبل صفحہ ۵۷



کشمیر میں اکثریتی فرقہ ہونے کے باوجود خستہ حالی اور پریشانی میں عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انھیں اس مصیبت سے نہات دلانے کے لیے اکتوبر ۱۹۳۱ء میں احرار اسلام نے ڈوگرہ راج کے مظالم کے خلاف ایک تحریک شروع کی، اور کشمیر میں داخل ہو کر مسلمانانِ کشمیر کے حقوق بحال کرانے کے لیے سول نافرمانی کی، اور اپنے ہزاروں رضاکار جیل میں پہنچا دیے،<sup>(۱)</sup> مجلس احرار اسلام کے روح رواں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو بھی اس تحریک میں زیرِ دلفہ ۱۲۴ الف ایک سال کی قید و بند برداشت کرنی پڑی۔<sup>(۲)</sup> حسبِ بیانِ سابق اس جماعت کا قیام ۱۹۳۹ء میں ہوا تھا۔ مگر اس میں تحریکِ علماء و دیگر حضرات ملکی سیاست میں تحریکِ خلافت اور جمعیتِ علماء ہند کی تشکیل کے وقت ہی سے عملی حصہ لے رہے تھے اور اس نے اپنی تشکیل کے بعد بھی اپنا سیاسی مسلک، جمعیتِ علماء ہند دہلی کی مطابقت میں ہی رکھا۔ نیز ملک کے سیاسی مفاد اور مسلمانانِ ہند کے سیاسی اور مذہبی حقوق کے پیش نظر کانگریس کے ساتھ بھی تعاون کیا۔ لہذا کانگریس کے متعصب اور مہاسجائی ذہنیتوں کے حامل افراد پر تنقید بھی کرتے رہے، اور اپنے دینِ متین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بھی شعبہ تبلیغ بھی قائم کیا۔ جماعت احرار اسلام نے بیک وقت مندرجہ ذیل امور انجام دیے یعنی سیاست ملکی، خدمتِ خلق، رضاکاروں کی تنظیم، ردِ مرزائیت، مدحِ صحابہؓ اور مسجدِ شہید گنج کی بحالی وغیرہ، احرار اسلام نے مندرجہ بالا امور میں حتیٰ المقدور کوشش کی نیز اپنی مالی و اقتصادی مشکلات کے باوجود جماعت کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے برابر کوشاں رہی۔<sup>(۳)</sup>

آپ نے مندرجہ بالا کتاب کا اقتباس پڑھا اس کے علاوہ بھی اس کتاب میں بہت کچھ ہے اور وہ اسی کے نامِ بنی سے ظاہر ہے جبکہ شروع میں صفحہ نمبر ۵، ۶ پر یہ درج ہے:

علماء کے طبقے یا علماء کی اقسام:

عام طور پر علماء کی دو قسمیں ہیں یعنی علماء حق، اور علماء سوء۔ علماء حق کا سب سے پہلا اور اہم کام نہیں عی السنکر۔ یعنی بھلائی پھیلانا اور بُرائی سے روکنا ہے مگر علماء سوء جائز و ناجائز کا خیال کیے بغیر اپنی الوقتی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں یوں تو احادیث کی کتابوں میں علماء حق کے متعلق بہت سے اقوال اور احادیث موجود ہیں جن میں سے ایک معروف حدیث یہ ہے کہ العلماء ودتہ الاتیباء۔ یعنی علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں اس ضمن کی ایک دوسری حدیث یہ ہے افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائز۔ (یعنی سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جابر ظالم سلطان (حکمران) کے سامنے بلا جھجک حق بات

۱۔ پیام مشرق ۱۳، اگست ۱۹۵۳ء، صفحہ ۲۸، مسلمانوں کا روشنی مستقبل صفحہ ۵۳

۲۔ خطبات احرار صفحہ ۷۲

۳۔ بین برے مسلمان صفحہ ۵۶

کمر دی جاتے۔"

اور پھر اس ۳۰۸ صفحات ۲۰+۳۰+۸ سائز کے صفحات میں اس کی تفصیل ہے اختصاراً قطب الدین ایبک سے لے کر انتش کا ذکر کرتے ہوئے عہد مغلیہ کے دور کو لیتے ہوئے ۱۹۳۰ تک برصغیر میں علماء کے کردار کو بیان کیا گیا ہے۔

کچھ کڑوا ہوتا ہے۔ برا لگتا ہے کچھ کہنے والوں کو دارور سن سے گزرنا پڑتا ہے اور انقلابِ زمانہ سے بعض دور ایسے بھی آتے ہیں کہ اس کو چھپایا جاتا ہے لیکن حق اور سچ چھپنے کے لیے نہیں آتا وہ ظاہر ہو کر رہتا ہے اور اس کی روشنی سے تاریک راہوں میں تریکیں اپنی مثل کے لیے تیل حاصل کرتی ہیں۔ آج کل نہ چاہتے ہوئے بھی اخبارات میں سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، تحریک ریشی رومال، ابوالکلام آزاد، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، کانام بار بار آتا ہے۔ اکبر اور جہانگیر کے مرزا و جھٹھے سیر و قہر گاہ بنے ہوئے ہیں لیکن مجدد الف ثانی کا مرزا زیارت گاہ خاص و عام ہے گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے

احرار اسی قبیلہ سے تھے جیسے جیسے زمانہ گزرے گا ان کی یاد زیادہ آئے گی، تذکرہ نکھر کر سامنے آئے گا۔ اور درِ مرانیت، تحفظ ختم نبوت میں تو اس کے کردار نے اس کو عالم اسلام کی اہم جماعتوں میں شامل کر دیا ہے۔ یہ ایک طبعہ مستقل موضوع ہے جس کا تذکرہ ان شاہ اللہ پھر کسی فرصت میں کیا جائے گا۔



فرمایا:

مسلم لیگ والو! تم ہندوستان کے مسلمانوں کا حل پاکستان بتاتے ہو۔ میرا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ تمہاری مجوزہ تقسیم سے کبھی حل نہیں ہوگا۔ ہاں اس سے دس کروڑ مسلمان تین حصوں میں بٹ جائیں گے۔ جواہر لال کو..... تم، اشوک (۱) کا تخت بچھا کر دے رہے ہو۔ ہندو کو اتنی بڑی سلطنت (۲) اس کے بعد کبھی نہیں ملی۔

(۱) اشوک اعظم (۳۷۳ تا ۳۳۲ ق م): قدیم ہندوستان کا نامور راجہ، ۲۵۵ ق م میں تخت پر بیٹھا۔ ہمالیہ سے مدراں تک اس کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔

(۲) بھارت کا موجودہ رقبہ ۱۲۶۱۵۹۷ مربع میل اور پاکستان کا موجودہ رقبہ ۳۱۰۴۰۳ مربع میل، ہے۔

## دلوں کو چیر گئی اس کی شوخی گفتار

اپنے سلطان کے قیام میں، میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہنس سرہ کی ادبی، علمی، مذہبی اور روحانی صحبتوں سے مستفیض ہوا۔ علم و ادب کے بے شمار گوشے آداب و اخلاق کے کئی پہلو سامنے آئے۔ بزرگان دین علمائے کرام کے علم و فضل، طہارت و تقویٰ، زہد و ورع اور روحانی کمالات کی کئی داستانیں شاہ جی رحمہ اللہ علیہ کی زبانی سنیں۔ قلب و ذہن کو منور کیا۔ ماضی کے نقوش حال کے آئینے میں جلوہ گر ہوتے رہے۔ شاہ جی رحمہ اللہ کی صحبتوں میں گزرے ہوئے لمحات بیتے دنوں کے روشن چرخ تھے۔ جو افقِ ذہن پر قطار اندر قطار روشن ہوتے گئے۔ وہ علمائے کرام اور بزرگان دین کا ذکر انتہائی عقیدت اور ادب سے کرتے گفتگو کرتے وقت شاہ جی رحمہ اللہ کے وجود پر ان بزرگان دین کے فیضان کے اثرات نمایاں ہو جاتے۔ سیاسی رہنماؤں کے قصے ان کی بے لوث خدمت ان کی قربانیاں ان کا بے پناہ اشار سب کچھ شاہ جی رحمہ اللہ سے سنا۔ ایک ایک جملہ کتاب کا درجہ رکھتا تھا مشاہدے کی باتیں تھیں۔ دیکھے ہوئے واقعات تھے۔ سامنے گزری ہوئی داستانیں تھیں۔ اگر ان سب کو تحریر کروں تو الگ ایک کتاب کا موضوع بنتا ہے۔

میری خوش قسمتی ہے کہ زندگی میں روشنیاں زیادہ ہیں۔ اندھیرے کم ہیں روشنی میرے ارد گرد پھیلتی ہے۔ میری رہنمائی کرتی ہے۔ میری ذات کی تاریکی کو روشنی میں بدل دیتی ہے۔ ان صحبتوں سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ان بزرگوں کے قرب سے ان کی گفتگو سے ان کی پاکیزہ زندگی سے ان کے علمی کمالات سے اکتسابِ روحانی کرتا ہے۔ یوں تو ہر بزرگ اپنے دامنِ کرم میں ایسے ایسے گلہائے رنگ رکھتا ہے جس سے قلب مطمئن اور ذہن آسودہ ہو جاتا ہے۔ جو ان کے باطنی کمالات کا حصہ ہوتا ہے۔

بعض مجالس ایسی ہوتی ہیں جن کی یاد سے کتابِ زندگی کے اوراق تابندہ رہتے ہیں۔ یہ مجالس ان علماء، ادباء اور اہل دل حضرات کی ہوتی ہیں جیسا ہر جملہ ادب پارہ، ہر لفظ حکمت کا گوہر اور ہر بات تاریخ ساز ہوتی ہے۔ عام گفتگو ہو یا علمی تبصرہ۔ سیاست کا عنوان ہو یا دینی مسائل پر اظہارِ خیال، شعر و ادب موضوع بحث ہو یا ذاتی واقعات و مشاہدات۔ موضوع چاہے کچھ بھی ہو ان کے ایک ایک جملے سے علم و ادب کے سوتے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ ہر جملہ ان کے علمی تہیہ، شری ذوق، حسن بیان اور دلکش اسلوب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایسی علمی و ادبی مجالس میں شرکتِ ادب عالیہ کی درجنوں کتابیں پڑھنے سے زیادہ سودمند اور نفع بخش ہوتی ہے۔ مجھے زندگی میں جید علماء، ممتاز دانشور، معروف شعراء، مستند رہنما اور روحانی پیشوا کی صحبتوں سے مستفیض ہونے ان سے اکتسابِ علم کرنے کے بیشمار مواقع میسر آئے۔ ادبی انجمنوں، تنقیدی اجلاس اور ہندوستان گیر مشاعروں میں شریک ہو۔ ذکا اعزاز نصیب رہا۔ بزرگوں کی صحبتوں نے میرے ادبی ذوق کو جلا بخشی آداب و اخلاق کے زینے سمجھ میں آئے۔ مجلسِ زندگی کے نئے رخ سامنے آئے مگر جو لطف جو کیفیت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ

اللہ علیہ کی صحبت میں نصیب ہوا وہ سب سے منفرد تھا شاہ جی اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ایک ہیکر میں ہزار رنگ، ایک وجود میں بے شمار صفات ایک شخص متضاد علوم و فنون کا شاہکار تھا۔ اگر سیاست کی بات ہو تو ان کا انداز فکر جداگانہ۔ دین پر اظہار خیال ہو تو انکا طرز بیان سب سے الگ۔ شاعری موضوع گفتگو ہو تو ان کا شعری ذوق سب سے منفرد تھا۔ ان میں انفرادیت بدرجہ اتم موجود تھی وہ ہر مسئلے کو اپنے زلویہ نگاہ سے دیکھتے تھے۔

شعر فہمی وہی ہے۔ ہر ممتاز شاعر اچھا شعر فہم نہیں ہوتا۔ یہ مکہ خدا داد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شاہ جی کو ایسی شعری بصیرت اور کمال ذوق سے نوازا تھا جس میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا خوبصورت شعر سننے ہی اس کی اس حسین انداز سے تشریح فرماتے کہ اہل ادب حضرات ان کی شعر فہمی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتے۔ شاہ جی کے داد دیئے کا انداز سب سے زالا اور مختلف تھا۔ شاعر شاہ جی کی آنکھوں کی سہاوت اور ہونٹوں کی بناوٹ سے شعر کا معیار پرکھ سکتا تھا۔ شعر کے معانی اور محاسن ان کے چہرے پر بکھرتے نظر آتے جیسے پھول کی خوشبو مشامِ جاں کو مہل کر دیتی ہے۔ ایسی حسین داد وہی دے سکتا ہے جو شعر کی روح سے واقف ہو اور اس کی زراکتوں سے کماحقہ آگاہ ہو لطافتِ شعر بے ہنگم داد کی بھی تو محفل نہیں ہو سکتی۔ شاہ جی کی پسند اور ناپسند سند کا درجہ رخصتی تھی شعر فہمی شعر گوئی سے زیادہ مشعل ہے شعر فہمی میں خداوند کریم نے اپنی عطائے خاص سے شاہ جی کو وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔

شعر فہمی کا تعلق ایک خاص وجدانی کیفیت سے ہوتا ہے۔ یہ وجدانی کیفیت ہر شخص کا ورثہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ایک خاص قسم کا ادبی ماحول، روحانی لطافت، پاکیزگی خیال اور حسن مطالعہ درکار ہوتا ہے۔ جب شاہ جی لاہور تشریف لاتے تو ان کی قیام گاہ (دفتر مجلس احرار اسلام) پر لاہور کے ممتاز شعراء حاضری دیتے ان شعراء میں صوفی تبسم، عابد علی عابد، احسان دانش، حفیظ جالندھری، عبد الباقی سالک، پطرس بخاری، ایم ڈی تاثیر جیسے اہل علم ہوتے۔ شاہ جی کی قیام گاہ اچھے خاصے شاعرے میں تبدیل ہو جاتی اور شاہ جی اس ادبی و شعری انجمن کے روح رواں ہوتے۔ ہر شاعر کی خواہش ہوتی کہ شاہ جی کسی شعر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کریں اور وہ اس کے لئے ادبی سند بن جاتے۔

شاہ جی غالب کی شاعری کو سراہتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ "غالب تو جنت ہے اپنے ذوق کو کیا کروں اس سے کم درجے کا شاعر میرے مذاقِ سخن پر پورا ہی نہیں اترتا" شاہ جی کو غالب کے فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ جب کبھی اس گل کدے کا دروازہ کھولتے تو انجمن مہک مہک جاتی۔ گل تازہ کا حسن اور خوشبو دیدہ و دل کو مسرور کر جاتا۔ شاہ جی کے شعر پڑھنے کا انداز کوئی نہ اپنا سکا۔ شاہ جی کو خداوند کریم نے حسن صوت اور کمال آدا سنجی سے نوازا تھا۔ شعر اس انداز سے پڑھتے کہ معانی اپنی تمام آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتے۔ شعر کا حسن رگ و پے میں سرایت کرتا اور ذہن و خیال کو تازگی بخشتا ہوا گزر جاتا۔ شاہ جی کا شعری انتخاب مثالی تھا۔ کوئی شعر معیار سے گرا ہوا لطافتوں سے محروم شاہ جی کی زبان سے نہیں سنا۔ ہر شعر فہمی عروج اور حسن خیال کا شاہکار ہوتا۔

قط بھال پر نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ساحر لدھیانوی نے نظم "بھال" لکھی جو کسی ساتھی نے شاہ جی کو پڑھ کر سنائی شاہ جی روزنامہ "آزاد" کے دفتر لاہور میں مقیم تھے۔ آپ نے نظم سننے ہی فی البدیہہ شعر کہا اتفاقاً چند دنوں بعد ساحر چند دوستوں کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور نظم "بھال" سنائی۔ ساحر کی نظم کے ایک بند کا شعر یہ تھا۔

ملیں اسی لئے ریشم کے طعیر بنتی ہیں  
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں

شاہ جی ساحر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ اس بند کا دوسرا شعر کہاں ہے؟ ساحر نے جواب دیا کہ وہ نہیں ہو سکا۔ اس پر شاہ جی نے اپنا یہ شعر سنایا۔ اور فرمایا۔ ساحر! یہ شعر تمہاری نذر کرتا ہوں۔

چمن کو اس لئے مالی نے خوں سے سینھا تھا  
کہ اس کی اپنی ٹھائیں بہار کو ترسیں

ساحر نے بہ اشتیاق و عقیدت قبول کر کے اسے اپنی نظم کا حصہ بنالیا۔

شاہ جی نے فارسی اور اردو میں شعر کہے۔ جملے جلوبوں سے اتنی فرصت نہ تھی کہ اس فی کو باقاعدہ اپناتے۔ چیدہ چیدہ اشعار کہے جو ان کے ہائین برادر م سید ابوساویہ ابوذر بخاری مدظلہ نے "سواطع الالبام" کے نام سے شائع کر دیئے۔ شاہ جی کا فارسی کا بے پناہ مطالعہ تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں فارسی اشعار اذہر تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا معروف فارسی شاعر ہو جس کے اشعار شاہ جی کو یاد نہ ہوں۔ اگر شاہ جی شاعری کو اپناتے تو اس دور کے عظیم شعراء میں ان کا شمار ہوتا۔ مگر شاہ جی کی مدیم الفرستی نے انہیں اس طرف پوری طرح متوجہ نہ ہونے دیا۔

ایک دفعہ شاہ جی نے فرمایا کہ بھپن پٹنہ عظیم آباد میں گزرا شاد عظیم آبادی جیسا قادر الکلام شاعر محاورے اور روزمرہ کی فصیح کے لئے ہمارے گھرانے کی طرف رجوع کرتا تھا۔ ایسی علی لودی اور دہنی فصائیں شاہ جی کا بھپن گزرا۔ علماء کی صحبت سے مستفیض ہوئے گھریلو تربیت اور دین کے حصول نے اخلاق و آداب کے دروازے کھول دیئے۔

زبان و بیان پر شاہ جی کو قدرت کاملہ تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے جہاں تقریر کی اہل زبان حضرات سے دلو وصول کی۔ لکھتے ہیں جلسہ ہوا دہلی میں اہل زبان حضرات نے میری زبان کو سند مانا میرے کسی جملے یا لفظ پر کبھی اعتراض نہیں کیا" شاہ جی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جہاں بھی تقریر کے لئے تشریف لے جاتے اس علاقے کی زبان بلکہ لب و لہجہ میں تقریر کرتے۔ سامعین تک اپنی بات ان کے لب و لہجہ اور زبان میں پہنچانے سے زیادہ موثر ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے شاہ جی کی تقریر خطاب کا شاہکار تھی۔ میں نے ان کی خطابت کے ہارے میں اشعار کہے تھے۔

زبان ایسی فصاحت بھی جس پہ اترائے  
کلام ایسا سخن جو بھی اس کو رشک آئے

ہر اک سنن میں دل سنگ کو گداز کرے  
وہ جس نے فن خطابت ہزار ناز کرے  
تھی جس کے حسن تملوت میں بارش انوار  
دلوں کو چیر گئی اس کی شوخی گفتار

اسی خطابت اسی فن تقرر میں کمال کی وجہ سے سیاسی رہنماؤں، علماء اور شعلہ بیان مقررین نے انہیں خطیب اعظم کے لقب سے یاد کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور نے شاہ جی سے بڑا خطیب پیدا ہی نہیں کیا۔ ایک روز حفیظ جالندھری سے شاہ جی کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ حفیظ جالندھری نے عجیب و غریب جملہ فرمایا کہ "شاہ جی کی تقریر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی ماندہ معجزات میں سے ایک معجزہ تھی" اس جملے میں سرور کائنات ﷺ کے کرم کی جھلکیاں اور شاہ جی کے تحت کی معراج نظر آتی ہے۔

شاہ جی جس احترام، ذوق و شوق اور حسن تمبید کے ساتھ کلام پاک پڑھتے تھے وہ انہیں کا حصہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آواز میں سوز، اور لہن میں عجیب تاثیر رکھی تھی۔ شاہ جی کی تملوت دلوں میں نور کی قندیلیں جلاتی، روحوں کو بجلی کرتی اور تطہیر قلب و نگاہ کرتی نظر آتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انوار کی بارش ہو رہی ہے۔ دلوں کی تاریکیاں چھٹ رہی ہیں۔ پاکیزگی کی فضا قائم ہو رہی ہے۔ یہ تاثیر یہ انداز یہ کمال شاہ جی کے ذاتی تھدس قرآن مجید سے شائستگی اور احکام خداوندی پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ تھا۔ شاہ جی کی تملوت سے کوئی بھی متاثر ہونے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ خواہ اس کا تعلق کسی مذہب سے ہو۔ دوسرے مذاہب کے لوگ شاہ جی کی تملوت سننے کے لئے جلسہ گاہ میں آتے تھے۔ اس ضمن میں شاہ جی نے ایک واقعہ بیان کیا۔

شاہ جی تہجد کے وقت تملوت کلام پاک میں مصروف تھے۔ ایک بندہ اپنے خدا سے ہم کلام تھا۔ دل کے خلوت کدے کو کلام الہی کے نور سے منور کر رہا تھا۔ اس جیل کا جیلر ہندو تھا۔ شاہ جی کی آواز سن کر ان کے چہرے اکھڑا ہوا۔ شاہ جی کی آواز کے سوز نے اس میں رقت پیدا کر دی آخر اس نے شاہ جی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا شاہ جی تملوت بند کر دیجئے اب رویا بھی نہیں جاتا۔ شاہ جی نے مڑ کر دیکھا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

شاہ جی کی حسن قرأت کے اور بہت سے قصے ہیں ایک واقعہ شاہ جی نے خود بیان کیا۔

دہلی میں ایک عظیم الشان اجتماع تھا۔ اکابرین ملت، زعمائے کرام مقتدر سیاسی رہنما کانگریسی لیڈر اور معروف تحریری وجود تھے۔ مجمع کسی مسئلے پر متفق نہ تھا۔ مخالفت گروہ کی اکثریت تھی وہ کلہاڑیاں اور لٹائیاں لئے جلسہ درہم برہم کرنے کو تیار تھے وہ کسی مقرر کی تقریر سننے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو تک کو انہوں نے تقریر نہ کرنے دی۔ ابوالکلام آزاد نے مجمع کی یہ کیفیت دیکھی تو ان کی نگاہ انتخاب شاہ جی پر پڑی۔ ان کو معلوم تھا کہ شاہ جی عوام کی نفسیات سے واقف ہیں وہ کسی نہ کسی طرح مجمع کو قابو میں کر لیں گے۔ ابوالکلام آزاد نے شاہ جی کو تقریر کرنے کو کہا۔ تعمیل میں شاہ جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاحد نظر لکڑے ہوئے تند و تیز سیلاب کو دیکھا۔ شاہ جی نے تملوت شروع کی جلسہ گاہ میں مکمل خاموشی ہو گئی۔ شاہ جی نے ایک گھنٹہ کلام

پاک کی ملکوت کی مجمع شاہ جی کے حسن قرأت میں اپنا موقف بھول گیا۔ شاہ جی خدا نے بزرگ و برتر کی آخری کتاب کی ملکوت کر رہے تھے لوگوں کے چہروں سے مخالفت کا غبار دھل رہا تھا۔ جذبات کے شططہ مدھم مدھم گئے۔ جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ جلسہ گاہ میں مکمل سکوت تھا۔ ہر شخص شاہ جی کی ملکوت سے مظلوظ ہو رہا تھا۔ شاہ جی نے کلام پاک کی ملکوت اور خطبہ مسنونہ ... کے بعد تقریر کا آغاز کیا۔ شاہ جی کی ملکوت نے دلوں کو نرم کر دیا۔ وہی مجمع جو کچھ دیر پہلے زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے آیا تھا۔ زندہ باد کے نعرے لگاتے لگاتے شاہ جی نے تفصیل کے ساتھ اپنا موقف بیان کیا اور اپنے نظریے کی وضاحت کر کے مخالفت گروہ کو اپنا ہنسوا بنا لیا۔ شاہ جی نے ایسے کئی مہر کے سر کئے جن کی تفصیل کے لئے ضخیم کتاب درکار ہے۔

ایک روز میں نے شاہ جی سے سوال کیا کہ آپ نے فنی تبوید و قرأت کس سے سیکھا۔ شاہ جی اس سوال پر مسکراتے فرمایا۔ یہ بہت عجیب و غریب واقعہ ہے جس کا کسی کو علم نہیں ہمارے بٹنے میں ایک عرب تھے۔ وہ بھوں کو قرأت کا درس دیا کرتے تھے۔ میں ان کی قرأت کو غور سے سنتا اور گھر آکر انکی نقل اتارتا۔ ایک روز میں مسجد کے حجرے میں ان کی نقل اتار رہا تھا وہ عرب قاری (عمر ماسم) باہر غور سے میری ملکوت سنتے رہے۔ جب میں ملکوت کر چکا اندر حجرے میں آئے ان کی اچانک آمد سے میں حواس باختہ ہو گیا۔ انہوں نے آتے ہی سوال کیا تم نے فنی تبوید کس سے سیکھا میں نے حواس مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا کہ میں تو آپ کی نقل اتار رہا تھا۔ اس عرب قاری نے فرمایا "تم ساری الطبع ہو" شاہ جی نے فرمایا بس میرے فنی تبوید میں سماعت ہی کو مدخل ہے۔

شاہ جی کا سب سے بڑا وصف حاضر دماغی اور حاضر جوابی تھا۔ جلسے میں کوئی سوال کیا جائے شاہ جی نہایت سکون اور وضاحت کے ساتھ اس کا برجستہ اور مسکت جواب دیتے تھے۔ سوال کرنے والے کی تسلی ہو جاتی تھی۔ اس کو مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ لاکھوں کے مجمع میں مخالفین نے شاہ جی سے سوال کئے اور شاہ جی کے چند جملوں نے انکی حقنی کر دی۔

شاہ جی کی تقریر سننے اس سے مستفیض ہونے کے لئے علمائے کرام مفسرین، مقررین، سیاسی رہنما، اہل ادب، اہل ذوق حضرات اور عوام الناس سبھی قسم کے لوگ آتے تھے۔ حسن خطابت کا کمال یہ تھا کہ دس دس گھنٹے شاہ جی تقریر کرتے اور مجمع میں سے ایک شخص بھی اٹھ کر نہ جاتا۔ شاہ جی جب چاہتے مجمع کو رلاتے جب چاہتے بندتے۔ گویا لاکھوں اشخاص کی نینوں پر شاہ جی کا ہاتھ تھا۔ وہ عوام کے چہروں سے عنوانات جن کی تقریر جاتے۔ ان کی تقریر ایک ان پڑھ کے لئے اتنی ہی پرکشش تھی جتنی ایک عالم کے لئے۔ ایک مفسر قرآن بھی آیات کریمہ کے ترجمے اور نکات سے مظلوظ ہو رہا ہے اور ایک ادیب اور شاعر بھی شعر کے برجستہ استعمال سے مسحور ہو رہا ہے۔ ہر ایک کا دامن بھرا جا رہا ہے لوگ کیسے دل میں یادوں کے انمول موتی لے کر لوٹتے۔ حاضر جوابی کے سلسلے میں قاضی احسان احمد شجاع آبادی سے ایک پر لطف واقعہ سناؤ۔ وہ غازی خاں میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا شاہ جی کی آمد کی اطلاع ملتے ہی ہزاروں معتقدین شاہ جی کی تقریر سننے کے لئے آئے۔ مصافحات میں سے میلوں پیدل چل کر جلسہ میں شرکت کی غرض سے آئے۔ اس علاقے کے لوگ

بزرگان دین کے مزاروں سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ بعض اوقات یہ عقیدت کا جذبہ شمرک کی حدود کو چھو لیتا ہے۔ یہ عقیدت یہ مزاروں سے قلبی وابستگی ان کو اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی ہے۔

شاہ جی کی تقریر کے آغاز ہی میں کسی نے مزاروں پر حاصری اور مزاروں کے جواز کے بارے میں استفسار کر دیا۔ ان دنوں سعودی عرب میں شاہ سعود مزارات کے قبوں کو مسمار کر رہے تھے۔ قاضی صاحب فرماتے تھے کہ میں حیران تھا کہ شاہ جی اس نازک مرحلے سے کس طرح نکل سکیں گے۔ اگر مزاروں کے خلاف بات کرتے ہیں تو جملہ گاہ میں ایک بھگامہ بپا ہو جائے گا اگر ان کے نظریات کی تائید کرتے ہیں تو عقیدے میں خلل واقع

ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ نہایت کٹھن تھا۔ سوال کرنے والے نے یہ بھی کہہ دیا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی تو مدینہ منورہ میں مزار ہے۔ شاہ جی نے اس نوجوان سے پوچھا کہ کیا واقعی جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار مبارک ہے۔ مجمع اس سوال پر حیران تھا کہ وہی روضہ اطہر تو قلوب کی تسکین کا مرکز، انوار کا سرچشمہ، پناہ عالمیال اور قننہ ظہور کی سیرابی کا نشان ہے۔ شاہ جی نے خطابت کے انداز میں جواب دیا کہ جب میرے آکا کائنات کے آکا کا مزار مقدس موجود ہے تو دوسرے مزار کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ یہ شمرک فی النبوۃ ہے۔ یہ بات کچھ اس انداز سے بیان کی کہ مجمع امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ لوگ اپنا عقیدہ اور مسلک بھول گئے۔

شاہ جی کی تقریر مزاج کو بدل دیتی تھی۔ نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیتی تھی۔ اعتقادات میں انقلاب برپا کر دیتی تھی۔ لوگ شاہ جی کے ہمنوا ہو جاتے تھے۔ یہ زور بیان، یہ حسن خطابت، یہ انداز کلام بہت کم لوگوں پر نصیب ہوتا ہے۔

شاہ جی کی خطابت کا ایک اور معرکہ برادر محترم اعجاز احمد چشتی نے بیان کیا۔ اعجاز احمد چشتی گارڈن کالج راولپنڈی میں زیر تعلیم تھے۔ شاہ جی کی تقریر کا اعلان ہوا چشتی صاحب کے کچھ دوست کمیونسٹ ذہن کے تھے۔ چشتی صاحب نے انہیں تقریر سننے پر آمادہ کر لیا۔ وہ چشتی صاحب کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچے وہ اپنے ذہنوں میں بہت سے سوال لے کر آئے تھے کہ وہ دورانِ تقریر اپنے نظریے کے مطابق شاہ جی سے سیاسی نوعیت کے سوال کریں گے۔ ان کو اپنے مطالعے، اپنے نظریے پر ناز تھا۔ وہ تمام مسائل کا حل کمیونزم سمجھتے تھے۔ لہذا وہ عقائد نے ان کے ذہنوں کو مسخ کر دیا تھا۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ لوگ بے تابی سے شاہ جی کی آمد کے منتظر تھے۔ شاہ جی پنڈال میں داخل ہوئے ہزاروں عقیدت مند گاہیں ان کے استقبال کے لئے اٹھیں شاہ جی زندہ باد کے فلک بھاک نعرے بلند ہوئے شاہ جی نے قرآن پاک کی تلاوت شروع کی مجمع خاموش ہو گیا۔ خطبہ مسنونہ کے بعد شاہ جی نے تقریر کا آغاز کیا۔ وہ کمیونسٹ طلباء، موحیرت بنے ہوئے شاہ جی کی تقریر سن رہے تھے۔ سوالات کا نقشہ ذہن سے مٹا ہو گیا۔ ایک ایک لفظ دل کی گھرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ ایک موج خطابت تھی کہ بہانے لئے جا رہی تھی۔ ایک سوز تھا کہ دل کے خلوت کدے روشن کر رہا تھا۔ خداوند کریم کے آخری پیغام کی تفسیر و تفسیر ہو رہی تھی۔ دلوں کی سیاہی دھل رہی تھی۔ دلوں کا رنگ دور ہو رہا تھا۔ اعجاز احمد چشتی صاحب کا سامان ہے کہ جلسہ گاہ میں سب سے زیادہ رونے والے ہی کمیونسٹ طلباء تھے۔ جو اعتراضات کے کانٹے



نے کر آئے۔ عقیدت و محبت کے پھول لے کر لوٹے۔

شیخ حسام الدین احرار کے سرکردہ لیڈروں میں سے تھے۔ شعر و ادب کے دلدادہ، باوضع و باوقار انسان، تقریر میں گرج، مجلس گفتگو میں لطافت، آزادی کا بے باک و نڈر سپاہی۔ زندگی کی نصف صدی کی داستانوں، واقعات و حادثات، سیاسی کشمکش، قید و بند کے حالات دار و رسن کے قصے، انگریزوں کے مظالم، جدوجہد آزادی کی تفسیر۔ یعنی شیخ صاحب کی ذات تاریخ کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ دوران گفتگو مجلس احرار کے معرکوں، خطابت کے انداز، مقتدر سیاسی شخصیتوں کے کارہائے نمایاں بیان کرتے تو تاریخ کے اوراق کھل جاتے۔

ایک دن دوران گفتگو سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کو امیر شریعت کا لقب ملنے کا واقعہ شیخ حسام الدین رحمہ اللہ کی زبانی سنا۔ شیخ صاحب اس واقعہ کے عینی شاہد تھے۔ آپ نے فرمایا۔

شیر انوالہ گیٹ میں مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہ نے انجمن خدام الدین کا سالانہ جلسہ منعقد کیا۔ جس میں ہندوستان بھر کے پانچ سو علماء جمع تھے۔ ان دنوں قادیانی تحریک زوروں پر تھی۔ حکومت انگریز اس کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ علامہ شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہ جیسے بزرگان دین بھی موجود تھے۔ علامہ محمد انور شاہ صاحب ہدس سرہ العزیز نے فرمایا کہ قادیانی فتنے کے رد کے لئے اس کی نفرو اشاعت کو روکنے کے لئے لوگوں کو بے دینی سے بچانے کے لئے ہمیں ایک امیر منتخب کر لینا چاہیئے تاکہ منظم طریقے سے اس فتنے کا سد باب کیا جاسکے۔ حضرت رحمہ اللہ کی رائے سے تمام علمائے کرام نے اتفاق کیا اور بیک زبان ہو کر کہا کہ آپ ہم سب میں بزرگ، سب سے زیادہ محترم و مکرم ہیں۔ آپ جو فیصلہ فرمائیں گے ہمیں منظور ہوگا۔

علامہ محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے شاہ جی کو طلب کیا شاہ جی لپک کر حاضر ہوئے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں اس کام کے لئے آپکے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں اور امیر شریعت کا لقب عطا فرمایا۔ شاہ جی کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بزرگ جس کی طبیعت، جس کی بزرگی، جس کے تقویٰ کا ہر شخص مستفہد تھا۔ جو تمام علماء کا قدوم تاجس کی دینی خدمات بے مثل تھیں۔ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ ختم نبوت اور ناموس کی خاطر ایک نوجوان عالم دین کے ہاتھ پر بیعت کر رہا تھا۔ حضرت رحمہ اللہ کے بعد پانچ سو کے قریب علمائے دین، مفسرین، محدثین نے رد مرزائیت کے سلسلے میں شاہ جی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر حضرت انور شاہ کاشمیری ہدس سرہ العزیز نے فرمایا کہ "خداوند کریم نے اس عظیم کام کے لئے آپ کو منتخب کر لیا ہے۔ اس کار خیر کی سعادت آپ کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔"

شاہ جی نے اس لقب کی لاج رکھ لی۔ سونگڑوں اجتماعات سے اس مسئلہ پر پرزور تقریریں کیں۔ اس جھوٹے مدعی نبوت کے تار و پود یکمیر کر رکھ دیئے۔ ہزاروں سادہ لوح مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچالیا۔ اس مشن کی تکمیل کے لئے اس دینی خدمت کے لئے ساری زندگی وقف کر دی۔ جوانی سے بڑھاپے تک اس محاذ پر لڑے۔ قید و بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ آخر ان کی سعی جمیل، ان کی عمر بھر کی کاوش بار آور ہوئی اور مرزائیوں کو خارج از اسلام قرار دیا گیا۔ اور حکومت نے مرزائیوں کو اقلیت قرار دے کر اس مسئلہ کو

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

شاہ جی علمائے کرام اور بزرگان دین کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جب کسی بزرگ کا ذکر کرتے تو ادب و احترام کے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر ذکر کرتے۔ شاہ جی احرار کے دفتر لاہور میں تشریف فرما تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ شاعری کا دور ہو رہا تھا۔ شورش کاشمیری نے اپنی گفتگو سے مغل کو زعفران بنا رکھا تھا۔ اچانک کسی نے مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی نور اللہ مرقدہ کی آمد کی اطلاع دی۔ مغل کا رنگ یکسر بدل گیا۔ ہر شخص احترام و عقیدت کا بیکر بن گیا۔ شاہ جی نے آگے بڑھ کر حضرت کا استقبال کیا۔ اور نہایت ادب سے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ حضرت تشریف فرما ہوئے۔ شاہ جی سے فرمایا کہ تشریف رکھئے شاہ جی دو زانو ہو کر نظریں جھکا کر حضرت کی خدمت میں بیٹھ گئے۔ جب تک حضرت احمد علی رحمہ اللہ تشریف فرما رہے شاہ جی اسی انداز سے بیٹھے ادب و احترام سے ان کے ارشادات سنتے رہے۔

اسی طرح شاہ جی کو اپنے مرشد و مرئی حضرت عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ العزیز کی مجلس میں مؤدب بیٹھے دیکھا لاکھوں کے مجمع کو اپنی خطابت سے مسحور کرنے والا، ہر جگہ زبان و بیان کا جادو جگانے والا، خطیب اعظم شعلہ بیان مقرر خاموشی و عقیدت سے سر جھکانے حضرت رحمہ اللہ کی خدمت اقدس میں حاضری دیتا۔ آداب کے تمام تقاضے احترام کے تمام پہلو، نیاز مندی کے تمام رخ سامنے آ جاتے۔ اگر حضرت رحمہ اللہ کوئی بات دریافت فرماتے تو مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔

جالندھر میں خیر المدارس کا جلسہ تقسیم اسناد تھا۔ مدرسے میں جگہ ناکافی ہونے کی وجہ سے جلے کا انتظام کمپنی باغ میں کیا گیا۔ یہ کمپنی باغ شہر میں واقع تھا۔ اور سیر کی بہترین جگہ تھی۔ نماز جمعہ کے بعد جلسہ کی کارروائی کا آغاز ہوا چند علماء نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مدرسے کی دینی خدمت کو سراہا مولانا خیر محمد نور اللہ مرقدہ کی ذات بابرکات کو خراج تمکین ادا کیا۔ سب سے آخر سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا خطاب تھا۔ حد لگا تک لوگوں کا مجمع تھا۔ شاہ جی نے خطبہ مسنونہ شروع کیا ہی تھا کہ کسی نے شہید کی کھپوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ ہزاروں لوگوں کے سروں پر کھپوں نے چکر لگانے شروع کر دیئے۔ شاہ جی نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے پتھروں کی طرح جم کر بیٹھے رہو۔ شاہ جی کے چہرے پر کھپوں نے ڈنگ مارنا شروع کر دیئے شاہ جی نے فرمایا کہ چہرے کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں کبھی نے ڈنگ نہ مارا ہو۔ میں نہایت ضبط سے خطبہ پڑھتا رہا۔ ایک کبھی نے میری آنکھ کے کونے میں ڈنگ مارا۔ مجھے جھرجھری سی آئی۔ مجمع میں سے ایک شخص اٹھا اس نے دونوں ہاتھوں سے کھپوں کو چہرے سے اتارا چہرہ سوچ گیا۔ بخاری کی شدت ہو گئی۔ لدھیانہ میں احرار کا عظیم الشان جلسہ تھا۔ دوسرے روز شاہ جی اسی حالت میں لدھیانہ تشریف لائے۔ چہرہ بے حد سوچ گیا تھا۔ تیز بخار تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ العزیز کی تقریر تھی۔ حضرت کرسی پر بیٹھے تقریر فرما رہے تھے۔ مجمع نہایت احترام سے آپ کے ارشادات گرامی سن رہا تھا۔ الوار کی بارش ہو رہی تھی۔ ایک وجود گرامی جو دین کی تفسیر تھا۔ خداوند کریم کی آخری کتاب سے خداوند کریم کا پیغام لوگوں تک پہنچا رہا تھا۔ احادیث نبوی کے حوالوں سے ساری مجلس دائرہ نورانیت میں آگئی۔ ایک آواز دلوں میں گھر

کر آ جا رہی تھی۔ حضرت کی گفتگو میں تقویٰ کا حسن، علم کی خوشبو، پاکیزگی کا جمال اور عمل کی لذت تھی جب حضرت تقریر ختم کر چکے تو شاہ جی فرط شوق و محبت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت کو بلوغ انداز میں خراج تمغین پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی دے۔ آپ کی تقریر کا ایک ایک لفظ میری سال بھر کی تقریروں کا موضوع بن گیا۔ آپ نے علماء کے ذہنوں میں علم کے چراغ روشن کر دیئے۔ آپ نے جس انداز سے قرآن مجید کی تعلیمات کو ہم تک پہنچایا وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ میں تو حضرت کا خوش چین ہوں۔ غرضیکہ شاہ جی نے اپنی محبت و عقیدت کا حسین انداز میں اظہار فرمایا۔ جیسا کہ اوپر تقریر کر چکا ہوں کہ شاہ جی کو بزرگوں سے، اہل اللہ سے مقربان بارگاہ الہی سے انتہائی عقیدت تھی۔ یہ جملے بھی اسی عقیدت کے اظہار کی علامت تھے۔

ملتان کے دو سالہ قیام میں باقاعدگی سے شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ شاہ جی کے علمی خزانے سے دامن طلب بھر تا رہا۔ مختلف موضوعات پر شاہ جی کی گفتگو سنی۔ علمائے دین کی مجالس کی رونما، ان کے علمی کمالات، ان کی بے نفسی ان کے تقویٰ کی داستانیں شاہ جی سناتے۔ مجلسی آداب کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کرتے۔ ایک روز اخلاق پر گفتگو فرماتے ہوئے کہا کہ "اخلاق کا سرچشمہ ادب کا مصدر تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں ایک بار بھی مجلس میں لات پاسد کر نہیں بیٹھے" بھر جہاں بے کے ساتھ فرمایا "حضور ایک بار لات پاسد کر بیٹھتے تو صوابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان کے قدم مبارک کو آنکھوں سے لگاتے۔ ان کے پائے مبارک پر چہرے کو ملتے مگر اس معلم اخلاق اس سرچشمہ رشد و ہدایت سے ایسی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔"

شاہ جی درویش صفت انسان تھے۔ سادہ زندگی بسر کی۔ ان کے دل میں دولت و ثروت کی کبھی خواہش پیدا ہی نہیں ہوئی۔ ہندوستان کا خلیفہ اعظم کرائے کے مکان میں رہا۔ جس میں برسوں سے قلعی نہ ہوتی تھی۔ جس کی مٹی گرتی رہتی تھی۔ اسی مکان میں ہندوستان بھر کے علماء شاہ جی کی ملاقات کے لئے آئے۔ اسی مکان میں شعر و ادب کی مجلسیں آراستہ ہونیں۔ سرمایہ دار اسی ٹوٹی چٹائی پر بیٹھ کر شاہ جی کے ارشادات سے مستفیض ہوئے۔ اس گھر کے دروازے رنگ و روغن سے بے نیاز رہے۔ خطیب اعظم کے گھر میں قالین نہ تھا۔ موٹے نہ تھے۔ دروازوں پر بٹنی پردے نہ تھے۔ ایک چھوٹا سا غسل خانہ تھا جس میں نلکا لگا ہوا تھا۔ خطیب اعظم اسی غسل خانے میں نلکے سے پانی نکال کر غسل کرتا۔ اس غسل خانے میں مثل سے غسل ہو سکتا تھا۔ اندر کے کمروں کا بھی یہی حال تھا۔ صحن کچا تھا۔ ایک روز میں نے شاہ جی کو حیدر دہلوی کا شعر سنایا۔

چمن والوں سے مجھ صرا نہیں کی بود و باش ابھی

بہار آکر جلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

شاہ جی کو شعر بہت پسند آیا۔ پھر اپنے گھر کے در و دیوار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے بہار آکر جلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی۔

شاہ جی اگر چاہتے تو ایک تقریر میں ایک کوٹھی کے پیسے جمع کر سکتے تھے۔ لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں ہزاروں

روپیہ اکٹھا کرنا مشکل کام نہ تھا مگر شاہ جی کو اللہ تعالیٰ نے توکل اور غنا کی دولت سے نوازا تھا۔ انہوں نے مادی دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ فقر و فاقہ کو زندگی کا حسن بنایا۔ اگر شاہ جی دولت کھانا چاہتے تو آج پاکستان میں ان کے فرزندوں سے زیادہ امیر کوئی نہ ہوتا۔ انہوں نے اپنی اولاد کو علم کی دولت دی، دین سکھایا، دین پڑھایا، سب کو قرآن مجید حفظ کرایا اس سے زیادہ بہتر ورثہ کیا ہو سکتا ہے کہ اولاد کا ہر نیک عمل والدین کے درجات کی بلندی کا سبب بنے۔

شاہ جی کے مسلسل قرب سے ان کی ذاتی خوبیاں، ان کے زندگی کے بے شمار پہلو دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ایسے بزرگوں میں سے تھے جن کے قرب سے ان کی عظمت کے پینار اور بلند نظر آتے ہیں۔ شاہ جی کو صاف کا پیکر جمیل تھے۔ شہر کی مجلس میں گھنٹوں گزارے۔ شاہ جی نے تمام عمر کسی کی غیبت نہیں کی۔ یہ بظاہر بہت معمولی بات نظر آتی ہے مگر ہماری کوئی مجلس بھی غیبت سے سبرا نہیں۔ جہاں چند دوست اکٹھے ہو جاتے ہیں تو کسی کی برائی، عیب جوئی ضرور درمیان میں آ جاتی ہے۔ شاہ جی نے اپنے دشمنوں کے بارے میں بھی کبھی غیر محتاط گفتگو نہیں کی۔ کسی کی ذات کے بارے میں نازبا لفظ استعمال نہیں کئے۔ یہ ان کے اخلاق کا کھان اور ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ یہ عالی ظرفی، یہ رکھ رکھاؤ، یہ وضعداری ان سے مختص تھی۔

شاہ جی کی زندگی نشیب و فراز سے عبارت ہے۔ انہوں نے کسی حال میں بھی کسی معتمد کسی مرید یا کسی دوست کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ یہ فقر کی شان ہے، یہ بے نیازگی کی شان یہ غنا کا ورثہ، یہ توکل کی دولت انہیں آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔

ایک روز سکندر مرزا صدر پاکستان ملتان آئے شاہ جی کو پیغام بھیجا کہ اگر تشریف لاسکیں تو میں بے حد ممنون ہوں گا۔ شاہ جی نے قاصد سے کہا کہ مجھے مرزا صاحب سے کوئی کام نہیں اگر وہ اس فقیر سے ملنا چاہتے ہیں تو دروازے کھلے ہیں بعد شوق تشریف لائیں۔

نہ تاج و تخت میں نے لکھ و سپاہ میں ہے۔

جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے۔

تیسری بات جس کا میں نے مشاہدہ کیا کہ شاہ جی نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا اگر کسی بات میں جھوٹ کا شائبہ بھی ہوتا تو اس کی وضاحت فرما دیتے۔ ایک روز شاہ جی حکیم حافظ ضیف اللہ صاحب کے مطب میں تھے مجھ سے فرمایا کہ میں آپ کی تیسرا داری کے لئے جانا چاہتا تھا مگر ہمت نہ پڑی۔ زیادہ چل نہیں سکتا۔ پھر فرمایا کہ گھر سے ارادہ کر کے نہیں نکلا تھا راستے میں خیال آیا تھا۔

حدیث شریف میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ مسلمان میں دو خصلتیں جمع نہیں ہو سکتیں ایک بخل دوسرے جھوٹ۔ شاہ جی کی زندگی ان دونوں برائیوں سے پاک صاف تھی۔

مولانا محمد یونس صاحب شاہ جی کے حلقہ احباب میں سے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں خانہ کعبہ کے سامنے راقم الحروف کی ان سے ملاقات ہو گئی۔ بزرگان دین کا ذکر خیر ہوتا رہا۔ اسی گفتگو میں شاہ جی رحمہ اللہ کا ذکر خیر بھی آوا ملانا محمد یونس صاحب نے شاہ جی کی شفقت محبت اور حسن کردار کا عجیب و غریب واقعہ بیان فرمایا۔

مولانا کا تعلق ضلع جھنگ سے ہے اور ان کے خاندان کے کئی افراد یہیں آباد ہیں۔ مولانا نے بیان فرمایا کہ "ہیڈ ٹرموں کا بند ٹوٹ گیا اور سیلاب سے ایک وسیع علاقہ زیر آب آگیا۔ میرے بھائی کی زمین بھی اسی علاقے میں تھی۔ پانی کا بہاؤ اس قدر تیز تھا کہ بھائی کے مکان کے قریب تیس فٹ گھبراگڑھا پڑ گیا۔ اور مکان بہہ گیا۔ اس ہنگامی صورت حال میں بھائی نے خواتین کو محفوظ مقام تک پہنچایا۔ پھر چار پائی اور دوسرا کچھ سامان اٹھانے گئے۔ تو پانی کے شدید ریلے کی نذر ہو گئے اور اسی میں وفات پا گئے۔ میں ایک چھوٹی کشتی کے ذریعے خواتین کو لیکر علاقہ "واسوستانہ" پہنچا۔ کچھ دنوں بعد ملتان آیا تو بھائی کی اس حادثاتی موت پر سخت دل گرفتہ اور منہموم تھا۔ اسی حال میں اپنے پیرو مرشد اور شفیع و مرئی حضرت امیر خریعت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت شاہ جی کو حال دل سنا کر کچھ غم ہلکا کیا۔ میں نے واپس جانے کے لئے اجازت چاہی تو مجھے ایک طرف تقلید میں لے گئے۔ اور فرمایا میری جیب میں ہاتھ ڈالو۔ جب میں پانچ سو روپے تھے۔ شاہ جی نے فرمایا انہیں اپنے اخراجات میں لانا۔ پھر فرمایا کہ معلوم ہے میں نے آپ کو جیب میں ہاتھ ڈالنے کے لئے کیوں کہا تھا۔ یہ اس لئے تھا کہ میرے دوست کو ہاتھ پھیلائے کی ذلت اور خرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ یہ حسین انداز یہ محبت کا رخ یہ حسن اخلاق کی ادا شاہ جی ہی کی حسن تدبیر کا کرشمہ ہو سکتی تھی۔

میں نے شاہ جی کو ایک لٹانی خلیب، ایک شعلہ بیان مقرر، ایک مفضل آرا شخصیت ایک بلند پایہ ادیب، ایک جید عالم کے علاوہ ایک بلند کردار، راست باز، متوکل، ہمدرد اور دوست نواز شخص بھی پایا۔ یہ اوصاف یہ خوبیاں یہ وضع داریاں اسلاف کا ورثہ ہیں۔ یہ ورثہ اب نایاب ہوتا جا رہا ہے۔

شاہ جی کی بیعت اول قطب دوراں حضرت پیر مہر علی شاہ قدس سرہ العزیز سے تھی۔ بعد میں وہ حضرت عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہ کے دامن سعادت و کرم سے وابستہ ہو گئے۔ شاہ جی نے حضرت اقدس سے روحانی فیض حاصل کیا۔ ان کی خدمت میں نہایت ادب و احترام سے حاضری دیتے رہے۔ جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔

ایک روز پنجابی شاعری پر گفتگو ہو رہی تھی۔ شاہ جی رحمہ اللہ پنجابی زبان کی وسعت اس کی جدت اور اس کی بے ساختگی کی داد دے رہے تھے۔ شاہ جی نے پیر وارث شاہ سے چند اشعار بھی سنائے۔ دوسرے پنجابی شعراء کا تذکرہ رہا۔ راقم الحروف نے بھی میاں محمد رحمہ اللہ کے کچھ اشعار سنائے۔ صوفیائے کرام کی شاعری پر شاہ جی نے اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں جو سوز، رقت اور واردات قلبی کا اظہار ہے وہ دوسری زبانوں میں بہت کم نظر آتا ہے۔ صوفیاء کی شاعری حال کی شاعری ہے۔ وہ اپنی کیفیات باطنی کو چند اشعار میں بیان کر کے اہل دل حضرات کو سوز کا بہت بڑا سرمایہ عطا کر جاتے ہیں۔ پنجابی کی مختلف اصناف شاعری کا ذکر رہا۔ آج کی مجلس پنجابی زبان کے بارے میں معلوماتی اور کیف آور مجلس تھی۔ دوراں گفتگو شاہ جی نے پنجابی زبان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ایک بلیغ جملہ ارشاد فرمایا "پنجابی زبان خیال کو آنگن دیتی ہے۔"

میں نے شاہ جی کو پنجابی کا ایک شعر سنایا۔

سیری گھگھری نون گھگھرو لو آ دے  
جے تون سیری ٹور دیکھنی

شاہ جی کو شعر بہت پسند آیا۔ مجھے اس شعر میں کوئی جدت یا ندرت خیال نظر نہ آئی۔ مجھے شاہ جی کی شعر فہمی کے بارے میں علم تھا خاموش رہا۔

حضرت اقدس حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہ فیصل آباد میں خالصہ کالج کی مسجد میں مقیم تھے۔ شاہ جی بیماری کی وجہ سے سفر کے قابل نہ تھے۔ نقاہت بہت بڑھ گئی تھی۔ حضرت اقدس کے ارشاد پر شاہ جی کو کار بھیج کر بلوایا گیا۔ عصر کے بعد حسب معمول حضرت اقدس کی محفل جی شاہ جی نے اپنی دھوئی کا پلو پکڑ کر حضرت اقدس سے مخاطب ہو کر شعر پڑھا۔ فرمایا حضرت ایک درخواست ہے۔ میرے بیٹے حافظ لدھیانوی نے شعر سنایا تھا۔ پھر اپنی مخصوص لے میں مندرجہ بالا شعر پڑھا۔ آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ دو تین سو آدمی اکٹھا ہو گئے۔ شاہ جی شعر پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ حضرت اقدس پر بھی کیفیت طاری ہو گئی۔ شعر کی قسمت جاگ اٹھی اس ادا لے خلوص و محبت، نیازمندی، حضرت اقدس سے وابستگی کے ہزار پہلو روشن کر دیئے۔

ابتداء میں شاہ جی کو روحانی فیض اپنے والد ماجد ہنس سرہ کی نظر التفات اور خاص توجہ سے ملا۔ شاہ جی نے ایک روز فرمایا تھا۔ جب وہ چلتے تو درخت اور دیواریں انہیں پیچھے ہٹتی ہوئی معلوم ہوتیں اور بھی روحانی کمالات کا تذکرہ کیا۔ شاہ جی کی ساری زندگی تقویٰ، پرہیزگاری، درویشی اور توکل پر گزری، اللہ تعالیٰ نے ظاہری حسن و جمال کے ساتھ حسن سیرت سے بھی نوازا تھا۔ ان کی طبیعت دنیا کی طرف کبھی راغب ہی نہ ہوتی حتیٰ رسول اللہ ﷺ نے ہر خواہش سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ان کو اگر دھن تھی تو یہ کہ وہ حضور اکرم ﷺ کا پیغام زندگی جو ابدی نجات کا ذریعہ ہے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچا دیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے ہزاروں تقریریں کیں۔ حضور اکرم ﷺ کے لاکھوں شیدائیوں کو حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ حضور ختمی مرتبت ﷺ کی ناموس اور تحفظ ختم نبوت پر جہاد والا، ان کیا۔ حضرت سید محمد انور شاہ کاشمیری نور اللہ مرقدہ نے جس مشن کے لئے آپ کا انتخاب کیا تھا اس کو تمام عمر بطریق احسن پورا کیا۔ شاہ جی نے ایک دفعہ فرمایا کہ ہم نے انگریزوں کے خلاف اس وقت علم بغاوت بلند کیا جب مائیں اپنے بچوں کو انگریز کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ اس حق گوئی و جذبہ حریت کی پاداش میں انہیں بارہا جیل جانا پڑا۔ مقدمات چلے۔ مگر انہوں نے ہزاروں کے مجمع میں انگریز کے خلاف تقاریر کیں۔

آئین جوان مردان حق گوئی و بیباکی  
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روپائی

شاہ جی سے لاکھوں انسانوں کو بے پناہ عقیدت تھی۔ شاہ جی کا نام ان کے دل کی دھڑکنوں میں بس گیا تھا۔ شاہ جی کے لئے ہزاروں دلوں سے دعائیں نکلتی تھیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آگیا جو شاہ جی کی ذہانی سنا تھا۔

لدھارام حکومت کا رپورٹر تھامس سکندر حیات کی حکومت نے شاہ جی کی تقریر کے متن کو مسخ کرا کے لدھارام سے نئی رپورٹ لکھوائی یہ بہت بڑا مقدمہ تھا۔ اس مقدمے میں شاہ جی کو بڑی سے بڑی سزا دی جا سکتی تھی۔ آخری پیشی کے وقت لدھارام نے شاہ جی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ لدھارام کا مردہ ضمیر جاگ اٹھا۔ اس نے برسر عدالت حقیقت کا انکشاف کر دیا اور عدالت میں بیان دیا کہ شاہ جی کی تقریر کے متن کو مسخ کر کے اس سے دوبارہ رپورٹ تیار کرائی گئی ہے۔ جو الزامات شاہ جی پر لگائے گئے ہیں وہ بے بنیاد، فرضی اور بعید از حقیقت ہیں۔ اس طرح شاہ جی تختہ دار تک پہنچ کر واپس آ گئے۔ (مقدمہ سے باعزت بری کر دیئے گئے) یہ ان دعوؤں کا نتیجہ تھا جو لاکھوں انسانوں نے ہار گاہ رب العزت میں کی تھیں۔

شاہ جی نے فرمایا کہ میں ایک جلعے میں تقریر کر کے سٹیج سے نیچے اترا ایک ضعیفہ لاشی سے ٹیک لگائے راستے میں کھڑی تھی۔ جو نبی میں اس کے پاس سے گزرا اس نے میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ میرے دم یکدم رک گئے۔ میں اس ضعیفہ ضعیفہ کے قریب گیا۔ ادب سے سلام کیا۔ بڑھیا کھنے لگی عطاء اللہ شاہ تیرا ہی نام ہے۔ ادب سے کہا کہ اس گنہگار ہی کو عطاء اللہ کہتے ہیں۔ بے شمار دعائیں دے کر کھنے لگی کہ اس بوڑھی جان کے ساتھ سو کنڈوں نفل پڑھ کر تیرے لئے دعائیں کی ہیں کہ اسے خدا اس نے تیرے حبیب کے ناموس کے لئے سر دھڑکی بازی لگا دی ہے یہ حق کے لئے لڑنا ہے۔ اس کو سلام رکھنا۔ اس کو دشمنوں پر قلع نصیب کرنا۔ بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شاہ جی نے فرمایا کہ میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا جو اس وقت مجھ پر طاری ہوئی۔ یہ حضور اکرم ﷺ کے کرم کے انداز ہیں۔

شاہ جی کی صحبتوں کا ایک ایک لمحہ علم و ادب کے چراغ روشن کرتا رہا۔ شعر و ادب کی مہفلیں منعقد ہوئیں۔ مذہب کے بہت سے گوشے بے نقاب ہوئے۔ سیاست کے عروج و زوال کی داستانیں سنیں، بزرگوں کے روحانی درجات کے واقعات نے ذہن میں اجالا کیا۔ علمائے کرام کے تقویٰ، پرہیز گاری، ان کے علمی مقامات اور ان کی بے نفسی و خدا ترسی کے بہت سے قصے سنے۔ لیکن ان کے دو سال کے قیام کے دوران دل۔ و نظر کی تربیت کے بے شمار مواقع میسر آئے۔

کلچ کا نوجوان طبقہ شاہ جی سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ پروفیسر صاحبان کلچ کے طلباء اور نوجوان اکثر شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ شاہ جی کی تبلیغ کا انداز منفرد تھا وہ نوجوانوں پر کفر کے فتوے لگانے، انہیں مذہب سے دور رکھنے کے حق میں نہ تھے۔ نوجوان شاہ جی کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے۔ حالات حاضرہ پر باتیں ہوتیں۔ سیاست زیر بحث آتی۔ ملکی معاملات پر تبادلہ خیالات ہوتا۔

ایک روز اسلامیہ کلچ کے چند طلباء شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ شاہ جی کلچ کا ماحول ہی ایسا ہوتا ہے جہاں دائرہ رکھنا بہت مشکل ہے۔ شاہ جی نے دائرہ رکھنے کے جواز میں کوئی حدیث نہ پڑھی نہ ہی کلام پاک کی کسی آیت کی حاکمات کی۔ فرمایا "آپ نے ٹھیک فرمایا۔ حالانکہ کلچ میں دائرہ رکھنا آسان ہے اسلامیہ کلچ میں واقعی بہت مشکل ہے" اس جواب سے ان کے چہرے زرد پڑ گئے۔ انتہائی شرمندہ ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شاہ جی ایسا جواب دیں گے۔ جیسا کہ اوپر عرض کر

چکا ہوں۔ شاہ جی کی تبلیغ کا انداز سب سے جدا تھا۔ یہ ان کی فراست اور حاضر جوابی کی دلیل تھی۔ شاہ نے ساری زندگی قصداً تصور نہیں کھینچوائی جب جیلے میں کیرہ میں سامنے آتا تو آپ ہمرے پر کپڑا ڈال لیتے۔ مگر لوگ کسی نہ کسی طرح تصور اتار لیتے۔ اس میں شاہ جی کی مرضی کا کوئی دخل نہ تھا۔ ایسے بست سے پر لطف واقعات ذہن میں محفوظ ہیں جو شاہ جی کے منفرد انداز کلام کے صامین ہیں۔ اس مضمون میں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔

میرا تبادلہ فیصل آباد ہو گیا۔ اکتساب فیض کا یہ سلسلہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ ایک روز جھنگ کے دورے پر تھا کہ شاہ جی کی علالت کی خبر سنی۔ شاہ جی کو فلج کا حملہ ہو گیا تھا۔ خبر ملتے ہی شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عصر کا وقت تھا۔ برادر محترم سید عطاء الحسن بخاری نے میری آمد کی اطلاع دی۔ شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ عرض کی "بے وقت حاضر ہو گیا ہوں۔ آپ کی علالت کی خبر سن کر طبیعت پریشان ہو گئی مجھے معلوم ہے کہ یہ آپ کے اور دو وظائف کا وقت ہے مگر مجھ سے رہا نہ گیا۔ آپ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے تاب تھا۔" شاہ جی کی زبان پر فلج کا اثر تھا۔ رک رک کر گفتگو فرما رہے تھے۔ انگلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "انگلیاں کام نہیں کرتیں۔ وظائف کا تسلسل ٹوٹ چکا ہے۔ یادداشت ساتھ نہیں دیتی۔ صحت جیسی ہے تم دیکھ رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس حال میں رکھے شکوہ کس کا کروں۔ میں نے اپنے جسم کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں نہیں کی۔ تین سو پینسٹھ دنوں میں چار سو تقریریں کی ہوں گی۔ اب اس نے اگر میرا ساتھ چھوڑ دیا تو اس کا کیا قصور یاد رکھو اگر کوئی حکومت اپنی رعایا سے اچھا سلوک نہیں کرے گی تو رعایا ایک نہ ایک دن ضرور بغاوت کر دے گی۔ پھر جسم کی طرف اشارہ کر کے فرمایا میں نے اپنی رعایا کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس کے آرام کا خیال نہ رکھا۔ اس نے بغاوت کر دی۔"

اتنی مختصر سی گفتگو کے بعد شاہ جی تک چکے تھے۔ کافی دیر خاموشی رہی۔ اس دوران میری نظروں کے سامنے وہ تمام جیلے آگئے جن میں شاہ جی کی سر بیانی دیکھی تھی۔ انہیں دلوں کو سز کرتے اور دلوں پر قبضہ جماتے دیکھا تھا۔ ان جلسوں میں شاہ جی کی بے پناہ تہذیب و منزلت اور احترام دیکھا تھا۔ شاہ جی کو تلواروں کی سلامی دی جاتی۔ احرار کے خدام انہیں رائج کرتے ہوئے جلسہ گاہ تک لاتے۔ شاہ جی کے جلسہ گاہ میں داخل ہوتے ہی ہزاروں لوگ شاہ جی کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ پنڈال شاہ جی زندہ باد مجلس احرار زندہ باد، امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے گونجا رہتا۔ شاہ جی کی تقریر سننے کے لئے دوسرے شہروں سے لوگ گروہ در گروہ آتے۔ سوئٹروں لوگ میلوں پیدل سفر کر کے جیلے میں شریک ہوتے۔ تقریر سے گھنٹوں پہلے لوگ سٹیج کے قریب جمع ہونا شروع ہو جاتے۔ تاکہ دوران تقریر شاہ جی کو دیکھ سکیں۔ مشائقان دید ہمہ انتظار بنے شاہ جی کی جلسہ گاہ میں آمد کے منتظر رہتے۔ بیک وقت ہزاروں نگاہیں شاہ جی کے استقبال کے لئے اٹھتیں۔ شاہ جی شاہانہ طہر کے ساتھ جلسہ گاہ میں داخل ہوتے۔

شاہ جی نے خطبہ مسنونہ پڑھا۔ تقریر کا آغاز کیا۔ لاکھوں کے مجمع میں سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ علماء شاہ جی کی خطابت سے مسحور ہو رہے ہیں۔ انگریزی دان طبقہ الگ مجموعہ رہا ہے۔ شعروں کے برجستہ استعمال پر اہل



ذوق داد دے رہے ہیں۔ حفاظ اور قراء شاہ جی کی تکلوت پر قربان ہو رہے ہیں۔ ہر ایک کی بھولی بھری جارہی ہے۔ ہر ایک کے ذوق کی تسکین کا سامان بسم ہو رہا ہے۔ ہر ایک علم کے خزانے سے دامن بھر رہا ہے۔ خطابت دلوں کے تاروں کو ہلاتی اور ذہنوں کو شاداب کرتی چلی جارہی ہے۔ مجمع دنیا و دنیاسے بے خبر ہستہ تن گوشِ تقریر کے صحن میں کھویا ہوا ہے۔ ہزاروں نگاہیں شاہ جی کے چہرے پر جمی ہیں۔ شاہ جی کی سر بیانی اور آتش نوائی زوروں پر ہے۔ شاہ جی موضوع کی مناسبت اور موقع کی مطابقت سے قرآنی آیات و جہد آفریں قرأت کے ساتھ تکلوت فرما رہے ہیں۔ تقریر کے دوران فارسی اور اردو کے اشعار و روحوں کو گما رہے ہیں۔ شاہ جی اشعار اپنے مخصوص ترنم سے پھر رہے ہیں۔ آواز کے زیر و بم کے ساتھ معانی و مطالب کی خود بخود وضاحت ہوتی چلی جاتی ہے۔ الفاظ موضوع کے لحاظ سے تقریر کا حصہ بن گئے۔ ہزاروں کے مجمع میں سانس تک کی آواز نہیں ایک ہی آواز ہے جو دلوں کو گراتی، روحوں میں سسائی جارہی ہے۔ شاہ جی لوگوں کے چہروں سے عنوانات چن رہے ہیں ان کا ہاتھ لوگوں کی نبضوں اور دھڑکتے دلوں پر ہے وہ بے پناہ ہوم کا دھارا جس طرف چاہتے ہیں موڑتے جاتے ہیں۔ مخالفین کی زبانوں سے واہ واہ کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ مخالفین لہجہ مخالفت بھول گئے۔ معتدین اشار کے پیکر غلوص کے مجھے اور ہدایت کا نشان بنے بیٹھے ہیں۔ یہ مرد مجاہد، یہ بے لوث انسان، یہ خطیب اعظم اپنے مخصوص انداز میں خدا اور اس کے رسول اللہ ﷺ کا پیغام لوگوں تک پہنچا رہا ہے۔ اپنے فرض سے سرخرو ہو رہا ہے۔ حق و باطل کی جنگ جاری ہے۔ دین خدا کا سپاہی ان سب طاغوتی طاقتوں سے تنہا نبرد آزما ہے۔ اس کو کسی طاقت کی مخالفت کی پرواہ نہیں۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے شاہ جی کے بارے میں کہا تھا۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمرے

بلبل چمک رہا ہے ریاض رسول میں

شاہ جی کی تقریر میں جلال و جمال کا حسین استزاج تھا۔ شاہ جی کے الفاظ میں شبنم کی نرمی، شاخ گل کی لچک، بلبل کا زمر، ستاروں کی چمک اور بہاروں کا حسن تھا۔ اگر شاہ جی کی زبان پر خدا اور رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں کا ذکر ہوتا تو شاہ جی کی تقریر میں بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، سمندر کا خروش، شاہوں کا جلال اور مرد مجاہد کی شان نمایاں ہو جاتی تھی۔ وہ موضوع کے مطابق لب و لہجہ اور انداز بیان بدل لیتے تھے۔ اور تقریر کو انتہائی موثر بنا لیتے تھے۔ الفاظ میں کہ پرے باندھے چلے آ رہے ہیں۔ دریا ہے کہ بہاؤ پر ہے۔ سمندر ہے کہ شامیں مار رہا ہے۔ اور اس سمندر کی ہر موج دلوں اور ذہنوں کو بہانے لئے جارہی ہے۔ فرط جذبات سے لوگ مشتعل ہو رہے ہیں اور ہر دس پندرہ منٹ بعد فلک شگاف نعروں کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد اسیرِ شریعت زندہ باد۔

میں ان فضاؤں میں کھویا ہوا تھا اس دور کو تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا ان درخشاں تصورات کا سلسلہ شاہ جی کی مدغم آواز نے توڑا تمام معز کے تمام نچے، تمام بھگائے آن واحد میں غائب ہو گئے۔

خیالات کا سلسلہ ٹوٹا میں نے اس سر بیان مقرر، شیریں مقالِ خطیب، شعلہ نوا اور آتشِ بیاں عالم دین

کو اس حالت میں دیکھا جس کی آواز مدھم ہو چکی تھی۔ جس کی زبان سے بمثل گنگو ہو رہی تھی۔ جس کے قوائے ذہنی و جسمانی کمزور ہو چکے تھے۔ جس کی بینائی دھندلا چکی تھی۔ جو ایک خستہ و شکستہ مکان میں رہتا تھا۔ جس کی دستی و ملی خدمات کا صلہ عزت و تنہائی اور جدوجہد آزادی کا انعام مسلسل پریشانی اور کسپہری تھا۔ جس کی صحت جو کبھی قابلِ رکھ تھی۔ آج وہ اٹھنے بیٹھنے سے معذور تھا۔ آج اس کے جوڑ جوڑ اور نس نس میں نصف صدی کی ٹھکان اور مشقت بسی ہوئی تھی۔ جس کا ذہنی اثاثہ کافی حد تک لٹ چکا تھا۔ جس کا جسمانی سرمایہ آہستہ آہستہ گھٹ رہا تھا۔ میری نظروں میں ماضی کی درخشاں تصویر حال کے بوسیدہ چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی۔ یہ چوکھٹا کتنا دیرک خوردہ تھا۔ کتنا بے رنگ و بے آب تھا۔ یہ حال کا چوکھٹا ماضی کے تابندہ و درخشاں نقوش پر اپنا گھر اسایہ ڈال رہا تھا۔

تغیر کی اس زنجیر کو پھر شاہ جی کی آواز نے توڑا۔ شاہ جی نے سلسلہ کلام شروع کیا اور لمبی آہ بھر کر فرمایا۔ "یادداشت کافی حد تک جواب دے چکی ہے۔ بات کرتے کرتے بھول جاتا ہوں جب کوئی بات یاد نہ آئے تو بہت پریشانی ہوتی ہے" میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے۔ میں شاہ جی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کتنا عظیم المیہ ہے۔ کتنا اندوہناک واقعہ ہے۔ وہ شخص جس کے ذہن میں سوکڑوں احادیث پورا کلام پاک اور بیشمار عربی، فارسی اور اردو کے اشعار تھے اور وہ ہر ت کے اس حلیے سے جب چاہتا تھا جس وقت چاہتا تھا حلقے کی قوت اور یادداشت کے سہارے استفادہ کر سکتا تھا۔ آج وہ شخص بات تک یاد نہیں رکھ سکتا۔ اس کے دل و داغ پر کیا قیامت گزرتی ہوگی۔ آج وہ گنگو کرنے سے عاجز ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور لیٹان کے ایک کوچے میں زندگی کے ایسے کی تصویر بنا ہوا ہے۔ جس کی مغلیں ہر ذوق کے انسان کے لئے انمول سرمایہ ہوا کرتی تھیں آج وہ خود دوستوں کی محفلوں کو ترس گیا ہے۔

ایک بار شاہ جی نے ایک نشست کے دوران فرمایا تھا "حافظ جی یہ کوئی زندگی ہے یہ تو زندگی کا ماتم ہے۔ گزری ہوئی زندگی کا مریخ ہے۔ میری زندگی مسلسل نوحہ بن کر رہ گئی ہے۔" پھر فرمانے لگے کہ "زندگی کا بیشتر حصہ علماء کی صحبت، شعراء کی مجالس اور، بزرگوں کی خدمت میں بسر ہوا۔ پیر مرعلیٰ شاہ گور اللہ مرہہ کی صحبت سے فیض یاب ہوا۔ حضرت اقدس حضرت مولانا عبدالقادر راسانی پوری قدس سرہ العزیز کی باطنی توجہ سے قلب و روح میں ابتزاز پیدا ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ علیہ کے علمی و ادبی خزانے سے مستفیض ہوا۔ مولانا حسین احمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک عمر رفاقت رہی۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی زندگی کے ساتھی تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے جید علماء کی صحبتیں نصیب رہیں۔ ان میں سے اکثر داغ مفارقت دے گئے۔ یہ بزرگ علم و عمل کے پیکر، زہد و تقویٰ کی تفسیریں اور تبلیغ دین کے علمبردار تھے۔ یہ لوگ جہاں دین کے داعی تھے وہاں جدوجہد آزادی کے رہنما بھی تھے۔ ایوبوں اور شاعروں میں ایم ڈی تاثیر، حفیظ جالندھری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، عابد علی عابد، عبد الحمید سالک، غلام رسول مہر، پطرس بخاری میری مجلسوں کی زینت میری ادبی محفلوں کی رونق تھے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ ان میں سے بھی اکثر اللہ کو بیار ہو گئے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ  
 شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی  
 جو موجود ہیں ان کی صورت رکھے برسوں گزر جاتے ہیں۔ عبدالمید سالک تو میرے جیل کے ساتھی  
 تھے۔ ایسے ہی رفیقوں کے سہارے جیل انجمن یاروں بنی رہی۔ فرمایا کہ ایک دفعہ صوفی تبسم جیل میں لے آئے  
 عبدالمید سالک سے مل کر چلے گئے۔ مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میرے لئے ایک شعر چھوڑ گئے۔ میں :  
 عرض کی اگر شعر حافظے میں موجود ہو تو سنائیے پھر شاہ جی نے اپنے مخصوص انداز میں شعر پڑھا۔  
 حیف کہ من بنوں تبسم از تو سخن رود کہ تو  
 اشک بدیدہ بشری، نالہ بہ سینہ بنگری  
 فرمایا یہ غالب مرحوم کا شعر ہے اسی غزل کا مطلع ہے۔

دیدہ درال کہ تانہ دل بشمار دلبری  
 گر رگ سنگ بنگرد رقص بتان آذری  
 دکھ بھرے لمبے میں فرمایا۔ وہ صحبتیں خواب ہو کر رہ گئیں وہ محفلیں اجڑ گئیں۔ خواب تھے کہ بکھر گئے  
 اس سینے میں کن کن صحبتوں کے دلخ ہیں۔  
 تن ہمہ داغ داغ شد پند کجا کجا نیم  
 حافظ صاحب اب تو اس محلے میں رہتا ہوں جہاں کوئی اخبار پڑھ کر بھی نہیں سنا سکتا۔ میری بیٹائی کمزور ہو چکی  
 ہے۔ آپ آجاتے ہیں تو بھولی بسری صحبتوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لاہور سے کوئی دوست آجائے تو اضنی  
 جگہ لگتا ہے۔ کمزوری اور نقابت اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ گھر کی دلیز سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔  
 ذیابیطس سے جسم گھل کر رہ گیا ہے۔

ایسی کئی محفوں کے نقوش ذہن میں تازہ ہیں۔ کن کن صحبتوں کا ذکر کیا جائے۔ کن کن لمحات کو احاطہ  
 تحریر میں لایا جائے۔ کن کن واقعات کو دہرایا جائے۔ شاہ جی کی صحبتیں میرے لئے کھلی چھٹی کتابیں ہیں۔  
 جن کے ایک ایک ورق میں علمی و ادبی خزانے محفوظ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی، صحابہ کبار  
 رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جاں نثاری کے واقعات شعرائے کرام کے تذکرے، بدھ سنی، خوش مذاقی،  
 انقلاب زمانہ کی ہولناک تصویریں، دیمک خوردہ خاکے ماضی کے تابندہ نقوش، حال کی شکستہ زندگی قید و بند کی  
 جاں سوز حکایتیں۔ ان مجالس میں شاہ جی نے کس موضوع پر اظہار خیال نہیں کیا۔ کوسا وہ خزانہ نہ تھا جس کی  
 تمہید شاہ جی کے پاس نہ تھی۔ ایک شخص کے ہزار رخ ہزار جلوے تھے مگر اس دینی سیاسی علمی پیکر کو مسلسل  
 بیماری نے نعمت و نزار کر دیا تھا۔ اب اس کے ذہن میں ہنگاموں اور معرکوں کے دھندلے خاکے بھی نہیں  
 تھے۔

عید کا روز شاہ جی غسل خانے سے وضو کر کے ٹکے غسل خانہ جس میں ایک آدمی اچھی طرح بیٹھ کر  
 وضو بھی نہیں کر سکتا۔ جس کا دروازہ نہیں تھا۔ دروازے کی جگہ پردہ لٹکا ہوا تھا۔ غسل خانے سے ٹکل کر مجھے افسردہ  
 دیکھا "فرمایا کیوں پریشان ہو" میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ آپ نے یہ شعر سنایا۔

نہ گنم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم  
ہمہ حیرتم کہ دہقان بچہ کار کت دارا

میں شاہ جی کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ شعر کون پڑھ رہا ہے وہ شخص جس نے بے شمار ویران دلوں کی آبیاری کی جس کے سامنے میں ہزاروں لوگوں کو آسودگی نصیب ہوئی۔ جس نے لاکھوں دلوں میں آزادی کی شمع روشن کی جس نے ان گنت لوگوں کو دین کا درس دیا۔ اللہ اکبر کیسا حیرت کن انقلاب تھا۔ جس کے تصور سے روح کے تار لرزنے لگتے ہیں۔

شاہ جی کا ذاتی کتب خانہ فسادات کی نذر ہو گیا بہت سے قلمی نسخے ضائع ہو گئے۔ قیمتی دو لوہے اور سینکڑوں اشعار کا خوبصورت انتخاب امر سر رہ گیا۔ جو عمر بھر کے ذوق کا ادبی سرمایہ تھا۔ اس علی خزانے کے لٹ جانے سے شاہ جی پر کیا بیتی ہوگی۔ اس کا اندازہ ادب سے شغف رکھنے والے ہی لگا سکتے ہیں۔

ایک دن فرمایا کہ آج کل نوجوانوں میں فارسی ادب کا ذوق ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اسی لئے صبح ادبی ذوق پیدا نہیں ہوتا۔ پھر مولانا غلام قادر گرامی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبتوں کا ذکر کرنے لگے۔ مولانا گرامی رحمۃ اللہ علیہ کے معراج کے واقعہ پر لکھے ہوئے اشعار سنائے۔ فرمایا "یہ اشعار مولانا گرامی ہی کا حصہ ہیں" صوتی آہنگ، تکرار لفظی، حسن معنوی، انتخاب الفاظ اور پھر شاہ جی کے پڑھنے کا دلکش انداز۔ عجیب کیفیت پیدا ہوئی۔

بلا در ہر سخن پیچیدہ زلف نسیم تابش را

اجل در یک گریبان ست چشم نسیم خوابش را

شعبہ در خانہ زیں آں لام انبیا آمد

قصا گیرد عنائش را قدر گیرد رکابش را

قصا گیرد قدر گیرد ازل گیرد ابد گیرد

رکابش را عنائش را عنائش را رکابش را

سوار برق شدما ہے فلک آمد عنائش گیرش

رکابش بوسہ برپا زد ملک بوسہ رکابش را

گرامی در قیامت آں نگاہ مغفرت خواہد

کہ در آغوش گیرد جرہائے بے حسابش را

فارسی ادب کا بہت دیر تذکرہ رہا۔ شاہ جی نے اس روز مسجد میں شہداء کے بہت سے اشعار سنائے۔

شاہ جی باتوں باتوں میں ایسے جملے کہہ جاتے تھے جو ادب کی تاریخ ہوتے تھے۔ کتنے ہی جو اہر پارے ہو گئے جو ضبط تحریر میں نہ آنے کی وجہ سے ضائع ہو گئے۔

ایک دفعہ حدیث کے بارے میں فرمایا "حدیث تو دعوے کی مثل ہے" ایک دن فرمایا "دوستی اور دشمنی کا ترازو تو صرف انبیا علیہم السلام کے ہاتھ میں رہا ہے" مولانا محمد انور شاہ کاشمیری نور اللہ مرقدہ کے بارے میں نہایت بلیغ جملہ ارشاد فرمایا۔ واقعہ یوں ہے کہ شاہ جی کسی جلسہ میں شرکت کے لئے گئے۔ سٹیشن پر لوگ ان کے استقبال کے لئے آئے کسی بزرگ نے شاہ جی سے درخواست کی کہ آج وہ علامہ محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہ

کے بارے میں کچھ بیان فرمائیں۔ ہماری نئی پود کو اپنے اکابرین کے بارے میں بھی علم ہونا چاہیے۔ وہاں شاہ جی نے فرمایا کہ حضرت کے بارے میں کیا عرض کروں "صحابہ کا قافلہ جا رہا تھا حضرت پیچھے رہ گئے" اس مختصر سے جملے میں حضرت محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے اوصاف حمیدہ ان کے تقویٰ، ان کی بزرگی، ان کا جناب رسالت مآب سے عشق، ان کی اتباع سنت غرضیکہ خصائل و شمائل کی ایک دنیا آباد ہے۔ اگر اس کی تشریح کی جائے تو ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم کی بات ہو رہی تھی شاہ جی نے وہ شعر سنائے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فکر کی معراج نظر آئے۔

وجدت العلم فی الاکشاف عظماً

وفی الاجلاف مقبوحاً و ذماً

کماہ المطوفی الاصداف دراً

وفی فم الافاعی صارساً

میں نے شرفاء میں علم کو معزز پایا اور کمینوں میں ذلیل و خوار دیکھا۔ جیسے سوانی کا پانی سیپ کے منہ میں مونی اور سانپ کے منہ میں زہر۔

میں نے جب آخری بار شاہ جی کو دیکھا وہ صاحب کمال اور صاحب علم و فضیلت بزرگ فخر کھیل میں بے سدھ پڑا تھا جس کا وجود نصف صدی کی جدوجہد کی تاریخ تھا۔ جس نے اپنی سر بیانی لیشاور قربانی اور علم و فضل سے لاکھوں انسانوں کے دلوں پر حکومت کی۔ جس کے صدائے کلمۃ الحق سے اہل باطل کا نپ کا نپ اٹھتے تھے جس کی ساری زندگی مسلسل جدوجہد، مستقل آزمائشوں اور قید و بند کی صعوبتوں میں گزری مگر کسی استعماں کی آزمائش میں اس کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

شاہ جی نے وطن کی آزادی کے لئے قابل رشک جوانی قربان کر دی اور ناموس رسول اللہ ﷺ کے لئے ساری زندگی۔ اس شخص کو نہ زنجیر و سلاسل کا خوف تھا نہ دار و درسن کا اس نے ظلم و استبداد کا عالی حوصلگی اور پامردی سے مقابلہ کیا۔ اس نے کبھی اپنی قربانیوں کا صلہ نہیں چاہا۔ خلافت کے زمانے میں لاکھوں روپے اکٹھے ہوئے عورتوں نے شاہ جی کی تقریر سے متاثر ہو کر زیورات سٹیج پر پیش کر دیئے۔ اگر شاہ جی چاہتے تو اپنی ذات کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ان کی بے لوث اور پر خلوص زندگی نے دنیوی آرام و آسائش کو قبول نہیں کیا۔ شاہ جی کو قدرت نے حسن کلام اور حسن خطابت کا جوہر عطا فرمایا تھا۔ وہ زندگی کی اعلیٰ ترین آسائشیں حاصل کر سکتے تھے مگر اس مرد فکندر اس فرشتہ سیرت بزرگ نے آخرت کے لئے سرمایہ اکٹھا کیا وہ مطمئن تھا کہ اس نے کبھی ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ برسر عام حق بات کہی۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ وطن سے محبت کی، آزادی کا علم بلند کیا۔

آج وہ مرد درویش، خطیب اعظم، شعلہ بیان مقرر، عاشق رسول اللہ ﷺ آزادی کا بیباک اور نڈر سپاہی دین کا مبلغ اپنا فرض ادا کر کے زیر زمین آسودہ خاک ہے۔

وے لوگ تو نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے  
پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کے

## حکیم محمد بخش کامل چشتی جائیدہ حری مرحوم منکر ختم نبوت پر تو اک صمصام ہے

شہ عطاء اللہ سبط حیدر کرار ہے اور نواسہ ختم مرسل احمد مختار ہے  
عالم اسلام کی ہاں تیغ جوہر دار ہے کفر اور الحاد سے تو برسرِ پیکار ہے  
بادہ توحید کا گویا چمکتا جام ہے

قادیانی کے لئے تو موت کا پیغام ہے  
جلوہ گر تیری جبین سے مصطفیٰ کی شان ہے تو جی شیر خدا اور فاطمہ کی جان ہے  
مزنِ علم و عمل تو چشمہ عرفان ہے اخترِ اقبال اور سرتاجِ ہندوستان ہے  
ہند کیا چرچا تیرا تو مصر و روم و شام ہے

قادیانی کے لئے تو موت کا پیغام ہے  
سچ تو ہے عالم تیرا شرمندہ احسان ہے جان جب ناموس احمد پر تیری قربان ہے  
تیری قربانی کی عالم میں نمایاں شان ہے سطوتِ فاروق اور خاندان کی دل میں آن ہے  
اہل حق کے واسطے الطاف اور اکرام ہے

قادیانی کے لئے تو موت کا پیغام ہے  
کانپ جاتا ہے فلک جب نعرہ تکبیر سے لرزاں ایوانِ حکومت کیوں نہ ہو تقرر سے  
ہاں الجھ جاتی ہے تیری تیغ جب تقدیر سے حل نہ کیونکر ہوں بھلا عقیدے تیری تدبیر سے  
منکر ختم نبوت پر تو اک صمصام ہے

قادیانی کے لئے تو موت کا پیغام ہے  
بند زنداں میں کیا جوہی حکومت نہ تجھے دی صدائے مرحبا!! ختم رسالت نے تجھے  
دیدیا پیغامِ آزادی صداقت نے تجھے دی مبارکباد حید کی شجاعت نے تجھے  
دنا پیغامِ عمل ہاں غازیوں کا کام ہے

قادیانی کے لئے تو موت کا پیغام ہے  
زندگی ہے وقف تیری ملک و ملت کے لئے جیل کی جھیلی مصیبت دیں کی عظمت کے لئے  
سرکشت بیتاب ہے جامِ شہادت کے لئے ہے ٹپ دل میں تیرے احمد کی امت کے لئے  
زندہ کرنا سنتِ اسلاف تیرا کام ہے

قادیانی کے لئے تو موت کا پیغام ہے

## شاہ جی اور مولانا محمد گل شیر شہید

اللہ کریم نے مجلس احرار اسلام کو ایسے عظیم المرتبت رہنماؤں اور قابلِ حدِ تمعین کارکنوں سے نوازا تھا کہ ان میں سے ہر ایک فرد اپنے مقام پر استقامت کا پہاڑ اور غیرتوں کا مرقع تھا۔ قیامِ ازل سے انہیں بے شمار خوبیوں و دیوت ہوئی تھیں۔ جن کی مثال دیگر جماعتوں کے رہنماؤں اور کارکنوں میں آج بھی مفقود ہے۔

حضرت امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ مجلس احرار کی آبرو تھے۔ یا عبد اللہ ملک کے الفاظ میں "شاہ جی اور احرار میں گل و بلبل کا رشتہ تھا"۔ اور اس رشتے و تعلق کو صرف موت ہی جدا کر سکی۔ شاہ جی کی سر طراز شخصیت کا ظہور تھا کہ لوگ کھپے چلے آتے۔ اور پیروں جمالِ ہمنشین کا لطف اٹھاتے۔ شاہ جی اپنے سکندرانہ جلال اور قلندرانہ اداؤں کی بدولت لپٹوں کے دلوں کی گھمرائیوں میں یوں بس گئے کہ پھر کوئی دوسرا ان کی جگہ نہ لے سکا۔ شاہ جی حسبِ اور لبِ سادہ کی لمانتوں کے امین تھے۔ اور اپنی صفاتِ عظیمہ تین قرونِ اولیٰ کی یادگار تھے۔ ان کے مہمندانہ معرکوں کا اعتراف کس نے نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کی وفات کی خبر ان کے مرشدِ قطبِ انقلاب حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری تک پہنچی تو وہ شدتِ غم سے دھڑلے مار مار کر رونے لگے۔ کیونکہ مرشد کے آنکھ نہ دل سے بڑھ کر کس پر مرید باصفا کے باطن و ظاہر کے احوال منکشف ہو سکتے تھے۔

الفرض شاہ جی کو اگر مشاطہِ ازل نے اس طرح بنا سنوار کر یہاں بھیجا تھا کہ ماضیِ مرحوم میں ان کے حسنِ ظاہری اور باطنی میں ان کا کوئی ثبیل نہ تھا۔ تو قدرت کے دستِ فیاض نے انہیں ساتھی بھی ایسے عظیم عطاء کئے تھے جو اپنے مقام و مرتبے، علم و عمل اور مزاج و طبیعت کے اعتبار سے بھی سرِ پائے احرار تھے۔ انہیں تو یوں محسوس کرتا ہوں کہ وہ شاہ جی کی ذات ہی کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ چودھری افضل جی ایسے رہنما سے لے کر جانہاز مرزا ایسے کارکن تک ہر رہنما و کارکن تمام تر احراری صفات کا مکمل آئینہ دار تھا جو سیرتِ رسول ﷺ ازواج و اصحاب رسول رضی اللہ عنہم کا عکسِ جمیلا تھیں۔ ہر ایک کا شاہ جی سے اور شاہ جی کا ہر ایک سے اپنا ہی تعلق خاص تھا جو بس اسی کے لئے مخصوص تھا۔

مولانا محمد گل شیر شہید بھی شاہ جی سے اپنے تعلقِ خاطر کے لحاظ سے منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ مجلس احرار میں شمولیت سے پیشتر مولانا گل شیر شہید کے تاریخی کام کا دائرہ کار گجرات، راولپنڈی، جہلم، انکب، چکوال، میانوالی، بکھر، خوشاب، شاہ پور، سرگودھا اور مظفر گڑھ وغیرہ کے اضلاع میں پھیلا ہوا تھا اور وہ ان علاقوں میں اپنے اثر و رسوخ کے حوالے سے جانہاز مرزا کے بقول "مسلمانوں کے دلوں پر راج کرتے تھے"۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ مولانا گل شیر نے اصلاحِ رسوم و تبلیغِ اسلام، عورتوں میں بدوسے پر زور اور ان کے حقوق پر توجہ، ہندوؤں کے تہارت پر قبضہ کے خلاف تحریکات، مسلمان قبائل میں صلح و اتحاد، غریب مسلمان کاشتکاروں کی مالی امداد اور خاکسار تحریک کے عقائد و نظریات کی سرکوبی میں گزارا۔ اس وقت تک آپ سیاسیاتِ ہند میں وارد نہ ہوئے تھے۔ اور

انگریز پرستوں کے پھیلانے گئے پروپیگنڈے کے تحت آپ بھی مجلس احرار کو کانگریس کی زرخیز جماعت سمجھتے تھے۔ جب کبھی ان علاقوں میں شاہ جی یا مولانا حبیب الرحمن ندوی وغیرہ تشریف لاتے تو آپ دوسرے ہی روز اسی مقام پر جلسہ کرتے اور احرار رہنما کی تقاریر کے اثرات کو اپنی شعلہ بیانیوں سے ختم کر کے رکھ دیتے۔ شاہ جی بھی مولانا گل شیر کی اثر انگیز شخصیت کے معترف تھے اور ان کی عوام میں مقبولیت اور جادو بھری خطابت سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ یہاں تک کہ شاہ جی نے میانوالی کے ایک اجتماع میں مولانا کی عوام میں اثر پذیری کا اعتراف کر ڈالا اور سامعین سے فرمایا کہ:

”بھائی! تمہارا کیا اعتبار ہے تم تو ریت کے ٹیلے ہو۔ جب انگریز کے خلاف تمہارا ذہن تیار

کر کے چلا جاتا ہوں تو ایک تند و تیز بگوند آتا ہے اور تمہیں اڑا کر لے جاتا ہے۔“

ابھی تک ان دونوں رہنماؤں کی آپس میں کھیں ملاقات نہ ہو پائی تھی کہ غلط فہمیوں کے بادل چھٹے۔ ۱۹۳۸ء میں ہی عالمی سطح پر جنگ عظیم دوم کے آثار واضح ہو رہے تھے بڑی سیاسی جماعتیں ان اہم نوعیت کے فوجی اصطلاح پر نظر جمائے بیٹھی تھیں۔ لیکن مولانا کے ہوتے ہوئے یہاں کسی سیاسی جماعت کا قیام عمل میں نہیں آسکتا تھا۔ اب صرف ان کی ذات ہی اسیدوں کا مرکز تھی۔ کیونکہ آپ کا وزن جس پڑے میں جاتا وہی جماعت یہاں قدم جمانے میں کامیابی حاصل کر سکتی تھی۔ مگر آپ نے تمام جماعتوں کی دعوتوں کو یکسر مسترد کر دیا۔

جج کے ایام نزدیک آپکے تھے اور آپ اپنی تیاریوں میں مصروف تھے کہ اسی اثناء میں لاہور میں شاہ جی سے آشناسنا ہو گیا۔ شاہ جی بڑے تپاک سے ملے۔ دونوں طرف سے محبت بھرے جذبات کا سیلاب اسٹنڈ آیا۔ شاہ جی بالاخر دل کی بات زبان پر لائے اور آپ سے فرمایا کہ:

”گل شیر! میں تمہاری دینی خدمات سے کماحقہ واقف ہوں۔ تمہارا ہر دینی قدم مجھے بے حد عزیز

ہے۔ ہم سب کا مقصد خدمت اسلام ہے۔ اور نجیب منزل ایک ہے تو یہ دوری اچھی نہیں لگتی۔

ہمارے ساتھ مل کر تم اپنی خدمات کو وسیع پیمانے پر انجام دے سکتے ہو۔ میں ایک جہت کا اظہار اگلاس

موقع پر کر دوں تو شاید غیر مناسب نہیں کہ اب دین متین کی سب سے بڑی خدمت انگریز کو ہندوستان

سے نکالنے کے لئے جہاد کرنا ہے۔ کیونکہ اس نے ہند پر ہی تسلط نہیں جمایا بلکہ جزیرۃ العرب کو بھی اپنی

ہوس کا نشانہ بنایا ہے اور اپنے خود کاشتہ پودے سے قادیانیت کے ذریعے دین مصطفیٰ ﷺ میں نقب

لگائی ہے۔ مسد ہو کر ہی لٹتے ہوئے غریب الوطن دین کا دفاع کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ ہمارا ساتھ دیں تو

دشمن منہ کی کھائے گا (ان شاء اللہ)

مولانا گل شیر نے شاہ جی کی گفتگو سن کر عرض کیا:

”حضرت! آپ کا فرمان بجا ہے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میں آیا تو باجماعت آؤں گا۔ میں نے دیگر

کئی دعوتوں پر غور کیا ہے۔ نہ معلوم کیا بات ہے کہ جب سوچتا ہوں تو ذہن ساتھ نہیں دیتا۔ یوں

موسس ہوتا ہے کہ کوئی کلمہ رہا ہے کہ:

”گل شیر! ابھی وہ گھڑی نہیں آئی“ میں کیا جانوں کہ وہ گھڑی کب آئے گی۔“



اس بات چیت کے بعد مولانا گھر واپس تشریف لے آئے۔ یہ ۱۹۳۸ء کے آخری دن تھے جنوری ۱۹۳۹ء کے اوائل میں آپ حج بیت اللہ کے لئے عازم سفر ہو گئے۔ آپ کے ہمراہ مولانا قطب الدین آف غور عسکری، مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا غلام اللہ خان اور مولانا قاضی زاہد الحمیدی بھی زائرینِ حرمین تھے۔ مولانا نے روضۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ بارگاہِ ایزدی میں شہادت کی موت کے لئے دعاء کی اور اسی مقدس مقام پر رب العزت کے حضور گڑگڑا کر عرض کیا کہ:

”اے اللہ! میرا تعلق اس جماعت سے جو ڈوے جو خالص تیری رضا اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ

وسلم کے دین کی سر بلندی کے لئے مصروف عمل ہو۔“

آپ گھر سے یہ ارادہ باندھ کر چلے تھے کہ: ”روضہ رسول ﷺ سے جواب لے کر ہی لوٹوں گا۔“ دعاء مستجاب ہوئی اور آپ وہیں زیارتِ حبیب کبریٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب ہوئے جیسا کہ احرار میں شمولیت کے بعد ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ:

”مجھے احرار کے شیخ پر دلی مسرت ہوتی ہے کہ میں یہاں آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ مجھے لانے والا کوئی جھوٹی حیثیت کا مالک نہیں بلکہ میں سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا مامور ہوں اور فرض کی بجا آوری کو ہی اپنا فرض خیال کر کے کام میں مشغول ہوں۔ مجھے اس بات کا حکم میرے آکا صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت دیا جب میں اُن کی ادب گاہ کے زائر کی حیثیت سے مدینۃ النبی ﷺ میں مقیم تھا۔ رات سویا تو خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور ارشاد فرمایا:

”گل شیر! اگر اسلام کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہو تو جاؤ ہندوستان میں احرارِ اسلام کے ساتھ تعاون

کرو۔“ (روزنامہ ”آزاد“ لاہور ”احرار نمبر“ ۲۷ ستمبر ۱۹۵۸ء ص ۳۶)

اس واقعہ کے ساتھ ہی آپ کی فکر و نظر کے زاویے تبدیل ہو گئے۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں وطن واپس آئے چند دن گاؤں (ملہوالی ضلع ایک) میں گزار کر دفتر احرار لاہور میں تشریف لے گئے۔ حضرت شاہ جی جی نے احباب کے ہمراہ دفتر میں موجود تھے۔ آپ کی دفتر میں غیر متوقع آمد پر حیرت و تہمت اور مسرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ آپ کا استقبال کیا گیا۔ آپ اور دفتر احرار؟ یہ جوڑ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مولانا نے مہر سکوت توڑتے ہوئے یہ منتر النبی میں پیش آنے والا واقعہ سنایا اور اپنی خدمات مجلس احرار کے لئے پیش کرنے کا اعلان کیا تو شاہ جی نے آپ کو سینے سے چٹا لیا اور شاہ جی پر گرہ طاری ہو گیا۔ آپ کی احرار میں شمولیت پر برہمی خوشیاں منائی گئیں۔ مولانا احرار رہنماؤں سے ملنے کے بعد اپنے علاقے میں مجالس احرار کے قیام کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔ یہ وہ دور تھا جب فرنگی کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا۔ اور ان مصوص اصطلاع میں جہاں مولانا اثر و رسوخ رکھتے تھے انگریز اور اس کے حاشیہ برداروں کی عوام پر اتنی مضبوط گرفت تھی کہ کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ مجلس احرار اسلام اسی حریت پرور جماعت کا نام ہی سرمایہ پرستوں کے لئے کھلا چیلنج تھا۔ ان جاں سوز حالات میں مجلس احرار کے پلیٹ فارم سے مولانا کا ابھرنا کسی بڑے خطرے سے خالی نہ تھا۔ لیکن آپ نے آکا نے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بجا آوری میں اس راہِ عزیمت میں لہنی جان تک لڑادی۔

آپ کی دعوت و انتظام کے نتیجے میں ۳،۲،۱ جون ۱۹۳۹ء کو ڈسٹرکٹ احرار کانفرنس پنڈی گھیب ضلع ایک میں انعقاد پذیر ہوئی۔ مولانا مظہر علی اعظم اور شاہ جی نے مختلف نشستوں سے خطاب کیا۔ ایک نشست کی صدارت پیر لال بادشاہ آف بکھٹ نے کی اور یونینٹ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک بھی پیش کی۔

اس کامیابی کے بعد احرار رہنماؤں کی یہاں آمد و رفت میں حائل تمام رکاوٹوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ۲۱ تا ۲۹ جولائی ۱۹۳۹ء کو آپ کے پروگرام کے تحت مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی قاضی احسان احمد شجاع آبادی حضرت شاہ جی اور خواجہ عبدالرحیم عاجز امر کسری نے ضلع میانوالی میں پانچ بڑے اجتماعات سے خطاب فرمایا۔ اور تحریک فوجی بھرتی بائیکاٹ کے سلسلے میں عوامی اذہان کو بیدار کیا۔

۳۱، جولائی ۱۹۳۹ء کو ڈسٹرکٹ احرار کانفرنس ملہوالی ضلع ایک اپنے گاؤں میں منعقد کی۔ شاہ جی اور مولانا لدھیانوی نے فوجی بھرتی کے خلاف مہم کو تیز تر کرنے کے لئے اپنی تمام تر شعلہ گفتاری سے کام لیا۔

ان اجتماعات کے انعقاد پذیر ہونے کے ساتھ ہی مولانا گل شیر اس علاقے میں بالخصوص اور ہندوستان بھر میں بالعموم احرار کے مشن کو لے کر اٹھے اور غلامی کی تاریکی میں غرقاب قوم کو لیلانے آزادی سے روشناس کرانے میں دیوانہ وار مصروف ہو گئے۔

مذکورہ بالا اجتماعات کے بعد شاہ جی مولانا کو اپنے ساتھ لاہور لے گئے تھے اور ایک جلسہ عام میں مولانا کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ!

"آج میں اپنے نال اک ہور جنا لے کے آیا ہوں۔"

کہ "میں آج اپنے ساتھ ایک اور مرد لے کر آیا ہوں" لفظ "جنا" ان علاقوں میں بہادر شخص کے لئے بولا جاتا ہے۔

شاہ جی اور مولانا کا تعلق ایسا جڑا کہ موت کا عارضی وقفہ ہی انہیں کچھ وقت کے لئے جدا کر سکا۔

اللہ کریم نے شاہ جی اور مولانا میں بعض مشابہتیں بھی پیدا کر دی تھیں۔ شاہ جی کی کیفیت آہ اور وجد آہیں قرأت نے ایک عالم سے خراج وصول کیا تھا۔ یہی حال مولانا کی ملکوت کا بھی تھا۔ شاہ جی نے اس سوال پر کہ "آپ کو کبھی کسی کی ملکوت نے متاثر کیا؟" فرمایا کہ:

"مجھے اپنے ساتھیوں میں سے مولانا گل شیر خان شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ملکوت کلام الہی نے بے حد متاثر کیا۔ مولانا کی ملکوت قرآن حکیم سُن کر لوگ بے مدھ ہو جاتے تھے۔ مجھے آج تک کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں مل سکا جس کی ملکوت اتنی موثر اور کیفیت آور ہو۔"

یہی صورتِ تقریر کی تھی۔ شاہ جی اور مولانا کی تقریر میں حیرت انگیز مشابہت نظر آتی تھی۔ جس پر مرکزہ مجلس احرار ہند کو یہ سرکلر جاری کرنا پڑا تھا کہ:

"تأملت جماعتیں متوجہ ہوں کہ ایک ہی جملے میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا گل شیر خان کو مدعو نہ کیا جائے۔"

اسی وجہ سے دونوں حضرات کی تقاریر کی مثال ایک مقام پر کم ہی ملتی ہے۔ جس شہر میں مولانا گل شیر تاریخ دے دیتے اور منتظمین شاہ جی کو مدعو کرنا چاہتے تو شاہ جی سختی سے یہ کہہ کر انکار فرما دیتے کہ:

”مولانا گل شیر کے ہوتے ہوئے میری ضرورت نہیں ہے۔“

جو قلبی موافقت کا بھی بھرپور اظہار و اعتراف ہوتا تھا۔

۱۹۴۳ء میں آل انڈیا احرار کانفرنس گوجرانوالہ میں شاہ جی اور مولانا اتفاق سے اکٹھے ہو گئے شاہ جی کی صدارت

تھی مولانا کی خطابت نے وہ سماں باندھا کہ شاہ جی وجد میں آگئے اور وارفتگی سے اٹھ کر آپ کا ماتھا چوم لیا۔

۱۹۳۹ء میں شاہ جی پر مشہور زمانہ مقدمہ بغاوت ”لدا حارام کیس“ قائم کیا گیا لیکن آپ باعزت بری کر دیئے

گئے۔ اسی دوران مولانا پر بھی ایسا ہی ایک مقدمہ سکندر وزارت نے بنانا چاہا۔ لیکن آپ کے بیانِ صادق نے اُن کی تمام آرزوں کو خاک بسر کر دیا۔

جن دنوں شاہ جی مذکورہ مقدمہ میں رہا ہوئے تھے اس دوران سر سکندر حیات کا بیٹا سردار شوکت حیات مضر

میں جنرل رو میل کی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ سکندر حیات خان بیٹے کی رہائی کے لئے مصر گئے۔ اس واقعہ اور

شاہ جی کے مقدمہ کو مولانا نے بڑے خوبصورت پیرائے میں چنیوٹ کے ایک جلسہ عام بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

”دیکھ میرے مولادے رنگ تھو وزیر داپتر اسیر تھی گیتے جنوں توں پھانسی لگوانا چاہندا اسی او

ضیاء اللہ شاہ داپتر عطاء اللہ شاہ رہا تھی گیا۔“

چینا      انج      چھوٹا      یار  
مولانا      مولد      گھم      مریدا      یار

(میرے اللہ کے رنگ تو دیکھ کہ تم وزیر اعظم (سکندر حیات) کا بیٹا گرفتار ہو گیا لیکن سید ضیاء اللہ شاہ

بخاری کا بیٹا سید عطاء اللہ شاہ بخاری جنہیں تم پھانسی لگوانا چاہتے تھے رہا ہو گئے)

سکندر حیات چونکہ جرجل سے بیٹے کی رہائی کے لئے مصر گئے تھے۔ حج کے ایام قریب تھے۔ وہ حج پر نہ گئے۔

اس پر مولانا نے انور صابری مرحوم کی یہ رباعی پڑھی تو مجمع تڑپ اٹھا۔

حرم کو بندہ لات و منات کیا جانے

خدا کے گھر کو سکندر حیات کیا جانے

کسی غریب کی اختر شمار یوں کے مزے

نہ جس نے رو کے گزاری ہو رات کیا جانے

مولانا اور شاہ جی میں محبت و الفت کا بھی عجیب ہی سلسلہ تھا۔ ریل و جیل کی صعوبتوں سے کبھی فرصت

ملتی تو شاہ جی دفتر احرار لاہور میں شعر و ادب، دین و سیاست کے ساتھ ساتھ بذلہ سنبی اور چٹکھ بازی کا وہ میدان گرم

کرتے کہ اللہ ان اس مفضل میں اگر مولانا تشریف لے آتے تو سب حضرات خصوصاً شاہ جی دیکھتے ہی احتراماً خاموش

ہو جاتے۔ لیکن کب تک! شاہ جی تو رو توں کو ہنسانے والے تھے۔ ہلا کیوں کر چپ بیٹھتے۔ کچھ دیر بعد اوہ کوئی

دوست بات چھیڑتا اور شاہ جی کو پھر کٹنا ہوا لطیفہ برآمد ہوتا اور ٹوٹا ہوا سلسلہ دوبارہ جڑ جاتا۔ مولانا بھی شریک ہو جاتے

اور مفضل لوٹ لوٹ ہو جاتی۔

مولانا کے دل میں شاہ جی کی عظمت کا نقش کچھ اس طرح بیٹھ گیا تھا کہ تا دمِ واپس کسی کے مقابلے نہ مٹ

سکا۔ یہی حال شاہ جی کا تھا۔ وہ جب کبھی ماضی کی یادوں کو کریدتے مولانا کا تذکرہ لازماً آتا۔ اور وہ تاویر مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بنائے رکھتے۔ ان دونوں شخصیتوں میں انس و محبت کی جو فضا قائم تھی وہ ہر دو کے خلوص و بے غرضی کی بنیاد پر تھی۔ اس پر ایک ہی مقصد کی لگن اور ایک ہی منزل کی جستجو نے قربتوں کے مزید سامان میسر کر رکھے تھے۔ دو عزیز ترین ساتھی تو شاہ جی نے اپنے پالنہار سے مانگ کر لیے تھے۔ ایک بقول ابو یوسف قاسمی مرحوم کے چودھری افضل حق اور دوسرے بقول مولانا عنایت اللہ چشتی کے مولانا گل شیر خان دونوں احباب سے شاہ جی کا تعلق دیگر رہنماؤں سے الگ نوعیت کا تھا۔ اور ان دونوں کی اچانک رحلت و شہادت نے شاہ جی کی صحت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

برصغیر کے قومی و سیاسی حالات اتنے گھمبیر ہو گئے تھے کہ احرار رہنماؤں کو بھی اتنی ہی شدت سے آزادی کی جنگ کو تیز تر کرنے کے لئے اس کماری سے پشاور تک ہر محاذ پر دادِ شجاعت دینا پڑ رہی تھی۔ اور انہیں مہینوں بچوں کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔

اور مولانا گل شیر خان اپنی جان کو لاحق تمام خطرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اعلان و اظہار حق کے لئے طویل دوروں میں مصروف تھے۔ آپ نے ۲۶، ۲۷ اگست ۱۹۴۳ء کو دو روزہ حکومتِ اُردو کانفرنس تہ گنگ صلیج ایک میں شرکت فرمائی۔ جناب کپتان غلام محمد صاحب (آف چکڑالہ صلیج میانوالی) کی روایت ہے کہ مولانا نے اس کانفرنس میں فرمایا کہ:

”مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ پھر میں کبھی تہ گنگ نہیں آسکوں گا۔ یہاں میری یہ آخری تقریر ہے۔ ہاں میرے بعد شاہ جی یہاں آئیں گے اور تمہیں قرآن سنائیں گے۔“

اور یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد آپ تہ گنگ شریف نہ لاسکے۔ شاہ جی کے بارے میں آپ کا مندرجہ بالا جملہ شاہ جی سے آپ کی سچی محبت کا ترجمان ہے۔

مولانا گل شیر احرار میں شامل ہونے ہی تحریکی کاموں میں ایسے مصروف ہوئے کہ غرضاً کے لمحات بہت ہی کم نصیب ہوئے۔ اب مرکزی مجلسِ عاملہ کے اجلاسوں یا مرکزی اجتماعاتِ احرار کے موقع پر ہی شاہ جی سے ملاقات ہوتی۔

۱۹۳۹ء میں احرار نے فوجی بھرتی بائیکاٹ کی تحریک چلا رکھی تھی۔ مولانا نے اس تحریک کو اپنے اصل صلح میں اتنے زور و شور سے ہوا دی کہ فرنگی اور فرنگی نواز حلقے ہو کھلا گئے۔ مولانا نے فوجی بھرتی میں اتنی مضبوط رکاوٹیں کھڑی کیں کہ انگریز کو یہاں سے جنگِ عظیم اول (۱۹۱۴ء) کی نسبت جنگِ عظیم دوم (۱۹۳۹ء) میں بہت کم فوجی رنگروٹ ہاتھ آئے۔ جس پر جاگیردار عناصر کے مفادات کو بھی سخت دھچکا لگا اور انگریزی دربار میں اُن کے علانہ و قار کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ علوہ ازیں مولانا نے سینکڑوں مقامات پر مجالسِ احرار کا قیام عمل میں لایا۔ جس کے نتیجے میں عوام میں آزادی کا شعور جاگا اور وڈیروں کو مظلوم عوام پر سے اپنا دبدبہ و دہشت بکھرتا ہوا نظر آیا۔ اس پر ستراد مولانا کا کالا باغ سے غریب کمیونوں کے شہری و سماجی حلقوں کے تحفظ و بحالی کے لئے آواز اٹھاتا تھا جس پر کالا باغ کے رئیس کو اپنا حاکمانہ غرور خاک میں ملتا ہوا دکھائی دیا۔

مولانا گل شیر کے ان اقدامات نے وڈیوں کی خیندیں حرام کر دیں۔ نخت و نکیر اور ظلم و ہیبت کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بجائے اس کے کہ مولانا کے کئے گئے عوامی و سماجی کاموں کی قدر کی جاتی۔ عقیدت و محبت بھری نگاہیں ان کے فرشی راہ کی جاتیں لیکن جبر و تشدد اور سفاکی و درندگی نے ہار کب مانی ہے کہ اس سے سُر پر غرور ہر حال ختم کرنا ہی پڑتا ہے۔ انگریز، ہندو اور فرنگی کے چھیٹے فرزند نواب اسیر محمد خان آف کالا بارغ کے شیطانی منصوبے کے تحت بالآخر ۲۴، ۲۳ مئی ۱۹۴۴ء کی درمیانی شب مولانا کو اپنے گھر میں سوتے میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

اس دوران شاہ جی سرسہ صلع حصار (انڈیا) کے دور سے پر تھے۔ رات کے چلے سے پہلے آپ کو اس اہم قومی و دینی حادثہ اور عزیز ساتھی کی اچانک رحلت کی اطلاع ملی۔ اور آپ اس صدمے کے زیر اثر بغیر تقریر کئے امرتسر روانہ ہو گئے۔

مولانا کی شہادت کی خبر ملتے ہی مرکزی دفتر احرار لاہور میں پرچم احرار سرنگوں کر دیا گیا اور صدر مرکز یہ احرار نے پنجاب بھر میں ۱۰ جون تا ۱۰ جولائی مولانا کی یاد میں احرار اجتماعات منعقد کرنے کا حکم دے دیا۔

مولانا گل شیر شہید کی جدائی کا صدمہ شاہ جی کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ یہ شاہ جی کے لئے نہ صرف محبوب رفیق کی فرقت کا غم تھا بلکہ انگریزی استعمار کی کمین گاہوں یعنی ان فوجی اضلاع میں جاگیر داری کے خلاف ایک توانا آواز کا خاموش کر دیا جانا شاہ جی کے لئے بار خاطر تھا۔ انگریز کے گماشتوں کی اس سفاکانہ واردات پر شاہ جی شعلہ جوالہ بنے ہوئے تھے۔ آپ نے ۲ جون ۱۹۴۴ء کو فیصل آباد میں "یوم گل شیر" سے خطاب کیا اور نواب آف کالا بارغ کو مولانا کے قتل کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"اے اسیر محمد خان! تو نے ایک مسلمان، حافظ قرآن، اسلام کے مسلخ اور سیر بے رفیق مولانا گل شیر خان کو اپنے راستے کا کاٹنا سمجھ کر قتل تو کر دیا لیکن یاد رکھنا تیری قبر بھی تبھ کو پناہ نہ دے گی۔"

شاہ جی کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور نواب کالا بارغ اپنے ہی بیٹے کے ہتھوں مارا گیا۔ لیکن بظاہر اس کے قاتلوں کی نشاندہی قانون کے ہاتھوں نہ ہو سکی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ آج نواب کی قبر کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ کالا بارغ کے نواح میں یہ بات مشہور ہے کہ نواب کی لاش کو دریائے سندھ کی موجوں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

و اللہ عزیز ذو انتقام

"اور اللہ ہی زبردست انتقام لینے والا ہے۔"

شاہ جی "یوم گل شیر" کے سلسلہ میں مولانا کے صلع انجھ میں شریف لائے۔ اور ۹ جولائی ۱۹۴۴ء کو تحصیل تہ گنگ کے گاؤں "لاوہ" میں مسجد بابیاں والی میں خطاب فرمایا۔ شاہ جی کی یہ تقریر ان کے دلی جذبات، غیرت دینی اور حزن و ملال کا اظہار تھی۔ آپ نے شہادت گل شیر کا پس منظر اور پیش منظر بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"مولانا گل شیر خاندان اسلام کے وہ عظیم بیٹے تھے جنہیں احرار میں شہرت کا حکم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں فرمایا۔ اس سے بڑھ کر ان کے لئے کون سی سعادت و خوش بختی ہو

سکتی تھی۔ وہ آج جس مقام اعلیٰ پر فائز ہو چکے ہیں وہ ہماری مدح و توصیف کا محتاج ہی نہیں ہے۔  
 مولانا گل شیر کا یہی ایک قصور تھا کہ انہوں نے سامراجی غلامی کے گھٹے ہوئے اس علاقے میں اللہ کی حاکمیت کا پرچم بلند کیا۔ اور فرنگی اور اس کے خواجہ تاشوں کی اندرون خانہ گھنواؤنی سازشوں کو بے نقاب کیا لیکن افسوس کہ ملک و ملت اور دین اسلام کے درد میں ڈوبی ہوئی صدائے گل شیر پر لبیک کہنے کی بجائے خود انہیں ہی راستے ہی ہٹا دیا گیا۔ کتنے بد نیت تھے وہ لوگ! جنہوں نے ان کے خون بے گناہی سے اپنے ہاتھ رنگے اور کیسا خوش قسمت ہے گل شیر! کہ جسے دین حق کی خاطر شہادت عظمیٰ نصیب ہوئی۔  
 ہائے گل شیر! مجھے اپنی آرزوؤں کی سراج مل گئی۔ لیکن شہادت کا جام اپنے تک ہی کیوں رکھا۔  
 میں نے سنا تھا کہ اعوان بہت سخی ہوتے ہیں لیکن تو تو بنیل ٹلا۔ اگر اپنے لئے شہادت کی دعا مانگی تھی تو میرے لئے کیوں نہیں مانگی۔ ہاں! جس جانور میں کوئی نقص ہو وہ قربانی پر نہیں لگتا شاید۔۔۔۔۔ میں ہی اس قابل نہ تھا کہ میرے جسے میں بھی شہادت آتی۔ (یہ کہتے ہی شاہ جی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور سارا مجمع بھی انکسار ہو گیا۔ طبیعت سنبھلی تو فرمایا)

گل شیر کا قتل معمولی قتل نہیں ہے کہ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ گل شیر خان کا خون رنگ لا کر رہے گا۔ پھر تمہاری نوابی اور سرداری بھی تمہارا تحفظ نہیں کر سکے گی۔

گل شیر نے انگریز کو غائب اور تم جاگیر داروں کو وطن کا غدار کہا اور تمہارے کہ تو توں کا پردہ چاک کیا۔ لو سنو! آج اسی مقام پر جہاں گل شیر نے تمہیں لٹکا رہا تھا اور تمہیں قوم و ملک کا بے وفا اور نمک حرام قرار دیا تھا بخاری بھی تمہیں اور تمہارے فرنگی آکا کو ڈنکے کی چوٹ غائب، شیرا، غدار، ٹوٹھی، دین محمد ﷺ، دشمن اور است محمد یہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا باغی کہتا ہے۔ تم نے جو تعزیر مجھ پر جاری کرتی ہے ابھی کر لو۔ سید حاضر ہے۔

اے فرنگی زادو! تمہاری حیثیت و اہمیت مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ فرنگی کی چو کھٹ پر جبہ سائی اور زلہ ربانی تمہارا کردار رہا ہے۔ تم وہی ہو جنہوں نے کعبۃ اللہ کی مقدس دیواروں اور سید عبدالقادر جیلانی کے مزار کو لپسی گولیوں سے چھلنی کیا ہے۔ انگریزی حکومت کو مضبوط کر کے قوم کی عزت و آبرو کو گروی رکھ دیا ہے۔ وقت کے کسی فرعون و ہامان کا رعب و رعوت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم حرار ایک بات جانتے ہیں کہ حکم بھی اللہ کا ہے اور زمین بھی اللہ کی ہے۔ جب تک آزادی کامل کا سورج طلوع نہیں ہو جاتا احرار کا ہر گل شیر انگریز اور اس کے زرخیز غلاموں کی دسیہ کاریوں کی راہ میں رکاوٹ بنتا رہے گا۔ چاہے کچھ ہو جائے ہمارا کارواں اسی خلوص اور لگن سے چلتا رہے گا جس طرح مولانا گل شیر نے زندگی کی ہر گھڑی و ساعت کو دعوت حق کی خاطر صرف کیا۔

"آئیں جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی"  
 ۱۱ جولائی ۱۹۴۴ء کو ڈسٹرکٹ احرار کانفرنس مسجد عید گاہ تہ گنگ (ضلع انک) تب میں منعقد ہوئی جس کے مہمان خصوصی شاہ جی تھے۔ خطبہ استقبالیہ مولانا محمد علی جالندھری نے پیش کیا جبکہ دیگر مقررین میں مولانا مظہر علی

اعظم، مولانا عبد الرحمن میانوٹی، مولانا عبد الرحیم جوہر جہلمی، حافظ عزیز الرحمن، جانیہاز مرزا، مولانا محمد باز گل، غلام محمد ہاشمی، کپتان غلام محمد اور رفیق غلام ربانی شامل تھے۔

شاہ جی جب بھی ان اصلاح میں آئے گل شیر شہید کو ہمیشہ یاد کیا۔ شاہ جی اور گل شیر خان میں جو بدنی رشتہ قائم ہوا تھا وہ اللہ کے فضل سے آج بھی قائم ہے۔ شاہ جی کی لمبی و روحانی اولاد اور ان کی محبوب جماعت مجلس احرار اسلام آج بھی اُس تعلق کو برقی پارودی و استقامت سے نبھا رہی ہے۔ اور مولانا شہید کے نام و کام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ آغا شورش کاشمیری نے مولانا کی شہادت پر خوب لکھا تھا کہ:

”آپ کی شہادت سے اس ویرانہ آباد میں استقامت کا چراغ روشن ہوتے ہی بجھ گیا اور اس قیمتی انسان کے اٹھ جانے سے ایک ایسی جگہ خالی رہی کہ نہ احرار میں اس قسم کا انسان دوبارہ آسکا نہ کیمپلور کی مٹی ہی سے کوئی ایسا شخص اٹھا۔“

اور یہ تمی بھی ایک ناقابل تردید حقیقت کہ مولانا کے بعد اگرچہ مجالس احرار نے ان علاقوں میں کام کی رفتار کو کم نہ ہونے دیا لیکن اس کے وہ اثرات ظاہر نہ ہوئے جن کی توقع صرف مولانا سے ہی کی جاسکتی تھی۔ ان کی شہادت کے بعد یہ علاقہ ایسی محو میں کی گرداب میں آگیا کہ کوئی مضبوط قیادت اب تک سامنے نہیں آسکی۔

مجلس احرار اسلام کے سٹیج سے ہی مولانا شہید کا نام سننے میں آتا رہتا ہے۔ جبکہ دیگر وہ پیشہ ور مولوی اور نام نداد قومی و سیاسی قائدین جنہوں نے مولانا کے نام پر اپنے جہنم کا ایندھن سمیٹا اور اب تک انہی کے واسطے سے مفادات حاصل کر رہے ہیں۔ انہیں کبھی یہ توفیق بھی نہ ہوئی کہ وہ گزشتہ اڑھائی برس میں بمحض ایک دن ہی مولانا شہید کی یاد میں کسی کارز میٹنگ کا اہتمام ہی کرتے لیکن خوش قسمت کہ یہ سعادت صرف مجلس احرار اسلام کے ہی حصے میں آئی کہ انہوں نے مولانا کے بعد ان کے مشن کو زندہ رکھا اور تمام تر حق و دانیوں کے باوجود صحیح سمت میں کاروائی آگے بڑھایا۔ جس کی نشاندہی مولانا کر گئے تھے۔ اور محمد لطف اسی کا اثر ہے کہ نصف صدی بیت جانے کے بعد بھی ان کی یاد زندہ و تابندہ ہے۔

لیکن میرے دل کی اتنا گھمرائیوں میں ایک آرزو ہے جو برسوں سے ڈیرے ڈالے ہوئے ہے کہ ایسے کاش! مولانا شہید کے اپنے خاندان میں سے کوئی ایسا رجل رشید اٹھ کھڑا ہو جو ان کی محبوب جماعت، جس کے لئے انہوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پاک پر اپنی جان کا نذرانہ تک پیش کر دیا تھا۔ کا سرخ پرچم تمام کر میدان عمل میں نکل پڑے۔ اور مولانا کی چھوٹی دینی و خانہ دانی وراثت کا امین ہو۔ آمین بجاہ النبی اکرم و آکر واصحابہ اجمعین۔

وگرنہ مولانا تو آج بھی غالب کی زبان میں کہہ رہے ہیں:

کون ہوتا ہے حریف سے مرد انگن حق  
سے مکر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اللہ کریم ہمیں شاہ جی اور مولانا گل شیر شہید کے مشن کے ساتھ تا دم آخریں وفا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارا شرو و نشر بھی انہی برگزیدہ ہستیوں کے ہمراہ کرے۔ آمین۔

## یاد پارینہ

عزیز بھائی جانباز صاحب السلام علیکم،

تینوں یاد ہووے گا جد قادیاں کا نفرنس ہوئی تے اوتھے نظم توں وی پڑھی  
 تے میں وی پڑھی۔ جیہڑی امیر شریعت خلد مکانی نے اوتھے تقریر کیتی اوہدے  
 بارے شاہ جی تے اک مقدمہ قائم کیتا گیا تے انہاں دنال دے بعد روزیاں وچ جمعہ  
 الوداع گورداس پور وچ شاہ جی نے پڑھایا تے قریباً لکھ آدمی نے شاہ جی دی بیعت  
 کیتی، کیونکہ فرداً فرداً بیعت کرنی مشکل ہو گئی سی، ایس واسطے شاہ جی نے حکم دتا کہ  
 اک پگ والے مینوں پھر ڈایو تے اگوں اوس پگ نال ہور لگاں۔ سہی جاو۔ تے پگاں دا  
 اک جال مسلماناں دے سراں تے بن گیا سی تے شاہ جی حکم دتا کہ جتھے جتھے وی کے  
 دا پگ نوں ہتھ پیندا ہے ہتھ پالے میں اکو واری سبھناں دی بیعت لیناں وال تے  
 ہر شخص نے حکم سن دیاں پگاں نوں ہتھ پالے تے شاہ جی نہیں بیعت لئی، ایہ وی اک  
 عجب منظر سی۔ سبھ تھیں پہلے مینوں نظم پڑھن دا حکم ہویا، مینوں یاد دے تینوں وی  
 یاد ہوویگا کہ میرے نظم پڑھن ویلے ہزار ہا مخلوق خدا روندی سی پسی میں ایہہ پرانی  
 نظم ایس کر کے بھیج رہیاں تہاں کہ پرانی یاد تازہ ہو جائے میں انشاء الرحمن اج تیکر  
 اوس بیعت تے قائم ہاں۔ تے او نظم پیش کرناں،

عطاء اللہ کی جاندا ہے ایس قید دی زنجیر نوں ختم الرسل اوندائے بس اکو عربی پیر نوں  
 اک طرف آل نبی تے اک طرف آل یزید کلمہ پڑھ مٹا دے تے تیر پے شبیر نوں  
 گود وچ چھ ماہ دے پچے مذہب لئی ایہہ دسیا دودھ دی تھاں تے جھناں لُج ظالماں دے تیر نوں  
 گل حق دی دسی جاتیگاں دے میدان چہ شرف مولا بخشیائے ایہہ فاطمہ دے شیر نوں  
 جال پگاں دا بنا اج بیعت لئی شاہ جی جے توں

کر دعارب قائم رکھے ایس تے عاجز میر نوں (میر محمد دین میر جلالپوری)



## شاہ جی کی باتیں خوبصورت یادیں

میں تو کسی کا نقش قدم بن کر مٹ گیا مجھ سے نہ پوچھئے کہ گیا کارواں کہاں

امیر شریعت کو میری زندگی میں مرکزی روح (RULING SPIRIT) کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام تھے۔ وہ اس عہد کے سب سے بڑے مہربان رسول ﷺ تھے۔ انہوں نے جب رسول ﷺ میں ڈوب کر سنت صدیق اکبر ادا کی اور حضور ختم المرسلین ﷺ کی ختم نبوت پر حملہ کرنے والے غاصبوں اور گروہ کٹوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کیا۔ اور اپنے پیچھے مجاہدین احرار کی ایک ایسی جماعت چھوڑ گئے۔ جس کا لوڑھنا پھونکا جب نبی ﷺ ہے۔ اور جو حضور ﷺ کی ختم نبوت کا ہر دوں میں دفاع کرتی رہی ہے۔ اور کرتی رہے گی۔ شاہ جی نے جس دور میں کولہنی جدوجہد کا آغاز کیا وہ برہمچاری سے ایک مشکل دور تھا۔ ایک طرف انگریزی حکومت کا جبر و استبداد زوروں پر تھا۔ تو دوسری طرف پنجاب کے جاگیرداروں اور زمینداروں کا گروہ احرار کی تحریک کے اسلئے حلف تھا۔ کہ اس نے غریب مسلمانوں میں جیسے کا حوصلہ۔ جب نبی ﷺ کا ولولہ اور غیر ملکی حکومت کو برصغیر سے نکال باہر کرنے کا بے مثال جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ شاہ جی اور احرار غریب اور متوسط مسلمانوں کے نمائندہ تھے۔ جنہوں نے قرآن اور حدیث کو لہنی جدوجہد کا رہنما بنا کر اس قدر طویل اور شاندار تاریخ حریت مرتب کی۔ کہ آج اور کل کا مورخ ان کا تذکرہ اور اعتراف کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ شاہ جی برہمی جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ فقہ میں امام ابو حنیفہ کے معتد۔ مسلک ولی اللہی پر کاربند اور اکابر و اراکین العلوم و دیوبند کے ہم فکر تھے۔ اپنے عقائد میں بڑے راسخ اور مضبوط تھے۔ اور عقیدے کے معاملے میں فرمایا کرتے تھے۔ کہ میرے عقیدے میں تین چیزیں شامل ہیں۔

(۱) قرآن سے محبت (۲) ختم نبوت کا تمنا (۳) انگریز سے نفرت۔

شاہ جی کو ایک بار ملنے اور دیکھنے کے بعد بڑے بڑے مخالفت بھی ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ برصغیر کی بعض ممتاز شخصیتیں۔ اختلاف فکر و نظر کے باوجود ان کا احترام کرتی تھیں۔ اور ان سے باقاعدہ ملاقات کے لئے اہتمام کرتی تھیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ ان کی بے حد قدر کرتے تھے۔ اقبال کا شعر شاہ جی کی شخصیت پر کتنا صادق آتا ہے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اچھا جلا رہا ہے وہ مرد درویش دیے ہیں حق نے جس کو دیے ہیں انداز خسروانہ

شاہ جی کے توسط سے حضرت علامہ اقبالؒ علما نے دیوبند کے بہت قریب ہو گئے تھے اور بعد میں حضرت محدث العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے تہر علی کے تو وہ بہت معتد ہو گئے تھے۔ مشہور انگریز مورخ سر جان گنتھر جب ہندوستان کے دورے پر آیا۔ تو اس نے اسی عظیم مجاہد آزادی کو دیکھنا اور ملنا چاہا مگر شاہ جی ان دنوں راولپنڈی جیل میں تھے۔ اس نے اپنی کتاب "INSIDE INDIE" میں شاہ جی کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے

لکھا ہے۔

”یہ شخص اگر انگلستان میں پیدا ہوتا، تو اس کی تصویریں کلیساؤں میں لگائی جاتیں۔“

۱۹۴۶ء میں شاہ جی دہلی میں مقیم تھے اور میر احمد حسین شملوی کے مکان پر قیام فرماتے۔ جواہر لال نہرو وہاں ملنے آئے اور ویر تک رسمی خیر خیریت اور غیر رسمی سیاست کی باتیں ہوئی رہیں۔ پھر عزیز الرحمن جاسی پہنچے کہ ماما گاندھی ملنا چاہتے ہیں۔ فلاں وقت اور فلاں دن۔۔۔۔۔ شاہ جی مقررہ دن مانگہ پر بیٹھ کر اپنے دوستوں کے ساتھ انہیں ملنے گئے۔ بھنگی کالونی دہلی میں گاندھی جی کا قیام تھا۔ وہاں پہنچے تو باہر چارپائی پر خان بادشاہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے گفٹ لگایا، پھر شاہ جی گاندھی جی کو ملنے اندر چلے گئے۔ جہاں بقول شورش کاشمیری، سورۃ فاتحہ اور سورۃ اعراس کے ترجمے اور تفسیر ہی ہیں وقت کٹ گیا۔ یہ دونوں سورتیں گاندھی جی اپنی پرارتنا میں پڑھتے تھے۔

اسی طرح امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد۔۔۔۔۔ شاہ جی کو دعوت دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جامعہ ندیہ کے میدان میں رات کو شاہ جی کا جلسہ تھا۔ جس میں انہوں نے وارث شاہ کے کچھ حسب حال پنجابی اشعار سنائے۔ دہلی والوں نے اسے گالی سمجھا۔ کسی نے امام الہند سے تذکرہ کیا کہ رات عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایسی تقریر میں گالیاں دی ہیں۔

اگلے روز شاہ جی مولانا کے ہاں ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ تو مولانا نے فرمایا ”شاہ صاحب سنا ہے آپ تقریر میں گالی بھی لٹکا دیتے ہیں“

”حضرت! آپ سے کس نے کہا؟“

”کوئی بیان کر رہا تھا“

”کون؟“

”ہر کسی کا نام تو حافظے کی چیز ہے اور نہ ہر نام کا پوچھنا ضروری ہوتا ہے“

”تو حضرت آپ نے اس روایت پر اعتماد کر لیا“

”سوال روایت کا نہیں نہ اعتماد کا ہے۔ آپ سے جو تعلق خاطر ہے، اس کے باعث معاوہ چیز یاد آگئی۔“

”جی نہیں۔ راوی نے غلط بیانی کی ہے بلکہ جھوٹ بولا ہے“

”الحمد للہ وہ پانس اسیلے دماغ میں رہ گئی کہ آج سے چوبیس یا پچیس سال پہلے، آپ نے ہیر وارث شاہ کے بعض بند سنائے تھے جن میں جل، مل، قسم کے قافیے تھے۔ میں نے خیال کیا جس شخص کو اس قسم کے اشعار یاد رہے ہوں ممکن ہے حالات کی برہمی نے اس سے گالی اگوا دی ہو“

شاہ جی مسکرائے اور کہا

”حضرت، ربع صدی پہلے کی وہ صحبت آپ کو یاد ہے؟“

”میرے بھائی، سوال کسی صحبت کی یادداشت کا نہیں۔ گو حافظ ہر طرح کی شاہراہوں اور بگڈ ٹیڈیوں۔۔۔۔۔ گزرتا ہے لیکن بعض چیزیں حافظے کے خانوں میں بھول چوک ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وارث شاہ کا کلام تھا۔ آپ کی وجہ سے حافظے میں ایک تاثر رہ گیا۔ اب جو آپ سامنے آئے تو وہ تاثر بھی تازہ ہو گیا“

۔۔۔ سب سے بہت پہلے کی بات ہے۔ شاہ جی میانوالی جیل میں تھے۔ انگلستان کا ہوم ممبر ہندوستان کے دورے پر آیا ہوا تھا۔ اس نے شاہ جی کو ملنے اور دیکھنے کے لئے میانوالی جیل کا دورہ کرکھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل بہت

گھبراہٹ ہو گیا تھا۔ وہ بار بار شاہ جی اور دوسرے سیاسی رہنماؤں سے التجائیں کرتا۔ کہ یہ دورہ کامیاب رہے اور رہنما کوئی ایسی بات نہ کریں۔ شاہ جی نے کہا۔ کہ لالہ جی آپ فکر نہ کریں۔ اس دورہ کے روز شاہ جی نے اپنے تمام ساتھیوں سے کہا۔ کہ وہ لیٹ جائیں۔ اور اپنے اوپر کھبل اوڑھ لیں۔ صرف اپنے اپنے پاؤں ننگے رکھیں۔ اور ان کا رخ دروازے کی طرف ہو۔ ایسا ہی ہوا صرف شاہ جی میرک کی سلاخوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہوم ممبر برٹنی رعونت و ٹمکنت کے ساتھ سیاسی قیدیوں کی میرک پر پہنچا تو ساوا شاہ جی سب نے اپنے پاؤں اس کی طرف کر کے اپنی حقارت و نفرت کا اظہار کیا۔ برطانوی نژاد ہوم ممبر شاہ جی سے مخاطب ہوا۔

شاہ صاحب: آپ اچھے ہیں؟

شاہ جی: خدا کا شکر ہے۔

ہوم ممبر: کوئی سوال؟

شاہ: میں صرف اللہ سے سوال کیا کرتا ہوں۔

ہوم ممبر: میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

شاہ جی: جی ہاں! آپ میرا ملک چھوڑ کر تشریف لے جائیے!۔۔۔۔۔

شاہ جی:۔۔۔۔۔ علماء و اکابر دیوبند اور بزرگانِ رائے پور۔ گنگوہ۔ مکان شریف۔ سیال شریف۔ دین پور۔ آکو مہار شریف، گولڑہ شریف۔ علی پور سیدان سے خصوصی تعلق رکھتے تھے اور ان مقامات پر اکثر حاضری بھی دیتے اور تقاریر بھی فرماتے تھے۔ ایک دفعہ وہ ہماری معیت میں (۱۹۵۱ء) سیال شریف کے مدرسہ شمس الاسلام کے سالانہ جلسہ پر تشریف لے گئے تھے اور خواجہ قمر الدین سیالوی رحمہ اللہ کے مہمان تھے۔ انہوں نے شاہ جی کی بہت اعلیٰ بگت کی۔ ہمارے ساتھ معروف احرار رہنما مولانا عبد الرحمن سیالوی بھی تھے۔ خواجہ صاحب اور ان کے مریدین نے مثالی مہمان نوازی، حسن سلوک اور بے پناہ احترام کا مظاہرہ کیا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ سیال شریف والے اب یہ بات کیوں بھول گئے ہیں؟ کہ اتحادِ بین المسلمین کا اس دور میں سب سے بڑا داعی ان کے ہاں مہمان خصوصی ہوتا تھا۔ ایک دفعہ دیوبند تشریف لے گئے۔ رات دارالعلوم میں تقریر کی اور سونے کے لئے مدنی منزل حضرت شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی کے ہاں تشریف لے گئے۔ فجر کی اذان ہو گئی تو ابھی وہ سو رہے تھے۔ حضرت مدنی متنبہ ہوئے اور ان کے پاس بیٹھ کر شاہ جی کے پاؤں دبانے لگ گئے۔ شاہ جی ہڑبڑا کر اٹھے اور حضرت مدنی کو پاؤں دبانے دیکھ کر اذہد پریشان ہوئے۔ کھنسنے لگے حضرت! آپ گھبرا کر رہے ہیں۔ حضرت مدنی نے فرمایا شاہ جی! نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا آپ کو جگا لوں۔ لیکن پھر خیال آیا آپ تھکے ہوئے ہیں۔ یہی مناسب سمجھا کہ پاؤں دابوں۔ تھکاوٹ دور ہوگی، آنکھ کھلے گی تو ممکن ہے نماز قضا نہ ہو!

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے نتیجے میں آپ لاہور جیل میں تھے۔ آپ کے ساتھ مشہور بریلوی عالم سید ابوالحسن قادری تھے۔ جو نام نہاد مسلکی اختلافات اور سیاسی راہوں کے جدا ہونے کی وجہ سے شاہ جی سے کبھی نہ ملے تھے۔ جب جیل میں شاہ جی کو دیکھا۔ ان کے عشقِ رسول ﷺ عقیدہ ختم نبوت کی پہنچی اور ایمان کی لازوال دینی و روحانی دولت کا مشاہدہ کیا تو شاہ جی کے گرویدہ ہو گئے۔ اور اس بات پر ہمیشہ افسوس کرتے رہے۔ کہ عمر کا زیادہ

حصہ شاہ جی کی معیت کے بغیر کیوں گزارا؟

شاہ جی کی مغل میں تذکرہ ختم نبوت چھڑتے ہی رنگ مغل تبدیل ہو جاتا تھا۔ اور جوش سے لبریز اشعار کی آمد شروع ہو جاتی تھی۔ خصوصاً وہ اشعار جو آپ کے مزاج اور فکر کے آئینہ دار ہوتے وہ حاضرین کے قلوب پر بے حد اثر چھوڑتے تھے۔ آپ کو نبی کریم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی وجہ سے تمام مدعیان نبوت و رسالت سے آپ کو سنتِ خداوت تھی۔ حقیقت ایمان سے نا آشنا لوگ اس عقل کو مذہبی اور احرار رہنماؤں کی تنگ نظری قرار دیتے ہیں۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ یہ تعصب یا حسد نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی انتہا ہے۔ جو شاہ جی کے دل و دماغ پر جلوہ گر ہوئی۔ لاؤ سپیکر تو آزادی سے کچھ عرصہ پہلے ایجاد ہوئے تھے۔ مگر شاہ جی کی آواز کی بلندی کو اگر دیکھا جائے تو رسول کریم ﷺ کے زمانہ کے ہاشمی یاد آجاتے تھے۔ حضور ﷺ کے غم محترم حضرت عباس بن عبدالمطلب کی آواز کے متعلق علمائے تفسیر نے لکھا ہے۔ کہ آٹھ میل تک پہنچتی تھی۔ اسی طرح لاؤڈ سپیکر کے بغیر شاہ جی نے بڑے بڑے شہروں میں دو دو لاکھ کے کثیر مجمع سے خطاب فرمایا۔

یہ بات اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ کہ تقریر اور خطاب میں شاہ جی کا کوئی ثانی کرشمہ ایک صدی کے دوران برصغیر میں پیدا نہیں ہوا۔ ان کو اپنی تقریر کے دوران اکثر نواقات سامعین، حاضرین کے عجیب اور مشکل ترین سوالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جن کا وہ اس خوبی اور تاثیرِ خطابت سے جواب دیتے تھے۔ کہ مجمع غش غش کر اٹھتا تھا۔ اگر ایسے سوالات کسی اور عالم یا خطیب سے کئے جاتے۔ تو وہ جواب کے لئے شاید مہینوں بتائیں لگاتے مگر شاہ جی کو اللہ تعالیٰ نے برجستہ گوئی اور فی البدیہہ گفتگو کا جوہر خاص عطا فرمایا تھا۔ وہ کسی دوسرے کے حصے میں کم ہی آسکا۔ ان کے تہر علمی کے سبھی معترف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد بے شک بہت بڑے خطیب اور عالم تھے۔ مگر وہ شاہ جی کی طرح عوامی خطیب نہ تھے مولانا کے ہاں اختصار تھا اور شاہ جی کے ہاں ابلاغ۔

ایک جلسہ شاہ جی سے کسی نے سوال کیا۔ حضرت! سیدہ فاطمہ افضل ہیں یا جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری صاحبزادیاں افضل ہیں۔ جب کہ سیدہ رقیہ۔ سیدہ ام کلثوم۔ اور سیدہ زینب۔ آپ سے عمر میں بھی بڑی تھیں۔ فرمایا۔ فاطمہ افضل ہیں کیونکہ وہ نزول وحی کے بعد پیدا ہوئی تھیں اور دوسری نزولِ وحی سے پہلے! ایک دفعہ سوال کیا گیا کہ سیدہ عائشہ صدیقہ اور سیدہ خدیجہ میں کیا فرق ہے؟ ارشاد فرمایا بڑا فرق ہے۔ سیدہ خدیجہ کا نکاح محمد بن عبد اللہ سے ہوا تھا اور سیدہ عائشہ کا نکاح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔

کسی نے سوال کیا۔ حضرت آپ کو صاحبزادہ فیض الحسن نے کیوں چھوڑ دیا۔ ارشاد فرمایا وہ نوری ہیں اور میں خاکی۔ ان نوریوں سے امید کب تک! سب سے بڑے نوری جبریل علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے شبِ معراج میں میرے نانا کو سدرة المنتہی پر ہی چھوڑ دیا تھا۔

آزادی سے چند ماہ بعد جب کہ پاکستان کے مسلمان احرار رہنماؤں کے سیاسی اختلافات کی بنا پر کچھ کچھ ہوئے تھے۔ شاہ جی پاکستان چوک ڈیرہ غازی خان کی سیرت کا نفرین سے خطاب کرنے لگے تو اچانک نزدیکی مکان سے جلسہ گاہ میں پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ شاہ جی وظیفہ پڑھتے رہے۔ اور پتھر برستے رہے۔ جب یہ سلسلہ بند ہوا تو اس کوہ استقامت نے کہا۔

”تم پتھر برساتے رہے تو میں دل ہی دل میں خوش ہو کر کھڑا رہا اور اسی انتظار میں تھا۔ کہ کوئی پتھر آ کر

میرے دانت توڑ دیتا۔ تو میں اپنے نانا کی سنت کو تازہ کر دیتا۔ جو طائف اور اُمد میں ایس ہی صورت حال سے دو چار ہوئے تھے۔۔۔۔۔

یہ بات کچھ اسی انداز سے کی کہ ایک لٹ سارا مجمع زار و قطار رونے لگ گیا۔ اور جلسہ کے بعد بہت سے لوگوں نے آکر ان سے معافی طلب کی۔

آزادی سے قبل پشاور کے جلسہ عزم سے خطاب فرما رہے تھے۔ جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو سکھ بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ مسلمان نعرہ تکبیر کے جواب میں اللہ اکبر کہہ رہے تھے۔ مگر ہندو سکھ خاموش تھے۔ انہوں نے ہندوؤں سے پوچھا۔ مجھے بتاؤ "رام" کون ہے؟ انہوں نے کہا خدا۔ پھر سکھوں سے پوچھا۔ "واہ گورو" کس کو کہتے ہو۔ جواب ملا اللہ کو! بلند آواز میں فرمایا۔ اگر رام اور واہ گورو اللہ ہے۔ تو پھر تم اللہ اکبر کیوں نہیں کہتے۔ اس پر سب نے نعرہ تکبیر کے جواب میں اللہ اکبر کہنا شروع کر دیا۔

شاہ جی کی شخصیت فقر و استغنا۔ صبر و قناعت۔ خودداری اور خود نگہداری کا دلدادہ مرقع تھی۔ چاہتے تو آج کل کے خطیبوں اور واعظوں کی طرح لاکھوں روپے کما سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ساری عمر ایسا نہ کیا۔ جو کچھ مل گیا وعظ کو اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ تو بنایا معاش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اسی میں گزارا کیا۔ اور آزادی کے بعد کا تمام عرصہ کرائے کے ایک معمولی مکان میں بسر کیا۔ ۱۹۵۱ء میں وہ ضلع میانوالی کا دورہ کر رہے تھے۔ میں ان کے ہمراہ تھا۔ میانوالی سے رواجی کے وقت صوفی ائمہ و ائمہ مرحوم جو مجلس احرار کے نامور رشتہ کار تھے۔ اور شاہ جی کے انتہائی عقیدت مند، وہ شاہ جی، مولانا محمد علی، مولانا عبدالرحمن میانوئی اور سائیں حیات کے لئے سکینڈ کلاس کی ٹکٹیں لے آئے۔ شاہ جی نے ٹکٹیں دیکھیں اور مولانا محمد علی سے پوچھا۔ ان کا رنگ کچھ اور ہے۔ میں جو ٹکٹیں دیکھتا ہوں وہ زرد ہوتی ہیں اور یہ سبز معلوم ہوتی ہیں۔ مولانا نے فرمایا۔ یہ اونپے درجے کی ہیں۔ فرمایا! مولوی صاحب! آگے کی فکر کرو ہاں اگر اچھا درجہ مل گیا۔ تو بات بن جائے گی۔ یہاں کے درجوں کو چھوڑو ٹکٹوں کو واپس کر کے وہی زرد ٹکٹیں لاؤ (تھرڈ کلاس) صوفی صاحب ٹکٹیں واپس کر آئے اور غالباً سات روپے کا فرق واپس ملا۔ شاہ نے وہ رقم مولوی محمد علی صاحب کو دے دی۔ کہ اس کی رسید کاٹ دو۔ وہ ساری عمر تھرڈ کلاس میں سفر کرتے رہے۔ میں نے ایک بار سوال کیا۔ حضرت ایسا کیوں؟ اونپے درجہ میں سفر کرنے میں حرج کیا ہے۔ ارشاد فرمایا۔ تھرڈ کلاس میں گدڑی کے لعل مل جاتے ہیں۔ اور میرے وہاں بیٹھنے سے غریب مسلمانوں میں حوصلہ اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

میں ملتان میں ۱۹۶۰ء میں تھا۔ لائل پور (فیصل آباد) سے مولانا تاج محمود مرحوم وہاں کے ممتاز مل اور میاں محمد شفیع (کریسٹ ٹیکسٹائل ملز) کو لے کر آئے جو شاہ جی کے لائل پور میں قیام کے لئے ایک اچھی رہائش گاہ اور مکمل کفالت کی درخواست لے کر آئے تھے۔ ہو سکتا ہے میاں محمد شفیع اس میں اخلاص رکھتے ہوں۔ مگر جب شاہ جی سے مولانا محمد علی نے میاں محمد شفیع سے ملاقات کی درخواست کی۔ اور ساتھ اچھی پیشکش کا ذکر کیا۔ تو ارشاد فرمایا۔

"بھائی محمد علی! مجھے کسی مل (MILL) والے سے نہ ملو۔ کسی دلی والے سے نہ ملو۔ یہ پیشکش سبھوں کے مقابلے میں ان کی سیاسی اور معاشرتی ضرورت ہوگی۔ مجھے اب آخر عمر میں کیوں رسوا کرنے لگے ہو؟ میاں محمد شفیع شاہ جی سے ملے مگر دوران ملاقات اس بات کا قطعی ذکر نہ کیا!

۱۹۵۹ء میں ملتان کے کچھ دوستوں قاضی احسان احمد، اور مظہر نواز خان درانی نے شاہ جی کے عظیم آباد (پٹنہ) اور امرتسر کی رہائشی جائیداد کے عوض ملتان میں کلیم حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا ان دوستوں نے بحالیات کمشنر کی عدالت میں خود ہی کلیم داخل کر دیا۔ اور جب شاہ جی کا بیان لینے کے لئے انہیں عدالت میں لے جانے کی ضرورت پیش آئی تو انہیں شاہ جی سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ان دوستوں نے کسی طرح شاہ جی کو راضی کر لیا۔ جب شاہ جی عدالت میں پہنچے۔ تو وہاں انہی پدیرانی کی گئی۔ بیان کے دوران صرف اپنی دینی ادنیٰ کتابوں اور لائبریری کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اور بعد میں وہ اپنے مندرجہ بالا ساتھیوں سے کچھ عرصہ ناراض رہے کہ وہ انہیں دنیا کی طرف کیوں راغب کر رہے ہیں۔ مظہر نواز خان درانی کی ذاتی کوششوں سے کلیم منظور ہو گیا اور ایک مکان الاٹ کر دیا گیا۔ آج کل اس جگہ شاہ جی کے بیٹوں نے ایک دینی مدرسہ اور جامع مسجد تعمیر ہے۔ یہ جگہ دارِ نبی ہاشم کے نام سے معروف ہے۔

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی (اقبال)

شاہ جی کی زندگی کا یہ استغنائی پہلو اس حدیث کا مضمون یا تفسیر تھا۔ کہ جس میں فرمایا گیا (بہترین آدمی فقیر ہوتا ہے۔ اگر اس کے پاس حاجت لے کر جائیں تو نفع پہنچائے اور اگر اس سے کنارہ کریں تو وہ بھی بے پروا رہے)

وہ صرف عبادت کے ڈسپلن اور پروگرام کے پابند رہتے تھے۔ کوئی بڑے سے بڑا آدمی ان کے پروگرام میں تبدیلی نہ کر سکتا تھا۔ جماعت کے پروگرام کے علاوہ وہ اپنے احرار رضا کاروں کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور نہ ہی شفقت عطا فرماتے تھے۔ کہ ہر کوئی اپنی جان کا ہدیہ دینے تک کے لئے تیار رہتا تھا۔ وہ اپنے رضا کاروں کی درخواست جو اپنے شہروں میں انہیں لے جانے کے لئے کرتے تھے۔ کبھی رو نہ فرماتے تھے۔ فوراً اپنی جیبی ڈائری نکال کر تاریخ عطا فرمادیتے تھے۔

شاہ جی عالم و خطیب سیاست دان اور روحانی شخصیت ہونے کے علاوہ شاعری بھی فرماتے تھے۔ ان کا مجموعہ "سواطع الالہام" کے نام سے ان کی زندگی میں انکے فرزند حضرت سید ابودر بخاری نے شائع کیا۔ شاہ عظیم آبادی کی صحبت کی وجہ سے وہ شعر و ادب کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ حضرت علامہ اقبال سے بڑے اعلیٰ تمکانات تھے۔ اور جیسا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ حضرت علامہ اپنا کلام شاہ جی کو سنا کر بہت مسرور ہوتے تھے۔ افسوس اقبال کے نام نہاد مؤرخین نے محض تعصب اور تنگ نظری کے سبب اس کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ حضرت علامہ عقیدہ ختم نبوت کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ اور انہی فکر کا یہ پہلو شاہ جی اور دیگر علمائے دیوبند کے ساتھ تمکانات کی وجہ سے مضبوط رہا۔

بزرگ صغیر کے ممتاز شعراء فیض۔ جگر۔ روش۔ نصرت قریشی۔۔۔۔۔ تاثیر اور بعد کے دور میں۔۔۔۔۔ عدم۔۔۔۔۔ مرغ۔ احمد ندیم قاسمی۔ حاضی کرناٹی۔ عبدالکریم شر۔ طاہر شادانی۔ علامہ طاہر (مرحوم) اند ملتان۔ شاہ جی کے ہاں اکثر حاضری کرتے تھے۔ دیگر ممتاز شعراء علامہ انور صابری۔ عبدہ لطیف انور، آغا شورش کاشمیری۔ عبد الرحیم عاجز، طفیل امرتسری۔ تاجنہار مرزا۔ استاد وامن سائیں حیات تو ان کے شریک سفر تھے۔ الفرض شاہ جی کی شخصیت جامع بحالات تھی۔

یہ شاہ جی کی شخصیت کا جاذب نظر اور روحانی پہلو تھا۔ کہ مجلس احرار اسلام میں مختلف عقائد کے قومی رہنما اکٹھے ہو گئے تھے۔ اور ان میں محبت اور اتحاد کا جو شاندار نظم و ضبط چشم فلک نے دیکھا وہ پھر کہیں نظر نہ آسکا شاہ جی اپنے تمام ساتھیوں سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ان تمام رہنماؤں نے شاہ جی کے جذبہ جہاد اور عشق رسول ﷺ کے فیضان سے قربانیوں کی ایک لازوال تاریخ حریت ترتیب دی۔ ان رہنماؤں میں مولانا محمد داؤد غزنویؒ، چودھری افضلؒ، مولانا مظہر علی اظہر مرحوم۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن مرحوم، مولانا عبد القیوم کانسوری مرحوم مولانا عبد القیوم پوپلزی مرحوم (پشاور) مولانا غلام غوث مرحوم شیخ حسام الدین مرحوم۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی مرحوم۔ ماسٹر تاج الدین انصاری۔ قاضی احسان احمد مولانا گلشیر شید، حافظ علی بہادر، سید نوشیر علی، مولانا عبد الرحمن چانہزار مرزا، خواجہ عبد الرحیم عاجز، غازی محمد حسین (تانہ لیا نوالہ) عبد الرحیم جوہر، سردار محمد شفیع، چودھری عبد العزیز راہوں اور حافظ عبد الباقی نایینا (فیصل آباد) شامل تھے۔ یہ تمام بزرگ اور رہنما شاہ جی کے جذبہ دروں اور نعرہ حق کی تصویر تھے۔

شاہ جی ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۶۱ء تک برصغیر کی آزادی (۱۹۴۷ء تک) اور عقیدہ تحفظ ختم نبوت کے محاذوں پر مردانہ وار لڑتے رہے۔ ان کی یہ جدوجہد جو بجائے خود ایک تاریخ ہے۔ نہایت کھٹن اور مشکل تھی۔ انہوں نے تحریک خلافت تحریک فوجی بھرتی، بائیکاٹ، تحریک کشمیر، تحریک تحفظ ختم نبوت اور دیگر کئی ملی اور قومی تحریکوں میں حصہ لیا۔ جن کی پاداش میں وہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ انگریزی دور میں ان پر سنگین سے سنگین مقدمات چلائے گئے۔ مگر وہ اپنے غیر سترزل ایمان، روحانی قوت، بزرگان ملت کی دعاؤں اور اپنی جماعت کے وفادار ساتھیوں کی قربانیوں سے ان مشکل مراحل سے باعزت سرخرو ہوتے رہے۔ لادھو سی کی ایک تقریر کی وجہ سے ان پر آزادی سے قبل دفعہ ۱۲۴ کے تحت مقدمہ چلا۔ اور حکومت پنجاب نے ان کو سزائے موت دلوانے کی سازش کی۔ تو ایک ہندو رپورٹر لدھارام کے بائیکوٹ میں اعتراضی بیان کی وجہ سے حکومت کو شرمندہ ہونا پڑا۔ لدھارام جو سرکاری رپورٹر تھا اس نے جسٹس ڈگلنگ سنگ کے سامنے کہا:

”میں اس رشی اور مہی (روحانی شخصیت) کو دیکھ کر جھوٹ نہیں بول سکتا۔ سچ یہ ہے کہ دی رپورٹ میں تحریف و رصانہ حکومت کے ایماء پر کیا گیا ہے۔

۱۲۴۔ الف کے اس مقدمہ سے شاہ جی باعزت بری ہوئے۔

چارہ گرنے مجھ کو باندھا تھا سمجھ کر ناتواں  
بہ ذرا تڑپا تو گھڑے ہی نہ تھے زنجیر کے (جگر)

شاہ جی کی زندگی کے بے شمار واقعات اور پہلو بہر بن کو بیان کرنے کے لئے ایک عرصہ چاہیے۔ ان کی داستانیں قریہ قریہ، بستی بستی، پرانے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ وہ جامع الصفات شخصیت تھے۔ اور ان جیسے لوگ روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔ شاہ جی نے لوگوں کے اعتراض یا اعتراف کی پرواہ کئے بغیر تمام عمر اعلیٰ کھتہ الحق کا فریضہ انجام دیا۔ وہ علمائے حق کے محبوب تھے۔ حضرت شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیری نے برصغیر کے ۵۰ نمائندہ علماء کے اجتماع میں انہیں امیر شریعت کا خطاب عطا فرما کر ان کے دست مبارک پر بیعت جہاد کی۔ شاہ جی حضرت شیخ العصر علامہ انور شاہ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ”صحابہ کا قافلہ جا رہا تھا۔ انور شاہ پیچھے رہ

گئے "اسی طرح شاہ جی کے متعلق حضرت اشرف علی تھانوی فرماتے تھے کہ: "شاہ جی کی باتیں عطاء الہی ہوتی ہیں" حضرت شیخ الاسلام مولانا بشیر احمد عثمانی فرماتے تھے "شاہ جی اسلام کی مشین ہیں" مولانا حسین احمد مدنی علامہ انور شاہ کاشمیری۔ مولانا احمد سعید دہلوی۔ مفتی کفایت اللہ مفتی اعظم ہند۔ حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری۔ پیر طریقت عبدالقادر رائے پوری۔ حضرت گولڑوی۔ حضرت خواجہ ضیاء الدین۔ (سیال شریف) معنوی طور پر شاہ جی سے بہت محبت رکھتے تھے۔ آپ کی پہلی بیعت طریقت پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف سے تھی۔ ان کے انتقال کے بعد تجدید بیعت حضرت رائے پوری سے کی۔

اللہ تعالیٰ کا فضل خاص اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی کرم نوازی تھی کہ میرے لاشعوری دور میں، جب میں بڈل کا طالب علم تھا، مجھے حضرت امیر شریعت کی نگہ لطف کرم عطا فرمادی۔ میرے سکول کے ایک سکھ استاد سردار خزان سنگھ اپنے درس میں حضرت امیر شریعت کا نام گرامی اکثر لیا کرتے تھے۔ مجھے "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" کا نام۔ اس کا حسن۔ اس کی ترکیب بہت پسند آئی۔ اور میں غائبانہ طور پر اس شخصیت کا عقیدت مند ہو گیا۔ پھر حضرت مولانا بشیر احمد جو قافلہ آحرار و جمعیت کے ممتاز رہنما تھے۔ کی قیادت و سیادت میں شاہ جی کا اکثر ذکر ہوتا۔ انجمن تبلیغ الاسلام۔ چونکہ ہر سال چونڈہ میں دینی جلسہ منعقد کیا کرتی تھی۔ اس انجمن کی خدمات تبلیغ اسلام اور دین کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں بہت قابل قدر ہیں میں نے انجمن کے سالانہ جلسہ کا اشتہار پڑھا۔ اور اس میں شاہ جی کی تقریر کا اعلان پڑھا تو اپنے طالب علم ساتھیوں کے ہمراہ پیدل چونڈہ گیا۔ وہاں شاہ جی کو دیکھا اور سنا۔ لاشعوری دور کی بات ہے یاد نہیں کیا کیا سنا۔ مگر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں نے دل ہی دل میں اس شخصیت کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد پسرور میں اجراء سٹوڈنٹس کا قیام شمل میں لے آیا۔ اور دور و نزدیک شاہ جی کی تقریر میں سے جلا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ ۸-۹ اپریل ۱۹۳۴ء کو میں فیروز پور احرار پراونشل کانفرنس پر چلا گیا۔ وہاں شاہ جی ایک ٹینٹ میں قیام پذیر تھے۔ میں نہایت عقیدت سے ملا۔ پاس صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ بیٹھے تھے۔ مجھ سے میرا پتہ پوچھا۔ میں نے پسرور کا ذکر کیا۔ تو گلے لگا لیا فرمانے لگے۔ یہ تو میرے استاد حضرت مولانا نور احمد پسروری ثم امرتسری کا شہر ہے۔ پھر مولانا روشن دین پسروری کی اپنے ساتھ رسالت میانوالی جیل ۱۹۲۱ء کا حوالہ دیا۔ مولانا بشیر احمد کے تعلق کی بات ہوئی۔ شاہ جی منراپا شفقت بن گئے۔ اُس وقت سے لے کر ۱۹۶۲ء تک وہ میرے ساتھ عزیزانہ شفقت برتتے رہے۔ سیالکوٹ، لاہور، امرتسر، چونڈہ اور دوسرے کئی مقامات پر انکی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔ اور پھر میری عاجزانہ دعوت پر پسرور بھی آئے۔ ۲- روز قیام فرمایا ۳۶-۱۹۳۵ء کے انتخابات میں وہ اکثر مولانا مظہر علی اظہر (سیالکوٹ) پسرور / نارووال / قلعہ سوبا سنگھ کے حلقہ (صاحبزادہ فیض الحسن شاہ مرحوم (دربہائی خانہ تحصیل دسکہ پسرور) اور جناب چوہدری محمد عبداللہ خان (چونڈہ / ظفروال) کی انتخابی مہموں میں حصہ لینے شریف لاتے رہتے تھے۔ اور میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ ان کی تقاریر نوٹ کر کے "آزاد" لاہور میں رپورٹنگ کر دیتا تھا۔ تعلیم میرے لئے ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اسی دوران انہوں نے قوم کا وہ شاندار تجزیہ پیش کیا۔ جو تمام برصغیر میں مشہور ہوا۔ چونڈہ کے ایک اجتماع میں شاہ جی نے صاحبزادہ فیض الحسن سے پوچھا۔ شاہ صاحب! آپ کے حلقہ انتخاب کا کیا حال ہے؟ صاحبزادہ صاحب نے کہا۔ شاہ جی جیت رہا ہوں۔ انشاء اللہ تخت میری



ہے۔ شاہ جی ہنسے۔ صاحبزادہ صاحب سے کہا شاہ صاحب! میں اس قوم کو اچھی طرح جانتا ہوں یہ تقریر میری سنتی ہے۔ بچہ نہ ہو تو کمویڈ آپ سے لیتی ہے۔ "تفسیر ابوالکلام کی پڑھتی ہے۔ حدیث حسین احمد مدنی سے سنتی ہے۔ فقہ اور فتویٰ کے لئے مفتی کفایت اللہ کے پاس جاتی ہے۔ علم احمد علی سے سیکھتی ہے مگر ووٹ کسی اور کو دیتی ہے۔"

بعد میں شاہ جی کا یہ تجزیہ صحیح ثابت ہوا۔ اور صاحبزادہ صاحب چوہدری سر فراز سے شکست کھا گئے۔  
میں نے ۱۹۳۸ء میں گرنڈ میز بینک میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۵۰ء میں شاہ جی لاہور آئے۔ پوچھا کیا کرتے ہو؟ عرض کیا "بینک میں ملازم ہوں۔" فرمایا "لگے بینک کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ کچھ اٹا سیدھا جواب دیا۔۔۔ پھر پوچھا یہ بینک کس کا ہے۔۔۔ میں نے کہا انگریزوں کا! اس پر خاموش رہے اور خاصا احسان احمد جو پاس بیٹھے تھے سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"احسان احمد! میری بد قسمتی ملاحظہ ہو۔ باپ ساری عمر انگریز کے خلاف لڑتا رہا۔ انگریز گیا۔ تو اولاد نے اس کی ملازمت کر لی۔"

میں نے اگلے روز جا کر استعفیٰ دے دیا۔ اور ملتان چلا گیا۔ سارا ماجرا بتایا فرمایا لگے میرا یہ مطلب تو ہرگز نہ تھا۔ پوچھنے لگے اب کیا ارادہ ہے میں نے کہا آپ کے پاس رہوں گا۔ مسلسل تین ماہ تک شاہ جی کے ساتھ رہا۔ سینکڑوں جلسوں کی رپورٹنگ کی۔ اور ان کی کسی بھی ملازم سے بڑھ کر خدمت کی۔ کنڈیاں شیشیں پر مجھے گھر جانے کا حکم دیا۔ اور تین سو روپے کی خلیفہ رقم مجھے دی کہ میں اپنی اہلیہ کو جا کر ان کی طرف سے دے دوں! میں نے بت افکار کیا مگر نہ مانے فرمایا لگے۔

"تم نے میری بہت خدمت کی۔ میں بہت خوش ہوں۔ اور تمہارے لئے ہمیشہ دعا گو رہوں گا، تم کسی اپنے آپ کو اکیلے موس نہ کرنا میں ہمیشہ تمہارے پاس رہوں گا۔"

بعد کی ساری زندگی میں وہ ہمیشہ میرے لئے دعا گو رہے۔ میں ان کی خدمت میں مسلسل ملتان حاضری دیتا رہا۔ وہ اس عہد کے عظیم انسان، تاریخ ساز شخصیت اور سب سے بڑے عاشق رسول ﷺ تھے۔

### حافظ جان محمد خادم شام غم

امیر	شریعت	عطاء	اللہ	شاہ
چوں	رخت	سفر	روح	برفک
بگفتند	خادم	ہم	چشم	تر
عزیز	و	اکار	عُفران	نک

# انے کا مخاطب، اُنے کا تکلم

(نذر مجیدی (لاہور)

بزم	وٹن	ہے	درہم	برہم	ارض	و	سما	میں	برپا	ماتم
موت	العالم،	موت	العالم	برہم	رنج	سراپا،	حزین	مسلم		
آج	فصا	بے	کیف	یکدم	آج	نہیں	پہلا	سا	دم	غم
آج	طبیعت	ہے	افسردہ	کیا	کیا	نغمہ؟	کیا	ترنم		
چشم	فلک	نے	کس	کو	کس	کا	دیا	ہے	آج	ہمیں
تیر	قصا	نے	سونپ	دیا	نالہ	پر غم،	گر	پہم		
رو	رو	کر	اب	یاد	ان	کا	مخاطب،	ان	کا	کلم
ان	کی	بات	نبات	کی	ان	کے	قصے،	ان	کا	تبسم
یوں	تاریخ	مجیدی	کھدو	سکتے	سا	ہے	طاری	تاہم		

رحلتے سید و شیر مجسم  
قائد افضل و دین مکرم

۱۳۸۱ھ

## نجات ہم، شجاعت ہم، خطابت ہم، صباحت ہم

خوشا مردے کہ بعد از مرگ خود نام کھو دارد!  
ہے پنہاں شدار عالم دلے دہار گرو دارد  
وگر نہ ہر کہ آمد خیر عدم ہر گز نیا ساید  
بہار ہر کھالے واز دالے دودو دارد  
نجات ہم، شجاعت ہم، خطابت ہم، صباحت را  
کجا یابد سے بکجاؤ گر صد جستجو دارد  
عطاء اللہ از عشاق ختم السلسلین آمد  
زبان ساکنان ہندو پاک ایں گفتگو دارد  
دہم تسکین دل خود راجو از مارت آں شا ہے  
عطاء النعم آں خلف الرشید ایں رنگ و بودارد  
دعائے مغفرت از بالاجابت از در مولے  
پے شاہ بخاری ہم شفیعش آرزو دارد  
(مفتی محمد شفیع سرگودھوی رحمۃ اللہ علیہ)

## حضرت رائے پوری اور شاہ جی

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری، بزرگانِ رائے پور کے پاکباز وارث تھے۔ آپ ولایت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے۔ اور برصغیر کے بیشتر علماء حق انکے دستِ حق پرست پر بیعت تھے۔ جن میں حضرت امیر شریعت۔ شیخ حسام الدین۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا محمد علی جالندھری۔ مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی۔ مولانا عزیز الرحمن لدھیانوی ایسے اکابر شامل تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ روحانی منزلت اور مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ بزرگانِ دیوبند بالخصوص حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی۔ حضرت قاری محمد طیب۔ بزرگانِ سہارنپور۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا۔ حضرت مولانا خلیل احمد۔ بزرگانِ جمعیت۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور مولانا عتیق الرحمن۔۔۔۔۔ اجتماعِ طور پر حضرت شاہ عبدالقادر کے عقیدت مند تھے۔ اور اپنی دینی و سیاسی جدوجہد میں انہیں اپنا سرپرست تسلیم کرتے تھے۔ فی الحقیقت حضرت شاہ عبدالقادر کاروانِ علماء حق کی جدوجہدِ حریت کے امام تھے۔ اور تمام بزرگوں کو اپنے قیمتی مشوروں اور دعاؤں سے نوازا کرتے تھے۔

گو حضرت امیر شریعت۔ حضرت رائے پوری کے مرید تھے۔ مگر حضرت رائے پوری انکو بڑا اہم مقام دیتے تھے۔ اور امیر شریعت کے ساتھ انہیں خصوصی محبت اور لگاؤ تھا۔ حضرت امیر شریعت فرمایا کرتے تھے۔ کہ جدوجہدِ آزادی میں کسی ایسے مشکل مقام آئے جہاں زندگی اور موت میں بہت تھوڑا فاصلہ رہ جاتا تھا۔ مگر حضرت رائے پوری کی خاص روحانی توجہ سے وہ مرحلے آسانی طے ہو جاتے۔ شاہ صاحب کو جب کبھی فرصت ملتی تو وہ حضرت کی خدمت میں رائے پور کشریف لے جاتے۔ اور انکے فیضانِ نظر سے مستفید ہوتے رہتے۔

جب ۱۹۶۰ء میں حضرت رائے پوری بیماری کی حالت میں بغرضِ علاج لاہور کشریف لائے۔ تو شاہ جی بھی ملتان سے لاہور پہنچ گئے۔ اور شب و روز حضرت رائے پوری کی خدمت میں رہنے لگے۔ حضرت رائے پوری اکثر انہیں دعا کے لئے کہتے اور شاہ جی نظریں جھکا لیتے۔ میں ان دنوں لائل پور ٹھونکتا تھا۔ ایکدن قاضی جی (قاضی احسان احمد شجاع آبادی) بھاگے بھاگے آئے۔ فرماتے لگے۔ لاہور چلنا ہے۔ حضرت رائے پوری کی حالت تھوڑا سا بہتر ہوئی ہے۔ ہم بذریعہ کار لاہور پہنچے۔ حضرت کا قیام ڈیوس روڈ کے قریب اپنے ایک عقیدت مند حاجی عبدالستین کے ہاں تھا۔ ہم وہاں پہنچے۔ حضرت چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اور مشتاقانِ دید کا جہوم ارد گرد مودعا تھا۔ اندر ایک کمرے میں شاہ جی اور شیخ حسام الدین بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ ساتھ کے کمروں میں آغا شورش کاشمیری۔ ماسٹر تاج الدین۔ جناب عبدالوحید وزیر مغربی پاکستان۔ سابق جنرل حق نواز۔ مولانا احتشام الحق تھانوی۔ مولانا عبدالعزیز انور۔ مولانا غلام غوث ہزاروی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا عزیز الرحمن لدھیانوی اور دہلی سے آئے ہوئے کچھ اور بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔

میں باہر صحن میں بیٹھا تھا۔ اور حضرت رائے پوری بستر علالت پر تھے۔ سب لوگ بارگاہ رب العزت میں حضرت کی صحت کے لئے دعا کر رہے تھے۔ حضرت نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ میں نے ایک بار یہ شعر پڑھا:

جوابد من بنگمدار آبروئے گدا لے خویش

میری حیرانی کی حد نہ رہی۔ کہ حضرت نے آنکھیں کھول کر میری طرف متھڑک آدیکھا۔ اور پھر مواستراحت ہو گئے۔ قاضی جی نے دیکھا تو حیران ہوئے۔ مجھ سے پوچھنے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ شر پڑھا تھا۔ فرمانے لگے کہ یہ حضرت کا روحانی تصرف تھا۔ اب نہ پڑھا۔ حضرت کو آرام کی ضرورت ہے۔ پھر میں اور قاضی صاحب۔ اندر شاہ جی کی خدمت میں جا بیٹھے۔ شاہ جی حضرت سے اپنے تعلق کے واقعات سن رہے تھے۔ فرمانے لگے:

آزادی برصغیر اور تحریک ختم نبوت کی مسلسل جدوجہد کے دوران انہوں نے محسوس کیا کہ جب وہ رات بچھٹے پھر تہجد کے لئے اٹھتے ہیں۔ یا اٹھنا چاہتے ہیں۔ تو اکثر نیند کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ وہ اس سے اذہ پریشان تھے۔ انہماک کی ایک ملاقات میں انہوں نے اپنی اس مشکل کا تذکرہ حضرت رائے پوری سے کیا تو انہوں نے پڑھنے کے لئے ایک وظیفہ بتادیا۔ شاہ جی نے پڑھا۔ تو اس کے بعد یہ کیفیت ہو گئی۔ کہ نیند بالکل غائب ہو گئی۔ اور اشد ضرورت کے وقت بھی نیند نہ آتی تھی۔ رات گئے تقریر کے بعد جب قیام گاہ پر آتا۔ تو بقیہ وقت کروٹیں بدل بدل کر گزر جاتا۔ مگر تہجد ضرور ادا ہو جاتی۔ اس سے اذہ پریشانی رہی۔ کچھ دوائیاں بھی استعمال کیں۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ جماعتی کاموں میں بے پناہ مصروفیت کے سبب حضرت رائے پوری سے جلد ملاقات نہ ہو سکی۔ آخر دو ماہ بعد سہارنپور میں ملاقات ہوئی۔ تو میں نے اپنی اس مشکل کا ذکر کیا۔ فرمانے لگے کہ مجھے بھی اس کا بے حد فکر رہا۔ آپ (شاہ جی) کے اصرار پر وظیفہ بتادیا تھا۔ ورنہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ حقیقتاً آپ کی جدوجہد اور تقریر ہی عبادت کا ایک ایسا ذریعہ ہیں۔ کہ کسی فظی عبادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ کی تقریر ہی عبادت فظیہ کی ضرورت پوری کر دیتی ہے۔ میرا مشورہ ہے۔ آپ تقریر کے بعد نماز فریضہ آرام کیا کریں۔ اس کے بعد نیند کی حالت معمول کے مطابق ہو گئی۔ میں سو بھی لیتا تھا۔ تہجد بھی ادا کر لیتا تھا۔ اور پھر بروقت نماز فریضہ کے لئے تیار بھی ہو جاتا تھا۔ تھکاوٹ یا نیند کی کبھی کا پھر کبھی احساس نہ ہوا۔

فرمایا۔۔۔ کہ پس مشن کے زمانے (۱۹۴۶ء) میں ہم سب دہلی میں مقیم تھے۔ حضرت رائے پوری وہاں تشریف لائے تو میرے ہاں، میر مشتاق احمد کے گھر پر بھی گئی۔ ہم علیحدگی میں بیٹھے ہاتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ حضرت! اب بہت تنگ گیا ہوں۔ آپ کیوں دعا نہیں کرتے۔ کہ انگریز ہندوستان سے چلا جائے۔

فرمانے لگے۔ کہ میں دعا کیوں نہیں کرتا۔ لو آج! تمہارے سامنے دعا کرتا ہوں۔ حضرت نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا میں مستغرق ہو گئے۔ عجیب و غریب روحانی کیفیت و انداز تھا۔ فارغ ہوئے تو فرمانے لگے۔ عطاء اللہ! اب چند دنوں کی بات رہ گئی ہے۔ تمہاری جدوجہد کامیاب ہوگی۔

یہ واقعہ ہے کہ چند دنوں کے بعد لاڈ ویل نے برصغیر کی آزادی کا پروگرام دے دیا۔

حضرت رائے پوری لاہور کے اسی قیام کے دوران انتقال فرما گئے۔ سہارت سے تقاضہ تھا کہ آپ کو رائے پور دفن کیا جائے۔ مگر احباب کے اکثریتی فیصلے سے حضرت رائے پوری کو موضع جھاریاں (سرگودھا) میں اسکے

آبادی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

اب کہاں دنیا میں ایسی ہستیاں

لاہور میں حضرت رائے پوری کی نماز جنازہ ادا ہوئی۔ تو انسانوں کا ایک جم غفیر اس میں شریک تھا۔ پھر خالصہ کالج فیصل آباد کی گراؤنڈ میں لاکھوں فرزند ان توحید نے انہی نماز جنازہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اقتدا میں ادا کی اور حضرت کے جد خاکی کو جھاوریاں (سرگودھا) لے جایا گیا۔ جہاں ہزاروں مسلمانوں نے نماز جنازہ پڑھنے کے بعد اس آفتاب روحانیت، علماء حق کے سرپرست امام اللولیاہ اور صدر مجلس پیشہ وران حریت کو سپرد خاک کر دیا۔ (مجھے جھاوریاں تک جانے کی سعادت حاصل رہی)۔ آپ کی وفات کے بعد۔ آپ کے وابستگان طریقت خصوصاً امیر شریعت، شیخ حسام الدین، مولانا عزیز الرحمن لدھیانوی اور قاضی احسان احمد شجاعبادی از حد مغموم رہنے لگے۔ اور پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ لوگ بھی اپنے اللہ کے پاس چلے گئے۔

کہاں گیا وہ رنگ مظل کہاں گئے وہ لوگ

جن کی خاطر ہم ایسوں کے دل کو لگ گئے روگ

یہ تمام بزرگ مسلمانان برصغیر کے لئے اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور انعام تھے۔ ان کے بعد ان کا کوئی بدل پیدا نہ ہو سکا۔ اور نہ مل سکا۔ افسوس! ہماری موجودہ سوسائٹی اور تاریخ ان بزرگان سلف کے تذکرہ سے خالی ہے۔ اور کوئی امید نہیں کہ ان کا تذکرہ کیا جائے۔ جس قوم اور سوسائٹی کے مورخ مادی تقاضوں کا شکار ہو کر اپنے قلم کا سودا کر لیں۔ تاریخ اور تاریخ ساز شخصیات کا دیا نذرانہ رکھا ڈال گئی نسل تک نہ پہنچائیں۔ وہ ایک ایسے جرم کا ارتکاب کر جاتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ جسے مستقبل کا مورخ کبھی معاف نہیں کرے گا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طہنت را

آئے قرار کیسے دل بے قرار کو؟



شکوہ ہے تیری موت پہ لیل و نہار کو  
آنکھیں ترس گئی ہیں خزاں کی بہار کو  
تارے غم فراق میں شب بھر نہ سو سکے

اٹھ اٹھ کے دیکھتے ہیں تیری رہ گزار کو  
تیرا سا بانگین ہے نہ تیرا سا سوز دل کو  
آئے قرار کیسے دل بے قرار کو

(جانہاز مرزا)

## سکوتِ خطابت

اے دیوِ اجل! قاطعِ برہانِ تنہا بے مطلعِ تقریر ہے، دیوانِ تنہا  
عنوانِ غمِ دل ہے کہ عنوانِ تنہا اٹھا نہ یہاں زیت سے احسانِ تنہا  
چپ کیوں ہے ذرا عظمتِ آدم کو صدا دے

ڈوپی ہوئی کستی کو کنارے سے لگا دے  
اے جبرِ قضا! کس کی صدا چھین لی تو نے دنیائے خطابت کے مناظر ہوئے سونے  
صدیوں یہاں ڈھونڈے گی وفا ایسے نمونے پروان چڑھایا جنہیں تابندہ ہونے  
شیرینیِ گفتار سے کردار عیاں تھا

تاثیرِ سکوتِ تمہی، خلوت کا جہاں تھا  
اے سیلِ فنا! تمہ سے گھگھ کو نہیں معلوم بھی ہے کون: یہ پیوند زمیں ہے  
کیا تیرے لئے منزلِ احساس کہیں ہے؟ اک موجِ تیری عالمِ صدا میں بہ جہیں ہے  
لیکن دلِ زندہ کی صدا مر نہیں سکتی

تعلیمِ محمد کی ادا نہیں سکتی  
جس سینے میں ہو عشقِ محمد کا قرینہ دب سکتا نہیں قبر کی مٹی میں وہ سینہ -  
تاکعبہ اگر دل میں تو آنکھوں میں مدینہ کیا وقت ڈبوئے گا یہاں اس کا سفینہ

وہ قلمِ توحید کا پیراک رہے گا

باطل کا گربان یہاں چاک رہے گا

## باتیں شاہ جی کی

برصغیر پاک و ہند میں جب بھی "شاہ جی" کا لفظ بولا جاتا ہے تو سننے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اس سے مراد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ کیونکہ یہ لفظ ان کے لئے مختص ہو گیا ہے۔ شاہ جی کے اور بھی کئی القاب تھے۔ "بابا ڈنڈے والا" "احرار کا بوڑھا جرنیل" وغیرہ وغیرہ لیکن "شاہ جی" کے لقب نے جو شہرت پائی وہ کسی اور لقب کو حاصل نہ ہو سکی۔ اس برصغیر میں آپ کی شہرت کی کئی وجوہات ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ شہرت آپ کی خطابت تھی۔ ہندو پاک کے ہر قریہ اور ہر شہر میں اس خطیب اسلام کی آواز خطابت گوئی اور چشم فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ ان کی آواز پر مردوں نے لہنی جانیں اور عورتوں نے اپنے زیورات نچا کر دیئے۔ شاہ جی اپنے وقت میں خطابت کے بادشاہ بلکہ عاقم تھے۔ باطنی مرحوم میں بھی ایسے لوگ خال خال تھے۔ اور مستقبل میں تو امیدیں ہی ہانپ رہی تھیں۔ شاہ جی کی خطابت میں شیر کی گرج اور نسیم سر کی سبک خراہی کا بہترین امتزاج تھا۔

بخاری محمد طیب صاحب قاسمی قدس سرہ مستم دارالعلوم دیوبند نے ایک مرتبہ شاہ جی کی خطابت کے بارہ میں فرمایا تھا۔

"ان کا مشور زمانہ و صفت جس میں وہ بے مثال تھے۔ خطابت تھا۔ ان کی خطابت جاذبیت کا ایک جادو تھی۔ جس میں بے پناہ کشش تھی۔ ہزاروں انسانوں کا مجمع جو تاحہ نظر پھیلا ہوا اور ان کی تقریر کی مسلسل زنجیر میں جکڑا ہوا موس ہوتا تھا۔ جس میں کسی کا اکٹا کر اٹھ جانا تو کیا معنی کوئی لہنی جگہ سے بل بھی نہیں سکتا تھا۔ ان کی تقریر اسے جکڑ کر باندھ لیتی تھی اور کیا مجال کہ کوئی شخص لہنی توجہ کو بھی ان سے ہٹا سکے۔"

"یہ کش معض الفاظ کی نہ تھی۔ اور الفاظ معض میں یہ جاذبیت ہو بھی نہیں سکتی جب تک کہ الفاظ میں گہری معنویت نہ ہو اور معض معنویت بھی زنجیر کش نہیں بن سکتی جب تک اس معنویت میں معرفت نہ ہو۔ اور معض معنویت بھی کش کے اس مقام پر نہیں پہنچ سکتی۔ جب تک کہ اس میں محبت نہ ہو۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری بے مثال خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب معنویت صاحب معرفت اور صاحب حق و محبت تھے۔ بالفاظ دیگر وہ معض انسان نہ تھے بلکہ صاحب دل انسان تھے۔ محبت نبوی ان کے دل کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ اسی سے ان کے جوش کا تعلق تھا اور اسی سے ہوش کا اور اسی سے ان کی خطابت کا چشمہ ابھرتا تھا۔ جس میں دوسروں کے دلوں کی رگ و پے میں سما جانے کی خصوصیت ہوتی تھی۔"

ایک خطیب کے لئے ذہین ہونا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ہدایت نے شاہ جی کو ذہانت میں بھی حظ وافر عطا فرمایا تھا۔ چھوٹے چھوٹے قہرے جہاں شاہ جی کی طبعی اور ذہانت کی غمازی کرتے تھے۔ وہاں وہ بہت سی حقیقتوں اور صداقتوں کو بھی اجاگر کرتے اور ایک فہیم انسان اس چھوٹے سے قہرے سے ہی مسئلہ کی گہرائی

اور گیرائی کو سمجھ جاتا۔ ان سطور میں شاہ جی کے ان شہ پاروں کو پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جن میں انہوں نے بڑی بڑی حقیقتوں کو چند لفظوں اور جملوں میں بیان کر دیا ہے۔ ان میں بعض وہ مجاہدانہ جملے بھی ہیں جو تیرگی سے الجھتے اور ستاروں سے کھیلنے ہیں۔ جن میں کچھ داستانِ حرم کے کتبے اور کچھ نغمہ حق کی نئے نوازی کے فقرات ہیں۔

### جیل خانے کی آبرو

ایک مرتبہ فرمایا کہ میں دنیا میں ایک چیز سے محبت کرتا ہوں اور وہ ہے قرآن۔ اور مجھے صرف ایک چیز سے نفرت ہے اور وہ ہے انگریز۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں نے میرے ان دو جذبوں میں بلا کی شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ محبت اور نفرت کے یہ دو زوایے ایسے ہیں کہ جن دماغوں میں اٹکا سودا ہوا ان کے لئے پایہ زنجیر ہندوستان میں جیل خانہ زندگی کے سفر کا ایک ایسا موڑ ہے۔ جہاں کبھی طلب کے خیال سے رکنا پڑتا ہے کبھی فرض کی کشاکش لے آتی ہے اور کبھی جستبوں منزل کا ٹھکانا پہنچا دیتا ہے۔ یہ صمیم ہے کہ اب جیل خانے کی "آبرو" پر بواہوسوں نے پیش دستی شروع کی ہوئی ہے۔ اور جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

لیکن ۳۱ء کی تحریک خلافت کے زمانہ قید طلب پر غور کرتا ہوں تو لگا ہوں میں ایک تصویر سی کھینچ جاتی ہے۔ میانوالی ڈسٹرکٹ جیل میں احباب کی ایک یادگار بزم، سب اہل ذوق، اہل نظر، اہل دل اور اہل علم جمع تھے۔ مولانا احمد سعید دہلوی حدیث پڑھایا کرتے۔ عبد الحمید سالک دربار اکبری کا سبق دیتے، مولوی لقاء اللہ کی نہی تلی باتیں گفتگو میں رس پیدا کرتی ہے۔ صوفی اقبال پانی پتی کے "اشتہ" خدا کی پناہ! عبد اللہ چوڑی والے کی نکمائی گالیاں تبرک کی طرح تقسیم ہوتیں اور آصف علی کھلتے تو پھولوں کے تھے چھ جاتے۔ جی خوش کرنے کے لئے مشاعروں کا اہتمام ہوتا۔ کبھی سالک صدر ہوتا کبھی آصف اور کبھی

قرص فال بنام سن دیوانہ زوند

اختر علی خاں نے ایک دفعہ معرکہ کی غزل سنائی۔ سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میرا ماتھا ٹھکا کچھ یاد سا آگیا۔ میں نے اختر سے کہا۔ میان مقطع کھو۔ وہ کسی قدر جھنجھپا میں نے کہا تو لو پھر مجھ سے سنو مقطع تھا۔

جو مے کشی سے ہو فرصت تو دو گھر ٹی کو چلو

امیر مسجد جامع میں آج امام نہیں

(امیر میانوالی)

### تین چیزوں پر ایمان

شاہ جی اکثر فرمایا کرتے تھے۔ "خدا کی عبادت، رسول کی اطاعت اور انگریز سے بغاوت یہ میرا ایمان ہے اور رہے گا۔ خدا معبود ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبوب اور انگریز مغضوب خدا کو جو جی چاہے کھو اس کا محاسبہ وہ خود کرے گا۔ مگر محمد ﷺ کے متعلق سوچ لینا یہ معاملہ عقل و خرد کا نہیں ہے یہ عشق کا



ہے۔ عشق پر زور نہیں جوتا نہ اپنے پر اختیار۔ یہ نہیں سوچا جائے گا کہ قانون کیا کھتا ہے۔ پھر جو ہونا ہو گا ہو جائے گا اور جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

باخدا دیوانہ ہاش و بامحمد ہوشیار

## صرف قرآن کی ضرورت

شاہ جی فرمایا کرتے تھے کہ میں قرآن مجید کے علاوہ کوئی دوسری کتاب پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہوں۔ جو کچھ ہے قرآن و سنت میں ہے اور جو کچھ اس کے باہر ہے وہ باطل ہے اور ایک باطل شے کے مطالعہ کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر آج دنیا قرآن کو چھوڑ کر دوسری کتابوں کی طرف نگاہ کر سکتی ہے تو میں کیوں نہ دوسری کتابوں سے روگردانی کر کے اپنی تمام تر توجہ قرآن پر مرکوز کروں۔ میں تو قرآن کا مسلخ ہوں۔ سیری باتوں میں اگر تاثیر ہے تو وہ صرف قرآن کی وجہ سے ہے۔ جو چیز مجھے قرآن سے الگ کر دے اسے اگل لگا دوں۔

## قرآن کی بلاغت

ایک موقع پر فرمایا۔

"اللہ کی کتاب کی بلاغت کے صدقے جائیے۔ خود بولتی ہے کہ میں محمد پر اتاری گئی ہوں۔ باہر اس کی قسمیں نہ سمجھایا کرو۔ اس کو پڑھا کرو۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی طرح نہ سہی۔ اقبال کی طرح ہی پڑھ لیا کرو۔۔۔۔۔ دیکھا آپ نے کہ اس نے قرآن کو ڈوب کر پڑھا تو مغرب کی دانش پر ہل بول دیا پھر اس نے قرآن کے ساتھ کچھ اور بھی نہیں دیا۔۔۔۔۔ تہہ نہ کی نہ ہے۔"

مگر قومی خواہی مسلمان زینتی  
نیت ممکن جز بقرآن زینتی

## منکرین بشریت

ایک موقع پر منکرین بشریت کو جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

"بھائی لوگو! آپ کے کبوتروں کی بھی لسل ہو اور بشریوں کی بھی لیکن ہم ایک سید ایسے ہیں کہ جن کی لسل نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تم بشر نہیں مانتے تو ہم کس کی اولاد ہوتے؟"

مدح صحابہؓ

جن دنوں مدح صحابہ اور شہر ابھی ٹیش (لکھنؤ) کا زور تھا تو شاہ جی نے دہلی دروازہ کے باہر ایک عظیم الشان اجتماع سے خطاب فرمایا۔ اور گرجدار آواز میں فرمایا۔ قدح صحابہ کرنے والو! خدا سے ڈرو۔ اتنے میں دور سے آواز آئی۔ شاہ جی خدا کا خوف کرو۔ سید ہو کر خلافت کے غاصبوں (معاذ اللہ) کی مدح کرتے ہو۔ بس اس جملے سے شاہ جی جلال میں آگئے چہرہ تہمتا اٹھا۔ پھر بلند آواز میں فرمایا۔ میں علیؑ کا بیٹا ہوں اور صدیقؑ، عمرؓ اور عثمانؓ کی مدح کرتا ہوں۔ اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ تم کون ہو؟ ہائے وہ لوگ جنہیں رسول کے پہلو میں جگہ

ملی ہو تم انہیں گالی دیتے ہو۔ ظالمو حشر کے دن آکا کو کیا جواب دو گے؟ پھر اس کے بعد صحابہ کے فصائل پر وہ تقریر کی کہ کائنات ہمہ تن گوش ہو گئی اور صرف بخاری کے قلندرانہ الفاظ ہی سنائی دیتے تھے۔

### ازواج مطہرات اور اہل بیت

۱۹۵۳ء میں مظفر علی شمس جیل سے سنیر انکوائری کمیٹی میں بیان دینے کے لئے آئے۔ بیان دے کر جب واپس گئے تو شاہ جی نے پوچھا شمس! کیا کیا سوالات ہوئے۔ شمس نے ایک سوال یہ بھی بتایا کہ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا تم ازواج مطہرات کو اہل بیت نبوت میں شمار کرتے ہو۔ شاہ جی نے پوچھا۔ اس سوال کا تم نے کیا جواب دیا مظفر علی شمس نے کہا کہ میں نے جواب دیا کہ ہم ان کو اہل بیت میں شمار نہیں کرتے یہ سننا تھا کہ شاہ جی جلال میں آگئے اور فرمایا۔

اہل گشت کے لئے بابِ گشت بند ہے  
اس قدر کم ظرف کوئی باطن دیکھا نہیں

سیدہ خدیجہؓ اور سیدہ عائشہؓ

ایک دفعہ غالباً مظفر علی شمس ہی نے دریافت کیا کہ خدیجہؓ اور عائشہؓ میں کیا فرق ہے؟

شاہ جی نے فرمایا۔

"خدیجہؓ کا نکاح محمد بن عبد اللہ سے ہوا اور عائشہؓ کی شادی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زوجہ بنیں اور یہ نبوت کی زوجہ بنیں۔"

### قبور کی زیارت

ایک مرتبہ درگاہ امام ناصر (چاندھر) کے جلسہ میں کسی نے اس وقت کا اختلاقی مسئلہ چھیڑ دیا۔ مخالفوں نے شاہ جی کے بارہ میں مشور کر رکھا تھا کہ وہابی ہیں۔ چنانچہ آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ کا واپس قبور کے بارہ میں کیا خیال ہے؟ شاہ جی نے فرمایا!

"اپنے اپنے ظرف اور ذہن کی بات ہے۔ کچھ لوگ انکور نعمت خداوندی سمجھ کر رکھتے ہیں۔ کچھ اس میں شراب نکالتے اور عقل کی بازی بدلتے ہیں۔ میں بھی مزار کی زیارت کر کے آیا ہوں اور تم بھی کرتے ہو۔ میں خدا کے فضل سے کچھ لے کر آیا ہوں اور تم ایمان میں سے کچھ دے کر آئے ہو۔"

سبواپنا اپنا ہے جام اپنا پنا

### قوم کی نفسیات

شاہ جی عام طور پر فرمایا کرتے تھے۔ میں نصف صدی اس ملک کے چپے چپے پر پھرا ہوں۔ میری قوم کی نفسیات یہ ہے کہ یہ ڈنڈے والے کے آگے اور دولت والے کے پیچھے بھاگتی ہے۔

## اذہان یورپ کے لطف و کرم کا نتیجہ

ایک مرتبہ علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں یونی کی سرزمین میں پہنچا تو میں نے اکثر لوگ ایسے دیکھے جو کالی اچکن اور سفید پاچاے پہنے ہوئے تھے مگر سروں پر انگریزی ٹوپی (ہیٹ) اور گلوں میں نکٹائیاں لٹک رہی تھیں۔ تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں غاصب یورپ کی سرزمین پر پھر رہا ہوں یا کہ غلامی کی زنجیروں سے گلو خلاصی کرنے والوں کی سرزمین میں آیا ہوں۔ تو یکایک میرے ذہن نے میری یادری کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے جسم تو آزادی کے پرستاروں میں پلے ہیں لیکن اذہان یورپ کے لطف و کرم کا نتیجہ ہیں۔"

## روس کی کتیا

شاہ جی چند احباب میں بیٹھے ہوئے تھے موضوع سننِ تہا خلائی سائنس کی ترقی۔ ایک دوست نے کہا۔ "شاہ جی! سنا ہے کہ روس کی کتیا واپس آ گئی ہے۔ شاہ جی نے فرمایا۔ بھائی مگر کرو کہ تمہاری عزت و ناموس رہ گئی ورنہ اوپر والی مخلوق کو یہی گمان ہوتا کہ نیچے ایسی ہی مخلوق ہستی ہے۔"

## میرے دل نے غلطی نہیں کی

ایک موقع پر فرمایا کہ

"میں نے جو کچھ کیا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے کیا۔ مجھے ایک لفظ کے لئے بھی اپنی کسی حرکت پر ندامت نہیں۔ میرا داغ غلطی کر سکتا ہے لیکن میرے دل نے کبھی غلطی نہیں کی۔ مجھ سے زیادہ وفاداری کا ثبوت مانگنے والے پہلے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو وفاداری کا ثبوت دیں۔"

"میں ان لوگوں میں نہیں جو انسانی ضمیر کی سواگری کرتے ہیں۔ اس شخص کو دھوپ چھاؤں کی اولاد سمجھتا ہوں جو قوم کو بھتا پھرتا ہے۔ ملک سے غداری کرتا ہے اور جس ہنڈیا میں کھلتا ہے اسی میں چھید کرتا ہے۔ میں نے صرف ایک اللہ کے سامنے جھکنا سیکھا ہے۔ میں ان لوگوں کا وارث نہیں جنہوں نے درباروں کی دبیریں چاٹی ہیں۔ میں ان کا وارث ہوں جو شہادت کے رستہ میں سروں کو ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔"

## قول کا نہیں عمل کا آدمی

ایک موقع گفتگو پر فرمایا!

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو یہ صدا دیتے پھر میں کہ میں توشہ وفاداری لئے پھرتا ہوں۔ میری اٹلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے چلو اور جس مقتل میں چاہو مجھے ذبح کر دو۔ میں خوش ہوں۔ میری خوش بلے کراں ہے کہ اس ملک سے انگریز نکل گیا۔ میں دنیا کے کسی حصہ میں بھی سامراج کو دیکھ نہیں سکتا۔ میں اس کو قرآن اور اسلام کے خلاف سمجھتا ہوں۔"

"تم میری رائے کو خود فروشی کا نام نہ دو۔ میری رائے ہار گئی۔ اس کمبانی کو یہیں ختم کر دو۔ اب

پاکستان نے جب بھی پکارا۔ واللہ! باللہ! میں اس کے ذرہ ذرہ کی حفاظت کروں گا۔ مجھے یہ اتنا ہی عزیز ہے جتنا کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہے۔ میں قول کا نہیں عمل کا آدمی ہوں۔ اس طرف کسی نے آنکھ اٹھائی تو وہ پھوڑ دی جائے گی۔ کسی نے ہاتھ اٹھایا تو وہ کاٹ دیا جائے گا۔ میں اس وطن اور عزت کے مقابلہ میں نہ اپنی جان عزیز سمجھتا ہوں اور نہ اولاد۔ میرا خون پیلے بھی تمہارا حساب بھی تمہارا ہے۔"

## انگریز کی فطرت

ایک موقع پر فرمایا:

"انگریز کی فطرت کا خمیر سانپ کے زہر سے اٹھایا گیا ہے۔ اور اپنی غذا کے لئے اسے انسانی خون کی جو چاٹ پڑی ہوئی ہے بڑی مشکل سے چھوٹے گی۔"

## ہندوؤں کا خدا

شاہ جی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ۔

"ہندو قوم مسلمانوں کا کیا مقابلہ کرے گی جس کا خدا (گائے) مسلمانوں کی غذا ہے"

## قادیانیوں کو خطاب

ایک دفعہ شاہ جی نے قادیانیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے قادیانیو! اگر نیا نبی ماننے بغیر تمہارا گزارا نہیں ہو سکتا اور اس کے بغیر تم جی نہیں سکتے تو ہمارے مسٹر جناح ہی کو نبی مان لو۔ ارے مرد تو تھا۔ جس بات پر ڈٹنا کوہ کی طرح ڈٹ گیا۔ آپہوں کے بادل اٹھے، اشکوں کی گھٹا چھائی، خون کی ندیاں بہہ گئی۔ لاشوں کے انبار لگ گئے۔ مگر کوئی چیز مسٹر جناح کے عزم کو نہ ہلا سکی۔ اس نے تاریخ کے اوراق کو پلٹ دیا اور ملک کے جغرافیہ کو بدل کر رکھ دیا۔ ارے تمہاری نبوت کو بھی لٹ پٹ کر جگہ ملی تو اسی کے قدموں میں تمام عمر گزار دی مگر انگریز کی نوکری نہیں کی حکومت سے خطاب نہیں لیا۔ انگریزوں سے کوئی تمنا وابستہ نہیں کی۔ اور ایک تمہارا نبی ہے کہ حضور گورنمنٹ کے آگے عاجزانہ درخواستیں کرتے کرتے پچاس لاکھ روپے لے کر لوٹے۔"

## جماعت کا بت

ایک مرتبہ شاہ جی دفتر احرار دہلی دروازہ لاہور میں تشریف فرما تھے۔ کئی اور احباب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہ جی کے سامنے اخبار آیا جس کی شہ سرخی تھی کہ "حکومت نے مجلس احرار پر پابندی لگا دی" یہ سرخی پڑھ کر شاہ جی فرمانے لگی۔

"لو! یہ بھی ایک بت ٹوٹا" پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمانے لگے کہ جماعت کسی مقصد کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جماعت خود مقصد بن جاتی ہے۔ اس وقت جماعت ایک بت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ کیونکہ پھر جائز و ناجائز طریق سے آدمی اس جماعت کا دفاع کرتا رہتا ہے اور بت کی تعریف یہ ہے کہ جو چیز آپ کو اٹھ تک پہنچنے سے روکتی ہے وہ بت ہے۔

## سیاسی بصیرت

شاہ جی ایک درویش طبع انسان تھے۔ لیکن سیاست میں بھی انہیں ایک خاص بصیرت عطا ہوئی تھی۔ وہ "کلندر ہرچ گوید دیدہ گوید" کے مصداق تھے۔ آپ کی وہ تقریر جو انہوں نے ۲۶ اپریل ۱۹۴۶ء کو اردو پارک دہلی میں قریباً پانچ لاکھ کے اجتماع میں کی۔ ان کی سیاسی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ نے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس وقت آئینی اور غیر آئینی دنیا میں یہ بحث چل رہی ہے کہ آیا ہندوستان میں ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت سے جدا کر کے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے؟ قطع نظر اس کے کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ اس بات پر کہ صبح کو سورج مشرق سے طلوع ہو گا۔ لیکن یہ وہ پاکستان نہیں بنے گا جو دس کروڑ مسلمانان ہند کے ذہنوں میں موجود ہے اور جس کے لئے آپ بڑے خلوص سے کوشاں ہیں۔ ان تخلص نو جوانوں کو کیا معلوم کہ کل ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

"بات جھگڑے کی نہیں سمجھنے اور سمجھانے کی ہے۔ لیکن تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والوں کے قول و فعل میں ہلاک اقتصاد اور بنیادی فرق ہے۔ اگر مجھے کوئی اس بات کا یقین دلائے کہ کل کو ہندوستان کے کسی حصہ کی گھٹی میں یا شہر کے کسی کوپے میں حکومت الیہ کا قیام اور شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے تو رب کعبہ کی قسم! میں آج ہی لہنا ب کچھ چھوڑ کر آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں"

"لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنی اڑھائی من کی لاش اور چھوٹے ہڈ پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکتے جن کا اٹھنا بیٹھنا، جن کا سونا، جن کا جھگڑا، جن کی وضع قطع، جن کا رہن سہن، بول چال، زبان و تہذیب، کھانا پینا، اور لباس وغیرہ غرض کہ کوئی چیز بھی اسلام کے مطابق نہ ہو وہ دس کروڑ کی انسانی آبادی کے ایک قطعہ زمین پر اسلامی قوانین کس طرح نافذ کر سکتے ہیں؟ یہ ایک فریب ہے اور میں یہ فریب کھانے کے لئے تیار نہیں۔"-----

"ہندو لہنی مکاری اور عیاری سے پاکستان کو ہمیشہ تنگ کرتا رہے گا۔ اسے کمزور بنانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اس تقسیم کی بدولت آپ کے دریاؤں کا پانی روک لے گا۔ آپکی معیشت تباہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ آپ کی یہ حالت ہو گی کہ بوقت ضرورت مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی اور مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کی کوئی سی مدد کرنے سے قاصر ہو گا۔ اندرونی طور پر پاکستان میں چند خاندانوں کی حکومت ہو گی اور یہ خاندان زمینداروں، صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کے خاندان ہوں گے۔ امیر دن بدن اسیر تر ہوتا چلا جائے گا اور غریب غریب تر۔۔۔۔"

(روزنامہ جمعیت دہلی ۲۵ اپریل ۱۹۴۶ء۔ بحوالہ کراچی قائد اعظم مصنفہ منشی عبدالرحمن بلتان)  
شاہ جی کی یہ چند باتیں محض جو کارکنین کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ مگر نہ انہی زبان کا ایک ایک بول ایک انمول موتی تھا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جس شخص نے ابو حنیفہ وقت حضرت مفتی محمد حسن صاحب دھس سرہ عظیم ارشد حکیم اللہ تھانوی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ہو اور شیخ العصر، خاتم الہدین علامہ انور شاہ کشمیری کے چہرہ سے علم کبید کیا ہو اس کے منہ سے ایسی باتیں غیر متوقع بھی نہیں۔

## نہ کر سکے گی کبھی موت پائمال اُسے

بساطِ وقت سے افسوس اٹھ گیا وہ خطیب  
مزاجِ عصر کا جو عمر بھر طیب رہا  
وہ جس کے فکر و عمل میں فرشتگی تھی اسیر  
تمام عمر جو اخلاص کا نقیب رہا!  
ہیولا بن کے جھپٹتا رہا جو باطل پر  
مخالفت کے ہر ایک جبر کا رقیب رہا  
یہ واقعہ ہے کہ جس نے سنا نہ اسکا سخن  
حصولِ علم بصیرت میں کم نصیب رہا  
تھا اسکا قلب حرمِ صفات کا مرم  
خلوصِ عشقِ ممد کی سلبیل لئے  
وہ اک شعورِ مبسم تھا عظمتِ دس کا  
حقِ آئیں کی نگہبانی جمیل لئے  
شکوہ و عظمتِ ملت کا پاسدار رہا  
سخن تھا اس کا تب و تابشِ جلیل لئے  
وہ اس کی صدقِ بیانی وہ اس کا صدق و خلوص  
تلاش کرتا تھا خود شاہدِ مقال اسے

گزر گیا جو ہر گھسیٹ اک موڑ کاٹ کر غم کا  
ڈرا سکا نہ کبھی موت کا جلال اسے  
بھل سکی نہ جے صر صر حوادث بھی  
خدا نے بننا تھا وہ دردِ لازوال اُسے  
ستیزہ کار رہا شاطِ فرنگی سے  
تمام عمر رہا قوم کا خیال اُسے  
اُتر گیا جو دلِ قوم میں لبو بن کر  
نہ کر سکے گی کبھی موت پائمال اُسے

## شاہ جی، ایک متحرک شخصیت

قافلے ہاد بہاری کے جدھر جاتے ہیں  
پھول تو پھول ہیں کانٹے بھی نکھر جاتے ہیں

ہم کہہ سکتے ہیں کہ امیر شریعت کے بیان و تقریر میں تاثر کا سبب ان کا روحانی تزکیہ بھی تھا کیونکہ انہوں نے عنفوان شباب میں سلوک و طریقت کی کئی منزلیں طے کی تھیں۔ اور سرزنش نفس کے لئے دو دو سال تک متواتر روزے رکھے۔ چھ چھ گھنٹے میں قرآن مجید ختم کیا۔ شب زندہ داری کا یہ عالم تھا کہ خود فرمایا کرتے تھے میں نے ستاروں سے بازی لادی تو انہیں ہرا دیا۔ جب ریاضت طبعیت پر غالب آجائے تو پھر زبان کا رس سر آفرینی کا کام کرتا ہے۔ زمین کی وحشیں اس کے آگے سمٹ کر رہ جاتی ہیں اور فضا پر اس کی حکمرانی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ہم نے بارہا محسوس کیا کہ جب امیر شریعت کی خطابت زور پر آتی تو زمین اور آسمان کے درمیان سکوت کا عالم طاری ہو جاتا اور کائنات کا ذرہ ذرہ جھومتا نظر آنے لگتا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریز نے ہندوستان پر رولٹ ایکٹ رائج کیا تو ملک میں نفرت و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی امر سر میں جلیا نوالہ باغ کا واقعہ مزید عظیم و غضب کا سبب بنا۔ مسلمانوں میں تحریک خلافت نے سر اٹھایا۔ ظلم و تشدد کے خلاف احتجاج کی بنیاد ڈالی گئی۔ مولانا داؤد غزنوی نے اس موقع پر نہایت جسارت سے کام لیا اور انگریز کے خلاف سر دھڑکی بازی لادی۔ اسی اثناء میں مولانا داؤد غزنوی نے امیر شریعت کو اپنا ہم خیال بنا کر آمادہ احتجاج کیا۔ یہاں طبعیت پہلے ہی سے معرکہ حق و باطل کے لئے تیار تھی۔ فوراً سیاسی خطیب کی حیثیت سے میدان عمل میں آگئے۔ ہندوستان کا چپہ چپہ چان مار اور انگریز کے خلاف ایسی مدلل اور ولولہ انگیز تقاریر کہیں کہ ظالم کے ایوان استبداد میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ آپ نے عمر عزیز کا ہر لمحہ استخلاص وطن کے لئے وقف کھویا۔ ان کا ایک جملہ ہمیشہ احباب کے درمیان گھومتا رہا ہے۔ وہ زندگی کی تقسیم پر فرمایا کرتے تھے۔

”کچھ ریل میں کٹ گئی اور کچھ جیل میں کٹ گئی“

عقیدہ کے لحاظ سے امیر شریعت حنفی مسلک کے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے اسلاف سے انہیں وابستہ عقیدت تھی نہ تو کٹر وہابی تھے اور نہ روایتی صوفی۔ وہ تصوف کو اسلام کی جزو سمجھتے تھے۔ اور ہر سلسلے کے بزرگوں سے انہیں قلبی ربط تھا۔ قدوة السالکین حضرت مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ گوڑہ شریعت سے بیعت تھے۔ ان کے وصال کے بعد لہسنی روحانی لڑتوں کو برقرار رکھنے کے لئے حضرت شیخ عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کر لی۔ اس طرح سے امیر شریعت کی زندگی دو کامل بزرگوں کے درمیان بسر ہونے لگی۔ اور یہ کبھ دینا بھی ہے ہا نہ ہو گا کہ امیر شریعت کی زندگی مجموعہ اصدا تھی۔ ملنگوں میں ملنگ خلیفوں میں خلیفہ۔ حالموں میں عالم درویشوں میں درویش اور سیاست دانوں میں غضب کے سیاست دان۔ ان کی مغل میں جب بھی کسی کو بیٹھنے کی سعادت ملی تو وہ پکار اٹھتا

پر تو منت نہ کبھد در زمین و آسمان  
اندرون خانہ حیرانم کہ چوں جا کردہ

مفضل کو ہمیشہ کثرت زعفران بنا دیتے۔ مستدین اساتذہ کا کلام از بر تھا۔ فارسی عربی اور اردو کے اشعار اس سلیقہ سے ادا کرتے کہ جاہل سے جاہل انسان بھی مضموم و معنی پانے میں دقت محسوس نہ کرتا۔ اور ہر طرح کے طبائع کو لطف اٹھانے کا موقع ملتا۔ ان کی مفضل میں امیر و غریب کے ساتھ برابر کا سلوک کیا جاتا۔ اور ہر ایک یہ خیال لے کر اٹھتا کہ امیر شریعت میرے ہیں گویا وہاں خلوص و محبت کے ایسے گلدستے تیار کئے گئے تھے کہ جن کی مہک اور خوشبو سے ہر طبقہ کے لوگ فیض یاب ہوتے۔ امیر شریعت حزن و یاس کے عالم میں بھی ہمیشہ خندہ پیشانی سے رہے۔ اور ہر مصیبت کو اس طرح لبیک کہا کہ شاید ان کی آغوش میں آکر پیغام مسرت و رحمت بن گئی ہے۔ ان کا اگر کوئی کمزور پہلو تلاش کیا جائے تو اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ وہ حسن کے فریفتہ تھے۔ حسن کائنات کی جس چیز میں بھی انہیں نظر آتا وہ اس پر وارفتہ ہو جاتے۔

ناصر کو بلاؤ میرا ایمان منب لے  
پھر دیکھ لیا اس نے محبت کی نظر سے

امیر شریعت کو تذہبی القرآن کا مکملہ ازل ہی سے ودیعت ہوا تھا۔ زندگی بھر مسائل مختلفہ پر قرآن مجید کی آیتیں تلاش کرتے رہے۔ اور اس کی تائید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آئمہ کبار کے حالات جمع کرنے میں لگے رہے۔

لطیفہ بازی اور برجستہ گوئی میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا۔ جب خطابت کی سر آفرینیوں کا جلوہ دکھاتے تو جم غفیر کو آہ و بکا، نالہ و فریاد پر مجبور کر دیتے اور پھر اسی لمحے میں ظرافت کے ایسے پھول بکھیر دیتے کہ تمام کا تمام مجمع ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

ہر علاقہ کی زبان پر انہیں تصرف و تبحر تھا۔ اور ہر علاقہ کے اطفال و عادات سے بھی کماحقہ واقف تھے۔ جہاں گئے لوگوں نے آنکھیں پھا دیں۔ لیکن اپنے دادا جان اور والدہ ماجدہ کی سنت کے مطابق بے انتہا بے نیاز تھے کسی سے کوئی چیز لینے کے روادار نہ تھے۔ البتہ اپنے مخلصین کے تحفے قبول فرماتے تھے۔ سادگی کا یہ حال تھا کہ بعلیٰ اختر آبادی۔ غریب خانہ پر قدم نہ رنجہ فرمایا۔ گھر میں رولت افزو ہوئے تو ہر کسی کی مزاج پر سی فرمائی۔ میری بیوی نے عرض کیا اباجان کھانا تیار ہے۔ یہاں تناول فرمائیں گے یا در پر۔ فرمایا بیٹی تمہارے پاس چٹائی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ میں بیٹھ کر کھالوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ بین الاقوامی شہرت کا وہ خطیب جو ہر نظر میں محبوبیت کا درجہ رکھتا ہو جس کی توجہ کا مستحق بڑے سے بڑا آدمی ہو۔ اس سادگی کے ساتھ ایک غریب انسان کے ہاں تلطف و آمیزیاں فرما رہا ہو کہ جس کی مثال آج ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی۔ میری بھی عطیہ بتول ان دنوں کوئی سال دو سال کی ہوگی۔ آپ کے سامنے کھیل رہی تھی۔ اسے اٹھا کر گود میں بٹالیا۔ میں نے عرض کیا حضرت اس نے اگر پیشاب کر دیا تو آپ کو زحمت ہوگی۔ فرمایا بابو تمہیں ان کی عظمت کا اور عزت کا کیا پتہ (میرے میاں) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا مقام پوچھو۔ میرا بھانجہ حبیب



الرحمن سولہنگی آپ کا مرید تھا۔ زندگی کی ۱۹ویں بہار دیکھ رہا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہا امیر شریعت پہلے ہی سے اس کی علالت پیسم کا علم رکھتے تھے۔ میں نے اس کے انتقال کی اطلاع کی تو بہت زیادہ غمزوں خاطر ہوئے اور جواب میں صرف یہ شعر لکھ دیا

گر پیر نود سالہ بمیرد عجیبے نیست

ایں ماتم سنت است کہ گویند جواں مرد

پھر ملاقات پر کچھ ایسے انداز میں اظہار تعزیت فرمایا کہ جانتا ہوا صبر پھر لوٹ آیا۔ لاریب یہ کہنا پڑے گا کہ امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات میں انسانیت کا احترام اور دوستوں، عزیزوں کی پریشانیوں کا دکھ درد بدرجہ اتم تھا۔ وہ جب بھی کسی کو آرزوہ خاطر دیکھتے تو مضطرب ہو جاتے۔ اس معاملہ میں ان کا یہ نظریہ تھا۔

صدیوں کی جان درد کا قالب دیا مجھے

جو کچھ دیا کسی نے مناسب دیا مجھے

حالات کے خاکے بتلاتے ہیں کہ امیر شریعت کے نظریات میں پیچگی اور اصول کی پاسداری کا لحاظ نہایت ضروری تھا۔ ان کے سلسلہ مؤثر و ارادت میں جو بھی ایک دفعہ منسلک ہو گیا وہ عمر بھر کے لئے انہی کا ہو گیا۔ حتیٰ کہ ایسے لوگ بھی امیر شریعت سے وابستہ رہے ہیں جنہیں ان سے سیاسی اختلاف تھا۔ مگر تعلقات میں کبھی کوئی فرق نہ آنے پایا۔ یہ اس لئے کہ وہ ایک مومن کا ایمان اور مسلمان کا اخلاق رکھتے تھے۔ ان کا دل ہر طرح کی گرد کدورت سے صاف تھا۔ علامہ اقبال مرحوم سے دلی تعلق پیدا ہوا تو ہمیشہ اس کے احترام کا خیال رکھا۔ جب کبھی ان کے ہاں جاتے تو راز و نیاز کی باتیں ہوتیں ان کی سنتے اور اپنی سناتے۔ وہ کوئی تازہ نظم سناتے تو حضرت امیر شریعت داد دیتے۔

برہمی ہستیوں کے بارے میں ان کی رائے اٹل ہوتی گاندھی جی کو سیاست کا ہمتا مانتے۔ پنڈت موتی لال لورسری آرداس کو پکا نیشنلسٹ مالویہ جی اور ولجہ بھائی پٹیل کو کٹر ہندو، مولانا آزاد کو علم کا بحر بیکراں، جواہر لال نہرو کو ایک سیاسی انسان، مولانا حسین احمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو تھوڑی و طہارت کا مہم، مولانا مفتی کفایت اللہ کو وقت کا ابو حنیفہ سمجھتے تھے۔

شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ کو براکھنہ والوں کے متعلق فرماتے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت عطا فرمائے تاکہ وہ شاہ اسماعیل شہید کے مقام کو پہچان سکیں۔ صاحب زادہ طاہر محمود صاحب گورنر جو طبقہ بریلویت سے مانوس ہیں ملتان میں حضرت امیر شریعت سے اس ارادے کے ساتھ ملنے گئے کہ

اسماعیل شہید اور تقوۃ اللہ الایمان کے بارے میں ان سے استفسار کیا جائے۔ چنانچہ جب امیر شریعت کے ہاں پہنچے تو آپ نے حسب معمول مزاج پرسی فرمائی۔ صاحبزادہ طاہر محمود صاحب سے نہایت ہی محبت سے پیش آئے اور فرماتے رہے کہ آپ خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ چاچڑوی کی نسل سے ہیں اس لئے مجھ پر احترام کرنا واجب ہے۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید کے بارے میں بات چٹھڑگئی تو الماری کی طرف اشارہ کر کے فرمایا اس سے کتاب منصب امامت نکال لالہ کتاب لائی گئی آپ نے اس کی وہ عبارت پڑھ کر سنائی جو

انبیاء نوع دیگر اند کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ پھر فرمایا۔ صاحبزادہ صاحب منصب لامت کی زبان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ الایمان کی عبارت شاہ اسماعیل شہید کے قلم کی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ منصب لامت اور تقویٰ الایمان کی زبان میں بیان و انداز کا تضاد ہے۔ حضرت امیر شریعت کے اس نظریہ نے صاحبزادہ موصوف کے دل میں ایسا گھر کیا کہ وہ آج تک شاہ اسماعیل شہید کے بارے میں رطب اللسان میں اور حضرت بخاری کے مدح خواں۔

اسلام پور تحصیل لیاقت پور میں اہل سنت و شیعہ حضرات کی ہمیشہ سے مذہبی چپقلش رہی تھی۔ جانین سے مناظرہ مباحثہ اور عہادہ کی سال بہ سال تیاری ہوتی رہتی۔ جلسہ منعقد ہوتا تو دونوں طرف کے علماء اپنے اپنے پینڈال میں ایک دوسرے کی تردید کرتے اور زور خطابت سے اپنے دعویٰ کو سہا دیکھانے کی کوشش کرتے۔ حضرت امیر شریعت اہل سنت کے جلسہ میں تشریف لائے تو منتظمین جلسہ سے کہا میاں اس طرح سے کوئی معاملہ طے نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی پر حقیقت مشکف ہوتی ہے۔ بلکہ ضد اور مخالفت کو راہ ملتی ہے۔ آپ کی تقریر کے وقت کا اعلان ہوا تو سنی اور شیعہ دونوں جلسہ گاہ میں آسجود ہوئے۔ شاہ جی نے خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا۔ میں جنگ لڑنے نہیں آیا اور نہ ہی مناظرہ و مباحثہ کا قائل ہوں۔ میں برہان و دلائل کے زور سے کسی کو کوئی بات سنانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ شیعہ حضرات سے صرف اتنا کہوں گا کہ وہ چار آدمی اپنی طرف سے ایسے تیار کریں جو صلی فطرت ہوں۔ میں ان کے ساتھ مدینہ منورہ جانے کو تیار ہوں۔ وہاں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آستان مقدس پر عرض کیا جائے گا کہ حضور اصحاب ثلاثہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرمادیں۔ اگر حضور نے جواباً فرمایا کہ یہ میرے ہیں تو پھر تمہیں بھی ان پر ایمان لانا پڑے گا۔ اور اگر حضور نے کوئی جواب مرحمت نہ فرمایا تو پھر میں تمہارا ہی عقیدہ و مسلک اختیار کر لوں گا۔ حضرت امیر شریعت کا یہ فرمانا تھا کہ جلسہ گاہ کی فصاحت اللہ اکبر کے فلک شگفت نعروں سے گونج اٹھی اور اس کا یہ اثر مرتب ہوا کہ پھر کبھی مناظرانہ انداز میں وہاں پر جلسے و جلوس منعقد نہ ہوئے۔ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی اس تقریر نے ان کے عقیدہ کو بھی صاف کر دیا جو کہ بعض لوگوں کے دلوں میں کھٹک رہا تھا شاہ جی حیات انبیاء کے قائل تھے یا نہیں بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ جن لوگوں کو اسلاف دیوبند سے گھر اور قریب کا واسطہ ہے وہ حیات انبیاء کے منکر ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ علمائے دیوبند کا ہر فرد گرامی حیات انبیاء کا قائل ہے اور یہ عقیدہ حضرات دیوبند کے نزدیک اصول کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند سے لیکر مسم دارالعلوم قاری محمد طیب کی ذات تک اس بات کے قائل ہیں کہ حضور پر نور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم روضۃ الطہر میں حیات حسنی کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ نے تو ایک مکتوب میں زیارت قبر نبوی کے متعلق حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو مرجوح قرار دیتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے۔ کہ مدینہ منورہ کی حاضری محض سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور آپ کے توسل کی غرض سے ہونی چاہیے۔ آپ کی حیات مطہرہ نہ صرف روحانی ہے جو کہ عام مومنین اور شہداء کو حاصل ہے بلکہ بہت سے وجہ سے اس سے بھی قوی۔ آپ

سے تو مل نہ صرف وجود ظاہری کے زمانہ میں کیا جاتا تھا بلکہ اس سے برزخی زمانہ میں بھی کیا جانا چاہیے۔

یہی بات تھی کہ حضرت امیر شریعت و فوق کامل کے ساتھ یہ اعلان فرما رہے تھے کہ اصحاب تلامذہ کے متعلقین سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ استفادہ کر لینا چاہیے تاکہ حقیقت کا اصلی پہلو واضح ہو سکے۔ چونکہ حیات انبیاء کے عقیدہ کا اجمالاً ذکر چھڑ گیا تھا اس لئے اس کی تفصیل پر چند سطور لکھنے پڑے ورنہ ہمارا موضوع صرف حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے صفات و کردار کا ذکر کرنا ہے۔ جن سے اللہ تعالیٰ نے انہیں خصوصیت کے ساتھ نوازا تھا۔

یوں تو اس دنیا میں بہت سے مقرر و خطیب نامور حیثیت سے رونما ہوئے۔ لیکن امیر شریعت کا مقام کچھ اور نوعیت کا تھا۔ وہ خطابت کے وقت موافق و مخالف کو انگشت بداندال کر دیتے اور دلوں کی بازیابی طرح سے جیت لیتے کہ کسی کو جمال اعراض و انکار نہ ہوتی۔ انگریزی سامراج کے خلاف ان کی خطابت زوروں پر تھی۔ سکھر میں احرار کانفرنس کے موقع پر رات کے دس بجے تقریر کا آغاز ہوا۔ حکومت کا ٹوہنی طبقہ اس تاک میں بیٹھا تھا۔ کہ شاہ جی کوئی ناساںب جملہ استعمال کریں تو حشر بپا کیا جائے۔ آپ نے لہجہ کو ذرا تلخ کرتے ہوئے فرمایا جو استقلال و وطن کا حامی نہیں وہ پلید و ناپاک جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ آپ کا یہ کھنا تھا کہ مخالف طبقہ نے پنڈال کو سر پر اٹھالیا۔ لیکن اس باوقار خطیب نے نہایت جلال کے ساتھ لوگوں کے دلوں پر اپنا اثر جمال لیا۔ کانفرنس کی فضا میں کوئی تغیر نہ آنے دیا۔ آواز میں اس وقت بجلی کی سی لکڑ تھی۔ لکھار کر فرمایا "برطانیہ کے سلطان دم بریدہ غور سے سنو۔ تمہارے آکا کو یہاں سے بستر گول کرنا پڑے گا۔ اور میں پھر بھگتا ہوں کہ جو وطن کی آزادی کا علمبردار نہیں وہ پلید و ناپاک جانور سے بھی بدتر ہے۔"

سبحان اللہ یہ آواز ایک ہادی کی گرج سے کم نہیں تھی۔ سارے پنڈال پر سناتا چھایا ہوا تھا۔ اور امیر شریعت کی صداقت آفرین اور بیدار دلوں کے قلعے فتح کر رہی تھی۔ کلام اللہ کی آیت پر آیت استدلال کے طور پیش فرما رہے تھے۔ رات گزرتے کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ صبح پانچ بجے جب مؤذن نے اذان دی تو حضرت امیر شریعت نے یہ فرماتے ہوئے تقریر ختم کی افسوس کہ

مؤذن اذان بے ہنگام برداشت

امیر شریعت کی خطابت میں مضمون قرآن کا بڑا دخل تھا۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے تدبر فی القرآن کا ایسا ملکہ عطا کیا تھا کہ وہ کلام اللہ سے دین و دنیا کی ہر شے تلاش کر لیا کرتے تھے۔

پچھلے اوراق میں بیان کیا گیا ہے کہ امیر شریعت کو میدان سیاست میں لانے والے مولانا داؤد غزنوی تھے۔ انہوں نے حضرت امیر شریعت کی ہتھکڑیاں آفرین فطرت کو خوب ابھرنے کا موقعہ دیا۔ آپ کا طوطی بولنے لگا۔ مولانا ظفر علی خان، مولانا داؤد غزنوی، جدوہری افضل حق، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، خواجہ عبد الرحمن غازی اور مولانا مظہر علی اظہر رحمہم اللہ نے ۱۹۲۹ء کو جماعت احرار کی بنیاد ڈال کر پنجاب کی سیاسی زندگی کو بیدار کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اور حضرت امیر شریعت کو احرار کا پہلا صدر منتخب کیا۔

احرار ذہن کا نگرہیں کے ساتھ تھے۔ اس لئے سول نافرمانی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اس عرصہ میں

انہوں نے ہندو ذہنیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس لئے احرار نے جولائی ۱۹۳۱ء کو پہلی کانفرنس حبیبیہ ہال لاہور میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کی صدارت میں منعقد کی اور جد آگاہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔ اسپر ہندو پریس آتش زیر پا ہو گیا۔ اور احرار پر کانگریس سے باغی ہونے کا الزام تراشنا شروع کر دیا۔ چونکہ احرار ہندو ذہنیت سے باخبر ہو گئے تھے۔ اس لئے دوبارہ ان کے ساتھ شریک کار نہ ہو سکے۔ جماعت احرار پورے اخلاص سے کام کرتی رہی اور ملک کے مشکلات کے حل کی تدبیریں سوچتی رہی۔ امیر شریعت کا وجود سراپا احرار تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں مرعوب نہیں کر سکتی تھی۔ اللہ کا نام لے کر میدان عمل میں کود پڑتے۔ پنجاب کے رگ و پے میں طلب آزادی کا خون دوڑ گیا۔ امیر شریعت جہاں بھی جاتے لوگ ان کی راہوں پر پھلکیں بچھاتے۔ وہ قرآنی منہز کے ساتھ عوام کو دین و سیاست کی پریچ راہوں سے آشنا فرماتے۔ مسلمان کو ان کے مقام سے باخبر کرتے۔ اور بدعات و رسومات کے جادو کو توڑنے کے لئے قرآن حکیم کے مجرب نسخے بتاتے۔ آپ کے اس طرز تبلیغ نے علماء کے دلوں میں آپ کا احترام پیدا کر دیا تھا۔ اور وہ اس بات کے معرفت تھے کہ جو کام ہم نے نہ ہو سکا اس کو حضرت بخاری کی مجاہدانہ روش اور مخلصانہ کاوش نے بدرجہ احسن انجام دیا ہے۔ یہی تاثر تھا کہ محدث العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ نے برصغیر ہندوستان کے پانچ سوجید علماء و صلحاء کی معیت میں حضرت امیر شریعت کے ہاتھ پر سیاسی و دینی امارت کے لئے بیعت جہاد کی۔ اس طرح سے آپ علماء ربانین اور صلحائے کاملین کی نظر میں امیر دین و مہدویت کے درجہ میں آ گئے۔ اور مسلم قوم کا درد پہلو میں لیکر قریہ قریہ اور بستی بستی پھرتے رہے۔ بے علم مسلمانوں کو صرف الاسلام علیکم سکھانے میں کئی برس لگا دیئے۔ تاکہ اسلامی معاشرہ اصول دین سے واقف ہو سکے۔ قوم کو عریانی و بے حیائی میں مبتلا پایا تو صرف اس موضوع پر مہینوں بولتے رہے حتیٰ کہ بیت الخلاء تک کے آداب سکھا دیئے۔ حسن اخلاق اور موافقات کے رشتوں کو جوڑنے کے لئے پند و نصائح کے باب کھول دیتے تو سخت سے سخت دل انسان بھی موم کی طرح پگھل جاتا۔ جاہلانہ رسوم و رواج کو نیست و نابود کیا اور عقائد باطلہ کے شبر خبیث کی جڑیں کاٹ ڈالیں۔ لوگوں کی گالیوں کا جواب ہمیشہ دعا اور طلب ہدایت کے رنگ میں دیا۔ اپنوں کو گود میں بٹھایا تو غیروں کو گنگے لگایا۔ ہر ایک کے حق میں اللہ تعالیٰ سے بھلائی چاہی۔ اور ہر کسی سے بے لوث محبت کی۔ بہت سی ماؤں کے بیٹے، بسنوں کے بھائی، چھوٹوں کے ابا اور بڑوں کے رازداں تھے۔

اپنے ساتھیوں کی ہمیشہ عزت کرتے اور عوام کے سامنے انہیں اونچا دکھاتے۔ جن جن گھرانوں سے انہیں خصوصی تعلق ہو گیا تھا۔ ان کے حالات سے باخبر ہونے کی کوشش کرتے اور ان کے اعزاز و تکریم کا پورا خیال رکھتے۔

سرٹھکی علاقے کا عمومی ذہن بدعات و رسومات کا دل دادہ اور غلط طریق پر تصوف کے استعمال کا عادی ہے۔ حضرت امیر شریعت نے قرآن و سنت کی روشنی میں جب یہاں تبلیغی دورہ کیا تو ایک طرہ نے ان کے غلط و ہابیت کا طور مار کھڑا کر دیا۔ یہ بات ان کے کانوں میں پہنچی تو فرمایا۔ "میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اور نہ کوئی نیا الزام ہے۔ قوم کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ ہمارے واعظ اور مقرر ہی کچھ اس طرح کے

واقع ہوئے ہیں کہ وہ قوم میں رسومات بد پھیلا کر اپنی من مانی کرانا چاہتے ہیں۔ اور مجھ سے اسے دور رکھنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ناامید نہیں ہوں۔ قوم میں اب بھی صلاحیت باقی ہے۔ پھر اس طغیانی کے ساتھ اس علاقے کا دورہ کیا کہ ہر ہر گھر میں امیر شریعت کی آواز پہنچی۔ اور لوگوں نے دین کی سجد و صبح معرفت حاصل کر لی۔

خانپور شہر میں میراث پر تبلیغ کی تورات ہی رات میں ایسے ایسے گھرانوں نے اپنے مال کو شرعی طور پر تقسیم کر ڈالا۔ جن کے خاندانی روایات میں اس طرح کی تقسیم ورثہ کا ذہن ہی نہیں تھا۔

وہ جس موضوع کو اپنی خطابت میں چن لیتے اس پر اس قدرت کے ساتھ براہین و دلائل لاتے کہ سامعین کو بجز تسلیم کرنے کے اور کوئی چارہ ہی نہ ہوتا۔ اور نہ ہی کسی کو مزید سوچنے کی توفیق ملتی۔ ان کی خطابت میں آواز خوش سونے پر سہاگے کا کام کرتی جو ذہن کے بالا خانوں سے ٹکل کر دل کی گھرائیوں تک جا پہنچتی۔

انگریز دشمنی ان کا ایمان تھا۔ وہ کسی ایسی طاقت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جس نے چراغ معطفی کے گل کرنے کی جدوجہد کر رکھی ہو۔ وہ ہمیشہ دشمنان دین سے نبرد آرتا رہے۔ اور اسی جذبہ کے تحت کلکتہ سے خیبر تک اور سرری نگر سے راس کھاری تک کی دور لگائی کوئی ایسا گاؤں اور شہر نہ تھا جس نے امیر شریعت کی درد برہی پکار نہ سنی ہو۔ اور ان کی ایمان افروز تقریر سے بہرہ اندوز نہ ہوا ہو۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی و شیخ الحد مولانا محمود حسن رحمہما اللہ نے ایک راستہ دکھایا تھا میں اس پر چل کر اپنی آخرت کا سامان بنا رہا ہوں۔

بہاول پور جب نواب صاحب بہاول پور کے زیر نگین تھا تو وہاں پر سیاسی مقررین کے خطاب کرنے کا کم موقع ملتا تھا۔ کیونکہ یہاں کے قوانین ہی کچھ ایسے تھے۔ لوگوں نے دو دروہوپ کر کے حضرت امیر شریعت کے داخلہ کی اجازت لی۔ آپ شریعت لائے۔ عید گاہ میں جلسہ کا انتظام کیا گیا۔ حد نظر تک لوگوں کا ہجوم تھا قی و حر نے جو جگہ نہ تھی۔ آپ کلباشی ہاتھ میں لئے سٹیج پر شریعت لائے۔ لوگوں نے دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ استقبال کیا۔ نعرہ تکبیر سے فضا گونج اٹھی۔ خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا۔ میں یہاں سیاسی تقریر کرنے نہیں آیا میں نواب بہاول پور اور ان کے خاندان کا احترام کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ریاست بہاول پور کو سرسبز و شاداب رکھے۔ مجھے یہاں پر دین کی خوشبو آتی ہے۔ مگر میں یہ پوچھتا ہوں کہ میرے داخلہ پر پابندی صرف اس جرم کے عوض ہے کہ میں ۱۸۵۷ء کے خونی واقعات پر پردہ ڈالنے والوں کو صرف اس لئے غدار کہتا ہوں کہ وہ اسے غدر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی شہزادوں کا خونی گیلی پولی کے مقام پر دروازہ پر لٹکایا جانا۔ گیلی پولی کے مقام پر ٹوانوں اور نونوں وغیرہ کی مصطفیٰ اسماعیل کے خلاف نبرد آزمائی کرنا۔ قسطنطنیہ کے بازاروں میں خلیفۃ المسلمین کی بیٹی کو گھسیٹنا، سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اوپر گولہ باری کرنا اور غلاف کعبہ کا جلانا۔ حرم کے کبوتروں کا زخمی ہونا۔ چھدی سوڈانی کا خرطوم میں سولی پانا وغیرہ کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔ اور انگریز کی ریشہ دوانیوں سے اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کرتا ہوں۔ اگر واقعی تمہارے نزدیک میرا یہ جرم باعث گرفت ہے تو میں اعلان کرتا ہوں کہ میں ایسے جرم کے ارتکاب میں

ایمان کی سلامتی اور دین کا استحکام پاتا ہوں۔ پھر کیا تھا۔ بخاری زندہ باد کے نعروں سے بہاول پور کا طول و عرض گونج اٹھا۔ اور پیر و جوان کے دل ان کی صداقت پر رجمہ گئے۔ حضرت امیر شریعت کی بے لوث خدمت اور دین کی درد مندی کا علم نواب صاحب بہاول پور کے بچا حاجی بلخ شیر کو ہوا تو انہوں نے اس بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہ نواب صاحب پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ آپ کو اپنے یہاں تبلیغ کے لئے دعوت دی۔ جو منظور کر لی گئی۔ حاجی بلخ شیر مرحوم کے مکان کا احاطہ بہت وسیع ہے۔ جہاں ان دنوں بغیر اجازت داخلہ ممنوع ہوا کرتا تھا۔ لیکن حضرت امیر شریعت کی تشریف آوری پر یہ پابندی اٹھا دی گئی۔ لوگوں نے نہایت خلوص و محبت کے ساتھ یہاں پر بھی اپنے خلیفہ کا استقبال کیا۔ رات کے سناٹے میں جب امیر شریعت کی قرأت قرآن نے پھول بکیر نے شروع کئے اور لمن دلوڈی لہنی پوری جولانی پر آیا تو ستاروں نے بھی جھک جھک کر سلام کیا۔ فضا نے آسمان کا ذرہ ذرہ رقص کرتا ہوا نظر آنے لگا۔ آپ نے نہایت جرأت مندانہ انداز کے ساتھ امراء کے عیش پسندانہ ٹھاٹھ و رویہ پر تنقید کی اور غریبہ پر ان کے ظلم و ستم کا شکوہ کرتے ہوئے انہی زندگی کا خاکہ کھینچا جو اس دنیا کے چھوڑ جاتے ہی ہر انسان پر وارد ہوتی ہے۔ پھر کیا تھا ہر کسی کے چہرے پر ندامت و تاسف کے آلمو جاری تھے اور بے ثباتی دنیا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا تھا۔ دلوں پر ایسی کاری ضرب لگ چکی تھی کہ ہائے اور وائے کے سوا کوئی جملہ زبان پر آتا ہی نہ تھا۔ اس تقریر میں توحید باری تعالیٰ، توصیف رسالت و ختم نبوت اور اصلاح معاشرہ پر بہت زور دیا گیا۔ حقوق العباد کا لحاظ اور اس کی تلخی پر نقصان و گرفت کا اندیشہ راعی و رعایا کے تعلقات پر سیر حاصل تبصرہ غرض کہ تبلیغ حق کا پورا پورا ادا کر دیا۔ رات کے آخری حصہ تک تقریر جاری رہی لیکن کسی کی آنکھ پر نیند کے خمار کا اثر نہ پایا گیا۔

جن لوگوں نے امیر شریعت کے جمال صورت کو دیکھا اور ان کی تقاریر کو سنا ہے وہ اس سے متفق ہوں گے کہ جب وہ شیخ پر جلوہ فرما ہوتے اور خطابت اختیار کرتے تو ہزاروں کے مجمع میں ایک متفس بھی ایسا نہ ہوتا جو اپنے دل و دماغ کو کسی دوسری طرف منقطع کر سکتا۔ خطابت کے دور تک وہ جلال و جمال کا مرقع بن جاتے ان کا چہرہ آفتاب کی مانند جھک اٹھتا۔ جو ہزاروں انسانوں پر لہنی دلربائی کی کمنڈ ڈال دیا کرتا تھا۔ ان کی مسکراہٹ مزمون و غمناک دلوں کے لئے مسرتوں کا پیغام بن جاتی اور وہ جس طرف نگاہ پر لطف اٹھا کر دیکھ لیتے وہاں بہاروں کے سامان جمع ہو جاتے۔

وہ مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی

دیکھا نظر اٹھا کے تو گلشن بنا دیا

بقول مولانا ابوالکلام آزاد کہ ”کمال مرتبہ حسن اور خوب روئی یہ ہے کہ صرف دوستوں ہی کی نظریں نہ اٹھتی ہوں بلکہ ایک عیب چیں دشمن بھی دیکھے تو بے اختیار ہو کر پکار اٹھے کہ دل ستاں صورتیں اور صبر آرزو چتونیں ایسی ہوتی ہیں۔“ چنانچہ ہمارے دلربا خلیفہ کی شخصیت میں بھی دل ستانی کے تمام سلیقے موجود تھے۔ سکندر وزارت کے عہد میں آپ راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل میں قید کر دیئے گئے۔ جیل کا انگریز سپرنٹنڈنٹ کرنل باورڈ آپ کا گویہ ہو گیا۔ باوجودیکہ اسے یہ علم تھا کہ امیر شریعت ہمارا کٹر دشمن ہے۔ لیکن وہ آپ

کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے آپ کو بیڈ منٹن کھیلنے پر آمادہ کیا اور جب تک آپ جیل میں رہے اس کے ساتھ ہر شام بیڈ منٹن کھیلنے رہے۔ اس انگریز نے ایک کتاب "ہندوستان کی یاد میں" مرتب کی ہے جس میں وہ امیر شریعت کے بارے میں قلم طراز ہے۔

"جن قیدیوں نے مجھے اٹھائے ملازمت میں متاثر کیا ان میں عطا اللہ شاہ بخاری نام کا ایک سیاسی قیدی برٹش ہی ولفریب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا چہرہ مہرہ چرچ کے ان مقدس راہبوں کی طرح تھا جن کی تصویریں یسوع مسیح سے مشابہ ہوتی ہیں۔ یا پھر ان مستشرقین کی طرح جنہیں یورپ میں خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم اسے عرب کے بڑے بڑے کاموسیوں سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں۔

میں اسے اپنا دوست بنانا چاہتا تھا لیکن ہمارے درمیان سب سے بڑی روک ہماری مختلف زبانیں تھیں اس کا بڑا سبب غالباً یہ

تھا کہ وہ ۱۸۵۷ء کے اس اینٹی برٹش ذہن کی باقیات میں سے تھا جنہیں ہمارے پیشرووں نے علماء کو پھانسی دے کر پیدا کیا تھا"

کسی کی ولفریب اداؤں کا جائزہ لیا ہو تو ان سے پوچھیے جو ہمیشہ تنقیدی نگاہ سے دیکھتے رہے ہوں۔ اور اس کی خوبیوں اور محاسن کا اپنی تہذیب و تمدن کے ساتھ مقابلہ کرتے گزر گئی ہو۔ انگریز کی تنگ نظری لو رہے انصافی کو کون نہیں جانتا کہ ہوس سلطنت کی خاطر وہ ہر اچھائی سے منہ پھیر لیتا رہا۔ لیکن حضرت امیر شریعت کے محاسن سیرت و صورت کے سامنے وہ بھی تسلیم و رضا کے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور اور آپ کے حسن کا گھائل ہو گیا تھا۔

صحن چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا  
وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے۔

حضرت امیر شریعت کی طبیعت کا یہ

خاصہ تھا کہ جب بھی آپ جیل کی چار دیواری سے باہر قدم رکھتے تو ان کا جذبہ حریت اور چمک اٹھتا وہ احباب کے جھرمٹ میں نہایت خندہ جبین نظر آتے اور اپنے ارادوں کی تکمیل کو پھر کمر باندھ لیتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک باپوسی گناہ تھی اور بغیر اللہ تعالیٰ کے کسی اور کا خوف و ہراس محرومی ایمان کا سبب تھا۔ وہ باطل کے خلاف ہر طرح کی جنگ لڑنے کو اسلامی شعار بتلاتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے کہ مومن وارث کائنات ہوا کرتا ہے۔

عالم ہے فقط مومن جانناز کی میراث

مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

مملکت پاکستان کے قیام کے بعد مرزا نیت نے اپنی تبلیغی کارروائیاں تیز کر دی تھیں۔ امیر شریعت اور ان کے رفقاء نے اس پر محاسبہ کیا تو تحریک ختم تحفظ نبوت کی پاداش میں ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں گرفتار کر لئے گئے۔ ایک سال بعد لاہور ہائی کورٹ نے مرافعہ وار کرنے پر مجبور کیا۔ مئی ۱۹۵۶ء میں آپ کو ملتان کے حدود میں سینٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ عمر کے اس آخری حصہ میں امیر شریعت کی قید و

بند مسلمان حکومت کے دور کی پیدوار تھی۔ جس پر ان کے تاثرات کی ترجمانی اس شعر سے ہو سکتی ہے۔

دوستوں سے اس قدر حد سے اٹھائے جان پر

دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر کے ساتھ اگر مرزائیت کے چہرے پر سے پردہ نہ اٹھایا جائے تو بہت سی ایسی حقیقتیں واضح نہ ہو سکیں گی جن کا تعلق دین کے اصول سے ہے۔ اور ہم یہ سمجھنے سے قاصر نہیں گئے کہ جماعت احرار دیگر مسلمان مرزائیت کے خلاف کن وجوہات کی بناء پر تھے۔

مسلمانوں اور مرزائیوں کا باہمی نزاع اس وقت شروع ہوا جب ۱۸۸۰ء میں مرزا غلام احمد نے ملہم من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا اور پھر یکم دسمبر ۱۸۸۸ء کو یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیعت لینے کا حکم فرمایا ہے۔ اس پر بھی انہیں اپنی تکمیل کا رنظر نہ آئی تو پھر ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود ہونے کا لعرہ بلند کیا اور ظلی نبی کی اصطلاح ایجاد کی۔ اس دعویٰ کے باوجود بھی تکلیف خاطر نہ ہوئی تو نومبر ۱۹۰۳ء میں سیالکوٹ کے ایک جلسہ عام میں انہیں یہ اعلان کرنا پڑا کہ میں مثیل کرشن بھی ہوں۔ اور ہر مذہب کے لئے اوتار بھی۔ دعویٰ نبوت سے پہلے مرزا صاحب عیسائی مشنریوں سے مناظرہ کرنے کے لئے جاتے تو ان کے ساتھ مولوی محمد حسین بٹالوی بھی ہوتے گویا مرزا صاحب سے پہلے کسی کو کوئی تعرض نہ تھا۔ جب انہوں نے خاتم النبیین کی نبوت پر ہاتھ صاف کرنے کی ٹٹائی اور اپنے ملہم من اللہ ہونے کے زعم میں مبتلا ہوئے تو وہ لوگ بھی ان سے علیحدہ ہو گئے جو پہلے ان کے ساتھ شریک مناظرہ عیسائیت وغیرہ ہوتے تھے۔ اور مسلمانوں میں ان کے اس دعویٰ نے مہمان کا عالم پیدا کر دیا۔ مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن خاتم النبیین کی مہر کے توڑنے والے کو کیونکر گوارا کرتے۔ مرزا صاحب کا دعویٰ نبوت مسلمانوں کے ایمان پر یخز کے مترادف تھا۔ ہر طبقہ کا مسلمان برا فروخت ہو گیا۔ جوانی کارروائی میں علماء کے فتوے چھینے لگے۔ سب سے پہلے ۱۸۹۰ء میں لدھیانہ کے علماء نے فتویٰ دیا جن میں مولانا محمد عبد اللہ اور مولانا عبد العزیز مولوی سید نذیر حسین محدث دہلوی پیش پیش تھے۔ پھر آگرہ حیدر آباد اور بنگال کے علماء نے بھی مرزا صاحب کے خلاف فتوے صادر کئے۔ اس طرح سے مرزا صاحب کی نبوت و مہدویت نزاع کا باعث بن گئی۔ لیکن یہ نزاع ابھی تک عام سطح پر نہیں آیا تھا کہ عوام بھی اس سے باخبر ہوشیار ہو جاتے۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم مدیر زمیندار اخبار نے اس ضمن میں زور دار مقالے اور نظمیں لکھیں۔ گویا تقریر و تحریر کا کوئی ایسا پہلو نہ تھا جو انہوں نے مرزائیت کو بے نقاب کرنے میں استعمال نہ کیا ہو۔ حتیٰ کہ "ارمغان قادیان" کتاب لکھ کر انہوں نے مرزائیت کے خلاف مستقل مواد چھوڑا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی پیدا کی ہوئی عوامی تحریک کا یہ اثر ہوا کہ سیاسی و دینی حلقوں نے بھی مرزائیت کے خلاف جدوجہد کرنے کی ٹٹائی لی۔ چنانچہ جو دھری افضل حق مرحوم جو جماعت احرار کے روح رواں اور مخلص ترین رکن تھے۔ نے اپنے احرار رفقاء کو مرزائیت کے خلاف آمادہ پیکار کیا۔ حضرت امیر شریعت پہلے ہی سے شان رسالت پر جان نچاؤ کرنا جانتے تھے۔ اور ان کا خلاصہ ایمان بھی یہی تھا کہ عصمت نبی کے تحفظ پر جان کی بازی لگا دینا ہزار سالہ عبادت سے افضل ہے۔ میدان عمار بہ میں ٹکل آئے اور مرزائیت کے تار و پود بکھیرنے لگے۔ ملک کے



چپے چپے میں پھرے اور مرزائیت کی اس حقیقت کو بے نقاب کیا۔ جو اصول اسلام کے منافی اور تضاد میں تھی۔ اور یہ بھی ثابت کیا کہ مرزا صاحب کی نبوت حکومت برطانیہ کی مرہون منت ہے۔ اور مرزائی برٹش امپریزم کے کھلے دہشت ہیں۔ کیونکہ مرزا غلام احمد کتاب ابریہ کے حاشہ میں خود لکھتے ہیں۔

”میرے والد کو انگریزی حکام نے خوشنودی مزاج کی چٹیاں دی تھیں۔ سر لیپل گرین نے اپنی کتاب رینسان پنجاب میں ان کا تذکرہ کیا ہے“

ملاحظہ ہو ریویو آف ریلیجز صفحہ نمبر ۲۱۹ بابت جون جلد ۵ نمبر ۶

امیر شریعت اکثر فرمایا کرتے کہ نبوت کا صحیح معیار معلوم کرنا ہو تو اس کے خاندان کے کوائف پر غور کر لینا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ نبوت کے لے جو گھرا نا چاہتا ہے وہ بھی اسی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے جن سے اس کی امتیازی حیثیت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وہ تعلق اور علائہ ذنیت سے بالکل مبرا ہوتا ہے۔ لیکن مرزا صاحب کے خاندانی حالات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ان کے بزرگوں نے ہمیشہ حکومت وقت کی اطاعت و غلامی میں اپنی زندگیاں بسر کیں۔ علامہ مرزا صاحب کے دادا اور ان کا والد گل محمد رام گڑھیہ اور کھنیا سکھ جماعتوں سے لڑتے رہے علامہ اپنی جائیداد کھو کر سردار فتح سنگھ اہلو الیاء کی پناہ میں بیگوال چلا گیا جہاں بارہ سال تک مقیم رہا۔

ہمارا جہر نعت سنگھ نے علامہ کی وفات پر اس کے بیٹے غلام مرتضیٰ اور مرزا غلام احمد کو واپس بلا کر جدی جاگیر کا بہت حصہ واپس دے دیا۔ جب پنجاب کا انگریزوں سے الحاق ہو گیا تو خاندان کے دوسرے افراد کی جاگیر ضبط کر لی گئی۔ لیکن غلام مرتضیٰ اور اس کے بھائیوں کو سات سو روپے بطور پیشین ملے رہے۔

جب انگریز ملک پر مسلط ہو گیا تو مرزا صاحب کے خاندان نے ان سے بھی اطاعت کا رشتہ قائم کر لیا اور ۱۸۵۷ء کے دوران نہایت وفادارانہ خدمات انجام دیں۔ مرزا غلام مرتضیٰ نے بہت سے آدمی بھرتی کئے۔ اس کا بیٹا غلام قادر جو مرزا غلام احمد کا بھائی تھا اس وقت جنرل ٹکسن کی فوج میں تھا۔ اس نے ۳۶ نیوا انفنٹری سیالکوٹ کے باغیوں کو تہ تیغ کیا۔ جنرل ٹکسن نے غلام قادر کو ایک سند عطا کی جس میں یہ لکھا تھا کہ ”ان کا خاندان قادیان ضلع گورداسپور کے تمام دوسرے خاندانوں سے زیادہ نمک حلال رہا ہے“ یہ سب واقعات سر لیپل گرین نے اپنی کتاب رینسان پنجاب میں لکھے ہیں۔

امیر شریعت ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ میں ان حالات کی روشنی میں کہتا ہوں کہ مرزا صاحب کی نبوت انگریز کی مرہون کرم ہے۔ اور یہ اس کا خود کاشتہ پودا ہے۔ جو مسلمانوں میں تقریباً پیدا کرانے کے لئے کاشت کیا گیا تھا۔ تاکہ ملک کی وحدت فکر پارہ پارہ ہو کر مغلوب بن جائے۔ اس لئے ہم یہ عزم لے کر اٹھے ہیں کہ ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔ لیکن کسی باطل مدعی نبوت کے انکار کو ملک میں نہ پھیلنے دیں گے۔ اور ہم ہر اس حکومت کا مقابلہ کرنے کو بھی تیار ہیں گے جو مرزائیت کے نظریات کو پھیلانے کی روادار ہوگی۔

امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیشہ اس ایمان افروز جذبے کے ساتھ مرزائیت کے استیصال پر کمر

باندھ رکھی تھی۔ وہ ہر سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ لیکن مرزائیت کے خلاف ان کی جدوجہد اس وقت بھی قائم رہی جبکہ وہ ذیابیطس و فلج جیسے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ علالت کے ایام میں بھی حضرات کو شرف دیدار میسر آیا ان سے فریضے کے اعشاء جواب دے رہے ہیں تمام وجود باغی بن گیا ہے میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتیاں کی تھیں۔ اب یہ انتقام پر اتر آیا ہے۔ کچھ توش آخرت پاس نہیں البتہ ایک چیز پر فلح آخرت کی امید رکھتا ہوں وہ یہ کہ تمام عمر عصمت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ پر صرف کر دی ہے۔ وہ یقیناً موجب نجات اور وجہ عافیت دارین ثابت ہوگی۔

امیر شریعت کی پذیرائی بارگاہ نبوت میں یقینی ہے۔ کیونکہ امیر شریعت کی زندگی کا ہر پہلو احیائے دین و سنت کا آئینہ دار تھا ان کے افعال و اقوال کا کوئی ایسا گوشہ نہ تھا جو اسلام کے جذبہ سے بھرپور نہ ہو۔ وہ کنز کی طاغوتی طاقت سے نبرد آزما رہا تو دین کی خاطر اور حکومت وقت کا باغی کھلایا تو دین کے لئے۔ اس نے اپنی تمام عمر کو مشکلات کے حوالے کیا تو دین ہی کی غرض سے۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بوجھل بیڑیاں گوارا کیں تو دین ہی کی عظمت کے لئے۔ باطل سے لڑا اور لینوں سے بگڑا تو صرف دین کی خاطر اس نے راحت و آسائش کے تمام شعبے موقوف کر دیئے۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر قربان ہوتا رہا۔ اور وہ آخر دم تک عشق کی اس گرمی میں مست و بنود رہا۔ تو کیا اس اشار و قربانی کو اس کے حضور پذیرائی کا کوئی درجہ نہیں ہوگا۔ کیا اس کی رحمت اپنے والد و شیدا کے لئے مقرر نہ ہو گی۔ کیا اس کی مخلصانہ جدوجہد کا کوئی صلہ نہیں ہوگا۔

یقیناً ہو گا وہاں بے انصافی کو راہ نہیں ہے۔ وہاں وابستگان پر رحمت و کرم کی نظر فرمائی جاتی ہے۔ اور خلقت قرب کی نعمتوں سے سرفراز فرما کر اس کے ذکر کو یہ عظمت دی جاتی ہے کہ دوست و دشمن اس کے محاسن کے قائل اور اس کے کردار کے دلدادہ ہو جاتے ہیں۔ بہت سی یادیں ایسی ہیں جو موت کے ساتھ دفنی ہو جایا کرتی ہیں۔ مگر جنہیں اس کی مشیت میں زندہ رکھنا ہوتا ہے۔ وہ مرور زمانہ کے باوجود بھی زندہ رہتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مرنے کے باوجود بھی مرنے والا زندہ ہے۔ بظاہر اس وقت امیر شریعت ہم میں نہیں ہیں۔ اور عرصہ ہوا ان کی آواز کے رسیلا پن سے ہمارے کان مرموم ہیں۔ اور نگاہ جستجو ہزار سعی و تردد کے انہیں تلاش نہیں کر سکتی۔ لیکن دل کی گھمرائیوں اور دماغ کے بالا خانوں پر ان کا قیام ابھی تک ہے۔ وہ نظر نہیں آتے لیکن ان کی رنگینی طبیعت اور پاکیزگی فطرت آج بھی ہماری محافل کو درگلیں بنا رہی ہے۔

شباب رنگیں جمال رنگیں وہ سر سے پانچ تمام رنگیں

تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں

بزرگان دین کی سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنہیں دین میں مقبولیت کا درجہ دیا جاتا ہے اور ان کے ذریعہ سے توحید و رسالت کی تبلیغ کا کام لیا جاتا ہے تو وہ حب مال اور منصب و جاہت کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہیں۔ وہ بظاہر دنیا کے مشہور ترین انسانوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان کی اندرونی زندگی فقر و خناس سے اس قدر مملو ہوتی ہے کہ کوئی اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔

امیر شریعت کی زندگی پر جب غور کیا جاتا ہے اور حالات کے حاسکے مرتب ہوتے ہیں تو ہمیں ان میں بھی فقر کی شاز اور غنا کی آن معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے سامان دنیا کو کبھی اپنی راحت کا ذریعہ نہیں بنایا۔ کسی سے کچھ لینے کے روادار نہ ہوئے۔ کسی کے ہاں دست سوال دراز نہ کیا۔ فاقوں پہ فائے ہوئے تو چہرے کی مسکراہٹ اور پیشانی کی تابانی میں فرق نہ آیا۔

متعلقین سے مروت کا ہاتھ کبھی نہ کھینچا۔ جو کچھ موجود ہوتا آگے رکھ دیتے چھائے دوست اختر الہ آبادی بتلاتے ہیں کہ: ”میری ہمیشہ چائے سے

ضیافت فرماتے۔ ایک دفعہ چائے لائی گئی تو بجائے نگر کے نمک استعمال ہوا۔ میں نے نظر اٹھا کھا شاہ جی میں تو پہلے ہی نمک خوار ہوں۔ فرمایا۔ با بویہ بات نہیں۔ ہفتہ بھر سے گھر میں نگر نہیں ہے۔ اس لئے بلا تکلف نمک استعمال کر رہا ہوں۔ اور دوستوں کو بھی نمکین مزہ سے آشنا کرنا چاہتا ہوں۔ پھر نمکینی اور حلاوت پر بات چھڑ گئی تو فارسی اور اردو کے اشعار کے دفتر کے دفتر لگ گئے۔ اور چائے کا ہر گھونٹ نمکینیت میں حلاوت کا ایسا مزہ بن گیا کہ اس کے سرور سے آج بھی روح کو کیف و خمار کی جاشنی موس ہوتی ہے۔ اور ساقی کے چل دینے پر بھی وہ تمام لذتیں باقی ہیں جو ان کے ہوتے ملتی تھیں۔“

اگرچہ میکدے سے اٹھ کر چل دیا ساقی

وہ سئے وہ خم وہ صراحی وہ جام باقی ہے

اللہ اللہ شہرت کا یہ عالم کہ چار دانگ عالم میں دھاک بیٹھ گئی ہو۔ لوگ راہوں پر یوں منتظر کھڑے ہیں جیسے ان کا محبوب ان کے خراب آباد کو اپنی شریعت آرزائی سے آباد کر رہا ہو۔ اور ہر دل سے یہ صدا آرہی ہو۔

بہ شرف تشریف قدم خود زانے  
شرف کین خراب آباد مارا

لیکن یہاں یہ حال ہے کہ امارت کی سب راہیں محدود دولت کے سب دروازے بند تھلید اسلاف میں نان جوں پر گزارا۔ اس پر طرفہ فضیلت یہ کہ ہر سانس میں اطمینان و سکون کی بشارت اصل بات اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن نفوسِ قدسیہ کو اپنی مودت میں چن لیتے ہیں۔ انہیں طمانیت قلب عطا فرما کر رغبت دنیا سے بے نیاز کر دیا کرتے ہیں۔ اور اس کی توقیر میں لوگوں کے قلوب کو سسر کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کی عظمت اور وجاہت کے سامنے کسی کو مجالِ انکار نہ ہو۔ دیکھنے والے حضرات ابھی اس دنیا میں باقی ہیں کہ انہوں نے امیر شریعت کے سامنے دوست دشمن کو سرنگوں ہوتے دیکھا ہے۔ اور ان کی دلبری کے گیت گاتے سنا ہے۔

حالتہ الناس سے لیکر عارفین و کاملین تک امیر شریعت کو مقبولیت کا درجہ حاصل تھا۔ وہ ہر ایک کے عزیز اور محبوب تھے۔ اور ہر انسان کے دل میں ان کی محبت تھی۔ لوگ ان کی راہوں پر آنکھیں بچاتے اور ان کی اداوں پر دل بھار کر رہتے تھے۔

بیسیوں محراب کا مشاہدہ ہے کہ سراج الکلمین حضرت خلیفہ عظام محمد قدس سرہ العزیزہ دینی پوری کی

خدمت میں جب حضرت امیر شریعت نے حاضری دی تو حضرت خلیفہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کی تعظیم میں باوجود ضعف پیری کے بھی سر وہ کھڑے ہو گئے اور امیر شریعت کو اپنی دعاؤں و نوازشات خصوصی کا مسکن جانا۔ ایک صاحب دلالت و منبع روحانیت کا امیر شریعت سے اس طرح کا سلوک کرنا اور ان کو دل سے چاہنے کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نظر نہیں آتا کہ حضرت دین پوری رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ معرفت نے ان کی خصوصیات خفی و جلی کو پہچان لیا تھا۔ جس انسان پر عارفین و کاملین کی نظر انتخاب پڑ گئی ہو وہ لازماً بامتیاری حیثیت کا حامل ہوا کرتا ہے۔ یہی بات تھی کہ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کامل یقین کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا فضل ہے کہ میری آنکھ کبھی سبلی نہیں ہوئی۔ دنیا بھر کی ہوبیٹیاں میری بیٹیاں ہیں۔ میری فطرت سے کسی کی عصمت کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ اور نہ ہی مجھ سے خیانت کا ارتکاب ہوا اور نہ ہی میرے ہاتھ سے کسی کو کوئی نقصان پہنچا ہے۔

امیر شریعت کے اس بیان کی صداقت معق ہے کیونکہ آج تک موافق و مخالف نے ان کے اس دعویٰ کی تکذیب نہیں کی۔ اور نہ ہی کوئی کر سکتا ہے۔ جس کا دامن طہارت و پاکی کے پانی سے دھلا ہوا اس پر اہتمام و الزام کے دجے کیونکر ہوں اور کسی کو یہ جرأت کیوں ملے کہ وہ آب زمزم کو بد ذائقہ اور بد بودار پانی سے تشبیہ دے۔

امیر شریعت کی زندگی کا ہر پہلو اور ہر قرینہ ان کی پاکیزگی فطرت کا آئینہ دار ہے۔ وہ علوت میں ہوں یا جلوت میں ایک پاکباز اور پاک نفس انسان نظر آتے ہیں۔ ان کی ہمہ گیری اور دہوئی کا یہ عالم تھا کہ آج تک ہر مقرر و خطیب انہیں کے طرز خطابت کے نقوش کو اجاگر کئے پھرتا ہے۔ اور اپنے تعلق کو ان کے آستان سے وابستہ کرنا اپنی عزت سمجھتا ہے۔ آج کی انجمنیں ان ہی کے سوز عمل کا پر تو اور انہی کے کاربائے نمایاں کا عکس جمیل ہیں۔

یک چراغیت دریں خانہ کہ از پر تو آں  
ہر کجا سے نگری اجنبی ساختہ اند

ہم اس موقع پر اس حقیقت کے اظہار سے بھی خاموش نہیں رہ سکتے کہ امیر شریعت کے ساتھ جن لوگوں کو خصوصی تعلق تھا اور وہ ان ہی کی بدولت پہلے پہلوے اور مشہور عالم ہوئے افسوس کہ آج ان میں سے بعض کا مزاج انکسار و اخوت کے جذبہ سے محروم ہو کر رہ گیا ہے وہ امیر شریعت کی ساری تعلیم بھول گئے ہیں اور ان کے اطوار مخلصانہ کو انہوں نے گلدستہ طاق نسیاں بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ حضرت امیر شریعت کے باقیات صالحات اولاد سے بھی کنارہ کشی اختیار فرماتے ہیں۔ حالانکہ وہی اولاد ہے جن سے بخاری کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی تھی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کا احسان یہ ہے کہ ان کی اولاد میں اپنے اسلاف کے مقام کو محفوظ رکھنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا احساس ہے۔ ہم دلیل کے طور پر ان کے فرزند جلیل فاضل روزگار حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری مدظلہ کو پیش کرنے میں کسی طرح کا تردد محسوس نہیں کرتے وہ اپنے والد محترم کی روایات کو زندرہ رکھنے اور ان پر عمل پیرا رہنے کی سعی میں رہتے ہیں۔ اللہ کرے ریاض امیر شریعت کے یہ پھول ہمیشہ

گلغٹہ رہیں۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حضرت امیر شریعت کی خطابت شخصیت اطلاق و عادات سے متعلق تھا اور ان کی مجاہدانہ زندگی کے چند ایسے خاکے تھے جو بر عظیم پاک و ہند کی دستوں میں بھیلے ہوئے ہیں۔ اب ہم ان کے اس پاکیزہ فکر اور ذوق طبیعت کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے نہاں خانہ دل سے نکل کر شاعری کے روپ میں ہمارے سامنے آیا ہے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا:

ان من الشعر لحکمتہ وان من البیان لسحر

بعض اشعار حکمت سے مملو ہوتے ہیں اور بعض خطابت جادوگری کا کام کرتی ہے۔

حضرت امیر شریعت کی خطابت کی جادوگری تو مسلمہ ہے۔ لیکن جب ہم ان کی شاعری پر غور کرتے ہیں تو وہ بھی حکمت کے موتی بکیر نے میں کسی سے کم نہیں ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جنہیں خطابت کاملہ کے ساتھ شاعری کا ملکہ بھی ودیت کیا گیا ہو۔ اور یہ دونوں چیزیں یکجا جمع ہوئی ہوں۔ امیر شریعت کی سخن فہمی اور رحمت ادب کا علم تو ہر کسی کو تھا۔ لیکن بحیثیت ایک شاعر کے انہیں بہت کم لوگ جانتے تھے حتیٰ کہ یہ راز بعض مقررین سے بھی مخفی تھا۔

جب ان کے فاضل فرزند چانشین سید ابو ذر بخاری مدظلہ نے انکا مجموعہ کلام سواطع الالہام کے نام سے شائع کیا تو معلوم ہوا کہ امیر شریعت کی زندگی ابتداءً اس طرف راجع تھی گھریلو تعلیم کے ادنیٰ ماحول نے انہیں مجبور سخن گوئی کر دیا تھا انہوں نے اصطلاح کلام کی خاطر میر سید علی محمد شاد عظیم آبادی مرحوم سے رجوع کیا اور مشق سخن جاری رکھی۔ موزنی طبع نے شاعری کے ملکہ پر گل بوٹے لگائے۔ آپ کے دل کی دہنی ہوئی چٹکاریاں شعلے بن کر نکلیں۔ جنہیں مولانا محمد دین غریب مرحوم امرتسری نے علم و ادب کے صمیم زلویہ کے مطابق ترتیب دیا۔ یعنی بحیثیت استاد فنی کے انہیں دیکھا اور پرکھا۔ لیکن امیر شریعت کا یہ ذوق جلوہ آرائیوں سے اس لئے محروم رہا کہ قدرت نے انہیں در حقیقت خطابت قوم کے لئے تیار کیا تھا۔ شاعری کوئی فرکی بات نہیں ہے۔ البتہ بعض دفعہ شاعری کو یہ عزت ضرور ملی ہے کہ اسے کسی کے اچھے دامن سے وابستہ ہونے کا موقعہ میسر آیا ہے۔ یہی حال امیر شریعت کی شاعری کا بھی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے شاعری کو نہیں چنا بلکہ شاعری نے انہیں اپنے لئے منتخب کیا ہے کیونکہ کلام کی بلندی، پاکیزگی اور ترکیب معاوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شاعری ہی کو معراج ترقی کی عزت بخشی ہے کسی کے کلام سے اس کے عقیدہ و حالات اور کوائف کا پتہ کیا جاسکتا ہے اور اس کے نظریات فطرت کا علم ہوتا ہے اور اس کی طہنت بکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

امیر شریعت کے کلام سے بھی ہم ان کے حالات عقائد اور گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لیں گے۔ تاکہ ان کی شخصیت کے بعض پنہاں پہلو بھی واضح ہو سکیں۔

تصوف سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کسی کا کمال تسلیم کرنے میں اس کے عقیدہ و تصرف پر غور

کرتے ہیں کہ وہ اس منزل میں کس حد تک تحقیقی راستہ طے کر چکا ہے۔ امیر شریعت کا حال ان کے تصوف میں ان کے اس شعر سے معلوم کیا جاسکتا ہے جس کے ذریعہ انہوں نے وحدت وجود جیسے مشکل مسئلہ کو نہایت صاف و سحرے انداز میں واضح کیا ہے۔

وحدت بوجد و حالت کثرت در آمدہ  
حرکت بجلوہ۔ جلوہ بمرکت در آمدہ

اسی مفہوم کو اور زیادہ صاف کر کے فرمایا

ذروں سے تابہ مہر ستاروں سے تا چمن  
عکس جمال یار کی تابندگی ہے دوست

وحدت وجود کا نظریہ بیان کرتے ہوئے امیر شریعت نے نہ تو روش منسور رحمۃ اللہ علیہ اختیار فرمائی ہے اور نہ ہی جاہلانہ وحدت وجود کی بنیاد رکھی ہے۔ بلکہ اس نازک ترین مسئلہ کو ہر طرح کی منطقی و عقلاتی آلائش سے پاک رکھا ہے تاکہ طریقت و شریعت میں ٹکراؤ نہ پیدا ہو اور مفاد و منفعت کے بجائے خسارہ و نقصان کا شکار نہ ہونا پڑے۔ کیونکہ اس راہ کی دشواریاں بڑے بڑے صاحب عقلیت بزرگوں کے پائے ہمت کے لئے تزلزل کا باعث بنی ہیں۔

در حقیقت یہ مسئلہ اظہار و بیان کا نہیں بلکہ عمل و محنت کا ہے اور وہ بھی کسی کامل کی دستگیری کے ذریعے حل ہو سکتا ہے۔ یہاں ہوش و خرد کی دنیا سے بات نہیں ہوتی بلکہ وارفتگی اور ذوق کا عمل و مخلصانہ جذبات کام آتے ہیں اور عشق کی جولانیاں راہ نور منزل بن جایا کرتی ہیں۔

حضرت امیر شریعت چونکہ ان کھنسن منازل کو طے کر چکے تھے اس لئے اس موضوع پر انہوں نے جو کچھ کجماوہ ان کے مشاہدہ کی بات ہے اور وہ صحیح طور پر رخ جانناں کی تصویر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مسلمان کی عقیدت و ارادت کا اگر کوئی گوشہ یا وجود اس دنیا میں باقی ہے تو وہ صرف سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس و مطہر ہے جس کے ذریعہ سے انسان کو اپنی حقیقت کا علم ہوا اور مقام ربوبیت کی شناسائی حاصل ہوئی۔ کیونکہ اس وجود گرامی کی شریعت آوری ان ہی کھانصوں کے سبب تھی۔ اسے تزکیہ نفوس کی ایسی قدرت ملی کہ انسان کی ضلالتیں رفع ہو کر رہ گئیں۔ اور راہ حق کی راہنمائی ہونے لگی۔ اس لئے ایسی ذات مقدس سے نسبت ارادت قائم کرنے اور وابستگی رکھنے کے لئے بھی ادب جمیل اور ہوش کامل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہاں پر تعمیری سی لغزش گرفت و عتاب کا سبب بن جاتی ہے اور پھر عمر بھر کے لئے رسوائی و ذلت نامرادی و ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے عارف رومی نے فرمایا تھا

باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

اس ادب کو یوں تو ہر مسلمان ملحوظ رکھتا ہے لیکن جن لوگوں کو عشق کی خصوصی گرمی اور نعمت ملی ہے وہ اس منزل میں رہنے پر اس قدر محاسبہ کرتے ہیں کہ حضور رسالت میں انہیں حواس کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ عقل و خرد کی تمام قوتیں مسلوب و عاجز ہو کر رہ جاتی ہیں ان کے قلوب کی دھڑکنیں تیز ہو جایا کرتی

ہیں اور ان کے رگ و پے میں احساس کی یہ آواز آنے لگتی ہے۔

عقل قربان کی بہ پیش مصطفیٰ

ہم جب امیر شریعت کی ان نعتوں پر غور کرتے ہیں جو انہوں نے باگاہ رسالت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے تو ہمارا ذہن ان نفوسِ قدسیہ کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ جن کا ذکر اوپر کی سطور میں کیا گیا ہے اور ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ امیر شریعت بھی جناب رسالت میں اسی ادب و احترام کے پابند ہیں جو عارفین و کاملین کی زندگی کا خاصہ ہے اور جس کی بناء پر وہ بارگاہ نبوت میں شرف پذیرائی کا درجہ حاصل کئے ہوئے ہیں۔ آپ کی نعتوں کا اندازِ مستندین کے اندازِ بیان و عقیدت سے اس قدر ملتا ہے کہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس نعت پر غور کیجئے کہ کس قدر مستندین کے طرزِ کلام سے ملتی جلتی ہے۔

لولاک ذرہ زہان محمد است

سبحان من براہ چہ شان محمد است

جب دل کی گھمرائیوں میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نقشِ دوام کی حیثیت اختیار کرتی ہے تو پھر روحانیت کی جلوہ پاشیاں بھی اسے اپنا مسکن بناتی ہیں۔ اس عالم میں جب کوئی وارفتہ محبت اپنے محبوب اور مقصود حیات کے لوصاف میں کچھ کہتا ہے تو اس کا بیان مشاہدہ جمالِ یار سے خالی نہیں ہوتا۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے دید کی لذتوں سے سرشار ہو کر کہتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت میں امیر شریعت کی ایک نظم جہاں ان کی الوہیت و عقیدت کے مقام کو نمایاں کرتی ہے وہاں ان کے اپنے مرتبہ کا بھی پتہ دے جاتی ہے۔ جس کا مطلع ہے کہ

ہزار صبح بہار از نگاہ می چکدش

جنوں ز سایہ زلف سیاہ می چکدش

امیر شریعت کی اس نعت سے ان کے ظرفِ بلند کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ کہ وہ کس قدر جمال رسالت کے فریفتہ تھے۔

پہلے اور اہل حق میں ان کی پاک داسی پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک حقیقت ہے نہ کہ افسانہ لیکن انہوں نے ذیل کے اشعار میں اپنی تراداسی کا جس طرح سے ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بندگی کو متاعِ حقیر سمجھتے ہیں۔ لیکن کسی کے کرشمہ ناز اور نواز شہنائے بے پایاں پر اس قدر بے وسر ہے کہ یقین کامل کے ساتھ یہ پکاراٹھتے ہیں۔

نازنینان جہاں ناز فراموش شدند

کہ گدائے تو ہا انداز دگر می نازد

ناز دارد بہ در افشائی خود ابر بہار

درد مند تو بنا سورِ جگر می نازد

پارسیان ہمہ نازند بہ زہد و طاعت

یک ندیم است کہ بر داسی تر می نازد

مقطع کے شعر میں بدوا میں تمکا ناز سے حضرت ندیم کے اعتماد و یقین کی کئی داستانیں مرتب ہو سکتی ہیں اور بلا کسی خوف تردید کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی ترداسنی ہی کو مایہ پذیرائی بنایا ہے۔ تاکہ غرور زہد و نخوت اٹھا کے حملہ و علیہ سے صلاحیت فطرت غارت نہ ہو سکے۔ ایسی ترداسنی پر ہزار ہا تقویٰ و طہارت قربان ہوں جس کے ہوتے ہوئے منزل مراد حاصل ہو۔ کسی بدست نے کیا خوب کہا ہے۔

تر داسنی پہ شیخ ہماری نہ جانید  
داسنی نہوڑ دس تو فرشتے وضو کریں

اسی ترداسنی مرد کامل کی بے نیازی کا عالم ملاحظہ کیجئے۔ کہ خوان شاہی کے مقابلہ میں ایسی نان جویں پر کس ہر نازاں ہیں اور سایہ قد یار میں لمحہ بھر کی زندگی کو چتر شاہی سے ترجیح دیکر کس ہر فر موس کرتے ہیں۔ اٹکا یار محبوب اور مقصود حیات کیسا حسن و خوبی کا سراپا ہو گا کہ حضرت ندیم دنیا کی ہر آسائش و راحت اور اعزاز کو اس کے مقابل بیچ جانتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواز شہائے جاناں نے امیر شریعت کو ہر چیز سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس لئے وہ منت کش غیر نہیں ہوتے اور نہ ہی کسی کا وقار و دبدبہ انہیں مرعوب کر سکتا ہے۔ فرمایا۔

یک نان جوں ز خوان شاہی خوشتر  
از چنگ و رہاب آہ صیغہای خوشتر  
از تیر نگاہ زغم کاری دارم  
خون جگرم زمرغ و ماہی خوشتر  
یک لفظ بزیر سایہ قد یار  
واللہ۔ زہزار چتر شاہی خوشتر

دیکھا شیخ ترداسنی جب مستی میں آئے تو دعویٰ ترداسنی بھول گئے اور اپنی آہ صیغہای کا اقرار و اعتراف کرنے لگے۔ جو ان کی زندگی کی صیغ تصویر ہے۔ مقام پارسائی چھپانے سے نہیں چھپتا۔ عطر آئست کہ خود بھوید نہ کہ عططار بگوید لوگ الزام تراشی کے دلدادہ ہیں وہ کسی کو رسوا اور بدنام کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے نفس میں بد اطوار کو تکلیف اسی عمل سے ملتی ہے۔ ایک دور ایسا آیا کہ امیر شریعت کو وہابی، گستاخ، اور منکر ولایت کے الزام کا ہدف بنایا گیا اور ہمیں قسم ایسے ایسے الزام تراشے گئے کہ جن کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ آپ علالت کے اس دور میں بھی نہایت پامردی کے ساتھ ہدف دین انہماں دیتے رہے۔ ہر صاحب و ولایت ان کے نزدیک واجب احترام اور لائق پیروی رہا۔ انہوں نے ہر سلسلہ کے بزرگ سے ارادت و عقیدت کے راستے تلاش کئے اور ان کے کمال عرفان کے گیت گانے لگے۔ چنانچہ مثال کے طور پر ہم ان کے وہ اشعار پیش کرتے ہیں جو انہوں نے چتر سلسلہ کے ایک کامل بزرگ صاحب ولایت حضرت خواجہ غلام فرید ہاجڑوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشقت میں کہے ہیں۔ ان اشعار سے امیر شریعت کے عقیدہ ولایت پر واضح طور پر روشنی پڑتی ہے۔



گھن	عشق	چشتیاں	بے	لطیف
شعلہ	اش	خواجہ	غلام	فرید
ہر	کہ	از	عشق	جرم نہ
اُو	چہ	داند	کہ	چیت
مرغ	فکرم	ز آشیان	بے	پرید
نالہائے	فرید	چوں	بے	شنید
سرمہ	چشم	شد	بخاری	را
خاک	پائے	غلام	خواجہ	فرید
حسرتے	از	دل	ندیم	نہ
کہ	نصیبش	نہ	شد	نگاہ

ان اشعار کے مطالعہ کے بعد اب بھی کوئی یہ کہے کہ امیر فریعت بزرگان دین اور اہل روحانیت کے منکر تھے تو یہ معترض کی بے بصری ہوگی۔ اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جن لوگوں نے عادتاً تعصب کی بڑی آنکھوں پر باندھ رکھی ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمیشہ کے لئے حقانیت بینی سے محروم کر دیا ہے۔ اور ان کی فطرت بد نے انہیں گمراہی و ضلالت کے غار عمیق میں ایسا گرایا ہے کہ وہ منہل ہی نہیں سکتے۔ اور ان کی عقل اس قدر ماؤف ہو جاتی ہے۔ کہ وہ سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہوئے بھی صحیح فیصلہ کرنے سے عاجز ہوتے ہیں۔ جو در حقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑی گرفت ہے۔ عقل کا ماؤف ہو جانا یا حقانیت کی تہر تک نہ پہنچنا ایک ایسی نعمت سے محروم ہو جانا ہے جس کے بغیر تکمیل انسانیت قطعی نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی کوئی صاحب فہم اسے معقول تصور کر سکتا ہے۔

جنہیں اللہ تعالیٰ نے دولت عقل سے سرفراز کیا ہے وہ اختلاف اور معاندت کے ہوتے ہوئے بھی اپنے حریف کے محاسن و خوبیوں کا اعتراف کیا کرتے ہیں اور یہی در حقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے راست بازی کی علامت ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے انسان بہت سی لغزشوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد امیر فریعت اور ان کے ساتھیوں نے سیاست سے تو کنارہ کشی اختیار کر لی تھی لیکن مرزائیت کے خلاف اپنی جدوجہد کو تیز کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ مذہباً اس کے خلاف تھے۔ کہ ایک اسلامی مملکت میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل کسی کے دعویٰ نبوت کا پرچار ہو۔ جبکہ دنیائے اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا۔ کیونکہ حضور کی ذات مقدس خاتم النبیین ہے۔ چونکہ مرزا غلام قادیانی نے اس اصول دین کے برعکس دعویٰ نبوت کیا تھا اس لئے علمائے ربانی کو ان کے خلاف مذہبی جنگ لڑنی پڑ گئی اور نہ انہیں مرزا سے کوئی ذاتی کد و دشمنی قطعی نہ تھی۔ اس میدان کارزار میں امیر فریعت کی حیثیت کا فائدہ سالار کی تھی۔ انہوں نے مرزائیت کے خلاف آخر دم تک جنگ لڑی اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ شیعہ رسالت کے پروانے اور دین مصطفیٰ کے دیوانے اب بھی باقی ہیں جو عظمت دین اور عصمت رسول پر جان نچاؤ کرنا جانتے ہیں۔

ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ امیر شریعت نے درد

دین اور علق رسالت میں ناموس نبوت پر اپنی متاع حیات قربان کر دی اور برصغیر پاک و ہند کو مرزائیت کے خطرہ سے خبردار کیا۔ ان کے اعضاء پر حکومت غالب آچکی تھی۔ عناصر میں اب وہ اعتدال کہاں کا رنگ نمایاں تھا۔ ذیابیطس جیسے موذی مرض نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ لیکن بایں صفعت و نقاہت بھی وہ مرزائیت کے خلاف خواجہ ناظم الدین کے دور حکومت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ پاکستان کا کونا کونا چھان مارا۔ اور اس جرم کی پاداش میں گرفتار ہو کر سکھر جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں صعوبت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہ ان کا علق رسول تھا اور یہ احساس دین کہ وہ حق کی خاطر بڑی سے بڑی طاقت سے نکلے لیا کرتے تھے۔ ان کی سیاست ان کے دینی معاملات و امور کے تابع ہوا کرتی تھی۔ اور ان کی نظر میں محاسن دین کے علاوہ اور کوئی خوبی جمتی ہی نہ تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے میاں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کی راہنمائی فرمائی ہے۔ اس میں انسانی زندگی کی ہر طرح سے فلاح و بہبود موجود ہے۔ اس میں سیاست بھی ہے اور معاشرت کی مشکلات کا حل بھی۔ صرف میاں سے وابستگی چاہیئے۔

ترے نقش قدم کا ذرہ ذرہ

عبادت گاہ جان عاشقان ہے

بعض شخصیتیں ایسی صفات خصوصہ کا مجموعہ ہوتی ہیں کہ جن کی جاذبیت موافق و مخالف کو گرویدہ کئے رکھتی ہے۔ چنانچہ امیر شریعت کی شخصیت بھی انہی صفات کا خلاصہ تھی۔ ان کے حلقہ میں ہر طرح کے فکر و نظر کے لوگ جمع رہتے تھے۔ اور ارادت کلام بھرتے حتیٰ کہ نیاز مندوں میں مسلمان ہندو کمیونسٹ اور سوشلسٹ بھی شامل تھے۔ گرچہ ہر ایک کی سیاسی و مذہبی راہ الگ الگ تھی لیکن وہ امیر شریعت کی مغل میں اس طرح سے جبر رہتے کہ ان کے چہرے بھی ان کے باہمی نظریاتی اختلاف کی غمازی نہ کرتے۔ امیر شریعت یوں تو ہر اختلاف کو گوارا کر لیا کرتے تھے لیکن کمیونزم کے بارے میں وہ بڑے شدید تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ اسلام کے خلاف ایک نہایت ہی خطرناک اور لالچناہی سازش ہے۔ کیونکہ اس کا موجد کارل مارکس یہودی تھا۔ اور یہ مسلمہ امر ہے کہ یہودیت نے اسلام کے خلاف ہمیشہ سازشوں کا جال بچھایا ہے۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ امیر شریعت نے سیاسی نہ تھے بلکہ وہ ایک پکے مسلمان اور اسلامی روایات کے تابع انقلاب آفریں انسان تھے۔ اس لئے وہ کسی ایسی تحریک کو برداشت نہ کرتے تھے جس سے اسلام کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ حضرت امیر شریعت کی زندگی کا مطالعہ کرنے والے حضرات سے یہ فحشی نہیں کہ انہوں نے پاکستان میں بھی مرزائیت کی بد زور مخالفت کی چنانچہ تحریک تحفظ ختم نبوت نے زور پکڑا۔ ملک کے طول و عرض میں شیدایان رسالت ناموس نبوت پر جان کی بازی لڑنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ لاہور میں گولی چلی۔ لیکن اس پر بھی جذبہ علق رسالت نہ دب سکا۔ ہر طرف سے مرزائیت کے خلاف احتجاجی جلوس نکلے۔ تحریک تحفظ ختم نبوت کے رہنماؤں کی گرفتاری عمل میں آئی تو ۲ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں حضرت امیر شریعت کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ایک سال بعد رہائی ہوئی تو آپ کی صحت بہت زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ خود

فرمایا کرتے تھے کہ سکھر جبل میں ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے صحت پر برا اثر پڑا ہے۔۔۔ اور عمر بھی ستر کے قریب پہنچ گئی تھی اور ذیابیطس کی تکلیف ایک عرصہ سے بلائے جان بنی ہوئی تھی۔ باہر آنا جانا تقریباً معطل ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی متعلقین کے پیسم اصرار پر کسی نہ کسی جہلہ میں شریعت لاتے اور پرتا شیر خطاب سے عروق مردہ میں روح پھونک دیا کرتے کچھ عرصے کے بعد یہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا تھا۔ کیونکہ اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ سفر کی کوفت برداشت کرتے۔ البتہ ان کے مکان پر ہر وقت مظل جی رہتی اور ان کا چہرہ سد اہسار پھول کی طرح گلغفہ و تابندہ رہتا۔ یہ ان کی فطرتی خصوصیت تھی کہ وہ ہزار رنج و محن بھی مظل احباب و ارادتمندوں میں ہنس مکھ نظر آتے تھے۔

ضعف نے پہلے ہی سے وجود گرامی پر تسلط جمارکھا تھا۔ ہر چند ڈاکٹروں اور یونانی حکماء نے تدبیر علاج کی۔ مرض بڑھتا چلا گیا آخر ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء بروز دو شنبہ کو غروب آفتاب کے وقت آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

انا لله وانا الیہ راجعون

ریڈیو پاکستان نے آپ کے وصال کی خبر نشر کی تو ملک کے طول و عرض میں غم و یاس کی لہر دوڑ گئی۔ دوسرے روز جنازہ اٹھا تو حد گناہ تک لوگوں کا ہجوم سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آرہا تھا۔ لوگوں کی نواستہیوں اور گریہ و زاری نے مٹان کے در و دیوار سے اظہار تعزیت کی۔ اخبارات نے ہائے اور وائے کی سرخیوں سے اپنے محبوب خلیف کو نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ کہتے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا جنازہ تھا جو اتنے ہجوم کے درمیان سے اٹھا اور لوگوں نے بصد خلوص خاطر کندہ عادیاء حضرت سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے جو بات کھی تھی اور درس زندگی دیا تھا وہ حضرت امیر شریعت نے عملاً کر کے دکھا دیا۔

یاد	داری	کہ	وقت	زنان	تو
ہم	خنداں	بودند	و	تو	گریان
ہمیں	زی	کہ	بعد	مردن	تو
ہم	گریاں	بودند	و	تو	خنداں



یہ کہہ رہے ہیں تجھ سے شیدانِ راہِ عشق  
تو دل کا خون کر لے محبت کا خوں نہ کر

شاہ جی کا آٹو گراف..... (شورش کاشمیری کے لئے)

قیصر معطی قیصر

## جہاں سے ہائے وہ شعلہ نوا خطیب گیا

فدا تھے اہل چمن جس پہ وہ خطیب گیا  
 زمانہ کہتا تھا جس کو مسلح ملت  
 چراغِ عشقِ محمد کی لو لگی تھی جے  
 زبیں حبیبِ خدا پر تھا وہ ازل سے فدا  
 سنن طراز جے جانتے تھے اپنا رقیب  
 یہ غلِ محافظِ نولت کی مرگ پر ہے بیا  
 وہ کہتا تھا کہ اگر پیشِ دادرِ محشر  
 جو دم میں کرتا تھا مردہ دلوں کو گرم عمل  
 فرنگی جس کی صداؤں سے کانپ اٹھتا تھا  
 وہ دورِ جوش پہ تھا جس میں ذوقِ دار و رسن  
 نہیں ہے شعر و ادب میں مزا کہ مفضل سے  
 وہ راہِ قربِ بنی جو تھی زندگی میں بعید

جو نالہ زنِ تہا شبِ غم وہ عندلیب گیا  
 وہ قوم کے دل پرورد کا طلیب گیا  
 ارم کا لٹے ہی پروانہ خوش نصیب گیا  
 جوقِ دیدِ سوئے مفضل حبیب گیا  
 وہ کہہ کے روتے ہیں اب ہائے وہ رقیب گیا  
 جگر پہ دلخِ الم لے کے غم نصیب گیا  
 ہلے گا عرش جو روتا ہوا غریب گیا  
 جہاں سے ہائے وہ شعلہ نوا خطیب گیا  
 وہ دینِ پاک کا سرِ آفریں نقیب گیا  
 پلک جھپکتے ہی کیا دور وہ عجیب گیا  
 سنن شناس گیا، شاعر و ادیب گیا  
 ہوئی جو قطع تو مسبب کے قریب گیا

ستارے عرش سے قیصر جو توڑ لاتا تھا

ارم کو آج وہ واعظ گیا خطیب گیا



## شاہ جی کی باتیں

غالباً ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے میں ابھی چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ ملک میں انقلابی نعرے بلند ہو رہے تھے۔ میں بھی ان نعروں کے مطالب سے بالکل بے خبر اپنے ہم جولیوں کے ساتھ مل کر انقلاب زندہ باد اور انگریز مرد باد نعرے بلند کرتا رہتا۔ انہیں دنوں سہ روزہ احرار کانفرنس کا اعلان ہوا۔ اور کانفرنس سے ایک روز پیشتر پتہ چلا کہ ”بابا ڈنڈے والا“ سیالکوٹ پہنچ گئے ہیں۔ اور عبدالرحیم کے مکان پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔

شوقِ زیارت ہمیں کشاں کشاں دربار کی جانب لے گیا وہاں جا کر ایک وجیہ و شکیل انسان دنیا بھر کا جاہ و جلال اور حسن و جمال سمیٹے، لہراتی ہوئی زلفوں، گھنٹی اور خوبصورت ڈاڑھی کے ساتھ اور چہرہ روشن پر برکات الہی کا نور لئے نظر آیا۔

دریافت پر معلوم ہوا کہ یہی شاہ جی ہیں۔ شاہ جی اس وقت نہا رہے تھے۔ جب غسل سے فارغ ہوئے تو آپ نے سفید قمیض اور ایک سیاہ تہبند زب جسم کر لیا۔ پاس ہی قبلہ شیخ حسام الدین بیٹھے ہوئے تھے۔ مسکرا کر پوچھا۔ شاہ جی! یہ دورنگی کیسی؟

شاہ جی نے برجستہ جواب دیا۔ ارے بھائی دن کی سیاہی نیچے اتر گئی اور ایک زوردار قہقہہ فضا میں گونجنے لگا۔ تشکیل پاکستان سے پیشتر چونڈہ صلیح سیالکوٹ کی انجمن تبلیغ الاسلام کے سالانہ جلسے تاریخی نوعیت کے ہوا کرتے تھے ہندوستان بھر کے جید علمائے کرام ان جلسوں سے خطاب کرنے کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔ اور ہمارا جنون بھی ہمیں اپنی پڑھائی چھوڑ چھاڑ کر چونڈہ جانے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں بھی حسب معمول سالانہ کانفرنس بڑے شاندار اور دھوم دھام سے ہوئی۔

کانفرنس کے آخری اجلاس میں شاہ جی کی تقریر تھی۔ تقریر سے پیشتر اسٹیج پر چونڈہ کا ایک مسٹر سکھ وزیر سنگھ مع اپنے دس خاندان کے افراد کے شاہ جی کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور عرض کیا۔

شاہ جی وزیر سنگھ اور اس کے اہل و عیال آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہونا چاہتے ہیں۔ شاہ جی نے آہ بھر کر کہا بھائی مجھے تو اتنا پتہ نہیں کہ میں بھی مسلمان ہوں یا نہیں آئیے پہلے دیکھیں کہ مسلمان ہوتا کیا ہے؟ اس کے بعد خطبہ سنو نہ پڑھا اور پھر صبح کے تین بجے تک مسلمان کیا ہے؟ کے عنوان پر ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی۔

تقریر کے بعد وزیر سنگھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا

یہ شہادت گجہ الفت میں قدم رکھنا ہے  
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اب بتاؤ مسلمان ہونا چاہتے ہو؟

وزیر سنگھ جس کے دل و دماغ میں اسلام کی حقانیت کی شمع روشن ہو چکی تھی آنسوؤں کے دیے روشن کر کے بولا۔ ہاں شاہ جی اب میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ شاہ جی نے وزیر سنگھ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نکمہ شہادت پڑھایا اور عبد اللہ نام تجویز کیا۔ اسی وقت اس کے خاندان کے دس افراد بھی مسلمان ہوئے۔ اور جلسہ نو مسلمین کے لئے دعائے استقامت کے ساتھ ختم ہو گیا۔ دوسری صبح چونڈہ کے دیگر ۵۴ افراد بھی شاہ جی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

ایک دفعہ دفتر احرار میں بیٹھے تھے، کھانے کا وقت آ گیا۔ اسی وقت بھنگی بھی کہیں سے آ پہنچا۔ شاہ جی نے کہا میاں کھانا کھاؤ۔ خدا آپ کو زیادہ دے، یہ بھنگی کا جواب تھا۔ شاہ جی لٹے بھنگی کو غسل خانے میں لے گئے، اس کا ہاتھ منہ دھلایا۔ اور پھر اپنے ساتھ ہی بٹسا کر کھانا کھلایا۔  
آہ کتنے عظیم انسان تھے!

ایک زمانے میں مجھے بڑے لوگوں سے ان کے دستخطوں کے ساتھ کوئی پیغام لینے کا بڑا شوق تھا۔ اس مقصد کے لئے میں نے ایک بڑی خوبصورت کاپی بنا رکھی تھی۔  
شاہ جی دفتر احرار میں مظل جمانے بیٹھے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کاپی ان کے آگے بٹھادی۔ دیر تک کاپی کی تعریف کرتے رہے اور مسکرا کر فرمایا: کیوں میاں، یہ مجھے تمہارے دے رہے ہو؟  
عرض کیا: شاہ جی اس پر آپ اپنے قلم سے کچھ لکھ دیں۔  
فرمایا: نہ بھئی، اتنی خوبصورت کاپی میں کیوں خراب کروں۔  
شاہ جی! یہ اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ آٹو گراف بک ہے۔  
شاہ جی ذرا غصے میں آ گئے۔ فرمایا، وہی انگریزی بدعت اور اس کے ساتھ ہی کاپی مجھے واپس لوٹانے لگے۔ دوبارہ عرض کیا: شاہ جی اس پر اپنی طرف سے کوئی پیغام لکھ دیجئے۔  
فرمانے لگے نہیں کیا اور میرا پیغام کیا، پیغام لانے والا تیرہ سو برس پیشتر جو پیغام لایا تھا اس پر تم لوگ کیا عمل کر رہے ہو، اسی پیغام کو سمجھو اور اسی پر عمل کرو۔ دنیا و عقبیٰ سنوارنے کے لئے وہی کافی ہے۔

کراچی ختم نبوت کے دفتر میں شاہ جی صبح کی نماز کے بعد وظیفے میں مصروف تھے کہ اتنے میں مولانا عبد الحمید سالک مرحوم اور حمید لاہوری مرحوم تشریف لائے۔ سالک صاحب نے آتے ہی حملہ کیا:

برزباں کسبج و در دل گاؤ خرا!

شاہ جی نے وظیفہ ختم کرنے کے بعد فرمایا:

سالک صاحب آپ نے بڑے موقع کا مصرع پڑھا ہے اس وقت میرے دل میں آپ دونوں ہی کا تصور تھا۔

ایک دفعہ شاہ جی سیالکوٹ میں ڈسٹرکٹ ٹرانسپورٹ کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ عقیدت مند پروانوں کی طرح جمع تھے۔ بات حقوق اللہ اور حقوق العباد پر چل نکلی۔ اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے۔

یاد رکھو اگر میں حقوق اللہ میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہوں تو کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کی طرف سے مجھے معاف کر دے۔ اسی طرح اگر میں کسی انسان کو دکھ دوں تو خدا کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ میری یہ غلطی معاف کر دے جب تک وہ انسان جس کے ہاتھوں مجھے یہ دکھ پہنچا ہے وہی معاف نہ کر دے!

ایک دفعہ شاہ جی سیالکوٹ تشریف لائے۔ ہر عقیدت مند کی خواہش تھی کہ شاہ جی میرے ہاں قیام کریں۔ شاہ جی نے دفتر ہی پسند کیا۔ دن بھر محفل جی رہی۔ رات کو دفتر ہی میں بستر لگا دیا گیا۔ شاہ جی نے چار پائی پر بستر لگا دیکھا تو اٹھا دیا۔

عرض کیا: شاہ جی بستر ہی پر سو رہیے۔

فرمایا: کل جیل میں یہ زرم و گرم بستر پہنچا دو گے؟

عرض کیا گیا: اگر آپ حکم دیں گے تو وہاں بھی پہنچا دیں گے۔

فرمایا: پھر قبر میں بھی پہنچا دو گے؟

اللہ اللہ یہ تھے شاہ جی!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

موم ہو جاتے ہیں اس کے وعظ سے پتھر کے دل  
کی ہے وہ طاقت بخاری کو عطا، اللہ نے  
(اسد ملتانی)

## گلستان نبوی کی بادِ بہاری

مافظ امرتسری

خطابت تھی تمہ کو خدا سے ودیعت  
وہ میدان کا غازی وہ مرد کلندر  
مصائب کا خوگر مجسم صداقت  
وہ عابد وہ زاہد، وہ بندہ خدا کا  
بلی جس کے ہاتھوں میں شعلہ نوائی  
خلوص و محبت رہا جس کا زیور  
وہ شاعر، مبلغ، مبصر، مقرر  
فصاحت، بلاغت کا سیل رواں تھا  
سیاست فراست میں تھا وہ یگانہ  
وہ حق گو وہ بے باک ساحر بخاری  
خطابت تھی جس کو خدا سے ودیعت  
ہوا ہم سے رخصت وہ میر شریعت





## سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور تحریک آزادی کشمیر

وادی کشمیر میں ڈوگرہ سامراج مسلمانوں پر جبر و تشدد اور جوہر و ستم کے پہاڑ توڑ رہا تھا اور خونِ مسلم سے وادی کے ذرہ ذرہ کو رنگین بنا چکا تھا۔ ادھر شاطر فرنگی کشمیر کو قادیانی سٹیٹ بنانے کے منصوبے بنانے میں مصروف تھا۔ اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے خواجہ جمال الدین لاہوری مرزائی کے بھائی خواجہ جمال الدین جو ان دنوں ریاست میں انسپکٹر تعلیمات تھا۔ اس کے اثر و رسوخ اور منصب سے فائدہ اٹھا کر تمام تعلیمی اداروں میں لاہوری اور قادیانی مرزائی بھرتی کر لئے گئے مزید برآں ۲۴ جولائی ۱۹۳۱ء کو شملہ میں انگریز کے ایسٹ پروسکریٹ اور درباری لوگوں کا اجتماع ہوا جس میں کشمیر کمیٹی کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ چنانچہ مرتبہ پروگرام کے مطابق مرزا بشیر الدین محمود آئنبھانی (خلیفہ قادیان) کو صدر اور مسٹر عبدالرحیم درد خلیفہ کے پرائیویٹ سیکرٹری کو جنرل سیکرٹری بنایا گیا۔ شملہ ہی سے مرزا بشیر الدین نے ایک اعلان کے ذریعہ کہا کہ مجھے تمام مسلمانوں نے اپنا رہنما تسلیم کر لیا ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب آئنبھانی نے ۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو تمام ہندوستان میں یوم کشمیر منانے کا اعلان کر دیا۔ خلیفہ کے پرائیویٹ سیکرٹری نے ملک کے مشہور لوگوں کو خطوط لکھ کر اطلاع دی کہ انہیں کشمیر کمیٹی کا ممبر بنایا گیا ہے۔ ہندوستان بھر کے مسلمان فرنگی کی اس سیاسی سازش سے بے خبر تھے۔ چنانچہ مجلس احرار کے عظیم دماغوں نے فوراً انگریز کی سیاسی سازش کو تارویا۔

### تحریک آزادی کشمیر اور احرار

آخر مجلس احرار نے مسئلہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے تحریک کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور احرار کے پلیٹ فارم سے تمام سیاسی جماعتوں کو دعوت دی کہ ہم سب کو مل کر کشمیر کے سیاسی مسئلہ کو حل کرنا چاہیے۔ ورنہ کشمیر کمیٹی ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال کو اور خطرناک بنا دے گی۔ احرار کا اس میدان میں آنا تھا کہ فرنگی سازش ناکام ہو کر رہ گئی۔ کشمیر کمیٹی کے تار و پود بکھر گئے۔ اور علامہ اقبال نے نائب صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔

دوبارہ سرکردہ مسلمانوں نے جو کمیٹی تشکیل دی اس کے صدر علامہ اقبال چنے گئے۔

### کشمیر چلو کی تحریک

مجلس احرار اسلام میں بہترین دل و دماغ رکھنے والے اور قابل ترین افراد موجود تھے۔ شاہ جی نے اپنی ساحرانہ خطابت اور مجاہدانہ عزم سے ڈوگرہ سامراج کے خلاف صور پھوٹا اور کشمیر چلو کی صدا بلند کی۔ ملک کے گوش گوشہ سے اس آواز پر لبیک کہا گیا۔ فرزند ان اسلام نے سر بکھٹ ہو کر کشمیر کی سرحدات میں داخل ہونا

شروع کر دیا۔ شہادت، قید و بند اور ماریٹ کے مصائب و آلام کے طوفان سے کھیلنے لگے۔ لیکن یہ سختیاں ان کے مجاہدانہ عزم اور شوق شہادت و آزادی کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔ بلکہ ذوق و شوق بڑھتا گیا۔ چالیس ہزار احرار مجاہدوں نے کشمیر کی آزادی کی خاطر جیلوں کو بھر دیا۔ یوں تو اس جہاد میں پورے ملک نے حصہ لیا لیکن تنہا سیالکوٹ کے دس ہزار فرزندان اسلام نے قربانی پیش کی۔ شاہ جی کے رفیق کار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی جو دراصل امیر احرار تھے۔ ہندوستان بھر کے اخبارات کی فہرست بنا کر رابطہ قائم کیا نتیجہ یہ ہوا کہ مسند کشمیر مشترکہ مسند بن گیا۔ اور مدد اس تک کے جیلے رضا کاروں نے اس تحریک میں حصہ لیا۔

### مہاراجہ کشمیر نے شکست تسلیم کر لی

شہیدوں کا خون رنگ لاتا ہے تو نوجوانوں کی قربانیوں سے قومی اور ملی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہیں اور ان کے مقدس خون کے جہاں جھینٹے پڑتے ہیں وہاں آزادی کے تن آور درخت پیدا ہوتے ہیں۔ مہاراجہ کو سر فروشوں کے عزم کے آگے جھکنا پڑا۔ اور اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور خود اختیاری کی اساس پر کشمیر میں جمہوری حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اسمبلی کے قیام کی تجویز کی گئی۔

اس وقت اگر کشمیری لیڈر عجلت پسندی سے کام نہ لیتے نرخ بالا کی آرزائی ہنوز کے فارمولا پر عمل پیرا ہوتے اور مفکر ایشیا جودھری افضل حق مرحوم کی اس تجویز پر اڑ جاتے کہ ہم ذمہ دار نمائندہ حکومت سے کم پر کسی طرح راضی نہ ہوں گے تو حالات مختلف ہوتے۔ اور مہاراجہ کی اتنی بھی حیثیت باقی نہ رہتی کہ وہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا اعلان کرنے کی جرأت کر سکتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

### تحریک کے گہرے اثرات

تحریک سے پہلے عوام میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ کشمیری مسلمان بزدل ہیں۔ ان میں صلابت و استقامت اور شجاعت و بہادری عتقاء ہے اس موقع پر پہلی بار اس نظریہ کے تار پود بکھر گئے اور کشمیری مسلمانوں نے اس کا جواب اپنے عمل سے دیا۔ اور میر واعظ یوسف کی پکار پر پروانہ وار گولیاں کھاتے تھے۔ اس تحریک کا دوسرا اثر یہ پڑا کہ کشمیریوں میں آزادی کی لہر دوڑ گئی جس کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہیں۔

تیسرا گہرا اثر یہ ہوا کہ فرنگی اور قادیانیوں کی سازش شاہ کر کے رکھ دی گئی۔ اور کشمیر کو قادیانی ریاست بنانے کا تصور ہمیشہ کے لئے دفن ہو کر رہ گیا۔

گو بعد میں اس تحریک کی قیمت مجلس احرار کو بھاری ادا کرنی پڑی۔ اور سر فضل حسین نے ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کا قہقہہ کھڑا کر کے احرار سے دل کھول کر انتقام لیا۔ مگر احرار شاہ جی کی قیادت میں اس تحریک سے جو عظیم مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے اتنی بڑی قربانی دیکر انہوں نے حاصل کر لئے۔

## یزداں کی اک نشانی

حضرت امیر شریعت عالم باعمل اور صوفی رمز شناس تھے۔ ہزاروں افراد نے ان کے دست مبارک پر بیعت کی اور اپنے نفس کی اصلاح کا اہتمام کیا۔ ان کی زندگی کے اس پہلو پر بہت کم حضرات کی نظر گئی ہے۔ اصلاح باطن میں انہیں کمال حاصل تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ جی کو شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ سے فیض تھا۔ جادہ تصوف کے راہرو اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ اس جہان میں حضرت رائے پوری کی نسبت سے بلابالغہ لاکھوں طالبانِ صادق نے روحانی منازل طے کیں "رائے پور" کی خانقاہ سے برسوں تصوف کا نورانی چشمہ رواں دواں رہا۔ یہ خانقاہ منازلِ سلوک میں اپنے وقت کی سب سے بڑی تربیت گاہ رہی ہے۔

آنکس ست اہل بشارت کہ اشارت داند

نکلتا ست بسی مرم اسرار کجا است

شاہ جی نے پیری اور سجادگی کی دکان کبھی نہ سہائی۔ پیری مریدی کو کاروبار کا درجہ نہ دیا۔ ان کی خیریت مند طبیعت کبھی کسی مرید سے ایک پائی کی روادار نہ ہوئی۔ ان کے ارادت مندوں نے بھولے سے بھی کبھی ان کی پیشوائی و ولولائی کا ڈھونڈ نہ نہیں پٹھا۔ شاہ جی دلق اویس اور گلہم بوزر کے امین تھے۔ انہوں نے بادلوں کا کفن نہیں بپھا اور آباء کی قبروں کی اینٹوں کو فروخت نہیں کیا۔ کیونکہ وہ دھن دولت کے بندے نہ تھے۔ وہ تو بطل حریت تھے۔ انہوں نے ولایتِ سیاست کے خارزار کی عمر بھر جادہ پیما کی۔ اپنے عقیدت مندوں کو بھی ساتھ لے کر چلے۔ انہوں نے مریدوں کے ہاتھ میں تسبیح کے بجائے کلہاڑی پکڑائی۔ غلامی کی زنجیروں سے نبرد آزما رہے۔ وہ قافلہ احرار کے سرخیل تھے۔ تو چودھری افضل حق مرحوم داغ، مولانا مصیب الرحمن لدھیانوی سالار میسر تھے تو قاضی احسان احمد سالار میسر۔ شاہ جی کے رفقاء کار میں شیخ حسام الدین، تاج الدین انصاری، مولانا مظہر علی اعظم اور شورش کاشمیری ابھی زندہ ہیں۔ یہ حضرات کسی بھی شیخ سے تقریر کریں۔ مگر ان کی تقاریر احرار کی خلافت کی دھندلی یادیں تازہ کر دیتی ہیں۔

جنوں تو کہہ ہی دیتا ہے بات ساری

خرد نے سوچ کر تعریف کی ہے

مجلس احرار اسلام کے سیاسی نظریے سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن تحریک آزادی میں جوان کا حصہ ہے اس سے انکار کرنا تاریخ پر ستم توڑنا ہے۔ "احرار" کو کانگریس کا پٹھو کھنا دھاندلی ہے۔ جبکہ ۱۹۳۱ء میں احرار کانگریس سے الگ ہو گئے تھے۔ کانگریس سے علیحدگی چودھری افضل حق مرحوم کے نظریات کی بناء پر ہوئی تھی۔ اور یہ بات بے باک دہلی کھی جاسکتی ہے کہ چودھری صاحب مرحوم کانگریس کو ہندو امپریزم کا اہم خیال کرتے تھے اور ان کی درویشانہ سرشت میں ہندو سرمایہ داری کے خلاف سخت نفرت موجود تھی۔ چودھری

صاحب کو ان کے ناقد احرار کا "مارکس" کہتے ہیں۔ یہ قطعی غلط ہے کہ میرے نزدیک ان کا ذہن توحید و رسالت میں سے نصرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے نزدیک تھا۔ چودھری صاحب کو جاگیر داری اور سرمایہ داری سے بغض کی حد تک چڑھتی۔ ان کا نظریہ حیات اس شعر کے قریب قریب ہے۔

دولت ہو جس نظام میں انسانیت کا نام

دنیا کا وہ نظام بدلنے کی فکر ہے

یہ ایک تاریخی المیہ ہے کہ اسلام پر دل و جان سے قربان ہونے کا جذبہ رکھتے ہوئے بھی "مجلس احرار" تحریک پاکستان میں شامل نہ ہوئی اس کی واحد وجہ جو تاریخی تجزیہ کے بعد مجھے نظر آئی ہے وہ مسلم لیگ میں نوابوں کی موجودگی تھی۔ دوسرے پنجاب کے جاگیرداروں کو "احراری دماغ" نے ہمیشہ بنیل اور کوتاہ فکر گردانا۔ بہر حال یہ دوسرا المیہ ہے کہ ایک فعال جماعت نے تحریک پاکستان کی مخالفت کر کے اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھونک لی۔ بہر حال ذکر تشاہدہ جی کا تو وہ بقول عبدالمہدیم یزدان کی لٹانی اور احرار کی جوانی تھے۔ شعر سن لیجئے

تو آدمی نہیں یزدان کی اک لٹانی ہے

تیرے بڑھاپے میں احرار کی جوانی ہے

آخری ایام میں شاہ جی کا حلیہ کچھ اس طرح تھا۔ درمیانہ قد، دھرا جسم، گھنڈی رنگ، چہرے پر ہمیری ہمیری سفید داڑھی، سر پر پنٹھے، اُن پر اور مٹی ہوئی انوار کیپ، کشادہ پیشانی، ہمارا ہوا روشن کتابی چہرہ، عقابانی آنکھیں جن میں غیرت اور خودداری کی کرنیں پھوٹا کرتی تھیں۔ طبیعت میں جلال و جمال کا حسین امتزاج تھا۔

قلندرانہ ادائیں

سکندرانہ جلال

آواز میں شیرینی سے بڑھ کر جادو، خلوت قرآن پاک کے وقت ان کے گلے سے اٹھنے والی سوز آواز نکلتی تھی کہ سامعین مجھوم مجھوم جاتے تھے۔ دیہاتی سامعین کو کبھی کبھار ہیر وارث شاہ کے جادو ہیرے اشعار سنا کر موہ لیتے تھے۔ تھریر فرماتے تھے تو مجمع پر سناٹا چھا جاتا۔ موافق مخالف واہ واہ کے ڈونگرے برساتے اور مسور ہو جاتے۔ ان کی شعلہ نوائی سے پنجاب کے دریاؤں میں بارہا موج آیا۔ جتنا اور گومتی بھی کناروں سے باہر ہو گئے۔ منبر سے ان کی گونج سنائی دی۔ شیخ سے انہوں نے لٹکارا۔ ہمالیہ کی چوٹیاں دہل گئیں۔ انگریز کا تخت ڈانوا ڈول ہوا۔ قادیانی نبوت لرز گئی۔ چالیس برس تک ان کی پاٹ دار آواز نے تھکے چھانے رکھا۔ مگر آخری ایام میں ان کی مجبوری اور لاہاری کا یہ عالم تھا کہ گویائی کے لئے ہلکی سی چھماری کے محتاج تھے۔ فشر میڈیکل کلج بمٹان میں ان کی بے زبانی اور کرب و کھم کر رونا آتا ہے کہ ہائے یہ وہ خلیب آتش نوا ہے کہ جس کی شعلہ نوائی اور آتش بیانی خرمن استعمار پر بجلی بن کر گرا کرتی تھی۔ ان کی آخری جھلک دیکھ کر راقم المروف کے ذہن میں ان کے ہم وطن شاعر حضرت شاد عظیم آبادی کی غزل کا یہ مطلع یاد آ گیا تھا۔ یہ شعر گویا جناب شاد نے پیر بخاری کے لئے کہا تھا۔

دھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم  
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اسے "ہم لغو" وہ خواب ہیں ہم

آپ کی پرورش کچھ ایسے ماحول میں ہوئی کہ مذہبی مطالعہ کے ساتھ ساتھ آپ کو اعلیٰ درجے کا ادبی ذوق بھی میسر آیا۔ آپ کا بچپن شاد و عظیم آبادی کے عروج کا زمانہ تھا۔ شاہ جی نے اپنے بچپن میں شاد کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اسی لئے تو شعر و شاعری کا ذوق ان کی فطرت ثانیہ بن گیا تھا۔ انہیں فارسی اور اردو اساتذہ کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ مولانا روم، حافظ شیرازی، عمر خیام، مرزا غالب اور ڈاکٹر اقبال ان کے محبوب شعراء تھے۔ شاہ جی خود بھی شریک تھے۔ ان کا قصہ ندیم تھا۔ ان کا مجموعہ کلام سوانح الاملاہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بقیہ کلام میں شرعی بائبلین کی جھلک نظر آتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کی زندگی میں شاعری کو اعلیٰ حیثیت حاصل تھی۔ ان کا اصل میدان خطابت تھا۔

کلم را آں زبان بنود کہ سر عشق گوید باز!

بیروں از حد تقریر است شرح آرزو مندی

انہوں نے اردو کی عوامی خطابت کو عمر بھر چار چاند لگائے ہیں۔ وہ اس میدان کے اتنے بڑے سوار تھے کہ ان کے ہم عصروں میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ خطابت کے میدان میں اردو نے آج تک اتنا بڑا خلیفہ پیدا نہیں کیا۔ شاہ جی کی سیاسی زندگی اور خطابت کا آغاز ۱۹۲۰ء کے محترمہ خیز دور میں ہوا۔ انکی شخصیت کے حسن و رعب اور شعلہ نوازی نے برصغیر پاک و ہند میں آگ لگادی انہوں نے اپنی اچھوتی طرز خطابت سے اس وقت اپنا لوہا منوایا جب مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت کا طوطی بول رہا تھا۔ جب مولانا محمد علی جوہر کی خطابت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ تحریک خلافت کا زمانہ تھا۔ آپ کی آتش بیانی سے مسلمان قوم بیدار ہوئی۔ ورنہ پوری کی پوری قوم ماضی کی شاندار روایات کے تصور میں گم تھی۔ یا حال کی شکست اور بس ماندگی میں ہسٹلان کی شعلہ بیانی مضی ان کی ذات کی نمود نہ تھی۔ ان کی تقریر میں شاعرانہ ڈھنگ بھی جوتی تھیں اور ناصحانہ نکات بھی عبرت کی داستان کے ساتھ ساتھ لطیفے اور جھلکے بھی بیان ہوا کرتے تھے۔ تقریر میں محاوروں کی پابندی اور عام فہم مثالیں اس طرح بیان فرماتے گویا انگلیں بھی گلیںے جڑ رہے ہوں۔ وہ گھنٹوں بے ٹکان بولنے کے عادی تھے۔ ان کے سامعین بادش میں بیگنا گوارہ کر لیتے تھے۔ لیکن تقریر چھوڑ کر نہ جاتے تھے۔ تقریر کی طوالت کبھی سامعین کی تھکاوٹ کا باعث نہ ہوتی۔ ان کی گفتار میں جادو کی کیفیت اور سر کا عالم ہوتا تھا۔ ان کے بدترین مخالف بھی ان کی تقریر کی گھریزیاں اور آتش بیانیاں سنتے پائے گئے ہیں بلکہ مخالفوں کو سرد جھٹے دیکھا ہے۔ سی آئی ڈی والے لکھتے لکھتے اکٹا جاتے ان کی انگلیاں تنک جاتیں۔ اخبار نویس ان کی گربا گرم تقریر کی رپورٹنگ سے عمر بھر عاجز رہے۔ شاہ جی ایک منٹ میں ایک سو سے زیادہ الفاظ بولنے پر قادر تھے۔ ان کی خطابت کے چرچے برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے میں رہے ہیں۔ اپنی مصروفیات زندگی کو انہوں نے ایک موقع پر یوں فرمایا:

"زندگی ہی کیا ہے تین چوتھائی ریل میں کٹ گئی۔ ایک چوتھائی جیل میں جتنے دنوں جیل سے باہر رہا

لوگ گلے کا ہار بنتے رہے۔ آج کل کلہ لاهور، لاهور سے پشاور، پشاور سے کراچی، سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں ۳۶۶ تقریریں کی ہوں گی۔ میں نے تقریر کی لوگوں نے کہا "واہ شاہ جی واہ" میں قید ہو گیا۔ لوگوں نے کہا "آہ شاہ جی آہ" اور "واہ اور آہ" میں ہم ہو گئے تباہ

گزر گیا کہ درماندہ راہ یہ کہتا  
اب اس فضا میں کوئی قائل نہ ٹھہرایے

انجمن خدام الدین لاهور کے ۱۹۳۰ء کے تاریخی اجلاس (جس میں ہندوستان بھر کے جید علماء فطریک تھے) کی حدات شیخ الاسلام حضرت مولانا انور شاہ کا شیریں نے فرمائی تھی۔ مولانا انور شاہ کا رتبہ علمائے دیوبند میں اور اس سے باہر بھی بہت بلند تھا۔ ہر مکتب خیال کے علماء ان کا احترام کرتے تھے۔ مولانا انور شاہ کے پائے کا محدث ان کی وفات کے بعد بلا ہند میں پیدا نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ حضرت انور شاہ پہلوی (قدیم فارسی) کے بہت بڑے عالم تھے۔ علامہ اقبال نے جب ایران کا سفر کیا تو وہاں زر قش مذہب کے پیروکاروں نے ان سے اپنی قدیم کتاب "پارشد" کے سلیس فارسی ترجمہ کی درخواست کی۔ حضرت علامہ نے جواباً کہا کہ اس کا ترجمہ مجھ سے تو ممکن نہیں البتہ میرے ملک میں ایک ہستی ایسی ہے جو اس کام کو بہمن خوبی سرانجام دے سکتی ہے۔ زر قشیوں نے ایک لاکھ ایرانی سکے کی پیش کش کی۔ حضرت علامہ نے ہندوستان لوٹ کر حضرت انور شاہ صاحب سے ذکر کیا۔ حضرت انور شاہ صاحب نے جانتے ہو کیا کہا "لاکھ روپے کے بدلے میں کفر کی اشاعت کیوں کروں۔ انور شاہ اسلام کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اشاعت کفر کے لئے نہیں" بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ذکر تھا۔ انور شاہ صاحب کی حدارت کا سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کے لئے کھڑے ہوئے ایسے لولولے للہ بکھیرے کہ مجمع کا مجمع جموم گیا۔ تقریر دلپذیر کے اختتام پر مولانا انور شاہ نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا۔ "عطا اللہ شاہ بخاری صبح معنوں میں اسیر شریعت کھلانے کے مستحق ہیں۔" اتنا فرمایا اور اپنا ہاتھ بیعت کے لئے بڑھا دیا۔ شاہ جی پر تورق طاری ہو گئی اور عرض کیا نہیں مجھے اپنے ہاتھ پر بیعت ہونے کی اجازت دیں۔ مگر انور شاہ صاحب نے اپنا ہاتھ شاہ جی کے ہاتھ میں دے دیا بس پھر کیا تھا پورا مجمع حضرت اسیر شریعت کے نعروں سے گونج گیا۔

### نصرت قریشی

رخعت ہوئے دنیا سے بخاری کے جلو میں  
اندازِ بیاں، سرِ بیاں، لذت گفتار  
نصرت! پئے تاریخ یہ ہاتھ نے ندا دی  
اب ختم ہوئی رونقِ ہنگامہ احرار

## امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا مقدمہ عدالت

آج فصیح البیان مقررین کا زمانہ بیت چکا ہے۔ سریندر ناتھ بنیرجی، فیروز شاہ مشرہ۔ محمد علی جناح، اینٹی بسنت، سری نواس شاستری، لالہ لاجپت رائے اور بہت سے دوسرے شعلہ نوا مقررین کا دور کہ جنہوں نے لاکھوں انسانوں کے اندر اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے بیداری پیدا کی اور (انقلاب عام سے) برطانوی سلطنت کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ انسانوں کا یہ قبیلہ آج فی الواقع معدوم ہو چکا ہے۔

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کسی نقطہ نظر سے اپنے دور میں ہندوستان کے ممتاز ترین اور خوفناک ترین مقرر تھے۔ ان کے دور عروج و ترقی میں اگر بالفرض ان کی نگر کے کوئی مقرر تھے بھی تو وہ تعدا میں برائے نام تھے۔ تین سے پانچ گھنٹوں کی تقریر ان کے لئے ایک عام سی بات تھی۔ سامعین کا جم غفیر، جو بعض اوقات ساٹھ ساٹھ ہزار انسانوں پر مشتمل ہوتا تھا ان کو سننے کے لئے نہایت صبر و تحمل سے انتظار میں رہتا۔ وہ عشاء کے بعد گیارہ بجے کے قریب سٹیج پر آتے تھے۔ اور پوچھنے پر سامعین کو چھوڑتے۔ جو پھر بھی گھروں کو بادلِ نخواستہ ہی جاتے ساری رات تقریر سن کر ان کا بالآخر گھروں کو جانا کسی شکم نسیری یا بیزاری کے باعث نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ شاہ جی خود اس خیال سے انہیں چھوڑ دیتے تھے کہ (رات کا یہ وقت آخر) ان کے آرام و استراحت کے لئے ضروری ہے۔ وہ سامعین کو ہٹانے اور رلانے پر قادر تھے۔ وہ ان کے اندر جتنی آسانی سے تصحیک اور تنفر کے جذبات مشتعل کرنے کی قوت رکھتے تھے، اتنی ہی آسانی سے محبت، نرم دلی اور رحم کے جذبات ابھارنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔

شاہ جی اصل و نسل کے اعتبار سے عرب تھے۔ وہ بول چال میں عربی فارسی اور اردو کو استعمال کرتے تھے۔ وہ انگریز سے نفرت و عداوت رکھتے تھے۔ اور مرزائیوں کو بے حد ذلت و حقارت سے دیکھتے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی نامِ قیادت کئی سال تک ان کے ہاتھوں میں رہی۔ اور کئی موقعوں پر قید و بند کی صعوبتوں کو مردانہ وار جھیلا۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی اپنی خداداد قابلیت، اپنے نظریات اور اپنی قربانیوں کو کسی ناچارِ نفع کے لئے واؤ پر نہیں لگایا۔

شاہ جی ہمیشہ سیاست کے موضوع کے مقابلے میں مذہب پر بحث و گفتگو کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ کانگریس اور ملک کی پکار پر سرکارِ داربار کی قدس گاہ کو خیر باد کہہ کر ستیہ گرہ کی تمریکوں کے حق میں، کبھی دوسروں کو انتخابات میں کامیاب کرانے، کبھی اپنی آتش بیانی سے سامعین کو (حق و صداقت کے لئے) شعلہ زن کرنے، کبھی عوام کو سیاسی جمود و خود سے چھٹکارا دلانے اور کبھی ملک و قوم کے نام پر ایثار و قربانی کے الؤ بھرکانے کے لئے میدانِ عمل میں اترتے تھے۔

جب ہندوستان بھی جنگ عظیم دوم میں شامل ہو گیا تو شاہ جی بہت جلد حکومت برطانیہ کی پالیسیوں کے ایک مخالفت کی حیثیت سے نمایاں ہو کر ابھرے۔ اس وقت حکومت پنجاب کا سربراہ بحیثیت وزیراعظم سر سکندر حیات خاں مرحوم تھا۔ وہ برطانوی حکومت کے مقصد اور مشن کے انتہائی وفادار حامیوں میں سے تھا۔ شاہ جی نے ۱۹۳۹ء کے موسم گرما میں بہت سی تقاریر کیں۔ جن میں سے ایک تقریر، کو جو راولپنڈی میں کی گئی، عدالتی مقدمے کی بنیاد بنانا حکومت کے لئے ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ لیکن شاہ جی بھی معمولی آدمی نہ تھے۔ اور اس لئے (جیسا کہ اس زمانے میں یہ بات عام ہو گئی تھی) عوام کو جوش عمل پر اکسانے والے اور اپنی پوشیدہ قوت کے لحاظ سے اس خطرناک ترین مقرر سے ملک کو نجات دلانے کی خاطر سیکرٹریٹ میں ایک انتہائی شیطانی سازش کا منصوبہ تیار کیا گیا۔

ان پر شاہ برطانیہ کے خلاف بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ یا دوسرے الفاظ میں انہیں غدار قرار دیا گیا۔ جو قانون فوجداری کی رو سے ایک سنگین ترین جرم تھا۔ اور جس کی سزا چالیس تھی یا عمر قید بہ عبور دریائے شور۔

چنانچہ آغاز جنگ کے فوراً بعد شاہ جی ضابطہ، تعزیرات ہند کی دفعہ نمبر ۱۲۱ الف کے تحت جاری ہونے والے ایک وارنٹ کے ذریعے گرفتار کئے گئے۔ شاہ برطانیہ کے خلاف بغاوت کا یہ مقدمہ حکومت پنجاب کے خاص حکم سے قائم ہوا۔ اور کئی مہینوں تک انہیں ایک حوالاتی ملزم کی حیثیت سے زیر حراست رکھا گیا۔ کیونکہ اتنے سنگین جرم کے لئے ضمانت کی درخواست مسترد کر دی گئی تھی۔ الزام کا لب لباب یہ تھا کہ شاہ جی نے ۳ جون ۱۹۳۹ء کی رات راولپنڈی کے مقام پر ایک ایسی تقریر کی تھی جس میں کئی دوسری باتوں کے علاوہ اس امر کا حوالہ بھی تھا کہ حکومت برطانیہ نے شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کو ناحق قتل کیا اور یہ بھی کہا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے اور یہ کہ ہندوستان اپنا قابل قدر حصہ آزادی پہلے ہی حاصل کر چکا ہے۔ اور اب ان غیر ملکی استحصالیوں اور قصابوں کو پوری طرح ملک بدر کرنے کے لئے عوام کو صرف ایک پُر عزم جذبہ عمل کی ضرورت ہے۔ یہ الزام بھی تھا کہ (انہوں نے کہا) مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ قابل نفرت سامراج کو ملک سے باہر نکال پھینکنے کو جہاد (یعنی ایک مقدس جنگ) سمجھیں۔ نیز انہوں نے اپنے سامعین کو یہ کہہ کر بھی اشتعال دلایا کہ اب یہ کام صرف ایک ہی طریقے سے ممکن ہے کہ "یامرو یا مارو" قانونی سزا کی رو سے تقریر بغاوت پر اکسانے والی بھی تھی۔ (جو دفعہ ۱۲۳ الف کے تحت لائق تعزیر تھی) اور ساتھ ہی شاہ برطانیہ کے خلاف جنگ آزما ہونے کے مترادف بھی تھی۔ (جو ضابطہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۱ کے تحت قابل سزا تھی)

یہ مقدمہ بہت زیادہ سیاسی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ عوام میں اس امر کی پیش گوئی پائی جاتی تھی کہ حکومت سزا کے سلسلے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گی۔ اس لئے میں شاہ جی کے قانونی دفاع کے معاہدے کو اپنے لئے ایک طرح کا اعزاز خیال کرتا تھا۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کافی ذمہ داری کا ایک معاملہ بھی ہے۔ کیونکہ



عامۃ الناس کو اس مقدمہ میں بڑی دلچسپی تھی۔ اور شاہ جی کی ہر دلعزیزی اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اور عصری خلفشار اور جوش و جذبہ کی وجہ سے اس مقدمے کو ایک بڑی جنگ سمجھا جا رہا تھا۔ کیونکہ اس کا تعلق دو مضبوط شخصیتوں سر سکندر حیات وزیر اعظم حکومت پنجاب اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے درمیان باہمی ٹکراؤ سے تھا۔ جن میں سے ایک خوشگوار لیکن بے رحم منتظم تھا۔ اور دوسرا نتائج سے بے پرواہ آتش بیان خطیب جسے مسلم عوام بہت کی طرح پوجتے تھے۔ راولپنڈی کے ایک مجسٹریٹ نے ابتدا کی تحقیقات کی اور بادی النظر میں مقدمہ کو اہم خیال کرتے ہوئے بغاوت کے اکا نے اور شاہ برطانیہ کے خلاف جنگ آزادی کی ترغیب دینے کے الزام میں آئندہ تہویر مقدمہ کے لئے اسے سیشن کے سپرد کر دیا۔

مقدمے کی اہمیت کے پیش نظر لاہور ہائی کورٹ نے کارروائی لاہور منتقل کر دی۔ اور ہدایت کی کہ لاہور کا سیشن جج مقدمہ کی سماعت کرے۔ اس وقت یہ سیشن جج انڈین سول سردرس کا ایک شخص مسٹر ڈی فالٹا تھا۔ جو آج کل شملہ ہائی کورٹ کا مسٹر جسٹس فالٹا کہلاتا ہے۔ فالٹا ہمیشہ ہی ایک سخت گیر جج رہا۔ جس کے سامنے کسی مقدمے کی پیروی کرنا یا اس پر بحث واستدلال کرنا آسان کام نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ زور درج تھا۔ اور طبیعت میں غصے کا میلان رکھتا تھا۔ لیکن ایک ایسا وکیل جو اس کی زور درخی اور سختی کو نرم کرنے اور طبیعت کے اشتعال کو اعتدال پر لانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کے لئے فالٹا ایک نہایت اعلیٰ جج تھا۔ جو با اصول، منصف مزاج، اور ہر قسم کے تعصب سے آزاد ہوتا تھا۔ فوجداری کے کسی مقدمہ میں جب تحقیقات مقدمہ پر ان کی توجہ مبذول کرائی جاتی تو کسی بھی ملزم کو عدالتی دیاننداری کے اعلیٰ ترین معیار کی توقع فالٹا سے زیادہ (کسی اور) جج سے نہیں ہوتی تھی۔ مقدمے کی سماعت، لاہور کی سیشن عدالت کے ایک بڑے کمرے میں ہوئی جو لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ فالٹا چار رائے دہندگان کے ہمراہ اپنی عدالت کی قست پر براجمان تھا۔ عبدالعزیز کو (جو کہ اب لاہور ہائی کورٹ کا مسٹر جسٹس ہے) شاہ برطانیہ کی نمائندگی کے لئے خصوصی وکیل سرکار مقرر کیا گیا تھا۔ ملزم (عطاء اللہ شاہ بخاری) کی طرف سے وکیل صفائی کے فرائض میں نے سرانجام دیئے۔ (چودھری مراد علی راولپنڈی کے وکیل میرے ساتھ تھے) چودھری صاحب میرے ایک نہایت ہی معتمد اور کار آمد جو نسیر ثابت ہوئے۔ انہیں اس کیس کی بہت سی باتوں کا ذاتی علم اتنا تھا کہ میں نے ان سے بطور گواہ صفائی کام لینے کے غیر معمولی خطرہ کا فیصلہ کر لیا۔ خوش قسمتی سے یہ خطرہ مول لینا مفید ثابت ہوا۔ اور مراد علی کی گواہی نے جج اور رائے دہندگان کو بہت متاثر کیا۔ لیکن اس کے آنے سے قبل سرکار کی جانب سے اس مقدمہ کی تائید میں متعدد دگواہ پیش ہوئے۔

عدالت کی کارروائی کے درج ذیل اقتباسات ان رپورٹوں پر مبنی ہیں جو لاہور کے انگریزی روزنامہ "ٹری بیون" میں شائع ہوتی رہیں سرکار کی جانب سے مقدمہ کا آغاز کرتے ہوئے وکیل سرکار نے کہا کہ ملزم نے ۳ جون ۱۹۳۹ء کو راولپنڈی میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر استغاثہ کے موقف کے مطابق ایسے ٹکڑوں پر مشتمل تھی جو تعزیرات ہند کے جرم زیر دفعہ ۱۲۱ الف (شاہ برطانیہ کے خلاف جنگ آزادی) اور جرم زیر دفعہ

۲۴ الف (حکومت برطانیہ کے خلاف ترغیب بغاوت) کی زمیں آتے ہیں۔ ملزم کی تقریر جسے پولیس رپورٹر ضبط تحریر میں لایا تھا۔ نیز ملزم پر جو الزام عائد کئے گئے تھے، عدالت میں پڑھ کر سنائے گئے۔ وکیل صفائی نے روزنامہ "ٹری بیون" مورخہ ۶ جون کا ایک شمارہ عدالت میں پیش کیا جس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی متعلقہ تقریر کی رپورٹنگ کی گئی تھی۔ اور عدالت سے درخواست کی کہ ٹری بیون کے نامہ نگار رام لال چڈھا کو بطور گواہ پیش ہونے کے لئے سمن جاری کئے جائیں۔ زیر بحث رپورٹ استغاثہ کے الزام کا ایک پورا پورا مسکت جواب تھی۔ عدالت نے درخواست سے اتفاق کیا اور رام لال چڈھا کو سمن جاری کرتے ہوئے پابند کیا کہ وہ تقریر کے اپنے قلمی نوٹس پیش کرے۔ تب عدالت نے استغاثہ کی شہادت قلمبند کی۔

سرداری لال انسپکٹر استغاثہ راولپنڈی نے بیان دیا کہ اس نے حکومت پنجاب کے زیر حکم اس مقدمے کے سلسلے میں ایک شکایت دائر کی ہے۔ متعلقہ کاغذات اس وقت کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ راولپنڈی ایف سی بورن نے اسے ارسال کئے تھے۔ گواہ نے جرح پر کہا کہ یاد نہیں کہ تقریر کی نقل حکومت پنجاب کو کب بھیجی گئی تھی۔ میں نے تو نقل صرف اس وقت دیکھی تھی جب مجھے متعلقہ کاغذات موصول ہوئے۔ آغا سعادت علی ڈی ایس پی راولپنڈی نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں جون ۱۹۳۹ء میں راولپنڈی میں سٹی انسپکٹر پولیس تھا۔ مجلس احرار کے زیر سرپرستی راولپنڈی میں ۳ جون کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کی مشتمری بذریعہ منادی کرائی گئی۔ میں نے محمد یار ہیڈ کنشٹیبل کو کارروائی کی مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) کا کام سونپا۔ اس نے اپنی نوٹ بک اگلے روز واپس کر دی۔ یہ نوٹ بک میرے قبضہ میں رہی۔ اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں لائی گئی۔ گواہ نے جرح میں کہا کہ کانگریس، مجلس احرار اور دوسری تنظیموں کے جلسوں کی رپورٹنگ کا انتظام میرے ذمے تھا۔ میں عام طور پر تھاریر کی مختصر نویسی کی خدمت پر محمد یار ہیڈ کنشٹیبل کو مامور کرتا تھا۔ محمد یار ہیڈ کنشٹیبل پھلورے کہا کہ میں تھاریر کو مختصر نویسی کی صورت میں نقل کرتا تھا، اور پھر ان کی نقل تیار کر کے اگلے روز نوٹ بک انسپکٹر استغاثہ کے حوالے کر دیتا تھا،

سرکاری وکیل نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا کیا تم انہیں جانتے ہو؟ گواہ نے کہا، ہاں میں انہیں پہچانتا ہوں۔

شاہ جی نے رائے دی کہ یہ ملزم شناخت کروانے کا بڑا عمدہ طریقہ ہے۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا یہ شناخت ہے یا میرا تعارف ہے؟ (حاضریں میں قہقہہ بلند ہوا) سرکاری وکیل نے کہا کہ تعارف کروانے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ عطاء اللہ شاہ بخاری کو ساری دنیا جانتی ہے۔ (مزید قہقہہ بلند ہوا) پھر گواہ نے ملزم کی تقریر کے ان اقتباسات کا حوالہ دیا جن میں یہ کہا گیا تھا کہ برطانوی راج کا تمام ممکن ذرائع سے خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ خواہ مرنے اور مارنے تک کی نوبت آجائے۔ ملزم پر مزید الزام یہ بھی تھا کہ اس نے یہ کہا کہ انگریزوں نے اُس بغاوت کے دوران جسے وہ عام طور پر "خدر" سمجھتے تھے علماء کی ایک کثیر تعداد کو موت کے

گھاٹ اتارا۔ یہ دراصل جنگ آزادی تھی۔ گواہ نے کہا کہ میں نے ملزم کی تقریر کے ان حصوں کو چھوڑا ہے جن کا تعلق مذہب یا قرآن سے تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اس کے نوٹس غلطی سے مبرا تھے۔ ان نوٹس کو صاف کرنے پر ایک گھنٹہ صرف ہوا تھا۔ گواہ نے جرح میں کہا کہ شاہ جی نے اوسطاً ۹۰ الفاظ فی منٹ کی تیز رفتار کے ساتھ تقریر کی۔ اور انہوں نے جو کچھ کہا اسے وہ مکمل طور پر ضبطِ تحریر میں نہیں لاسکا۔ گواہ نے کہا کہ شاہ جی نے سکندر حیات خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس وزیرِ اعظم نے جنگ میں اہلِ برطانیہ کی مدد کا وعدہ کر رکھا تھا۔ جب گواہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے تقریر کا یہ حصہ اپنی ڈائری میں تحریر کیا تھا تو گواہ نے اثبات میں جواب دیا لیکن وہ یہ الفاظ اپنی ڈائری کے اندر دکھانے سے قاصر رہا۔ مزید سوالات پوچھے جانے پر گواہ نے تسلیم کیا کہ صوفی عنایت محمد (پسروری، مشہور احرارِ رہنما) پر بھی جو اجلاس کی صدارت کر رہے تھے قانونِ تحفظِ امن ہند کے تحت مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اس نے مزید یہ بات بھی تسلیم کی کہ بہت سے لوگوں نے اجلاس میں نظمیں گا کر پڑھیں اور شاہ جی کی تقریر کے دوران ان لوگوں کی موجودگی کا اقرار کیا اور یہ بھی کہا کہ وہ یہ صلاحیت رکھتے تھے کہ شاہ جی کی تقریر کے متعلق شہادت دے سکیں۔ فصلِ کریم نے جو راولپنڈی کے ایک وکیل کا منشی تھا۔ بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں اس اجلاس میں حاضر تھا جس سے ملزم نے خطاب کیا تھا۔ اجلاس کے فوراً بعد محمد یار نے مجھے پوری تقریر پڑھ کر سنائی تھی۔ اور میں نے نوٹس کی صحت کی نشانی کے طور پر ان پر اپنے دستخط بھی کئے تھے۔ میں نے تصدیق کی کہ رپورٹ میں جو الفاظ درج کئے گئے ہیں وہ ملزم نے کچھ تھے۔ تقریر جو مجھے یاد تھی دو گھنٹے جاری رہی۔ اس نے کہا تاہم میرے لئے تقریر کی باز آفرینی مشکل کام ہے کیونکہ تقریر کو ایک سال گزر چکا ہے۔ تاہم اتنی بات ضرور یاد ہے کہ ملزم نے کہا تھا کہ میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہوں۔ میری جرح کرنے پر گواہ نے تسلیم کیا کہ پولیس کی امداد کرنے پر میں نے کئی اعزازی سرٹیفکیٹ حاصل کئے ہیں۔ میں نے جیلے میں شمولیت اس لئے کی کہ مجھے جیلے میرے محلے کے بالکل قریب منعقد ہوا تھا۔ اور پولیس رپورٹر محمد یار نے مجھے اپنے ساتھ جیلے میں چلنے کے لئے کہا تھا۔ میں مولانا مظہر علی اظہر سے واقف نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ مولانا مذکور جیلے میں موجود تھے یا نہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ آیا شاہ جی نے کانگریس یا احرار کی طرف اشارہ کیا تھا یا نہیں۔

سوال: کیا شاہ جی نے یہ کہا تھا کہ کانگریس نے بہت سی قربانیاں دی ہیں۔

جواب: نہیں لیکن انہوں نے یہ ضرور کہا تھا کہ اہلِ ہند نے روپے میں سے دس آنے کا سیاسی حاصل کر لی ہے۔

اگلے گواہ سربراہ ذیل دار، جہاندار خاں نے اپنے گواہ کی تائید کی۔ جرح کرنے پر گواہ نے یہ بات تسلیم کی کہ مجھے پستول کا لائسنس دیا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی پولیس کی سفارش پر مجھے رقم کی صورت میں معاوضہ بھی۔

میں نے ایک اچھے مقدمے میں تعاون اور کامیابی کے صلہ میں پولیس کی سفارش پر امتیازی سندات حاصل کیں۔ راولپنڈی کے ایک ٹھیکیدار مولوی فضل الہی نے بھی بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں جیل میں موجود تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس وقت ملزم اپنی تقریر کا کچھ حصہ ختم کر چکا تھا۔ مجھے تقریر یاد نہیں لیکن تقریر کے وہ حصے جو محمد یار نے یہاں پڑھ کر سنائے ہیں وہ ملزم نے اپنی تقریر کے دوران کئے تھے۔ جرح ہونے پر گواہ نے کہا کہ مختصر نوٹس کی نوٹ بک پر میرے دستخط کرنے سے پہلے محمد یار نے قرآن پاک اور دوسرے مذہبی موضوعات کو چھوڑ کر پوری تقریر کی نقل کو دہرانے میں پانچ منٹ صرف کئے تھے۔ میں مسلم لیگ سے ہمدردی نہیں رکھتا نہ ہی میں نے کبھی مسلم لیگ کے جلسوں میں شرکت کی مجھے مسلم لیگ یا کانگریس کے نصب العین کا علم نہیں۔ میں نے کبھی اخبار کا مطالعہ نہیں کیا۔ میں اس سلسلہ میں بالکل ناخواندہ ہوں۔ اس مرحلے پر عدالت کے پوچھنے پر میں نے (شاہ جی کے وکیل صفائی کے ایل گابانے) کہا کہ ان انیس گواہوں میں سے جو صفائی میں طلب کئے گئے ہیں۔ ہم مسٹر محمد علی جناح، صدر مسلم لیگ کو چھوڑ رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے تعاون کا امکان نہیں اور اسی طرح تین دوسرے گواہوں کو بھی باقی ماندہ پندرہ گواہوں پر بہ شمول سابق وزیر اعظم صوبہ سرحد، صفائی کے لئے جرح بعد میں ہوگی۔ کیونکہ مقدمے کا اصل سوال یہ ہے کہ شاہ جی نے جیل میں اپنی تقریر کے دوران درحقیقت کیا کہا تھا؟

مولانا مظہر علی اظہر ایم ایل اے جنرل سیکرٹری آل انڈیا مجلس احرار صفائی میں بگلتے والے پہلے گواہ تھے۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ ملزم مجلس احرار ہند کے صدر اور نائب صدر کے طور پر کئی بار منتخب ہوئے۔ مجلس احرار کا نصب العین یہ تھا کہ عدم تشدد پر مبنی ذرائع کے بل پر (برطانوی سامراج سے) کامل آزادی حاصل کی جائے۔ گواہ نے مزید کہا کہ ملزم اور میں نے یکم اور تین جون کو پٹنہ گھیسپ (ضلع ایک) کانفرنس میں تقریریں کی تھیں۔ ۳ جون کو ہم راولپنڈی میں آگئے۔ جہاں ملزم نے تقریر کی۔ جس کا موضوعاتی مواد یہ تھا کہ انہیں آزادی ہند کے لئے عدم تشدد پر مبنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیے اور مسلمانوں کو اس جدوجہد میں حصہ لینا چاہیے۔ انہوں نے مجلس احرار پر لگائے گئے الزامات کی تردید کی۔ مثلاً یہ کہ مجلس احرار کانگریس کا بھٹی بچہ ہے۔ ملزم نے حکومت برطانیہ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ یا یہ الزام کہ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کا خون بہادر شاہ کے سامنے پیش کیا۔ نہ ہی ملزم نے ”مرو یا مرو“ کا نعرہ لگایا۔ اس نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ عوام کو برطانوی وقار کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ اور سکھر کے مقام پر بھی ملزم نے عدم تشدد کی ہی حمایت کی۔

وکیل سرکار کی جرح پر گواہ نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں نے ملزم کی تقریر قلمبند نہیں کی۔ میرے علم کے مطابق کسی احرار کارکن کو آج تک تشدد کی تبلیغ پر سزا نہیں ہوئی۔ تشدد کا پرچار کرنے پر خود پارٹی منابطلے کے خلاف ورزی کی بنا پر اس کے خلاف کارروائی عمل میں لا سکتی تھی۔ گواہ نے بتایا کہ اس سے حفظ امن عامہ کے سلسلہ میں سیالکوٹ کی ایک تقریر پر ضمانت لی گئی تھی۔ نیز یہ کہ اس نے کسی پولیس

رپورٹر کو نہیں دیکھا تاہم وہاں چند اخباری رپورٹر موجود تھے۔

سوال: جہاد کا مفہوم کیا ہے؟

جواب: اس کا مطلب جہد، کوشش ہے جس میں تشدد بھی ہو سکتا ہے اور عدم تشدد بھی۔

سوال: کیا عام حور پر اس کا مطلب ایک مقدس جنگ نہیں لیا جاتا۔

جواب: ہاں ایسا ہی ہے۔

راولپنڈی کے ایک تاجر بخشی ابناشی رام نے اپنے بیان میں کہا کہ ملزم نے ۳ جون ۱۹۳۹ء کو ایک تقریر کی، میں جلسے میں موجود تھا۔ ملزم نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندوستان میں بسنے والے نوکروٹ مسلمانوں میں سے جو یہ سوچتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے کام کرنے کا کوئی جواز نہیں وہ فریب میں مبتلا ہیں۔ لوگوں کو جیلوں میں جانے اور سول نافرمانی کی مہم چلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف ووٹوں کے صحیح استعمال کی ہے۔ اگر وہ احرار کو ووٹ دے دیں تو نوکانگریسی صوبوں کی طرح انہیں بھی حکومت مل سکتی ہے۔ گواہ نے بیان میں کہا کہ یہ بات غلط ہے کہ ملزم نے مرو یا مارو کے الفاظ استعمال کئے۔ عوام سے صرف یہ کہا تھا کہ وہ عدم تشدد پر سختی سے کار بند رہیں۔ اور برطانوی وقار کا خاتمہ کر دیں۔ سرکاری وکیل کی جرح پر گواہ نے بیان میں کہا کہ یہ بات غلط ہے کہ مسلمان عام طور پر خیال کرتے ہیں کہ مجلس احرار تو صرف کانگریس کے بھاڑے کا ٹٹو ہے۔ میں گزشتہ تین عام جلسوں میں شریک ہوا اگرچہ میں نے تقریر کے کوئی حصہ قلم بند نہیں کئے۔ تاہم تقریر کا خلاصہ میرے علم میں ہے۔ صفائی کے ایک اور گواہ چودھری مراد علی وکیل راولپنڈی نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ۳ جون ۱۹۳۹ء کے جلسہ عام میں موجود تھا۔ مولانا نے جلسے میں عدم تشدد کی تبلیغ کی۔ اور اپنی تقریر میں جہاد کا حوالہ دیا۔ لیکن اس انداز سے نہیں جیسے پولیس رپورٹر کی رپورٹ میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ ملزم نے صرف یہ کہا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں علیہ نے آزادی ہند کے لئے جہاد کا مطالبہ کیا تو نتیجہ قتل و غارت گری کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس لئے اب علماء نے فیصلہ کیا ہے کہ تشدد آزادی ہند کے لئے صحیح راستہ نہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ آزادی عدم تشدد کے ذریعے حاصل کریں۔ ملزم نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان پر برطانوی وقار کا خاتمہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اس نے "مرو یا مارو" کے الفاظ استعمال نہیں کئے۔ یہ گواہ نجلی عدالت میں ملزم کا وکیل بھی تھا۔ جس پر گواہ نے تسلیم کیا کہ مسٹر گابا نے نجلی عدالت میں مقدمے کے حق میں استدلال کیا تھا۔ مولوی شمس الدین خطیب مسجد ہندھی گھپ ایک اور گواہ تھا جس پر جرح ہوئی۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ ہندھی گھپ میں یکم تا ۳ جون مجلس احرار کی دعوت پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی اور ملزم نے دو یا تین تقریریں کیں۔ ملزم کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمیں آزادی صرف عدم تشدد کے ذریعے حاصل کرنی چاہیئے۔ ملزم نے پولیس کی تنخواہ میں اضافے کی ضرورت کی بھی حمایت کی۔ (تقریر) ڈاکٹر محمد عمر فرخین سرجن نے کہا کہ میں ملزم سے واقف ہوں۔ میں نے ۸، ۹، ۱۰ جون کو سکھر کا دورہ کیا تھا اور سکھر کی مجلس احرار کی دعوت پر ایک کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ ملزم نے کئی

تقریریں کیں جن میں اس نے عدم تشدد کا پرچار کیا تھا۔ صوبہ سرحد کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نے بھی مدعا علیہ کے حق میں شہادت دیتے ہوئے کہا کہ احرار عدم تشدد پر پوری مضبوطی سے جھے ہوئے ہیں۔ روزنامہ ”ٹری بیون“ کے رپورٹر رام لال چٹھا نے کہا کہ اس نے ۳ جون کی تقریر اپنے روزنامہ کے لئے قلمبند کی تھی۔ اس نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ تقریر کے سرکاری ترجمے میں ملزم پر جن الفاظ کے استعمال کرنے کا الزام لگایا گیا ہے وہ اس نے نہیں کھے۔ چونکہ ملزم کو اپنی صفائی میں گھٹکنے والے گواہوں کی سربراہی حاصل تھی۔ اس لئے آخری بیان حکومت کے ذمے تھا۔ جب اس کی صفائی میں دلائل شروع ہوئے تو مجھے (کے ایل گاہا کو) چند لمحوں کے لئے (دلائل دینے میں) دقت محسوس ہوئی کیونکہ جج کے رائے دہندگان میں سے کوئی بھی زیادہ انگریزی سے واقف نہ تھا۔ اور فالٹا نے اردو کے علاوہ کسی اور ذریعہ اظہار میں دلائل سننے سے انکار کر دیا۔ بغاوت اور اغوا کے مقدمے کو اردو زبان میں زیر بحث لانا آسان کام نہ تھا۔ لیکن میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں یہ بات بھول جاؤں کہ کمرہ عدالت میں کھڑا ہوں۔ اور اپنی بات کو اس انداز میں بڑھایا جیسے یہ کوئی عوامی پلیٹ فارم اور اس کی سیاست ہو۔ اور جس کے لئے کسی قانون قاعدے کی چنداں ضرورت نہ ہو۔ اس کا اثر اور نتیجہ حیران کن رہا۔ میرا استدلال ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ اور بعض ناظرین کے خیال کے مطابق ملزم نے جس طرح راولپنڈی میں نتائج سے بے پرواہ ہو کر تقریر کی تھی میں نے اس سے بھی زیادہ بے پرواہ ہو کر خطاب کیا۔ ایک مرحلے پر عبدالعزیز نے میری قلیل کلامی کرنا چاہی تو جج نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ اور عبدالعزیز سب سے خاموش ہو گیا۔ اور جب عبدالعزیز کی باری آئی تو بلاشبہ اس نے میرے پیش کردہ دلائل کو رد کرنے کی سنت کوشش کی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس وقت تک ساری کھیل ہار چکا ہے۔ قانونی تشنیص کنندگان نے بے یک زبان یہ اعلان کیا کہ ملزم مجرم نہیں اور جج فالٹا نے اس فیصلے سے اتفاق کرتے ہوئے ملزم کو ہر دو الزامات سے بری کر دیا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہ میرے پاس بیٹھے اور مجھ سے ہنگامہ ہو گئے۔ انہوں نے میرے دونوں رُخساروں پر بوسہ دیا۔ لوگوں کا ایک پُر جوش و خروش ہجوم اٹھ آیا جو مجھے بھی ہر اہ لیکر جلوس کی شکل میں شہر میں گشت لگانا چاہتا تھا۔ شام کو سٹی گارڈز نزد میں حکومت اور قادیانیوں کے خلاف ۳ گھنٹے تک زور خطابت صرف کر کے شاہ جی نے پچھلے بتائے کا سارا حساب چکا دیا۔ تاہم یہ تقریر ایسی کسی شکل میں پھنسانے کا باعث نہ بن سکی۔ میں اگلے روز کے مقدمے پر ایک نظر ڈالنے کے لئے عدالت سے واپس چلا گیا۔ اُس مقدمے میں میری بہترین کوشش کے باوجود جج نے شاید میرے خلاف ہی فیصلہ دیا۔ لیکن یہ تو ہر وکیل کا روزمرہ کا نصیب ہے۔

FROM "BATTLES" AT THE "BAR"

"THE TRIAL OF ATTAULLAH SHAH" P: 1-9

BY K L GAUBA, BOMBAY

# عَلَّمَ الْعِلْمَ وَالْأَعْمَالَ عَظِيمُ الشَّيْمِ

قطعہ تاریخیہ بوفاتہ الشاہ عطاء اللہ البخاری رحمۃ اللہ علیہ

جَلَّ الْقَضِلُ خَطِيبُ الذِّنَرَاتِ الْحَكَمِ

(کوہ فضل نادر حکمتوں کے خطیب)

عَلَّمَ الْعِلْمَ وَالْأَعْمَالَ عَظِيمُ الشَّيْمِ

(علم و عمل کے پرچم کمال کی عادات و لے)

نُكْتُ بَادِرًا خُطْبَتُهُ مُرْتَجَلًا

(جن کی فی البدیہہ تقریر بے ساختہ نکلتے ہوئے تھے)

حَيْرَانٌ لِّتَعَالِيهِ شَدِيدُ النِّقَمِ

(کہ سخت سخت نکتہ چیں ان کی بلند پروازی سے حیران تھے)

عَرَبٌ عَامِرَةٌ لَوْ سَبَعُوا خُطْبَتَهُ

(خالص عرب لوگ اگر ان کی تقریر سن لیتے)

رَجَعُوا عَنْ كَلِمَاتٍ رَضَخُوا لِلْعَجَمِ

(تو ان سب باتوں سے رجوع کر لیتے جو عجیبوں کے سر پر پھینک ماری ہے)

عَجَمٌ قِيلَ لَهُمْ لَيْسَ فَصِيحٌ فِيهِمْ

(وہ عجیب قوم جن کے بارہ میں یہ کہا گیا ہے کہ ان میں فصیح و پُرگوہ نہیں سکتا)

بِتَلَاْقِيهِ لِصَاحُوا بَيْلٍ أَوْ نَعَمِ

(ان کی ملاقات پر وہ لوگ جنج اٹھتے کہ ضرور ضرور دیا ہاں ہاں ہوتا ہے)

بَطْلٌ مُّبِطِلٌ مَا أَبَدَا عَنْهُ مُبْتَدِعٌ

(دو بہادر جو بریتوں کی سب بدعتوں کو باطل کر رہا تھا)

هَزَمَتْ جَيْشَ آبَا طِلْ لَهُ نِتُ فَمِ

(ان کی باطل دلیلوں کے لشکر کے لشکر کو جس کے منہ ایک لونڈی نے ٹکست دیا)

سَنَنْ السَّحْرِ لَهُ بَيْنَ فِينَا سُنَنًا

(ان کی سحر بیانی نے وہ وہ سنتیں بیان کر کے رکھ دی ہیں)

مُرَأًى الْبَعْضُ عَنِ السَّرْدِ لَهَا مِثْلُ عَمِ

(کے بعض لوگ ان کے ذکر سے مثل اندھے کے بنے ہوئے تھے)

أُخِذَ الشَّاهُ وَقَدْ كَانَ عَطَاءً إِذْ لَا

(شاہ صاحب لیلے گئے اور وہ عطا دے تھے تو رنج نہ کر دیکھو نہ)

عَبُّ الْأَخْذِ لِمَنْ مِنْهُ عَطَاءُ النِّعَمِ

(اس کا تعجب نہیں ہو سکتا جس کی طرف سے عطا و نعمت ہوا)

فَقَدِ الْيُصْقَعُ فَإِنَّ اللَّهَ إِلَيْهِ الشَّكْوَى

(زبردست خطیب گم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ سے ہی اپنی معیبت کا شکوہ ہے)

غَفَرَ اللَّهُ لَهُ إِذْ رَجُلٌ رَجُلُ الْعَدَمِ

۸۱ ۱۳ ۴۰  
(اللہ ان کی بخشش فرما دیں - سفر عدم کی تاریخ ہے)



## نکتہ سنج و لطف بزم و دیں شعار (قطعہ تاریخ وفات)

رفت	از	دنیا	عطا	اللہ	شاہ
اہل	حق	را	رنج	و غمنا	پیغم
گو	عطا	اللہ	را	معمول	ہست
واپسی	از	عاصیاں	عادت	ہم	است
سید آں	سید	بود	کو	ہر	وے
پیرو	آں	سید	کل	عالم	است
در خطابت	مایہ	نازے	نما	ند	
عالم	تقریر	ویراں	عالم	است	
ممبراں	خاموش	نوص	میکند		
کو؟	بشکل	خطبہ	صد	جام	جم
برسر	منبر	خطیباں	پے	پے	
لیک	می	بینی	کہ	ایر	دم
غزود	ہا	دیدمی	کہ	باتیخ	است
لیکن	آں	خطبہ	کجا؟	کو	یک
لفظ	لفظے	کز	زبان	می	چکید!
برسر ادا	اش	تیغ	دودم	است	
نکتہ	سنج	و	لطف	بزم	و
گر	میسر	آبدت	ہم	کم	کم
چشم	جودیاے	جمال	است	گفتگو	
بر قدم	می	افتد	و	پیغم	نم

رحمت	خاص	الله	العالمین
تا	قیامت	را	است
سال	رحلت	عالم	شنیه
نوحه	مرگ	اعظم	است
۱۹۶۱			



# مجاهد ملت

قطعه تاریخ

از بنم در پشته بخاری که بوده است      سرور با ابر شریعت، گزشت حیف  
 - یار پنج سال حیت او از سر جهاد      گفتیم، یک مجاهدیت گزشت حیف  
 ۳۰ ————— ۴۱ م ۱۰۰ —

۱۱ م ۱۰۰

سیرافق کاظمی امروزی

اثر خامه: میر سید حبیب احمد آفاق کاظمی امروزی رحمہ اللہ علیہ (عزم مکرم مولانا سید احمد سعید کاظمی مرحوم)

## بلاغت کے چمن کا نغمہ پرداز

فضا معمور ہے آہ و فغاں سے  
گری اک اور بجلی آسماں سے  
یہ کون آج اُٹھ گیا ہے دریاں سے  
دلِ مرد و زن و پیر و جوان سے  
ہوئی مرمومِ مردِ راہِ داں سے  
بھڑ کر جا رہا ہے کارواں سے  
اُٹھا ہے آج بزمِ میکشاں سے  
نوائےِ عندلیبِ نغمہ خواں سے  
وہ ماہِ صوفشاں لائیں کہاں سے  
ہے جاری جوئے خوں چشمِ رواں سے  
ہر سو مضرِ شیون بپا ہے  
گروہِ اہلِ حریت کا سالار

وہ آزادی کی عظمت کا پرستار  
فضا میں، گونجتی تھی جس کی للکار  
وہ ناموسِ رسالت کا مجتہد  
دل اس کا عشقِ پیغمبر سے سرشار  
رہا دل، ماسوا سے جس کا بیزار  
جسے بننا گیا تھا قلبِ بیدار  
حمیت اور خود داری کا معیار  
نہ رکھا میر و سلطان سے سروکار  
حوادث سے ہمیشہ گرم پیکار  
وہ درویشی و استغنا کا پیکر  
تھی اُس کے حوصلوں پر یہ فضا تنگ  
کہ رُو بہا ہی ہے شیروں کے لئے تنگ  
تھا حق گوئی پر اُس کی آسماں دنگ  
وہ ذوق و شوق کی تصویر صد رنگ

ٹھاری بھی ہوئے رُخست جہاں سے  
دلوں پر کوہِ غم اک اور ٹوٹا  
نظر آتا ہے ویرانی کا عالم  
یہ کون اُٹھا کہ فریاد اُٹھ رہی ہے  
دریغِ ملتِ اسلامیہ آج  
اسیرِ کارواںِ اہلِ ایمان  
وہ ساتی جس سے سیٹھانہ تھا آباد  
تھی ہے اب فضا اپنے چمن کی  
درخشاں تھی جہیں جس سے وطن کی  
بیرنگ اُٹھا ہے دل میں شعلہِ غم  
ہر سو نالہ و آہ و بکا ہے  
ہوا رُخستِ اسیرِ جیشِ احرار  
وہ افزگئیِ ملوکیت کا دشمن  
فلک کو چیرتی تھی جس کی تکبیر  
وہ تقدیسِ شریعت کا محافظ  
نگہ اس کی جمالِ حق سے روشن  
وہ مردِ حق، وہ درویشِ خدا مست  
عطا جس کو ہوئی تھی چشمِ بینا  
توکل اور قناعت کا نمونہ  
قتیر بے سرو ساماں کہ جس نے  
رہا اس رزمگاہِ زندگی میں  
وہ غازی، وہ مجاہد، وہ قلندر  
رہا باطل سے دائمِ برسرِ جنگ  
بناتا تھا ہمیں اپنے عمل سے  
زمیں تھی اس کی بے باکی پر شہد  
غنا و فقر کا وہ نقشِ سادہ

پگھل جاتے تھے جس سے آہن و سنگ  
 لرز جاتی تھی جس سے رُوحِ افزہنگ  
 وہ اس کی پُرفوں گفتار کا ڈھنگ  
 چمن میں جیسے اک مُرغِ خوش آہنگ  
 نوا اس کی حریفِ نغمہ چنگ  
 رہے گا دہر میں اس کا فسانہ  
 وہ بزمِ شعر کا طاووسِ بظناز  
 بلاغت کے چمن کا نغمہ پرداز  
 فکر میں عقابِ چرخِ پرواز  
 وہ اس کی شعلہ گفتاری کا انداز  
 وہ اس کے نغمہ پُرکیت کا ساز  
 کلمہ میں دمِ صیغی کا اعجاز  
 جو تھا اپنے حریفوں میں سرِ افراز  
 جو اصحابِ طریقت کا تھا ہرراز  
 تھا جس کی ذات پر اسلام کو ناز  
 سنیں گے اب کہاں ہم اس کی آواز  
 ضیاء تم بھی کرو اپنا بیاباں بس

وہ اُس کے شعلہٴ تقریر کی آنچ  
 وہ اُس کا نعرہٴ حل من مبارز  
 وہ اُس کی رسِ بھری باتوں کا انداز  
 نوا پرداز تھا یوں مظلوموں میں  
 صدا اُس کی جوابِ صوتِ بلبُل  
 نہ بھولے گا کبھی اس کو زمانہ  
 وہ میدانِ خطابت کا سبک تاز  
 گلستانِ فداست کا نوا سنج  
 تخیل میں بہائے آسمان سیر  
 وہ اس کی رزمِہ خوانی کا اسلوب  
 وہ اس کے نالہٴ پردرد کا سوز  
 سخن میں لہجہٴ داؤدی کی تاثیر  
 خطیبِ بے مثالِ عصرِ حاضر  
 جو اربابِ شریعت کا تھا ہمد  
 وہ ملت کے لئے سرِ پایہٴ فخر  
 سنیں گے اب کہاں ہم اس کی باتیں  
 ہوئی دورِ سلف کی داستان بس



سر شیخ عبدالقادر، کی جان پہچان اور تعلقات کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ سر سید احمد خاں سے لے کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور داغ سے لے کر حفیظ جالندھری تک، ہر شخص سے ان کے یکساں مراسم تھے۔ باتیں کرنے پر آتے یا گزری ہوئی صحبتوں کا حال بیان کرتے تو سماں باندھ دیتے تھے۔ حافظہ کی یہ کیفیت تھی کہ نصف صدی قبل کے واقعات ان کے ذہن میں یوں محفوظ تھے گویا کل کی بات ہے۔ تفصیلات و جزئیات تک یاد تھیں۔ ایک روز فخری خطابت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ محفل میں کسی شخص نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سرکلامی کی بہت تعریف کی۔ شیخ صاحب کہنے لگے۔ ہاں بھائی، عطاء اللہ شاہ بخاری خوب بولتے ہیں۔ لیکن مس الملک مرحوم بھی کسی سے کم نہ تھے۔

(عاشق حسین بٹالوی - چند یادیں چند تاثرات ص ۳۵)

## بخاری کی یادیں

وہ ہستیاں الٹی کس دیں بستیاں ہیں  
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں  
تقسیم ملک سے پہلے ایک دن شاہ جی کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپ نے اچانک لمن داؤدی میں بلند  
آواز سے یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا۔

مغال مجھ مست بن خندہ قتل نہ ہووے گا  
مئے گلگوں کا شیشہ بچکیاں لے لے کے رووے گا  
حاضرین جھوم اٹھے اور اس تصور میں کھو گئے کہ واقعی جب شاہ جی داغ مفارقت دے جائیں گے تو دنیا  
کی رنگینیوں پر کیا اثر پڑے گا۔ اب جب کہ تصور حقیقت میں ڈھل گیا تو معلوم ہوا کہ شاہ جی کا دنیا سے اٹھ جانا  
کچھ عجب سا سا نہ ہو گیا ہے۔

وہ مرد درویش جن کی ایک لڑکھ نے بڑے بڑے سرکوں کو جھکا دیا جس کی حق گوئی اور بے باکی کے  
آگے سلطنتِ برطانیہ کی طاغوتی طاقت نہ ٹھہر سکی۔ جس کے زمرے فضائل میں تیزی سے گونجنے۔ جب اس  
دنیا سے رخصت ہوا تو اس پر ہر مکتبہ خیال نے آنسو بہائے۔

والسیر کے متعلق کچھ جانا ہے کہ جب وہ اپنے بستر پر چھوٹتا تھا تو یورپ کے تحت لرزہ براند ام ہو  
جاتے تھے۔ یہی شاہ جی کا حال تھا۔ کہ ان کے نام سے برطانوی سامراج لرزہ براند ام ہو جاتا تھا۔

شاہ جی کی خدمت میں جو کوئی ایک دفعہ حاضر ہوا۔ وہ ہمیشہ کے لئے انہی کا ہو گیا۔ میں جب پہلی دفعہ شاہ  
جی سے ملا تو ایسا معلوم ہوا کہ شاہ جی سے میری برمی پرانی جان پہچان ہے۔ کوئی بھی اجنبیت محسوس نہیں  
ہوتی۔ اسی طرح ایک اور دوست نے شاہ جی سے پہلی ملاقات کے بعد بے ساختہ یہ شعر پڑھا۔

تجھ سے اب مل کر قعب ہے کہ عرصہ اتنا

آج تک تیری جدائی میں کیوں کر گزرا

السان خواہ کتنا ہی بہاد ہو۔ کتنا ہی شہ زور ہو، موت کا سرد اور بے رحم ہاتھ اسے وقت موعود پر  
آدب بوجھتا ہے۔

وہ ہستی جس نے سر سے لے کر پیر تک زندگی کی ساری عمارت اپنے ہاتھ سے کھڑی کی،

جس نے اس عمارت کی ایک ایک لٹ اپنے ہاتھ سے چنی ہو،

جس نے بادشاہوں کو دعوتِ مہارزت دی تھی،

جس نے وقت کے فرعونوں کو لٹکارا،

جو باطل کے خلاف صفِ آرا رہا،

جب موت اس کے پاس آئی تو وہ اس کے سامنے جھک گیا۔ دنیا میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔

شاہ جی کی بیماری کی خبریں کئی ماہ سے سن رہے تھے۔ آخر وہ گھڑی آگئی جب وہ عظیم شخصیت ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔

اب اس کی یاد باقی ہے۔ اس کے معرکوں کی گونج تاریخ کے صفحات میں سنی جائے گی۔ اس کی عظیم خطابت کے قصے لوگوں کی زبانوں پر رہیں گے۔ اس کی بہادری کی داستان ضرب الالٹال بنے گی۔ مگر جس نے دنیا کو اتنا کچھ دیا اس کی زندگی ہمیشہ دکھی رہی۔ وہ جن کے لئے لڑتا رہا انہوں نے وقت کی مصلحتوں کا ساتھ دیا۔ اور اس کے نقش قدم پر چلنے سے انکار کر دیا۔ مگر ایک دن آئے گا جب مورخ حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھائے گا اور پھر معلوم ہو گا کہ بخاری کے دل میں قوم کے لئے کتنا درد تھا۔ اور وہ جو کچھ کھتا تھا اس میں کتنا خصوص تھا۔

حضرت شاہ جی کو خداوند کریم اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ ان کے مزار مقدس پر اپنے انوار برسائے کہ انہوں نے اپنی زندگی قوم پر نثار کی۔ (یہ مضمون شاہ جی کی وفات کے چار روز بعد لکھا گیا)

محمد احسان الحق (سول جج) گوجرانوالہ

## امیر شریعت

امیر شریعت ملک البیان  
امیر شریعت رئیس خطابت کو  
لہ فی جنة اعلیٰ المکان  
جنت میں بلند درجات نصیب ہوں  
فمات ولم تمت نعمات صوت  
وہ فوت ہو گئے مگر  
لما یتلو من السبع المثانی  
ان کی تلاوت قرآن کی آواز زندہ ہے  
وقد رجع العطاء الی الہ  
اللہ کی عطا اللہ کی طرف لوٹ گئی  
ہو القیوم والمخلوق فانی  
وہ ہمیشہ سے قائم ہے اور مخلوق فانی



کو دے رکھی تھیں۔ کسی میں نہ ہوں گی۔ اگر میں اس کو اس برا عظم کا "مارک انتہی" سمجھ دوں تو شاید پھر بھی ان کی خطابت و تقریر کی خوبیوں کا پورا پورا خاکہ پیش نہ ہو۔ ایسے انسان یقیناً قوموں کی قسمت بدلتے ہیں۔ اور ان کے عمل و کردار کی قوتوں سے تاریخ اپنے صفحات کی رنگینیوں کو دوبالا کرتی ہے۔ لیکن کیا مسلمان قوم نے اس مرد حق کو اپنی صفوں میں مناسب مقام دیا ہے؟

پاکستان کی تخلیق کے بعد وہ عمل سیاست سے دست بردار ہو گئے تھے۔ اور اپنی تمام ذہنی و عملی قوتوں کو دفاع پاکستان کے لئے صرف کرنے کا عہد کر چکے تھے۔ لیکن بڑے دکھ اور درد کے ساتھ اس خیال کا اظہار فرمایا کرتے تھے کہ پاکستان اسلام کے مقدس نام پر معرض وجود میں آیا ہے اس لئے تم کو دین حق کی سر بلندی کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے۔ اور ہمارے اعمال و کردار کے کسی پہلو سے اسلام کے مقدس دامن پر کوئی دھبہ نہیں آنا چاہیئے۔ نہ معلوم! جو کچھ اس مرد حق نے کہا تھا وہ کس حد تک قابل عمل سمجھا گیا ہے۔ اور دین حق کی اشاعت و ترویج کے لئے ہم نے کیا کیا ہے۔ مملکت خداداد پاکستان میں آنکھوں دیکھتے لوگ ترقی و کامرانی کے زینوں تک پہنچ گئے۔ سیم و زر کی جھلک نے اکثر آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ مستحق اور غیر مستحق انسانوں نے دولت کے اتہار لگائے ہیں صبح اور جلی کلیوں کا کاروبار کر کے چشم زدن میں لاکھ پتی ہو گئے ہیں اور اپنی فکر و ضمیر کی تمام روشنیوں کو معدوم کر دیا۔ وہاں اس مرد درویش نے اپنے آپ کو ان الاثول سے بالکل ہٹا رکھا۔ اور حکومت وقت کی کسی مراعت کو قابل قبول نہیں سمجھا۔ جب عظمت و جلالت کا یہ پیر موت کے دروازے پر دستک دے رہا تھا تو حکومت نے یہ تجویز دی کہ ان کی آخری آراگاہ ملتان کے مشہور مقام قلعہ قاسم باغ پر بنائی جائے۔ لیکن ان کے وارثوں نے ان کی وصیت کے مطابق اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت کا اظہار کیا۔ اور برصغیر کے اس بطل جلیل کو جو آزادی و حریت کے لئے قید و بند کی تکالیف سے نہ گھبرایا اور کلمہ حق تختہ دار پر بھی کھنے سے گریز نہ کیا عوام کی آغوش میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ کیونکہ قولاً و فعلاً وہ عوام کا بندہ تھا۔ اور اس رسول کا نواسہ جس نے امیری پر عریسی کو، نموت پر طہیسی کو، جلالت و مملکت پر انکسار و عجز کو، بادشاہت پر فقیری کو اور انسانیت کو فرقہ بندی پر ترجیح دی۔

بنا کردند خوش رے خاک و خون ظلین  
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را





## وہ ایک طوفان، کہ عزم جولاں بھی جسکے قدموں پہ سہجکائے

بہار کاشمیری

وہ ایک درویش آہنی جو بنام آزادی گلستاں  
دیار مغرب کے رہنے والوں کے ذوق جور و رستم سے الجھا  
وہ ایک درویش شمع عزم و عمل جلا کر وطن میں جس نے  
غور افزنگ کو صدا دی طلسم جاہ و حشم سے الجھا !

خطیب اعظم کہ جس نے منبر پہ خواجگی کو ہدف بنا یا  
وہ ایک شعلہ کہ قصر پرویز جس کو دیکھے تو زلزلائے  
خطیب اعظم کہ جس نے منبر پہ حق پرستی کا گیت گایا  
وہ ایک طوفان کہ عزم جولاں بھی جس کے قدموں پہ سر جھکائے

وہ اک شکستہ مزاج انسان وہ ایک شعر و ادب کا رسیا  
وہ اک سنخور جو بزم شعرو سخن میں آیا تو گل بکھیرے  
وہ ایک حافظ وہ ایک عرفی وہ ایک خیام ایک غالب  
وہ ایک دانائے راز جو انجمن میں آیا تو گل بکھیرے

دیار ملتان کے رہنے والو دیار ملتان کے بد نصیبو  
نا ہے درس حیات دے کر انسان سو گیا ہے  
نا ہے پھر شر زندگی میں چراغ اٹکوں کے جل رہے ہیں  
نا ہے پھر شر زندگی میں حسین متاب کھو گیا ہے



## گرمی سے حریت کی اک آتش کدہ تھا دل

باطل پسند ہونا بڑا سود مند تھا      وہ مرد باخدا تو مگر حق پسند تھا  
 بے موٹ بے ہراس گزاری تمام عمر      تھی حرص عز و جاہ نہ خوف گزند تھا  
 اٹھی نہ سوئے دولتِ دنیا کبھی نظر      کس درجہ بے نیاز دل مستند تھا  
 چلتا فریب دانہ و دام اس پہ کس طرح      سدرہ نشیں بلند زکید و کمند تھا  
 تھا درد ملک و ملت اسے جان سے عزیز      دریاں سے بے نیاز دل درد مند تھا  
 گرمی سے حریت کی اک آتشکدہ تھا دل      اور دل میں جو خیال تھا گویا سپند تھا  
 اس ساجرِ کلام کے ایک ایک لفظ میں      اک قلم معافی و منوم بند تھا  
 دار و رسن کے پنجرے خرمیں سے بے نیاز      محبوب اس کو سلسلہ قید و بند تھا  
 ہم اور اس کی موت کے شایاں شان غم      اس کا مقام و مرتبہ بسمل بلند تھا  
 اس کا مقام و مرتبہ بسمل بسمل سعیدی۔ دہلی



## وہ پیکرِ حمیت و غیرت نہیں رہا،

سرمایہ دار حسنِ خطابت نہیں رہا      آئینہ دار شوکتِ ملت نہیں رہا  
 پروانہ چراغِ رسالت نہیں رہا      اور رازدارِ ختمِ نبوت نہیں رہا  
 افسوس وہ شیدِ نبوت نہیں رہا      واحسرتا! امیرِ شریعت نہیں رہا  
 اک برق بے لیاں تھا جو باطل کے واسطے      وہ شعلہ نوائے صداقت نہیں رہا  
 افسوس بزمِ عشق پر طاری ہے اک سکوت      لذت شناسِ دردِ محبت نہیں رہا  
 مٹان جس کے فقر سے شاہی کا ہنشنیں      وہ پیکرِ حمیت و غیرت نہیں رہا  
 جس نے کھی کھی کو کیا آشنائے درد      نغمہ طرازِ گلشنِ وحدت نہیں رہا  
 رنگیں ہے جس سے قصہ آزادی وطن      صد حیف وہ مجاہدِ ملت نہیں رہا  
 تھا عالمِ شباب کو پیری پہ جس کی ناز      وہ استرِاجِ دین و سیاست نہیں رہا  
 انگریز جس کے نام سے لرزاں تھا آج تک      وہ استرِاجِ دین و سیاست نہیں رہا  
 حیرت لہ پہ اس کی ہوں رحمت کی بارشیں

صد نازشِ تلوٹِ قرآن نہیں رہا      حیرتِ جلالپوری

## پٹنہ کی یادیں، بچپن کی باتیں

غالباً ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۵ء کے لگ بھگ ایک بزرگ تجارت کے سلسلہ میں صوبہ پنجاب کے ضلع گجرات سے پٹنہ آئے۔ یہ ضلع گجرات کے ایک با عظمت خاندانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جو سیادت و وجاہت اور سلسلہ بیعت کے لئے مشہور تھا۔ یہ خود بھی بہت ہی متدین اور متشرع اطلاق و عادات میں بہت ہی منکسر المزاج اور ملندہ تھے۔ محلہ جواؤ گنج میں جو خواجہ عنبر کی مسجد ہے اسی کے حواشی مکانوں سے ایک میں ٹھہرے۔ ان کی تجارت کاشمیری شال اور جامہ وار (اعلیٰ قیمتی کپڑا) کے علاوہ مشک و زعفران کی تھی۔ جلد ہی انہی وجاہت، پیشہ میں ایمانداری اور اعلیٰ درجے کی چیزوں کی بکری کے باعث انہی رسائی پٹنہ کے بڑے بڑے گھروں میں ہونے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے خواجہ عنبر کی مسجد کے قریب ایک مکان کرائے پر لیا۔ اور اس میں جا رہے اور دو چار برس بعد اپنے بچوں اور ایک بھتیجے کو بھی پنجاب سے لے آئے جو ان کی نگرانی میں مکتب اور اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان کے بھتیجے سید ضیاء الدین جو حافظ قرآن تھے اور وہ تجارت میں ان کا ہاتھ بھی بٹاتے تھے۔ اپنے چچا ہی کی طرح بڑے متدین اور متشرع بھی تھے۔ دونوں چچا بھتیجا ساتھ ہی رہتے تھے، کبھی مال کی بکری میں ساتھ جاتے اور کبھی الگ الگ، پنجاب سے جو اشخاص آتے وہ ان دونوں سے ملنے کو ضرور ان کے پاس جاتے آس پاس کے مکھ حضرات بھی ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے۔

انہی دنوں محلہ خانہ باغ پٹنہ میں ایک بزرگ رئیس سید احمد شاہ رہتے تھے۔ ان کا مکان بھی خانہ باغ کھلاتا تھا اور اسی مکان کے نام پر یہ محلہ بھی خانہ باغ کھلانے لگا۔ سید احمد شاہ صاحب نجیب الطرفین سید تھے۔ انکو تلاش تھی کہ کوئی اعلیٰ خاندان کا لڑکا مل جائے تو اپنی بیٹی کی اس سے شادی کر دیں۔ جب سید ضیاء الدین صاحب اپنے چچا کے ساتھ تجارت کے سلسلہ میں پٹنہ آئے تو ان کو بہت سچے۔ لنگے یہاں دونوں چچا بھتیجا کا آنا جانا بڑھا تو سید احمد شاہ نے حافظ سید ضیاء الدین صاحب کو بہت زیادہ نزدیک سے دیکھا۔ لوگوں سے لنگے خاندانی حالات معلوم ہو ہی چکے تھے۔ اب نسبت کا سلسلہ چلا تو بات بچی ہوتے دیر نہیں لگی۔ غرض سید ضیاء الدین سید احمد شاہ کے داماد بن گئے۔ سید ضیاء الدین صاحب کے ہاں کو ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام تو سید ضرف الدین احمد رکھا گیا مگر حافظ سید ضیاء الدین اس کو عطاء اللہ کے نام سے پکارتے تھے۔ یہی نام آخر میں اٹکا نام پڑ گیا۔ سید ضیاء الدین صاحب کے چچا آخر عمر میں ضلع گجرات چلے گئے۔ اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بیٹوں میں ایک صاحب پٹنہ میں ہی رہ گئے اور پولیس میں سب انسپکٹری کی ملازمت کر لی اٹکا نام سید محمد الحسن تھا۔ (۱) کچھ دنوں کے بعد حافظ سید ضیاء صاحب کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت عطاء اللہ شاہ محسن تھے مگر لنگے والد صاحب نے خود انہی دیکھ بھال شروع کی۔ اپنی اہلیہ کی زندگی میں بھی محلہ خانہ باغ کے قریب محلہ

لنگر گلی میں ایک مکان خرید لیا تھا وہیں رہتے اور شال دو شالہ جامد ار اور مشک و زعفران کی تجارت کرتے تھے۔ سال دو سال میں پنجاب بھی چلے جاتے۔ کچھ دنوں کے بعد سید ضیاء الدین صاحب نے دوسری شادی پنجاب میں کی مگر پٹنہ کو پھر بھی نہیں چھوڑا۔ اب سید عطاء اللہ شاہ عنفوان شباب کی سرحد میں پہنچ چکے تھے۔ اسی زمانے میں میرے والد مرحوم سید ضمیر الدین احمد صاحب نواب سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال کے یہاں ان کے اجلاس کامل کے نائب صدر اور ان کے چیف سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہو کر جانے لگے تو یہ فکر ہوئی کہ میری دیکھ بھال کے لئے کوئی اچھا آدمی مل جائے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں سید ضیاء الدین صاحب تھے یہ والد مرحوم کے دوست بھی تھے، دیاندار اور بڑے ہمدرد بھی۔ رہ رہ کر میرے والد مرحوم کی نظر انتخاب حافظ سید ضیاء الدین صاحب ہی پر ٹھہرتی تھی مگر بچپنی تھے کہ ان سے میری تعلیم اور نگہداشت صدر گلی میں رہ کر کرنے کی بات کہیں یا نہیں۔ آخر ایک دن جب حافظ صاحب مرحوم تشریف لائے تو والد مرحوم نے اپنی مشکل ان کے آگے پیش کی، جس میں یہ استدعا بھی تھی کہ بھوپال جب والد مرحوم جائیں تو پٹنہ میں میری تعلیم و تربیت اور نگہداشت کا کام حافظ صاحب انجام دیں۔ حافظ سید ضیاء الدین صاحب نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ یہ بات منظور کر لی مگر شرط یہ رکھی کہ باورچی خانہ انکا اپنا رہے گا۔ جناب حافظ سید ضیاء الدین صاحب اس پر سختی سے مصرعے۔ آخر انہیں کی بات رہی۔ جناب حافظ صاحب کو والد مرحوم صرف میری تربیت و نگہداشت کا کام نہیں سپرد کر گئے بلکہ گھر کا مختار کل بھی انکو بنا کر گئے۔ اب حافظ سید ضیاء الدین صاحب اپنے مکان لنگر گلی سے میرے مکان محلہ صدر گلی میں آٹھ آئے۔ ان کے فرزند سید عطاء اللہ بھی ان کے ساتھ آگئے۔ جن کو میں عطاء اللہ بھائی کہتا تھا۔ سید عطاء اللہ کی عمر اس وقت اٹھارہ انیس سال کی ہو گئی۔ یہ مجھ سے تقریباً دس سال بڑے ہوں گے۔ انہوں نے بھی قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ مگر پھر بھی کچھ تھے۔ قرآن شریف کی تلاوت اور گردان میں بڑی تساہلی کرتے اور اس کے لئے جناب حافظ صاحب کی ڈانٹ بھی سنتے۔ سید عطاء اللہ نے ابتدائی عربی کتابیں بھی پڑھ لی تھیں۔ صدر گلی آئے تو ہمارا گھر بھرا ہوا ملا۔ ہم سبھوں کا مکان بہت بڑا تھا۔ ایک محلہ ہی کہیے۔ میرا مکان، میرے ماموں صاحبان کے مکانات زنا نے اور مردانے جسے سب ایک ہی حلقے میں تھے۔ سید عطاء اللہ ایک تو یہ یونی کھلنڈرے اور ہنسور طبیعت کے نوجوان تھے۔ یہاں ان کو ساتھی بھی مل گئے۔ کچھ یہاں کے اقامت پذیر طلباء اور دو تین نوجوان میرے ماموں صاحبان یہ سب لنگے ساتھی اور دوست تھے۔ عطاء اللہ شاہ بچپن سے ہنسی مذاق اور لطیف بازی کے آدمی تھے۔ یہاں ان کا خوب جی لگا۔ صبح اور شام حافظ صاحب مجھے قرآن شریف اور دوسری کتابیں پڑھاتے۔ ان وقتوں میں پڑھنے کے لئے سید عطاء اللہ بھی پکڑے جاتے اکثر ان کے ساتھ یہ ہوتا کہ تھوڑا سا پڑھ کر جناب حافظ صاحب سے کہتے کہ اب نہیں پڑھوں گا اور حافظ صاحب فرماتے کہ اچھا کتابیں اٹھا لو اور جاؤ۔ میں نے دیکھا کہ یہ پڑھنے سے چھٹکارا پانے کی اچھی ترکیب ہے چنانچہ ایک دفعہ یہی داؤ میں نے بھی استعمال کیا۔ پڑھتے پڑھتے میں نے بھی حافظ صاحب سے کہا کہ اب نہ پڑھوں گا۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ گلو خلاصی ہو جائے گی مگر میرے اس

کھنے پر ایک زلزلہ آیا۔ جناب حافظ صاحب گرج کر بولے تو نہیں پڑھے گا تو تیرا کچھ مر نکال دوں گا۔ عطاء اللہ کی پیروی کرنے چلا ہے۔ تو اس کی ریس نہ کر۔ حقیقت یہ تھی کہ سید عطاء اللہ اگرچہ ان کے بیٹے تھے مگر جناب حافظ صاحب مجھے بھی ان سے کچھ نہ سمجھتے تھے اور بڑی محبت کرتے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ سید عطاء اللہ بچپن ہی سے آزاد منش اور ایک حد تک سرکش بھی تھے۔ اور اسی لئے جناب حافظ ان پر زیادہ سختی بھی نہیں کرتے تھے۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے دل جوئی بھی کرتے تھے۔ جناب حافظ سید ضیاء الدین کی تجارت یہاں بھی جاری تھی۔ کبھی خود معزز خریدار آپ کے پاس آجاتے کبھی یہ ایسے لوگوں کے یہاں جاتے تو ان کے حسب فرمائش شال دو شالے خریدنا چاہتے اگر پسند کی چیزیں نہ ہوتیں تو کشمیر سے خط لکھ کر منگواتے اور ان کو دیتے۔

جناب حافظ صاحب تقریباً ساڑھے چار سال میرے یہاں مستقل طور پر رہے اور عطاء اللہ شاہ صاحب بھی ان کے ساتھ یہاں رہے۔ آخر میں عطاء اللہ شاہ صاحب میرے گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگے۔ ایک دفعہ میرے ایک ماسوں عبدالغنیظ صاحب جو دیہات میں رہتے تھے ان کو اپنے ساتھ دیہات لے گئے وہاں یہ پانچ چھ مہینے رہ گئے ان کا خوب جی لگا دیہات کے لہلہاتے کھیت ان کو خوب پسند آئے۔ دیہات کی ندیوں میں مچھلی کا شکار ان کو خوب پسند آیا۔ بڑے بڑے جال، جسے زمین پر پھا کر تیر اور بٹیر کا شکار کرتے ہیں یہ خوب مشاق ہو گئے۔ انہیں دنوں جب میرے والد مرحوم بھوپال سے کچھ دنوں کی رخصت لیکر آئے تو وہ عطاء اللہ شاہ صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ وہ ان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ بھوپال میں یہ آٹھ نومہینے رہے۔ وہاں کی روداد یہ بڑے مزے میں بیان کرتے تھے۔ جناب حافظ سید ضیاء الدین صاحب صدر لکھی میں تھے تو ایک دو دفعہ چند ہفتوں کے لئے اپنے گھر گجرات پنجاہ بھی ہو آئے یہاں انہوں نے عطاء اللہ شاہ کی والدہ کے انتقال کے بعد اپنی برادری میں دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ محترمہ بڑی خدا ترس، عبادت گزار اور حافظ بھی تھیں۔ ان سے جناب حافظ صاحب کو ایک لڑکا بھی تھا۔ حافظ سید عطاء الرحمن شاہ صاحب مرحوم جن کا گزشتہ برس انتقال ہو گیا: مرتب) جب والد صاحب مرحوم ۱۹۱۱ میں بھوپال کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس آ گئے تو جناب حافظ سید ضیاء الدین صاحب پھر واپس اپنے گھر واقع محلہ لنگر لکھی چلے گئے مگر ہفتہ میں دو تین دفعہ صدر لکھی ضرور آجاتے تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد حافظ سید ضیاء الدین صاحب مستحقاً اپنے گھر گجرات پنجاہ چلے گئے۔ اور ان کے ساتھ عطاء اللہ شاہ بھی گئے۔ پنجاہ ہی میں (امر تسر شہر میں) عطاء اللہ شاہ نے اپنی عربی تعلیم مکمل کی اور مدرسہ سے نکلے تو اپنے ساتھ علم و فضل اور فصاحت و بلاغت اپنے جلو میں لیکر نکلتے۔

تقریباً عطاء اللہ شاہ صاحب کو پٹنہ سے گئے ہوئے تو دس سال ہوئے ہوں گے کہ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید عطاء اللہ بخاری پٹنہ آئے ہیں اور ان کی بصیرت افروز تقریر دو ایک جگہ ہوئی جس میں لوگوں کا بڑا مجمع تھا اور ایک تقریر اسی دن پٹنہ سٹی کی جامع مسجد مدرسہ پر رات میں ہوئی یہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا جبکہ عدم تعاون کا ہر

طرف پر چار تھا۔ اور اسکول و کالج کی تعلیم کا طلباء بائیکاٹ کر رہے تھے۔ اس خبر کو کہ مولانا سید شاہ عطاء اللہ بخاری پٹنہ آئے، میں کچھ ہی دیر گزری تھی کہ والد صاحب مرحوم کا ملازم خاص مجھے ان کے کمرے میں بلانے کے لئے آیا۔ جب میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک مولانا نسیم نسیم بزرگ بیٹھے ہیں، چہرے پر درمیانی درجہ کی داڑھی ہے، کھادی کا کرتہ اور اسی کا پانچامہ ہے اور سر پر چپکی ہوئی کھادی کی گول ٹوپی۔ مجھے دیکھ کر والد مرحوم نے ان حضرت سے کہا کہ لومیاں بدر الدین آگئے۔ اب مولانا میری طرف پلٹے تو بڑی حد تک چہرہ جانا پہچانا نظر آیا۔ وہ لپک کر اٹھے اور مجھے بغل میں داب کر تقریباً زمین سے ایک فٹ اٹھایا اور میرا بھائی میرا بھائی کہتے ہوئے میری ہڈیاں اور پسلیاں چور کرنے لگے۔ بعد میں جب ان کو خود احساس ہوا کہ مجھے زور سے پیچھے ہونے ہیں تو ہنس کر مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے بغور دیکھا تو عطاء اللہ تو غائب تھے یہاں مولانا سید عطاء اللہ بخاری بیٹھے ہیں۔ چہرے کا کھنڈرا بہن صاف ہو چکا تھا، پیشانی پر سنیدگی کی کنگنیں تھیں، داڑھی شرعی حد میں تھی مگر ہونٹوں میں مسکراہٹ اور آنکھ کی چمک یہ کچھ نہ رہی تھی کہ ہم وہی عطاء اللہ ہیں جو پہلے تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجھ سے میرے پٹنہ کے متعلق پوچھا۔ میں نے کہا کہ بی، اسے میں پڑھتا ہوں پھر میرے بچپن کے قصے سنانے لگے۔ یہ والد مرحوم کا بہت احترام کرتے تھے۔ والد صاحب مرحوم سرکاری گروپ کے آدمی تھے کیونکہ خان بہادر بھی تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کانگریس کے بڑے سرگرم رکن اور پنجاب کی احرار جماعت کے روح رواں بھی تھے۔ مگر ذہن برابر بھی میرے گھر میں انہوں نے سیاست کا تذکرہ نہ چھیڑا۔ یہ عدم تعاون اور اسکول و کالج کے طلباء سے تعلیم کی بائیکاٹ کا مطالبہ اپنی گفتگو اور تقریروں میں کرتے پھرتے مگر میرے یہاں سوائے نجی حالات پر گفتگو کے سیاست کا ذکر نہ آنے دیا۔ دن بھر میرے یہاں رہے ان کے رفقاء پٹنہ میں ایک دوسری جگہ مقیم تھے اور یہ انہیں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے دوسرے برس والد مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ انکا لاہور سے تعزیت کا خط آیا پانچ مجھے برس کے بعد مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری پٹنہ پھر اپنے دورے پر آئے اس وقت ملک کی آزادی کی پکار اور بڑھ گئی تھی۔ اور سیاست اب عوام میں رچ بس رہی تھی۔ اس دفعہ پٹنہ میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا استقبال بڑی شہود سے ہوا۔ جوق کے جوق لوگ ان سے ملاقات کرنے کو اور انکی تقریر سننے کو امدے پڑتے تھے۔ تقریریں ایسی ہوتی تھیں کہ گھنٹوں سنتے رہے مگر سیرمی نہ ہو۔ روتوں کو ہنسا دیں، ہنستوں کو رلا دیں اور چاہیں تو پانی میں آگ لگا دیں۔ تقریر کرتے وقت عوام کے جذبات کی باگ ڈور لٹکے ہاتھ میں ہوتی۔ جس طرف اور جس طرح چاہیں موڑ دیں۔ انکی تقریریں صرف سچائی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ تاریخی اور سیاسی مواد کے ساتھ ساتھ مذہبی ہدایات کے سلسلے بھی ان کی تقریریں میں جاری رہتے تھے۔ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی پر مغز اور پروقار تقریریں بھی سنی ہیں، حیدر آباد کے ہنادر یار جنگ کو بھی بڑے بڑے مجموعوں کو خطاب کرتے دیکھا ہے مگر انکی وہ معجز بیانی جودل و دماغ کو سرشار کرتی تھی۔ اسے خدا نے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہی کے حصہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ پٹنہ سے ان کو بے پناہ محبت تھی

اور کیوں نہ ہوتی۔ پٹنہ ہی میں وہ پیدا ہوئے، ماں کا بے حد و بے پایاں پیار ان کو یہاں ملا، اٹکا بچپن اور ان کا  
 غضوان شباب یہاں کی فضاء میں پروان چڑھا، لنگے ابھرتے ہوئے شعور نے یہاں کے ماحول میں انگڑائی لی اور  
 ان کی صلاحیتوں کی پہلی تربیت یہیں کی آب و ہوا میں ہوئی۔ یہ جب بھی پٹنہ آتے تو یہاں کی ہر تقریر میں  
 اپنے پیارے پٹنہ کی روداد سناتے یہاں کے لوگوں کا ہر تذکرہ بڑی محبت اور احترام سے کرتے اور لوگوں سے  
 کہتے کہ پٹنہ بھی ان کا ویسا ہی وطن ہے جیسا پنجاب ہے۔ وہ اجنبی نہیں ہیں ان کا ضمیر بھی پٹنہ ہی کے ضمیر سے  
 بنا ہے۔ میرے ایک عزیز ماموں زاد بھائی سید حسین احمد مرحوم پنجاب گئے۔ یہ ۱۹۳۵ء کا زمانہ تھا۔ لاہور کے  
 اسٹیشن پر آگے جانے کو گاڑی لگی ہوئی تھی۔ انکو کراچی جانا تھا۔ ابھی ٹرین کے کھلنے میں دیر تھی۔ یہ  
 کمپارٹمنٹ میں جا کر بیٹھ رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک جماعت چالیس پچاس آدمیوں کی آتی دکھائی دی جس  
 میں ایک شخص بہت نمایاں تھے، ادھیڑ عمر کے، اچھے ہاتھ پاؤں کے، یہ مولانا اپنی گفتگو سے سبھوں کو محفوظ  
 کرتے ہوئے مجمع میں سبھوں کے لیڈر معلوم ہوتے تھے۔ حسین احمد کا کمپارٹمنٹ سامنے ہی پڑتا تھا مولانا  
 صاحب نے سیدھے اسی کا رخ کیا اور آکر اسی کے ایک خالی برتھ پر بیٹھے۔ جو پلیٹ فارم سے لگا ہوا تھا۔  
 ساتھیوں میں کچھ تو لنگے ساتھ ہی کمپارٹمنٹ میں آکر بیٹھے مگر زیادہ تعداد لنگے ساتھیوں کی پلیٹ فارم ہی پر  
 رہی۔ کچھ ہی دیر کے بعد ٹرین نے چلنے کی سیٹی دی۔ اور ٹرین چل پڑی۔ اب مولانا نے کمپارٹمنٹ کا جائزہ لیا  
 تو ایک طرف حسین احمد مرحوم پر نظر پڑی۔ انکی وضع قطع پٹنہ والوں جیسی نمایاں تھی۔ مولانا اپنی قسمت  
 سے اٹھ کر ان کے برتھ پر آگئے۔ اور پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لارہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ  
 پٹنہ وطن ہے وہیں سے آ رہا ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ غریب خانہ پٹنہ کے ایک محلہ صدر لگی میں ہے۔ یہ  
 سن کر مولانا کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کیا تم "حسنو"؟ انہوں نے کہا ہاں میں حسنو ہی ہوں مگر آپ نے کس  
 طرح سمجھا مولانا نے حسین احمد مرحوم کو بھینچتے ہوئے کہا کہ جے گو د میں کھلایا، جس کے والد صاحب کے ساتھ  
 مہینوں ان کے دیہات پر جا کر لنگے ساتھ رہا، پھر پٹنہ میں ان کے ساتھ رہا اس کو کیوں نہ پہچانتا۔ حسین احمد  
 مرحوم سمجھ گئے کہ یہی عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ مولانا عطاء اللہ شاہ نے پٹنہ کے جانے پہچانے لوگوں کا نام لیکر  
 خیریت پوچھی گھر کے ہر فرد کو چاکر دائی مانا سب کا حال فردا فردا دریافت کیا۔ پھر پوچھا سیرا بھائی بدر الدین  
 کس حال میں ہے۔ مراد بھ سے تھی۔ حسین احمد نے کہا کہ آج کل وہ بھی لیڈر ہیں۔ اس پر مولانا عطاء اللہ شاہ  
 خوب ہنسے اور کہنے لگے یہ تو ہونا ہی تھا ایک بھائی لیڈر تو دوسرا کیوں نہیں ہو گھر میں سمجھتا ہوں کہ میں تو  
 جماعت احرار میں ہوں اس لئے بدر الدین ضرور مسلم لیگ میں ہوں گے۔ حسین احمد مرحوم نے کہا کہ جی ہاں  
 آپ ٹھیک سمجھے..... پھر حسین احمد مرحوم پر زور دینے لگے کہ وہ دو ایک دن ان کے ساتھ رہیں مگر اپنا ضروری  
 کام بتا کر حسین احمد مرحوم نے معذرت کر لی۔ اور کہاں کہ بعد میں وہ آپ سے ملیں گے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا  
 جب حسین احمد مرحوم واپس آئے تو مجھے یہ قصہ سنایا۔

غالباً ۱۹۳۷ء میں رہنک جیل میں سے ایک خط میرے نام آیا مجھے تعجب ہوا کہ یا اللہ رہنک جیل سے

مجھے خط بھیجنے والا کون ہے۔ لفاظہ چاک کیا تو اندر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا خط تھا۔ مجھے آج تک اس خط کا مضمون یاد ہے۔ لکھا تھا "سیرے پیارے بھائی بدرالدین آج کل جیل کی تنہائی میں تم مجھے یاد آتے ہو، زمانہ دراز سے تمہیں نہیں دیکھا غالباً اس کی کسر بار بار تمہارے یاد آنے سے نکل رہی ہے، قوم کی خدمت کرنے کی سزا مجھے توقید تنہائی سے ملتی ہے، آج کل بھی وہی سزا ہے۔ تنہائی کو دور کرنے کے لئے میں نے کھادی کے کپڑے کے تھان کو اپنے ہاتھوں سے پیک کر کے تمہارا نام اور پتہ لکھا اور جیل والوں سے کہا کہ تمہارے پاس بھیج دیں۔ اس کو میری یادگار سمجھ کر قبول کر لینا۔ برسوں گزر گئے مگر کھادی کا تھان مجھے نہ ملا۔ غالباً جیل والوں نے اپنے مصرف میں لے لیا ہو گا۔

۱۹۳۰ء میں میں لاہور گیا تو یہ خواہش لیکر گیا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے ضرور ملاقات کروں گا۔ اس وقت مسلم لیگ کا پنجاب میں بڑا زور تھا۔ دوسری مسلم سیاسی پارٹیاں جن میں جماعت احرار بھی تھی ماند ہو کر رہ گئیں تھیں۔ اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، سارے پنجاب میں امیر شریعت اور جماعت احرار کے سب سے اونچے لیڈر ہونے کے باوجود بھی پس پشت ڈال دیئے گئے تھے۔ بہر حال میں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ توجیل میں تشریف رکھتے ہیں۔ ان کے بال بچوں کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ امرتسر میں رہتے ہیں۔ لاہور سے پٹنہ آنے کے راستہ امرتسر پڑنا تھا۔ مجھے گولڈن ٹمپل، جو سکھوں کی مشہور زانہ عبادت گاہ ہے، اس کے دیکھنے کی بھی تمنا تھی۔ میں اور میرے دو ساتھی دن بھر کے لئے امرتسر اتر گئے، اسباب اسٹیشن ہی پر کھاک روٹ میں رکھا اور اسٹیشن پر ہوٹل میں کھا پی لیا، پھر گولڈن ٹمپل دیکھنے کو چلے گئے۔ ایک بڑے حلقہ میں گولڈن ٹمپل واقع ہے، بیچ میں بہت بڑا تالاب ہے، اس کے چاروں طرف خوبصورت عمارتیں بنی ہوئی ہیں تالاب کے بیچ میں بھی سنگ مرمر کی عمارتیں ہیں۔ ایسی دلکش اور پرکشش کہ دیکھا کیجئے۔ کئی عمارتوں میں مقدس صورت منست بیٹھے گرنٹھ صاحب پڑھ رہے تھے۔ گولڈن ٹمپل پہنچتے ہی ایک سن رسیدہ منست میرے ساتھ ہو گئے تھے اور ہر جگہ ہماری رہبری کر رہے تھے آخر میں سبھوں کو ایک بڑی خوبصورت سبک پل کے ذریعہ سے اس عمارت میں پہنچنا ہوتا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو ہمارے راہبر نے کہاں کہ یہاں کے جو سب سے بڑے منست ہیں انہی کے پاس آپ کو لئے چلتا ہوں۔ اندر ایک سنگ مرمر کے تحت پر ایک بڑے باوقار سفید ریش بزرگ کو دیکھا جو گرنٹھ صاحب پڑھنے میں مشغول تھے۔ انہوں نے ہم تینوں کو دیکھا تو کتاب بند کر دی۔ ہم نے موڈ بانہ ان کو سلام کیا انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ سلام کا جواب دیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لارہے ہیں۔ میں نے کہاں کہ پٹنہ سے۔ یہ سننا تھا کہ جھٹ لٹھے اور مجھے گلے لگا لیا میرے ہاتھوں کو باری باری سے اور بڑی محبت سے کھینچے گئے کہ آپ پٹنہ شریف سے آئے ہیں اس لئے ہم سبھوں کو سر آنکھوں پر آپ کا آنا ہے، آپ تو میرے معزز اور بڑے محبوب مہمان ہیں۔ پھر پوچھا کہ آپ کے اسباب کہاں ہیں اور ہمارے راہبر سے کہا کہ بھائی ان کے اسباب لیجا کر مہمان خانہ میں ٹھیک ٹھاک کر کے رکھو۔ میں نے عرض کیا کہ ہم سب تو سر راہ ہیں، صرف گولڈن ٹمپل کی زیارت کی تمنا کھینچ کر



لے آئی ہے۔ اور آج ہی شام کے وقت پٹنہ روانہ ہو جائیں گے مگر بڑے مہنت صاحب ہم سبھوں کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ آخر ہم سبھوں نے وعدہ کیا کہ دوبارہ آپس کے تو انکی خدمت میں دو چار دن ضرور رہیں گے۔ پھر ہم سب وہاں سے رخصت ہوئے۔ آج تک گولڈن ٹیمپل کے لوگوں کی محبت کا برتاؤ اور پٹنہ سے ان کی عقیدت اور پٹنہ والوں کے ساتھ اٹکا برادرانہ خلوص میرے دل پر نقش ہے۔

گولڈن ٹیمپل سے چلے تو دو بج رہے تھے مولانا عطاء اللہ شاہ کا مکان کس محلہ میں واقع تھا یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا تھا۔ لوگوں سے پوچھتے پوچھتے آخر منزل مقصود تک پہنچ ہی گیا۔ ایک کشادہ گلی سے کچھ آگے بڑھ کر ایک کشادہ جگہ پر ایک نئی عمارت کھڑی تھی۔ سامنے ہی مردانہ خست کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ جو بند تھا۔ اس کے بغل سے لگا ہوا۔ ایک دروازہ تھا جو زمانہ حصہ میں جانے کا راستہ تھا۔ وہیں پر جا کر میں نے کارا کہ کوئی صاحب ہیں؟ باہر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ پہلی ہی آواز پر ایک صاحب باہر آئے، تیس، بیستیس سال کی عمر ہو گی، متوسط قد کے خوش رو آدمی تھے، چہرے پر خوشی داڑھی تھی۔

صاحب سلامت کے بعد پوچھا کہ آپ لوگ کہاں سے تشریف لارہے ہیں میں نے کہا کہ پہلے یہ تو بتائیے کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا یہی مکان ہے کہ نہیں؟ جواب ملا کہ مکان تو یہی ہے اور ان کی اہلیہ اور بچے اسی مکان میں ہیں مگر مولانا جیل میں ہیں۔ میں نے کہا کہ مولانا کا جیل جانا معلوم ہے۔ آپ انکی اہلیہ سے یہ کہہ دیں کہ بدرالدین پٹنہ سے آیا ہے۔ وہ صاحب یہ سن کر اندر گئے پانچ منٹ بعد باہر کی خست گاہ کھلی، اچھا خاصہ کمرہ تھا۔ ہم سب کمرے میں بیٹھے تو تین بچیاں میرے سامنے کھڑی تھیں، بڑی کی عمر نو سال ہو گی، دوسری تقریباً سات سال اور چھوٹی پانچ چھ سال کی۔ (شاہ جی کی صرف ایک بیٹی ہیں دوسری گھر میں پڑھنے والی بچیاں تھیں)۔۔۔۔۔ (مدیر)

سب آکر مجھ سے لپٹ گئیں۔ مجھے حیرت تھی کہ آخر ان سبھوں نے مجھے کس طرح پہچانا۔ میں نے سبھی کو پیار کے بعد ان کے نام پوچھے۔ اتنے میں بڑی لڑکی لپک کر اندر گئی اور پھر دو عین ٹھٹ میں باہر آئی اور کھینے لگی کہ امی جان آپ کو سلام کہتی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ آپ کے اسباب کہاں ہیں آپ کو چار پانچ دن یہاں رہنا ہے۔ میں نے کہا کہ تم اپنی امی جان کو میرا سلام کہو، میں تو صرف تم سبھوں کو دیکھنے کے لئے آگیا تھا۔ بھائی جان جیل میں ہیں، اس لئے رہ کر کیا کروں گا۔ بڑی لڑکی نے جواب دیا کہ امی جان اور ہم سب تو ہیں۔ ابا جان ہمیشہ آپ کا ذکر ہم سبھوں سے کرتے رہتے ہیں کہ میرا ایک بھائی بدرالدین پٹنہ میں ہے۔ اللہ اللہ، مولانا عطاء اللہ شاہ کی محبت کے طویل زمانہ گزرنے پر بھی انکی محبت میرے ساتھ کم نہ ہوئی۔ بچیوں کا اصرار کہ میں دو چار روز قیام کروں میرا یہ عالم کہ بچیوں سے گفتگو کے درمیان سارے گزشتہ واقعات کی تصویر نظر کے سامنے کھڑی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بچیوں کو سمجھا رہا ہوں مگر وہ بہہ نہ سکتے ہیں کہ میں قیام کروں۔ اتنے میں مولانا کی اہلیہ نے بڑا پر تکلف ناشتہ ہم سبھوں کے لئے بھیجا۔ وہ صاحب جو پہلے آکر ہم سبھوں سے ملے تھے ان کے متعلق ان سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ مولانا کے سائلے ہیں۔ وہ میرا بانی میں مجھے جا

رہے تھے۔ ناشتہ کر کے میں نے مولانا کی اہلیہ سے اپنی مجبوری کھلا بھیجی کہ آج میرا پٹنہ روانہ ہو جانا بہت ضروری ہے۔ ہم سب سیدھے اسٹیشن روانہ ہو گئے مگر وہ دن اور آج کا دن، میں نے پھر ان کو دیکھا نہیں۔ ملک تقسیم ہو گیا۔ جذبات بدل گئے۔ اہلماقہ درخت خشک ہو کر پیوند زمین ہو گئے، ان کی جگہ پر نئے پودے نکل کر تناور درخت بن گئے مگر پرانی یادیں پہلے ہی کی طرح آج بھی دل کو بے چین کر دیتی ہیں۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی گزر گئے۔ میں نے ۱۹۲۱ء کے بعد پھر انہیں نہیں دیکھا مگر آج بھی جب ان کی یاد آتی ہے تو دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے قومی خدمات کا ایک طویل اور شاندار ریکارڈ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ جمعیتہ العلماء کو انہوں نے پروان چڑھایا، مجلس احرار کو انہوں نے قوت اور روشنی بخشی، پنجاب میں ملکی سیاست کو اونچی سیڑھیوں پر چڑھایا، انہی کی معجز بیانی سے ہندوستانی سپوت ملک پر نثار ہونے کے لئے تیار ہو کر سینوں پر انگریزوں کی گولیاں کھاتے تھے۔ انگریزوں کے لئے توپ اور رائفل سے زیادہ خطرناک مولانا عطاء اللہ شاہ کی آتش نوائی تھی جو دم کے دم میں نئے لوگوں کو انگریزوں سے ٹکر لینے کے لئے ان کے رائفل کے مقابل بھیج دیتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ حکومت کے قید و بند کی برابر زنت بنے رہے۔ آج مولانا نہیں ہیں مگر ان کی عظیم المرتبت داستان حیات باقی ہے۔

### "عقیدت"..... اور..... "ارادت"!

گذشتہ روز کا واقعہ ہے کہ میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ "امروز" کا پرچہ پاس پڑا تھا جس پر حضرت شاہ جی کا فوٹو چھپا ہوا تھا۔ محلہ کی ایک چھوٹی سی کھیتی ہوئی آئی اور شاہ جی کا فوٹو دیکھ کر بولی یہ شاہ جی کا اخبار ہے؟ کسی جواب کا انتظار کئے بغیر واپس دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد آئی اور بڑے منت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ کہ میری نانی لماں بہت ہی بوڑھی ہیں۔ وہ شاہ جی کے جنازہ پر نہیں جاسکیں آپ ہمیں یہ اخبار دیدیں گے؟ ہم تصویر دیکھ کر جلد واپس کر دیں گے۔ اخبار لے گئی۔ واپس آکر بولی اگر آپ کے پاس شاہ جی کی کوئی اور اچھی سی تصویر ہو تو ہمیں دے دو، ہم زیارت کر کے واپس کر دیں گے۔

اس بات سے جہاں عوام الناس میں شاہ جی کی بے پناہ مقبولیت اور لوگوں کی انکے ساتھ عقیدت اور ارادت کا پتہ چلتا ہے۔ وہاں یہ اندیشہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ شاہ جی ساری عمر جن خلاف شرع افعال (مثلاً قبر پرستی، تصویر پر پوجا، نذر نیاز اور اندھی عقیدت وغیرہ) سے منع فرماتے رہے ہیں۔ ہم لوگ ان افعال کی ابھی سے خود شاہ جی کی تصاویر اور شاہ جی کے مزار سے ابتداء کر بیٹھیں۔

(شذرہ لماہنامہ "الصدیق" بھٹان۔ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ)

حاشیہ: بجائے صفحہ ۲۵۱

اور اسی آغاز میں

(۱) سید محمد اسحق، سید عبدالغنی کے فرزند تھے۔ حافظ ضیاء الدین صاحب رحمہ اللہ کے دیگر بچا سید حیدر شاہ صاحب سید حسام الدین اور سید پیر شاہ صاحب بھی تجارت کی غرض سے پٹنہ جایا کرتے تھے (مرتب)

## کچھ پریشاں تذکرے

اباجی جب ناگڑیاں سے امر سر حصول تعلیم کے لئے آنے لگے تو بزرگ خاندان حضرت مولانا سید محمد یوسف رحمہ اللہ سے ملنے گئے وہ دادا جی کے چچیرے چچا تھے اور اماں جی کے حقیقی تایا۔ مسلک ہمارے خاندان کے واحد اہلحدیث بزرگ اور حضرت مولانا نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد۔ پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری بھی کچھ عرصہ انکے ہم سبق رہے تھے۔ گاؤں میں اس زمانہ میں وزیر آباد سے مستری بلوا کر شاندار مسجد تعمیر کرائی تھی جواب تک موجود ہے۔ اسی مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ اباجی فرماتے ہیں مسجد میں حاضر ہوا اور عرض کیا باباجی پڑھنے چارہا ہوں نصیحت فرمائیے انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا اور سورہ لقمن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

یا بُنِی اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاَصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلَکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْر۔

میں نے سلام و مصافحہ کیا اور اٹھ کر آگیا اس سے بڑی نصیحت اور کیا ہوتی؟ باباجی کا مزار اب بھی گاؤں میں مرجع عوام ہے۔ انہی بنائی ہوئی مسجد میں قریباً چالیس سال ہمارے دادا جی حضرت حافظ ضیاء الدین صاحب رحمہ اللہ نے امامت کی اور تراویح میں کلام پاک بھی سنایا ان کے بعد خاندان کے ایک دو افراد نے امامت کی۔ آجکل بجائی عطاء الحسن سلمہ اللہ نے وہاں قرآن پاک حفظ و ناظرہ کا مدرسہ قائم کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ قائم رکھیں اور ترقی عطاء فرمائیں آمین۔ نضیالی گھر اور مسجد کی دیوار ایک تھی۔ ہماری نانی جی صاحبہ رحمہ اللہ علیہا کو تلاوت کا بہت ذوق تھا، سینکڑوں لڑکوں لڑکیوں کو قرآن پاک پڑھایا۔ اباجی کا امر سر آسنے سے پہلے مسجد میں روزانہ ختم قرآن کا معمول تھا۔ نانی جی پیر ٹھی بچا کر مسجد کی دیوار کے ساتھ بیٹھ جاتیں اور قرآن پاک سنتی رہتیں۔ اللہ پاک سب کی ارواح پر رحمت نازل فرمائیں، آمین تم آمین۔



آخری بیماری میں عصر و مغرب کے درمیان کچھ طبیعت بحال ہوتی تو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ہم اباجی کو کرسی پر کھدیر کے لئے بٹھا دیتے اکثر مغرب کی اذان تک بیٹھتے ورنہ ٹانگیں ٹھک جاتیں تو جب کبھی زبانی اور کبھی ہاتھ کے اشارہ سے کہتے ٹھک گیا ہوں تو پھر ہم ٹھا دیتے۔ ایک روز ایسے ہی بٹھایا تھا اتفاق کی بات کہ اس وقت بجائی کوئی گھر نہ تھا۔ دروازہ پر دستک ہوئی پڑھنے والے ایک دو بچے موجود تھے انہوں نے کہا ایک بابا کہتا ہے شاہ جی سے ملنا ہے۔ بڑا تنگ وقت تھا۔ میں صحن کے کونے میں چولہے پر روٹی پکا رہی تھی اور مغرب کا وقت ہونے والا تھا میں نے کہا اماں جی میں چار پانی کھڑی کر لیتی ہوں، بے چارہ پتا نہیں کہاں سے

آیا ہوگا۔ چنانچہ میں نے چار پائی پر چادر ڈال لی اماں جی کمرے میں چلی گئیں اور بچہ اس بوڑھے دیہاتی کو لے آیا۔ بچے کپڑوں والا وہ بوڑھا برآمدے میں بیٹھے ابا جی کی کرسی کے پاس آکر زمین پر بیٹھ گیا اور سلام کر کے انکی دونوں پنڈلیوں کو پکڑ کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے سنا..... ابا جی نے دو دفعہ کہا، "نہ رو آخر ایسا انجام اسے" میں نہیں جانتی وہ کون تھا؟ چند منٹ بعد وہ اٹھا اور سلام کر کے پکڑی کے پلو سے اٹھو پوچھتا ہوا باہر نکل گیا۔ یہ تھی وہ محبوبیت جو اللہ تعالیٰ نے انکے لئے لوگوں کے دلوں میں اتھا کر دی تھی اور جس کے مظاہر بار بار شاہدہ میں آئے۔



ایک روز عمر کے وقت صحن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ برادر محترم جناب ملک عبد الغفور صاحب انوری مرحوم و مغفور ملنے آئے۔ بیٹھک کھلی تھی کوئی صاحب بیٹھے تھے۔ انوری صاحب نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا السلام علیکم۔ ابا جی نے جواب دیا۔ ممکن ہے پیالی کی کھٹک انہوں نے سنی ہو یا ویسے ہی کہا "چاہ پئے پیندے او" (چائے پی رہے ہو) ابا جی نے مسکرا کر کہا "اوے ہر کھڑاک نوں پیالی دانہ سمجھ لئیں مار یا جاویں گا" مرحوم انوری صاحب ۹-۱۰ برس کی عمر سے وفات تک احرار اور ہمارے خاندان سے وابستہ رہے انکے والد ماجد سے لیکر نواسوں تک تین نسلوں کا تعلق ابھی تک الحمد للہ سنبھ رہا ہے۔ جب انہوں نے چائے پینی ہوتی بے تکلف پی لیا کرتے اس وقت نہیں یاد اس دن پی یا نہیں۔ ان کے والد صاحب کے متعلق ابا جی نے فرمایا کہ جب بلتان میں ہر رات میرے قتل کی رات ہوتی (مخالف منصوبے بناتے تھے) تو مولوی برخوردار میرا پریدار ہوتا تھا۔ (رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)



ایک دن ابا جی نے لطیف سنایا۔ مولوی مظہر علی اظہر صاحب کے ساتھ لاری میں سفر کر رہے تھے۔ چھوٹی سی ٹوکری میں پان کا سامان ساتھ ہوتا تھا۔ سیٹ پر ٹوکری رکھنے کی جگہ نہ تھی پان لگانا تھا اس لئے پان کا ٹکڑا تو خود ہاتھ میں پکڑا اور ڈبانا پاندان مولوی صاحب کو تھماتے ہوئے کہا بھائی مظہر!

تعاونو علی البر واتقوا  
مولوی صاحب نے ڈب پکڑا اور چونے کتے کے خانوں کی طرف انگلی کر کے کہنے لگے "ایسناں وجوں برکھیرا  
اسے تے تقویٰ کھیرا؟"

ایک روز فرمانے لگے امرتسر بیٹھک میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا کہ سرک پر سے چار پائیاں ٹھونکنے والا گزرا اور اس نے آواز لگائی "بھئی پیرھی ٹھالو" "مآ مجھے خیال آیا یہی حال برطانوی فوج میں شامل ہمارے مسلمان بھائیوں کا ہے۔ یہ ترکھان تو روزی کمانے کے لئے کندھے پر اپنے ہتھیار اٹھائے پھرتا ہے اور فوجی کندھے پر بندوق رکھے کھتا ہے مصری مروالو۔ حجازی مروالو۔ ترکی مروالو۔ شامی مروالو۔ ۱۵ روپے دو اور جس کو چاہو مروالو۔ تب ۱۵-۱۶ روپے ہی تنخواہ ہوتی تھی۔ ایک روز ایک پٹھان چھریاں چاقو تیز کرنے والے سے فرمایا

کہ تم لوگ اتنی منت کرتے ہو لیکن مسلمان بھائیوں کو قرض سود پر دیتے ہو یہ تو حرام ہے۔ فرماتے وہ کہنے لگا یہ لوگ یہاں سے جاتے ہیں ہم آزاد قبائل پر بم اور گولیاں برساتے ہیں۔ ہمارے بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ بناتے ہیں ہم نے انکا کیا بگاڑا ہے؟ کون کا پر کا بچہ (کافر کا بچہ) انکو مسلمان سمجھتا ہے۔؟



سر سکندر والے کیس میں خاتونہ سراجیہ کنڈیاں والے حضرت مولانا احمد خاں صاحب کو جب ابا جی نے دعاء کے لئے پیغام بھیجا تو انہوں نے وظیفہ پڑھنے کے لئے بتایا اور ساتھ فرمایا تھا "جے میں ول ہونداتے میرا اک رات داکم سی ہن شاہ نوں آکھوتن راتاں پڑھے تے ہوئے گا تماشا۔" پھر رپورڈ کرنے ہی جلی تھریر کا بھانڈا برسر عدالت پھوڑ دیا۔ ابا جی فرمایا کرتے تھے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا، آنکھیں بند کیں تو تلوار چلتی دیکھی۔ حضرت مولانا احمد خاں صاحب رحمہ اللہ نے ایک بڑا عجیب تحفہ بھی عنایت فرمایا تھا۔ جب رہائی کے بعد ملنے گئے۔ لکڑی کی ایک چوکور صندوقی، جس پر سنہرے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ اسکے اندر نمدا لگا کر چائے دانی اور دودھ دان وغیرہ رکھنے کے خانے بنے ہوئے تھے چائے بنا کر اس میں رکھ لی جائے تو کئی گھنٹے گرم رہے۔ ابا جی نے تبرک رکھ دی تھی ۳۴ میں جہاں سب کچھ گیا ساتھ وہ بھی گئی ایک اور بڑا عجیب قصہ بیان فرماتے کہ حضرت کے ایک صاحبزادے جو ال سال فوت ہو گئے تھے۔ مین جب ملنے گیا تو حضرت کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے دل میں خیال آیا کہ جوان بیوہ بے چاری کیسے زندگی گزارے گی۔ جب نماز ختم ہو گئی تو حضرت رحمہ اللہ نے کسی خادم سے فرمایا کتب خانہ میں جاؤ اور فلاں کتاب نکال لاؤ۔ خادم گیا اور مطلوبہ کتاب حاضر کر دی۔ اس خلافت معمول عمل پر سب حیران تھے۔ مجلس میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (سرگودھا والے) اور ان کے چچا حضرت مولانا احمد الدین صاحب گنبدی لوی بھی شریک تھے۔ حضرت نے کسی سے فرمایا کہ فلاں صفحہ سے پڑھو۔

"قصہ یہ تھا کہ کسی جہاد میں ایک مجاہد شہید ہو گیا بیوہ جوان تھی بچے بھی تھے منت مشقت کر کے گزارا کرتی تھی پھر اسکے متعلق یہ مشہور ہوا کہ وہ کھاتی پیتی کچھ نہیں، ہوتے ہوتے یہ بات خلیفہ وقت تک پہنچی تو اسے دربار شاہی میں طلب کیا گیا اور سوال کیا گیا کہ کیا واقعی تم غذا نہیں کھاتیں اسنے کھانا خاوند کی شہادت کے بعد اکثر روٹی تھی ایک رات خواب دیکھا کہ بہت خوبصورت باغ ہے اسکے اندر سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میرے خاوند کی آواز بھی تھی۔ میں سن کر اندر چلی گئی تو میرا خاوند کچھ کھا رہا تھا اسنے اپنے رفیقوں سے کہا اگر تم اجازت دو تو یہ میری بیوی ہے اس کھانے میں سے میں اسے کچھ دیدوں۔ انہوں نے اجازت دیدی تو میرے خاوند نے ایک ٹکڑا میرے ہاتھ پر رکھ دیا، وہ میں نے کھایا شہد سے زیادہ میٹھا اور دودھ سے زیادہ سفید تھا جب میری آنکھ کھلی تو اس کھانے کا ذائقہ میرے منہ میں تھا اسکے بعد سے نہ مجھے بھوک ہے نہ پیاس پیٹ کمر کے ساتھ لگ چکا ہے اور سہارے کے لئے کمر پر کپڑا باندھ رکھتی ہوں!"

اباجی فرماتے ہیں سمجھ گیا کہ یہ میری اصلح ہو رہی ہے۔ میرے دل میں جو اسکے گھر کے متعلق خیال آیا۔ قصہ ختم ہوا تو میں نے کہا حضرت ایک اور مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ حیاتِ مسیح کا۔ کئی لوگوں کو بہت فکر ہے کہ وہ آسمانوں پر کھاتے کیا ہیں۔ حاضرین حیران تھے کہ پہلے کو نسا مسئلہ تھا کہ اب دوسرا حل ہو گیا۔ مولانا احمد الدین حیاتِ مسیح کی بات سنکر بے اختیار کہہ اٹھے "شاہ ایہ تیرا فیض اے۔" فرماتے تھے بعد میں میں نے مفتی محمد شفیع صاحب کو بتایا کہ میرے دل میں بس اتنا خیال گزرا تھا کہ بے چاری بیوہ کیسے گزارا کرے گی۔ مولانا احمد الدین صاحب شگفتہ مزاج بزرگ تھے۔ اباجی فرماتے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہتے، چائے کا انکار "ستفح علیہ کفر ہے" مطلب تھا اباجی اور مولانا خود!



جب سردار عبدالرزاق نشتر گور نر پنجاب تھے، ملتان دورہ پر آئے اور چلے گئے۔ اباجی کا قیام ملتان اسکے علم میں تھا۔ بیماری کا یہاں پتا چلا ہو گا۔ بہر حال عیادت کا خط انہوں نے حیدر آباد (سندھ) سے لکھا مجھے یاد ہے ۱۳۳۲ء یا ۱۳۳۳ء میں اباجی نے سرحد کا دورہ کیا تو آکر بتایا تھا کہ نشتر صاحب نے بھی دعوت کی تھی۔ کیا دور تھا۔ علی گل ظلل صاحب سرحد کے کانگریسی لیڈر، سردار اورنگزیب خاں لیگی لیڈر، سب نے دعوتیں کیں۔ بہر حال نشتر صاحب کے ملاقات نہ کرنے اور خط لکھنے پر اباجی نے ارجحاً یہ شعر کہا اور یہی خط کے جواب میں لکھ بھیجا۔

نوشتی نامہ از حیدر آباد  
بملتان جانِ زامِ رانیدی

پھر نہ تو جواب آیا۔ نہ کبھی اور خط!



قبل از تقسیم ایک دفعہ ضلع ملتان ہی کے کسی چھوٹے سے گاؤں میں گئے (بھائی عطاء المؤمن سلسلہ نے یاد دلایا وہ گاؤں محبت پور تحصیل میلی تھا اور داعی تھے قاضی عبید اللہ صاحب مرحوم، جنکو کسی شقی القلب نے کچھ عرصہ ہوا شہید کر دیا) داعی نے اپنے مکان کے صحن میں ہی بستر بچھا دیا۔ فرمانے لگے میں نے اسے کہا کہ میرا بستر گھر سے باہر کھلی جگہ بچھا دو۔ بہنوں بچیوں کو تنگی نہ ہو۔ فرماتے ہیں باہر سو گیا آدمی رات کا عمل ہو گا کہ ایک بڑے زور دار دھماکا سے میری آنکھ کھل گئی چاروں طرف دیکھا کوئی آدم نہ آدم زاد لیکن بارود کی سی بو پھیلی ہوئی تھی میں نے تھوڑی دیر سوچا پھر صاحب خانہ کو جگایا اور چارپائی وہاں سے اٹھا کر گھر میں ایک طرف بچھانے کو کہا تو وہ حیران تو ہوا کہ پہلے منتوں کے باوجود شاہ جی اندر نہیں سوتے اب کیا بات ہوئی۔ میں نے پوچھا اباجی پھر یہ کیا تھا۔ فرمانے لگے "مجھے وہاں سے اٹھانا مقصود تھا" اور وہ بوفلج کے پہلے حملہ تک میرے دماغ میں تھی اب نہیں ہے!۔



میرے سر حضرت الحاج سید محمد شفیع شاہ صاحب مرحومؒ مغفور نے اباجی کی وفات کے بعد بتایا کہ

جس دن غاری صاحب فوت ہوئے ہیں میں آیا تو اسٹیشن ملتان چھاؤنی پر ایک آدمی بیچ پر بیٹھا تھا۔ اسکے ہاتھ میں اس روز کا اخبار تھا۔ وہ اخبار کھولتا خبر پڑھتا اور دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیتا۔ کئی بار اسنے ایسا ہی کیا۔ میں اسے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ اس شخص کا خاندانی تعلق تو کوئی نہیں محض لوجہ اللہ محبت سے اسکا یہ حال ہے۔ اباجی کی زندگی میں انہوں نے مجھے ایک دفعہ سنایا کہ ہم (کوئی اور صاحب بھی ساتھ تھے) ملتان آئے، تانگہ میں بیٹھے تو ایک پولیس کاسپاہی بھی سوار ہو گیا اور پھر بغیر کرایہ دے اپنی منزل مقصود پر اتر گیا جب وہ اتر گیا تو تانگے والے نے اسے خوب صلواتیں سنائیں چچا جان کہتے کہ جب ہم کاسم العلوم کے سامنے تانگہ سے اتر کر میدان کی طرف چلے تو دو آدمی شاہ جی سے مل کر واپس جا رہے تھے اور آپس میں بات کر رہے تھے کہ اللہ کا شکر ہے ہم نے جو بد یہ پیش کیا شاہ جی نے قبول فرمایا تو میں نے سوچا یہ ہیں تصویر کے دورخ ایک نے از خود حق جتلیا اور تانگے والے نے پس پشت گالیاں دیں۔ ایک یہ ہیں کہ دیگر شکر گزار ہیں کہ بد یہ قبول ہوا۔



ایک اور واقعہ سنایا کہ کوٹ "ملانہ" عبدالکلیم (تھیل کبروال) کے نواح میں گاؤں ہے اباجی نے پاکستان بننے سے قبل وہاں تقریر کی اور دیہاتیوں کو گھر میں داخل ہوتے وقت سلام کر کے داخل ہو نیکی تلقین کی۔ فرماتے ایک اجد دیہاتی دوسرے سے کہنے لگا بڑی تعریف سنی تھی۔

"پیر عطاء اللہ شاہ بڑے وعظ کرندا اے، ایہو وعظ کرندا اے؟ جو گھر ونبوتے دھی مائی بیٹھی ہووے تاں آکھو "السلام علیکم"۔ ہڈای نہ مریوے"

یعنی پیر عطاء اللہ شاہ کی بڑی تعریف سنی تھی یہی وعظ کرتا ہے؟ کہ گھر جاؤ اود بیٹھی بھی بیٹھی ہو تو کھو دالسلام علیکم۔ ڈوب کر نہ مرجائیں! جمالت کا اندازہ لگائیں کہ سلام کرنا ڈوب مرنے کا مقام تھا وہ سچ ہی تو کہتے تھے میں نے سب زینوں میں ہل چلائے ہیں۔ بے شمار دیہاتوں میں کئی کئی گھنٹے صرف السلام علیکم کے موضوع پر تقریریں کیں۔



اباجی نے ایک دفعہ سنایا کہ ضلع مظفر گڑھ میں کسی جگہ جلسہ تھا دواڑھانی گھنٹے وعظ کے بعد پوچھا کہ اب تو آپکو مسائل کی سمجھ آگئی ہوگی تو جلسہ میں سے متفقہ آواز آئی "سائیں" کوہ۔ یعنی نہیں جناب! فرماتے تھے پھر دوبارہ گھنٹہ دو لگا کر انکو مسائل ضرور یہ ذہن نشین کرائے۔ پھر پوچھا کہ اب سمجھ آگئی ہے؟ تو حاضرین نے جواب دیا کہ اب سمجھ آگئی ہے۔



سید محمد شفیع شاہ صاحب چچا جان رحمہ اللہ ایک اور قصہ بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتے۔ عبدالکلیم کے معروف بزرگ حضرت پیر سید خورشید احمد شاہ صاحب رحمہ اللہ سے بھی اباجی کا بہت تعلق تھا وہ اپنے چک میں جلسہ کراتے اور اباجی کو تقریر کے لئے بلاتے۔ ایک دفعہ پیر صاحب کا ایک بچہ حادثاتی طور پر فوت ہو گیا

کہیں سے ماچس ہاتھ آگئی تیلیاں جلا کر پھینکتا رہا آخر قمیض کو آگ لگ گئی اور وہ بے چارا مجلس گیا اور انتقال کر گیا۔ اباجی جلسہ پر عبدالکیم آئے تو اس حادثہ کا پتا چلا تو انہوں نے تعزیت کے لئے چمک میں جانے کا ارادہ کیا چنانچہ پیر مبارک شاہ صاحب بغدادی مرحوم، میرے سر اور غالباً حافظ محمد حسین صاحب مرحوم بھی جو پیر صاحب کے بڑے چیمے شاگرد اور مرید تھے ساتھ گئے وہاں پہنچ کر تعزیت کی۔ چچا جان فرمایا کرتے کہ تب تک میں صرف بخاری صاحب کی تقریروں کا سامع تھا سلام و مصافحہ ہوتا اور بس! نماز ظہر کے بعد مسجد میں سب بزرگ جمع تھے کہ بخاری صاحب نے کہا مبارک شاہ اسوقت ہم تین سید یہاں اکٹھے ہیں آؤ دعاء کریں آج اللہ تعالیٰ سے پیر خورشید شاہ کو تین بیٹے لے کر دیتے ہیں۔ اس اثنا میں پیر صاحب کے ہاں سے کھانا آیا تو فرمانے لگے کھانا بعد میں کھائیں گے پہلے دعاء کریں گے۔ چچا جان کہتے ہیں مسجد کے والان میں ایک طرف بیٹھا ہوادل میں سوچ رہا تھا کہ انکو اللہ تعالیٰ پر اتنا اعتماد ہے کہ بڑے زور سے کہہ رہے ہیں سیٹھے لیکر دینے ہیں فرماتے تھوں بڑی دیر تک دعاء میں مصروف رہے اور دعاء بخاری صاحب نے ہی کرائی۔ چچا جان مرحوم روایتی کرامات کے کچھ زیادہ معترف بزرگ نہ تھے مگر یہ قصہ جب انکو یاد آجاتا بڑے انبساط سے سناتے اور کہتے کہ اس روز کی دعاء کی قبولیت دیکھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تین ہی بیٹے پیر صاحب کو عطا کئے۔

\*

جیٹھ بھٹ کے ایک مولوی صاحب (غالباً اللہ بخش نام)

بھائی جان سے رحیم یار خاں جیل میں ملے تو یہ واقعہ سنایا کہ: "اباجی سے ملنے ملتان آئے تو انہوں نے حافظ کے یہ اشعار سنائے۔"

باغبان گر پنہروزہ صمبت گل بایدش

برجٹائے خار ہبران صبر بلبل پیوش

انے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال

مرغ زیرک چوں بدام افتد تمحل بایدش

اباجی فرماتے تھے۔ ہر شاعر کا ہر شعر اچھا نہیں ہوتا حافظ کا کمال یہ ہے کہ اس کا ہر شعر اچھا ہے۔ حضرت تھانوی نے کہیں فرمایا کہ: "مشہور ہے تفسیر کثاف کا حاشیہ حافظ شیرازی نے لکھا ہے (اللہ تعالیٰ ایسے کام کسی بُرے آدمی سے نہیں لیتا۔)"

جامعہ عباسیہ کے ایک متعلم مولوی صاحب مدینہ طیبہ میں پیر جی عطاء اللہ حسین سلمہ سے ملے اور سنایا کہ انکے دور طالعہ علی میں اباجی جامعہ عباسیہ آئے اور ہم طلباء کے درمیان بیٹھے تھے کہ شیخ الجامعہ حضرت مولانا غلام محمد گھوٹوی تشریف لائے اور دیکھ کر فرمایا۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز

تو اباجی نے کہا مولانا یہ تو بہت پرانا ہے اسے چھوڑ لے



دلم	بازلف	جاناں	می	نشیند
پریشاں	با	پریشاں	می	نشیند

تقسیم ہند کے بعد انور صابری مرحوم اباجی سے ملنے پاکستان آئے تو دیکھ کر روئے کہ شاہ جی یہ کیا ہو گیا۔ تو فرمایا بس کسی دن سن لو گے۔ "بخاری نہیں رہا۔"

وجل السيول عن الطلول كانها -- زبر تجد متونها اقلامها  
سیلاب نے کھنڈرات کو ایسے نمایاں کر دیا جیسے پرانی تحریروں کو اسکے قلم نے کر دیا



موضع باگڑ سرگاندہ میں قبل از تقسیم بھی بہت مضبوط جماعت قائم تھی مجھے مہر شوق محمد سرگاندہ کا نام چمپین سے یاد ہے کہ ان کی اباجی سے خط و کتابت رہتی تھی ایک بار وہاں کانفرنس ہوئی اباجی، مولانا حبیب الرحمن صاحب، قاضی صاحب، شیخ صاحب، سبھی حضرات موجود تھے اباجی فرمانے لگے ایک روز بیٹھے تھے کہ ایک آدمی آیا اور کہنے لگا مجھے بیعت کر لیجئے۔ میں نے کہا بھائی جا کسی نیک آدمی کی بیعت کر لے۔ وہ چلا گیا۔ دوسری بار پھر آیا میں نے پھر کہا کسی اور بزرگ کی بیعت کر لیجئے۔ تیسری بار وہ پھر آیا۔ ہم سب ساتھی صبح کی نماز سے فارغ ہو کر چار پائیوں پر بیٹھے تھے اور میں پاؤں لٹا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسنے آکر پھر بیعت کرنے کو کہا میں نے زنج ہو کر کہا آچڑھ میرے کندھوں پر مجھے بیعت کروں وہ اتنا سادہ آدمی تھا فوراً میرے کندھوں پر سوار ہو گیا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے، اٹھ کر کھڑے ہو گئے تالیاں بجاتے اور کہتے اب بھی نہ کرو بیعت! میں نے کہا بھائی میں نے بیعت کیا، میرے پیچھے نے مجھے بیعت کیا، تو نیچے اتر! اس بیچارے نے سمجھا شاہ جی کا طریقہ بیعت یہی ہے! خیر بعد میں اسے بیعت کر لیا یہ قصہ یوں سنایا! کہ تذکرہ مولانا آزاد کا ہو رہا تھا کہنے لگے مولانا علامہ حسین میر کا شمیری کو جب دیکھتے تو مسکرانے لگتے خصوصاً انہی گردن کے دائمی انما پر۔ تو میں نے کہا اباجی کوئی ایسا بھی ہے جسے دیکھتے ہی آپ کو ہنسی آئے تو یہ باگڑ میں بیعت والا قصہ سنایا۔ ملتان میں ایک روز مسکراتے ہوئے پیشک سے اندر آئے اور کہا وہی باگڑ والا مرید آیا ہے پھر تواضع کے لئے خور و نوش کی اشیاء خود اٹھا کر لے گئے۔



## میر کارواں

الوداع اے حضرت میر شریعت الوداع  
 الوداع اے صاحب علم و فضیلت الوداع  
 الوداع اے ماحی کفر و ضلالت الوداع  
 الوداع اے باعث صد فخر ملت الوداع  
 رحمتوں کے پھول برسیں تیری تربت پر سدا  
 تجھ کو جنت دے خدا بر محمد مصطفیٰ

ذات تیری سید والا مگر تھی بے مثال  
 تو نے علم و فضل کے موتی بکھیرے بالکمال  
 تیرے دم سے ہو گئی بدعت کی دنیا پامال  
 خدمت اسلام و دین کا تھا تجھے ہر دم خیال  
 تھا حقیقت میں تو اس ملت کا میر کارواں  
 اور ناموس نبوت کا حقیقی پاساں !

عہد حاضر میں تھا بیشک تو خطیب بے مثال  
 پیکر انسانیت تھا ، ملک و ملت کا ظلیل  
 مرتبہ زعمائے ملت میں تھا کیا تیرا جلیل  
 پیش باطل تو نے ہر جا حق کی روشن کی دلیل  
 آفتاب علم دیں تھا تو جہاں میں بالیقین  
 تھا دل و جاں سے تو واللہ ! عاشق دین متین

دین قیم کے لئے تو نے سے ظلم و ستم  
 زندگی بھر دین حق پر تو رہا ثابت قدم  
 تیری فطرت سے عیاں تھی الفت شاہ ام  
 تو نے اونچا کر دیا حق و صداقت کا علم  
 فقر و درویشی میں انور جس کی گزری ہے حیات  
 سرخرو ہو کر ہوا پیش رب کائنات !  
 نور محمد انور (کالا باغ)

## شاہ جی، ابراہم لنکن اور پاکستان

لنکن میں حضرت امیر شریعت تادم واپس ہیں جس مکان میں رونق افروز رہے آپ کا معمول یہی رہا کہ بیشتر وقت "بیشک" میں گزارتے۔ بیشک کے مقابل کے مکان میں ایک عرصہ کوئی نائب تحصیلدار صاحب مقیم رہے اور ان کے ہاں بھی آنے جانے والے کچھ کم نہ تھے۔ سنت گرمیوں میں ایک روز دوپہر کے وقت امیر موصوف کے ایک ملاقاتی ان کی کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے تک ہار گئے مگر جواب نہ دیا! شاہ جی نے دیکھا تو بیشک میں بلا لیا۔ پینکھے کی ہوا میں کچھ دیر بیٹھے رہنے سے اس کے لوسان بحال ہوئے تو اب اس نے نظریں گھما گھما کے بیشک کے خستہ و شکستہ درودیوار کا جائزہ لینا شروع کیا۔ شاہ جی اس کے موسسات بھانپ گئے اور فرمایا: "بھئی تم دیکھ کر حیران ہو رہے ہو گے کہ حکومت نے کیسا عالیشان مکان الاٹ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مکان کرائے پر حاصل کیا گیا ہے" قاطب شاہ جی کے لطیف طنز کو پا گیا۔ اور فوراً بولا، ویسے اگر آپ موسس نہ فرمائیں تو میں ایک بات عرض کروں، اور ادھر سے خوشدلانہ اجازت پا کر کھٹے لگا کر "امیر خیال ہے آپ کے ساتھ ہونا بھی ایسے ہی چاہیئے تھا"

شاہ جی "پرکھ اٹھے، قاطب کو گلے لگایا اور فرمایا: "بھئی بہت خوب! سچ تو یہی ہے کہ جب ہم نے ساری زندگی فریق مخالف سے کوئی ادھار نہیں رکھا بلکہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تو اب ادھر سے التفات اور عنایات کی توقع۔ چہ معنی دارو؟" اس ساری مکالماتی کارروائی سے ماحول میں بے تکلفی سی پیدا ہو گئی تو بات پاکستان کے سماج اور سرکار کے عاقلانہ اور معائنہ تک پھیل گئی۔ وہ صاحب کھنے لگے کہ "علی جی!" مجھے پاکستان کی صورت حال دیکھ کر ابراہم لنکن یاد آ جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی عادت کچھ ایسی تھی کہ وہ سفارشی حضرات کی دو ٹوک انداز میں حوصلہ شکنی سے بہت کتراتا تھا۔ بلکہ اس کی بجائے سفارشی حضرات کو کسی تمثیلی پیراہنے میں ان کا ناجائز موقف پاور کرائے کی کوشش کرتا۔ مثلاً ایک دفعہ ابراہم لنکن کو اس کا ایک دوست آکر ملا، اور اپنے ایک دوست کا تعارف کراتے ہوئے ابراہم سے پر زور سفارش کی کہ پارلیمان سے وزیر بنادو، اس پر ابراہم نے حسب معمول اپنے دوست سے کہا کہ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے اور وہ کچھ یوں ہے کہ ایک دفعہ ایک بادشاہ نے شکار کا پروگرام بنایا اور وزیر اعظم سے کہا کہ نبوی سے زائچہ تیار کر کے بتلاؤ کہ موسم شکار کے لئے سازگار ہے یا نہیں؟ وزیر اعظم نے تعمیل ارشاد کی اور اطلاع دی کہ حضور موسم بہت سازگار ہے۔ اب بادشاہ نے متربین اور مصاحبین کا لالہ لشکر ترتیب دیا اور سینکڑوں امراء کا یہ قافلہ جنگل کو چل پڑا۔ موسم واقعی خوب تھا۔ مطلع صاف، دھوپ کی تمازت اور تروتازہ سبزہ! اچانک بادشاہ کی نظر ایک دیہاتی پر پڑی جو اپنے گدھے کو بری طرح پیٹتے ہوئے شہر کو بھگائے لے جا رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کی اس حرکت پر ناگواری کا اظہار کیا تو ایک وزیر نے لپک کر دیہاتی کو چالیا کہ کیوں بے زبان پر ظلم ڈھاتے ہو۔ دیہاتی نے تنک کر جواب دیا ارے

صاحب! زوروں کی بارش آنے والی ہے اور مجھے گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔ آپ خواہ منواہ میرا وقت ضائع کرتے ہیں، بادشاہ نے اسے درہائی کی دیوانگی پر ممول کیا مگر ہوا یہ کہ تصور ہی در میں آنا فنا گھٹا چا گئی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بادشاہ کو وزیر اعظم پر بے حدو حساب غصہ آیا اور وزیر اعظم صاحب برطرف کر دیے گئے۔ دوسری طرف درہائی کی ڈھنڈیا بج گئی کہ بادشاہ سلامت اس کی فہم و دانش کے قابل بلکہ گھائل ہو چکے تھے۔ درہائی کو حاضر دربار کیا گیا۔ اس نے وزارت عظمیٰ کا پروانہ پایا تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گھگھکیا کر بولا کہ بادشاہ سلامت، یہ کس گناہ کی سزا ہے؟ بادشاہ سلامت فرمایا نے لگے کہ ہم تمہیں اس کا اہل سمجھتے ہیں اور تمہاری بارش کی پیٹنگوئی، تمہاری قابلیت کا یقین ثبوت ہے۔ درہائی بولا! حضور! اگر یہ بات ہے تو وزارت عظمیٰ کا حقدار میرا گدھا ٹھہرتا ہے کیونکہ جب بھی بارش قریب ہوتی ہے تو گدھا غیر معمولی اچھل کود کا مظاہرہ کرتا ہے اور میں بارش کے امکان سے مطلع ہو جاتا ہوں۔ یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے کہا کہ پھر ٹھیک ہے آج سے ہمارا وزیر اعظم یہ گدھا ہی ہوگا۔ یہ واقعہ سنا کے ابراہیم لنگن نے اپنے دوست کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا مگر وہ مسٹر کھانی کی دلچسپی میں اس بری طرح کھو چکے تھے کہ فوراً بولے پھر آگے کیا ہوا؟ اور ابراہیم نے بڑی متانت سے کہا کہ پھر یہ ہوا کہ اس کے بعد سے دنیا کے ہر گدھے نے وزارت اپنا موروثی حق سمجھنا شروع کر دیا۔ شاہ جی نے حکایت سنی اور کھٹکھٹلا کر ہنس دیے۔ قاطب کو بہت داد دی۔ کہ پاکستان کی سیاسی صورت حال پر یہ بڑا بلیغ تبصرہ تھا۔ افسوس اس ملاقاتی کا نام حافظ میں محفوظ نہیں رہا۔



### ٹو ایک طرف ایک طرف نسل ہلا کو!

جایا ہے زمانے میں جدھر دیکھتے ہر  
ابے مرد قلندر تیرے الفاظ کا جادو  
کیسے میں سکوں ان میں ترا خون نہیں ہے  
مکے ہیں جو محبوبہ ایام کے گئیو  
اصنام فرنگی کا نشان بھی نہیں باقی  
گو نجا ہے فضاؤں میں ترا نعرہ یاہو  
ہر معرکہ دار و رسن یاد ہے تیرا  
ٹو ایک طرف، ایک طرف نسل ہلا کو  
عظمت کو تری آج بھی دنیا نہیں سمجھی  
دنیا جو سراپا ہے بدطینت و بدخو  
مدت سے ترستے ہیں جو آواز کو تیری  
سمجھائے انہیں کون کہ خاموش ہے کیوں ٹو



بخاری جنہیں پیار سے ہم لادہ جی کہتے ہیں) سے میری ایک آدھ چونچ بھی ہو جاتی ہے۔ پھر اچانک محلہ سے ایک شور بپا ہوتا ہے۔ پکڑو پکڑو! یہ کوئی پتنگ کٹ کر جا رہی تھی اور بچے اس کے تعاقب میں تھے۔ میں بھی پیر جی کو قہر بآ پیٹنگ کر "گدھی" لوٹنے چھت پر چلا جاتا ہوں۔ گدھی تو لوٹنے والے لوٹ گئے مگر میں خالی ہاتھ نہ آ کر آپا جی کے حکم پر کان پڑا لیتا ہوں۔ بعد میں آپا جی کی سفارش پر مجھے معاف کر دیا جاتا ہے۔ پھر میں نے سبق یاد کر کے سنایا تو آپا جی بہت خوش ہوئیں۔ سبق سننے کے بعد انہوں نے مجھے چاول اور ثابت موگھی کھلائے۔ یہ ہمارے پنہابی اور کشمیری لوگوں کی پسندیدہ غذا ہے۔ دال چاول بہت مزیدار ہیں۔ اور میں مزے لے لے کر کھا رہا ہوں اس دوران آپا جی مجھے کھانے کے آداب بھی سکھا رہی ہیں۔ "منہ سے چہرہ چہرہ کی آواز مت نکالو" میں کھانا کھا چکا تو آپا جی میرے باقی بھائیوں اور والدہ کیلئے کھانا باندھ کر دیتی ہیں۔ "بیٹے ہاؤ نگھر لے جاؤ"

یہ وہ احساس ہے جو خالصتاً اللہ کی عطا ہے

آپا جی جانتی تھیں کہ میری ایک عزیزہ بیوہ ہے۔ اور غریب ہے اسلئے ہر طریقے سے ان کی مدد کرتی تھیں۔

بھائی جان مرحوم تحریک آزادی کے عظیم رہنما تھے۔ تمام ہندوستان میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ لوگ انہی باتوں اور صحبت کو ترستے تھے۔ بڑے بڑے سیاسی رہنما اور ادیب و شاعر ان سے ملنے آتے۔ مگر دوسری طرف میں ---- ایک - یتیم اور غریب بچہ، سیلا لباس بڑے بڑے بال اور سر جووں سے بھرا ہوا لیکن وہ مجھے اپنی پاکیزہ گود میں بٹھا کر احباب سے میرا تعارف یوں کراتے "ان سے ملتیے یہ میرے سالے ہیں" یہ تعارف، یہ محبت اور یہ اپنائیت میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اپنے روتیلے سے میرے اندر احساس کستری پیدا نہ ہونے دیا۔ بے شک وہ ہم سب کیلئے روشنی کا ایک پینار تھے۔ جن سے ہم سب حسب توفیق روشنی حاصل کرتے تھے۔ وہ ایک مثالی کردار کی حامل شخصیت تھے۔ اللہ اللہ! کیا لوگ تھے۔ اللہ کی رحمت کے خزانے ان پر نچاور تھے۔ وہ سوائے انگریز کے کسی کے دشمن نہ تھے۔

یہ اسکے عظیم اور بلند کردار کی ایک بلکی سی جھلک ہے۔ میں نے ان کا یہ رویہ شعور کے آنے سے پہلے کا جذب کیا ہوا ہے۔ جس کا اظہار میں کبھی کبھار اپنے مرحوم بھائی سید سعید شاہ صاحب نے کیا کرتا تھا یا پھر آج صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے تاریخ کے حوالے کر رہا ہوں۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں



## سید الاحرار کی قرآن فہمی

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا مختلف طریقوں سے مختلف ادوار میں اظہار فرمایا ہے کبھی کسی خط میں کبھی کسی قسم میں اور کبھی کسی فرد کی شخصیت کے روپ میں حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت عظیمہ اور قدرت کاملہ کے مظہر تھے شاہ صاحب مغفور جامع صفات تھے آپ ایک عظیم خطیب تھے۔ مبلغ اسلام تھے۔ آپ کے تبلیغی انداز انوکھے اور زرا لے تھے آپ اس وصف میں برصغیر میں یکتا تھے۔ آپ ایک بہترین سیاست دان تھے۔ آپ کی رائے پیش آئندہ حالات کا آئینہ ہوتی اس کے باوجود آپ اپنی رائے پیش فرما کر اصرار نہ فرماتے آپ صوفی کامل تھے آپ مرنے تھے آپ کے تربیتی خطوط حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ نقوش پر مبنی تھے اور یہ نابغہ روزگار ذات گرامی مذکورہ بالا اوصاف کے ساتھ تفسیری اقدار کی حامل تھی۔ بہت سی آیات ایسی ہیں۔ کہ ان کا مضمون سلف کی کتابوں میں خال خال ہی نظر آتا ہے آپ کی ایک امتیازی شان یہ تھی کہ ہمیشہ قرآنی مضامین کی تہ تک پہنچنے کی سعی فرماتے اور تمام مفسرین کے طریق سے ہٹ کر سوچتے پھر اسے علماء عصر علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی کی مضمونوں میں بیان کرتے اور ان سے داد تحسین وصول کرتے۔ اس سلسلہ میں ایک بات واضح کر دینا ضرور سمجھتا ہوں کہ ان کے ذہن کو دو جگہ سے روشنی ملی۔ دوران تعلیم حضرت مولانا نور احمد امرتسری رحمہ اللہ تعالیٰ سے، دوسرے دور میں حضرت شاہ عبد القادر دہلوی مرحوم کے شرہ آفاق ترجمے سے جسے آپ نے مدت العمر ساتھ رکھا اور جیل کی زندگی میں بھی اس سے مکمل استفادہ کرتے رہے۔

ایک دفعہ خود فرمایا کہ اللہ الصمد کے معنی میں مجھے ہمیشہ تردد رہا کہ ”اللہ بے نیاز ہے“ بس یوں ہی دل کو تسکین نہ ہوتی جیل ہی کا واقعہ ہے کہ شاہ عبد القادر صاحب دہلوی کا مترجم قرآن پاک دیکھ رہے تھے کہ اچانک اس کا خیال آیا کہ دیکھیں شاہ صاحب کیا لکھتے ہیں۔ جب وہ جگہ نکالی تو حضرت نے ترجمہ فرمایا ”اللہ زاوہار ہے“ شاہ جی فرماتے ہیں کہ میں کبھی اسے زاوہار پڑھوں کبھی کچھ بالآخر اپنے جیل ہی کے ایک ساتھی پنڈت نیکی رام شرما کے پاس گیا جو بہت فاضل تھا اس سے پوچھا کہ یہ لفظ کیا ہے وہ دیکھتے ہی جھومنے لگا اور واہ واہ کے نعرے بلند کرنے شروع کر دیئے میں نے چند لمحے انتظار کے بعد کہا کیا عجب آدمی ہیں۔ میں انتظار میں ہوں اور آپ اپنے ہی آپ لطف لے رہے ہیں مجھے بھی تو علم ہو کہ کیا معنی ہیں اس کے بعد اس نے بتایا کہ یہ سنسکرت کا لفظ ہے ”زادھار“ اور یہ اس ذات پر بولا جاتا ہے کہ جس کا کام کسی بن نہ اڑے اور جس بن کی کا کام نہ بنے فرمایا تب مجھے تسکین ہوئی۔ اور یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گمشدہ متاع مل گئی ہو پھر میں نے اسی پر کئی کئی گھنٹے بیان کیا۔ ایسے ہی فرمایا کہ احدنا الصراط المستقیم تا ولا الضالین کے معنی میں بھی مجھے تسکین نہ ملتی کیونکہ عام معنی میں دکھا ہم کو سیدھی راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے العالم کیا نہ ان کی جن پر تیرا غضب ہوا اور وہ گمراہ ہوئے لیکن جب حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ پڑھا تو بالکل وضاحت ہو گئی اور وہی عین مطابق معنی میں وہ فرماتے ہیں

جلاہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان کی جن پہ تیرا عالم ہوا (اور) نہ ان پر تیرا غضب اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔

ظاہر ہے کہ جو بات اس میں ہے وہ اس عام ترجمہ میں نہیں یہ دونوں ترجمے ایک دوسرے کا عکس ہیں اس میں ایک تواضع نامے معنی دکھائے گئے ہیں جو اس کی ذات وعدہ لاشریکہ کے منافی ہے جہاں کانٹے ہی کانٹے ہوں وہاں اکیلا چھوڑ دینا؟ اور ساتھ چلانا ایسا ہے کہ جیسے باپ بچے کو انگلی پکڑ کر ساتھ چلاتا ہے اور راستہ کی دشواریاں سہل کر دیتا ہے اپنی توفیق و حفاظت میں چلانا یہ اس بارگاہ کی عین شان ہے۔

ایک دفعہ حضرت شاہ جی کے یہاں گھر پر بہت سے علماء جمع تھے ان میں سے بے تکلف راتھی صرف استاذی مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ تھے شاہ جی نے حسب عادت اکابر کا ذکر چھیڑ دیا جو بہت دیر تک جاری رہا۔ آخر میں شاہ جی نے کہا سبحان اللہ کیسا اچھا وقت گزرا کیسے اچھے تذکرے تھے کہ مصیبت کا خیال تک نہیں گزرا جن کا تذکرہ ہوتا رہا ہے اللہ تعالیٰ انہیں کے ساتھ مشر میں اٹھائے (امین) اور یہ "آیت" و "توفیاع الابرار" پڑھ کر سب سے اس کے معنی پوچھے سب نے عام معنی کئے کہ "موت دے ہمیں نیکیوں کے ساتھ" شاہ جی نے فرمایا کچھ اور سب نے سکوت اختیار کیا آپ نے فرمایا کہ (پنجابی میں) "تے پوری پاساڈی نال نیکال دے" ہر طرف سبحان اللہ سبحان اللہ کے آواز سے آنے لگے مولانا خیر محمد صاحب نے فرمایا ماشاء اللہ شاہ جی یہ آپ ہی کا حصہ ہے اور آپ نے بالکل لفظی و لغوی اور اس میں مطابقتی معنی بیان فرمائے ہیں پھر در تک تمام حظ اندوز ہوتے رہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر قرآن شریف کے سولہویں پارے میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے وہاں آپ کی مہدی زندگی میں آپ کی معجزانہ زندگی کا ذکر ہے اس گفتگو میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ

و جعلنی نبیا و جعلنی مبارکا ابن ما کنت و اوصیٰنی بالصلوۃ

شاہ جی نے ایک دن اپنے ایک متوسل مولوی یسین صاحب سے پوچھا کہ جانتے ہو "ابن ما کنت" کیوں فرمایا انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

کیا یہ بھی جانتے ہو کہ سارے قرآن میں کسی اور نبی کے ذکر میں بھی یہ ہے اس پڑ بھی انہوں نے نفی کا اظہار کیا پھر آپ نے فرمایا: یہ صرف حضرت عیسیٰ کے ذکر میں ہے اور علت اس تخصیص کی یہ ہے کہ ایک ہی نبی ہے جو زمین پر بھی تھا اور آسمان پر بھی ہے اور پھر زمین پر بھی نزول ہوگا۔ ورنہ ابن ما کنت کا معنوی مقصد فوت ہو جاتا ہے اگر انہیں مردہ تسلیم کر لیا جائے اور سرنگر میں دفن بھی مان لیا جائے جیسا کہ نصرانی وغیرہم کہتے ہیں اور بڑی دلیل یہ ہے کہ جو آگے آیت کے آخر میں ہے "مادمت حیا" جب تک میں زندہ رہوں یہ مسیح علیہ السلام کی حیات کی قوی ترین دلیل ہے۔

شاہ جی رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی مقبولیت عامہ عطا فرمائی تھی کہ اس کی نظیر پچھلی چند صدیوں میں کم از کم نہیں ملتی آپ کے ملنے والوں میں ہمہ قسم لوگ تھے۔ ہر مکتب فکر کے لوگوں کو شاہ جی سے عقیدت تھی اور شاہ جی بھی ان سے مل کر خوشی کا اظہار فرماتے! وہ لوگ شاہ جی کے خلوص اور سادہ عظمت کا اعتراف کر کے حاضر خدمت ہوتے اور خلوص و محبت کے جوہر رولتے اور جھولیاں بھر بھر لے جاتے! شاہ جی کے شیعوں کی ایک مستقل کھیپ



سے سماجی و مجلسی مراسم رہے ہیں ملتان کے قیام میں ایک معتدل شیعہ دوست کی آمد و رفت کثرت سے ہونے لگی۔ دن بہ دن راہ و رسم بڑھتے ہی گئے وہ آتے اور بہانے سے اہل بیت اور اپنے آئمہ کا ذکر چھیڑ دیتے اور شاہ جی کو کریدنے کی کوشش کرتے لیکن حضرت شاہ جی ہمیشہ طرح دے جاتے اور گفتگو کا موضوع ہی بدل دیتے ایک روز وہ محترم حاضر ہوئے اور حسب عادت پھر وہی تذکرہ شروع کر دیا۔ اور اس دن انہوں نے کچھ نیچے انداز سے آیت تطہیر کا سوال کر کے بحث شروع کر دی۔ اور کہا کہ یہ آیت نزول اور حکماً اہل بیت کے بارہ میں ہے اور وہ اس کے حکم سے معصوم و منزہ ہیں حضرت شاہ جی نے اس گتھی کو ضروری خیال کرتے ہوئے یوں حل فرمایا کہ یہ آیت کریمہ ہر نوعیت سے ازواج مطہرات کے حق میں ہے اور سبب نزول بھی صرف انہی کی ذات ہے اور یہ بات ایسے ہی نہیں کہتا۔ اس کا سیاق و سباق اس کی برہمی اہم دلیل کہ یہ آیات صرف امہات المؤمنین کے بارہ میں نازل ہوئیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اہل بیت مراد لئے جائیں تو آپ حضرات کا آئمہ کے متعلق معصومیت کا دعویٰ باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ آیت کے الفاظ ناطق ہیں کہ پہلے ان میں "رجس" تابعہ میں "تطہیر" جس کا پایا جانا پھر طہارت کا ہونا یہ تو شان معصومیت کے منافی ہے۔

بچہ کو معصوم کہنے کی علت اتنی ہے کہ وہ ایک حد تک گناہ کے تصور سے ہی ظاہر و منزہ ہوتا ہے پھر انبیاء کرام کو جو معصوم کہا جاتا ہے تو وہاں بھی یہ حکمت ہے ان کی ذات گرامی پیدا کنی طور پر اس استعداد سے ہی پاک ہوتی ہے۔ اور اگر یہ بات نہ پائی جائے بلکہ رجس کا وجود مان کر پھر تطہیر کا ڈھنڈورہ پیٹا جائے تو یہ سیرے نزدیک کفر ہے کیونکہ انبیاء کے بارے میں تو تصور معصیت ہی باعث دخول نار ہے جب کہ آپ میں سے بعض عنادی لوگ اس بات کے خود معترف ہیں اور یہ اعتراف کہ انبیاء میں استعداد ہوتی ہے اور دلیل میں حضور نبی کریم ﷺ کے بچنے کے سینہ چاک کئے جانے والے واقعہ کو پیش کرتے ہیں اور یہ عصمت انبیاء کی تصنیف ہے یہ سینہ چاک تو نور معرفت کا سبب بنی جو ایام طفولیت میں ہی ظہور پذیر ہو گیا تھا۔ اس پر ان صاحب نے اعتراف کیا کہ اگر یہ ازواج مطہرات کے حق میں ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں رجس تھا۔ شاہ جی نے فرمایا بالکل واضح ہے وہ اور چوٹا اور حیران ہوا کہ نبی کی اہلیہ اور رجس؟ شاہ جی نے پھر تفصیلاً فرمایا کہ ازواج مطہرات اکثر امراء عرب کی لڑکیاں تھیں جو ناز و نعم کی پروردہ تھیں ان کے دلوں میں مال کی محبت تھی اور مال کی محبت ہی سب سے بڑا رجس ہے اور پھر نبی کی بیوی میں رجس باقی رہنے دیا جائے کیوں کر ہو سکتا ہے؟ نبی کا تو مشن ہی مال کی محبت دلوں سے نکالنا اور خدا کی محبت سے دلوں کو روشن اور معور کرنا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کے دلوں سے یہ رجس ایسا خارج کیا کہ پھر آٹھ آٹھ روز تک چہلوں میں روشنی نہ ہوتی! مال کی محبت کو دلوں سے نکالنے کو ہی تطہیر ثابت کرنے کے لئے پھر شاہ جی نے سند آدوسری آیت تلاوت فرمائی۔

خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم و تزکیہم بھا  
 لیجئے ان کے مالوں سے صدقہ تطہیر کیجئے ان کی اور تزکیہ کیجئے ان کا اس کے ساتھ (مال لے کر) معلوم ہوا کہ جب مال کا لینا تزکیہ و تطہیر کا باعث ہو سکتا ہے تو جہاں سرے سے محبت ہی ختم کر دی جائے! اور لفظ اہل بیت کی مراد کو

واضح کرنے کی غرض سے حضرت ابراہیم کے تذکرہ میں ان کی اہلیہ کو خطاب کے وقت کے قرآنی الفاظ سنداً پیش فرمائے

قَالُوا اتعجبیٰ من امر الله رحمت الله و بركاته علیکم اهل البيت  
 کہا انہوں نے (فرشتوں نے) تعجب کرتی ہیں آپ اللہ کے کام پر اللہ کی رحمت اور برکتیں ہیں تم پر (اے) گھر والی۔

اہل بیت سے مراد زوجہ ابراہیم علیہ السلام ہے نہ کہ میرا خاندان ابراہیم۔ وہ شیعہ دوست جھوم جھوم گیا۔ اور پھر جذبات کے دھور میں کہا شاہ جی میں قیامت کے روز اللہ کے سامنے آپ کا دامن پکڑ کر کموں گا کہ اے اللہ انہوں نے ہماری برادری کو سیدھی راہ نہ دکھائی ورنہ یہ سب کچھ کر سکتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ہدایت و صلاحت کسی کے بس کا روگ ہی نہیں جبکہ باری عزاسمہ نے خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی کو ارشاد فرمایا  
 نک لاتھدی منی احببت و لکن الله یھدی من یشاء



پروفیسر شاہد محمود کاشمیری

## ہے نگاہوں میں روئے نورانی

شاہ صاحب کی ذات کیا کہیے	تھی بہارِ صفات کیا کہیے
وہ گئے، دل کا بوستان اجڑا	دل کی اب واردات کیا کہیے
ہجر کی رات آگئی ایسے	بن گیا دن بھی رات کیا کہیے
ہے نگاہوں میں روئے نورانی	لب پہ ہے ان کی بات کیا کہیے
اے جہانگیر گردشِ حالات!	میری تیغِ مات کیا کہیے
بعد تیرے وطن پہ کیا بیتی	تمہ سے جانِ حیات کیا کہیے
راہبر، راہزن ہوئے ثابت	ٹٹ گئی کائنات کیا کہیے
اپنے اہل وطن کی سازش سے	ہو گئی ہم کو مات کیا کہیے
غیر ممکن ہے غم کے ماروں کی	دردِ غم سے نجات کیا کہیے
ملک میں انتشار ہے ہر سو	اور دشمن کی گھات کیا کہیے

شاہ صاحب کو دے کوئی آواز

جل اٹھے شش جہات کیا کہیے

## باطل کارنگ اُس کے حقائق سے زرد تھا

رخت ہوا جو ہم سے حق آگاہ مرد تھا  
 بنے میں جس کے عشق حقیقی کا درد تھا  
 پھونکی جو حق نے روح حیات دوام کی  
 سرگرم عشق دیں وہیں پل بھر میں سرد تھا  
 حاصل اسے تھیں قرب حضوری کی نعمتیں !  
 عشق رسول میں وہ جو صحرا نورد تھا  
 اللہ رے اس کا زور خطابت رجز صفت  
 اک جذبہ جہاد کہ جوش نبوہ تھا  
 لرزاں دل حریف ، رگ و پے میں کپکپی !  
 باطل کا رنگ اس کے حقائق سے زرد تھا  
 کہتا جسے امیر شریعت ہے اک جہاں  
 اس کے حضور جھکتا ہر اک یزد جرد تھا  
 مرتد پہ اس کے رحمت باری کا ہونزول  
 عشاق ملک و قوم میں محبوب فرد تھا  
 کیا اس کی رزم و بزم کی توصیف ہو فدا  
 " حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا "

اسے کاش! کوئی اللہ کا بندہ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس جمع کرتا تو ہزاروں کتابوں پر  
 ہماری کتاب بنتی (اللہ پاک اپنے کسی بندے کو توفیق دے آمین) یہاں ایک واقعہ نقل کرنا مقصود ہے۔ جس  
 سے حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کا منفرد انداز تبلیغ حاضر جوابی اور برجستہ گوئی کی عجیب مثال سامنے  
 آتی ہے۔ حضرت نے اپنی بیٹھک میں کئی مرتبہ دوران گفتگو فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک آریہ سماجی نے مجھ سے  
 گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ شاہ جی آپ جو یہ کلمہ پڑھتے ہیں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ  
 یہ کلمہ توحید تو نہیں ہے بلکہ یہ تو کلمہ شرک ہے۔ (عیاذ باللہ) ہاں اگر صرف لا الہ الا اللہ  
 ہوتا تو کلمہ توحید تھا۔ لیکن جب محمد رسول اللہ اس میں آگیا تو یہ کلمہ توحید نہ رہا۔

میں نے برجستہ جواب دیا یہ تو تمہارے لئے ہے۔ تم لوگ چونکہ بڑے لوگوں کی پوجا پاٹ شروع کر  
 دیتے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ بزرگ لوگ بھی اللہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے وصاحت کر دی کہ محمد ﷺ اللہ  
 نہیں ہیں بلکہ صرف رسول اللہ ہیں کہیں تم بھی ان کی پوجا نہ شروع کر دو خبیث الذی کفروا میں کافر مسبوت ہو گیا

## "تیری رحلت سے ہوا علم و ادب کا گل چراغ"

اے خطیب ملک و ملت اے امیر ہاکمال  
 کر گیا ہے آج کیوں ملت کو تو وقف ملال  
 ہو گیا وقف خزاں اب سارا عالم بے گماں  
 منسلح فرقت میں تیری ہو گیا سارا جہاں  
 اس جہان سے ایک دن سب نے ہونا ہے فنا  
 خالق کو نہیں کا ارشاد بے شک ہے بجا  
 ملک و ملت کو ہے تیری موت پہ جدمہ عظیم  
 خادم اسلام تھا، تو ملک و ملت کا زعیم  
 یاد کرتی ہی رہے گی تجھ کو اے والا صفات  
 ملت اسلامیہ خدمت تھی ساری حیات  
 روشنی بن کر رہا دنیا میں تو روشن دماغ  
 تیری رحلت سے ہوا علم و ادب کا گل چراغ  
 شرع نبوی کی اطاعت میں تری گزری حیات  
 عالمانِ دین میں مشہور تھا تو ذی صفات  
 رہنمائے قوم تھا تو سید الاحرار تھا  
 جان و دل سے تُو فدائے احمد مختار تھا  
 یک زباں ہو کر رہا ہر بابت میں ثابت قدم  
 تُو نے ہر آلام میں اونچا کیا دیں کا علم  
 عالم اسلام میں زندہ رہے گا تیرا نام  
 مَعد میں تجھ کو ملے گا بالیقین اونچا مقام  
 تیری تربت پر سدا ہو رحمت حق کا نزول  
 یا خدا یہ التجا انور کی ہو جائے قبول

## مجلس احرار اسلام اور مجلس تحفظ ختم نبوت

۱.....۳۸۔ میں مجلس احرار اسلام کے اکابر نے غیر سیاسی ہونے کا فیصلہ کیا۔

ان اکابر مرحومین کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ضمیمہ احرار جناب شیخ حسام الدین صاحب امر کسری۔ مدبر احرار جناب ماسٹر تاج الدین صاحب لدھیانوی۔ رحمتہ اللہ علیہم اجمعین۔

۲.....۳۹۔ میں مجلس احرار اسلام کے زیر اہتمام مہمان میں داراللمین قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چونکہ مجلس احرار اسلام کا شعبہ تبلیغ پہلے کادیان میں تھا۔ اور پاکستان بننے کے بعد جماعت کے اکابر بھی تقسیم ہند کی انتشار کا شکار ہوئے تھے حالات سازگار نہ تھے۔ اپنی پونجی سنبھالنے میں دو سال لگ گئے۔ اور مرزائیوں نے ربوہ میں فرنگی اور مسلم لیگ کی سرپرستی میں کئی سو بیگم زمین حاصل کر کے مرزائیت کا ایک بڑا مرکز قائم کر لیا تھا۔ اس لئے بزرگوں نے دو مرزائیت کئے ربوہ میں یا ربوہ کے آس پاس جگہ حاصل کرنے کے لئے بہت پاتھ پائی مارے مگر مرزائی نواز مسلم لیگ حکومت نے مجلس احرار کی ایک نہ چنے دی۔ تب حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی اپنی نگرانی میں مہمان میں ہی شعبہ تبلیغ کی ابتداء کی گئی یوں داراللمین قائم ہوا جس میں حضرت مولانا محمد حیات صاحب اور حضرت مولانا لال حسین اختر صاحب مجلس احرار کی نظامت میں تعینات کئے گئے کہ یہی بزرگ ختم نبوت، حیات عیسیٰ علیہ السلام، مرزائیت کے موضوعات پر احرار کے مستند اور ماہر مناظر تھے۔ اور انہیں ان موضوعات پر زبردست کمانڈ حاصل تھی۔

۳..... ربوہ میں مرزائیوں نے مرکز بنانے کے بعد انگریز اور مسلم لیگ سے حاصل کئے گئے سرمائے کے بل بوتے پر پاکستان کے گوشے گوشے میں تبلیغ مرزائیت کا جال پھیلا دیا تو مجلس احرار اسلام نے اپنی خداوندی جرات و بسادری شجاعت و بسالت اور بہت و سرفروشی کی روداد رقم کرتے ہوئے ۵۲، ۵۱، ۵۰ میں مرزائیوں کے خلاف بھر پور کام کیا اور ان کے تعاقب میں سندھ اور بلوچستان کے دور دراز علاقوں میں بھی گئے جس کے نتیجے میں ۵۳ میں ختم نبوت کی تحریک جلی تحریک نے جہاں مرزائیت کی کمر توڑ دی وہاں مسلم لیگ حکومت بھی زبردست ہو گئی۔ جسکی پاداش میں مجلس احرار اسلام کو خلاف قانون جماعت قرار دیدیا گیا۔ دفاتر بند، اثاثہ و ریکارڈ ضبط اور اکابر احرار جیل کی کال کوٹھڑیوں میں بند۔

ہم نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

۴..... ایک سال بعد اکابر احرار رہا ہوئے تو پھر آشیانے کے نیکے چنے لگے مگر وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ

تھا۔ کالعدم مجلس احرار اسلام کے اکابر جمع ہوئے اور باہمی طویل مشاورت سے طے پایا کہ مجلس احرار اسلام کا شعبہ تبلیغ تحفظ ختم نبوت تو موجود ہے اسکو نئے سرے سے منظم کیا جائے۔ اور حضرت امیر شریعت کی نگرانی میں احرار کے کار اور دو مرزائیت کا کام وسیع پیمانے پر کیا جائے چنانچہ اس فیصلہ کے بعد شعبہ تبلیغ، تحفظ ختم نبوت

کے نام سے سرگرم ہو گیا۔

۵..... حضرت مولانا محمد علی ہالندہ مرہ رحمہ اللہ مجلس احرار اسلام صوبہ پنجاب کے صدر تھے۔ انہیں اس شعبہ تبلیغ کے حساب کتاب کی نگرانی سپرد کی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت مولانا مرحوم ایک دستور مرتب فرما کے لے آئے۔ جس میں اس شعبہ کو مستقل جماعت کی حیثیت دینے کا اعلان کیا گیا۔ یہ گھر ملی احرار ساتھیوں کے لئے برہمی اذیت ناک تھی۔ مگر ان کے پرکٹے ہوئے تھے۔ احرار خلافت قانون تھی۔ ساتھی کچھ نہ کر سکتے تھے۔ احرار دوہری پالیسی کی زد میں تھے۔ چنانچہ ۵۶ء میں حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی رہائش گاہ پر پانچ روز کی مسلسل کشمکش کے بعد شیخ حسام الدین صاحب، ماسٹر تاج الدین انصاری صاحب اور نواب زاوہ نصر اللہ خان صاحب حضرت مولانا محمد علی ہالندہ مرہ رحمہ اللہ کی احرار سے عدم موافقت اور عدم موافقت سے تنگ آکر الگ ہو گئے اور احرار کے آزاد ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

۵۷ء میں سکندر مرزا..... سازش اور برطانوی و امریکی آکاؤں کی اشیر واد سے برسر اقتدار آیا تو کچھ ماہ کے لئے مجلس احرار اسلام واگزار ہو گئی۔ احرار کے اکابر نے جماعت کا باقاعدہ اجلاس طلب کیا جس میں تمام اکابر و اصاغر شریک ہوئے۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم و مغفور بھی اس موقع پر الگ نہ رہ سکے۔ یاد ماضی اور سنگت کا لطف انہیں ستانے لگا اور وہ پھر انہیں اشارہ پیشہ سر فروشان احرار سے آئے۔ لیکن اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے، کے مصداق ۵۸ء میں ایوب خان مرحوم نے رافضی سکندر مرزا کا ایسا ٹیڈا دیا کہ اس غدار ابن غدار کی "بابی ڈوب گئی اور پھر کبھی نہ ابھر سکی۔

حضرت مولانا محمد علی صاحب رحمہ اللہ چین سے بیٹھنے والے بزرگ نہ تھے۔ جب مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفاتر بھی سیل کر دیئے گئے۔ اور حکومت نے یہ کہ کر سیل کئے کہ یہ تو مجلس احرار کا ذیلی ادارہ ہے۔ تو مولانا مرحوم نے اس کی بحالی کے لئے صوبائی انتظامیہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا جس کے نتیجہ میں طے پایا کہ آپ "تعلیم القرآن" کے نام سے کام کریں اور اپنے "مہیر احراری" ہونے کا ثبوت فراہم کریں۔ آپ کے "کردار" کو دیکھا اور آپ سے "حسن سلوک" کیا جائیگا۔ حضرت مولانا مرحوم نے یہ بات بھٹان لوہاری گیٹ والے دفتر کے ایک کھلے کمرے میں باقاعدہ ایک اجلاس میں کھلے بندوں میں سنائی (لیکن حضرت امیر شریعت کو کبھی نہ سنائی) ایک احرار ورکر (جو بقید حیات ہیں اور آج جمعیت علماء اسلام فضل الرحمن گروپ کے سرگرم رہنما ہیں) کے اعتراض پر حضرت مولانا برہم ہو گئے اور فرمایا اگر اسلام میں قتل جائز ہوتا تو میں تمہیں قتل کر دیتا۔

۵۸ء سے ۶۱ء تک دفتر مجلس تحفظ ختم نبوت مجلس احرار اسلام کے شعبہ تبلیغ ہونے کی وجہ سے ہی سیل رہا۔ ۶۲ء میں جب تمام جماعتیں آزاد ہوئیں تو مجلس احرار اسلام بھی آزاد ہو گئی۔ پابندی اٹھنے کے بعد حضرت علامہ شیخ حسام الدین صاحب نے بھٹان کے اسی دفتر (تحفظ ختم نبوت) کے ایک کمرے میں مجلس احرار اسلام کی تنظیم نو کا اعلان فرمایا۔

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو؟

مجھے یاد ہے وہ ذرا دُورا

۶..... یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ حضرت مولانا محمد علی ہالند حری رحمہ اللہ نے ۵۸ء کے بعد مسلسل یہ بات جلسہ عام میں فرمائی شروع کر دی کہ:-

"سیرا مجلس اخراج اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے میں مجلس تحفظ ختم نبوت کا خادم ہوں۔"

انہیں ان خیالات کے اظہار سے روکا گیا۔ تو وہ برہم ہو گئے۔

گذشتہ کئی برس سے مسلسل بعض ناواقبت اندیش اور ان پڑھ تاریخ نویس ریکارڈ خراب کر رہے ہیں۔ اور اپنی اس تاریخی غلطی پر مسرور بھی ہیں۔ میں نے یہ سطور صرف ریکارڈ کی اصلاح کے لئے لکھ دی ہیں۔ کسی شخص کی توہین ہرگز مطلوب نہیں۔ موضوع اپنی اہمیت کے لحاظ سے مستقل کتاب کا مقتضی ہے اور انصاف چاہتا ہے۔ ہماری گزشتہ تیس برسوں کی خاموشی کو شرافت کی بجائے کمزوری پر محمول کیا گیا اب پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ چشم دید حقائق پر مبنی مستقل کتاب عنقریب شائع کر دی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

## ایمان کی صباحت سے چہرہ تھا درخشندہ

باطل کے مقابل تھا تو حق کا نمائندہ  
 شاید ہو کہیں پیدا تجھ سا کوئی آئندہ  
 دنیائے خطابت میں ہے گونج تری اب تک  
 دنیائے ولایت میں تو زندہ و پائندہ  
 اے سید والا شاں، جینا تھا ترا جینا  
 جینا تو انہی کا ہے جو مر کے رہیں زندہ  
 خورشید کی صورت تھی، اے شاہِ حری ہستی  
 دنیا میں بھی تابندہ، عقبتی میں بھی تابندہ  
 روشن تھا ترا سینہ عرفانِ نبوت سے  
 ایمان کی صباحت سے چہرہ تھا درخشندہ  
 جرأت سے شجاعت سے، محبت سے فراست سے  
 باطل کو کیا تو نے ہر جنگ سے شرمندہ  
 دنیا سے خفا ہو کر دنیا سے جدا ہو کر  
 فردوس میں جا بیٹھا، فردوس کا باشندہ  
 تجھ سے جو تعلق ہے، تجھ سے جو محبت ہے  
 مسلمان کے دل و دیدہ ہیں اس لئے درخشندہ  
 سید سلمان گیلانی

## اُف، آفتاب زیرِ زمیں ہو گیا ہے آج

باطل پہ آج خوف سا طاری نہیں رہا  
 بولا کوئی مجاہد باری نہیں رہا  
 کیا حکم عرشِ فرش پہ جاری نہیں رہا  
 دنیا میں آج شاہ بخاری نہیں رہا  
 محبوبِ بزمِ گوشہ نشین ہو گیا ہے آج  
 اُف آفتاب زیرِ زمیں ہو گیا ہے آج  
 درویشِ تمہ سا کوئی تہہ آسمان نہ تھا  
 تمہ سا بلا مبالغہ قرآن خواں نہیں  
 اسی ادا نہیں ہے کسی کی زباں نہیں  
 واعظ تو بیشمار ہیں جادو بیاں نہیں  
 خوش دل تھے خوش مزاج تھے اور خوش خصال تھے  
 اسلاف کی مثال تھے خود بے مثال تھے  
 اے دلبرِ فصیح و بلیغ و حسین آ  
 نانا کے دینِ پاک کے وارثِ امین آ  
 آنکھوں کے نورِ دل کے سرور و کمین آ  
 تمہ کو تلاش کرتے ہیں اہلِ زمین آ  
 چچا ترے فیوض کا ہے ہند و پاک میں  
 تو کس خیال سے شہا سویا ہے خاک میں  
 جنگل میں کوہسار میں تیری تلاش ہے  
 گلشن میں سبزہ زار میں تیری تلاش ہے  
 ندی میں آبشار میں تیری تلاش ہے  
 بستی میں رہگذار میں تیری تلاش ہے

اے نور چشم، چشم کے تم رُہرو رہو  
 اس بزم کے چراغ رہو، گل کی بُو رہو  
 اے حضرت امیرِ شریعت بتائیے  
 اے رازدارِ سرِ حقیقت بتائیے  
 اے آشنائے راہِ طریقت بتائیے  
 اے پیشوائے اہلِ بصیرت بتائیے  
 تیرے بغیر قوم کو آکر بچائے کون  
 اعلائے حق کے واسطے سب کچھ نہ کون  
 پاکیزہ بچپن اور جوانی بھی طے ہوئی  
 حق گوئی اور فیضِ رسانی بھی طے ہوئی  
 سیلابِ غم کی تیزِ روانی بھی طے ہوئی  
 آخر بغیر منزلِ غائی بھی طے ہوئی  
 اب اس جہاں کی منزلیں آساں خدا کرے  
 جنتِ مقامِ صدقہ خیر الوریٰ کرے  
 اے بے شعور قوم کے معمارِ الوداع  
 اے شاہ اور شاہ کے کردارِ الوداع  
 اعلیٰ عالیشان کے معمارِ الوداع  
 مالی وقار قائدِ احرارِ الوداع  
 اے جانے والی ہستیِ ممتازِ السلام  
 اے حق کی گونجتی ہوئی آوازِ السلام



## شریعتِ نبوی کا ظہور تھا جس سے

وہ اک ستارہ اندھیروں میں نور تھا جس سے  
 شریعتِ نبوی کا ظہور تھا جس سے  
 وہ ایک چاند جو شب کی جبین کا جھومر تھا  
 وہ جس سے چہرہ اہل وفا منور تھا  
 وہ آفتاب کہ جس میں بشارتیں تھیں بہت  
 جلو میں جس کے سر کی ساداتیں تھیں بہت  
 ذرا بلند ہوئی تھی وہ ایک موجِ صدا  
 تمام اثاثہ عہدِ فرنگ ڈوب گیا  
 ذرا سی تند جلی تھی وہ بادِ صرصرِ حق  
 بتانِ کفر کے دل پھٹ گئے جگر ہوئے شق  
 ذرا سی تیز ہوئی تھی چراغِ صدق کی کو  
 قبائے تیرہ شبی کو جلا گیا پرتو  
 ذرا جلال میں آیا تھا فقرِ آگاہی  
 ورق ورق ہوا سب دفترِ شہنشاہی  
 سکندری نے جو مانگا قلندری سے خراج  
 نہ وہ شکوہ فرنگی رہا، نہ تخت نہ تاج  
 لڑی ہے قوم جو برسوں جہادِ نبوی  
 ہوا شکستہ بالآخر جو طوقِ صیادی  
 جو نکل گیا درِ زنداں، جو کٹ گئی زنجیر  
 ہمیں جو خوابِ تمنا کی مل گئی تعبیر  
 جو فکرِ قوم نے پہنا عمل کا جامہ بھی  
 ہے اس میں عزمِ بخاری کا کارنامہ بھی  
 کتابِ راہبری کا بیانِ مجمل ہے  
 ہنوز ناموں کی غرست نا مکمل ہے  
 اٹھیں گے چہرہ ماضی سے پردہ ہائے دقیق  
 موزخوں کو دیانت کی گر ہوئی توفیق  
 ذرا تو لگو تصور میں عہدِ جبرِ فرنگ  
 اڑا اڑا سا وہ رخسارِ حیات کا رنگ

وہ سہمی سہمی فضا، وہ دھواں دھواں ماحول  
 زباں پہ مہرِ خموشی، دلوں پہ غلبہٴ ہول  
 جبیں پہ داغِ غلامی، نظر میں جنبشِ خوف  
 ہمارے چاروں طرف خوں چکاں بلوں کا طوف  
 گھس آئے تھے جو لٹیرے ہماری سرحد میں  
 تمام قوم تھی انکے عتاب کی زد میں  
 ہمارا دین، ہماری شریعتِ اطہر  
 ہماری حکمت و دانش، ہمارے فکر و نظر  
 ہماری دولتِ کردار و سیرت و تہذیب  
 ہمارے علم و ثقافت، ہمارا ذہنِ نبیب  
 ہماری سوچ، ہمارا عمل، ہمارا ضمیر  
 ہمارے پورے تشخص کو کر لیا تھا اسیر  
 میں کیا بتاؤں غلامی کی زندگی کیا ہے  
 بس ایک مرگِ مسلسل ہے، بندگی کیا ہے  
 نظامِ جبر ہر اک اس چھین لیتا ہے  
 دلوں سے دولتِ احساس چھین لیتا ہے  
 یہ عہدِ جبر تھا یا دورِ ننگ و ربوائی  
 کہ دفعتاً اٹھے کچھ لوگ لے کے انگڑائی  
 یہ لوگ شعلہٴ بیاں تھے، یہ لوگ شعلہٴ بھائی  
 مثالِ موجبِ مضطر، مثالِ برقِ تپان

ابن اسیر شریعت سید عطاء الحسن بخاری مدظلہ کے ماہنامہ "لغیب ختم نبوت" اور روزنامہ "خبریں" میں  
 شائع ہونے والے دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی مسائل پر مضامین اور کالموں کا مجموعہ

## دل کی بات

ایک خطیب کی خطابت، ایک ادیب کی ادب طرازیوں اور ایک سچے مسلمان کا دردِ دل! دینِ اسلام پر اپنوں  
 کی "مہربانیوں" اور اغیار کی سازشوں کا توڑ..... "کٹ میں ایک ایک لہجہٴ خبرِ باطل ٹکٹن۔"

عنقریب شائع ہو رہی ہے

بخاری اکیڈمی ملتان۔

## کیا حضرت امیر شریعت نے مجلس احرار اسلام کو ختم کر دیا تھا؟

تاریخ مسخ نہ کریں۔ ریکارڈ درست رکھیں

یہ مضمون دراصل ایک ہنگامی نوعیت کا تھا اور ایک ایسی تحریر کے جواب میں لکھا گیا جو اپنے اندر بہت سی غلط فہمیوں اور شبہات کو لیے ہوئے تھی۔ میں اسے اس تاریخی نمبر میں شائع نہ کرتا اگر ان تاریخی غلطیوں کو ایک مستقل کتاب میں شامل کر کے تاریخ کا حصہ نہ بنایا جاتا۔ چونکہ قارئین کا حلقہ ایک ہی ہے اس لئے تاریخ کا دوسرا پہلو بھی ان کے سامنے رکھنا از بس ضروری ہو گیا۔ آئینہ رو برو ہے۔ (مدیر)

روزنامہ جنگ لاہور ۱۰ ستمبر ۱۹۹۳ء کے "قانون امتناع قادیانیت" ایڈیشن میں ایک مضمون بعنوان "قادیانیت جھوٹے دعویٰ نبوت سے قومی اسمبلی کے تاریخی فیصلوں تک ایک جائزہ۔" شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار کا نام درج نہیں۔ معلوم نہیں یہ کن صاحب نے تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں بعض باتیں تاریخی طور پر غلط شائع ہوئی ہیں۔ جن سے قیام پاکستان کے بعد مجلس احرار اسلام کی پالیسی کے بارے میں غامض ابہام اور شبہات پیدا ہوئے ہیں۔ مضمون نگار لکھتے ہیں۔

۱۹۳۹ء میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجلس احرار اسلام کا اجلاس طلب کیا۔ مجلس احرار اسلام کی سیاسی حیثیت ختم کر دی گئی اور قادیانیت کے مذہب کے لئے مجلس تحفظ ختم نبوت کے نام پر مذہبی پلیٹ فارم تشکیل پایا۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری حسب سابق اس جماعت کے امیر قرار پائے۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا محمد علی چاند حرمی، مولانا لال حسین اختر وغیرہ نے سیاست کو خیر باد کہہ کر تبلیغ عقیدہ ختم نبوت کے کام کو سنبالا۔ بعض دیگر رہنما مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر سیاسی و عملی جدوجہد کے لئے شریک سفر ہو گئے۔ بعض احباب نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔"

۱۹۳۹ء کے اسی اجلاس میں امیر شریعت کی تقریر کا اقتباس بھی نقل کیا گیا ہے کہ  
 "ہم لوگ مجلس تحفظ ختم نبوت کے پلیٹ فارم سے صرف قادیانی سرگرمیوں کو روکنے اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کے لئے اپنی جدوجہد کو سیاسی مفادات سے ہالائے طاق رکھ کر کام کریں گے۔"

مضمون نگار نے ۲۱، ۲۰ اپریل ۵۳ء کو حضرت امیر شریعت کے مکان ملتان میں قائدین احرار کے ایک اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ۛ "اس اجلاس میں فریقین نے دفاتر وغیرہ تقسیم کر لئے۔ اس طرح ۵۴ء میں اس تجویز کی عملی شکل

ظہور میں آئی جس کا اعلان ۱۹۴۹ء میں کر دیا گیا تھا"

مندرجہ بالا اقتباسات میں حقیقت کو نظر انداز کر کے نہ صرف ابہام پیدا کیا گیا بلکہ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے الفاظ میں تحریف بھی کی گئی ہے۔ جن سے دو شبہات واضح طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

- (۱) ۱۹۴۹ء میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجلس احرار اسلام کو ختم کر دیا تھا۔
- (۲) ۱۹۴۹ء میں ہی مجلس تحفظ ختم نبوت کے نام سے نئی مستقل جماعت تشکیل دے دی تھی۔ جس کا انہیں امیر منتخب کر لیا گیا تھا۔

علاوہ ازیں عام قاری کے ذہن میں یقینی طور پر چند سوالات بھی ابھرتے ہیں۔

- ۱۔ اگر مجلس احرار اسلام کی سیاسی حیثیت ختم کر دی گئی تھی تو پھر کوئی حیثیت باقی رکھی گئی تھی؟
- ۲۔ اگر کوئی دوسری حیثیت باقی نہیں رکھی گئی تھی تو پھر سرے سے جماعت کے خاتمے کا اعلان کیوں نہ کر دیا گیا؟

- ۳۔ اگر کوئی حیثیت باقی رکھی گئی تھی تو پھر مجلس تحفظ ختم نبوت کے نام سے نئی جماعت بنانے کا کیا جواز تھا؟

اس مغالطہ و ابہام کی روح فرسا کیفیت سے باہر نکلنے اور اصل حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ہمیں کچھ تفصیل میں جانا ہوگا۔

(۱) ۱۲، ۱۳، ۱۴، جنوری ۱۹۴۹ء کو دہلی دروازہ لاہور میں "دفاع پاکستان احرار کانفرنس" منعقد ہوئی۔ اس موقع پر ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بھی ہوا۔ جس میں ملکی حالات کے تناظر میں مجلس کی آئندہ پالیسی اور حکمت عملی یہ طے کی گئی کہ "مجلس احرار اسلام ملک کی انتخابی سیاست میں حصہ نہیں لے گی۔ مگر ملکی قومی امور میں اپنی رائے ضرور دے گی۔ چونکہ مرزا نیوں نے پاکستان کے اقتدار پر شب خون مارنے کی سازشیں تیز کر دی ہیں۔ اس لئے تبلیغی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کر کے زیادہ طاقت اسی مجاذ پر صرف کی جائے گی۔ مجلس احرار کو قائم رکھا گیا۔ صرف دائرہ کار تبدیل کیا گیا اور مجلس کا شعبہ تبلیغ تحفظ ختم نبوت جو ۱۹۳۵ء میں قادیان میں قائم ہوا تھا اسے فعال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

صاحب مضمون کا تضاد ہی ہمارے موقف کی تائید ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

ۛ "مجلس تحفظ ختم نبوت کا پہلا اجلاس ۵، ۴ ستمبر ۱۹۵۴ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوا جس میں جماعت کے دستور وغیرہ کی تیاری شروع ہوئی۔" (مضمون مذکور)

مزید تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۱۳، دسمبر ۱۹۵۴ء کو مجلس تحفظ ختم نبوت کا پہلا انتخاب ہوا۔ جس میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری امیر، اور مولانا محمد علی جالندھری ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ "(مضمون مذکور)

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ

(۱) ۱۹۴۹ء میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے نام سے کسی مستقل یا الگ جماعت کے قیام کا اعلان نہیں ہوا تھا اور نہ ہی حضرت امیر شریعت اس کے امیر چنے گئے تھے۔

(۲) اس اجلاس میں امیر شریعت نے اپنی تقریر میں "مجلس تحفظ ختم نبوت کے پلیٹ فارم، والا جملہ قطعاً ارشاد نہیں فرمایا یہ صریحاً تحریف ہے۔ امیر شریعت کی تقریر سے قبل محترم شیخ حسام الدین صاحب نے ورکنگ کمیٹی کی منظور کردہ قرار دادیں۔ اجتماع میں پڑھ کر سنائیں۔ جماعت کی پالیسی کے متعلق طویل قرار داد کا یہ حصہ اس ابہام کی وضاحت کرتا ہے۔

۱۴ "مجلس احرار اسلام کے مقاصد میں اسلام کی سربلندی کے ساتھ ساتھ وطن کی آزادی بھی شامل تھی۔ جو قیام پاکستان کے بعد سیاسی طور پر اب پوری ہو چکی ہے۔ لہذا "دفاع پاکستان احرار کانفرنس" کا یہ اجلاس غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کر دینا اپنا ملی فرض سمجھتا ہے۔ کہ آئندہ سے مجلس احرار اپنی سعی و عمل کو مسلمانوں کے دینی عقائد و رسوم کو درست رکھنے کے لئے اور خصوصاً مسئلہ ختم نبوت کی مرکزی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے تبلیغی سرگرمیوں تک محدود رہے گی۔"

امیر شریعت نے اس قرار داد کی تائید کرتے ہوئے فرمایا

۱۵ "بھائی حسام الدین نے آپ کے سامنے جو قرار داد پیش کی ہے وہ مجلس احرار اسلام کی

آئندہ پالیسی کی آئینہ دار ہے" (حیات امیر شریعت، جاناہز مرزا ص ۳۲۵)

اس جملہ میں کہیں بھی مجلس تحفظ ختم نبوت کا ذکر نہیں۔ ۱۹۴۹ء میں مجلس احرار اسلام کے خاتمہ اور مجلس تحفظ ختم نبوت کے قیام کے دعویٰ کو خود مجلس تحفظ ختم نبوت کے پہلے ناظم اعلیٰ مولانا محمد علی جالندھری نے رد فرمایا ہے۔ ۵، ۴ ستمبر ۱۹۵۴ء ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے پہلے اجلاس شوریٰ میں ارکان کے نام ہدایات میں لکھتے ہیں۔

۱۶ "مجلس احرار اسلام نے جب سیاسیات سے ۱۹۴۹ء میں علیحدگی اختیار کی تو مقصد الیکشن سے علیحدگی

تھا۔ لیکن ملکی اور شہری حقوق سے دستبرداری یا حکومت پر جائز نکتہ چینی سے دستبرداری مراد نہ

تھی۔" (تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء جلد دوم صفحہ ۳۸) ترتیب مولانا اللہ وسایا۔

حضرت امیر شریعت کے ذہن میں مجلس احرار اسلام کے وجود کو ختم کر کے کسی نئی جماعت کی

تشکیل کا کوئی پروگرام ہوتا تو وہ درج ذیل خط کہیں نہ لکھتے۔ جو ۲۴ دسمبر ۱۹۵۴ء کو خان گڑھ سے صدر مجلس

احرار اسلام، ماسٹر تاج الدین انصاری کے نام لکھا گیا۔ اس میں مجلس کی آئندہ پالیسی واضح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

”مقتان میں آپ کے اجلاس کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ چند باتیں لکھ دیتا ہوں۔ اگر احباب کو پسند ہوں تو بہتر ہے۔

۱۔ لیگ سے ہماری سیاسی کشمکش ختم ہو چکی ہے۔ اور الیکشن کے ساتھ ہی ختم ہو چکی تھی۔ اس وقت لیگ قوتِ حاکمہ ہے۔ مسلمانوں نے اسے بنایا اور قبول کیا ہے۔ پاکستان نہ صرف مسلم لیگ کا بلکہ کانگریس کا تقسیم پنجاب کے اٹانے کے ساتھ تسلیم کردہ معاملہ ہے، جس پر ”حضورِ برطانیہ“ کی مہر ثبت ہے۔ اس میں صرف مسلم لیگ کو ہدفِ ملامت بنانا آئینِ شرافت سے بعید ہے۔ اگر اچھا کیا تو کانگریس اور لیگ دونوں نے۔ اگر برا کیا تو دونوں نے۔ اب پاکستان بن چکا اور تقسیم پنجاب کو کانگریس نے پیش کر کے مسلمانوں سے پاکستان کی بہت بڑی قیمت ادا کرانی اور کراہی ہے۔ ابھی نہ جانے مسلمانوں کو کب تک سودور سودا کرنا پڑے گا۔

میرری آخری رائے اب بھی یہی ہے کہ ہر مسلمان کو پاکستان کی فلاح و بہبود کی راہیں سوچنی چاہئیں اور اس کے لئے عملی قدم اٹھانا چاہیئے۔ مجلسِ احرار کو ہر نیک کام میں حکومت کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے۔ اور خلافِ شرع کام سے اجتناب! اصلاحِ احوال کے لئے ایک دوسرے سے مل کر ”الدین نصیحتہ“ پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ یہ ارشاد ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا۔

۲۔ ”مجلس کا قیام و بقا بہر حال ایک شرعی امر ہے۔“ تبلیغِ اعتقادِ صحیحہ اور تنقیدِ رسوماتِ قبیحہ، اعلائے کلمۃ الحق، اعلان و بیانِ ختمِ نبوت و اظہارِ فضائلِ صحابہ و اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین، مجلس کے فرائض میں سے ہیں۔ خصوصاً اس دورِ لادینی میں جنسِ انسانی کی تمام مشکلات کے لئے شریعتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ہی بطور حل پیش کرنا ہمارا وہ فریضہ ہے کہ ہمیں اگر دار و رسن تک بھی رسائی ہو جائے تو الحمد للہ! اس لئے مجلس کے قیام و بقا کی بہر حال کوشش رہنی چاہیئے۔

اگر دوستوں کو یہ باتیں معقول و مدلل نظر آئیں تو ان بنیادوں پر آئندہ زندگی کی عمارت استوار کریں۔ ورنہ جیسے ان کی مرضی، میں کسی کی راہ میں حائل نہیں، اب تک گیا ہوں ورنہ مفصل بھی لکھ سکتا تھا۔ غریب الدین سید عطاء اللہ بخاری۔

(حیاتِ امیرِ شریعت، جاناہِ مرزا ص ۳۱۲-۳۱۳)

یہ وہ خط ہے جو قیامِ پاکستان کے بعد حضرت امیرِ شریعت کی وفات تک اور تاحال مجلسِ احرار اسلام کی پالیسی کی بنیاد ہے۔ جس جماعت کے قیام و بقا کو وہ خود ایک ”شرعی امر“ قرار دے رہے ہوں اسے کیسے ختم کر سکتے تھے؟

حضرت امیر شریعت کا ایک اور خط جو انہوں نے مولوی نذیر حسین صاحب مرحوم (ساکن پنوں عاقل، سندھ) کے خط کے جواب میں ۲۵ جون ۱۹۵۱ء کو تحریر کیا، مجلس احرار کی موجودگی اور اس کی پالیسی کا آئینہ دار ہے۔

مولوی صاحب اپنے خط میں حضرت امیر شریعت سے استفسار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:.....  
 ”جمیعت علماء اپنے خدوخال سے پاکستان میں گویا کالعدم ہو گئی ہے۔“ (۱) جبکہ احرار ہر جگہ ماشاء اللہ مشغول کار ہے۔“ ایک سوال جو ہر وقت دل میں چبھتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لیگ سے زیادہ احرار کی نظر میں کوئی بری جماعت نہ تھی۔ اور اب اس جماعت کے متعلق باوجود اس کے کہ ان کے خیالات میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہیں ہوئی، احرار نے اپنی پالیسی اتنی نرم کر دی ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ افہام و تقسیم اور تقنی مقصود ہے نہ کہ اعتراض۔ اب جو کچھ احرار کی پالیسی ہے اس سے تفصیلاً متنبہ فرمائیں۔“

حضرت امیر شریعت نے اسی خط کی پشت پر درج ذیل مختصر جواب تحریر فرمایا۔ (۲)

۳۰ رمضان المبارک، شہر ملتان۔  
 مکرمی و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
 یاد فرمائی کا شکر گزار ہوں۔

رسالہ (۳) تو ان شاء اللہ میرے خط سے پہلے پہنچ چکا ہو گا۔ باقی آپ کی کھٹک تو صحیح ہے، فکر صحیح نہیں۔ تقسیم سے پہلے لیگ کے ساتھ ہمارے بہت سے اختلافات تھے۔ ہم نے قوم کے سامنے اپنا نظریہ پیش کیا، لیگ نے اپنا، قوم نے لیگ سے اتفاق کیا اور لیگ قوت حاکمہ بن گئی۔ مد مقابل پارٹی نہ رہی۔ ہم بہر حال رعایا بن گئے۔ ہم لوگ شروع سے ملکی معاملات کے ساتھ ساتھ کچھ دینی مقاصد بھی رکھتے تھے اور اب تک بفضلہ تعالیٰ رکھتے ہیں۔ موجودہ صورت میں ان دینی مقاصد کو حاصل کرنے کی کوئی اور صورت اگر ہو سکتی ہے تو ارشاد فرمائیں؟ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا، اور اب کسی صورت میں اس کو بدلتا قومی ہلاکت و تباہی ہے۔ اصلاح احوال سے انکار نہیں وہ بھی ہم کر رہے ہیں۔ مگر مخالفت بن کر نہیں۔ موجودہ وقت میں اس فتنہ مرزاہیت کے مقابل میں جو کامیابی

(۱) پاکستان میں جمیعت علماء اسلام ۱۹۵۶ء میں مولانا غلام ٹوٹ ہزاروی نے قائم کی۔ ۴۷ء سے ۵۶ء تک مجلس احرار ہی ان لوگوں کی اسیدوں کا سہارا تھی۔ مولوی نذیر حسین صاحب کا یہ جملہ ”احرار ہر جگہ ماشاء اللہ مشغول کار ہے“ کو دیکھ کر اس وقت و مراب و منبر کے لئے سرمد نور بصیرت ہے۔

(۲) اس خط کا اصل مکس نقیب ختم نبوت کے امیر شریعت نمبر حصہ اول ۱۹۹۲ء کے صفحہ ۷۵، ۷۶ پر شائع ہو چکا ہے۔

(۳) سرمایہ مستقبل ملتان۔ ۱۹۵۱ء مدیر چائین امیر شریعت سید ابومحاورہ ابوذر بخاری۔ زیر اہتمام نادیۃ الادب الاسلامی ملتان۔

ہم کو حاصل ہو رہی ہے وہ باہمی تعاون کا ہی نتیجہ ہے۔ بصورت دیگر "مسکرمے بودن و ہرنگستان زیستن" مشکل ہے۔ روزہ میں یہ مختصر سا جواب عرض خدمت ہے اسے آپ خود ذرا پھیلا کر دیکھیں اور ہماری مشکلات کا اندازہ لگائیں۔ لیگ کی مخالفت فی نفسہ کوئی کار خیر نہ تھا نہ ہے۔ کسی مقصد عالی کے لئے مخالفت و موافقت معنی رکھتی ہے۔ عہد فرنگی میں اختلاف بامعنی تھا۔ اب اتفاق سے ہی اصلاح احوال کی توقع ہو سکتی ہے۔ ورنہ سرخ پوش، انجمن وطن اور دوسری جماعتیں کمال تک اپنے مقاصد میں کامیاب ہو رہی ہیں۔ فافہم و تہ۔ بز۔ والسلام مع الاکرام

دعا گو غریب الدیار

سید عطاء اللہ بخاری

اسی طرح نومبر ۱۹۵۰ء میں کل پاکستان تحفظ ختم نبوت احرار کانفرنس ملتان کے اجلاس میں حضرت امیر شریعت نے اپنے خطبہ صدارت میں مجلس احرار اسلام کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

ہم "بعض لوگ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مجلس احرار اسلام چونکہ الیکشن بازی سے الگ ہو گئی ہے لہذا اب اسے ملکی معاملات میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں رہی۔

گویا ان کا مطلب ہے کہ ہم لوگ مرچکے نہیں۔ یا ہم نے ملک چھوڑ دیا ہے! نہیں اور ہرگز ایسا نہیں۔ یہ ان کی ناتمام خواہش تو ہو سکتی ہے حقیقت نہیں۔

احرار کا وجود اور کردار تاریخ کی بہت بڑی صداقت ہے۔ سیاست افرنک کے فریب خوردہ اسیر سن لیں!

ہم نے اپنے ملک اور اپنے حقوق سے قطعاً کنارہ کشی نہیں کی۔ کوئی شریف انسان ایسا نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے حقوق شہریت زائل کر دے۔ پاکستان ہمارا ملک ہے اس میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے یہاں رہنا ہے۔ بات کرنا ہے، صبح راستہ دکھانا ہے اور غلط روی پر ٹوکنا

ہے۔ گرد و پیش کے مسائل و حالات سے ہم چشم پوشی کر سکتے ہیں نہ لالعلق رہ سکتے ہیں۔ اس ملک کی تعمیر میں ہمارا خون پیونہ ہے۔ ہمیں تمام ملکی معاملات پر اپنی رائے کا بڑا اظہار کرنا ہے۔ سیاست اور معیشت و تجارت میں حصہ لینا ہے اور ملازمتوں میں اپنا حق بھی وصول کرنا ہے۔ ہمارے بچوں نے ہمیں تعلیم حاصل کرنی ہے۔ اور تعلیم کے بعد ملازمت بھی ان کا بنیادی حق ہے۔ ملکی معاملات میں ہمارا بھی اتنا ہی دخل ہو گا جتنا اور کسی کو دعوئی ہو سکتا ہے۔ ہم اپنا حق شہریت پورا پورا استعمال کریں گے اور کسی قیمت اس سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

قائد احرار کا نہیں ہے۔ ہم نے صرف جدوجہد کا رخ بدلا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ سول نافرمانی، ڈائریکٹ ایکشن یا الیکشن کے ذریعے ہی اپنے حقوق حاصل کئے جائیں۔ اور بہت سے



معقول ذرائع سے بھی یہ حقوق حاصل ہو سکتے ہیں۔ مجلس احرار اسلام کو اب ملکی سیاست میں نئی حکمت عملی کے ساتھ ایک فعال کردار ادا کرنا ہے۔“

مندرجہ بالا دونوں خطوط اور خطبہ صدارت کے اقتباس سے یہ بات الم نشرح ہو جاتی ہے کہ حضرت امیر شریعت نے مجلس احرار اسلام کا وجود ختم نہیں کیا تھا بلکہ مجلس احرار اسلام کو ایک نئی حکمت عملی سے آشنا کر کے مابین ان کارزار میں رواں دواں کر دیا تھا۔

روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والے اسی زیر بحث مضمون میں ۱۹۳۹ء کے بعد مجلس احرار اسلام کا وجود اور تحریک تحفظ ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں اسکا کردار کتبیں نظر نہیں آتا جو کہ تاریخ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ بعض واقعات جن کا تعلق براہ راست مجلس احرار سے ہے۔ نہ معلوم وہ تمام کے تمام مضمون مذکور میں مجلس تحفظ ختم نبوت سے کیسے منسوب ہو گئے۔

مثلاً

۴۹ء میں قادیانیت کے خلاف جلسوں کا انعقاد

۵۰ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قادیانی امیدواروں کے خلاف جلسے اور ان کی عبرتناک شکست۔

لاہور اور سیالکوٹ میں قادیانیوں کی کانفرنسوں کو ناکام بنانا

پشاور یونیورسٹی میں قادیانیوں کے جلسے کو مسلمانوں کے جلسے میں تبدیل کرنا۔

۱۷-۱۸-۵۲ء کو کراچی میں سر ظفر اللہ کے جلسے کو درہم برہم کرنا۔

۲ جون ۵۲ء کے اجلاس کراچی میں تشکیل پانے والے علماء کے بورڈ کی طرف سے آل مسلم پارٹیز کنونشن کی ذمہ داری قبول کرنے اور ۱۳ جولائی ۵۲ء کو بورڈ کی طرف سے کنونشن کا فیصلہ کرنے کے بعد جماعتوں کو دعوت نامے جاری کرنا۔

۳۱ دسمبر ۵۲ء کی رات چنیوٹ کا جلسہ اور اسمیں حضرت امیر شریعت کی تقریر، مرزا محمود احمد کی دھمکی کہ ۵۲ احمدیوں کا سال ہے ۳۱ دسمبر کو چنیوٹ کے اسی جلسے میں حضرت امیر شریعت کا جواب دینا کہ ۵۳ء شروع ہو گیا ہے۔ اور یہ مجلس تحفظ ختم نبوت کا سال ہے۔

۵۳ء میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفاتر سیل ہونا؟

✽ حالانکہ اس دور کے تمام اخبارات اور دفتری دستاویزات (جو راقم کے پاس موجود ہیں)

اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ یہ تمام کارروائیاں مجلس احرار اسلام نے کیں۔ یہاں بھی حضرت امیر شریعت کی تقریر کے جلسے میں تحریک ختم نبوت کے روح رواں تھے۔ مجلس احرار ہی اس تحریک میں داعی جماعت تھی۔ اور کارکن ہی تحریک تحفظ ختم نبوت کے ہی سیل ہوئے تھے۔ احرار کی دعوت پر تمام کتاب نگار کے علماء کراچی میں اکٹھے ہوئے دفاتر بھی احرار کے ہی سیل ہوئے تھے۔

تھے۔ اور آل پارٹیز مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی تشکیل ہوئی تھی۔

۱۳ جولائی ۵۲ء کو برکت علی حال لاہور میں آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقد ہوا۔ اس کا دعوت نامہ مولانا غلام غوث ہزاروی نے جاری کیا۔ تب وہ مجلس احرار اسلام میں ہی شامل تھے۔ اس دعوت نامہ پر تمام مکاتب فکر کے علماء کے دستخطوں کے علاوہ مولانا محمد علی مائدہ حری کے بحیثیت ناظم اعلیٰ مجلس احرار اسلام پنجاب دستخط ثبت تھے۔

۱۳ جون ۵۵ء کو لائل پور میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے اجلاس سے حضرت امیر شریعت نے خطاب کر کے ہوئے فرمایا۔

۱۹۳۵ء میں مجلس احرار کا شعبہ تبلیغ قائم ہوا۔ جس کا تعلق ملک کے سیاسی معاملات سے نہیں تھا۔ (حیات امیر شریعت، جاناہ مرزا، صفحہ ۱۰۰۰)

یعنی اس شعبہ کا روز اول سے سیاسی معاملات کے ساتھ تعلق نہیں تھا۔ سیاسی معاملات کے لئے مجلس احرار اسلام کے سٹیج پر ہی کام ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں بھی اسی پالیسی کی تجدید اور اعادہ کیا گیا جو ۳۵ء میں طے ہوئی تھی۔ مجلس تحفظ ختم نبوت کے ایک اور بانی رہنما مولانا تاج محمود نے ۲۸، ۲۹، اکتوبر ۱۹۶۳ء کو احرار کانفرنس لائل پور میں جو تقریر کی اسے بعض اخبارات نے اس سرخی کے ساتھ شائع کیا۔

"مجلس احرار اسلام کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں"

چنانچہ مولانا تاج محمود نے اس کی تردید کرتے ہوئے یہ بیان جاری کیا۔

"میں اس خبر کی تردید کرتا ہوں۔  
میری تقریر کا اصل فقرہ یوں ہے۔

"موجودہ سیاسیات، جس سے ملکی تخریب کا پہلو نکلتا ہو، مجلس احرار اسلام کا اس سیاست سے کوئی تعلق نہیں" (ماہنامہ تبصرہ، لاہور دسمبر ۱۹۶۳ء)

۱۸ اگست ۵۸ء کو حکومت نے مجلس احرار سے پابندی اٹھانے کا اعلان کیا تو ان دنوں مجلس کے دو ریزی رہنما شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین (جو ۵۶ء میں سہروردی کی عوامی لیگ میں چلے گئے تھے) واپس احرار میں آچکے تھے۔

چنانچہ ۵ ستمبر ۵۸ء کو ملتان میں مجلس احرار اسلام کے نئے دفتر (واقع چمڑا مارکیٹ گھنڈہ گھر) کا افتتاح ہوا۔ جماعت کی بحالی پر ہزاروں احرار کارکنوں نے سرخ وردیوں میں لمبوس ہو کر مارچ پاسٹ کیا اور حضرت امیر شریعت کو سلامی دی، ماسٹر تاج الدین انصاری بھی اس موقع پر موجود تھے۔ امیر شریعت سرخ قمیض پہن کر آئے تھے اور بازو پر جماعت کا بیج آویزاں تھا اس پر لکھا تھا "مجلس احرار اسلام" یہ قمیض اور بیج یادگار کے طور پر آج بھی راقم کے پاس محفوظ ہے۔

حضرت امیر شریعت کے ایک خادم خاص مولانا محمد یسین (موجودہ نائب مہتمم جامعہ قاسم العلوم ملتان) نے اس جملے کے حوالے سے راقم کو بتایا کہ



خدمت کے لئے متعہ ہیں (روزنامہ آزاد لاہور یکم ستمبر ۵۸)

درج بالا تاریخی حقائق و شواہد کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔..... مجلس احرار اسلام نے ۴۹ء میں انتخابی سیاست سے دستبرداری اور تبلیغی سرگرمیوں خصوصاً مسئلہ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے احرار کے شعبہ تبلیغ کو مضبوط اور فعال کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجالس احرار کو ختم کرنے کا اعلان نہیں ہوا۔

۲۔..... اپریل ۵۰ء میں مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس مرکزی دفتر لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں مولانا محمد علی جالندھری، بحیثیت ناظم اعلیٰ مجلس احرار اسلام پنجاب شریک ہوئے۔ اجلاس میں جماعت کی تنظیم اور تبلیغی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا۔

۳۔..... ۵۰ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی طرف سے چھ قادیانی امیدواروں کو ٹکٹ دینے پر مجلس احرار اسلام نے مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا۔ اور ۴۹ء کی پالیسی پر غور و خوض کے بعد درج ذیل پریس بیان جاری کیا۔

”مجلس احرار اسلام براہ راست سیاسیات میں دخل نہیں اور نہ ہی وہ الیکشن میں حصہ لینا پسند کرتی ہے۔ لیکن مسلم لیگ نے مرزائیوں کو ٹکٹ دیئے ہیں اب مجلس احرار اسلام ان کا مقابلہ کرنا اپنا دینی فرض سمجھتی ہے۔ (حیات امیر شریعت، جاناہز مرزا صفحہ ۳۲۴)

۴۔..... ۵۰ء کے انتخابات میں تمام قادیانی لیگی امیدواروں کو مجلس احرار اسلام کی مہم کے نتیجے میں ہی عبرتناک شکست ہوئی۔ مجلس احرار نے اپنی کامیابی پر لاہور میں یوم تشکر منایا۔ حضرت امیر شریعت نے اس جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے احرار کارکنوں کو خراج تحسین پیش کیا اور محاسبہ مرزائیت کی مہم کو تیز تر کرنے کی ہدایت فرمائی۔

۵۔..... جولائی ۵۰ء میں مجلس عاملہ کا دوسرا اجلاس ملتان میں حضرت امیر شریعت کی اقامت گاہ پر منعقد ہوا اور تین ارکان پر مشتمل دستور کمیٹی تشکیل دی گئی۔

۱۔ مولانا غلام غوث ہزاروی

۲۔ ماسٹر تاج الدین انصاری

۳۔ سید ابومعاویہ ابوذر بخاری

۶۔..... ۲۵ نومبر ۵۱ء کو اوکاڑہ میں مجلس عاملہ کا تیسرا اجلاس ہوا جس میں مولانا محمد علی جالندھری نے اپنا مرتبہ دستور مجلس احرار اسلام منظور کرایا۔ جبکہ جماعت کو انتشار سے بچانے کے لئے سید ابومعاویہ ابوذر بخاری مدظلہ نے اپنا مرتبہ مسودہ دستور مولانا کی مخالفت کی۔ جب سے رضا کارانہ طور پر واپس لے لیا۔

۷۔..... ۵۲ء میں کراچی میں تمام مکاتب فکر کے علماء کا اجلاس مجلس احرار نے بلایا اور آل پارٹیز مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی تشکیل ہوئی۔ مولانا محمد علی جالندھری مجلس احرار اسلام کی نمائندگی کرتے ہوئے اس اجلاس

میں شریک ہوئے اور اسی حیثیت میں دستخط کئے۔

۸۔..... مولانا محمد علی جالندھری مجلس تحفظ ختم نبوت کے قیام ۱۹۵۳ء تک مجلس احرار اسلام سے ہی وابستہ رہے۔

۹۔..... ۵۲ء میں تمام مکاتب فکر کے نمائندہ ۳۳ علماء کے اجلاس منعقدہ کراچی میں بھی مولانا محمد علی جالندھری نے مجلس احرار اسلام کی نمائندگی کی۔ اس اجلاس میں علماء نے متفقہ طور پر ۲۳ نکات (اسلامی مملکت کے بنیادی اصول) مرتب کئے۔ ۲۳ واں نکتہ جو مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے سے متعلق تھا، جانشین امیر شریعت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری کی کوششوں سے مجلس احرار کی تجویز کے طور پر منظور ہوا۔ انہوں نے مولانا بخش سومرو کی کوٹھی پر سید سلیمان ندوی مرحوم سے ملاقات کر کے اس نکتہ کی منظوری کئے انہیں قائل کیا۔ حضرت بخاری کے بقول مولانا ندوی نے فرمایا کہ ”۲۳ نکات میں اقلیتوں سے متعلق بات تو آگئی ہے“ اس پر میں نے عرض کیا کہ حضرت تمام لوگ سلیمان ندوی نہیں کہ بات سمجھ لیں۔ ۲۳ واں نکتہ قرار دہ اقلیت کے طور پر علیحدہ درج کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ مولانا مان گئے۔ اس موقع پر مولانا محمد علی جالندھری احرار کے نمائندہ کی حیثیت سے بطور مشیر حضرت بخاری کے ہمراہ تھے۔

۱۰۔..... مارچ ۵۳ء میں تحریک تحفظ ختم نبوت کے سبب مجلس احرار خلاف قانون قرار دے دی گئی۔

۱۱۔..... جسٹس منیر کے تحقیقاتی کمیشن میں مجلس احرار نے بھی اپنا بیان دیا۔ حضرت امیر شریعت کا الگ بیان احرار کے مرکزی رہنماء کی حیثیت میں عدالت کے ریکارڈ پر آیا۔

۱۲۔..... ۱۸ اگست ۵۸ء کو مجلس احرار سے پابندی اٹھائی گئی۔

۱۳۔..... ۲۵ ستمبر ۵۸ء کو مئتان میں مجلس عالمہ کے اجلاس میں سیاسیات میں دوبارہ شرکیت کی قرار داد منظور ہوئی۔

۱۴۔..... ۲۸ ستمبر ۵۸ء کو دارالعلوم تقوۃ الاسلام شنیش محل روڈ لاہور کے وسیع حال میں احرار و مرکز کنوینشن ہوا اور ۲۵ ستمبر کی قرار داد کی عمومی تائید بھی حاصل کر لی گئی۔ شیخ حسام الدین صاحب کو مجلس احرار کا کنوینٹنٹ کیا گیا مگر ایک ماہ اکیس دن بعد ۱۸ اکتوبر ۵۸ء کو ایوب خان نے مارشل لا نافذ کر دیا اور جماعت پھر خلاف قانون قرار دے دی گئی۔

۱۵۔..... ۱۶ جولائی ۶۲ء کو ایوب خان نے سیاسی پابندیاں ختم کیں تو جماعت پھر بحال ہو گئی۔

۱۶۔..... ۲۳ جولائی ۶۲ء کو مئتان میں مجلس عالمہ کا اجلاس شیخ حسام الدین کنوینر مجلس احرار کی صدارت میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر میں ہوا اور تنظیم نو کا اعلان کیا گیا۔

۱۷۔..... ۳۰ اگست ۶۲ء کو لاہور مرکزی دفتر میں مجلس مشاورت کے ذریعے نئے دستور کی منظوری تک عارضی طور پر نظم جماعت چلانے کے لئے سات رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس میں سید ابو معاویہ ابوذر بخاری اور

مولانا تاج محمود بھی شامل تھے۔

۱۸۔ ..... ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۲ء تک جماعت دو مرتبہ خلافت قانون ہوئی۔ اس پابندی کی مجموعی مدت تقریباً دس سال بنتی ہے۔ ظاہر ہے ان دس برسوں میں احرار جیسی فعال جماعت کے رہنما اور کارکن خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء کے فیصلہ کے مطابق شعبہ تبلیغ تحفظ ختم نبوت کے نام سے کام کیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں اسی شعبہ کو مارشل لائی ممبریوں کی بناء پر مجلس تحفظ ختم نبوت کا نام دے دیا گیا۔ اور اسی عنوان سے احرار کارکن جدوجہد میں مصروف رہے۔ مجلس تحفظ ختم نبوت اپنے باقاعدہ قیام کے بعد بھی احرار کا شعبہ تبلیغ ہی تھی۔ صرف نظام اور دفاتر علیحدہ کئے گئے تھے۔

۱۹۔ ..... ۱۹۶۲ء میں مجلس احرار اسلام کی قیادت جانشین امیر شریعت حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ کو سونپی گئی تو پھر مجلس تحفظ ختم نبوت احرار سے مستقل طور پر علیحدہ ہو گئی۔  
مندرجہ بالا تاریخی حقائق کی روشنی میں فاضل مضمون نگار کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ تاریخ مسخ نہ کریں اور ریکارڈ درست رکھیں۔ ورنہ حقائق منظر عام پر آنے سے گڑے مردے اکھڑیں گے۔ جس کی ذمہ داری بہر حال انہیں پر ہوگی۔

مجلس احرار اسلام نے اپنے شاندار ماضی کی روایات کو برقرار رکھا ہے۔ اور ۱۹۷۴ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت سے لیکر ۱۹۸۴ء کے امتناع قادیانیت آرڈینینس کے اجراء تک اس کا کردار کسی جماعت سے کسی سم، حیثیت میں کم نہیں۔ جان کی شہادت بھی دی ہے اور وقت و مال کا ایشار بھی کیا ہے۔

اور پھر یہ شرف بھی اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے مجلس احرار اسلام ہی کو بخشا کہ ۱۹۷۴ء میں فرزند ان امیر شریعت نے ربوہ میں مسجد کے لئے زمین خریدی اور فروری ۱۹۷۶ء کو حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ نے ربوہ میں مسلمانوں کی پہلی جامع مسجد، "مسجد احرار" کا سنگ بنیاد رکھ کر حضرت امیر شریعت کی آرزو کو پورا کر دیا اور ان کی روح کو لکھن پھنچائی۔

عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ کسی ایک ادارے کا نہیں بلکہ سب مسلمانوں کا مشترکہ فریضہ ہے۔ اس جہاد میں سب مسلمانوں اور دینی جماعتوں نے جب توفیق حصہ لیا۔ مگر مجلس احرار اسلام کا کردار مضی اللہ کے فضل و کرم سے قائد نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ سب کی منت قبول و منظور فرمائے اور امت کو اتحاد و اتفاق کی نعمت سے سرفراز کرے (آمین) میں اس مضمون کو حضرت امیر شریعت کی تقریر کے اس اقتباس پر ختم کرتا ہوں جو ان تمام تاریخی تعریفیات اور مغالطہ آرائیوں پر برہان قاطع ہے،

"خواہ ساری دنیا مجھے چھوڑ جائے، میں مجلس احرار اسلام کا علم بلند رکھوں گا۔ حتیٰ کہ جب میں مر جاؤں تو میری قبر پر بھی یہ سرخ پھریرا ہر اتار ہے گا۔"

(خطبہ صدارت، حضرت مولانا عبید اللہ انور رحمہ اللہ، جلسہ بیاد حضرت امیر شریعت، ۳۰ اگست



(۱۹۶۲ء لاہور)

## کجلا گیا ماحول کا متاب بہاراں

رشید کمال

سینے میں دھواں بن گیا سرمایہ اٹکار  
اور روح ہوئی صدمہ جائگاہ سے اٹکار  
اس رنج پہ دل تفتہ نہیں چند کہ دوچار  
اجڑا ہے کچھ اس رنگ سے تہذیب کا دربار  
ویران ہوا علم و فضیلت کا چمن زار  
ہاں بُجھ گیا اک مہر درخشندہ و صنوبر بار  
میدان ونا میں کوئی چلتی ہوئی تلوار  
توڑا ہے تدبیر نے بڑے کفر کا پندار  
اک جوش تھا اک ولولہ تازہ و بیدار  
گرہا ہے کبھی حق کی حمایت میں سردار  
لب بستہ مگر آج ہے وہ لفظ فصول کار  
اک عمر فریگی سے رہا برسر پیکار!  
تھے بادۂ عرفاں سے دل و جاں ترے سرشار  
دیوار کہیں تھی کوئی سایہ دیوار  
کھتی تھی تری چشم مروت کرم آثار  
پاکیزہ خیالات تھے آئینہ کردار  
احباب ثنا خواں ترے دشمن تھے پرستار  
آساں تھی ترے عزم کو ہر منزل دشوار  
تھا عاجز و مجبور کا تو ہمد و غم خوار  
یہ بات سمجھتے ہیں کہاں خوار و زبوں کار  
صد حیف کہ ہے تیز بہت وقت کی رفتار  
آتے ہیں نظر روتے ہوئے کوچ و بازار

ناگاہ یہ کس نے خبر مرگ سنائی  
بے ساختہ آنکھوں سے ٹپکنے لگے آنسو  
گیاں ہے تیری مرگ پہ اک عالم اسلام  
موس ہوا چمن گئی ہم سے بڑی دولت  
کجلا گیا ماحول کا متاب بہاراں  
ہاں لٹ گیا گموارہٴ تقرر و خطابت  
تقرر تھی تیری کہ حریفان وفا پر  
ٹھہری نہ ترے سامنے باطل کی حقیقت  
تقرر تھی تیری کہ مہمان وطن کو  
چھیڑا کبھی توحید کا نغمہ سر منبر  
برساتی کبھی آگ کبھی پھول بکھیرے  
اک عرصہ اٹھائے ہیں دل و جاں پہ مصائب  
رقصاں تھی لمبو میں ترے ایماں کی حرارت  
تو ایسے مقاموں سے بھی گزرا ہے جنوں میں  
سینے میں مسور تھی تیرے شمعِ محبت  
آئینہ کردار تھے پاکیزہ خیالات  
سب تیرے یہ عادات و خصائل کا اثر تھا  
اس بات کی شاید تیری خندہ جبینی  
پہلو میں دھڑکتا تھا ترے درد بھرا دل  
انسان کو انسان سمجھنا ہے بڑی بات  
دم لینے نہیں دیتی مگر گردشِ دوراں  
اٹھتی ہیں یہ بھیگی ہوئی آنکھیں کسی جانب

افسردہ ترے غم میں ہیں بام و در و دیوار  
فطرت نے تراشا تھا فقط ایک ہی شکار  
مفوظ نہیں دامِ اجل سے کوئی جاندار  
اس رہ سے گزرنا ہے ہر اک شمس کو اکبار  
موس یہ ہوتا ہے کہ ہے زندہ و بیدار  
ہوتا نہیں الفاظ میں جذبات کا اظہار  
اور سایہ گلنِ تمہ پہ رہے رحمتِ بخار

ہر گوشہ کونین پہ سکتے سا ہے طاری  
تاریخ میں ایسا نہ خطیب اور اٹھے گا  
اس پختہ حقیقت سے مگر کس کو مفر ہے  
ادنیٰ ہو کہ اعلیٰ ہو ولی ہو کہ پیسبر  
دل دکھتا ہے لیکن تری رحلت کی خبر پر  
کچھ آہوں میں شامل ہے کچھ انگلوں میں ترا غم  
آباد رہے گوشہ فردوس میں تاحضر



### یکتائے روزگار بخاری بھی چل بے

دنیا ہے سوغوار بخاری بھی چل بے  
یکتائے روزگار بخاری بھی چل بے۔  
ملت کے جاں نثار بخاری بھی چل بے  
رنگِ گل و بہار بخاری بھی چل بے  
گیاں تھے برگ و بار بخاری بھی چل بے  
اُڑتی تری بہار بخاری بھی چل بے  
وہ شیرِ مرغزار بخاری بھی چل بے  
خنداں تھے زیرِ دار بخاری بھی چل بے  
قائد و شہسوار بخاری بھی چل بے  
الفت کے رازدار بخاری بھی چل بے  
ہدایت کے شاہکار بخاری بھی چل بے  
ہائے وہ شعلہ باز بخاری بھی چل بے

آئینیں ہیں اکبار بخاری بھی چل بے  
جادو اثرِ خطیب و شعلہ نوا خطیب  
یوباک حق پسند مہ وطنِ خطیب  
آزاد زیبِ صحنِ گلستانِ ایشیا  
ظاہر پرست آنکھ نے شبنمِ سبھ لیا  
اے بوستانِ فکر و عمل بزمِ شاعری  
وختِ فزائے آہوئے افرونگ جس کی ذات  
جورِ فرنگِ گردشِ ایام کے اسیر  
صدرِ نظامِ مجلسِ احرار بالقصود  
جن کا ضمیر فیضِ نبوت سے مستنیر  
گیاں فلک، ملائمہ نومہ کتاںِ زمیں  
جراتِ شکن تھے زاوے جس کی نگاہ کے

سالم زبانِ شعر میں کیے ادا کروں

مذہب کے عسکار بخاری بھی چل بے  
سالم ربانی (میاں چمن)



## سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا محمد الیاس دہلوی

بانی تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی رحمہ اللہ کا شمار برصغیر کی نامور دینی ہستیوں میں ہوتا ہے۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ اور ان کے درمیان تعلقات کی نوعیت محض اخلاص اور للہیت پر مبنی تھی۔ حضرت مولانا اور شاہ جی کی بہت سی ملاقاتیں ہیں۔ ان ملاقاتوں اور مجلسوں میں علم و عرفان کے کیا کیا موتی بکھرے گئے اور کتنے لوگوں نے ان سے استفادہ کر کے اپنے قلوب و اذہان کو منور کیا، کاش انہیں کوئی محفوظ کرتا اور ان لعل و جواہر سے آج ہم اپنا دامن بھر لیتے۔ حضرت شاہ جی رحمہ اللہ کی تمام زندگی تبلیغ دین کے لئے سفر اور کافرو مشرک نصرانی حکمرانوں کے خلاف جدوجہد اور اس کی پاداش میں قید و بند میں گزر گئی۔ انہیں اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ اپنی یادداشتیں صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے۔ شاہ جی فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنی زندگی میں جن لوگوں کی کیفیت نماز سے بہت زیادہ متاثر ہوا ان میں تین شخصیتیں سرفہرست ہیں، مولانا محمد الیاس دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہم !

ہماری خوش قسمتی ہے کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایسے اکابر کو اللہ تعالیٰ نے قلم و قرطاس کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ اور ہر دو حضرات ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہوں نے ان اکابر کو دیکھا اور ان کی مجالس میں شریک ہو کر کسب فیض کیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی رحمہ اللہ کی سوانح میں شاہ جی اور مولانا محمد الیاس کے تعلق کے حوالے سے "دعوت کا انہماک" کے زیر عنوان مولانا محمد منظور نعمانی کی جو روایت نقل کی ہے ذیل میں۔ وہ ہدیہ قارئین کی جارہی ہے۔ (مدیر)

### دعوت کا انہماک

یہاں چند واقعات مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان" کی روایت اور حوالہ سے نقل کئے جاتے جن سے اس شدت خلالت میں بھی اپنے کام میں مولانا کی یکسوئی اور کامل انہماک و استغراق کا اندازہ ہوگا (۱) "اپریل کے آخری ہفتہ میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری زیارت اور مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے۔ اس سے دو دن پہلے حضرت پر نہایت سخت دورہ پڑ چکا تھا۔ جس کی وجہ سے ضعف بے حد ہو گیا تھا کہ دو چار منٹ بھی بات کرنے کی سکت نہ تھی۔ شاہ جی کی خبر سن کر اس ناچیز کو طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا مجھے ان سے باتیں ضروری کرنی ہیں لیکن صورت یہ ہو گی کہ تم اپنے کان میرے منہ کے قریب کر دینا اور میں جو کہوں وہ ان سے کہتے جانا۔ چنانچہ جب شاہ جی اندر بلائے گئے تو بات شروع تو مجھ ہی سے فرمائی لیکن دو تین ہی



## احرار تبلیغ کانفرنس کا دیان اور روزنامہ زمیندار کی ریکارڈ فروخت

اور خواجہ عبدالرحیم عاجز کی نظم

اکتوبر ۱۹۳۴ء میں قادیان میں سہ روزہ احرار تبلیغ کانفرنس منعقد ہوئی تو قادیانیت کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا۔ آنہانی موسیو مرزا بشیر الدین اور مسٹر ظفر اللہ آنہانی و انسراٹے ہند کے دربار میں حاضر ہوئے اور کورنش بجالائے۔ ان دونوں نے متیں سنا جتیں کہ کانفرنس پر پابندی لگوانے کی بھرپور کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ انگریز حکومت نے قادیان میں مجوزہ جلسہ گاہ میں دفعہ ۱۳۴ کے تحت اجتماع منعقد کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ احرار رہنماؤں نے حدود قادیان سے باہر جلسہ گاہ تجویز کرنی اور ایک مقامی سکھ کی اس پیشکش کو قبول کر لیا کہ اس کی زمین پر کانفرنس کا پنڈال بنائیں۔ چنانچہ اسی جگہ کانفرنس منعقد ہوئی اور ہندوستان بھر سے لاکھوں مسلمان جوق در جوق کانفرنس میں شریک ہوئے۔

کانفرنس میں جن اہم رہنماؤں نے شرکت فرمائی ان میں مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالوفا شاہجہان پوری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جناب جودھری نذیر احمد صاحب (ساکن ساہیوال) کی روایت کے مطابق وہ کانفرنس میں شریک تھے۔ اور حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر عروج پر تھی۔ قادیانیت اور انگریزی اقتدار کے نئے ادھیر رہے تھے۔ شاہجی تقریر کے لئے مائیک پر تشریف لائے تو عجیب سناں تھا۔ لاکھوں مسلمانوں کے اجتماع میں نعرہ ہائے تکبیر اللہ اکبر اور تاج و تخت ختم نبوت زندہ باد کے فلک شگاف نعروں کی گونج نے فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ شاہجی نے خطبہ مسنونہ پڑھا تو فضا ساکت ہو گئی اور ہو کا عالم تھا۔ لاکھوں انسان گوش بر آواز تھے۔ شاہجی کے دائیں اور بائیں ان کے قد کے برابر روزنامہ زمیندار، لاہور کے پریچوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ شاہجی نے اعلان کیا کہ شرکاء کانفرنس ان تمام پریچوں کو فوراً خرید لیں۔ چنانچہ آج واحد میں یہ تمام پریچے تین تین روپے میں فروخت ہو گئے۔ زمیندار نے کانفرنس کے حوالے سے خصوصی نمبر شائع کیا تھا۔ لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ اس زمانہ میں فی پریچے تین روپے میں شاہجی کے حکم پر فوراً ٹکڑے ہو گئے۔ یہ ایک ریکارڈ سیل تھی۔

شاہجی کی معرکتہ الارا تقریر کے بعد کانفرنس کے منتظمین اور شرکاء کا شکریہ ادا کیا گیا تو پنڈال کے کناروں پر کھڑے ہوئے سکھ سامعین نے شکوہ کیا کہ آپ لوگوں نے سب کا شکریہ ادا کیا لیکن ہمارا شکریہ ادا نہیں کیا جبکہ کانفرنس کے لئے زمین بھی ہم نے فراہم کی۔ اس پر احرار کے معروف پنجابی شاعر عبدالرحیم عاجز مائیک پر تشریف لائے اور سکھ سامعین، کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فی البدیہہ چند اشعار بھی ان کی نذر کر دیئے۔

نظم یہ تھی۔

آگنی	فوج	اکالی	آگنی	فوج	اکالی
گرو جی	ساڈی	آگنی	فوج	اکالی	اکالی
ایہہ	ہے	ساڈے	گرو دا	فوج	اکالی
کچھا	کرلا	کھلا	رکھو	فوج	اکالی
تے	کیوں	نا	رہنا	فوج	اکالی
ساڈی	آگنی	فوج	اکالی	فوج	اکالی

سکھ سامعین خوشی سے اچھل پڑے اور "تس سرری اکال" کے نعرے لگاتے رہے۔ احرار تبلیغ کا نفرین کا اس شان و شوکت کے ساتھ انعقاد مضی اللہ کا کرم تھا جو حضرت امیر شریعت اور دیگر احرار رہنماؤں کے اخلاص کے نتیجے میں حاصل ہوا۔ اگر ایک کافر (قادیانی) تبلیغ اسلام کے راستے میں حائل ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دوسرے کافر (سکھوں) کو مسلمانوں کا مددگار بنادیا۔



## کون ٹوکے گا ترے بعد جہاں بانوں کو

جاننا مرزا

آج ہم دولتِ احرار گنوا بیٹھے ہیں  
دل کے بازار سے الفت کا خریدار گیا  
جس کنارے پہ تھے ہم وہ ہی کنارہ ڈوبا  
تجہ کو چاہے گا مگر تجہ کو کہاں ڈھونڈے گا  
شاخِ امید سے یوں ٹوٹ کے جانے والے  
اپنی حرکت پہ تھکا دیکھنا شاکی ہو گی  
کون ٹوکے گا ترے بعد جہاں بانوں کو  
اپنے جانناز پہ ہر آنکھ کا تل روئے گا

آج ہم واقفِ اسرار گنوا بیٹھے ہیں  
آج وہ ختمِ نبوت کا نگہدار گیا  
روشنی ماند ہوئی اپنا ستارہ ڈوبا  
کارواں روئے گا منزل کا نشان ڈھونڈے گا  
چاہنے والوں سے یوں روٹھ کے جانے والے  
زندگی تیری ترے بعد بھی باقی ہو گی  
کون قرآن سنائے گا مسلمانوں کو!  
آنکھ روئے گی، جگر روئے گا دل روئے گا

## انگریز پہلی مرتبہ پکڑا گیا

عائياً ۱۹۵۸ء کا ذکر ہے۔ ان دنوں حضرت شاہ جی بیمار تھے۔ ڈاکٹروں نے ایکسرے کرانے کا مشورہ دیا۔ میں انہیں نلے کرسول ہسپتال پہنچا۔ ڈاکٹروں کو شاہ جی کی آمد کا علم ہوا تو وہ پروانوں کی طرح ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر نے شاہ جی کو ایکسرے روم چلنے کے لئے کہا اور وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان دنوں موسم سرد تھا اور شاہ جی نے سبز رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ جونہی آپ ایکسرے مشین کے سامنے آئے تو ڈاکٹر نے کوٹ اتارنے کے لئے کہا۔ شاہ جی نے کوٹ اتارا تو ڈاکٹر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک خوبصورت پتھر بھی ڈورمی سے باندھ کر شاہ جی نے گلے میں لٹکا رکھا ہے۔ دراصل یہ عقیق کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا جو دن کی شکل میں بنا ہوا تھا۔ کسی ارادت مند نے انہیں ہدیہ کیا تھا کہ آپ اس "عقیق دل" کو ڈوری سے باندھ کر دل کے محاذ پر لٹکائیں۔ چنانچہ شاہ جی نے اسے بھی اتار دیا ایک ڈاکٹر نے کہا کہ شاہ جی اب اور تو کوئی پتھر آپ کے پاس نہیں؟ تو شاہ جی نے بے اختیار التجا لگھا ہاں! ایک ننھا سا دل ہے۔ کھو تو وہ بھی نکال کر سامنے رکھ دوں۔ اس مختصر مگر بر محل اور برجستہ جملے نے ماحول کو زعفران زار بنا دیا۔ اور سب حاضرین کے چہرے کھکھلا اٹھے۔ ایکسرے تو اتار لیا مگر ڈاکٹروں کا جی یہ چاہ رہا تھا کہ وہ شاہ جی سے باتیں کریں اور ان کی شگفتہ گفتگو سے حظ اٹھائیں۔ نہر سوز کا مسئلہ تب زبان زد عام تھا اور ہر مجلس میں موضوع سخن۔ ناصر مرحوم نے انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ چنانچہ یہی مسئلہ موضوع مجلس بن گیا۔ مختلف احباب اپنی اپنی سوچ اور بصیرت کے مطابق اس پر اظہار خیال اور تہذیب کر رہے تھے۔ اور شاہ جی ہمہ تن گوش۔ اسی دوران ایک ڈاکٹر نے سلسلہ کلام توڑتے ہوئے کہا۔ شاہ جی واقعی انگریز نے سوز کے مسئلہ میں زیادتی کی ہے۔ شاہ جی نے برجستہ فرمایا۔ میاں زیادتی تو انگریز ہمیشہ سے کرتا چلا آیا ہے۔ آپ یوں کہیئے کہ پکڑا پہلی مرتبہ کیا ہے۔ اس ایک جملے میں انہوں نے انگریز کے خلاف اپنی بھرپور نفرت کا اظہار کر دیا۔ اور اس کے مظالم اور زیادتیوں کے بارے میں شک و شبہ کے تمام امکانات ختم کر ڈالے۔ اسی پر گفتگو ختم ہو گئی اور ہم شاہ جی کو لے کر گھر لوٹ آیا۔



## ہو جسکی فقیری میں بوئے اسد اللہی

سیرت نگاری کوئی معمولی موضوع نہیں ہے۔ بلکہ ایک عظیم موضوع ہے۔ جس کے ذیل میں بے شمار عنوانات ہوتے ہیں اور ان میں کمی و بیشی شخصیت کے اعتبار سے ہوتی رہتی ہے جو شخصیت جتنی اہم اور بزرگ ترین ہوگی اتنے ہی عنوانات کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ مثلاً ایک معمار کی سوانح اور سیرت کے لئے جہاں اسکے ملک، قوم، شہر، سن ولادت، سلسلہ نسب، ماحول وغیرہ کا ذکر ضروری ہے وہاں اسکی بنائی ہوئی عمارتوں کا مشاہدہ اور اس میں معمار کی فنکاری کے نمونوں کا اظہار بھی ضروری ہوتا ہے۔ اور اس کام کو وہی لوگ اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں جن کو اس معمار کی معاشرت کا شرف حاصل ہوا اور ساتھ رہ کر کام کیا ہو۔ یہی وجہ ہے حضرات صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے جتنے عمدہ اور احسن طریقہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بیان فرمائی ہے دوسرا بیان نہیں کر سکتا۔

بد قسمتی سے جن ایام میں شاہ جی کا گزر ہمارے دیار سے ہوا کرتا تھا اور ہمارے علاقہ میں ان کی مسکور کن تقاریر ہوا کرتی تھیں ان ایام میں مجھے شخصیتوں کے دیکھنے اور سمجھنے کا ہوش ہی نہیں تھا چہ جائیکہ شاہ جی کی معاشرت اور ان کے ساتھ کام کرنے کا شرف؟

یہ میں نے سنا اور پڑھا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں ان جیسا خطیب اور مقرر نہ پچھلے سو سالوں میں پیدا ہوا اور نہ آج کوئی نظر آتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ عرض کرتا ہوں کہ پورے ایشیا میں فی زمانہ وہ اپنا شیل اور عدیل نہیں رکھتے تھے۔ ہزاروں نہیں لاکھوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ نہ آکر کبر الصوت کا انتظام ہوتا تھا لیکن عشاء کی نماز کے بعد صبح کی اذان تک شاہ جی کی آواز کے علاوہ سانس کی آواز بھی نہ سنائی دیتی تھی۔ اسی سکوت کے عالم میں آہستہ اور خاموش پچکیوں اور سکویں کی آواز سنائی پڑ جاتی تھی۔ ایک بصیرت ہوتی تھی جو ٹکھنی جمانے مسبوت اور ساکت بیٹھی ہوتی تھی۔ گویا کہ انسان نہیں تصویریں ہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ دلی میں پہلی تقریر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی ہوئی۔ موصوف نے ایک بے تک تقریر فرمائی۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقریر کے بعد تقریر کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں تھا وہ جماعت دیوبند میں تقریر کے میدان میں منفرد ہیں اور پھر تقریر بھی عالمانہ حضرت نانوتوی کی تقریر کا پورا پورا چرچہ ہوتا تھا۔ آج موصوف کی دولٹائیاں (فتح المعلم اور تفسیر قرآن بر ترجمہ قرآن از حضرت شیخ الہند) دو علمی شاہکار ہیں۔ کہ جن کی ضرورت مرور ایام کے باوجود ہنوز باقی ہے۔

ایک سب سے قریب حضرت شاہ جی کھڑے ہوئے، تقریر کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ معذرت پیش کرنے کے لئے اور صبح کی اذان کر دی۔ اب اندازہ لگائیے کہ جاڑوں کی راتیں پورے چھ گھنٹہ میں معذرت ختم ہوئی۔ معذرت جب اتنی طویل ہوتی تھی تو تقریر کتنی دراز ہوتی ہوگی؟

شاہ جی کی زندگی اور موت دونوں شاہی تمیں بلکہ باوشاہوں کو نہ وہ زندگی حاصل اور نہ موت۔ شاہ جی کی زندگی اور موت اقبال مرحوم کے اس شعر کے مصداق تھی

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر ادلی

ہو جس کی فقیری میں ہوئے اسد اللہ

اور واقعی آپ کی زندگی میں عجیب استغنا تھا اور آپ اس حدیث کے مضمون کے عین مطابق تھے۔

نعم الرجل الفقیر ان اجتج الیہ نفع وان استغنی عنہ اغنی نفسہ (اوکما قال)  
ترجمہ۔ بہترین آدمی فقیر ہوتا ہے اگر اس کے پاس حاجت لے کر جائیں تو نفع پہنچائے اور اگر اس سے کبارہ کریں تو وہ بھی بے پروا رہے۔

حضرت شاہ جی میں یہی بات تھی۔ ایک مخلوق دوڑی پھرتی تھی مگر ہر ایک کو دینی، دنیوی، حسب ظرف فائدہ پہنچاتا تھا۔ لیکن حضرت شاہ جی ہمیشہ مستغنی رہے۔۔ اور انکے وصال نے اس چیز کو یقین کے درجہ تک پہنچا دیا تھا۔

انتقال کی خبر ہوا کی طرح پورے عالم اسلام میں پھیل گئی تھی۔ اور پورے پاکستان سے آدمی جوق در جوق پہنچ رہے تھے۔ راویوں اور اخبارات کا کہنا ہے کہ جنازہ میں ایک لاکھ سے زائد آدمی شریک تھے۔ یہ خصوصیت پاکستان میں کسی کے جنازہ کو حاصل نہ ہوئی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

جب حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری قائد احرار کا انتقال ہوا تو مجلس احرار کے رہنماؤں نے مرحوم کے سوگ اور یاد میں باغ بیرون موجی دروازہ میں جلسہ عام منعقد کیا۔ آغا شورش کا شیعہ سی مرحوم اس جلسہ میں شریک نہ ہو سکے کیونکہ وہ ان دنوں حکومت وقت کے ساتھ کسی سیاسی چیقلش کے نتیجہ میں پش دیوار زنداں تھے۔ جلسہ شروع ہوا، شیخ پر مجلس احرار کے شعلہ بیان مقرر باری باری نمودار ہوئے سب نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی دینی اور ملی خدمات پر ان کو خراج تحسین ادا کیا۔ بعض حضرات نے بعض تجاویز پیش کیں مثلاً مولانا صاحب کی یادگار کے طور پر ان کا مقبرہ تعمیر کیا جائے، ان کی یاد میں شفاخانہ قائم کیا جائے، ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا جائے جس میں مولانا کی زندگی اور تعلیمات کے بارے میں لٹریچر جمع کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ بالاخر شیخ سیکرٹری نے استاد داس کو دعوت دی وہ شیخ پر تشریف لائے اور ایک بر محل نظم پیش کی جس کا ایک شعر یہ تھا

بابو ترس مویا کے کھڑیاں نوں

پتر پوڑیاں دان کرواندے نیں

(وحید فاطمی۔ روزنامہ مشرق لاہور ۵ دسمبر ۱۹۹۵ء)

## کہاں ڈھونڈیں گے؟

ایسا غم خوار مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے کھو گیا واقفِ قرآن کہاں ڈھونڈیں گے  
 بے خطر آتشِ نرود میں جو کود پڑے ایسا ملت کا نگہبان کہاں ڈھونڈیں گے  
 فیصلے دل کے ٹکڑوں سے کئے ہوں جس نے ایسا درویش مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے  
 جس کی لکار سے لرزاں تھے سگانِ باطل ختمِ مرسل کا وہ دربان کہاں ڈھونڈیں گے  
 کل ہمیں سنتِ یوسف کی ضرورت ہو گی ہائے وہ واقفِ زندان کہاں ڈھونڈیں گے  
 جذبہٴ موت بھی ہے دار و رسن بھی لیکن جانِ منصور کی پہچان کہاں ڈھونڈیں گے  
 سطوتِ شاہ سے مرعوب نہ ہونے والا کتنا بیباک تھا انسان کہاں ڈھونڈیں گے

پاسباں ملک کا اور شریعت کا امیر

ایسا جانباز مسلمان کہاں ڈھونڈیں گے

جانباز مرزا



## ہمہ صفت موصوف

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ پر کوئی مضمون لکھے تو کیا لکھے۔ اور لکھے تو کس پہلو پر۔ جدھر نگاہ اٹھتی ہے حیرت و اطمینان پکڑ لیتی ہے۔ ہر وصف اور کمال جو شاہ جی میں سہہ فیاض نے ودیعت کیا تھا۔ نگینہ بنا ہوا تھا۔ شاہ جی لہجہ ذات اور صفات کے اعتبار سے جو کچھ تھے۔ ایک حقیقت تھے ایک مضمون تھے۔ محکی عنہ تھے جو کچھ بھی بیان و تحریر میں آئے گا مجاز ہوگا۔ عنوان ہوگا، حکایت ہوگی۔ شاہ جی ان امور میں حقیقت مجسم ہوں گے مضمون ثابت و مستحکم ہوں گے۔ واقعی محکی عنہ ہوں گے۔

قوم کو ہزاروں سال اپنے اس دیدہ ور کے کھونے پر رونا پڑے گا۔ مگر بخاری جیسی تمنا کب بر آئے گی۔ و احسرتا و الحسا۔ سب سے پہلی مرتبہ شاہ جی کو انجمن خدام الدین کے سالانہ جلسہ پر لاہور شیرانوالہ دورہ و روزہ میں دیکھا۔ یہ جلسہ حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ امیر انجمن خدام الدین کی دعوت پر بلایا گیا تھا۔ جس میں اس مقدس دور کے تمام اکابر علماء اور اصغر فضلاء دیوبند شریعت لائے ہوئے تھے۔ اجتماع کیا تھا چلتے پھرتے، بیٹھے اٹھے انوار کا اجتماع تھا۔ اس میں شاہ جی نے ایک برجستہ، پر معنی اور درو انگیز لہجہ میں سابق پنجاب کی خانقاہی، علمی، سیاسی، روحانی کیفیت کا اظہار کیا اور معرکہ کی تقریر فرمائی۔

جید اور حلیل القدر علماء کرام کے سامنے پورے ملک کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ اور ان سے رہنمائی کی استدعا کی۔

تقریر کا یہ عالم تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان سے باران رحمت کا نزول ہو رہا ہے۔ زمین گونا گوں اور بو قلموں پھولوں کے گلہ بستے پیش کر رہی ہے علمائے کرام و محققین قوم اس نذر و بے باک مقرر کے طرز خطابت و اظہار واقعات سے بے حد متاثر تھے۔ میرے جیسے تو اس بیان جادو اثر پر مو حیرت تھے۔ شاہ جی کی تقریر کی روشنی میں حضرات اکابر نے مختلف عنوانات سے قوم کو زندگی بخش خطاب سے نوازا۔ اس جلسہ میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان پر ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ اور دنیا کی آنکھیں کھل گئیں کہ علماء و دیوبند اور یہ مضامین بلند۔ غرض کہ شاہ جی پورے مجمع پر چمکے ہوئے تھے۔ حضرت امیر شریعت نے جہاد پر ایک مبسوط و مفصل تقریر فرمائی۔ جس کے اختتام پر مولانا حبیب الرحمن لودھیانوی نے لوگوں سے اپیل کی کہ اگر شاہ جی کی تقریر سے یہ تاثر صمیم اور سچا ہے۔ تو موت علی البہاد پر ان کے ہاتھ پر بیعت کرو۔ لوگ و الہانہ جذبہ کے ساتھ آگے بڑھے تو شاہ جی نے فرمایا۔ میں اس وقت تک ہرگز کسی کو بیعت نہ کروں گا جب تک خاتم المحدثین بقیۃ السلف و الخلف حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری مجھے بیعت نہ فرمائیں اور اجازت نہ دیدیں۔ چنانچہ حضرت محدث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہو گئے اور شاہ جی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر فرمایا۔ اگر میں خدا کی طرف سے مجاز ہوں تو ان کو یعنی شاہ جی

کو اہانت دیتا ہوں کہ تمہیں بیعت کریں۔ بس اس کے بعد علماء اور عوام نے شاہ جی کے دست مبارک پر بیعت کی اور اسی جلسہ میں آپ کو امیر شریعت منتخب کیا گیا۔ شاہ جی فرمایا کرتے تھے۔ جب حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک میں ہاتھ دیا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اور پورے جسم میں بجلی دوڑ گئی۔ اس کے بعد کچھ اور ہی کیفیت تاجب کبھی حضرت شاہ جی سے میری ملاقات ہوتی تو وہ حضرت مرشد انور شاہ جی کا ذکر فرماتے رہتے اور آپ دیدہ ہو جاتے۔ اب دونوں پروردگار عالم کو پیارے ہو گئے

اللہم ادخلہما فی الجنۃ وارحمہما رحمۃ واسعۃ۔ امین۔

جانبا زمرزا

### سرزمین ملتان سے

اے شہنشاہوں کی بستی، اونیائوں کے دیار  
ہر خزاں کے دور میں قائم رہی تیری بہار  
تو شہیدوں کی ہے مٹی، تو امانت دار ہے  
آج پھر پہلو میں تیرے ہے عطاء اللہ شاہ  
ہاں کہ وہ باغی رہا، برطانوی سرکار کا  
ہے یہی دارو رس نے آنا یا تھا جے  
یہ خزانہ دفن کرتے ہیں بہاری خاک میں  
یہ امانت قوم کی، اور سینہ احرار ہے  
دیکھنا صنائع نہ ہو جائے وطن کا بالکلین  
قبر کی مٹی سے کہہ دو، لحد کو آواز دو  
ذرے ذرے پر ہے تیرے رحمت پروردگار  
تیرے دامن میں ہیں اب بھی نیک بندوں کے مزار  
تیری اک تاریخ ہے اور تیرا اک کردار ہے  
جو امیر وقت تھا، ڈرتے تھے جس سے کجگلاہ  
وہ محافظ تھا قاری احمد مختار کا  
آئینِ افزنگ نے باغی بنایا تھا جے  
تاکہ یہ محفوظ رہ جائے زمینِ پاک میں  
حشر تک ہے تجھ میں یہ، تو اس کی چوکیدار ہے  
داغ تک آنے نہ پائے اور نہ ہو میلا کفن  
با ادب آئینِ فرشتے، روک دیں حشرات کو

پاک رہنا چاہیے مشر تلک تیرا ضمیر  
سو رہا ہے تیرے دامن میں شریعت کا امیر

## بے لوث مجاہد

جنگ آزادی کے دلیر اور نڈر سپاہی حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کی سحرانہ تقریروں نے ہندوستان کو جنگ آزادی کے لئے تیار کیا اور ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشے تک انگریزوں کے خلاف ایسی آگ لگائی کہ بالآخر انہیں ملک چھوڑ کر یہاں سے رخصت ہونا پڑا۔ بلاشبہ ہندوستان میں اتنا بڑا جادو بیان خطیب اور نہ ٹکٹے والا جاننا آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اگر تاریخ انصاف کرے گی تو آپ کی سیاسی اور قومی زندگی کو فراموش نہ ہونے دے گی۔ انہوں نے جنگ آزادی میں جو کردار ادا کیا اسے تاریخ حریت میں بے مثال قرار دیا جائے گا۔ وہ بارہا آزادی کے جرم میں ماخوذ ہوئے۔ قید و بند کی مصیبتیں ایک تہائی عمر تک جھیلیں اور اہل انڈیا لیڈر کی حیثیت سے ہمیشہ انگریزوں کے معتبوب رہے۔ جمعیت علمائے ہند نے سول ناخوابی میں کانگریس کا ساتھ دینے کے لئے جو قرار داد جمعیت علمائے ہند کے اجلاس امروہہ میں ۱۹۲۹ء میں منظور کی اس کی تائید و حمایت آپ ہی نے کی۔ اور اپنی معرکتہ الاراء تقریر کے ذریعہ مخالف عناصر کا منہ ایسا پھیرا کہ وہ پھر اس طرف کارخ نہ کر سکے۔ جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس اس وقت ہوا جب گاندھی نے ملک کی تحریک شروع کی تھی۔ اس اجلاس میں جماعتی طور پر جمعیت علمائے ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ اجتماعی طور پر کانگریس میں شریک ہو کر ملک کی تحریک آزادی کو جوش و قوت کے ساتھ کامیاب بنایا جائے۔ اس کی تحریک مولانا حفظ الرحمن سیوہاری جنرل سیکرٹری جمعیت علمائے ہند نے کی اور اس کی تائید میں حضرت شاہ جی نے جان کی بازی لگائی۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ اجلاس کے موقع پر ہندوستان کے تمام ٹوڈی حضرات جو تحریک آزادی کے سنت مخالف تھے امروہہ میں آکر جمع ہو گئے تھے اور ان کا عزم یہ تھا کہ اصل قرار داد کو ہرگز منظور نہ ہونے دیں گے۔ لیکن جب مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی قادر الکلامی اور زور خطابت کے ذریعہ قرار دادوں کی حمایت کی اور تین گھنٹہ تک تحریک آزادی پر بولے تو اجتماع کا سارا رنگ بدل گیا۔ اور مخالفوں کو غائب و غاسر ہو کر واپس جانا پڑا۔

شاہ جی نے امروہہ میں آکر خطابت کے جوہر اس وقت دکھائے جب ہر صوبہ سے آپ کی گرفتاری کے نو دس وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ اجلاس کے ختم ہوتے ہی آپ غائب ہو گئے۔ راقم الحروف جس ٹرین سے واپس ہو رہا تھا جب وہ گجوالہ اسٹیشن پر آکر ٹھہری تو شاہ جی وہیں سے ہمارے ڈبہ میں سوار ہو گئے۔ آپ کے ساتھ نہ کوئی سامان تھا اور نہ کپڑوں کا کوئی جوار صرف تہبند اور قمیض میں لمبوس تھے۔ ایک رومال ہاتھ میں تھامے سر کے پیچھے رکھا اور لیٹ گئے۔ اور باتوں میں مصروف ہو گئے۔ آپ دہلی واپس آرہے تھے لیکن جب ٹرین غازی آباد کے اسٹیشن پر ٹھہری تو ایک چیکر نے آکر صرف آپ کا ٹکٹ چیک کیا اور چلا گیا۔ آپ نے فوراً کہا۔ من خوب می شناسم۔ یہ کبھہ کر اسٹیشن پر ہی اتر گئے۔ راقم الحروف کو برسی تھویش ہوئی

اور گاڑی چل پڑی۔ دہلی اسٹیشن پر بھی دیکھا مگر کہیں نظر نہ آئے۔ آخر تین روز کے بعد پتہ چلا کہ آپ نے بمبئی کے ایک زبردست اجتماع میں تقریر کی اور عوام کو جمعیت علماء کے فیصلہ سے آگاہ کیا۔ شاہ جی کی گرفتاری کے لئے تقریباً ہر صوبہ سے ورائٹ جاری ہو چکے تھے۔ دہلی میں جمعیت علماء ہند کے دفتر میں قیام رہتا مگر فوراً ہی پانچ منٹ میں دہلی سے باہر کسی غیر معروف اسٹیشن کی طرف روانہ ہو جاتے اور ان کے جاتے ہی پولیس دفتر پر چھاپہ مارتی اور انہیں تلاش کرتی۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ ایک دفعہ شاہ جی کے روانہ ہوتے ہی پولیس کا گارڈ آیا اور اس نے سارے دفتر کو چھان مارا۔ اور چند سپاہیوں نے جھٹ پر چڑھ کر دیکھا کہ کہیں یہاں تو چھپ کر نہیں بیٹھ گئے غرض نو دس وارنٹوں کی موجودگی میں بھی آپ نے پورے تک کا گت کیا اور ہزاروں کے اجتماعات میں مسلسل پانچ پانچ گھنٹہ تک تقریریں کی۔ بہار کے کسی مقام پر آپ تقریر کر رہے تھے کہ پولیس کی جمعیت نے پورے اجلاس کا محاصرہ کر لیا۔ آپ نے رضا کاروں سے کہا کہ تقریر ختم ہوتے ہی گیس کے ہنڈے گل کر دیئے جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور آپ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ٹھٹھ میں کامیاب ہو گئے۔ اور پھر دوسرے شہر میں تقریر کی اتفاق سے کسی ایسے ہی مجمع میں پولیس کو موقع مل گیا اور آپ گرفتار کر لئے گئے۔

بالآخر تقسیم سے پہلے شاہ جی اپنے وطن امرتسر سے لاہور آئے۔ اور چند ماہ بعد خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ میں سکونت اختیار کی اور وہاں سے ملتان منتقل ہو گئے۔ اور وہیں جاں آفریں کے سپرد کی۔ موت سے کسی کو مفر نہیں اور وہی ہو کر رہا جس کا اندیشہ تھا۔ ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ جن مجاہد شخصیتوں نے آزادی کے لئے پورے ملک کو گناہ آج ان کا کہیں تذکرہ نہیں وہ بے حقیقت لیڈر جو باہر کاروبار کھاتے رہے آج تاریخ آزادی کا سرعنوان بنے ہوئے ہیں اور کانگریس کی تاریخ جو کسی ضمیمہ جلدوں میں ہے ان کے ناموں سے پر ہے۔ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے جو کچھ کیا اپنا اسلامی اور وطنی فرض سمجھ کر کیا جس کا اجر بھی خدا ہی کی جانب سے مل سکتا ہے یہ ظاہر ہے کہ مرحوم نے جو جگہ چھوڑی ہے وہ خالی رہے گی اور ان جیسا بے لوث مجاہد اور جنگ آزادی کا سپاہی ہندوستان اور پاکستان میں مشکل ہی سے پیدا ہو سکے گا۔

مفکرِ احرار

چودھری افضل حق  
(سوانح و افکار)

تحریک آزادی کے عظیم  
مجاہد، سیاسی مصلح، قومی مفکر  
اور ادیب کے سوانح، افکار، خدمات  
سید ابوساویہ ابوذر بخاری

10 روپے

قیمت

بخاری اکیڈمی، میرپور، کالونی، ملتان۔

## جس کی گفتار میں تھا نغمہ پیکار حیات

قرنِ مہمانوی

آج اس دور میں دشوار ہے تم کو جینا!  
 موت جس دور میں ہے سرگرباں یارو  
 آج اس دور میں شکوے ہیں خدا سے تم کو  
 جس میں شدت سے ہے احساس بہاراں یارو  
 تم ستم ہائے زمانہ کا گلہ کرتے ہو  
 جب کہ مائلِ بکرم وقت کا ہر لمحہ ہے  
 تم کو اس عہد میں حاصل ہے فقط ماتمِ زیست  
 یعنی جس عہد کا ہر سانس حسینِ نغمہ ہے  
 تم نے دیکھا نہیں شائد وہ زیاں کارِ سماں  
 قابلِ دار تھے جس وقت تمام اہل وفا  
 جب کہ تقدیسِ حرمِ راہ میں لٹ جاتی تھی  
 چند قزاق بنے بیٹھے تھے جب راہ نما  
 تم نے دیکھے نہیں شائد وہ ستم کے منظر  
 جب کہ ہر لفظ پہ تفریر تھی پابندی تھی  
 روشِ عام تھی گنجیں کے قصیدے لکھنا  
 غنچہ و گل کو سلنا ہی چمنِ بندی تھی  
 ثبت تھی وقت کے ہونٹوں پہ جب اک مہر سکوت  
 کون اٹھا تھا مگر شعلہ احساس لئے  
 ہاں یہی پیکرِ اشار و جنوں تھا جس نے  
 قوم کو فکر و عمل کے نئے اسلوب دیئے  
 دیکھ اے گردشِ ایام یہی شخص ہے وہ  
 جس کے الفاظ میں تھے کتنے ہی پرسوز اللہ  
 جس کی گفتار میں تھا نغمہ پیکار حیات  
 جس کی تقریر میں تھا شعلہ و شبنم کا رجاؤ

## وہ جس کی قوتِ کردار نے دنیا بدل ڈالی

عبد الغفور ریاض (فورٹ سندھین)

اجل کا تلخ پیسانہ لئے پھر عزرائیل آیا  
 کما میرِ شریعت سے چلیں وقت رحیل آیا  
 ہوا مرد مجاہد باندہ کر رحلت سفر رخصت  
 ہوئی محمود میرِ کارواں سے قوم بد قسمت  
 دماغ و دل ہوئے مفلوج اس جائگاہ صدے پر  
 بصیرت ہو گئی مجروح اس ناگاہ صدے پر  
 وہ منزل جس پہ ہر اک طالبِ دیدار جا پہنچا  
 وہاں ختمِ نبوت کا علم بردار جا پہنچا  
 لئے اعمال کے گوہر بڑی سرکار جا پہنچا  
 حقیقت میں حضور پاک کے دربار جا پہنچا  
 وہ جس کی قوتِ کردار نے دنیا بدل ڈالی  
 اکیلا چھوڑ کر رخصت ہوا اس باغ کا مالی  
 نہ ہو گا پھر کوئی تجھ سا یہاں بالغ نظر پیدا  
 بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ و پر پیدا  
 شرافت اور نجابت میں وہ تھا اک گوہر کیسا  
 خطابت اور قیادت علم و عرفاں میں وہ تھا تنہا  
 مجالِ اف نہیں ہے ربِ اکبر کی مشیت پر  
 نہیں ضبطِ فغاں ممکن مگر اس حالِ اتر پر  
 تری فرقتِ غم و اندوہ کے نشتر چھوٹی ہے  
 مثالِ زرگس بے نور تجھ کو آنکھ روٹی ہے  
 الٰہی رحمۃ اللعالمین کے نام کے صدے  
 تو اس کو داسیِ رحمت کے سائے میں جگہ دے دے

## وہ زندہ جاوید رہے گا

جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور مرحوم کی ایک یادگار تقریر۔ جو انہوں نے ۳۱ اگست ۱۹۶۳ء کو احرار پارک دہلی دروازہ لاہور میں شاہ جی کی یاد میں منعقدہ ایک جلسہ میں کی۔

بزرگان محترم! آج عہد حاضر کے اس مرد جلیل کی یاد میں ہم اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس مرد پاکباز کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جس کی درویشی و فقیری بوئے اسد الہی سے معطر تھی۔ خونے سلمائی و بوڑھی جس پر ناز کرتی تھی، غیرت شبیری جس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت جس کا اور حنا پھونکتی تھی۔

جہاں تک سیدی و مولائی حضرت امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی یاد کا تعلق ہے میرا وجدان یہ کہتا ہے کہ جب تک عشق رسول کی روح موجود ہے۔ کتاب و سنت کی عزت و پرکٹ مرنے والے حیات ہیں، صحابہ کی عظمت کا نقش باقی ہے اور مسلمانوں کی رگوں میں اسلامی غیرت و حمیت کا خون دوڑ رہا ہے۔ بخاری کبھی نہیں مر سکتا، وہ زندہ رہے گا، زندہ جاوید رہے گا۔

وہ اگرچہ نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے اس کی صورت اگرچہ آنکھوں کے سامنے نہیں لیکن اس کے زمرے آج بھی کانوں میں گونج گونج کر محبت رسول ﷺ اور عشق خداوندی کے سرمدی کیفیت سے قلب و روح کو تڑپانے میں مصروف ہیں۔ یہ احرار پارک کی فضا اور دہلی دروازے کے در و دیوار آج بھی اس کی داستان عشق رسول کے ورق الٹ رہے ہیں، یہ کو توالی کے سامنے شہیدان ختم نبوت کے خون میں نہائے ہوئے ذرات آج بھی بخاری کی یاد میں تڑپ رہے ہیں۔ وہ منتظر ہیں کہ بخاری کے نام لیوا خدا کا نام لے کر آئیں اور محمد مصطفیٰ کے عشق سرمدی کا پھر رافضائے آسمانی میں لہرا دیں سامنے وطن بلندنگ اور احاطہ عبد الرحیم کے در و دیوار چشم تصور کو ۱۹۲۷ء کے ہنگامہ خیز دور کی طرف متوجہ کر رہے ہیں اور ماضی کی یادیں بادلوں کی طرح اُٹلڈ کڈل و داغ پر چارہ پی ہیں۔ لاہور یا نیگورٹ کے جٹس دلیپ سنگھ نے ماشہ "راج پال" "ناشر" "نگیلا رسول" کو کانوں کے اصطلاحی قسم پر رہا کر دیا ہے۔ مسلمانوں میں پہچان پر پڑا ہے۔ ناسوس و رسالت کے پروانے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ سٹر لوگھوئی نے دفعہ ۱۴۴۴ لگا کر مسلمانوں کی غیرت کا استہسان چاہا ہے۔ مدینے والے کی ختم المرسلینی کا پاسپان اپنے نانا کی عزت پر کٹ مرنے کا تہیہ کر کے میدان عمل میں آچکا ہے۔ بخاری کا عشق شباب پر ہے اور وہ شہادت کے راستہ میں سر ہتھیلی پر رکھ کر باطل کو لٹکا رہا ہے۔ مولانا احمد سعید اور مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ شیخ پر موجود ہیں۔ احاطے کے دروازہ پر پولیس کے مسلح دستے پہرہ دے رہے ہیں لیکن جذبہ شوق شہادت سے سرشار، دین خداوندی کی تلوار بھی

حرکت میں ہے۔ وہ دیکھے اسلام کی زبان بول رہی ہے۔

”آج آپ لوگ جناب فر رسل محمد عربی ﷺ کے عزت و ناموس کو برقرار رکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ آج جنس انسان کو عزت بخشنے والے کی عزت خطرے میں ہے۔ اس جلیل القدر ہستی کا ناموس معرض خطر میں ہے جس کی دی ہوئی عزت پر تمام موجودات کو ناز ہے۔“ آج سنتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی کے دروازے پر اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ اور اُم المومنین سیدہ خدیجہ الکبریٰ کھڑی ہیں اور فرمایا ہم تمہاری مائیں ہیں کیا تمہیں معلوم نہیں؟ کہ کفار نے ہمیں گالیاں دیں۔ ارے دیکھو! اُم المومنین دروازے پر تو نہیں کھڑی ہیں؟ تمہاری محبت کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالتوں میں کٹ مارتے ہو لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ آج گنبد خضرا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ٹپ رہے ہیں خدیجہ و مائشہ پریشان ہیں تمہارے دلوں میں اُمہات المومنین کے لئے کوئی جگہ ہے؟

اُمہات المومنین تم سے اپنے حق کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ عائشہ پکارتی ہیں وہی جنہیں میرے میاں (رسول اللہ ﷺ) پیار سے حمیرا کہہ کر پکارتے تھے۔ جنہوں نے رسول ﷺ کو رحلت کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔ ان کے ناموس پر قربان ہو جاؤ۔ سچے بیٹے ماں پر قربان ہو جایا کرتے ہیں۔“

آخر اس مجمع سے علم الدین اٹھا اور جنس ناموس کی حفاظت سے قانون قاصر تھا اس کی حفاظت علم الدین کے خبر نے راجپال کی جان لیکر کی۔ اگرچہ اسے اپنی جان کی بازی بھی ہارنا پڑی مگر یہ بات دنیا پر واضح ہوئی کہ مسلمان حضور سرور کائنات ﷺ کے ناموس کی حفاظت قانون سے نہیں بلکہ خون سے بھی کرتا ہے۔ عقیدہ ختم نبوت کی راہ میں جب قادیانی فرقتے نے رخنے پیدا کرنے شروع کیئے اور ایک اور تحریک نے سر اٹھایا تو اس وقت حق پرستوں کی جو صفیں اس کے مقابلے میں سینہ سپر ہوئیں۔ شاہ جی قائد کی حیثیت سے اس میں پیش پیش تھے۔ اور آخر تک پیش پیش رہے۔ ہر قدم پر مشکلات آئے آئیں، مصائب سے سامنا ہوا۔ آفات کی گھٹائیں اٹھیں۔ فرنگی اقتدار نے قدم قدم پر روٹے اٹکائے۔ قید و بند سے گزر کر دار در سن تک بات چاہی مگر عشق رسول کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ شیر نستان ایک طرف انگریز سامراج پر بھرپور وار کرتا رہا تو دوسری طرف انگریز کی ذریت جو قادیانیت کے نام سے خود نما پارہی تھی اس کا تیا پانچ کرنے میں مصروف رہا۔ چنانچہ شاہ جی نے فرمایا تھا

”ختم نبوت کی حفاظت میرا جزو ایمان ہے جو شخص بھی اس ردا کو چوری کرے گا جی نہیں۔۔۔ چوری کا حوصلہ بھی کرے گا میں اس کے گریبان کی دھجیاں اڑا دوں گا اور جو اس مقدس امانت کی طرف اٹھل اٹھائے گا میں اس کا ہاتھ قطع کر دوں گا۔ میں میاں (رسول اللہ ﷺ) کے سوا کسی کا نہیں۔ نہ اپنا نہ پرانا۔ میں انہیں کا ہوں۔ وہی میرے ہیں جس کے حسن و جمال کو خود رب کعبہ نے تمسین کھا کھا کر آراستہ کیا ہوا۔ میں ان کے حسن و جمال پر نہ مرثوں تو لعنت ہے مجھ پر اور لعنت ہے ان پر جو ان کا نام تو لیتے ہیں لیکن سار قول کی خیرہ چشمی کا تماشا دیکھتے ہیں۔“



آپ فرمایا کرتے تھے "مجھے ایک چیز سے محبت ہے اور وہ ہے قرآن۔ مجھے ایک چیز سے نفرت ہے اور وہ ہے انگریز۔"

اللہ کی کتاب کی بلاغت کے صدقے چاہئے۔ خود بولتی ہے میں محمد پر اتاری گئی ہوں۔ بابو لوگو! اس کی قسمیں نہ کھایا کرو۔ اس کو پڑھا کرو۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی طرح نہ سہی اقبال کی طرح ہی پڑھ لیا کرو۔ دیکھا اس نے قرآن میں ڈوب کر پڑھا تو مغرب کی دانش پر ہلہ بول دیا۔ پھر اس نے قرآن کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ تمہارے بت کدوں میں اللہ اکبر کی صدا ہے۔"

خود شاہ جی قرآن پڑھتے تو نہ صرف یہ کہ وہ خود لطف اندوز ہوتے بلکہ سننے والوں پر بھی سر ہوجاتا۔ یوں محسوس ہونے لگتا کہ قرآن کا نزول ہو رہا ہے اور جذب و کیفیت میں انسان ہی نہیں فضا بھی جھوم رہی ہے۔ اثر کا یہ عالم تھا کہ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم ہندو اور سکھ بھی شاہ جی کا قرآن سننے کے لئے آتے۔ اکثر ہندوؤں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ "شاہ جی توریوں کی زبان بولتے ہیں۔" سر شیخ نور محمد کی آمد پر مجلس احرار اسلام کا جو جلسہ اردو پارک دہلی میں ہوا تھا اور اس جلسے میں احرار رہنماؤں کے علاوہ دیگر قائدین ملت بھی شریک تھے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ الفاظ کہے تھے "اوقات کار سے فرصت کہاں تھی میں تو محض تصورِ اس وقت نکال کر شاہ جی کا قرآن سننے آ گیا ہوں"

انگریز سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ بر ملا فرماتے۔ میرا اس کے سوا کوئی موقف نہیں۔ "میرا ایک ہی نصب العین ہے۔ برطانوی سامراج کو کھنکانا یا دفنانا۔" محمد تقی خان نے شاہ جی کی یہ آرزو پوری کی اور وہ انگریزی سامراج کو اپنا پتھر اٹھا کر جاتے ہوئے دیکھ کر گئے اور انہوں نے مرزاویت کو بھی دم توڑتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ ان مردانِ حق کے گروہ میں سے ایک ایسے فرد تھے جن کا مقام بارگاہِ خداوندی میں بہت بلند تھا اور زمرہ اولیاء میں وہ مقامِ محبوبیت پر فائز تھے۔ اس صدی کے مجددِ اعظم حضرت علامہ محمد انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ نے آپ کو امیرِ شریعت کا خطاب دیا اور خود آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ آپ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا گل شیر

رحمۃ اللہ علیہ اسی پاداش میں شہید ہوئے۔ خود ہمارے حضرت شیخ التفسیر سیدی مولائی حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ تو آپ پر جی جان سے فدا تھے۔ گھنٹوں آپ کا ذکر خیر کرتے اور یوں محسوس ہوتا کوئی عاشق صادق اپنے محبوب کی ادواؤں کا ذکر چیر کر کیفیت و سرور کی وسعتوں میں کھو گیا ہے آپ فرمایا کرتے تھے حکمت کے موتی بکھیرتے تو شہرِ جبریل کے کان کترتے قرآن کے معانی بیان فرماتے تو مصنفین کے انہار لگا دیتے۔ چنانچہ اسی سے متاثر ہو کر حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا "شاہ جی کی باتیں عطاءِ الہی ہوتی ہیں"

محترم حضرات! بے شک، اسلام اقوامِ غیر کی تقلید میں کسی کا دن منانے کی کوئی تلقین اپنے ماننے والوں کو نہیں کرتا لیکن انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین کی یاد تازہ رکھنے کا ہمہ وقتی پروگرام اس کے پاس

ضرور موجود ہے اور جس کا اعلان نماز کی ہر رکعت میں

صراط الذین انعمت علیہم

کی روح پرور دعا سے ایک مسلمان ہر روز کرتا ہے۔ خداوند قدوس کا راہِ ہدایت کو انعام یافتہ لوگوں کی تابعداری کے ساتھ مخصوص کر دینا اس بات کا بین اور واضح ثبوت ہے کہ وہ انبیاء و صلحاء کے کارناموں کو زندہ و تابندہ رکھنے کا سبق امت مسلمہ کو دنا چاہتا ہے اور اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ مسلمان نہ صرف بزرگانِ ملت کے تذکرے اور حرارتِ قلب و روح کا سامان مہیا کریں بلکہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا عزم بالجزم بھی اپنے اندر پیدا کریں۔ اصل میں اسلاف کی یاد منانے کا واحد اور بہترین طریق اسلام کے نزدیک ان کی راہ پر چلنا اور ان کے طریق کو زندہ رکھنا ہے۔ اس اعتبار سے وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ شاہ جی کے نظریات، افکار اور خیالات کی نشر و اشاعت کی جائے۔ تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے وہ مشعلِ راہ بنیں۔ اور نشانِ منزل کا کام دیں اور خود مرحوم کے لئے اجر و ثواب کا موجب ہوں

من سن سنتہ حسنتہ فلہ اجرہا واجر من عمل بہا

یاد رکھیے جو قومیں بزرگوں کے طریق کو چھوڑ دیتی ہیں، بندگانِ الہی کے راستے سے منہ موڑ لیتی ہیں، اسلام کے نقوشِ قدم سے بے نیاز ہو جاتی ہیں اور بزرگوں کے کارہائے نمایاں کو دل و دماغ سے مٹا کر دیتی ہیں۔ وہ کبھی دیر تک زندہ نہیں رہ سکتیں اور صفحہ ہستی سے یوں مٹ جایا کرتی ہیں جیسے کہ ان کا نشان ہی نہ تھا۔

”آخر میں احرارِ دوستوں سے میری گزارش ہے کہ وہ جماعت کو زندہ رکھیں۔ آخر اس کا ایک ماضی ہے اس کی ایک تاریخ ہے اور اس کے کارنامے ہیں۔ جماعت کا مرنا ایک تاریخ کا مرنا ہے، ایک عہد کی موت اور بزرگوں کے کارناموں کو موت کے سپرد کرنے کے مترادف ہے۔ میں نے کہیں دیکھا ہے کہ شاہ جی نے فرمایا تھا۔

”خواہ ساری دنیا مجھے چھوڑ جائے میں مجلسِ احرار کا علم بلند رکھوں گا۔ حتیٰ کہ جب میں مرجاؤں تو میری قبر پر بھی یہ سرخ پھر رہا ہمارا ہے گا“

اللہ تعالیٰ شاہ جی کے مقاماتِ بلند تر فرمائے۔ ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ اور شاہ جی کی سببی اولادِ بھائی عطاء الحسنم بخاری، عطاء الحسن اور دیگر فرزندوں کو ان کا صحیح جانشین بنائے (ثم آمین)



## در خطابت بے نظیر و در عبادت بے ریا

رفت چوں میر شریعت از فنا سوئے بقا  
 سو بسو آمدندا، واحسرتا، واحسرتا  
 شرفِ دیں احمد عطاء اللہ آل ابن ضیا  
 شد غروبِ آل شمس ارضی قبل از شمسِ سماء  
 روز دیگر شمس گردوں گشت روشن بر سماء  
 لیک شمس ارضِ والے کرد دنیا را ہا  
 بو العطایا شاہ شاہاں، سید احرار بود  
 در خطابت بے نظیر و در عبادت بے ریا  
 میج حاصل نیست نادم، آہ وزاری ترک کن  
 یا مجیب غفرلہ، تاریخ گووہم دعا

۱۳۸۱ھ

عبدالرحمن نادم جالندھری

## ہمہ عمرش عزیزمت خویش پنداشت

عطاء	اللہ	آں	شاہ	بخاری
رسیدہ	بر	مقام	کا	مکاری
ہمہ	عمرش	عزیمت	خویش	پنداشت
جہاد	حق	بعد	استواری	
بکوش	در	بلندی	کلمہ	دین
قدم	بہاد	در	صف	پختہ کاری
بتوفیق	خدا	کرد	استقامت	
بست	صابراں	برحق	گزارمی	
لباس	منزلت	جاوید	پوشید	
بفرحت	دید	دولت	پائنداری	
بحالے	رفت و	زیر	دنیا	کہ گوئی
نہ	خوف و	غم	برد	نے ، منتظاری
بالش	استغاث	گفت	ہاتف	
کہ	حسن	انجمن	شاہ	بخاری

۱۳۸۱ھ

فرہنگی	سال	از غور	بسیار
بگفتم	"بحر	رحمت	فیض باری"

۱۹۶۱ء

(محمد علی بنوی)

## حضرت امیر شریعت کا نعرہ رستا خیر

حضرت مولانا قاضی محمد زاہد السینی مدظلہ کا نام دینی و علمی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں آج کل انکے شہر میں دارالرشاد کے نام سے دینی و علمی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان دنوں وہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی تھمس سرہ کی شخصیت پر ایک ضخیم کتاب کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ ذیل کی تحریر اس کتاب کا حصہ ہے جو مولانا نے لقیب ختم نبوت میں اشاعت کے لئے ارسال کیا ہے۔ ہم مولانا کے شکریہ کے ساتھ اسے نذر قارئین کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

جمیعت العلماء ہند کا آخری اجلاس لاہور میں ہونا قرار پایا، اس وقت پنجاب میں سر سکندر حیات کی وزارت تھی، اختر اس اجلاس سے چند روز پہلے دارالعلوم دیوبند حضرت مدنی کی نقش بوسی کے لئے حاضر ہوا تھا، نماز ظہر کے بعد خانقاہ مدنی کے بڑے کمرہ میں حضرت مہمانوں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ باہر تاگہ آکر رکھ جس میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اتر کر اندر تشریف لائے، آپ لاہور جمیعت کے اسی جلسہ کے انعقاد کے لئے تشریف لے گئے تھے اور پنجاب ایکسپریس سے واپس تشریف لائے تھے، اندر آتے ہی علیک سلیک کے بعد حضرت مدنی نے اجلاس کے بارہ میں پوچھا تو آپ نے عرض کیا کہ سکندر حیات اجازت نہیں دیتا، حضرت نے فرمایا کہ ”آپ پھر چوڑیاں پہن کر کیوں نہیں آئے۔“ بس یہ جملہ سنتے ہی مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی واپس لاہور پہنچے اور مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے مشورہ کے بعد اجلاس منعقد کرنے کا اہتمام کیا، مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم ناظم استقبالیہ مقرر ہوئے، چنانچہ مؤرخہ ۱۹ مارچ ۱۹۴۲ء کو اکابر تشریف لائے اور مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ میں قیام فرمایا یہاں اگرچہ مولانا عبید اللہ سندھی بھی مقیم تھے مگر جمیعت کی کسی میٹنگ میں شریک نہیں ہوئے جمعہ کا خطبہ عربی اور نماز حضرت مدنی نے پڑھائی مگر تقریر نہیں فرمائی۔ نماز جمعہ کے بعد جلوس بڑی شان سے جلسہ گاہ پٹنجا اور ابتدائی کارروائی کے بعد نماز عشاء تک جلسہ ملتوی کر دیا گیا۔ چنانچہ نماز عشاء کے بعد کارروائی شروع ہوئی تو حکومت نے بجلی کاٹ دی، لیمپوں کا انتظام کیا گیا اور لائٹس پیکر کے لئے بیٹری لگائی گئی، تلاوت کلام پاک کے بعد حضرت مدنی نے خطبہ صدرات شروع فرمایا، پنڈال سارا کچھ کھینچ بھرا ہوا تھا سٹیج پر علماء کرام خصوصاً مولانا حفص الرحمن اور مولانا نافع گل مرحومین سٹیج کی نگرانی فرما رہے تھے، جلسہ کی پہلی صف میں بعض شریعت پسند بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت نے خطبہ پڑھنا شروع فرمایا، آپ نے آزادی ہندوستان کے بعد ملکی نظم و نسق کے بارہ میں تین خیالات پیش کئے اور ان پر تبصرہ فرمایا، جب آپ نے تقسیم کے منصوبہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ جملہ فرمایا کہ ایک گروہ کا یہ خیال ہے۔ تو اچانک پنڈال اور سٹیج سے مختلف نعرے شروع کر دیے گئے جن کا مقصد اجلاس کو ناکام کرنا تھا، حضرت نے خطاب بند فرما دیا۔ اور اسی طرح کھڑے رہے، پنڈال پر ایک

شر پسند کھڑا ہوا تو مولانا نافع گل نے اس کے سر پر اس طرح ڈنڈا مارا کہ وہیں دم بخود ایسا بیٹھا کہ پھر حرکت نہ کر سکا۔ چونکہ پولیس اسی انتظار میں تھی کہ کوئی بہانہ بنا کر جلسہ کو درہم برہم کر دے اس لئے ہینڈل میں پولیس کے کافی آدمی آگئے اور صورتحال خطرناک نظر آنے لگی، وہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ امیر شریعت، بطل حریت، مجاہد ملت، سید عالی نسب عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاؤڈ سپیکر کے سامنے آکر چند نعرے لگوائے اور پولیس کو لنگار کر فرمایا کہ میرا اپنا جلسہ ہے فوراً باہر نکل جاؤ ورنہ تمام ذمہ داری تم پر ہوگی۔ چنانچہ پولیس باہر نکل گئی۔ آپ نے احرار رضا کاروں کو فرمایا کہ اپنی اپنی کھلمکھیاں فضاء میں لہرا دو، چنانچہ سارے ہینڈل میں کھلمکھیوں کی چمک نے جہاں فدا یان اسلام کو نور نبوت سے مشرف فرمایا وہاں بزدل مفسدوں کے لئے بجلی کی کرکٹ بن گئی، آپ نے فرمایا اگر کوئی مفسد سر اٹھائے تو اسے فوراً کچل دو میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ بس پھر کیا تھا ان کو سانپ نے ایسا سونگھا کہ دم بخود ہو گئے، پھر حضرت مدنی سے درخواست کی کہ اب آپ ارشاد فرمائیں، چنانچہ حضرت مدنی نے جہاں سے خطاب چھوڑا تھا وہیں سے شروع فرمایا اور اجلاس پوری کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ اس اجلاس کے برخواست ہونے سے قبل حضرت مولانا احمد سعید صاحب نے سر سکندر حیات کی اس حرکت کی مذمت کی اور اس کے برے نتائج سے آگاہ کیا۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے خطاب فرمایا، انکا یہ تاریخی جملہ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔

"انگریز کے خلاف جو بھی جملے کی میں اس میں لکڑیاں ڈالتا رہوں گا۔"

اجلاس بخیر و خوبی ختم ہوا اور اکابر واپس تشریف لے گئے۔ اس کے بعد آنیوالے پہلے جمعہ کو شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی نور اللہ مرقدہ نے سر سکندر حیات کی اس حرکت پر اسے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا "سکندر حیات! میں نے ابھی اپنا ہتھیار استعمال نہیں کیا اگر استعمال کیا تو برداشت نہ کر سکو گے۔" اس ہتھیار کی نمائش کرتے ہوئے اپنی تسبیح کو فضاء میں لہرایا۔ اللہ تعالیٰ کی شان کہ اس اجلاس کے تقریباً چھ روز بعد سر سکندر حیات خان کی بڑی دختر صاحبہ کی رخصتی ہوئی اور اسی رات ۲۶ دسمبر ۱۹۴۲ء، سکندر حیات کا انتقال ہو گیا۔

ابا جی کے آخری دنوں کی بات ہے روزانہ کے معمول کے مطابق سلیبی دواخانہ جانے کے لئے ٹھٹھے۔ پان بنانے لگے۔ اکڑوں بیٹھ کر ہتھیلی پر پان رکھا۔ لوازمات اوپر ڈالے اور پھر پان کو ہتھیلی پر مروڑنے لگے۔ چُور کر کے منہ میں ڈالتے تھے کہ دانت باقی نہیں رہے۔ اچانک پتہ نہیں کیا خیال آیا۔ پان کا چُور کرنے کے لئے غالب کا شعر گنگنانے لگے۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا  
نہ ہو مرنا تو جینے کا مرا کیا

شعر پڑھتے پڑھتے پان کا چُور ہاتھ سے نیچے گرا دیا اور پھر ہمیشہ کے لئے پان کھانا ترک کر دیا۔

(روایت: ابن امیر شریعت سید عطاء المومن بخاری مدظلہ)

## مقدس قافلے کی امانت

ہندوستان میں اسلام اور اس کی دعوت کے یکے بعد دیگرے کئی موڑ آئے۔ اسلامی دعوت کا قافلہ چلتا رہا اور رکتا رہا۔ تا آنکہ قدرت کی فیاضیوں نے اس ظلمت کدہ کو نور ہدایت پوری وسعت کے ساتھ عطا کرنے کے لئے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کو منتخب کیا اور حضرت خواجہ کی پرتا شیر شہادت حق سے روشنی کا چمنار تعمیر ہوا۔ حضرت خواجہ اور آپ کے خلفا سے ہندوستان میں جس زور سے تحریک اسلامی کو تقویت پہنچی وہ ازہر من الشمس ہے۔ رفتہ رفتہ اکبری الماد اور ہندوستانی دیدانت نے گھبراواڑ کیا اور اکثر صوفیاء بھی مسلک حق کی اسلامی دعوت کی بجائے روایات میں کھو گئے۔ رحمت الہی پھر جوش میں آئی اور ہندوستان کو امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ایسا باکمال صاحب دعوت عطا کیا۔ امام ربانی کے مسلسل جذبہ اسلامی سے ایک طرف اکبری فتنہ ختم ہوا اور دوسری طرف مدرسہ اور خانقاہ کی آویزش فروتر ہوئی۔ تا آنکہ آنے والے پر آشوب دور سے کچھ پہلے آفتاب ہدایت امام ولی اللہ دہلوی کی ذات گرامی نے علم جہاد اور تصوف کی صحیح تعبیر کے لئے ایک عظیم گروہ تیار کیا۔ اور حضرت شاہ عبدالعزیز نے ان خطوط میں رنگ بھرا اور امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید اور حضرت اسماعیل شہید نے ان خطوط کو جو شاہ ولی اللہ نے متعین کئے اور شاہ عبدالعزیز نے ان میں رنگ بھرا بالاکوٹ کے مقام پر اپنی جانیں جان آفریں کے سپرد کر کے ہندوستان کی سرزمین کو خطوط کے ان رنگوں سے رنگین کیا اور فرنگی استبداد کے لئے ایک قافلہ نئے سرے سے آیا اور بڑھا۔ اسی مقدس قافلے کی ایک کڑی حضرت امیر شریعت تھے۔ بالاکوٹ کی قربانیوں کے بعد فرنگی حکومت ملک پر قابض ہو گئی۔ جماد ۱۸۵۷ء کی کوشش بظاہر ناکام ہوئی۔ فرنگی تلوار نے اسلام اور مسلمان کا ہر جہت سے خاتمہ شروع کر دیا۔ علماء حق پھانسی دے دیئے گئے۔ جلاوطن کئے گئے اور کچھ ہجرت کر گئے۔ بات ذرا تلخ ہے کچھ عاقبت نااندیش اور گمراہ مولوی اور بیروں نے انگریز کے قصیدے لکھنے شروع کر دیئے کچھ بالیمان تو تھے مگر صاحب استقامت نہ تھے۔ گوشہ نشین ہو گئے۔ انگریز کی دور رس نگاہ نے منصوبہ بنایا کہ اسلام مٹایا جائے۔ اور مسلمانوں سے کتاب کریم قرآن کو لفظاً بھی چھین لیا جائے۔ مسلمانوں کو بیعت مسلمان کے جینا مشکل نہیں۔ بلکہ ناممکن ہو گیا۔ مایوسی اور بد دلی نے مسلمانوں کا مستقبل تاریک بنا دیا۔ ۵۷ء کی جنگ ناکامی کے دو بقیۃ السیف مجاہد امام برحق قطب الارشاد ظاہر و باطن کے جامع چشتیہ نسبت کے حامل نقشبندیہ نسبت کے کامل جتہ الاسلام امام محمد قاسم اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے علم اسلام ہاتھ میں لیا اور تحریک اسلامی کی بنیاد رکھی۔ اور اسلام کی ایک ایسی شمع روشن کی جس سے عرب و عجم میں ہزار ہا چراغ روشن ہوئے۔ اور دعوت اسلام کے ایک ایک گوشے میں دعوت و اصلاح کی۔ صد اس زور سے بلند ہوئی کہ بانگ خلیل نے کفر کے ہر ایوان میں زلزلہ برپا کر دیا۔ قاسم و رشید رحمہم اللہ تعالیٰ کے عظیم جالان نشین شیخ السند

(ممد حسن) نے دنیا کے اس حصے سے لے کر اس حصے تک دعوت حق کو پھیلا دیا۔ علم فقہ، حدیث، تفسیر، خصوصی طور پر دعوت دین کا سرچشمہ قرار دیئے گئے۔ اصلاح باطن کے لئے اشتغال روحانی جو نسبت چشتیہ کا ورثہ تھے صبح اسلامی شکل میں پیش کئے گئے۔ علم شریعت اور تصوف و احسان کے علمبردار قافلے نے جہاد حریت کی روح پھونکی۔ یہ مقدس گروہ آگے بڑھا فرنگی کا نام لینا ہی جب لگی پیدا کر دیتا تھا۔ اس مقدس قافلے نے فرنگی کو لٹکارا اور نور بصیرت سے جان گئے کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو مرکز اسلام عرب فرنگی جو رواستہاد سے آزاد نہیں ہو سکے گا۔ فرنگی نے ہندوستان خالی کیا۔ آج عرب ممالک کا حال دیکھ لیجئے کیا سے کیا ہو چکا ہے۔

آج بھی یہ، قافلہ تریک دعوت اسلامی کے لئے سر بکھٹ ہے۔

حضرت امیر شریعت اسی مقدس قافلے کی ایک لمانت تھے۔ آپ کیا تھے، کیا کیا۔ آپ کی اسلامی خدمات وطنی حریت کس شکل میں ظاہر ہوئیں۔ اپنے اپنے دلوں سے پوچھیے۔ اگر اب تک ہم امیر شریعت کو سمجھنے سے قاصر رہے یا جہل و نادانی نے راہ رو کے رکھی تو رونے و صوفیوں سے نہ کبھی کچھ ہوا اور نہ آئندہ کچھ ہو گا

اٹھو اور حضرت امیر شریعت کی پھیلائی ہوئی روشنی سے نشان منزل معلوم کرو۔ اور منزل کو پالو۔  
ور نہ یاد رکھو قیامت قریب ہے اور اللہ حبیب ہے

امر تسر میں۔۔۔۔۔ شیخ عبدالواحد، چینی کے برتنوں کی دکان کرتے تھے۔ شاہ جی کے دوست تھے۔ ان دنوں شاہ جی کی رہائش ایک جو بارے پر تھی جہاں مہمانوں کے بٹھانے کے لئے جگہ نہیں تھی۔ لہذا شیخ عبدالواحد جب کبھی شاہ جی سے ملنے آتے تو، نیچے کھڑے ہو کر بات چیت ہوتی یا قریب کی علیک دکان پر بیٹھ کر۔ ایک دن شیخ صاحب ملنے آئے تو شاہ جی نے اوپر سے کھڑکی میں سے جھانکا۔ چونکہ کسی کام میں مصروف تھے اس لئے نیچے نہ اترے اور وہیں سے بات چیت کر لی۔ شیخ صاحب اس وقت تو واپس چلے گئے۔ مگر انہیں یہ بات محسوس بہت ہوئی۔ حتیٰ کہ کچھ ہی دنوں میں دکان چھوڑ کر پشاور چلے گئے۔ اور پھر وہاں سے ایک خط لکھا خط میں صرف ایک شعر لکھا

اس شوخ نے نگاہ نہ کی ہم بھی چپ رہے  
ہم نے بھی کوئی آہ نہ کی، ہم بھی چپ رہے۔

(روایت حرم امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہا!)



## شاہ جی کی صدارت میں مولانا آزاد کی ایک یادگار تقریر

شیخ محمد صدیق سیالکوٹی تقسیم ہند کے وقت تک گلگت میں عسکوں کے بڑے تاجر تھے۔ مولانا آزاد سے بہت زیادہ ذہنی لاؤ رکھتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جمعیت تبلیغ اہلحدیث گلگت کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا۔ چنیوٹ کے سودگران گلگت میں بڑی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو اس جلسہ میں ضرور بلایا جائے جلسہ کے صدر مولانا ابراہیم سیالکوٹی تھے۔ اس زمانہ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ جلسے کے منتظمین میں سے جن کا میلان مسلم لیگ کی طرف تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد تقریر نہ کر سکیں لیکن جو لوگ مولانا آزاد کے عقیدت مند تھے ان کا اصرار تھا کہ مولانا کی تقریر لازماً ہو۔ چنانچہ ان کے نام کا اعلان ہو گیا کہ ہفتے کی شام کو چار بجے مولانا آزاد تبلیغ کے موضوع پر تقریر فرمائیں گے۔ ”مولانا آزاد بروقت جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ لوگوں کا بڑا ہجوم تھا۔ حاضری بے پناہ تھی کیونکہ ایک طویل عرصے کے بعد مولانا آزاد کی تقریر سننے کا موقع مل رہا تھا۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ صدر جلسہ کو چائے پلانے کے بہانے راستے میں روک لیا گیا۔ اس طرح جلسہ بروقت شروع نہ ہو سکا۔ اس انتظار میں آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ اس دوران کسی نے مولانا آزاد سے دریافت کیا کہ مولانا آپ کا مزاج کیسا ہے؟ کچھ طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں میرے بھائی کوئی نہ کوئی تکلیف تو انسان کو رہتی ہے۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ آپ آج تقریر کرنے کے لئے طیار نہیں ہیں۔ اس سوال کے جواب کے فوراً بعد اعلان کر دیا گیا کہ مولانا آج تقریر کرنے کے لئے طیار نہیں ہیں اس لئے دوسرے مولانا صاحب تقریر فرمائیں گے۔ اس طرح وہ لوگ کامیاب ہو گئے۔ جو محض سیاسی اختلاف کی بنیاد پر، مولانا آزاد کی خالص دینی تقریر بھی سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ لیکن اس اعلان کے فوراً بعد مولانا کے عقیدت مندوں میں سے ایک نے اعلان کیا کہ مولانا کی تقریر کل اتوار کے روز دہ بجے ہوگی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اتوار کے دن عام تعطیل تھی۔ پہلے دن سے زیادہ مجمع ہو گیا۔ اور ہجوم بڑھتا ہی گیا۔ مولانا اپنی عادت کے مطابق بروقت پہنچ گئے۔ آج بھی مخالفین نے وہ کھیل کھیلنا شروع کیا اور صدر جلسہ کو کسی بہانے راستے میں روک لیا۔ جب دس منٹ کی تاخیر ہو گئی تو مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جوش میں آ گئے اور انہوں نے اسٹیج پر آکر حاضرین سے کہا کہ حضرات کل والا ڈرامہ آج پھر کھیلا جا رہا ہے۔ صدر جلسہ کو آج بھی روک لیا گیا ہے، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لے آئے ہیں آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ میں صدارت کے لئے کوئی دوسرا نام پیش کروں؟ چاروں طرف سے زور زور سے آوازیں آئیں ضرور ضرور۔ اس کے بعد شاہ جی نے فرمایا کہ صدارت کے لئے میں اپنا نام پیش کرتا ہوں۔ منظور ہے؟ لوگوں نے کہا۔ منظور ہے، منظور ہے۔ ”شاہ جی کرسی صدارت پر بیٹھ گئے اور کہا مولانا آزاد سے

گزارش ہے کہ تشریف لائیں اور تقریر فرمائیں۔

سامعین کا بیان ہے کہ مولانا کی تقریر دو گھنٹے جاری رہی۔ پورے مجمع پر سننا تھا اور علم کا سمندر بہ رہا تھا۔ مولانا آزاد نے تبلیغ کا مفہوم بیان کیا۔ اس کے مقاصد کی وضاحت کی اور پھر بتلایا کہ مختلف مذاہب میں تبلیغ کی نوعیت کیا ہے، اور پھر تقریر کے آخری حصہ میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلامی تبلیغ کے آداب و خصوصیات بیان فرمائے۔ تقریر کیا تھی، معلومات کا ایک سمندر تھا جو دو گھنٹے کے اندر سیلاب کی صورت میں بہ گیا۔ پروگرام کے مطابق مولانا آزاد کے بعد مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن مولانا بخاری مرحوم نے فرمایا سمندر کے بہ جانے کے بعد ندی نالے کی ضرورت نہیں۔ لہذا میں سمجھتا ہوں کہ مولانا کے بعد میری تقریر مناسب نہ ہوگی۔ یعنی یہ علمی لحاظ سے مولانا کی توہین ہوگی۔

(ہفت روزہ "الاعتماد" لاہور ۵ رجب ۱۳۱۵ھ، ۹ دسمبر ۱۹۹۴ء)

غلام قادر خاتم (کالا بلغ)

## ہزباتِ محم

یہ کیسی شام آئی ہے کہ رنگ بھی بدل گیا  
جو آفتاب آندھیوں سے لڑ رہا تھا ڈھل گیا  
جہاں میں تیرگی ہوئی، عدم میں روشنی ہوئی  
ادھر چراغ گل ہوا، ادھر چراغ جل گیا  
تڑپ تڑپ کے رہ گیا ہے گفتگو کا بلکھن؟  
کہ نعلیوں کا اڑدبا متاع جاں نکل گیا  
چلے ہیں ہم بھی بانگیاں چن کو تو سنہال لے  
چن میں۔ اب رکھا ہے کیا جو رشک گل نکل گیا  
لطف و کرم کی بادشیں مرقد پہ اس کے ہوں کہ جو  
دنیا میں باعمل رہا، دنیا سے باعمل گیا  
ملت کو جس امیر پر لاریب فخر و ناز تھا  
دست اجل کا آج اس پہ آہ! وار چل گیا  
آہ و فغاں کا شور ہے خاتم جہاں میں چار سو  
فانی جہاں سے آج اک خطیب بے بدل گیا

## امیر شریعت کی زندگی کے عملی پہلو

آج تاریخ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۱ء پورا ایک مہینہ گزر چکا ہے اور اپنا خیال تو یہی ہے کہ صدیاں گزر جانے پر بھی جاننے والے حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی جدائی کا صدمہ محسوس کرتے رہیں گے۔ غیر منقسم یا متحدہ ہند کی تاریخ میں آپ جیسے عظیم الشان اور کثیر انبیان انسان کا نشان نہیں ملتا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ تاریخ عالم آپ جیسی ہستی پیش کرنے سے قاصر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ جس نظریہ کو سامعین کے ذہن نشین کرانے کا ارادہ فرماتے اس کے دلائل سامعین ہی کے ذہنوں سے فراہم کر کے ان کے سامنے رکھ دیتے۔ اس لئے انکار کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے بیان کے اختتام پر ذہنوں میں انقلاب برپا ہو جاتا۔ اور جو لوگ قبل از تقریر پیکرِ عداوت اور مجسمِ نفرت دکھائی دیتے وہی بعد از اختتام جلسہ محبت کا دم بھرے نظر آتے۔ بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ مخالفت کے علمبردار حمایت اور اطاعت اور محبت کے زندگی بھر کے لئے مسلح بن گئے۔ شاہ جی محبت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام میں وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ جہاں پہنچنا ہر کسی کا کام نہیں

ایں سعادت بزر بازو نیت  
تانا بنشد خدائے نبشندہ

آپ کی مجلس میں تذکرہ ختم نبوت چمڑتے ہی رنگ مغل ہی تبدیل ہو جاتا تھا۔ اسی حب رسول کے جذبہ کی بدولت آپ کو جدید و قدیم مدعیان نبوت و رسالت سے سخت عداوت تھی۔ حقیقت سے نا آشنا لوگ اس چیز کو مذہبی تعصب اور تنگ نظری قرار دیتے ہیں مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ تعصب نہیں بلکہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کی انتہا ہے جو امیر شریعت کے دل و دماغ پر جلوہ گر ہوئی اگر آواز کی بلندی کو دیکھا جائے تو رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زانے کے ہاشمی یاد آجاتے تھے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم محترم سیدنا عباس بن عبد المطلب کی آواز سے متعلق علماء تفسیر نے لکھا ہے کہ تقریباً آٹھ میل تک پہنچتی تھی۔ (جمل حاشیہ تفسیر جلالین جلد دوم صفحہ ۴۳۷ آیت۔ ثم ولیتمہ برین)

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بھی دو دو لاکھ کے کثیر مجمع سے خطاب فرمایا ہے جس زمانہ میں لٹوٹا اسپیکر ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت بھی حاضرین میں سے کسی نے تقریر کے عدم سماع کی شکایت نہیں کی۔ مسلسل بیان میں تو آپ کی گرد راہ کو بھی کوئی نہیں پہنچا آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے بولتے اور آواز میں کچھ فتور نہ آتا۔ اور ساتھ ہی حاضرین میں سے کسی کا اٹھ کر نہ جانا بلکہ عموماً سامعین کو وقت کی رفتار کا پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ یہ کرامت پر کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟ دورانِ تقریر طبیعت کا رخ شر و ادب کی طرف مڑتا تو جوش و جذبہ سے لبریز اشعار کی آمد شروع ہو جاتی۔ خصوصاً وہ اشعار جو آپ کی طبیعت کے فکر کا نتیجہ ہوتے۔

حاضرین کے قلوب و اذہان پر بے حد اثر چھوڑتے تھے۔

قرآن فہمی کی دولت سے بھی کامل حصہ پایا تھا۔ اگر آپ اہل قلم ہوتے اور قرآن کی تفسیر یا ترجمہ لکھ جاتے تو طویل عرصہ تک آپ ہی کی اس تالیف سے مسلم اور غیر مسلم فائدہ اٹھاتے۔ آپ کی تقریروں میں بعض آیات کے ترجمے جو آپ کی زبان سے صادر ہوئے ہیں وہ لوگوں کے ذہنوں سے اترنے والے نہیں ہیں۔

راقم الحروف بھی آپ کی اس تقریر میں موجود تھا۔ جس میں سورہ صافات پارہ نمبر ۲۳ کی آیت

فما ظنکم برب العلمین

کا ترجمہ یوں فرمایا۔

پس تم نے تمام مخلوقات کے مالک کے لئے کیا رکھا ہے؟ حضرت امیر ہدایت نے ارشاد فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کو راہ راست پر لانے کے واسطے سعی فرماتے ہوئے کھتے ہیں کہ تم لوگوں نے عبادت اور بندگی جب غیر اللہ کے لئے روا رکھی تو اللہ تعالیٰ کے لئے باقی کیا رہ گیا؟ عبادت ہی تو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص تھی جب وہ ہی

من دون اللہ

کے واسطے ثابت ہونے لگی تو بتلاؤ اب رب العالمین کے سامنے پیش کرنے کے لئے کون سا تمہ باقی ہے؟ جو پیش کر کے اس کی خوشنودی کا تمہ حاصل کیا جائے۔ اگر کوئی صاحب ایسے ہوں جنہوں نے آپ کی تمام تقریریں نوٹ کی ہوں تو وہ اس قسم کی آیات اور احادیث کے ترجمے کافی تعداد میں اہل اسلام کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر اخلاق اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا زندگی بھر دنیا کی کوئی چیز نہیں بنائی یہاں تک کہ رہنے کے لئے ایک جھونپڑی تیار کرانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آپ چاہتے تو اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے کافی مقدار میں جائیداد بنا سکتے تھے۔ مگر مکتان کے ایک کچے اور معمولی مکان میں زندگی گزار گئے جو کہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ یہ، میں انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی عملی زندگی نے مسند باغ فدک کے تنازعہ کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ جب پوتے کا یہ حال ہے تو داد اور دادی کا حال کیا ہوگا؟ علم کلام کی کتابوں کے دفتر موجود ہیں جیسا مطالعہ کر کر کے ایک دنیا تک گئی ہے صرف ایک مسند فدک ہے جو مل ہونے کا نام نہیں لیتا۔ شبہات در شبہات اور شکوک و شکوک کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے اگر آپ ان شبہات کے انہار سے گلو خلاصی چاہتے ہیں تو آئیے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سیرت اور عملی زندگی پر نگاہ ڈالئے۔

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا



## آفتابِ خطابت

عمرہا در کعبہ بت خانہ فی نالہ  
تاز بزمِ غیب دانائے راز آئید بروں

کچھ عرصہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ جب بھی کوئی صاحبِ کمال اس دنیا سے عالمِ باقی کو رخصت ہوتا ہے ملک و ملت کو اس کا بدل نصیب نہیں ہوتا۔ اقبال کے بعد پھر اقبال پیدا نہیں ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں کیا گئے۔ اپنی آتشِ بیانی ساتھ لے گئے۔ ابھی اکادمی باقی تھا کہ ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو عصر کے وقت عظیم دینی اور سیاسی رہنما دنیا کے بہت بڑے خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاری رفیقِ اعلیٰ کو لبیک کہہ گئے۔ مرحوم برصغیر کے آخری خطیب تھے۔ ان کے ارتحال سے ملک کی خطابت ہمیشہ کے لئے سو گوار ہو گئی۔ اب نہ شاہ جی پھر منظر عام پر آئیں گے اور نہ عوام کو ان کی رعد آسا تقریروں کے سننے کا موقع ملے گا

قدیس سا پھر نہ اٹھا کوئی بنی عامر میں  
فر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

خدا معلوم مولانا ابوالکلام کو ابوالکلامی لقب کس سنن شناس نے عطا کیا تھا مگر اس حقیقت سے مولانا کے دشمنوں کو بھی انکار نہیں۔ کہ واقعی وہ ابوالکلام تھے۔ اسی طرح جس کسی نے پہلی بار حضرت شاہ جی کو خطیبِ اعظم کہہ کر پکارا۔ اس نے دنیا کی بہت بڑی صداقت کو آشکار کیا۔ حضرت شاہ جی پبلک تقریروں کے شہنشاہ تھے۔ چونکہ وہ ایسے دور میں منظر عام پر آئے تھے جبکہ ملک کو اتحاد کی بڑی ضرورت تھی۔ اس لئے وہ ایک عرصہ صرف ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہے۔ بلکہ اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے نہ کہتے تھے فرقہ وارانہ اختلافات سے بہت اوپر چلے گئے تھے۔ وہ انگریز کے پیدا نشی دشمن تھے۔ اور قادیانیوں سے انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ چونکہ قادیانی انگریز کے پروردہ اور مدح خواں تھے۔ اس لئے جب شاہ جی اپنی تقریروں میں ان پر چوٹیں کرتے تو نہ صرف مسلمان خوش ہوتے بلکہ ملک کی آزادی کے تمام طلب گار ان لطیفوں اور چٹکوں کو مزے لے لے کر سنتے تھے۔ شیعوں کو لکار کر کہتے "ارے دشمنِ نبوت چھین لینے کی فکر میں ہے اور تم خلافت پر جھگڑ رہے ہو!" حضرت شاہ جی کو خدا نے ذوالجلال نے بڑا وجہ چہرہ عنایت کیا تھا۔ قرآن پڑھتے تو خالص عربی معلوم ہوتے۔ اور یوں محسوس ہوتا گویا اس کا ابھی نزول ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کا تو متاثر ہونا لازمی تھا۔ مگر شاہ جی کی قرأت سے غیر مسلم بھی جھوم اٹھتے تھے۔ ان کا ایک ہندو نیازمند لکھتا ہے کہ۔

"جب وہ جیل خانے میں علی الصبح قرآن پاک پڑھا کرتے تھے تو فضا کتنی خوبصورت ہو جایا کرتی تھی۔

اور میں بھی سوچا کرتا تھا کہ کلامِ اللہ کتنا خوبصورت ہے۔ کتنا مقدس ہے کہ مجھ کافر کے دل پر بھی اپنے نقوش چھوڑ رہا ہے"

ایک دفعہ شاہ جی نے باغ لائگے خان (لمنان) میں تقریر کرتے ہوئے شاہنامے کے یہ شعر پڑھے۔

مشیر      شہر      خوردن      و      سو      ساد  
عرب      را      بجائے      رسانید      کار  
کہ      تاج      کیمیاں      را      کند      آرزو  
تغویذ      تو      اسے      چرخ      گرداں      تقو

شاہ جی کالب و بعد اور انداز بیان کچھ ایسا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ خود شاہ ایران عرب ترجمہ سپہ سالار کے خط سے برہم ہو کر آسمان سے مخاطب ہے۔ تقریر کرتے وقت شاہ جی بالعموم عصا ہاتھ میں رکھتے تھے مگر اس امر کو آپ نے عادت میں داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ عرب کے زندہ جاوید مقرر اور خطیب سببان سے متعلق تو اتنا مشہور ہے کہ وہ جب تک اپنا مخصوص عصا ہاتھ میں نہ لے لیتا تقریر نہ کر سکتا تھا۔ مشہور اموی خلیفہ عبدالملک کہا کرتا تھا کہ اگر میں ہاتھ سے اپنا عصا رکھ دوں تو میری تقریر کا آدھا زور ضائع ہو جائے لیکن شاہ جی تقریر کے لئے کسی سہارے کے محتاج نہ تھے۔ کئی دفعہ انہیں کاغذ کا ٹکڑا لئے تقریر کرتے دیکھا ہے۔

خطیب کے لئے ضروری ہے کہ اسے زبان پر پورا عبور ہو۔ اور جس موضوع پر وہ تقریر کرنا چاہتا ہے اس موضوع پر اسے گہرے اور وسیع علم کا مالک ہونا چاہیے۔ حضرت شاہ جی اردو میں تقریر کرتے تھے۔ اور وہ اردو کے اہل زبان نظر آتے تھے۔

یوں تو ہندوستان کا چہرہ ان کے قدم مسنت لزوم سے فیض یاب ہو چکا تھا۔ مگر مٹان اور لاہور ان کے خاص مراکز تھے۔ ان شہروں میں جب بولنے کے لئے کھڑے ہوتے تو پنجابی اور سرائیکی میں بھی فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا دیتے تھے۔ روزمرہ اور محاورے کا انہیں بڑا خیال رہتا تھا۔ گفتگو کے دوران بھی اگر کوئی شخص غلطی کر جاتا تو اس کی وہیں اصلاح فرما دیتے تھے۔

ایک دفعہ کسی صاحب نے اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کا ایک فقرہ بول دیا۔ "سادات باد ہمدیش"۔ بزم مسجد انہ قابل سوختی نہ زلائق فروختی۔ "فوراً اسے ٹوکا اور فرمایا بھئی! اورنگ زیب جیسے ادیب پر یہ ظلم نہ کرو۔ یہ فقرہ یوں ہے نہ سوختی نہ فروختی۔ کسی نے کہا "آئی ٹم بم"۔ فرمایا "ٹم بم بم"۔

خطیب کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دانت مضبوط ہوں۔ اور حلق صاف ہو۔ اہل عرب تقریر اور خطابت میں ماہر تھے۔ اس لئے وہ ان چیزوں کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے خلیفہ عبدالملک کے جب دانت ہلنے لگے تو اس نے انہیں سونے کے تار سے جکڑوا لیا۔ شاہ جی کے دانت موتیوں کی طرح خوبصورت اور مضبوط تھے۔ حلق ہمیشہ صاف رہا۔ آخری عمر میں جب دانتوں نے دھوکہ دیا تو آپ نے تقریر کرنا ترک کر دی۔ چہرہ کی اولٹی بدلتی کیفیات تقریر کو موثر کرنے میں بڑا کام دیتی ہیں۔ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ۔

"چہرہ کی کیفیات مقرر اور خطیب کے لئے از حد اہم ہوتی ہیں۔ یہ کیفیات، علامتیں مقرر اور خطیب کے

قدرتی حسن سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔"

شاہ جی کی خطابت کی کامیابی میں ان کے چہرہ کی اولٹی بدلتی کیفیات کو بھی دخل تھا۔ ان کے چہرے کا جلال ہی سارے مجمع کو سُٹھی میں لے لیتا تھا۔ اگر جبر الصوت کے وہ سنت مخالفت تھے۔ فرماتے تھے "جب تک آنکھیں ہار نہ ہوں۔ تقریر کا لطف ہی نہیں آتا۔ مگر جب سے یہ میاں گمبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) آیا ہے۔ تقریر کا مزہ اٹھ گیا ہے۔"

خطیب کے لئے خلوص بے حد ضروری ہے۔ مقرر ہزار قابل کیوں نہ ہو۔ اگر اس میں اخلاص نہیں تو ایسا مقرر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس دل میں خلوص ہو اس کی بات اثر کئے بغیر نہیں رہتی اقبال کہتے ہیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے  
پر نہیں۔ طاقت پرواز نگر رکھتی ہے

حضرت شاہ جی اس مدرسہ فکر سے متعلق تھے جس کے شیخ مولانا محمد قاسم نافو توی اور مولانا محمود حسن رحمہ اللہ رہے تھے۔ تمام عروہ اسی فکر میں رہے کہ انگریز کو اس ملک سے کیونکر نکالا جاسکتا ہے۔ اور انہوں نے نکال کر ہی دم لیا۔ انہیں اپنی قوم سے محبت تھی۔ اگر کوئی مسلمانوں پر حملہ کرتا تو سینہ تان کر آگے آجاتے تھے۔ چنانچہ جس زمانے میں تارا سنگھ نے مسلمانوں کو خون کی ندیاں بہا دینے کی دھمکیاں دی تھیں تو شاہ جی نے لکار کر کہا۔

"ماسٹر جی! ہوش کے ناخن لو کیا کہتے ہو! جس قوم کے فرزند خون کے قلم میں تیرے رہے ہوں۔ تم

انہیں اپنی ننھی منی ندیوں سے ڈراتے ہو!"

شاہ جی کا دوسرا اہم محاذ قادیانیت تھا۔ بلاشبہ قادیانیت پر وہ برق صاعقہ بن کر گرے۔ سر کے بال سیاہ تھے تو بھی اور جب سفید گالے سے ہو گئے تب بھی وہ قادیانیوں کے لئے بڑا خطرہ تھے۔ وہ جبر اس خانہ ستار نبوت کے خلاف بولتے رہے جب ضعیفی نے شدت سے مصور کر لیا اور انہوں نے آخری تقریر فرمائی تو بھی قادیانیوں کو اپنے تبرکات سے محروم نہ رکھا۔ گویا تنک ہار کر بطور اتمام حجت کے طنز آفرمایا۔

"اے قادیانیو! اگر نیا نبی مانے بغیر تمہارا گزارہ نہیں ہو سکتا اور اس کے بغیر تم جی ہی نہیں سکتے تو مسٹر جناح کو ہی نیا نبی مان لو۔ تمہارے مرزا صاحب تو تمام عمر حکومت برطانیہ کی چاپلوسی کرتے رہے۔ بلکہ اسی چاپلوسی کا معاوضہ بھی وصول کرتے رہے۔ مسٹر جناح مرد تو تھا جس بات پر ڈٹنا کوہ کی طرح اڑ گیا۔ آہوں کے بادل اٹھے، انگلوں کی گٹھا چھائی، خون کی برکھا ہوئی۔ لاشوں کا سیلاب آیا مگر کوئی چیز مسٹر جناح کے عزم کو نہ ہلا سکی۔ اس نے تاریخ کے اوراق کو پلٹ دیا اور ملک کے جغرافیہ کو بدل کر رکھ دیا۔ ارے تمہاری جموٹی نبوت کو بھی لٹ پٹ کر جگہ ملی تو اسی کے قدموں میں۔ تمام عمر گزار دی۔ انگریز کی نوکری نہیں کی۔ حکومت سے خطاب نہیں لیا۔ انگریز سے کوئی تनावل نہ نہیں کی۔ اور ایک تمہارا نبی ہے کہ حضور گورنمنٹ کے آگے عاجزانہ درخواستیں کرتے کرتے پچاس الماریاں سیاہ کر ڈالیں۔"

شاہ جی کی تقریر کا یہ مختصر سا اقتباس اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ شاہ جی کی طبیعت میں شوخی اور لطافت کی پاکیزہ روش تھی۔ نہ اتنی کہ طنز بن جائے اور نہ اتنی کھلی کہ مسامت سے گر جائے۔

انہوں نے ساری عمر رمنائے الہی میں بسر کی۔ ان کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا سب خدا کے لئے تھا۔ وہ اپنے خدا کے پاس پہنچ گئے۔ انہی روح پر فتوح اعلیٰ علیین میں العلامات خداوندی سے شاد کام ہو رہی ہوگی۔

شاہ جی کی سب سے اہم یادگار ان کے خطبے ہیں۔ انہوں نے کانگریس کے پلیٹ فارم پر جو تقریریں کی۔ جو احرار کانفرنسوں میں وجد آفریں خطبے دیئے وہ سب کے سب سی آئی ڈی کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ انہیں حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ پاک وہند کی دونوں حکومتیں شاہ جی کا احترام کرتی ہیں اور پھر یہ تاریخی ریکارڈ ہے۔ اس سے نہ صرف حضرت شاہ جی کے خطیبانہ جگر پارے پوری قوم کے سامنے آجائیں گے بلکہ اس سے ہندوستان پاکستان کی تاریخ آزادی مدوں کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔

من آنچہ شرط بلاغ است با تو مے گویم  
تو از ستمختم پند گیر خواہ ملل

حبیب اللہ عظیمی

### عقیدت کے پھول

سردار	را	عدم	کو	امیر	ریعت
وہ	مرد	مجاہد	وہ	پیر	طریقت
وہ	شیدائے	ملت	وہ	شاہ	بخاری!
موثر	تھی	ہر	ایک	جس	نصیحت!
خطیبوں	کے	قائد	ادیبوں	کے	ربز!
کہ	تھی	نظم	و	نثر	آپ کی بیش قیمت!
وہ	آزادی	ملک	و	ملت	کے شیدا
اسیری	کی	جس	نے	اٹھائی	صعوبت
وہ	حق	و	صد اُفت	کا	عکس حسین اک
وہ	اک	زندہ	دل	اور	شگفتہ طبیعت
رفیتوں	کو	دے کر	وہ	داغ	جدائی
لئے	سوئے	فردوس	وہ	پاک	طہنت
سے	پیش	حضور	امیر	شریعت	
عظیمی	کی	جانب	سے	نذر	عقیدت



## شاہ جی کی پانچ باتیں

میں ان خوش نصیب طالب علموں میں ہوں جنہوں نے حضرت امیر شریعت کو امیر شریعت سمجھ کر دیکھا اور اسے میں فیما بینی بین و بین اللہ بڑی سعادت سمجھ رہا ہوں۔ والحمد للہ بے ہمتی اور بے عملی کے باعث اگرچہ حضرت سے استفادہ کا بے حد تصور وقت ملا میں نہ تو آپ کی قیادت میں کوئی ملکی یا سیاسی کام کر سکا اور نہ ہی کوئی ملی اور مذہبی خدمت۔ چند ارشادات جو گوش ہوش سے سننے کی سعادت میسر ہوئی وہ پلے باندھ لیں اور جب بھی اور جہاں بھی تصور میسر ہو ملکت و ملت کے لئے کوئی حرکت کی تو انہیں پیش نظر رکھا ان میں سے چند یہ ہیں۔

۳۵۔ (۱) کے لگ بھگ کی بات ہے میں خیر المدارس جالندھر میں خیر الاسلامہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب اور حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب رائے پوری سے مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف اور اس درجہ کی دوسری کتابیں پڑھ رہا تھا کہ حضرت امیر شریعت جالندھر تشریف لائے وہاں کسی بزرگ کی درگاہ — کے سامنے بڑا میدان تھا میں حضرت کی تقریر تھی دوسرے طلباء کے ساتھ میں بھی جلسہ میں گیا فوجی بھرتی کے خلاف حضرت تقریر فرما رہے تھے۔ آیت کریمہ

ان الملوک اذا دخلوا قریہ افسد واھا الخ

کی اپنی ساحرانہ لہجہ سے تلاوت فرمائی تشریح اول سے آخر تک شیخ سعدی کے مشہور لطیفہ سے فرماتے رہے۔ شندیم گو پسندے را بزرگے الخ در میان میں کوئی نوجوان اٹھا اس نے کہا شاہ جی اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کو اہل ایمان کے ساتھ اقرب الی المودۃ قرار دیا ہے جبکہ آپ کا سارا زور خطاب ان کے خلاف ہے اور مشرکین سے ملے ہوئے ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔ حضرت نے فرمایا۔ عزیزا لگی آیات کی تلاوت آپ کرتے ہیں یا میں ہی کر دوں وہ تو زمین بولے تو بولے میری کیا بساط کا مصداق رہا حضرت نے

ذالک بان منهم قسیسین و رہباننا الخ

آیات تلاوت فرمائیں ایسا معلوم ہونے لگا کہ سائنس جدید صحیح سمجھتی ہے کہ آسمان ساکن ہے اور زمین متحرک۔ اسی دوران حضرت الاستاد مولانا محمد عبداللہ صاحب جو اسٹیج پر تشریف فرماتے تھے آیت کریمہ تھے۔

لاینها کم اللہ عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین

۱۔ مولانا کو سو ہوا ہے یہ واقعہ ۱۹۳۹ء کا ہے۔ جب مجلس احمد اسلام نے فوجی بھرتی کی تحریک چلائی تھی۔ یاد رہے فوجی بھرتی کے خلاف اس تحریک میں کانگریس، لیگ اور جمیعت علمائے ہند کی برائے خاموشی تاریخ کا سوال یہ نشان ہے؟

۲۔ درگاہ امام ناصر رحمہ اللہ

کی طرف دینی زبان سے کچھ اشارہ فرمایا۔ شاہ جی نے بلند آواز سے فرمایا  
 "مولانا فکر نہ کریں میں جس دن احرام میں شامل ہوا اس رات سارا قرآن دیکھ لیا تھا"

یہی سنانا مقصود تھا میں اس سے یہ سمجھا کہ ملک و ملت کی کوئی خدمت بالخصوص اجتماعی طور پر کرنے کا  
 ارادہ ہو تو پورے غور و خوض کے بعد علی وجہ البصیرت اس میں شامل ہونا چاہیئے۔ یوں جوش میں آکر آج  
 شامل ہو گئے اور کل کسی نے ادھر ادھر کی باتیں سنائیں تو ساری عقیدت ختم۔ اسی وجہ سے آج روزمرہ کے عہد  
 و مواثیق کی جو مٹی پلید ہو رہی ہے۔ انہوں نے حضرت شاہ جی کا یہ ارشاد دیا تو سنا نہیں اور یا پھر سمجھا نہیں۔  
 ۲۔ "آہ کہ دین اسی راستہ سے واپس جا رہا ہے"

ایک دفعہ بٹان میں غالباً وفاق المدارس کی کسی میٹنگ میں شریک ہو کر میں حضرت مولانا عبدالحق  
 صاحب شیخ الحدیث و مہتمم دارالعلوم حنائیہ اکوڑہ خٹک کے ساتھ حضرت شاہ جی کی زیارت کو حاضر ہوا۔  
 حضرت قاسم العلوم سے ٹکل کر اپنے دولت کدہ پر تشریف لے جا رہے تھے الوداعی مصافحہ کے وقت حضرت  
 مولانا نے صرف بالغیر پانچ روپے کا نوٹ حضرت کے ہتھیلی میں چھپا کر رکھا۔ حضرت شاہ جی نے اسے سر پر  
 رکھا اور فرمایا حضرت چھپاتے کیوں ہیں یہ تو میرے لئے بڑے فخر کی بات ہے کہ مجھے شیخ الحدیث ہدیہ دے  
 رہے ہیں۔ اسی دوران کھڑے کھڑے کچھ لطافت اور ظرافت بھی سنائے سامعین کی جگہ صرف ہم دو تھے۔ اسی  
 میں حضرت نے ایک درد بھری آہ کے ساتھ یہ بھی فرمایا حضرت ہمارے انہی مدارس کے ذریعہ دین ہند و پاک  
 میں آیا اور اب اسی راستہ سے واپس جا رہا ہے۔

کچھ کچھ تو اس وقت بھی اپنی غفلتوں اور بد اعمالیوں کا اندازہ لگاتے ہوئے اس آہ کے مندرجات سمجھ  
 میں آنے لگے۔ لیکن جب سے دشمنان صحابہ کرام سے گٹھ جوڑ شروع ہونے لگا ہے۔ اور جب سے ان اعداء  
 دین۔ اعداء قرآن کو مسلمان کھلونے پر زور دیا جا رہا ہے اور یہ سارا سکوت فی الحق دینی مدارس کے ذریعہ دینی  
 خدمات کی فہرست میں گنوانے کا کاروبار شروع ہو چکا ہے تو حضرت شاہ جی کی فراست مومنانہ پر جان و دل  
 سے قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔

۳۔ علماء امت کی پولیس ہے  
 دارالعلوم نعمانیہ ڈیرہ اسماعیل خان میں کسی سالانہ اجتماع کے موقع پر طلباء کی ایک مجلس حکیم الاسلام  
 حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے فرمایا کہ "علماء کا کام تو قوانین اسلامیہ کی  
 حفاظت ہے یہ امت کی پولیس ہے اور پولیس کی ٹنک حللی یہ ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو  
 پکڑے چاہے اس کا باپ ہو یا بیٹا۔ کوئی بڑا افسر بھی کیوں نہ ہو اسے بھی پکڑے ورنہ پولیس والا احرام خود ہو  
 گا۔ جو کسی کی شخصیت کا تو خیال رکھے مگر قانون کی حفاظت کا خیال نہ رکھے۔ فرمایا یہی ڈیوٹی علماء کی ہے قانون  
 شریعت کی جو بھی مخالفت کرے گا علماء کا فرض ہے کہ اسے پکڑیں کسی کا لحاظ کئے بغیر فرمایا کہ حکیم الاسلام  
 نے فرمایا کہ بزرگوں نے اختلافی بات کہنی ہو تو دروازہ بند کر کے اندر کہیں باہر کہیں گے تو ہم کسی کا لحاظ کئے  
 بغیر اسے پکڑ لیں گے چاہے عدالت میں پہنچ کر چھوٹ بھی جائیں۔

سوچتا ہوں کہ اب ہم میں کتنے ہیں جو یہ فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ کسی بڑے دینی پیشوا کے مقابلے میں ہم حق گو بن سکتے ہیں۔ کسی بڑے عالم کی حق پرستی کے نام سے پگھلی اچال سکتے ہیں کسی جابر حکومت کے خلاف کلمہ حق کہہ کر زندہ باد ہو سکتے ہیں لیکن کیا کسی گروپ یا کسی سیاسی رفیق کو قانون شریعت کے پرچے اڑاتے ہوئے دیکھ کر ہم اسے ترجیحی نگاہ سے دیکھنے کی توفیق بھی رکھتے ہیں۔ واقعات کی زبان سے اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ کاش کہ شاہ جی کا یہ ارشاد آج ہمارا رہنما بن سکتا اور ہر سو پر ہم اس پر عملدرآمد کر سکتے۔

علماء کا کام رہنمائی ہے نہ کہ نمائندگی

غالباً ڈیرہ جی میں کسی خست عام یا خاص میں حضرت شاہ جی کا یہ ملفوظ بھی سامعہ نواز ہوا کہ علماء کا کام قوم کی نمائندگی نہیں کہ قوم جو چاہے آگے نکل کر اور کچھ قربانی دیکر "بقدم قومہ" کا ہر حال میں مصداق بنے تاکہ قوم سے خوشنودی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر سکیں چاہے وہ ہلاکت کے گڑھے کی طرف جا رہی ہو۔ بلکہ علماء کا کام قوم کی رہنمائی ہے جو راستہ چاہے قوم اسے ہزار بار ناپسند کرے خدا تک پہنچا نیوالا ہو وہی انہیں دکھلائے اسی پر چلنے کے لئے اس کو آدھہ کرے اور خود اسی پر چلنے کا نہ صرف عزم عہد کرے بلکہ عمل بھی کرے۔

اب ہم کیا کر رہے ہیں قوم کی رہنمائی یا نمائندگی

اعظمک بواحدة ان تقومو الله مشى و فردای ثم تتفکرو  
یہ فیصلہ "استفت قلبک" کے ارشاد نبوی علیہ السلام میں مضمر ہے۔

ہماری نظر عوام پر رہتی ہے عوام جو چاہیں ہم ان کے منہ سے کمال کر اپنی زبان سے کلمہ دیتے ہیں۔ زبان میری ہے بات ان کی۔۔۔۔۔ افغانی بارہ سال سے کفر کا مقابلہ کر رہے تھے۔ پندرہ لاکھ کے لگ بھگ افغان شہید ہو گئے ہزاروں علماء گریختار ہوئے سینکڑوں خاتواں سینماؤں میں تبیل ہو گئیں۔ ہم نے ان کے لئے ایک جلوس بھی نہ نکالا۔ اور جب عوام نے چاہا تو ہم نے لائحہ عمل جلوس عراق کے صدر کے لئے نکالے یہ شورا شوری اور وہ خاموشی کس بات کی غماز ہے کہ ہم نمائندگی کر رہے ہیں یا رہنمائی۔ شاہ جی پر خدا کی ہزاروں رحمتیں کہ وہ آج ہم میں موجود نہیں مگر ان کی ہدایات اب بھی ہماری رہنمائی کر رہی ہیں۔ فرحمہ اللہ رحمہ واسعہ لیکن سننے والے کان کہاں؟ لہم اذان لا یسمون بہا

۵۔ مزہ تو تب ہے کہ گرتوں کو تمام لے ساقی

غالباً ۴۲-۴۳ء کی بات ہوگی کہ شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ ڈیرہ اسماعیل خان سیرت کے ایک جلسہ میں تشریف لائے۔ حضرت امیر شریعت اور حضرت مولانا گل شیر مرحوم شہید بھی تشریف لائے تھے۔ عید گاہ کھان میں نماز جمعہ کے بعد حضرت شیخ کا خطاب تھا جلسہ کی صدارت حضرت شاہ جی کو کرنی تھی۔ حضرت شاہ جی بجائے کرسی کے سٹیج پر بیٹھے حضرت مدنی نے دو چار بار اشارہ کیا کہ حضرت کرسی صدارت کو سنبھالیں حضرت شاہ جی معذرت فرما رہے تھے آخر میں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے فرمایا شاہ جی میں حکم دیتا ہوں کہ کرسی پر بیٹھیں۔ شاہ جی نے فرمایا لاؤ بجائی کرسی لاؤ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ شاہ جی ایک

سیکند میں کرسی پر بیٹھے اور کرسی کو سر کا دیا اور کہا حضرت حکم کی تعمیل کر دی مزید بیٹھنے کی ہمت نہیں۔  
دوسرے دن جب حضرت شیخ رخصت ہو رہے تھے اور قیام گاہ سے موٹر تک بہت زیادہ جہوم تھا  
حضرت شاہ جی کمرہ قیام سے باہر نکلے اور لٹکار کر فرمایا۔

راستہ چھوڑو نہ ہم ڈنڈا چلاتیں گے۔ حاضرین کے پھروں پر مسکراہٹ کھینچنے لگی اور لوگوں نے راستہ دیدیا  
جب حضرت شیخ کو کار میں بٹھلایا تو حضرت شاہ جی نے یہ شعر عجیب انداز سے پڑھا۔

نہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے

مزا تو تب ہے کہ گرتوں کو تمام لے ساقی

ساقی کے لفظ پر جب شاہ جی نے حضرت شیخ کی طرف اشارہ کیا تو سینکڑوں آنکھیں بے اختیار منماک ہو  
گئیں اور آنسو بہہ نکلے

اب انہیں ڈھونڈ جرائے رخ زیبالیکر

تبلیغی جماعت کے دعوت کے چھ نمبر ہیں ان چھ باتوں میں سارے دین کا نبوڑ ہے۔ میرے خیال  
میں حضرت شاہ جی کی مندرجہ بالا پانچ باتوں میں دین و دنیا سمیٹ ہوئی ہے۔ اللہ ان پر مجھے اور سب کو عمل کی  
توفیق اور ارزانی فرمادیں۔ آمین۔ تم آمین یا رب العالمین۔۔۔۔۔ بحرمۃ سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ  
علیہ وسلم۔

مولانا حافظ ریاض الرحمان اشرفی مرحوم نے بیان فرمایا کہ میں ایک دفعہ غلام احمد پرویز کے درس میں چلا گیا اور  
متاثر ہو کر واپس آیا۔ پھر حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ سے ذکر کیا کہ پرویز صاحب دوران تقریر بہت رو  
رہے تھے تو امیر شریعت نے بے ساختہ فرمایا.....

”جا حافظ! رون توں متاثر ہو گیا ایس؟“

(ارے حافظ! محض اس کے رونے سے متاثر ہو گئے ہو؟)

اور پھر لہن داؤدی سے قرآن مجید کی آیت پڑھی۔

وجاء واباہم عشاء بیسکون

(ترجمہ) اور یعقوب علیہ السلام کے بیٹے، عشاء کے وقت روتے ہوئے آئے۔ (آگے ذکر ہے کہ انہوں نے کہا کہ

یوسف علیہ السلام کو بھیڑیا کھا گیا ہے)

حافظ صاحب فرماتے تھے کہ شاہ جی رحمہ اللہ کے اتنا فرمانے سے میرا سارا تاثر فوراً ختم ہو گیا۔

(مولانا عبد الرشید ارشد۔ ماہنامہ الرشید لاہور۔ مئی ۱۹۹۳ء ص ۷۱)

## ماہِ جمی کے علمی امتیازات

اہل نظر کا کہنا ہے کہ متحدہ ہندوستان کے دورِ زوال میں ہر شعبہ زندگی میں بڑے بڑے باکمال لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لے کر برطانوی سلطنت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ ایک شعبہ خطابت کا بھی تھا جو ابلاغ کے لئے ایک موثر ذریعہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ابلاغ کے لئے بہت حد تک آج میڈیا سے کام لیا جا رہا ہے پھر بھی خطابت کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں اور جس دور کے حوالہ سے ہم بات کر رہے ہیں۔ اس میں تو خطابت ہی خطابت تھی، ملت مسلمہ کی اس دور کی تاریخ میں ابوالکلام، سید سلیمان ندوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، نواب بہادر یار جنگ کے پہلو بہ پہلو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام اس شعبہ میں بڑا نمایاں ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ شاہ جی بہت سے حوالوں سے ایک ممتاز شخصیت کے مالک ہوں۔ ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہر خطہ و علاقہ کی زبان میں اس خطہ و علاقہ کے محاوروں کا لحاظ کر کے اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک اس کا پیغام پہنچانا اور ہر زبان کے لائق ادا اشعار اور ضرب المثال کو موتیوں کی طرح جڑنا شاہ جی کا ہی کام تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ابوالکلام، سید سلیمان، علامہ عثمانی، مولانا جوہر اور نواب بہادر یار جنگ سبھی شاہ جی کی خطیبانہ عظمت کے معترف تھے۔ ان کی خطابت کو موہبت الہی قرار دیتے اور بر ملا یہ کہتے کہ ان کی خطابت کے مقابلہ میں ہماری خطابت ایسے ہی ہے جیسے قورمہ کے مقابلہ میں چٹنی۔ لیکن میں آج کی صحبت میں شاہ جی کی علمی حیثیت کے حوالہ سے بات کرنا چاہتا ہوں کیونکہ خطابت کی دنیا میں بہت سے نام ایسے بھی مل جائیں گے جہاں لمبا چوڑا علم نہیں ہوگا اور اب تو گستاخی معاف خطابت نام ہی جہالت کا بن گیا ہے۔ آج بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں خطابت کے ساتھ علم کی دولت میسر آئی ہے۔ اکثر نامور خطبا ایسے ہیں جن کا مبلغ علم چند قصص کی کتابیں ہیں اور بس۔ اس لئے آج کے دور میں کسی کی خطیبانہ عظمت کے ذکر کا مضمون یہ ہے کہ وہ بے چارہ علم سے کورا تھا۔ شاہ جی کی علمی عظمت کا کھٹے بندوں اظہار و اعتراف ایشیا کی سب سے بڑی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے مستم قاری محمد طیب صاحب مرحوم نے خوب انداز میں کیا اور قاری محمد طیب صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ قرآن مجید کی الہامی تفسیر میں شاہ جی کو کمال حاصل ہے بلکہ قاری صاحب کی خواہش تھی کہ جن اسرار و رموز قرآنی کا تذکرہ شاہ جی تقریروں اور نجی مجالس میں کرتے ہیں۔ اسے کاش یہ صفحہ قرطاس پر منتقل ہو جائیں۔ شاہ جی کی علمی عظمت کا اظہار علماء کے ایک بڑے مجمعے میں اس وقت ہوا جب ہمارے آبائی شہر بصرہ کی شیر شاہی مسجد کے متولی کے حوالہ سے اختلاف پیدا ہوا، مجلس حزب الانصار کے بانی مولانا ظہور احمد بگویی اور ان کے برادر بزرگ مولانا محمد بچا کے درمیان مسئلہ متنازعہ تھا۔ مولانا ظہور احمد نے اپنا ثالث شاہ جی کو تجویز کیا تو مولانا محمد بچا نے

معروف چشتی خانقاہ سیال شریف کے سجادہ نشین خواجہ قمر الدین کو..... خواجہ قمر الدین اس وقت کے سجادہ نشینان پنجاب میں سب سے بڑے عالم تھے۔ جنہیں سلسلہ خیر آباد کے بزرگ عالم مولانا معین الدین اجمیری کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ ویسے خواجہ صاحب اپنی علمی سند کے حوالہ سے بڑے فر سے فرمائے کہ میری سند میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کا اسم گرامی ہے جنہوں نے پیغمبر اسلام کی تعریف میں وہ نکات بیان کئے کہ مولانا کے بڑے بڑے نکتہ جینوں کی فکر ان کے گرد راہ کو نہیں پہنچ سکتی۔

میرے والد گرامی مولانا محمد رمضان علوی کے بقول اس نزاع کے فیصلہ کے لئے سرگودھا شہر کی جامع مسجد میں اجلاس ہوا۔ صلح شاہ پور (اب سرگودھا) کے علاوہ دوسرے مقامات کے جید علماء اور فریقین کے ہمدرد بڑی تعداد میں موجود تھے۔ مسئلہ اس قسم کا تھا کہ فقہی سربراہ پر گہرا عبور رکھنے والا شخص ہی اس پہل کو عبور کر سکتا تھا۔ جبکہ شاہ جی کے متعلق ایک فقید المثال خطیب کی شہرت تھی لیکن مولانا ظہور احمد بگویی جیسے ذہین شخص نے اپنے شیخ طریقت مولانا احمد خان نقشبندی مجددی کے اشارہ سے شاہ جی کا جو انتخاب کیا تھا وہ بلاوجہ نہ تھا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی ایک بہت بہتہ کار اور جید عالم تھے۔ لیکن یہ بات تاریخ میں محفوظ ہے کہ شاہ جی نے کتب فقہ و فتاویٰ کی روشنی میں اپنے مؤکل کا مقدمہ اتنی خوبصورتی سے لڑا کہ فیصلہ مولانا ظہور احمد کے حق میں ہوا اور پھر مولانا ظہور احمد اپنی ساری زندگی شیر شاہی مسجد بمیرہ کے مستوی اور خطیب رہے۔ چونکہ وہ خود اولاد سے محروم تھے۔ اس لئے ان کے بعد ان کے برادر بزرگ مولانا نصیر الدین کے فرزند مولانا افتخار احمد جانشین ہوئے اور اب ان کے فرزند برادر عزیزا برار احمد بگویی اس منصب پر فائز ہیں۔ اس فیصلہ کے نتیجہ میں شاہ جی کی علمی دھاک بیٹھ گئی اور بالخصوص شمالی پنجاب میں اس فیصلہ اور شاہ جی کے علمی دلائل کا زبردست چرچا ہوا۔

شاہ جی کے حوالہ سے اور ان کی علمی عظمت کے حوالہ سے ایک اور بات کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ایک دنیا جانتی ہے کہ ابجد خدام الدین لاہور کے سالانہ جلسہ ۱۹۳۰ء میں انہیں امیر شریعت تجویز کیا گیا اور اس موقع پر پانصد علماء نے ان کی بیعت کی۔ اس تجویز کو پروان چڑھانے والے علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری تھے۔ جو علامہ اقبال کے علمی مرشد، دور آخر کے محدث جلیل اور فقید النفس بزرگ تھے، دہلی کے بزرگ عالم مولانا احمد سعید نے علامہ انور شاہ کی وفات پر کہا تھا کہ ہم نے ایک لائبریری و فتادی۔ خانقاہ گواٹہ کے فیض یافتہ اور جامعہ عباسیہ بہاولپور کے علمی سربراہ مولانا غلام محمد نے انور شاہ کے آخری سفر کے موقع پر جب وہ شدید بیمار بھی تھے۔ اسی سے زیادہ انتہائی مشکل سوالات مولانا انور شاہ کے سامنے رکھے۔ مولانا نے ایک ایک سوال کا جواب کتابوں کے صفحات اور سطور کی قید کے ساتھ لکھوایا۔ جس پر مولانا غلام محمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور کہنے لگے کہ آپ کے بعد ہم جیسے لوگوں کی علمی پیاس کون بجھائے گا۔ اسی عظیم عالم انور شاہ نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی امیر شریعت کی تجویز پیش کر کے خود ہی سب سے پہلے بیعت کی۔ اس منصب و اعزاز کا مقصد کیا تھا۔ اس کے لئے قارئین کے سامنے ایک حوالہ لانا ضروری ہے۔ قومی ادارہ

برائے تحقیق تاریخ و ثقافت کی پہلی جلد میں ضمیمہ جات کے حصہ میں دوسرا ضمیمہ صفحہ ۴۶۷ سے شروع ہوتا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "مسودہ فرائض و اختیارات امیر الشریعت فی البدن" ہے۔ یہ مسودہ ۹ دسمبر ۱۹۳۱ء کو مرتب ہوا۔ اسے ترتیب دینے والے مولانا کفایت اللہ، مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا محمد سجاد بہاری جیسے صاحب نظر علماء تھے۔ بعد میں سید سلیمان ندوی، حکیم اجمل خان جیسے حضرات بھی شامل کئے گئے۔ بیس جند علماء اور ذمہ دار زعماء پر مشتمل اس کمیٹی نے جو مسودہ تیار کیا وہ متحدہ ہندوستان کی مسلمان قوم کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان قوم کی تنظیم، اس کے دینی، ملی، روحانی، علمی، مالی اور عدالتی مسائل کو اپنے طور پر حل کرنے کا نظم بنایا جائے تاکہ مسلمان قوم انگریزی قوانین کی دلدل سے نکل سکے، اس نظام کی تجویز و تحریک کے سلسلہ میں ابتدائی شورے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سجاد بہاری کے تھے۔ مولانا ابوالکلام کی جیل کی وجہ سے مولانا سجاد نے ساری ذمہ داری اپنے سر لی اور یہ حیرت زما معاملہ ہے کہ انہیں کے صوبہ بہار میں یہ نظام بڑی کامیابی سے سب سے پہلے چلا اور پھر دھیرے دھیرے ہندوستان کے مختلف خطوں میں پھیلتا گیا اور تقسیم کے بعد بھی ہندوستان کے بڑے حصہ میں، یہ نظام کامیابی سے چل رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں مسلمان بہت سے عدالتی جھگڑوں اور پیچیدگیوں سے بچ کر اپنا وقت و سرمایہ بچا رہے ہیں۔ یہ ساری کاوش جمیعت علماء ہند کے تحت ہوئی۔ علامہ انور شاہ اس نظام کا اہم حصہ تھے۔ پنجاب میں اسی نظام کی خاطر امیر شریعت کے لئے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا انتخاب ہوا لیکن ہمیں یہ اعتراف ہے کہ اس بد نصیب خطہ میں یہ نظام اپنی اصلی شکل میں برپا نہ ہو سکا۔ لکھنؤ کے معروف عالم مولانا محمد منظور نعمانی کے فرزند مولانا عتیق الرحمن نے چند ماہ قبل لندن سے ایک خط میں ان سطور کے راقم کو بطور خاص لکھا کہ پنجاب میں اس نظام کا کیا بنا؟ اور جمیعت علماء کی نگرانی میں ملک کے بڑے حصہ میں جو نظام کامیابی سے چلا پنجاب میں اس پر کیا گزری؟ میں مولانا عتیق الرحمن کو کیا بتاؤں کہ اس کا سبب کیا ہوا اور پنجاب میں اس نظام پر کیا گزری؟ سب سے پہلا مسئلہ تو خود سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا تھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فقر غیور لے کر پیدا ہوئے، انہیں قدرت نے بے پناہ علم، جوش عمل، خطابت، معاملہ فہمی اور سب سے بڑھ کر بے کراں دولت اخلاص سے نوازا تھا۔ میری عقیدت مندانہ نہیں دیانت دارانہ رائے ہے کہ وہ قافلہ صحابہ کی پچھڑی ہوئی شخصیت تھے۔ انہیں قدرت نے لمن مجازی ہی نہیں دل و دماغ بھی مجازی عطاء فرمائے تھے۔ وہ "حادثاتی سید" نہ تھے بلکہ فی الواقع حسنی سادات کے گل سرسبد تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے جن خوبیوں اور کمالات سے نوازا تھا ان کے پیش نظر وہ بہت سے طبقات بشمول طبقہ اہل علم کی نظر میں مسودے تھے۔ لوگ ان کے علم، جوش عمل، اور جذبہ اخلاص کا مقابلہ نہ کر سکتے تو حد کے مکروہ ہتھیاروں سے کام لے، سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ہر مسجد، ہر مدرسے ہر ادارہ اور اس کے منتظم کی عزت کو اپنی عزت سمجھا۔ ان اداروں کی آب یاری کے لئے بھولی پھیلا کر ملت سے بھیک مانگی اور وقت آنے پر اداروں کی ناموس کے لئے خود اور اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کو اس طرح کھڑ کیا کہ کوئی سلی نظر نہ اٹھ سکی۔ لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ اس مرد غیور کے جذبات کی قدرت نہ کی گئی، بقول شاہ جی "میں مسودہ علماء

تھا "علامہ انور شاہ جیسی شخصیت نے جب اپنا ہاتھ بڑھا کر بیعت کی تو ان کے سامنے دم مارنے کی کئی میں جرأت نہ تھی۔ پانصد بیعت کرنے والوں میں ہندوستان کے ہر خطہ کے لوگ تھے۔ پنجاب کے جو حضرات اس موقع پر شریک بیعت تھے۔ مثلاً مولانا احمد علی لاہوری جیسے حضرات، انہوں نے آخر وقت تک عہد وفا کو نبھایا لیکن انگریزی سطوت کی خاطر جعلی نبی، جعلی ولی اور اس ظالم سامراج کے تحفظ کے لئے فوجی جوان چھنے والے خطہ کے اہل علم کی بڑی اکثریت نے اس مرد و فاشعار سے اپنے آپ کو دور رکھا، خطرہ یہ تھا کہ اس کے قرب کی وجہ سے کہیں انگریزی جیل کی ہوا نہ کھانی پڑے۔ ایسے ایسے المناک واقعات رونما ہوئے کہ بعض خطوں اور علاقوں کے اہل علم نے اپنے یہاں مہمان بنا کر ان کی سرگرمیوں سے خفیہ محکموں کو اطلاع دے کر نوازشیں حاصل کیں تو بعض مقامات کے یاران طریقت نے علاقہ کے جاگیرداروں اور وڈیروں کا اعتماد حاصل کر کے شاہ جی کے وعظ کے لئے مساجد و مدارس کے دروازے بند کر دیئے تو شاہ جی کے جی دار کارکنوں نے سکھوں اور ہندوؤں کے مذہبی مقامات پر ان کی تھریریں کرائیں۔ یوں صبح معنوں میں بت کدے میں اذان کی بات سامنے آئی۔ ان حالات میں امارت شرعیہ کا نظام کیسے چل سکتا تھا؟ لہذا شاہ جی نے اپنی تمام سرگرمیوں کا رخ باطل قوتوں خصوصاً قادیانیت کے محاذ کی طرف موڑ دیا۔ کہ اگر حدود و قیاسات اور بغض و کینہ کے ماحول میں امارت شرعیہ کا نظام نہیں چل سکا تو کم از کم تبلیغ و تحریک کے ذریعہ اقامت دین کا ماحول تو پیدا کر دیا جائے۔ بہر حال یہ بڑی تلخ داستان ہے اور مجھے یقین ہے کہ جو لوگ "امارت شرعیہ" کے نظام سے واقف ہیں اور پنجاب میں اس نظام کی ناکامی کا سوال ان کے ذہن میں ہے وہ ان اشارات سے بہت کچھ سمجھ گئے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہنا ضروری ہے کہ چونکہ پنجاب پر جعلی نبوت کا سایہ منوس پڑ چکا تھا۔ اس لئے شاہ جی نے اپنے مرشد علمی مولانا انور شاہ کے حکم سے اپنی سرگرمیاں اسی پر مرکوز کر دیں۔ مولانا انور شاہ ہی تھے جن کی توجہ سے علامہ اقبال نے زندگی کے آخری ایام میں بالکل اچھوٹے انداز سے قادیانیت کا تجزیہ کیا، مرحوم کے فرزند جاوید میاں خواہ کچھ کہیں، اقبال کی زندگی کی یہ وہ نیکی ہے جسے اس کی سوانح سے کھرچا نہیں جا سکتا۔

سید ابومسعود البوذخاری

## مقدماتِ امیر شریعت

خطیبہ الامت، بطلِ ہریت، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مقدمات کی عدالتی کارروائی

نیت ۸۰ روپے

بخاری اکبڈسی مہربان کالونی ملتان۔



## شاہ جی اور تحریک پاکستان

امیر شریعت، سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایک بے مثل خطیب اور شعلہ بیان مقرر تھے۔ آپ آزادی وطن کے قائلہ سالار اور تحریک تحفظ ختم نبوت کے روح رواں تھے۔ آپ نے مرزا قادیانی کی نبوت کا ذہب کی دھجیاں فضا لے آسمانی میں بکھیر دیں۔ اور نوجوانان ملت کے دلوں میں صمیم اسلامی جذبہ اور ولولہ پیدا کیا۔ آپ کی ذات میں وہ تمام خوبیاں جو ایک کامیاب خطیب کے لئے ضروری ہیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ شاہ جی موقع و محل کی مناسبت و موزونیت کے پیش نظر ظرافت و لطافت کا انداز بھی اختیار کرتے تھے۔ اور اپنے نمکدان ظرافت سے سامعین کو بہرہ ور کرتے۔ آج تک آپ کے نمکین اور مزاحیہ چٹکے اور فقرے زبانِ رزخ خاص و عام ہیں۔

مردان کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے غالباً ۱۹۴۰ء میں مردان شریف لاکر اہل مردان کو اپنی سرانگریز خطابت اور ولولہ انگیز ارشادات سے نوازا۔ ان کی شریعت آوری کے موقع پر مال منڈی مردان میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے ردِ مرزائیت کے علاوہ اس وقت کے ملک کے حالات اور سیاسیات پر ایک دلنشین تقریر فرمائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بندہ کو شاہ جی سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا اور ان کی نگفتہ بیانی سے منظور ہوا۔

### قیام پاکستان

اگرچہ شاہ جی اپنے سیاسی نظریہ کے تحت تحریک پاکستان کے ایک گونہ مخالفت تھے۔ لیکن بایں ہمہ جب پاکستان بن گیا تو انہوں نے دل و جان سے اسکا خیر مقدم کیا اور فرمایا۔

”میری رائے ہار گئی اور مسٹر جناح جیت گئے“

نیز فرمایا ”یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے پاکستان کی مخالفت کی لیکن جو کچھ صمیم سمجھا وہی کہا اور کیا ہمارا ضمیر اس وقت بھی مطمئن تھا اور آج بھی شرمندہ نہیں“

امیر شریعت نے یہ بھی فرمایا

”میری آخری رائے اب یہی ہے کہ ہر مسلمان کو پاکستان کی فلاح و بہبود کی راہیں سوچنی چاہئیں۔ اور اس کے لئے عملی قدم اٹھانا چاہئے۔ مجلس احرار اسلام کو ہر نیک کام میں حکومت پاکستان کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے اور خلافتِ شرع کام میں مزاحمت!“

### دفاع پاکستان

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان مرحوم نے جب بھارت سرکار کو جلسہ عام میں مکا دکھایا

اور اپنے جذبہ جہاد کا اظہار کیا تو شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"اگر اعلان جنگ ہوا تو بوڑھا بخاری بھی میدان جنگ میں کود پڑے گا۔ مجھے افسوس ضروری ہے کہ میں جوان نہیں۔ لیکن دشمن کے مقابلے میں جوان ہوں۔ میری تمنا ہے کہ بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بجائے میدان جنگ میں جان دوں"

اپنے رفقاء کو مشورہ

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں جب امیر شریعت اپنی بیماری اور کمزوری اور دیگر عوارض کی بناء پر ملکی سیاسیات سے الگ تھک ہوئے تو انہوں نے اپنے سیاسی رفقاء کا رد احباب کو بلایا اور فرمایا۔  
"اگر تم میں سے کوئی ملکی معاملات میں دلچسپی لینا چاہے یا سیاسی مزاج کا مالک ہو تو میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائے" شاہ جی کے اس اعلان و مشورہ کے بعد سیاسی مزاج رکھنے والے بعض حضرات مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے شایان شان حوصلہ افزائی نہ کی گئی۔ اکثر ان میں سے مسلم لیگ کو چھوڑ کر واپس آ گئے اور پھر سے مجلس احرار کی سیاسی حیثیت بحال کر کے اپنے اصل اور سابقہ پلیٹ فارم سے استقام پاکستان کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔

حضرت امیر شریعت علماء حق کی اس جماعت کے رکن رکین اور عظیم فرد تھے۔ جنہوں نے اسلام کی سر بلندی اور آزادی وطن کے لئے بیش بہا قربانیاں دیں۔ اور سال ہا سال تک قید و بند کی صوبیتیں برداشت کیں۔ اس راہ میں وہ کسی سے پیچھے نہ رہے بلکہ ہمیشہ صفِ اول ہی کے قائدین میں رہے۔ رو کا دیانیت اور تحفظ ختم نبوت کے لئے تو وہ عظیم الشان خدمات سر انجام دیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ حق بات یہ ہے کہ حضرت امیر شریعت نے تحفظ ختم نبوت اور رد مرزائیت میں جو کردار ادا کیا وہ بے مثل اور ہر لحاظ سے منفرد و ممتاز ہے۔ جس کے لئے رب ذوالجلال انہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

ہمیں اس پر فخر ہے کہ امیر شریعت کے لائق و فائق فرزند مولانا سید عطاء المسیح رحمۃ اللہ علیہ اپنے عظیم باپ کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں۔ ان کی بیش از بیش کامیابیوں کے لئے ہماری دلی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

## یادوں کے نقوش

پاکستان بننے سے پہلے مدرسہ ریاض الاسلام (جنگ) میں جلسہ تھا۔ بندہ اس وقت شاید جمعی جماعت کا طالب علم تھا۔ شیخ پرسید مبارک شاہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ مع دیگر علماء شریعت فرماتے۔ حضرت امیر شریعت تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ خطبہ مسنونہ کے بعد ایک رکوع کی تلاوت فرمائی۔ مجمع سے اچانک ایک شخص بڑا دھماکا مارتا ہوا کہ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ شاہ جی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ اے آلِ رسول ﷺ اولادِ علیؑ خدا کے لئے ایک رکوع اور تلاوت فرمائیں۔ حضرت شاہ جی نے سر کو ذرا جنبش دی۔ گھنگریالے بالوں نے اوپر سے اوپر پھیل کر رعب حسن کو دو بالا کر دیا۔ مجمع سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ سہی سکو گے؟ سارا مجمع پکار اٹھا۔ ضرور ضرور۔ مہربانی فرمائیے۔ حضرت شاہ جی نے جھوم جھوم کر تلاوت شروع کی تو مجمع سے سکویں کی آواز چنوں میں تبدیل ہو گئی۔ ایک ہندو نوجوان بھی کھڑا ہو کے تلاوت سننے لگ گیا۔ شاہ جی نے چار رکوع تلاوت کئے۔ بڑا دھماکا مارتا ہوا بیٹھ گیا۔ اور اسی جگہ وہ ہندو نوجوان آکر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ نور عرض کیا شاہ جی مجھے مسلمان کیجئے پھر اس کی آنکھوں سے ساروں کی برسات لگ گئی۔ شاہ جی نے پیار بھرے لہجے سے قریب بلا کر فرمایا کہ مسلمان کرنے والا یہ پیچھے پیر بیٹھا ہے (حضرت پیر مبارک شاہ صاحب بغدادی) اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے اس کا مرید بن جا۔ چنانچہ وہ پیر صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ سر صاحب اسے مسلمان کرنے کے بعد اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ یہ نو مسلم جب گھر گیا تو بھائیوں نے قتل کرنے کے لئے ہندو قاتل فرمایا یہ دوڑ پڑا۔ وہ فائر کرتے ہوئے پیچھے دوڑتے رہے۔ یہ زخمی ہونے کے باوجود جاگ نکلے میں کامیاب ہو گیا۔ ہسپتال میں زیرِ علاج رہا تو سارا خرچہ وغیرہ پیر صاحب نے برداشت کیا۔ تندرست ہو کر حضرت پیر صاحب کے ساتھ آگیا۔ ہم نے اس کے منہ مل زخموں کے نشانات دیکھے۔ واللہ اعلم وہ اب کہیں زندہ ہے یا اس دنیا سے جا چکا ہے۔

باگڑ مرگاہ نزد عبد الحکیم میں جلسہ تھا۔ حضرت شاہ جی چناب میل سے ایک بے اسٹیشن عبد الحکیم پر اتارے اور سید محمد حکیم حافظ غلام قادر صاحب (جو پیر مبارک شاہ بغدادی کی سبکدے کے حجرے میں اپنے دو خانہ میں موجود تھے) کے پاس تشریف لائے۔ میں اس وقت ان کے پاس طب پڑھ رہا تھا۔ تمام سے معاف ہوا۔ حضرت استاد صاحب شاہ جی سے اپنی علاقائی زبان میں مخاطب ہوئے۔ "حضرت چناب میل توں لیتے ہو۔" شاہ جی نے فوراً فرمایا کہ "ہاں چناب توں لیتے آں تے جناب تے چڑھنا ہے۔" یہ اشارہ تھا کہ بے وقت آئے ہیں کھانا بھی کھانا ہے۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی اور جب کبھی شاہ جی حکیم صاحب کے پاس آتے تھے تو وہ ہر دہرہ دوا، الکس، خیرہ مرواریدی اور خیرہ منبری کے تین ڈبے شاہ جی کی نذر کرتے تھے۔ یہ ساری کھانی صرف ایک جھیلے میں سا گئی تھی۔ ساری مظل کشت زعفران بن گئی۔

شاہ جی کے ساتھ بندہ بھی باگڑ سرگازہ جیلے میں شرکت کے لئے جا پہنچا۔ شاہ جی ایک پلنگ پر تشریف فرما ہوئے۔ لہر گرد سب عقیدت مند بیٹھ گئے۔ ایک دہائی ملنے کے لئے آیا وہ چند قدم ابھی دور ہی تھا کہ جیب سے کسبج نکال کر اللہ اللہ پکارتا ہوا مصافحہ کرنے لگا۔ شاہ جی نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ پاس ہی حافظ محمد حسین صاحب (خطیب مسجد پیر مبارک عبدالکیم) کی ایک تھیلی میں لمبی کسبج رکھی ہوئی تھی۔ شاہ جی نے تھیلی سے کسبج بھی نکال لی شروع کی اور ساتھ ساتھ کھنا شروع کیا۔ "لوکاں دیا جپالیاں دے باجے" چال۔ ساری عمر اس کسبج ماری ہک نہ پٹیا وال۔ چھنانج پھر ٹیندا یار چھنانج پھر ٹیندا یار۔ مجمع سارا بنس بنس کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اور شاہ جی بار بار۔ چھنانج پھر ٹیندا یار۔۔۔۔۔ دراصل یہ اس ریاکاری پر نہایت لطیف انداز میں طنز تھا۔

سائیں محمد حیات پسروری

## شاہ جی۔ سب دے پیارے

جو شاہ جی سب دے پیارے سن اللہ فوں پیارے ہو گئے نے  
یا حال شان رفیتاں دا حاضر دربارے ہو گئے نے  
کوئی رڑھیا ماریا فرقت دا بہ کنڈھے ساہ لے لیندا سی  
اج لماں بحر جدائیاں دا اج دور کنارے ہو گئے نے  
جد جن اسمانی ڈب دا اے کل تارے دوئے چمک پے سن  
امہ جن دھرتی دا ڈب گیا مدھم سب تارے ہو گئے نے  
کیوں رکیا ایس جہاز اندر پرواز سی ادب اڈاری دی  
کیوں دگڑیا کیوں مکینک دے اوزار نکارے ہو گئے ۳  
کئی عاجز ۱، جوہر ۲، امین ۳ بنے کئی خادم ۴ میں شاہ جی دے  
لکھاں جانناز ۵ حیات ۶ بنے غمگین ۷ دھارے ہو گئے نے

۲۔ عبد الرحیم جوہر جہلمی

۴۔ ابراہیم خادم قصوری

۶۔ سائیں محمد حیات پسروری

۱۔ خواجہ عبدالرحیم عاجز امرتسری

۳۔ امین گیلانی

۵۔ غلام نبی جانناز مرزا

شعراے

احرار



## عزم آہن گداز اور قلب گریہ بار کا حامل

وما کان قیس ہلک، ہلک واحد۔ ولکنہ بنیان قوم تہد ما  
حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ سے میں تقریباً چالیس سال سے متعارف ہوں ہمارے شیخ حضرت  
علامہ محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کی آپ پر خاص نظر عنایت تھی۔ خود حضرت امیر شریعت سے میں  
نے بار بار سنا کہ بھائی میں کچھ نہیں ہوں جو کچھ مجھے حاصل ہوا ہے۔ وہ حضرت انور کی نگاہ کرم کا نتیجہ ہے اس  
نگاہ کرم کی فیض بخشی کا تو خود ہم اور صد ہا دیگر حضرات نے بھی مشاہدہ کیا۔ کہ دین کا ایک پیچیدہ مسئلہ درپیش  
ہے۔ باہر الفن، مسلم اور مشہور علماء نے اس پر گھنٹوں تقریریں کیں لیکن پھر بھی وہ عوام کو پوری طرح ذہن  
نشین نہیں ہوا۔ لیکن جب حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ اس کو سٹیج پر سمجھانے کے لئے اٹھے تو اپنی سر  
آفریں خطابت کے ذریعے چند جملوں میں اس کو ایسا ذہن نشین کر دیتے تھے کہ تازیت وہ مسئلہ سامعین کے  
ذہن میں نقش ہو کر قائم رہتا۔ اس علمی کمال کے علاوہ آپ کی ذات دیگر بلند پایہ ممتاز ہستیوں کی طرح جامع  
اصد اد تھی۔ فقر ظاہری غنا باطنی۔

اشد آء علی الکفار رحماء بینہم  
باطل کے مقابلے میں عزم آہن گداز اور تائید حق کے لئے قلب گریہ بار کے حامل تھے۔ حافظ شیرازی کا یہ شعر  
آپ کی حالت کا ترجمان تھا۔

گدائے سیکدہ ام لیک وقت مستی بین  
کہ ناز بر فلک و حکم برستارہ کنم  
آپ فوت ہوئے لیکن آپ نے اپنی طوفانی اور تلاطم خیز جدوجہد کے ذریعہ مسلمانوں کے قلوب پر  
غیرت دین اور حمایت حق کے جو نقوش ثبت کئے ہیں۔ ان پر کبھی موت نہیں آئے گی۔ یہ آپ کا زندہ  
جاوید کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ اللہ تعالیٰ درجہ عالیہ اور خلعت صدیقیت سے آپ کو نوازے  
آمین باقی اپنا حال تو یہ ہے۔



# ٹکڑے چُن چُن اودھی تقریر والے

استاد دامن



کُل دی گل، بخاری پیا جیوند اسی  
 جہدی آج پیتے بری مناؤندے نیں  
 ٹکڑے چُن چُن اودھی تقریر والے  
 جھوم جھوم کئے سارے سناؤندے نیں  
 باپو سہک مویا، باسی ٹکڑیاں کول  
 پتر پوڑیاں دان کراؤندے نیں  
 جیوندی جان رہیاں لیراں تن اتے  
 مویاں بعد پیتے چادر چٹھاؤندے نیں  
 جیوندی جان نہ کوٹھڑی رہن لئی سی  
 مویاں بعد مقبرے بناؤندے نیں  
 جیوندی جان سکھ چین نہ لین دتا  
 مویاں بعد درود پچاؤندے نیں  
 دانش وراں ٹول سدا خوار کر دے  
 ٹھکڑا مار دے سولی چڑھاؤندے نیں  
 اپنے کیتے تے کرے نہ شرم آئی  
 دُب مرن، نے نہ پہنچتاؤندے نیں

# تحریکِ خلافت و ترکِ موالات

(۱۹۲۳ء.....۱۹۱۹ء)

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ..... اور حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین  
سیالوی رحمۃ اللہ علیہ

قدم بہ قدم شانہ بشانہ



ایک تاریخی دستاویز

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لاتھنو اولاً تحریر نوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین  
مت بے دل ہو اور مت غم کھاؤ کیونکہ تم ہی تو دنیا میں بلند مرتبہ ہو اور  
تمہارا ہی بول بالا ہو گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ تم مومن بنو۔

نبیرہ حضرت خواجہ شمس الملتہ والدین رحمۃ اللہ تعالیٰ  
یعنی

جناب حضرت مولانا پیر محمد ضیاء الدین صاحب قبلہ ادام اللہ برکاتہم  
سجادہ نشین سیال شریف  
کا

## اعلان واجب الاذعان

وابستگان حضرت خواجہ سیالوی رحمۃ اللہ علیہ اور تمام مسلمان بیدار ہوں۔  
باہتمام شیخ رائے شوق محمد پرنس شوق الیکٹرک پریس لاہور۔

تحریک خلافت، تحریک ہجرت، تحریک ترک موالات، تحریک عدم تعاون وغیرہ۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کے بہت اہم، بہت ہنگامہ خیز اور بہت فیصلہ کن..... واقعاتی تسلسل اور پیچ در پیچ سلسلے پر مبنی، ایک خاص دور کی نمائندہ تحریکات ہیں۔ ان تحریکات میں ختن بلاخیز کے قافلہ ہائے سخت جاں، کن مرحلوں اور کن منزلوں سے گزرے..... یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے۔ لیکن..... تفصیلات سے قطع نظر، ایک بات بہت واضح ہے کہ مسلمانوں کا ایک خاص طبقہ، جسے مذہبی پیشوائیت، مشیت و روحانیت اور نیابت و خلافت رسول ﷺ کا دعویٰ رہا ہے..... اکثر و بیشتر اس قسم کی تحریکات سے دور دور ہی نہیں ناخوش و بیزار بھی رہا ہے۔ اس کا بڑا سبب، یقیناً عیش و راحت و آرام کے وہ اسباب ہیں جو دشمن اسلام و مسلمین..... سامراج کی جانب سے "تبویز" کیے جاتے رہے اور حضرات سجادہ نشینان و مشائخ عظام کی جانب سے "جائز" گردانے جاتے رہے ہیں۔

پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۹ء۔ ۱۹۱۳ء) کے دوران، ترکی کی خلافت اسلامیہ کے مقابلے میں برطانوی سامراج کی مسلم کش جارحیت کو مالی، افرادی اور روحانی طور پر "مضبوط" بنانے کی "سعادت" اسی طبقہ سجادہ نشینان کے حصے میں آئی۔ اور جب جنگ جیتنے کے بعد، فتح کے نشہ میں بدست برطانیہ، ترکی کے مملکتی وجود و تنفس کو ختم کرنے کے درپے تھا تو فرنگی خاقانہ کے یہ سب درویش بصدِ عمر و نیار ہندوستان کے لئے سلطنت برطانیہ کو "ابر رحمت" قرار دے رہے تھے اور ترکوں کی "کوتاہ اندیشی" پر اظہارِ تأسف کر رہے تھے سرمایگی اڈوار (گور ز پنجاب) کی خدمت میں پیش کیا گیا سپانسامہ اس سلسلہ میں "مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری" کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ..... توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ ظلم سامری۔ اسکے مصداق، تحریک خلافت کے انہی ایام میں پنجاب کے عظیم روحانی مرکز سیال شریف سے زب سجادہ، حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کی صدائے حق بلند ہوئی۔ اور پنجاب کے طول و عرض میں صور اسرافیل بن کر گوی۔ دنیا نے دیکھا کہ سیال شریف کی تائید بیک وقت گولڑہ شریف سے بھی ہوئی اور دارالعلوم دیوبند سے بھی۔ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ..... ہر سہ علی و روحانی مراکز سے ربط خاص رکھتے تھے۔ اور حضرت خواجہ سیالوی کے اس مجاہدانہ اور فائدہ گردار کی ہر ہر قدم پر تائید و نصرت فرما رہے تھے۔ اسی دور میں حضرت امیر شریعت نے اپنے ذاتی اہتمام سے، یہ کتابچہ شائع فرمایا اور اس کا ابتدائیہ بھی بقلم خود رقم فرمایا۔ تاریخی اہمیت کا حامل یہ کتابچہ ہمیں مولانا سعید الرحمن علوی رحمۃ اللہ علیہ (م..... ۱۳۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء) کے توسط سے میسر آیا۔ مولانا نے لکھا تھا۔

مورخہ ۱۹ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۳ مارچ ۱۹۹۳ء کو محترم حکیم محمد موسیٰ امر سہری صاحب کے پاس جاتا ہوا، انہوں نے ارزاہ عنایت یہ تحریر عطا فرمائی جو ان کے پاس بشکل فوٹو تھی۔ احقر، اس سے ایک نقل لے کر برادر عزیز سید کفیل شاہ سلسلہ کی نذر کر رہا ہے کہ وہ اس کے اصل حقدار ہیں..... احقر محمد سعید الرحمن علوی..... ۲۰ رمضان ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۳ء۔ ۳۔ ۱۵



## التماس

۱۹۳۰ء کی ایک یادگار تحریر

پہلی دوسری رجب المرجب ۳۹ھ کو سیال شریف ضلع شاہ پور حضرت خواجہ شمس الملت والدین رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پر حسب دستور مجلس عرس منعقد ہونے والی تھی۔ مریدین و معتقدین دور دور سے حاضر ہونے والے تھے کہ یکایک میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس نازک وقت میں جبکہ مسلمان دنیا سے مٹائے جا رہے ہیں اور اسلام کی تذلیل کی جا رہی ہے۔ فراعنہ یورپ اپنی مادی طاقتوں کے نشے میں بدست ہو کر ننگ و ناموس اسلام کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔ عراق، عرب، بصرہ و بغداد پر برٹش قبضہ ہو چکا ہے۔ بیت المقدس پر ہلالی علم کی جگہ پر صلیبی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ ایا صوفیہ کی مسجد کو گرا کر گرجا گھر بنانے کی تمہیزیں پیش کی جا رہی ہیں۔ خلیفۃ المسلمین قید فرنگ کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ ان کی ہوس۔ مثلاً شہزادہ توفیق آفندی کی بانو نے محترم، گھر سے گھسیٹکی جا چکی ہیں۔ سرناما میں لاکھوں کلمہ توحید کے امانت دار بھوکے پیاسے مر رہے ہیں۔ سلیشا میں رسول اللہ ﷺ کی امت بہت بے عزت کی جا رہی ہے۔ اور وہ لوگ جنہیں اسلام اور فرزندان اسلام سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ ایک خدا کے ماننے والوں کے ننگ و ناموس کو صرف اس جرم میں کہ وہ مسلمان ہیں برباد کر رہے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کالافرنز جرنیل ونگلیٹ سابق کمشنر مصر اپنے دیگر برطانوی افسروں کی نصرت و اعانت سے اللہ اور اس کے رسول پاک کے گھروں یعنی مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ پر چڑھائی کر کے ان کو قمع کرنے کا فرما حاصل کر چکا ہے۔ بجائے اس کے کہ عامۃ الناس کو مخاطب کر کے اور ایک ایک دیہات میں در بدر ہو کر پنجاب کے ان غفلت شعار مسلمانوں کو جن کی کھائی برٹش گورنمنٹ کی نصرت و اعانت میں گولیاں بن کر مظلوم و بے گناہ ترکوں کے توحید پرست سینوں کو چھاڑ رہی ہے۔ اور جن کے ناپاک ہاتھ پیارے نبی کے سبز گنبد کے محافظوں کو ناحق ذبح کر کے برٹش گورنمنٹ کے صلیبی بھندوں کو بلند کرنے میں پوری قوت صرف کر کے اپنا ٹھکانا جہنم بنا رہے ہیں۔.....

بیدار کیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ یہ کیا کر رہے ہو، خدا کے لئے جاگو اور پچھلے گناہوں سے توبہ کر کے سچے مسلمان بنو اور ترک موالات (نا مل ورتن) پر عمل پیرا ہو کر برٹش گورنمنٹ سے ہر قسم کے نصرت و اعانت کے تعلقات قطع کر دو۔

مناسب یہ ہے کہ پنجاب کے ان مشایخ اور سجادہ نشینوں سے جن کے قبضہ میں لاکھوں انسانوں کے قلوب ہیں اور جنہیں نیابت و خلافت رسول علیہ السلام کا دعویٰ ہے۔ اور جن کی روحانیت سے سرمایہ کل اودھو آرنے مستفیض ہو کر پنجاب سے خراج تحسین وصول کیا، کہا جائے کہ حضرت! آپ کی نیابت و خلافت مسلمانوں کے کس دن کام آئے گی؟ خدا را! اٹھیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کئے اسلام پکار رہا ہے۔

پس ازاں کہ سن نہ نام بجے کار خواہی آمد

الفرض اس خیال نے مجھے ۳ رجب المرجب کو سیال شریف پہنچا دیا اور آتے ہی مجھے جناب سجادہ نشین حضرت مولانا محمد ضیاء الدین صاحب مسیح اللہ المسلمین بطول حیاتہ کی قدم بوسی نصیب ہوئی۔ آپ نہایت تواضع سے پیش آئے اور بڑی عزت افزائی فرمائی۔ اس کے بعد معاملات حاضرہ پر گفتگو شروع ہوئی۔ آپ کے خیالات کو سن کر ایمان تازہ ہوا۔ آپ اور حاضرین مجلس کی ایک عجیب حالت تھی۔ آپ نے عدم تعاون، ہجرت اور ترک موالات پر اس بے باکی اور جرأت ایمانی سے گفتگو فرمائی کہ بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی تھی کہ خداوند اس پیرِ جوان، نمت و جوان سال کو مسلمانوں کے سروں پر بہت دیر تک سلامت رکھے۔ حتیٰ لیکن اللہ

پھر آپ نے اپنی اس تقریر کی نقل جو آپ نے پہلی رجب المرجب کو ایک غیر معمولی جلد میں کی تھی مجھے عنایت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ میرے اس اعلان کو چھپوا کر تمام ملک میں پھیلا دو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے پہلے بھی علماء نے خطبوں اور رسالوں میں مسائل حاضرہ پر تقریریں شائع کی ہیں۔ لیکن یہ اعلان اپنے رنگ میں اپنا، آپ ہی جواب ہے۔ اس قدر مختصر اور اتنا مدلل ہے کہ سبحان اللہ! کلام الملوک ملوک الکلام۔ جناب نے اس سے پہلے ۱۹ مارچ ۲۰ کو دوسرے یوم خلافت کے دن بھی ایک ایسی ہی زبردست تقریر فرمائی تھی۔ جو کسی قدر اختصار کے ساتھ اخبار "النیر" جھنگ میں شائع ہوئی تھی۔ حسن اتفاق سے وہ پرچہ بھی مجھ کو مل گیا چنانچہ پہلے ۱۹ مارچ ۲۰ء والی تقریر اور بعد میں یہ تازہ اعلان اور اس کے بعد جناب حضرت پیر حافظ عبد اللہ صاحب برادر عزیز جناب سجادہ نشین صاحب قبلہ کی دو ایک نظمیں جو جناب حافظ صاحب نے مختلف مواقع پر پڑھیں، ہدیہ ناظرین کر کے خدا نے بزرگ و برتر سے دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ!

جو عدوئے باغ ہو برباد نہ ہو  
چاہے وہ گل چیں ہو یا صیاد ہو

خادم ملک و ملت

المتوکل باللہ الباری السید عطاء اللہ البخاری

مستوطن موضع ناگڑیاں

ضلع گجرات (پنجاب)

# قبلہ محمد ضیاء الدین صاحب سجادہ نشین سیال شریف کی

خلافت پر زبردست تقریر (۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء)

۱۹ مارچ کو دوسرے یوم خلافت کے دن حضرت سجادہ نشین صاحب سیال شریف نے دورانِ وعظ میں تحمید و صلوة کے بعد آن گنت حاضرینِ مسلمین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:-  
اے حاضرینِ کرام! آج جمعہ کا دن ہے جس کو خداوندِ کریم نے مسلمانوں کے لئے عید کا دن مقرر کیا ہے۔ مگر آج کا جمعہ یومِ اتقائے ہے۔ اس کو مسلمانانِ ہند نے یومِ خلافت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس لئے آج کا جمعہ ہمیشہ کے جمعہ سے نرالا ہے۔ اس میں مسئلہ خلافت پر تقریریں ہوں گی۔ اور جا بجا جیسے ہوں گے۔ اور بقاءِ اسلام کے لئے بہر گاہ رب العزت دعاء و التجا کی جائے گی۔ اور مسلم آبادی ایک دل و زبان ہو کر اپنی مجازی حکومت کو ضروریاتِ خلافتِ اسلامیہ و اتحادِ اسلام سے بالذات ملحق کرے گی۔ اور یہ بات گوش گزار کرے گی کہ اسلام بجز بھائے خلیفۃ المسلمین کے قائم نہیں رہ سکتا۔ فقیر کے دل میں بھی یہ خیال آیا کہ آج کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں سامعین کی سمجھ خراشی کی جائے اور اس خیالِ فاسد کو حرفِ غلط کی طرح عوام کے صفحہ دل سے مٹا کر نیا دنیا کر دیا جائے کہ فقراء میں (جس سے بالعموم سجادہ نشین و متولیانِ خانقاہ مراد لئے جاتے ہیں) محبتِ اسلام کی نہیں ہے۔

یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے کہ وہ اخباری دنیا میں قدم نہیں رکھتے اس میں وہ ایک حد تک حق بجانب بھی ہیں کیونکہ وہ اشتہاری دو فروشوں اور لیڈروں کی طرح اپنا نام پیدا کرنا نہیں چاہتے۔  
مگر فی الاصل بقولِ حافظ

بزرگِ دلقِ مرغِ کمند ہاں دارند  
درازِ دستیِ ایں کوتہ آستیناں بین

اس فرقہ کو ایک عضوِ معطل سمجھنا سنتِ غلطی اور نادانی ہے۔ انتظامِ عالم میں جتنا تصرف یہ گوشہ نشین رکھتے ہیں اتنا امورِ مملکت میں خسروانِ نامدار، شنشاپانِ کامگار بھی نہیں رکھ سکتے۔ اسلام کی خدمت جس قدر اس زمرہ بے شور و شر و بے رو و ریائے کی ہے۔ یار تو بجائے خود رہے اغیار کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ مگر اب خاموشی کچھ معنی نہیں رکھتی۔ کیونکہ جب سے سابقہ لاٹ صاحب سرمائیکل اڈوار نے وہ اڈورس حاصل کیا جس پر نمائندگانِ سجادہ نشیناں اور خود سجادہ نشینوں کے دستخط تھے۔ اس دن سے جو خیالِ عام مسلمانوں کے دلوں میں ان بزرگوں کی نسبت پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے ازالہ کے لئے کل سجادہ نشینوں کو چاہیے کہ وہ گورنمنٹ کو مطلع کر دیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا پسند کرتے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ اور امیر المومنین خلیفۃ المسلمین نائب الرسول کی عزت و وقار میں ذرہ بھر بھی فرق آنے سے ہمارے دلوں پر سخت صدمہ ہو گا۔

پہلے ہم اس عالمگیر جنگ کو سیاسی اور ملکی قرار دیتے تھے مگر اب انخلاے دار الخلافہ قسطنطنیہ و باسنورس وغیرہ یعنی یورپی روم (جو جنگ میں غیر مفتوح رہا ہے) کے متعلق ایچی ٹیشن پادریان یورپ اور ان کے ہم خیالوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جنگ صلیبی اور مذہبی جنگ تھی کیونکہ فاتح بیت المقدس کو وزیر اعظم برطانیہ نے تمغہ پہناتے وقت فاتح کروسید کا خطاب عطا کیا۔ اور جو بحث دارالعوام لندن میں ۲۶ فروری کو ترکی کے مستقبل کے متعلق ہوئی تو اس میں جو وزیر اعظم مسٹر لائیڈ جارج نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ترکوں کے اخراج قسطنطنیہ کی جو تحریک پھیلی ہوئی ہے۔ وہ کسی حد تک سمیت کے قدیم احسانات پر مبنی ہے جو ہلال کے خلاف ہیں۔ انہوں نے اپنی جماعت کو تسلی دیتے ہوئے یہ کہا کہ ترکوں کو یہ سزا دی جائے گی کہ ان کی نصف سے زیادہ سلطنت قطع کر دی جائے گی اور ان کا دارالسلطنت اتحادی اتواپ کی زد میں ہوگا۔ اسے فوج اور بیرٹے اور عظمت سے محروم کر دیا جائے گا۔ اور بحیرہ اسود اور بحیرہ روم کا درمیانی راستہ جس سے ترکوں کو دنیا کی کونسوں میں حقیقی اختیار ہے محروم کر دیا جائے گا۔ اور وہ آئندہ عیسائیوں کے مقدمات طے کرتے ہوئے اتحادی توپوں کے دباؤ میں دستخط کریں گی۔

اور ایک دوسرے مہربان جو مزدور جماعت کے سرگروہ ہیں یعنی مسٹر ایڈمرن وہ ترکوں کو قسطنطنیہ میں رہنے کی سفارش تو کرتے ہیں مگر پاپائے روم سا بنا کر، وہ لکھتے ہیں۔

مذہبی مشکلات اس صورت میں دور ہو سکتی ہیں کہ خلیفۃ المسلمین کو پاپائے روم کی طرح تمام دنیاوی قوتوں سے محروم کر کے قسطنطنیہ میں رہنے کی اجازت دی جائے۔

الفرض جتنے منہ اتنی باتیں باسٹھائے چند تمام ممبران پارلیمنٹ..... کیا مذہبی پیشوا اور کیا مذہبین مملکت سب ترکوں کے خلاف بول رہے ہیں اور جن لوگوں نے سبز باغ دکھا کر اور وعدہ تحفظ مقامات مقدسہ دلا کر اور جنگ کو غیر ملک گیری جنگ بتلا کر مسلمانوں سے ہر طرح کی امداد لی۔ آج وہی وعدہ کنندگان اپنے وعدوں سے انحراف کر رہے ہیں۔ اور اپنے وعدوں کی بعید از خیال و فہم توجہیں گھڑ رہے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے گھروں کو اپنے ہاتھ سے تباہ کیا ہے۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

خدا جس قوم کی عقل سلب کر لیتا ہے اس سے ایسے ہی کام ہوا کرتے ہیں۔ یہ قانون قدرت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ کسی قوم کو تباہ و برباد نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنی بربادی کے سامان خود مہیا نہ کرے۔ یعنی اعتماد اور نیت جب تک نہ بدلے اللہ پاک کی دی ہوئی نعمت چینی نہیں جاتی۔

اب اس مطلب کو مسلمان اپنی گورنمنٹ کے گوش گزار کریں کہ ہمارا خلیفۃ المسلمین پاپائے روم کی طرح ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پاپائے روم ان کا جانشین ہے جن کی یہ تعلیم ہے۔

”تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم کو یہ بھناتا ہوں کہ شریک کا مقابلہ نہ کرنا۔ بلکہ تیری داہنی گال پر طمانچہ مارے تو دوسری بھی اس کی طرف پھیر دے۔“

مگر جیسے کہ ہمارے نبی عربی فداہ امی وابی ٹیل موئے تھے ایسے ہی ان کے جانشین و خلیفہ مثل خلفاء و جانشیان موئے سے باحشت و جبروت ہونے چاہئیں۔ جیسا کہ موئے علیہ السلام شہریروں اور مفیدوں کی گوشمالی کے لئے مامور من اللہ تھے۔ موئے علیہ السلام کے خلفاء کی طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خلافت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا اور جیسا کہ بنی اسرائیل کے خلیفہ بنائے گئے تھے وہ احکام شریعت موسوی جاری کیا کرتے تھے۔ مثلاً یوشع بن نون اور قاضی، اور ساؤل، اور داؤد اور سلیمان بن داؤد علیہم السلام وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی محمدی شریعت کے جاری کرنے والے مسلمانوں میں خلیفہ ہونے چاہیں اور بفضل خدا آج تک ایسے ہی خلفاء خود ممتاز با خیل و حشم اسلام میں ہوتے رہے ہیں۔ اور اس وقت امیر المؤمنین و خلیفۃ المسلمین نائب رسول التعلین سلطان ابن سلطان خاقان ابن خاقان سلطان البر والبحرین خادم الحرمين الشريفین سلطان وحید الدین خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ..... مسند آرائے سریر خلافت میں اگر ان سے کوئی علاقہ جو جنگ سے پہلے ان کے ماتحت تھا اب چھینا جائے تو ہمارے دلوں کو سخت صدمہ ہو گا۔ اس واسطے ہم صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور اپنی گورنمنٹ کے کانوں تک اس غم و رنج کو پہنچاتے ہیں کہ صلیبی جنگ لڑ کر اور آزادی کے خوش کن لفظ سنا کر ہم سے اسلامی ملک چھینے جارہے ہیں۔ اور ہماری صدائے احتجاج کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔ جیسا کہ کئی ایک مدبرین انگلستان کہہ رہے ہیں کہ ہندوستانیوں کو انخلائے قسطنطنیہ و تجزیہ ترکی کا کوئی صدمہ اور احساس نہیں۔

اب ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ یا ہم مسلمان بنیں اور مسلمانوں کی آواز گورنمنٹ کے کانوں تک پہنچائیں یا اسلام سے قطع تعلق کر کے علیحدگی قسطنطنیہ کا جشن منائیں جو شخص اس وقت اپنی صاف بیانی سے حکام وقت کی خدمت میں باوازا بلند یہ نہ کہہ دے کہ اگر ہمارے اسلام پر حملہ کیا گیا، یا اسلامی جھنڈا کے خلاف صلیب بلند کی گئی۔ (جیسا کہ بعض کارٹونوں سے اس کا اظہار ہو چکا ہے) تو یا ہم مسلمان رہ سکیں گے یا وفادار..... تو وہ شخص یا منافق ہو گا یا دھوکہ باز۔ جس کی وجہ سے وہ پبلک اور گورنمنٹ کے لئے نہایت ہی خطرناک ہو گا۔ شارع علیہ السلام کی تعلیم حجۃ الوداع کے دن اپنی امت کو یہ تھی کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہو کر رہیں اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے کام آئیں خواہ کھیں بھی ہوں اور ایک دوسرے کو اسلام پر ثابت قدم رہنے کی فہمائش کریں۔

اب مخلصاد عابد رگہ قاضی الحاجات یہ ہے کہ وہ اپنے اسلام اور خلیفہ اسلام کا ہر حال میں حامی و ناصر ہو۔ آمین ثم آمین۔

منقول از اخبار "المنیر" جھنگ

۲۳ مارچ ۱۹۲۰ء

تقریر مولانا مولوی محمد ضیاء الدین صاحب اداام اللہ برکاتہم  
جوانہوں نے بموقع عرس شریف بمقام سیال شریف مجمع کثیر کے سامنے پڑھی

الحمد لله حمده و نستعينه و نستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه و نعوذ بالله  
من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا  
هادي له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان سيدنا محمداً  
عبده ورسوله الذي ارسله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله وكفى بالله  
شهيداً۔ محمد رسول الله والذين معه اشداء على الكفار رحماء بينهم تراهم ركعاً  
سجداً يبتغون فضلاً من الله ورضواناً۔ سيما هم في وجوههم من اثر السجود ذالك  
مثلهم في التوراة و مثلهم في الانجيل كزرع۔ اخرج شطاہ فزره فاستغلف فاستوئے  
على سوقه يعجب الزراع ليغيض بهم الكفار وعد الله الذين آمنوا وعملوا الصلحت  
منهم مغفرة واجراً عظيماً۔

اما بعد: فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم يا ايها  
الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى اولياء، بعضهم اولياء بعض ومن يتولهم منهم  
فانه منهم ان الله لايهدي القوم الظالمين۔ فترى الذين في قلوبهم مرض يسارعون  
فيهم يقولون نخشى ان تصيبنا دائره فعسى الله ان ياتى بالفتح اوامر من عنده  
فيصبحوا على ما اسروا في انفسهم نادمين۔ ويقول الذين آمنوا هؤلاء الذين اقسما  
بالله جهد ايما نهم انهم لمعكم حبطت اعمالهم فاصجوا خسرين۔ يا ايها الذين آمنوا  
من يرد منكم عن دينه فسوف ياتى الله بقوم يحبهم ويحبونه اذلة على المؤمنين  
اعزة على الكافرين يجاهدون في سبيل الله ولا يخافون لومة لائم ذالك فضل الله  
يوثيه من يشاء والله واسع عليم انما وليكم الله ورسوله والذين آمنوا الذين يقيمون  
الصلوة ويؤتون الزكاة وبهم راکون۔ ومن يتول الله ورسوله والذين آمنوا فان حزب  
الله هم الغالبون۔ (پ ۶ المائدہ ع ۸)

پوشیدہ نہ رہے کہ یہ کلام ربانی جو آپ لوگوں پر پڑھی گئی ہے سورہ مائدہ کا آٹھواں رکوع ہے۔ خلاصہ  
مطلب اس کا یہ ہے کہ مومنوں کو حق تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کی محبت اور مودت اور نصرت اور امانت سے  
منع فرمایا ہے۔ اور فرمایا ہے جو ان کا دوست ہو وہ انہی میں سے ہے۔ پھر ان لوگوں کو تنہید فرمائی ہے۔ پھر  
ان لوگوں کو تنہید فرمائی ہے جو تحریک ترک موالات کے مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ تحریک بار آور نہ  
ہوئی تو رہا سہا اعتبار بھی چلا جاوے گا۔

فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ غیب سے فتح و نصرت اور امداد اسلام کے اسباب مہیا کرے گا۔ اس وقت یہ لوگ نادم اور شر مسار ہوں گے۔

اور آگے چل کر ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ تمہاری راہ و رسم سے پھر کر کفار سے جا ملتے ہیں تم اس سے کبیدہ خاطر نہ ہو۔ عنقریب خدا ایک قوم کو لانے کا جو خدا سے عجز و نیاز رکھتے ہوں گے۔ اور خدا تعالیٰ ان سے محبت رکھے گا۔ ان کی نشانی بھی فرمادی ہے کہ وہ مومنوں سے نہایت ہی تواضع سے پیش آئیں گے اور کفار پر زبردست ہوں گے اور وہ کسی کی ملامت سے خوف بھی نہیں کھائیں گے۔ تمہارا دوست خدا ہے اور رسول اور وہ مومن جو کفار سے ترک موالات کرتے ہیں اور خدا کے کل احکام کی پابندی کرتے ہیں اور جو تم میں سے کفار کی موالات ترک کر کے خدا اور رسول کی دوستی اور مومنوں کی دوستی پسند کرے وہی غلبہ میں رہیں گے اور کامیاب رہیں گے کیونکہ خدا کا شکر ہمیشہ کامیاب اور غالب رہتا ہے۔

اس موقع پر میں آپ لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرانی چاہتا ہوں کہ ترک موالات کیا چیز ہے اور ترک معاملات کیا ہے اور اس وقت اس کی سخت ضرورت کیوں لاحق ہوئی ہے۔ یہ بات تو علماء ہند خصوصاً مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا غلام معین الدین اجمیری ادام اللہ برکاتہم کی تصانیف سے بخوبی واضح ہو چکی ہے۔ اس جگہ ان کی تشریح تحصیل حاصل ہے۔ میں تو اپنے حلقہ اثر کے لوگوں کو یہ بتا دینے کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ میں جمیعت علماء ہند کے فتوے کی حرف بحرف تصدیق کرتا ہوں اور اس پر کاربند ہوں اور آشناؤں کو بھی اس کی ترغیب دیتا ہوں اور اس فتوے سے شاید ہی کوئی فرد اسلام بے خبر ہو۔ مگر ہمارا ملک پنجاب خصوصاً شاہ پور عام طور پر اسلامی تحریکوں سے بے خبر رہتا ہے۔ ان کی آگاہی کے لئے مختصر اُوہ فتوے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

”جمیعت علماء ہند کا یہ اجلاس کامل غور کے بعد مذہبی احکام کے مطابق اعلان کرتا ہے کہ موجودہ حالات میں گورنمنٹ کے ساتھ موالات اور نصرت کے تمام تعلقات اور معاملات رکھنے حرام ہیں۔ اس کے ماتحت حسب ذیل امور بھی واجب العمل ہیں۔

۱۔ خطابات اور اعزازی عہدے چھوڑ دینا۔

۲۔ کونسلوں کی ممبری سے علیحدگی اور امیدواروں کے لئے رائے نہ دینا۔

۳۔ دشمنانِ دین کو تجارتی نفع نہ پہنچانا۔

۴۔ کالوں اور سکولوں میں سرکاری امداد قبول نہ کرنا اور سرکاری یونیورسٹیوں سے تعلق قائم نہ رکھنا۔

۵۔ دشمنانِ دین کی فوج میں ملازمت نہ کرنا اور کسی قسم کی فوجی امداد نہ پہنچانا۔

۶۔ عدالتوں میں مقدمات نہ لے جانا اور وکیلوں کے لئے ان مقدمات کی پیروی نہ کرنا۔

صاحب! اس فتوے کو وہ شخص ناقابلِ برواشت کہہ سکتا ہے جس کے دل میں ایمان اور اسلام کی ذرا





پیروں کو ایسا نہیں چاہیے کہ مردہ خواہ بہشت میں جاوے یا دوزخ میں۔ ان کو صوفے مانڈے سے کام ہو۔ بلکہ امر معروف و نہی عن المنکر ہر وقت کریں۔ یہی اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔ نکتہ خیر امتہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ پہلی امتوں کے علماء اور مشائخ کو تنبیہ کی گئی ہے کہ انہوں نے امر معروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

لَوْلَا يَنْفَعُهُمُ الرَّبُّ زَيْتُونٍ وَالْأَحْبَارِ عَنْ قَوْلِهِمُ اللَّاتِمُ وَكُلُّهُمْ السَّحْتُ لِبَشْسِ مَا كُنُوا يَصْنَعُونَ۔

ان کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے کیوں نہیں منع کرتے۔ واقعی ان کی یہ عادت بری ہے۔ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا آگے آپ کا ایمان

مراد  
حالات  
انصیت  
با خدا  
بودو  
کردیم  
و  
گفتیم  
رفتیم

فقیر محمد ضیاء الدین عفا اللہ عنہ (۲ رجب المرجب ۱۳۳۹ھ)



## عقیدت مند ان دربار سیال شریف کے لئے ہدایت

بردارانِ ملت و عزیزانِ طریقت! جو مظالم اس مظلوم دور میں اسلام اور مسلمانوں پر ٹوٹ رہے ہیں ان کو سن کر ایک سچا مسلمان ہی نہیں بلکہ ہر انصاف پسند دل لرز جاتا ہے۔ خلافت اسلامیہ جس کا قیام و بقاء مذہبی نقطہ نظر سے ایسا ہی ضروری ہے جیسے جاندار کے لئے روح، پنجہ عیسائیت میں گر خوار ہے۔ جزیرۃ العرب جس کی نسبت ہمارے آقائے نامدار حضور اقدس ﷺ کی آخری وصیت تھی کہ

اخر جوا الیہود والنصارى من جزیرۃ العرب۔

اے اہل اسلام کا لعنت گاہ بن گیا ہے۔ کلمہ حق کی آواز ٹکانے والے فدا یانِ ملت و قوم جیل خانوں کی کوٹھڑیوں میں دست و پا بہ زنجیر ہیں۔ سرنامیں ہزاروں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ بے کس بھوکوں جان دے رہے ہیں۔ جن کے مرنی اور سر پرست حمایت حق پر نثار ہو گئے اور محض اس جرم میں کہ توحید حق کا نعرہ بلند کرنے والے تھے تیغ تثلیث کی نذر ہو گئے۔

وما نقموا منهم الا ان یؤمنوا باللہ العزیز الحمید۔ (پ ۳۰ البروج آیت ۸)

ان واقعات کو سن کر کس مسلمان کا کلیجہ ہے کہ پانی نہ ہو جائے اور کون سی آنکھ ہے۔ جو آنسوؤں کے دریا نہ بہائے۔ حقیقت میں ان واقعات نے مسلمانوں کو اپنے بھولے ہوئے فرائض کا زریں سبق دیا

(۱) حضرت امیر شریعت کے شائع فرمودہ کتابچے میں یہ ”ہدایت“ شامل نہیں تھی۔ یہ الگ سے حضرت خواجہ نیالوی کی طرف شائع کی گئی تھی۔ تاہم اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

ہے۔ اور یہ خوابِ غفلت میں سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے کے لئے تازیانہ غیبی ہے۔ ہمیشہ سے اور اس نازک وقت میں ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے کہ وہ اپنی ہر ممکن کوشش سے حمایتِ اسلام اور اپنے مظلوم بھائیوں کی دستگیری کرے۔ اس لئے فقیر اپنے عزیز آشناؤں کو خصوصیت کے ساتھ توجہ دلاتا ہے کہ وہ مطالباتِ اسلامی پورا کرانے کی طرف اپنا کام عمل تیزی کے ساتھ بٹھائیں اور دنیوی اعزاز و جاہ (جو چند روزہ ہے) کے بدلے خدائے ذوالجلال اور رسولِ عربی فدائے ابی وانی کی خوشنودی کی دائمی عزت حاصل کریں۔ معاندینِ اسلام کے ساتھ تمام تعلقات نصرت و حمایت کو ترک کر دیں۔ اور علمائے کرام کے متفقہ فتوے پر عمل پیرا ہوں۔ مظلومینِ سرنا..... جہاں یتیم بچے لوارث عورتیں بھوک کے مارے داعیِ اجل کو لبیک کہہ رہے ہیں۔ ان کی مالی امداد میں نہایت فراخ دلی سے حصہ لے کر مستحقِ رحمت ایزدی ہوں۔ کیا عجب ہے کہ اس نیک کام کی بدولت تمہارے سابقہ گناہ موم ہو جائیں اور جو رو سیاہی اور ظلمتِ قلبی حمایت و نصرت اعدائے دین کی وجہ سے تم پر چھا چکی ہے۔ دُھل جائے۔ ان الحسنات بذهبن السیئات۔

میرے عزیزو کیا تمہارے مسلمان دل اس کو گوارا کر سکتے ہیں کہ تم اونچے اونچے محلات میں چین اڑاؤ۔ صبح و مساء متعدد کھانے پہنچ جائیں اور تم خوشی سے ان کو نوش جان کرو۔ اور دوسرا اسلام کے ننھے بچے اور بے کس عورتیں ایک لقمہ کی حسرت میں جان دے دیں۔ تمہارے گھروں میں غلہ کے انبار اور خزانوں کے خزانے دفن پڑے ہوں۔ لیکن ان اسلامی پودوں کے لئے تم اپنی جیب سے ایک پیسہ صرف نہ کرو اگر واقعی تمہاری یہ حالت ہو گئی ہے تو قوتِ تمہارے اسلام پر! قیامت کے دن حضور اقدس ﷺ کے سامنے جب اسلام اور اس کے مظلوم افراد فریادی ہوں گے کہ یا رسول اللہ کفار نے تو ہم پر ظلم توڑے لیکن ان مدعیانِ اسلام نے بھی انہیں کا ساتھ دیا اور ہماری کچھ خبر گیری نہیں کی تو اس وقت تم کیا جواب دو گے۔ اگر آپ حضرات صرف بیجا اسراف و لا یعنی مصارف ہی کو چھوڑ دیں تو ان مظلومین کی کافی امداد ہو سکتی ہے۔ زکوٰۃ و عشر ہی سے اگر امداد کی جائے تو ان کو بس کرتا ہے جس کا اصلی و اہم مصرف ایسے ہی مظلومین ہیں۔ میں اسید کرتا ہوں کہ ان ہدایات پر میرے عزیز آشنا عملی طور پر کار بند ہوں گے اور سعادت دارین حاصل کریں گے۔ جو صاحبِ مظلومین سرنا کے لئے رقم ارسال کرنا چاہیں وہ یا تو فقیر کے پاس بھج دیں تاکہ یہاں سے مرکزی مجلسِ خلافت کو روانہ کر دی جائے یا اپنے صلح کی مجلسِ خلافت کو یا اس کام پر مامور خدامِ خلافت میں سے کسی کو باختر سید عطا کر دیں لیکن فقیر کو بھی رقمِ مرسلہ کے متعلق اطلاع دیں تاکہ فقیر بھی ان کے لئے دعاءِ خیر کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ہزار شکر ہے کہ اس نے اس فقیر کو بھی کارِ خیر میں حصہ لینے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور اپنی مختصر امداد اور کچھ عزیزوں و آشناؤں کی مدد سے تقریباً چار ہزار روپیہ اس میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرے اور زبانی شورو فغاں کی بجائے شاہراہِ عمل پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللهم آمین۔ بحرمۃ سید المرسلین - الداعی: فقیر محمد ضیاء الدین سجادہ نشین سیال شریف۔

حضرت پیر حافظ عبداللہ سیالوی  
برادر اصغر حضرت خواجہ ضیاء الدین  
سیالوی رحمہ اللہ

جو تکلیف انہادے سرتے جانے عقلت ساری  
لپہر فصل خدا دے با جموں ہورنہ ساتھی کوئی  
جھیرے وعدے کیے آسے سارے چا بھلائے  
اس خبرنے ہر کے دا خون بگر دا پھٹا  
کھڑے کھڑے کر لیونے کجھ نال خوف کیتونے  
اسیں تڑاوی رعیت آنناں تیں اساڈے سائیں  
حکم تڑاڈے نال اسان نے سرکھوائے سیتی  
ساڈا وین ونباجو نائیں منت کراں تڑاوی  
ترک اساڈے دین دے ٹک حیف نہ سرتے دھریو  
آخر کار کیتونے مینوں جیویں انہاں نیقی  
بخرے صے کر لیونے جیونکر وڈ کھائیاں  
دل مل سب عیسیاں اس وچ ڈاڈھا ظلم کھایا  
گاجر مولیٰ وانگوں گھر وچ بال بچے پئے وڈے  
کئی نمائے کھڑے کارن عاجز ہوکے موئے  
پر دین دی کارن سردیوں تیں مسلم مول نہ ہارن  
جنہاں وچ خدا نیدے راہیدے سر اپنے چاوا  
بہار مصیبت دکھ درد داسر اپنے تے چایا  
حیف ہے دین اساڈے اتے مسلم اسیں نال دے  
غازیاں دے وچ نام تڑاڈا لکھی اللہ سائیں  
غازیاں والے درجے تیں رب سچے تیں پاسو  
اوہناں غریباں بھکیاں تلیس رقماں ہی پہنچاؤ  
مدت ایسناں یتیمناں کارن کراں کس کھلوئے  
تیں تا آخر مسلم ایسو رکھو قدم ودھا کے  
خرچ کرو وچ راہ خدا دے جان تے مال تہا

مسلماناں دے اتے اج کل ہے مصیبت بہاری  
دین اسلام دی اچکل حالت ڈاڈھی نازک ہوئی  
سب عیسیاں دل کے یارو ایڈے ظلم کھائے  
شہ اسلام نول وچ شہر دے قید انگریزاں کیتا  
باقی ملک جو بادشاہ دا سارا ونڈالیو نے  
ہندوستان دے مسلماناں کھیا انگریزاں تائیں  
اسا سنانوں مدال دتیاں بندیاں چندیاں سیتی  
اس محنت دے بدلے مہمانوں عرض اساڈی  
ایڈا ظلم ظلیف اتے تیں نہ ہر گز کر یو  
پر کجھ انگریزاں خیال نہ کیتا کجھ پرواہ نہ کیتی  
سب علاقے ترکان کولوں کھوہ لئے عیسیاں  
جھیرا ملک جے ترکان کولوں ہتہ اینہادے آیا  
کر قتل عام عیسیاں مارے جھوٹے وڈے نڈے  
کئی یتیم تے کئی رندیاں کئی بے وارث ہوئے  
جو کجھ سر ترکان تے گدزی مضی اسلام دی کارن  
بن کرو خیال کھان نال دے دے اے بہراؤ سارے  
جنہاں مضی اسلام دی خاطر سر اپنا کٹوایا  
جیکر پیچھے ہال بھی بھکے مر جانوں انہادے  
چاہئے رقماں جمع کر کے بھیجو اوہناں تائیں  
گھر اپنے وچ بیٹھیاں ہویاں غازی مرد بن جاسو  
ہت ہارو مول نہ تیں مرداں وانگوں آوو  
اچکل کل مسلمان ہندو سب اکٹھے ہوئے  
ہندو بڑی مدد پئے کر دے سارا زور لگا کے  
اللہ نال تڑاڈے ہو سی مدد گار مدای

# نظم

مسلمانانِ عالم گشت حیران  
چہ سال دور فلک گردیدہ اسال  
نمودے ہر ہی با دشمنِ دین  
ہمہ عیسائیاں اجماع کروند  
کنوں بیکس شدہ ناموسِ اسلام  
نخستیں لائڈ جارج وحدہ کردہ  
کنوں کردہ ہمارا وحدہ فراموش  
ممالک چیدہ چیدہ خود گرفتند  
ستم ہائے کہ برترکان نمودند  
ہزاراں فائماں ویران کردہ  
کنوں جملہ مسلمانانِ عالم  
ہمہ کس حسبِ طاقت استطاعت  
شدہ واجب ہر مسلم ہمیں کار  
چو ترکان نیست کس اکنوں پریشان  
گئے بودند ترکان شاہ شاہاں  
نمودندے گدایاں را غنی گے  
گئے واساقتدے قیدیاں را  
گرفتندے گئے صد خوانِ یغما  
گئے مالک ہمہ آلاتِ جنگی  
گئے از حکم اوشاں جمعہ واجب  
غرض احوالِ ترکان گفتنی نیست  
اگر اسلام داری اے مسلمان

دلِ ہر یک مسلمان شد پریشان  
تقو بر تو بود اے چرخِ نادان  
کہ کردی دین حق از ظلم ویران  
نمودہ قید شاہِ آلِ عثمان  
چو قیدی ہست آلِ شاہِ مسلمان  
کہ ترکان را نخواہم کرد نقصان  
نمودہ پارہ پارہ ملکِ سلطان  
گرفتہ باقی ماندہ حصہِ یونان  
نہ او را ہست حد و نیت پایاں  
ہزاراں ہر لقمہ گشتہ یحیاں  
کمر بستہ بہ اندادِ غریباں  
تصدقے نماید بریتیاں  
کہ سازد مرحمتِ بازیرِ دستاں  
بہ پیشی شان، خود پاکِ سبحان  
کنوں ہمیں مساکینِ لقمہ جوایاں  
کنوں ہستند مفلس چوں گدایاں  
کنوں خود ہمیں مہوسینِ بزنداں  
کنوں یغما شدہ خود ملکِ اوشاں  
کنوں دو دست خالی چوں اسیراں  
کنوں ہر جمعہ محتاجِ فریاں  
فلک بر حالِ ایشاں ہستِ گرگیاں  
عنایت کن بہ مسکیناں فراواں

مثالی "لن تنالوا البر حتی تستفقو" نہ آخر خواندہ از ورقِ قرآن  
نہائی صرف ہر چیز سے کہ داری براہِ مالک و غفار و رحمان  
خدایا این تمنائے عبد ہست کہ باشند اخترِ اسلام تابان

## نظم

اے ستم گر مجھ کو تو نے خسہ و رسوا کیا  
تیرے گیسو کھم نہیں زہریلی گیسوں سے صنم  
کیوں نہیں رکنا تو اپنے ظلم سے اے بے وفا  
اپنے منہ سے تو حقیقی دوست بن جاتے ہیں وہ  
یوں تو وہ اب رحمِ دل خود کو سمجھتے ہیں گر  
ہم تو تیرے عشق میں ایمان و دولت دے چکے  
ہے عبث چشمِ وفا ان طوطِ چشموں سے عبد  
خانماں ویراں کیا دل کو کیا ناشاد بھی  
تیغِ ابو نے ترے غارت کیا بغداد بھی  
کچھ تو ہونی چاہیے اس ظلم کی تعداد بھی  
پر نہیں دیتے وہ مرنے کے لئے میعاد بھی  
خونِ ناحق کے لئے کر دیتے ہیں ارشاد بھی  
تو بھی اے کافر ذرا کر اپنے وعدے یاد بھی  
ان کو بتلا نہیں سبقِ وفا استاد بھی

### تاریخِ احرار پر سلسلہ وار زیرِ طبع کتب

برصغیر میں مجلسِ احرارِ اسلام کی تاریخی جدوجہد کو محفوظ کرنے کے لئے مرحلہ وار مختلف موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

وہ تمام احباب جن کے پاس مجلسِ احرارِ اسلام سے متعلق اپنی یادداشتیں، مطبوعہ ریکارڈ، احرار کے اخبارات و جرائد..... روزنامہ آزاد، روزنامہ نوائے پاکستان، روزنامہ ہلالِ نو، (بمبئی) ہفت روزہ دورِ جدید، (بمبئی) ترجمانِ احرار (علی گڑھ) ترجمانِ احرار (سرحد) سہ روزہ افضل (سہارنپور) روزنامہ مجاہد، ماہنامہ تبصرہ (لاہور) نیز اکابر احرار اور جلسوں کی تصاویر وغیرہ موجود ہوں ازراہِ کرم ادارہ کو طالع دیں۔  
استفادہ کے بعد تمام مواد شکرِ یہ کے ساتھ واپس لوٹا دیا جائے گا۔

### زیرِ طبع کتب

خطباتِ احرار (سید محمد کفیل بخاری)، شاہ جی کی کہانی شاہ جی کی زبانی (سید محمد کفیل بخاری)، خطباتِ امیرِ شریعت (سید محمد کفیل بخاری)، احرار اور تحریکِ فوجی بھرتی بانی کاٹ (محمد عمر فاروق) اکابرِ احرار، تعارف، سوانح، خدمات، (محمد عمر فاروق) احرار اور تحریکِ کشمیر ۱۹۳۱ء (محمد عمر فاروق)۔

رابطہ: سید محمد کفیل بخاری، دارِ نبی ہاشم، مہربان کالونی ملتان۔ فون 511961 (061)

ملک محمد الدین صابر امرتسری (گوجرانوالہ)

## "صفتاں بہت اوس سخی سلطان دے وچ"

تیری موت دراصل خود دار دی موت  
 نگہبانِ امت، باوقار دی موت  
 اوس قافلے دے ہے سالار دی موت  
 فرملت رئیس الاحرار دی موت  
 الاعلان اے تیری پکار دی موت  
 شیخ حسام دے صابر غمنوار دی موت  
 بھگ گئی او شمعِ ملتان دے وچ  
 پیدا ہونا نہیں جہاں دے وچ  
 اے تاثیر سی اوہدی زبان دے وچ  
 آئی جنبش نہ ذرا ایمان دے وچ  
 چرچا عام ہو نیا ہندوستان دے وچ  
 پیا فرق نہ کچھ آن شان دے وچ  
 نیو یارک، نہ چین، جاپان دے وچ  
 فلسطین نہ مسقط، عمان دے وچ  
 نہ ظہران اندر نہ ایران دے وچ  
 ناممکن ہے سارے جہاں دے وچ  
 گھر گھر سوگ ہو یا پاکستان دے وچ  
 صفتاں بہت اوس سخی سلطان دے وچ  
 طاقت کیے اے صابر نادان دے وچ

مرحبا شیرا تیری موت اے  
 محافظِ دین دے، عاشقِ رسول دے وی  
 فرنگی دور نہ جنوں دبا سکيا  
 ناممکن ہے کدے وی بھل جاوے  
 آوے فرق نہ نبی دی شان اندر  
 جانباز، قاضی، تاج، مظہر، شورش  
 جدی روشنی سی ساری وچ دنیا  
 ایہو جیہا بے خوف بے باک غازی  
 جدول بولدا سی، موتی رولدا سی  
 تختہ دارتے وی اوہنے حق کھیا  
 لدھا رام دا واقعہ یاد ہو سی  
 دشمن خود ذلیل خوار ہوئے  
 پیدا ہونا نہیں، ہند، سندھ اندر  
 نہ اے، مکہ، مدینہ، بغداد، اندر  
 نہ اے قاہرہ، مصر، نہ وچ کابل  
 براعظم نہ ایشیا، وچ یورپ  
 ایس مردِ مجاہد دی موت اے  
 بے مثال، کمالِ حسین، عاقل  
 اوس درنایاب دی صفت آکھے

## وہ آدمی تھا مگر.....

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے ساتھ نیکیوں اور سعادتوں کی ایک دنیا لے گئے۔ جو گونا گوں اوصاف و خصائل اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے تھے، وہ پہلے بھی ایک وجود میں جمع ہوتے رہے۔ اب تو زمانہ ان اوصاف و خصائل کی تربیت ہی سے بد ظاہر محروم نظر آتا ہے۔ پھر کس بناء پر امید رکھنی جاسکتی ہے کہ ویسی کوئی شخصیت ہمیں دوبارہ دیکھنی نصیب ہوگی۔

جس دور سے میں گزر کر آیا ہوں اس میں ہر طرف عظیم القدر شخصیتوں کی صفیں نظر آتی تھیں جن میں سے ایک ایک فرد علم و فضل، ہمت و شجاعت، ایثار و نظریات اور عمل و سرگرمی کا ایک ایسا عجیب و غریب پیکر تھا کہ اسے دیکھتے ہی فرط ادب و احترام سے گردنیں جھک جاتی تھیں۔ آج ویسے وجود کہاں نظر آتے ہیں؟ اگر ہوں گے تو وہی جو اکاد کا باقی رہ گئے۔ جیسے طوفان گزر جاتا ہے تو اپنے پیچھے بادلوں کے چند ٹکڑے چھوڑ جاتا ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم و مغفور کے لئے اس مجمع عظیم میں بھی اک معزز مقام حاصل تھا۔ میں آج ان کی مثال کہاں تلاش کروں؟ ایک وسیع ظلمت زار میں روشنی کی کرنیں کس امید پر ڈھونڈوں؟

### گزری ہوئی دنیا

حضرت امام بخاری سے ایک شعر منسوب ہے۔ جس کا مفہوم اردو میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگر تیری زندگی طویل ہو گئی تو لازماً تمام احباب کی موت کے غم برداشت کئے بغیر تیرے لئے چارہ نہ رہے گا۔ اس وجہ سے تیری زندگی اندھوہ و قلق کا درد انگیز مرقع بن جائیگی۔

اس اندھوہ و قلق کا صمیم انداز وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے احباب و رفقاء کا کافلہ منازل حیات سے تیزی کے ساتھ گزر گیا اور وہ گردو پیش کارواں کی حیثیت میں پیچھے رہ گئے۔ میں کیا عرض کروں کہ کن کن بزرگوں، غمبول اور ہمدموں کی مفارقت کے دماغوں سے سینہ و دل شعلہ زار بنے ہوئے ہیں۔ کان جن صدائوں سے عمر بھر آشنا رہے۔ وہ اب کہیں سننے میں نہیں آتیں۔ نگاہیں جن مناظر کی اس درجہ خوگر ہو چکی تھیں کہ انہیں کو زندگی کے طبعی اور حقیقی مناظر سمجھتی تھیں ان کی زیارت کے لئے اب دور دور تک جاتی ہیں اور ناکام واپس آتی ہیں۔ کوئی گزری ہوئی دنیا کو کہاں سے لوٹا لائے اور کیوں کر لوٹا لائے؟ زندگی کا دھارا انتہائی تیزی سے بہنا چلا جا رہا ہے۔ اس میں رجعت ممکن نہیں۔ اس کا پیچھے کی طرف لوٹنا خارج از بحث ہے اور جو موصیٰ لہنی فطری بے تابویں کو دھارے کی سطح پر بکھیرتی ہوئی آگے جا چکی ہیں وہ پلٹ کر نہیں آسکتیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہر موج کے بعد دوسری ویسی ہی یا اس سے ملتی جلتی موج آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی اور منظر میں شکست یا انقطاع ہی نہیں بلکہ تغیر و تبدل کا بھی احساس بہت کم ہوتا تھا۔ مگر اب؟۔۔۔۔ میں کیا عرض کروں؟ اب دوسری ہی دنیا وجود میں آگئی ہے۔ وہ دنیا یقیناً باقی نہیں رہی۔ جس میں ہم نے زندگی کے بیشتر اوقات گزارے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس گزری ہوئی دنیا کی بہت بڑی شخصیت تھے۔ ان معنوں میں بڑی شخصیت نہ تھے کہ انہیں کوئی بہت بڑا منصب یا وسیع خطے پر اقتدار حاصل تھا۔ ان معنوں میں بھی بڑی شخصیت نہ تھے کہ وہ کثیر القدر اسوا و املاک پر قابض تھے اور اس وجہ سے سینکڑوں ہزاروں افراد کی زندگیاں ان کے ساتھ وابستہ ہو گئیں تھیں۔ اسلام کے نزدیک عظمت کا معیار نہ دولت ہے، نہ اقتدار، نہ رنگ ہے، نہ نسل، تنہا علم و فضل ہی نہیں تقریر و خطابت کی سرانگیزی اور تحریر و نگارش کی ندرت کاری بھی نہیں بلکہ صرف تقویٰ ہے۔ صرف حسن عمل ہے اور تقویٰ حسن عمل کا پیمانہ بھی اپنا بنایا ہوا ہرگز نہیں۔ بلکہ کتاب و سنت کا پیمانہ اللہ تعالیٰ کے احکام و اوامر اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کا پیمانہ۔

### رفعت و منزلت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اسی پیمانے کے مطابق دور حاضر کی رفیع المنزلت شخصیت تھے اگرچہ آج کل بیشتر ٹھاپوں کا انداز بنش بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ موازنے اور ناپ تول کے مسئلہ معیار باقی نہ رہے۔ زلویہ ہائے نگاہ کچھ لور ہو گئے۔ دقیقہ شناسی کی صلاحیتوں میں فرق آ گیا۔ اس لئے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، یقین نہیں کہ اسے اسجبل کی سطح فہم و نظر کے مطابق سمجھنے میں کامیاب ہو سکوں گا اور اپنا مطلب سمجھا سکوں گا مگر کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کیونکہ ٹھاپوں کی دگرگونی کا موجودہ دور بہر حال عارضی ہے دیر پا نہیں اور جو کچھ عرض کرنے کا خواہاں میں ہوں، وہ جیسا پہلے بتا دیے ہیں آج ہے اور ویسا ہی ہمیشہ رہے گا خواہ زمانہ کتنا ہی چکر کاٹ۔۔۔ اور کتنی ہی گردشوں کا تہہ مشق بن جائے کیونکہ حقیقتیں بدلا نہیں کرتیں۔ وہ ہر حال میں قائم و استوار رہتی ہیں۔ کلمات اللہ میں تبدیلی ممکن نہیں۔

### زندگی کے دو مقاصد

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ راہ حق میں ایثار و شہادت کا وہ ایک نادر پیکر تھے ان کی ہوشمندانہ زندگی کا ایک ایک لمحہ جہاد فی سبیل اللہ میں بسر ہوا۔ میرے علم کے مطابق ان کی زندگی کے دو اہم مقصد تھے۔ اول یہ کہ ان کا وطن اجنبی تسلط کی ہر آلائش سے بالکل پاک ہو جاتا اور سامراج کا وجود مٹ جاتا وہ سامراج کے دشمن تھے۔ مگر برطانوی سامراج کی مخالفت خصوصیت سے ان کی زندگی کا نصب العین بنی رہی کیونکہ برطانیہ ہی پاک و ہند پر قابض تھا اور برطانیہ ہی کے قبضے میں اسلامی دنیا کے وسیع ترین اور بہترین خطے تھے۔ دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمان دنیا میں بالعموم پاک و ہند میں بالخصوص آزاد تر، خوددار تر اور خوشحال تر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں اور عقیدہ و عمل کے لحاظ سے سچے مسلمان بن جائیں۔ تفصیلات پر گفتگو کرتے ہوئے آپ کہہ سکتے ہیں کہ فلان معاملے میں ان کی رائے صحیح نہ تھی اور فلان معاملے میں ان سے اندازے کی غلطی ہو گئی مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ جن مقصدوں کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کئے رکھی۔ ان کے لئے سنی و کوشش، جہاد، ایثار یا فداکاری میں کبھی تاہل نہ کیا یا کبھی یہ سوچا کہ قدم آگے بڑھایا تو انہیں قید و بند سے سابقہ پڑے گا۔ اور اہل و عیال کے گزارے کی کوئی صورت نہ رہے گی۔ ان مقصدوں



لے لئے لڑنا انکے نزدیک اسلامی زندگی کا گراں بہا فرض تھا اور فرض اس لئے ہوتا ہے کہ اسے بے چون و چرا خوش دلی سے ادا کیا جائے۔ اس لئے نہیں ہوتا کہ اسے پورا کرنے کے لئے قدم اٹھانے سے بیشتر ذاتی رنج و راحت کا موازنہ کر لیا جائے۔

### شرف اولیت

چنانچہ اسلامیت و آزادی کے ہر معاملے میں انہوں نے اولیت و سبقت کا شرف برابر قائم رکھا۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے فرائض کو اس نقطہ نگاہ سے دیکھا اور اس مستعدی و جانفروشی سے انہیں پورا کیا۔ میں اطمینان سے بیٹھا ہوا یہ داستان سرائی کر رہا ہوں اور داستان سرائی سے حقیقی حالات کا اندازہ مشکل ہے اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ ہر شخص اپنے کسی محبوب و مرغوب مقصد کے لئے اپنے اوپر ویسی ہی حالت طاری کرے۔ پھر اسے معلوم ہو گا کہ بلند مقاصد کے دیوانوں کی زندگی کیوں کر گزرتی ہے۔

پھر یہ معاملہ دو چار دن، دو چار مہینے یا دو چار برس کا نہ تھا۔ حکومت برطانیہ اٹل ہوتی تھی سید عطاء اللہ شاہ کا عنفوان شباب تھا۔ جب انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا اور وہ اسی میدان میں میرے سامنے بوڑھے ہو گئے۔

### آخری دور کا نقشہ

ان کے ایک نیازمند نے آخری دور کا نقشہ یوں پیش کیا ہے۔

اس سمر بیان مقرر اور شیریں مقال خطیب شعلہ نوا اور آتش نفس عالم دین کو اس حالت میں دیکھا جس کی آواز دم ہو چکی تھی جس کی زبان سے گفتگو بہ مثل ہو رہی تھی۔ جس کے قوائے جسمانی و ذہنی کمزور ہو چکے تھے۔ جس کی بینائی بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ جو ٹوٹے ہوئے، کچے کرائے کے مکان میں مکین تھے۔ جس کی دینی خدمت کا صلہ عزت و تنہائی اور جدوجہد آزادی کا انعام مسلسل پریشانی اور کسمپرسی تھا۔ وہ جس کی صحت کبھی باعث مد رکھ تھی۔ آج اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور تھا۔ آج اس کے جوڑ جوڑ اور نس نس میں نصف صدی کی ٹکان اور مشقت شامل تھی۔

یقیناً ہر شخص کے بڑھاپے کی کیفیت کم و بیش اسی قسم کی ہوتی ہے مگر کیا اس کیفیت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ان مسلسل اور طویل قیدوں اور اسیریوں کا بھی خاصا بڑا حصہ نہیں، جو اس نے دو قرن تک انتہائی مردانگی اور جوان ہمتی سے راہ حق کی ناگزیر مشقتیں سمجھ کر برداشت کیں؟ اس حالت میں بسر کیں کہ حکومت برطانیہ بظاہر اٹل نظر آتی تھی؟

بے نفسی اور بلند ہمتی۔

پھر آپ نے دیکھا کہ جس عطاء اللہ شاہ بخاری نے راہ حق کے لئے قربانیوں میں کبھی ایک لمبے کے لئے بھی توقف نہ کیا وہ اپنی ذات یا اہل و عیال کے لئے کبھی کسی اجر یا معاوضے کا طلب گار نہ ہوا۔ یہاں تک کہ زندگی کے بالکل آخری اوقات میں بھی وہ چپ چاپ کرائے کے ایک کچے مکان میں مقیم ہو گیا اور کبھی کوشش

نہ کی کہ اسے کوئی درمیانے درجہ کا مکان ہی الاٹ ہو جائے۔ حالانکہ اس کے گرد و پیش بارہ تیرہ سال تک الاٹ منٹوں کا ایک ہی عظیم پیارہا۔ وہ غیر معروف فرد نہ تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے دل فرط عقیدت سے لٹکے لئے برابر زپتے رہے۔ ارباب حل و عقد میں بھی اس کے شناساؤں، بلکہ عقیدت مندوں کی کمی نہ تھی۔ مگر اس نے اپنے لئے زندگی کا جو سانچہ تبویز کر لیا تھا۔ اس میں ایسی باتوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اہل حق ہر متاع اہل علم کی فلاح و سود کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ (اہل حق اپنی ہر متاع اہل علم کی فلاح و ہسود کے لئے لٹاتے رہتے ہیں۔ مگر خود کبھی کوئی چیز لینے کے روادار نہیں ہوتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے لئے عزیز ترین متاع اس کی درویشی تھی۔ وہ اسی متاع پر اس طرح قانع اور مطمئن رہا کہ ارباب اقتدار کو اپنی بلند پایہ سندوں پر بیٹھ کر بھی کبھی وہ اطمینان شاہد ہی نصیب ہوا ہوا اسی مقام کے باب میں عرض کیا گیا ہے۔

گر دولت ایں بود کہ بہ درویش سے دہند  
میری دعوت بادی گریستن جم و کے را بہ تمت خریش

میری زبان اس دعوت پر آمادہ نہیں ہو سکتی کہ لوگ اس نادر شخصیت کے متعلق میں اپنے فراموش کردہ فرض کی تلافی کر دیں۔ میرے شیوہ فکر و نظر کو ایسی دعوت سے کوئی مناسبت نہیں۔ البتہ یہ ضرور رکھتا ہوں اور جب تک زندہ رہوں گا کھتا جاؤں گا کہ دوسری نادر شخصیتوں کی طرح اس نادر شخصیت سے بھی خدمت اسلام، خدمت ملت، خدمت ملک اور خدمت خلق کے طور طریقے سیکھے پہلے ایسے مبارک وجود اتنے کمیاب نہ تھے جتنے آج ہیں۔ یہ آئینہ ہوتے ہیں جنہیں قدرت اس لئے بھیجتی ہے کہ لوگ انہیں سامنے رکھ کر اپنے خدو خال درست کر لیں۔ قومیں ایسی شخصیتوں کے بل پر ترقی کرتی ہیں۔ عزت مندانہ زندگی کے لئے ایسے ہی اشار، ایسی ہی فداکاری، ایسی ہی بے نفسی اور بے غرضی کی ضرورت ہے۔

### عزت مندانہ زندگی کی راہ

جس قوم کے افراد کی اکثریت یا خاصی بڑی تعداد اغراض کی گرم بازاری کا لہندہ صحن بن جائے اس کے لئے قدم آگے بڑھانے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ اس کی متاع ہمت و عمل تو اغراض کے شعلہ زار کی نذر ہو جائے گی۔ یہ بھی واضح رہے کہ قومیں دلکش الفاظ یا بہ ظاہر دل پذیر تقریروں سے زندگی کی امتحان گاہ میں کامیابی کی اہل نہیں بنتیں ایسے عمل کی ضرورت ہے جو اشار و بے نفسی کے سرچشمے سے فوازے کی طرح اچھلے۔ سید عطاء شاہ بخاری کی ذات گرامی زندگی بھر ایسے ہی اعمال کا مصدر بنی رہی۔ وہ ہمارے عہد میں اسلامی اوصاف و اطوار کا ایک قابل قدر نمونہ تھے۔ ایسے نمونے جتنی تعداد میں پیدا ہو سکیں، انہیں حقیقی قومی دولت سمجھئے۔ جن باتوں کو ہم اب اپنے نزدیک اہم سمجھتے ہیں اور معیار وقعت بنائے بیٹھے ہیں۔ انہیں تو اسلام کے حقیقی معنوں سے کوئی بھی مناسبت نہیں۔

ممکن ہے میری گزارشیں آپ کو تلخ و ناخوشگوار معلوم ہوں مگر۔

من آنچه شرط بلوغ است باتو سے گریم  
تو خواہ از سننم پندگیر، خواہ ملال

## شاہ جی اور فتنہ راجپال

### جماعت احرار اور اس کی مشکلات

آریہ سماجیوں کی طرف سے توہینِ رسول کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور مجلس احرار بھی ناموس رسول ﷺ کی حفاظت کے لئے ہر قربانی دینے کا فیصلہ کر چکی تھی لاہور میں "رنگیلار رسول" ناپاک کتاب کے خلاف عزم و غصہ کے طوفان ابھر رہے تھے اور ساری قوم مسلم لیگ کی بے عملی سے اکتا کر مجلس احرار کے دامن سے عمل کی توقع واپس لے کر چکی تھی اور خواص سے بیزار عوام میں سے ہر ایک کی زبان سے "احرار کہاں ہیں" "احرار کہاں ہیں؟" کی بے تاب آوازیں نکل رہی تھیں۔ اب وہ دن آگیا جب لوگ جوق در جوق دہلی دروازہ کے باہر مجلس احرار کے دفتر کی طرف بھوم کرتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ بارہ بجے تک شاہ محمد غوث رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار کے ارد گرد سارے باغات انسانی کھوپڑیوں کے گھنے جنگل بن گئے تھے۔

مجلس احرار بھی عجیب قسم کی جماعت تھی بڑی خوش قسمت مگر بڑی بد قسمت اس نے قبولِ عام کی ایسی بہاریں دیکھیں کہ کسی دوسری جماعت نے کم دیکھی ہوں گی۔ مگر اسے پسپائی اور زوال کی خزاں کے منظر بھی ایسے خوفناک دیکھنے پڑے کہ کیا کہوں

بات کیا تھی؟

بات یہ تھی کہ اس جماعت کا فکری رہنما اس جماعت کو ایسے انداز سے چلانا چاہتا تھا جس سے احساس مقامی کی بھی تسکین ہو جائے اور آزادی وطن کے اہم تقاضے بھی پورے ہو جائیں پس اس دو عملی استرجاع میں مجلس احرار میں کبھی تو بہار آجاتی رہی اور کبھی اسے بھیانک خزاں کا سامنا کرنا پڑتا۔ مسلمان عوام بڑے سادے اور مخلص لوگ ہیں۔ بیجا پیپی ان کی سمجھ سے باہر ہے وہ توسیدی سپاٹ بات کو سمجھتے ہیں۔ احرار کی یہ مشکل رہی ہے کہ انگریزوں کی مخالفت کے ساتھ ساتھ انہیں ان فتنوں کو بھی سنبھالنا پڑتا تھا جو پوری تحقیق کی جائے تو معلوم ہو گا کہ فرقوں کے حقوق کے پردے میں انگریزوں کے ہی اجمارے ہوئے تھے اور ان فرقوں کے حقوق سے زیادہ افتراق انگیزی معلوم ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شاطر اپنے مہروں کو آگے بڑھانے میں بڑی چابک دستی سے کام لیتا تھا۔ اس کے یہ مہرے مسلمانوں میں بھی تھے اور ہندوؤں میں بھی اور سب سے اچھے مہرے وہ ہوتے تھے جن کی چال کا دھوکہ ہی نہ ہو سکے ایسے موقعوں پر شاطر مخلص لوگوں سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے اور ایسی باتیں اٹھاتے تھے جن سے الگ ہونا ناممکن ہوتا تھا ہندوؤں کی بڑی کمزوری رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کے نام سے بدکتے تھے اور یہ منصوبہ بھی ایک سو سال سے ان کے پیش نظر تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی احساس کو بار بار کے تصادم سے کمزور کیا جائے اس میں انگریز اندر سے اس کا ہمنوا تھا گو ظاہر میں ثالث بن جاتا تھا اور لطف یہ کہ مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم بھی رکھتا تھا۔

احرار کی یہ حکمت عملی تھی کہ ہندو اور انگریز دونوں سے لڑائی لڑی جائے مگر شاطر کچھ اس طرح سے جال چلتا تھا کہ ہندو سے ان کی لڑائی اچھی طرح سے گٹھ ہاتی تھی مگر انگریز سے لڑائی کے وقت سارا ہجوم ان سے اس طرح ہٹ جاتا تھا گویا کبھی تھا ہی نہیں تاہم یہ واقعہ ہے کہ احرار دونوں محاذوں پر لڑتے رہے۔

### دفتر احرار میں احرار رہنماؤں کا اجتماع

بات کہیں سے کہیں ٹھل گئی میں یہ کہہ رہا تھا کہ تو بین رسالت ﷺ کے خلاف احتجاج سے بھرا ہوا ایک ہجوم بے پناہ شاہ محمد غوث والی سرک اور باغات میں جمع ہو گیا گویا ایک تقاضا عام تھا کہ احرار اس احتجاج کو عملی شکل دینے میں قوم کی رہنمائی کریں اس صورت حال میں مجلس احرار کے دفتر کی بلائی منزل پر احرار کے بڑے بڑے رہنما سرا سینگ کی اور پریشانی کے عالم میں جمع ہوئے اور مسلمانوں کے جذبات کو کم کرنے اور منظم کرنے کے وسائل پر غور کرنے لگے۔ اس موقع پر میری یاد کے مطابق منجملہ دیگر اصحاب کے چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمن، مولانا مظہر علی، مولانا داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولانا غلام غوث ہزاروی اور سب سے اہم اور ممتاز سید عطاء اللہ شاہ بخاری موجود تھے۔ بحث کے دو نقاط تھے۔

اول: کہ تو بین رسول ﷺ کے مسئلہ کو عدالت میں لایا جائے۔

دوم: آریہ سماجوں کی سرکوبی کے لئے حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی جائے۔

یہ بحث بڑے معرکے کی، بحث تھی ایک طرف وضع احتیاط کا انداز تھا اور دوسری طرف جرأت غازیانہ کا مظاہرہ تھا اندرون خانہ کی اس بحث میں ہر قسم کی باتیں ہوئیں اور یہ خصوصیت احرار میں ہی دیکھی گئی تھی کہ سخت سے سخت بحث کے باوجود احرار برادری کا احساس کبھی کمزور نہیں ہوتا تھا۔

### امیر شریعت کی اہل لاہور کو یقین دہانی

شاہ محمد غوث والی سرک پر ہجوم اور زیادہ ہوتا گیا اور اب شاید مخالف جماعتوں کے لہجہ بھی ہجوم میں شامل ہو گئے تھے اور نعروں کا انداز کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ گویا اگر کوئی جلد فیصلہ نہ ہوا تو دفتر احرار اور رہنمایان احرار کی بھی خیر نہیں۔

اس شور و شغب کے عالم میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بالکونی سے اپنا چہرہ دکھایا اور کہا "اے باشندگان لاہور! معاملہ عزت رسول ﷺ کا ہے اور اس کے لئے ہماری جماعت ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس مقدس جہاد میں وہ لوگ شریک نہیں جن کو اپنے دعوے کے مطابق اب تک میدان میں آچکنا چاہیے تھا۔ ہم عزت رسول ﷺ کے لئے سرحد کی بازی لگانے کا فیصلہ کر چکے ہیں مگر جاؤ ان رہنماؤ کو بھی لے آؤ جو ہم سے الگ مسلک رکھتے ہیں تاکہ یہ جہاد آخری جہاد ہو اور اس میں پوری قوم شریک ہو۔

### سول نافرمانی کی تحریک

سید عالی مقام کی اس تجویز سے دو اثر مرتب ہوئے بعضوں نے کہا کہ جھوٹ کہہ رہے ہیں بعضوں نے کہا آخر کار احرار ہی قوم کے کام آئی، یہ خاں بہادر، سر اور نواب اب کہیں نظر نہیں آتے۔

احرار کی میٹنگ پھر شروع ہوئی، شاطروں کی پہلی چال ذرا سی ناکام رہی، مگر شاطروں کی قوم حوصلے والی قوم ہوتی ہے، ہجوم پھر مشتعل کر دیا گیا میٹنگ کے اندر اب بمٹ اس نکتے پر آ کر رک گئی کہ عدالت میں چارہ جوئی اب بہانہ جوئی کے مترادف سمجھی جائیگی۔ اس لئے سول نافرمانی کے بغیر کوئی چارہ نہیں مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ ایسی سول نافرمانی میں پوری قوم کو شریک کیوں نہ کیا جائے مگر اس کے لئے پھر التوا ضروری تھا اس لئے یہاں بمٹ بند ہو جاتی تھی۔

### چودھری افضل حق کی رائے

چودھری افضل حق کا خیال تھا کہ سول نافرمانی کا مسئلہ طے شدہ ہے مگر شہر کے دوسرے رہنماؤں سے بھی اشتراک کی درخواست ضروری ہے تاکہ نقصان کی صورت میں یہی دوسرے رہنما قوم کو یہ کہہ کر نہ بھڑکائیں کہ دیکھا ہم عدالت کے ذریعے سارے مسائل حل کرالیتے۔ یونہی مسلمانوں کا خون کرا دیا اور بات بھی ٹھیک تھی مگر بڑا مسئلہ یہ تھا کہ باہر کے ہجوم کو کس طرح مطمئن کیا جائے عالی مقام سید عطاء اللہ شاہ بخاری بڑے راست پسند آدمی تھے۔ مگر سیاست میں باہر کے شاطروں کی ماریں کھاکھا کر یہ ضرور ماننے لگے تھے کہ شاطروں کے بچائے ہوئے جال میں پھنسا نہیں چاہیئے۔ تاہم مسئلہ کے حل کی جو صورت بھی سامنے آئی وہ خطرناک اور نازک ہی معلوم ہوتی تھی۔

### امیر شریعت کا فیصلہ اور بحث کا خاتمہ

اب سہ پھر ہو چکی ہے اور چار بجا چاہتے ہیں۔ اور ہجوم اور بھی بڑھتا جا رہا ہے، نعروں کی آوازیں اتنی بلند اور گونج دار ہوتی جا رہی ہیں کہ مجلس بحث میں لوگ ایک دوسرے کی بحث کو سن بھی نہیں سکتے۔ دفعتاً سید صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور دوسرے کمرے میں چلے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی اور دیر تک سجدے میں رہے۔ اور جب سجدے سے اٹھے تو ان کی آنکھیں اشکبار تھیں اور زبان پر یہ الفاظ

اللهم صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراہیم وعلی آل ابراہیم انک حمید مجید

کہتے ہوئے پھر مجلس میں داخل ہوئے اور فرمایا "آج ہمارا طریق کار صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ شہر کے سرکاری رہنماؤں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اور ہر مصلحت سے آنکھ بند کر کے ناموس رسول ﷺ کے لئے ہر وہ اقدام کیا جائے جس کی ضرورت ہو یہ فرمانے کے بعد فرمایا۔ بس میری یہی رائے ہے فقط۔"

### جلسہ عام کا اعلان اور دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ

حضرت سید صاحب کے اس نعرہ حق کے بعد بمٹ واستدلال کا چراغ گل ہو گیا اور ساری جماعت نے سید عالی مقام کی پیروی کرنے کا اعلان کیا اور فیصلہ ہوا کہ دہلی دروازے کے باہر جلسہ عام کی فوری سنادی کرا دی جائے مہر علم دین (جن کی اسیری کی مدت میری دانست میں بالاقساط پندرہ برس سے کم نہ ہوگی) کی آنکھیں جبک اٹھیں اور چہرہ غیرت دینی سے متمنا اٹھا ڈھنڈورا پیٹنے والے اطراف شہر میں پھیل گئے۔

اب ہجوم شہر کی کوتوالی سے لے کر اکبری دروازے تک پھیل گیا اور احرار کے رضاکار باغ میں پلیٹ فارم جمانے میں مصروف ہو گئے اب لوگ کوتوالی سے سرک سرک کر باغ میں پلیٹ فارم کے ارد گرد جمع ہونے لگے۔ اس اثناء میں شاطران شہر نے حکام سے مل کر ان پر اثر ڈالا کہ فرقہ وارانہ فساد کا سخت خطرہ ہے جلد روکا جائے ورنہ بڑا خون خرابہ ہوگا احرار بھی اپنے انتظامات درست کر رہی تھی کہ پولیس کی ایک مسلح گارد (انگریز) کے سمیت اور شاید مسٹر فیلوس سٹی مجسٹریٹ کی معیت میں دفتر احرار کے سامنے پہنچی اور اپنے خاص انچگی کے ذریعے احرار رہنماؤں کو مطلع کیا کہ حکومت کے نزدیک مجوزہ جلسہ عام نقص امن کا باعث ہوگا۔ اس لئے جلسہ ممنوعہ قرار دیا جاتا ہے اور اس تاریخ سے ایک ماہ تک کے لئے دفعہ ۱۴۴ نافذ کی جاتی ہے۔

### عزم امیر شریعت

اب احرار رہنماؤں کو ایک نئی مشکل پیش آئی موضوع بحث یہ تھا کہ اگر اس حکم کے باوجود جلسہ کیا جائے تو فائرنگ کا ہونا یقینی ہے اور اس صورت میں نقصان جان کی ذمہ داری کا سوال ہے ایک تجویز یہ ہوئی کہ سارے احرار لیڈر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیں۔ مگر سوال پیدا ہوا کہ ہجوم کی تسکین کے علاوہ اس سے اصل مسئلہ کا حق کس طرح نکلے گا۔

بڑا پیچیدہ مسئلہ یہ تھا مگر اب سید عالی مقام فیصلہ کر چکے تھے انہوں نے فرمایا آج جلسہ ہوگا اور ضرور ہوگا البتہ چودھری افضل حق کی تجویز پر یہ فیصلہ ہوا کہ کھلی جگہ جلسہ کرنے کی بجائے وطن بلڈنگ کے احاطے میں جلسہ کیا جائے اور حکومت کے رویہ کے خلاف احتجاج کے علاوہ تو بین رسول شہیدیت کے مسئلہ پر مسلمان قوم کی کسی متحدہ روش کی تجویز پر غور کیا جائے۔

### چودھری افضل حق اور مجسٹریٹ کے درمیان گفتگو

احرار رضاکار اس فیصلہ کو لے کر ہجوم میں پھیل گئے اور اب لوگوں کا اجتماع وطن بلڈنگ میں ہوتا گیا شام ہو چکی تھی۔ احرار رہنماؤں نے مسجد شاہ محمد غوث میں نماز ادا کی اور بعد از نماز معمولی سی کھلی مشاورت کے بعد جلسہ گاہ کا رخ کیا۔ یہ رہنما احاطہ کے دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ سٹی مجسٹریٹ نے احاطہ کے اندر کے جلسہ کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔ اس پر ان کے اور چودھری افضل حق کے درمیان در تک بحث مباحثہ ہوتا رہا ان کا کہنا یہ تھا کہ ہجوم سے بات کرنے کا موقع ضرور دیا جائے تاکہ لوگ پر اس طریق سے گھروں کو واپس چلے جائیں مگر مجسٹریٹ نے صدمہ کی۔

### سول نافرمانی کا فیصلہ اور شاہ جی کی تقریر

اس صورت حال کو دیکھ کر سید عالی مقام نے احرار رہنماؤں کو مشورہ دیا کہ اب حکومت سے ہکراؤ ناگزیر ہو گیا ہے۔ چنانچہ سول نافرمانی کا فیصلہ کر لیا گیا اور بشرط ضرورت جلسہ شروع ہو گیا جس کی صدارت چودھری افضل حق ایم۔ ایل۔ اے نے کی۔

میں نے مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی بیسیوں تقریریں سنی ہیں مگر اس رات کی تقریر کچھ ایسی تھی جس کا

نقش کبھی مٹ نہ سکے گا۔ مگر تقریر سے زیادہ سید صاحب کی تدبیر کا بھی اسی روز فائل ہوا، احاطہ مختصر تھا اور ہجوم زیادہ اور خطرہ یہ تھا کہ باہر کا ہجوم کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے جس سے پولیس کو فائرنگ کا بہانہ مل جائے۔ میں نے دیکھا کہ اکثر احرار رہنما (ہر چند کہ وہ بھی شعلہ بیان تھے) بے بسی کے عالم میں تھے اس لئے صدر جلسہ نے اغراض اور صورت حال پر معمولی سی روشنی ڈالنے کے بعد فرمایا کہ آج ہماری باگ ڈور سید عالی مقام کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے آپ انہی کے احکام سماعت کیجئے سید صاحب نے سب سے پہلے باہر کے ہجوم سے خطاب کیا "اے مسیح رسالت کے پروانہ! میں جانتا ہوں کہ آج تم شوق شہادت میں یہاں بے تابانہ آئے ہو مگر حفاظت رسول ﷺ کی لڑائی تم سے نظم و ضبط کا تقاضا کرتی ہے میں چاہتا ہوں کہ شہر لاہور بلکہ مسلمانان ہندوستان کا بچہ بچہ اپنی باری سے قربانی پیش کرے لہذا جو لوگ دروازے سے باہر کھڑے ہیں۔ دو دو چار چار کی ٹولیاں بن کر اور بکھر کر اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو جائیں۔ ان کی باری کل آئے گی اور جو لوگ احاطے کے اندر ہیں وہ پولیس یا فائرنگ کے خوف سے اپنی جگہ سے سرک نہ جائیں اور ایک نظم اور قاعدہ کے تحت اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کر دیں۔"

### شاہ جی کی تقریر

دروازے پر غل ہوا معلوم ہوا کہ شاطران شہر کے کچھ کارندے لوگوں کو سید صاحب کی تقریر کے خلاف مشتعل کر رہے تھے اور اس پر ملک لال دین قیصر اٹھے اور دروازے پر کھڑے ہو گئے اور باہر کے ہجوم کو سید صاحب کے اعلان سے باخبر کیا۔ ملک لال دین قیصر موقع پر گرفتار ہو گئے مگر باہر کا ہجوم منتشر ہو گیا اب سید صاحب کی تقریر شروع ہوئی تقریر کیا تھی آنسوؤں اور شعلوں کا اجتماع تھا جوش کی انتہا تھی اور آہ و کراہ کی آوازیں ہر طرف سے سنائی دے رہی تھیں مجھے سید صاحب کی تقریر کے الفاظ یاد نہیں رہے مگر ایک دو فقرے ابھی تک دماغ میں کبھے ہوئے ہیں۔

"اے مسلمانان لاہور آج جناب رسول ﷺ کی آبرو تمہارے شہر کے ہر ہر دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اسے امت رسول ﷺ آج ناموس محمدی کی حفاظت کا سوال درپیش ہے اور یہ سائنہ سقرہؑ بغداد سے بھی زیادہ غمناک ہے زوال بغداد سے ایک سلطنت پارہ پارہ ہو گئی تھی مگر تمہیں رسول ﷺ کے سانحہ سے آسمانوں کی بادشاہت متزلزل ہو رہی ہے"

تقریر سید صاحب کی تھی مگر اس روز سید صاحب اپنی معمول کی تقریر کے موڈ میں نہ تھے اور یہ معلوم ہے کہ سید صاحب کی عام تقریروں میں ظرافت اور بذلہ سنی کا عنصر اصل موضوع کے برابر ہوا کرتا تھا مگر اس روز پانی اور آگ کی ترکیب سے یعنی سرد آہوں اور گرم آنسوؤں کے ملاپ سے ان کی تقریر دھل رہی تھی یہ اور ہی طرح کی تقریر تھی

### شاہ جی کا پولیس سے خطاب

احاطے کے اندر تقریر ہو رہی تھی اور باہر پولیس کی جمعیت زیادہ سے زیادہ صف آرا ہوتی جاتی تھی رات

گزی جاری تھی اور پولیس والوں کا دل قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا آخر سید صاحب نے پولیس والوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "اے پولیس والو ہم یہاں صرف اظہار غم کے لئے جمع ہوئے ہیں تم کیا چاہتے ہو اگر تم ہمیں گرفتار کرنا چاہتے ہو تو ہم حاضر ہیں اور اگر ہمارے ساتھ وہ سلوک مطلوب ہے جو ایک سید زادے کو وراثت میں ملتا ہے تو ہمارے سینے اس کے لئے بھی حاضر ہیں۔" اس پر جلسہ میں شدید زور کی لہر اٹھی اور لوگوں نے کہا کہ ہماری جانیں بھی حاضر ہیں شہر کا کو تو ال زیرک آدمی تھا اس نے جلسہ گاہ کے قریب آکر سید صاحب سے کہا کہ آپ جلسہ جاری رکھیے دفعہ ۱۴۴ صرف بارغ کی حدود تک ہے۔ مگر اب پبلک کا جوش بہت بڑھ چکا تھا سینکڑوں آدمی شہادت کے شوق میں بے تابانہ اٹھ کھڑے ہوئے اس پر چودھری افضل حق نے کہا (جو آئینی حدود کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے) صاحبو! وہ وقت بھی آنے والا ہے جب ہمیں تمہاری جانوں کی ضرورت ہوگی مگر ابھی وہ وقت آنا نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے ہم اس قانون کے پرچے اڑا دیں جو ہمیں تو میں رسول ﷺ پر اظہار غم سے روکتا ہے۔ چنانچہ عام سول نافرمانی کا اعلان ہو گیا۔

### شاہ جی کی گرفتاری

دس دس اور پھر پانچ پانچ آدمیوں کے دستے پلیٹ فارم کے پاس جاتے تھے اور سید صاحب کی قدم بوسی کر کے بارغ کی طرف جا کر گرفتار ہو جاتے تھے ہزاروں آدمی اس شب گرفتار ہوئے میرے پاس میرا دوست مولوی خدائش کھڑا تھا۔ اس کا بھائی اور اس کے بھائی سب گرفتار ہو چکے تھے۔ میں نے اس کو روک رکھا تھا کہ تمہارے لوگ جا چکے ہیں۔ تم سب لوگوں کے گھروں میں ایک مرد بھی اب باقی نہیں جو خبر گیری کرے تمہارا جانا مناسب نہیں۔ مگر وہ دیوانہ وار اٹھا اور سید محترم کے قدموں میں جا کر اور پھر پانچ آدمیوں کے ہمراہ باہر چلا گیا اور گورے کا ڈنڈا کھانے کے بعد گرفتار ہو گیا اور میں (اس وقت بھی صید لاغر کی طرح بے مصرف ہی رہا)۔

نے خون ہو آنکھوں سے بہا تک نہ ہوا داغ

اے خون شدہ دل تو کسی کام نہ آیا!

جب سول نافرمانی کرنے والوں کی آخری ٹولی بھی چلی گئی تو احرار لیڈروں کی جماعت سید صاحب مرحوم کی سرکردگی میں باہر نکلی اور سید صاحب کے پرورد طریق سلام و صلوة کی گونج میں بارغ کے قریب چاہنچی اور وہیں گرفتار ہو گئی۔ اور اس طرح یہ شب ختم ہو گئی اور میرے ذہن پر سید عالی مقام کا انٹ نقش چھوڑ گئی۔ احرار کے بڑے بڑے لیڈر تو گرفتار ہو گئے مگر سول نافرمانی اصطلاح میں پھیل گئی اور آخر میں یہ اثر ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے خلاف زبان کشانی کرنے والوں کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔





## خطابت کا معجزہ

مسلمان طالب علم پاکستان کی تحریک میں پیش پیش تھے نیشنلسٹ مسلمانوں کا عام جلسوں میں تقریر کرنا مشکل تھا۔ لڑکے انہیں بولنے نہیں دیتے تھے جلسوں میں ہنگامہ ہو جاتا تھا۔ مجلس احرار اسلام کا مرکز تولاہور تھا لیکن اس کے خطیب لکھنؤ تک پہنچتے تھے اور اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے تھے۔ مجلس احرار کے ایسے خطیب اور مقرر کسی اور جماعت نے پیدا نہیں کئے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا انور صابری جادو بیان مقرر تھے۔ لڑکوں کا یہ خیال تھا کہ اگر ان لیڈروں کو خطاب کرنے کا موقع مل گیا تو اس کا اثر (ان کے حق میں) اچھا نہیں ہو گا۔ عوام ان کی خطابت سے متاثر ضرور ہوں گے۔ ایک دفعہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری لکھنؤ آئے مجلس احرار کی طرف سے امین الدولہ پارک میں جلسہ ترتیب دیا گیا۔ جلسہ شروع ہو گیا۔ شاہ صاحب ذرا تاخیر سے جلسے میں آئے۔ ان کو دیکھتے ہی لڑکوں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ اور کہا کہ مولانا! آپ ہندوستان کے سب سے بڑے خطیب ہیں۔ آپ کی تقریر نہایت دل کش ہوتی ہے آپ اپنی اس ساحری سے رائے عامہ کو (ہمارے خلاف) متاثر کریں گے اس لئے ہم آپ کو تقریر نہیں کرنے دیں گے ہم مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف ایک لفظ سننا نہیں چاہتے۔ شاہ جی کہنے لگے: خدا کی قسم اگر دس منٹ میری تقریر سن لو تو میرے ساتھ ہو جاؤ گے۔ ایک لڑکے نے جواب دیا۔ "اسی لئے تو ہم آپ کو تقریر نہیں کرنے دیں گے۔ ویسے آپ کی تقریر سننے کو میرا بھی جی چاہتا ہے۔"

شاہ جی نے کہا۔ "اچھا میں سیاست پر تقریر نہیں کروں گا۔ صرف دینی معاملات پر بولوں گا۔" یہ سن کر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے لڑکے شاہ جی کی تقریر سننے پر آمادہ ہو گئے۔

شاہ جی نے کلام پاک کی تلاوت ایسے لہجے کے ساتھ کی کہ سماں بندھ گیا اور حاضرین جلسہ میں سے ہر شخص جھومنے لگا اور پھر وہ دینی معاملات پر تقریر کرنے لگے۔ تقریر تو دین اسلام کے مختلف اصولوں پر تھی لیکن اس میں قرآنی آیات کا ترجمہ، حدیثوں کا بیان، حافظ، سعدی، عرفی، نظیری، غالب اور مومن کے اشعار، حالی اور اقبال کی نظمیں، لطیفے اور خدا جانے کیا کیا کچھ شاہ جی نے اپنے خطاب میں پیش کیا۔ لوگ مسحور ہو گئے اور شاہ جی ساری رات تقریر کرتے رہے اور یک شخص بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ تقریر کیا تھی اچھی خاصی ساحری تھی۔ فجر کی اذان ہوئی تو شاہ جی نے اپنی تقریر ختم کی۔

میں بھی رات بھر ان کی تقریر سنتا رہا اور ان کی ساحرانہ خطابت نے کچھ ایسی لذت اور لطف و انبساط سے آشنا کیا جس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ (یادِ عہد رفتہ، صفحہ ۱۷۸-۱۷۷)

## سالارِ کاروانِ جہانِ وفا گیا (قطعہ تاریخ)

سالا	کاروان	جہان	وفا	گیا
سوئے	ریاضِ خلد	بخاری	چلا	گیا
ہر آنکھ میں	ہیں اشک،	ہر لب	پہ آہ	سرد
اربابِ دردِ عشق	کا	درد	آشنا	گیا
پہنچا جہاں،	فضا میں	لطافت	بکھیر دی	
گزنہ ا	جہاں سے	نقشبِ قدم	چھوڑنا	گیا
روحِ ابوالکلام	کا	آئینہ	وار، فکر	
چشمِ و چراغِ محفلِ مشکل	کشا	گیا		
تصویرِ خلق،	پیکرِ	اخلاص، زندگی		
سرتا بپا نمونہ	صبر و	رضا	گیا	
الفاظ کے	مزاج	ومعانی	کا	رازداں
جہور کے	دلوں میں	اترنا	ہوا	گیا
آزادیِ وطن	کا	جواں	عزم	رہنما
آزادیِ وطن	کے	ستم	جھیلنا	گیا
سالِ وفات کے	لئے	انور جو	عرش تک	
وابستہ جنوں	مرا	فکر	رسا	گیا
آئی ندائے غیب	کھیں	کیشو	آپ	ہائے
"باغِ وطن	کا	بلبلِ آتش	نوا	گیا"

## مثالی خطیب

جلس احرار اسلام کے قائد سید عطاء اللہ شاہ بخاری جب اپنی تقریر کے لئے لاہور سے آیا کرتے تھے تو کڑا کے کی سردی میں سارا سیالکوٹ رام تلانی (۱) میں سمٹ آتا تھا۔ کیا ہندو کیا مسلمان، سبھی، رات کے کھانے سے سرشام فارغ ہو کر کھیلوں میں پاؤ پاؤ بھر مونگ پھلی کی پوٹلی سنبھالے پسند کی جگہ پر قابض ہو کے شاہ جی کی آمد کا انتظار شروع کر دیتے تھے۔ تلاوت کے بعد شاہ جی اپنی تقریر شروع کرنے سے پہلے چند لمبے بڑی متین خاموشی سے ڈھیروں حاضرین کا جائزہ لیتے، پھر یہ دیکھ کر مسکرانے لگتے کہ پوری رام تلانی بھر چکی ہے، مگر ابھی تک انبوه کے انبوه چلے آرہے ہیں۔ اسی دوران کوئی سچلا مائیکروفون پر گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرہ تکبیر بلند کرتا اور ہم سب بیک دل و صدا اپنے آپ کو اللہ کے سب سے بڑا ہونے کا یقین دلاتے۔ اور پھر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی آواز رقص کرنے کے انداز میں ان کے منہ سے برآمد ہونے لگتی۔ سنتے تو ہم سبھوں کو ہیں، مگر شاہ جی کا یہ تھا کہ ہم گویا ان کی آواز میں بھارت ناٹیم دیکھ رہے ہوتے۔ جو لیس سیزر کے رومان کے عہد کے مانند لاہور میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر مقررین تھے۔ مگر شاہ جی کی تاب کچھ ایسی تھی جیسی ستاروں کے پورے بھر مٹ میں مارک انتھنی کی۔

اقتباس مضمون "ساتھ ساتھ"  
(ماہنامہ تخلیق لاہور، فروری ۱۹۹۴ء)



## کرے گی ناز تجھ پر حشر تک تاریخ انسانی

علامہ انور صابری (دیوبند، انڈیا)

خطیب اعظم اسلام فریم ایمانی  
دلوں کا ذکر کیا رُوحوں کو گمگانی رہی برسوں  
چراغِ مظلِ ختمِ رسالت بن کے چمکی ہے  
جہادِ حریت میں رہبرانہ شان کے صدقے  
محمد کی غلامی تیرا تاجِ زندگانی تھی!  
وقارِ بوذرجمی تھا تیری درویشی کی رگ رگ میں  
تیرے خود دار جذبوں کا مزاجِ عزم ہستی تھا  
مری مجبور یوں کو دیکھ اے آزاد خو انسان  
نئی حد بندیاں ہیں اور میری چشمِ گریاں ہے

جمالستانِ عرفاں تھی تری پُرگور پیشانی  
فضائل میں ترے الفاظ کے چہروں کی تابانی  
تری آنکھوں کے جہروں میں ضیائے شمعِ ربانی  
کرے گی ناز تجھ پر حشر تک تاریخ انسانی  
ہمیشہ تو نے ٹھکرایا غرورِ تاجِ سلطانی  
فقیرانہ ادا تھی ہم مزاجِ فقرِ سلسانی  
مکمل خاکہِ تکمیلِ دستورِ جہاں بانی  
لہد پر آئیں سکتا برائے فاتحہ خوانی  
ہے درسِ آموذ دنیا میرے اشکوں کی پریشانی

بہاروں میں بھی میرے دل کا غمچہ کھل نہیں سکتا

تیری راہوں پہ چل سکتا ہوں، لیکن مل نہیں سکتا

علامہ لطیف انور

وہ آنچ جس سے محبت نمود پاتی ہے!

ہمار باغ سے جائے نہ، اس ہوس میں رہے  
کچھ اور فیصلہ کر لے نہ دل کی بے تابانی  
کہاں کہاں نہ رہے کاروانِ عمر رواں  
وہ آنچ جس سے محبت نمود پاتی ہے  
نمود برق سے گلشن کا حسن بڑھ جانے  
ترا کرم ہی سہی، اختراعِ دل ہی سہی

ہم آشیانے میں ہوتے ہوئے قفس میں رہے  
خدا کرے کہ تری یاد میرے بس میں رہے  
اگر شریک نہ تیری صدا جس میں رہے  
دعا کرو کہ مرے سوزِ نسیم رس میں رہے  
کچھ ایسی بات بھی ترتیبِ خار و خس میں رہے  
کوئی سکون کا پہلو تو دسترس میں رہے

کمالِ ربطِ تنہا نہ کھل سکا انور

قفسِ جہنم میں رہا اور ہم قفس میں رہے

## حسین یادیں

امر تسرا اس زمانے میں شعر ادب کا گہوارہ تھا مولانا فیروز الدین طغرائی، مولانا عرشی، ڈاکٹر تاثیر، صوفی تبسم، ساحر، فیض اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری امر تسرا میں ہی رہا کرتے تھے۔

یہ سب لوگ مولانا عرشی کے گھر میں اکٹھے ہوتے تھے۔ وہ گھر شعر و ادب کا مرکز تھا۔ حفیظ جالندھری بھی وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ اسی طرح مجلس احرار اسلام کے ایک بہت بڑے رہنما شیخ حسام الدین تھے۔ ان کے گھر پر بھی شعر و ادب کی نشستیں ہوا کرتی تھیں وہاں بھی میں جایا کرتا تھا۔ باہر سے جب لوگ آیا کرتے تھے تو شعر و شاعری کا خوب چرچا ہوا کرتا۔ اس میں ان لوگوں میں مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ جو نام لئے گئے، ہیں یہ سب لوگ مطالعے کے بہت شوقین تھے اور یہ سب نہایت عالم فاضل لوگ تھے۔ فیض اردو کے بلند پایہ اسکالر تھے۔ عربی زبان نہ صرف جانتے تھے بلکہ بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ تاریخ، فلسفہ، ادب اور مختلف سیاسی و ادبی تحریکوں سے انہیں بہت زیادہ واقفیت تھی۔ فرانس، روس اور اسکندریہ نیوین ممالک کے ادب پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا۔ ان کی شخصیت بہت سی چیزوں کا ایک حسین امتزاج تھی۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ کوئی نشست۔۔۔۔۔ ہوتی جس میں ڈاکٹر تاثیر، مولانا چراغ حسن حسرت، عطاء اللہ شاہ بخاری بیٹھے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں ادب اور مذہب کوئی مختلف چیزیں نہیں تھیں۔ ادب کے لوگ مذہب سے بھی تعلق رکھتے تھے اور باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔ علماء مثلاً عطاء اللہ شاہ بخاری کو اردو، فارسی کے ہزاروں شعر یاد تھے اور وہ اپنی تقریروں میں نگیںوں کی طرح ان شعروں کو جڑ دیا کرتے تھے۔ جب دو گھنٹے کی نشست ہوتی تھی تو ایسا موسیٰ ہوتا تھا کہ جیسے علم کے دریا بہہ رہے ہیں۔ اگر کوئی آدمی اس میں شرکت کرتا تو وہ چاہتا تو بہت اچھی کتاب بھی مرتب کر سکتا تھا۔ میں اس لحاظ سے خوش نصیب ہوں کہ میں نے ان کی بہت زیادہ مفلوں میں شرکت کی۔ جب بھی یہ لوگ اکٹھے ہوتے تو بکھتے تھے کہ سیف کو بلاؤ۔ اکثر یہ ہوتا کہ مولانا ہاشمی، ڈاکٹر تاثیر، مولانا حسرت، عطاء اللہ شاہ بخاری، فیض احمد فیض اور شیخ حسام الدین جب بھی امر تسرا آتے تھے تو گروپ کی شکل میں آتے تھے۔ ان کی دو سے چھ گھنٹے تک ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس قسم کی نشستوں سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

میں نے جن بڑے آدمیوں کو قریب سے دیکھا ان میں ادب میں فیض صاحب، صوفی تبسم اور ڈاکٹر تاثیر صاحب تھے۔ لیڈروں میں شیخ حسام الدین اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی حیثیت اس زمانے میں یہ تھی۔ (میں ۱۹۳۸-۳۹ء کی بات کر رہا ہوں) کہ وہ مجلس احرار کا دور تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ برصغیر کی تاریخ میں اتنا بڑا مقرر کوئی نہیں گزرا جیسے مولانا تھے۔ ادب سے انہیں بڑا شغف تھا۔

عربی، فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار انہیں از بر تھے۔ اپنی تقاریر میں اس طرح گنیے کی طرح شعر جوڑتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ اسی موقع کے لئے شعر کہا گیا ہے۔ میں اس وقت بچہ تھا لیکن چونکہ شعر اور سیاست کا بہت شوق تھا۔ اس لئے میں ان کا جلد سے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس زمانے میں، میں نے کئی جلد ایسے دیکھے کہ جہاں لاٹھی چارج ہونا لازمی ہوتا تھا۔ جلد کے دوران میں ایک وقت ایسا آتا تھا کہ لاٹھی چارج ہوتا تھا اور لوگ بھاگتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے بھی چوٹیں لگیں لیکن جاتے ضرور تھے۔ پتا نہیں کیا کش تھی؟

امر تسر میں مولانا خیر الدین کی مسجد سیاسی و مذہبی جلسوں کا مرکز تھی اور وہاں ۵۰ سے ۶۰ ہزار آدمی سما جاتے تھے۔ وہاں ایک بار عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کر رہے تھے۔ اس دوران کہنے لگے لوگ کہتے ہیں شاہ جی، آپ کہاں آجئے ہیں۔ دوامہ کے لئے باہر ہوتے ہیں اور پھر دو سال کے لئے اندر ہو جاتے ہیں۔ نہ بیوی بچوں میں بیٹھے، نہ دوست احباب کی مظلون کا مزہ لیا۔ نہ کچھ دائیں بائیں دیکھا۔ آخر آپ کو کیا شوق چڑھ گیا ہے؟ کیوں آپ بار بار جیل کی طرف جانے کے لئے رخ کر لیتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ایسی باتیں نہ کرو۔

ہم نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا  
دور تک یاد وطن آئی تھی سبھانے

ایسے انداز میں انہوں نے شہر پڑھا کہ میں حیران رہ گیا کہ واقعی اسی دن اور اسی موقع کے لئے یہ شعر کہا گیا تھا۔

میں نے ان حضرات کو قریب سے دیکھا۔ بعض آدمی قریب آکر اور بڑے ہو گئے لیکن بعض قریب آنے سے اور چھوٹے ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے، اسی طرح شخصیات کا بھی صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ بعض آدمی قریب جا کر چھوٹے، بندھے، بد نما اور غلط نظر آنے لگتے ہیں، لیکن بعض درمیانے قسم کے لوگ ہوتے ہیں مگر ان کے قریب جانے سے ان کی شخصیت بہت بڑی اور عظیم ہو جاتی ہے اور وہ واقعی بڑے دکھائی دینے لگتے ہیں۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساتھ بڑی مظلئیں رہیں کیونکہ ان دنوں امر تسر ادبی و سیاسی سرگرمیوں کا ایک مرکز تھا۔

صوفی تبسم صاحب، امر تسر کے رہنے والے تھے، اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے تھے۔ جب چھٹی ہوئی تو وہ امر تسر تشریف لائے۔ فیض، تاثیر، مولانا عرشی، شیخ حسام الدین، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سب اکٹھے ہو جاتے۔ بعض اوقات جگہ اور جوش آگے تو پھر یہ سب مل بیٹھتے۔

دوسرا مرکز شیخ حسام الدین کا گھر تھا۔ یہ دونوں حضرات کشمیری تھے اور کشمیری گھروں میں آتش پرستوں کی طرح چہلوا ہمیشہ جڑھا ہی رہتا ہے۔ کباب آرہے ہیں، باقر خانی، روغنی نان، چاول اور کچھ نہ کچھ ہر

وقت کھانے کے لئے آتا ہی رہتا تھا۔ ان کے ہاں بڑی مہفلیں ہوا کرتی تھیں اور یہاں پر اکثر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ میں انہیں جادوگر سمجھتا تھا کیونکہ میں نے انہیں دو دو لاکھ کے مجمع کو جب چاہا رلاتے اور جب چاہا ہنساتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب کبھی میں شیکسپیر کی لکھی ہوئی انٹونی کی تقریر دیکھتا تو سوچا کرتا تھا کہ اگر وہ آج ہوتا تو مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا شاگرد ہوتا۔ ان کی شخصیت اور تقریر کا ایسا اثر تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد وہ تقریر کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔ پہلے تلاوت کلام پاک کیا کرتے۔ اور تلاوت اتنی اچھی قرأت کے ساتھ کرتے تھے کہ لوگ کہتے، موس ہوتا ہے۔ کہ جیسے قرآن نازل ہو رہا ہے۔ بعد ازاں وہ تقریر شروع کرتے اور اذان فرمک وہ تقریر جاری رہتی۔ اس عرصے کے دوران وہ جب چاہتے لوگوں کو رلا دیتے اور جس وقت چاہتے لوگوں کو ہنسا دیتے۔ ہر تقریر میں ان کے چند فقرے ایسے تاریخی ہوتے تھے کہ جو آج بھی لوگوں کو یاد ہیں مثلاً شام رسول ﷺ کے معاملے پر جسے غازی علم الدین نے قتل کر دیا تھا۔ (میں اس وقت بہت چھوٹا تھا مگر آج بھی یاد ہے) کہنے لگے۔ "یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے رسول ﷺ کے بارے میں کوئی گستاخی کرے اور وہ زندہ رہے۔ انگریز کے دور حکومت میں یہ بات کہنا کتنی بڑی بے باکی اور جرأت تھی۔ کہنے لگے۔ "یاد رکھو، یا تو گولی دینے والی زبان نہیں رہے گی یا سننے والے کان نہیں رہیں گے۔"

انگریزوں کا ان کے بارے میں خیال تھا کہ یہ شخص جب چاہے دو ڈھائی لاکھ کا مجمع لے کر بغاوت کرا سکتا ہے۔ میں نے انہیں بڑے قریب سے دیکھا اور میں ان سے بہت متاثر تھا، حالانکہ میں خاکسار تھا اور وہ خاکساروں کے سخت مخالف تھے بلکہ میں نے مولانا صاحب کے خلاف خاکسار ہونے کی حیثیت میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔

کیونکہ میں مشن کے اعتبار سے پکا خاکسار تھا اور میرا ارمان تھا کہ یہ تحریک انقلاب لائے گی اور مسلمانوں میں تبدیلی پیدا کرے گی۔ میری ان سے جب پہلی ملاقات ہوئی اور میرے وہ شعرا انہوں نے سنے تو شیخ حسام الدین سے کہنے لگے۔ "اوتے شیخا! انہوں نے آپ اپنے کیسپ وچ بھئی" (اے شیخ! اسے اپنے کیسپ میں لے آؤ)

انہوں نے کہا۔ "یہ تو پہلے ہی کیسپ میں ہے۔"

مولانا نے سوال کیا "کون سے کیسپ میں ہے؟"

شیخ صاحب نے کہا۔ "مخالف کیسپ میں۔"

مولانا کہنے لگے "کوئی بات نہیں، آدمی کو کسی نہ کسی کیسپ ہونا چاہیئے۔ چاہے مخالفت کیسپ ہی کیوں نہ ہو۔"

شیخ صاحب نے مولانا کو بتایا کہ اس نے آپ کے خلاف ایک نظم بھی کہہ رکھی ہے۔

مولانا نے کہا۔ "سناؤ۔" پھر مجھ سے اپنے خلاف نظم سنی اور اس پر داد دی۔

یہ نظم اس طرح شروع ہوتی تھی کہ۔

وصالِ حُور کا قصہ سُننا کے ٹوٹ لیا  
عذابِ گور کا نقشہ دکھا کے ٹوٹ لیا  
غریبِ قوم کو اُنو بنا کے ٹوٹ لیا  
مثالِ فیل اٹکتے ہوئے، لٹکتے ہوئے  
عصا زمین پر کس زور سے ٹٹتے ہوئے  
سیاہِ زُلف کو انداز سے جھٹکتے ہوئے  
رہِ مسین سے ہر گام پر بھٹکتے ہوئے  
قلندروں نے تماشا بنا کے ٹوٹ لیا

جلسِ احرار کا یہ قصہ تھا اور جب کوئی سیاسی معاملہ ہوتا تھا تو یہ کانگریس کے ساتھ ہوتے تھے مگر مذہبی معاملات میں انفرادی طور پر مسلمانوں کی اعانت کرتے تھے۔ بہر حال اس نظم میں میرا مولانا کے ساتھ گستاخانہ لب و لہجہ تھا جو اچھا نہ تھا، لیکن وہ بہت بڑے اور عظیم لوگ تھے، ہمارا تو اس وقت آغاز ہوا تھا۔ شعر و شاعری میں نئے آئے تھے۔ جذبہ زیادہ تھا، عقل نہیں تھی۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہر نیا آنے والا اپنے خیالات اور نظریات میں بڑا متعصب ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے بالکل بیٹوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک میٹنگ میں مولانا اپنے ساتھ اپنے بیٹے کو بھی لائے تھے۔ سب سے بڑے فرزند (سید ابو معاویہ) ابو ذر بخاری) وہ مجھ سے عمر میں دو سال چھوٹا تھا۔ اسے فارسی کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ شاہ صاحب آکر بیٹھے تو پہلے اس سے تعارف کرایا پھر کہنے لگے۔ "یہ سیف ہے، تمہارا بڑا بھائی ہے، اسے سلام کرو۔" پھر کہا۔ "چلو اب کا آئی کا فلاں قصیدہ سناؤ۔"

اس نے فر فر قصیدہ سنانا شروع کیا تو شاہ صاحب کہنے لگے۔ شیخ جی، آپ نے کچھ حساب لگایا؟  
شیخ حسام الدین نے کہا۔ "ہاں، میں سمجھ گیا ہوں۔"

شاہ صاحب کا اشارہ اردو کے ایک شاعر کی طرف تھا جنہوں نے اس قصیدے سے بہت کچھ اخذ کیا ہوا تھا اور یہ قصیدہ ان کے بارے میں ایک ریفرنس تھا۔

میرے والد مولانا کے بہت معتقد تھے انہوں نے جب قادیان میں کانفرنس تین روزہ احرار تبلیغ کانفرنس قادیان کی تو والد صاحب دو تین روز کے لئے وہاں انہیں سننے کے لئے گئے حالانکہ والد صاحب کبھی بھی کہیں نہیں جایا کرتے تھے۔ "یہ ایسا شخص ہے کہ ولی تو کیا اگر یہ اس سے بھی زیادہ دعویٰ کرے تو میں اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

ایک مرتبہ میں اور والد صاحب شیخ حسام الدین کی گلی سے گزر رہے تھے۔ والد صاحب کا یہ حکم تھا کہ غیروں سے تعلقات نہیں رکھتے سوائے اپنے بھائیوں اور کزنز کے، اور اپنی عمر سے بڑے آدمی خواہ نیک



ہوں، فرشتے ہوں..... سے تعلقات نہیں رکھتے۔

مجھے عطاء اللہ شاہ بخاری "سیف المسرور" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ تمہارے اشعار بڑے کاٹ دار ہیں۔ ہم جوں ہی گلی کا ایک موڑ مڑے تو سامنے دیکھا کہ شاہ جی "چلے آرہے ہیں۔ وہ بڑے قوی، ہیکل گورے چٹے اور سیاہ لمبے بالوں والے آدمی تھے۔ روشن آنکھیں اور سرخ پُر رعب چہرہ، ہاتھ میں بھاری بھرکم عصا ہوتا تھا اور ساتھ میں دو چار آدمی ضرور ہوتے تھے۔ مجھے دیکھا تو دونوں بازو پھیلا دئے اور کہا۔ "اود سیف المسرور، ابھی میں شیخ صاحب سے تمہارے بارے میں پوچھ کر آ رہا ہوں۔" مجھے سینے کے ساتھ پیٹا لیا اور ایک آدھ قرآنی آیت پڑھنے کے بعد میرے چہرے پر پھونک ماری۔ میں گھبرا رہا تھا کہ والد صاحب کھڑے ہیں اور وہ پوچھیں گے کہ یہ تمہارا واقف کیسے بن گیا، یہ تو عمر میں مجھ سے بھی بڑا ہے جبکہ میں نے تمہیں کہا ہے کہ اپنی عمر سے بڑے آدمی سے نہ ملا کرو۔

شاہ جی کہ وہ بہت معتقد تھے، میں نے ان کا تعارف کرایا کہ یہ میرے والد صاحب ہیں۔ انہوں نے والد صاحب سے کہا۔ "اچھا اچھا، آپ بڑے خوش قسمت آدمی ہیں۔ اللہ نے آپ کو بڑا تحفہ دیا ہے۔ آپ کا بیٹا سیف ہمارا بھی بیٹا ہے۔"

اس کے بعد ہم اپنی اپنی راہ چلے گئے، والد صاحب نے بظاہر تو ظاہر کیا کہ وہ بہت ناراض ہیں لیکن انہوں نے سوچا ہو گا کہ جس شخص کو وہ اتنا بڑا سمجھتے ہیں، وہ بھی ان کے بیٹے کی تعریف کر رہا ہے۔ پوچھنے لگے۔ "بھئی یہ تمہارے کیسے واقف ہیں؟"

وہ اُس مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے جہاں مولانا عرشی امامت کرتے، درس اور خطبہ بھی دیتے تھے۔ اسی لئے میں نے کہا۔ "جی! وہ مولانا عرشی صاحب نے ایک بار بلوایا تھا اور وہاں شاہ جی نے ملاقات ہوئی۔" کھنسنے لگے۔ "اچھا ٹھیک ہے۔"

مجھے یاد ہے کہ شاہ جی ایک بار رہا ہو کر آئے۔ میں شیخ حسام الدین کے گھر بیٹھا ہوا تھا، مجھے دیکھا اور کہا! "اود سیف المسرور، خدا تمہیں پوچھے" میں نے کہا "شاہ جی کیا ہوا"

کھنسنے لگے۔ "تمہاری وجہ سے میں پوری رات جیل میں تڑپتا رہا ہوں اور سو نہیں سکا۔"

میں نے پوچھا "شاہ جی! میرا قصور کیا ہے؟" کھنسنے لگے۔ میں جیل میں تھا اور وہاں شیخ آگیا۔ میں نے اسے کہا کہ کوئی شعر سناؤ تو اس نے تمہارا ایک شعر سنایا۔ وہ شعر یہ تھا۔

تیرے قفس میں جوانی ٹا کے بیٹھ رہے  
میرے چمن میں تڑپتی رہی بہار مری

خود ان کی یہ کیفیت تھی کہ ساری عمر قفس ہی میں رہے۔ گھر کے چمن کی بہاریں نہیں دیکھیں۔ بیوی بچوں کے ساتھ آرام سے نہ بیٹھ سکے۔ بس آنا جانا لگا رہتا تھا۔ یا تو تقریریں کرنے چلے جایا کرتے تھے یا پھر کبھی کلکتہ، بمبئی، دہلی، لکھنؤ، پشاور، پٹنہ، لاہور میں ہیں یا پھر جیل میں ہیں۔ کبھی عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے تو وہاں پر ہیں۔ اس لئے کہنے لگے۔ جب یہ شعر سنا تو ساری رات سیف، یقین کرو میں سلاخوں کے ساتھ سرے بٹھتا رہا ہوں۔"

میں نے بتایا کہ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے ان لوگوں کی صحبت حاصل رہی اور میں نے ان کی مظلوم میں شرکت کی۔ ورنہ لاکھوں ایسے انسان تھے کہ جنہوں نے انہیں قریب سے دیکھا تک نہیں مگر وہ مجھ سے بے حد محبت سے ملتے تھے۔ میں جب کبھی اس بارے میں سوچتا ہوں تو بہت خوش ہوتا ہوں اور خود کو خوش نصیب سمجھتا ہوں۔

شیخ حسام الدین بھی بہت بڑے لیڈر تھے مگر شاد جی کی شخصیت اتنی نمایاں تھی کہ احرار کے باقی لیڈروں کے قد ان کی موجودگی میں چھوٹے ہو جایا کرتے تھے۔

بہادر یار جنگ کا اسلوب اور تھا جبکہ شاہ جی کا اندازہ مختلف تھا۔ وہ درویش تھے۔ یہ لوگ تو پیدا ہی قربان ہونے کے لئے ہوئے تھے۔ وہ لوگ کہ جنہیں ماں کی گھٹی میں آزادی کی تعلیم ملتی ہے اور وہ ان کے خون میں سراپت کر جاتی ہے۔ وہ تو انگریز کی غلامی کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے اور کہتے تھے۔ مسلمان ہونا اور غلام ہونا یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ جس وقت تک میں آزاد نہیں ہوں، مسلمان نہیں ہوں۔ شاہ جی انگریز کے اتنے سخت خلاف تھے کہ کہتے تھے "تمام عالم اسلام میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار انگریز ہے، اس لئے انگریز کو یہاں سے نکال پھینکو۔" اس لئے وہ ایسے مواقع پر انگریز کی مخالفت پر کانگریس سے اتحاد کر لیا کرتے تھے، لیکن جب مسلمانوں کے مفاد کا معاملہ ہوتا تھا تو پھر وہ سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔

مجلس احرار والے..... اس قسم کے لوگ تھے جنہوں نے انگریزوں سے لڑائی کی تھی۔ پندرہ سال تک جیلیں کاٹی تھیں، وہ اس وقت غلطی کر گئے۔ انہیں علم نہ ہوسکا کہ آنے والا وقت کیا ہے؟ اگر وہ اس قومی دھارے میں شامل ہو جاتے تو آج قوم کی حالت کچھ اور ہوتی۔ اب اگر اقتدار میں نون، چٹھے، دولتانے، ٹوانے اور خضر حیات آجائیں تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے۔ گاؤں دیہاتوں میں جہاں ان کی عمل داریاں ہیں۔ وہاں جا کر دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ جنگل کا راج ہے اور کوئی آدمی ان کے خلاف بول نہیں سکتا اور یہ سب کچھ اس ترقی یافتہ دور میں ہو رہا ہے۔ اس طرح آپ تھانے چلے جائیں، قتل کروانا ہو، کسی کی پٹائی کروانی ہو یا کسی کو مکاں سے بے دخل کرنا ہو، تھانوں میں ہر چیز کا سودا ہوتا ہے۔ میں یہ سنی سنائی باتیں نہیں کر رہا بلکہ میرا بڑا قریب سے مشاہدہ ہے اور میں نے اپنے کانوں سے لوگوں کو یہ باتیں کرتے سنا ہے۔

آدمی کو جب اپنے حقوق کا شعور ہو جاتا ہے تو وہ اس کے لئے لڑتا ہے۔ ابھی تک لوگوں کو اسکا شعور

حاصل نہیں ہوا ہے۔ مزارع سے اس کے حق کی بات..... کریں تو وہ انکار کر دے گا کیونکہ اسے پتا ہے کہ انسانوں کی طرح رہنا اس کا حق نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ انسانوں کی طرح تو میاں صاحب، چوہدری صاحب یا خاں صاحب رہ سکتے ہیں۔ میں تو جانوروں میں سے ہوں اور اس لئے پیدا ہوا ہوں کہ ان کی غلامی کروں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میاں افتخار الدین اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ اپنے علاقے میں اسکول نہیں کھولنے دیتے تھے کہ تعلیم نہیں آئی چاہیے۔ حالانکہ کتنے روشن خیال اور ترقی پسند سمجھے جاتے تھے۔

(ماخوذ: انٹرویو، سیف الدین سیف۔ ماہنامہ سرگذشت کراچی، اکتوبر ۱۹۹۳ء)

فیروز سائیں

### پتھر دلال نول موم بناؤ نداسی

درد مند عالم غم خوار دی موت	بڑا ہرج پہنچاوندی قوم تائیں!
ہو جائے جد سس سالار دی موت	دل لکھاں سپاہیاں دا توڑ دیوے
عمدوں ہوندی اے لکھ ہزار وی موت	جدوں موت آئے چے رہراں نول
یارو سید بخاری سردار دی موت	یاد رہے سانوں کدی بھلنی نہیں
گھٹ ہوندے او - سردار سید	جہڑے قوم تول جان قربان کر دے
ہے سی دتاں دا بیمار سید	اج موت نے آن کے چھڈیا نہ
گیا جیل اندر کئی وار سید	سچی گل سنائے نڈر ہو کے
مُر گیا اوہ اج احرار سید	دلوں برا غلامی نول جانے
ہوے جنت دے وچ مکان تیرا	لکھاں رحمتاں تیرے نصیب ہوں
ہے سی بڑا مضبوط ایمان تیرا	بخش دیوے گارب کریم تینوں
سچا علق تے سوہنا بیان تیرا	پتھر دلال نول موم بناؤ نداسی
بھلا کرے گا رب رحمان تیرا	قرآن دے نال سسی پیار تینوں

## ادائے زینت تیرے قرب کا عطیہ ہے

فضا میں تیرے کلم کی باس ہے ایک  
تری نگاہ نے جس کو جلال بخشا تھا  
کتاب دل میں زمانے کے ہاتھ سے محفوظ  
سکوت تیری صدا کا پکارتا جائے  
نہ تیرے بعد کوئی مرم وفا گزرا!  
متاع عام نہیں عشق کی توانائی  
کبھی تو سینہ ہستی کو چاک کر دے گی  
زینں پہ پھول ہیں شاخوں پہ جا بجا کانٹے  
وہ خونے قتل کے پروردہ سیاست ہے  
اُتر فلک سے کسی دن ضرور برسے گی  
وفا برہنگی آرزو سے کم تو نہیں  
ہزار رحمت جلوہ ہے جبکی مرموی  
ادائے زینت تیرے قرب کا عطیہ ہے



محترم ملک عبدالغفور انور می (رحمۃ اللہ علیہ) نے بیان کیا کہ شاہ جی کے آخری برسوں کی بات ہے ایک روز میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حسب معمول پرسش احوال کی۔ مجھے فرمائے گئے۔۔۔۔۔ اک بات کہیں تم سے؟۔۔۔۔۔ خفا تو نہیں ہو گے؟ میں نے کہا نہیں، شاہ جی ہر گز نہیں! آپ ضرور فرمائیں۔ شاہ جی نے پھر یہی فرمایا کہ "اک بات کہیں تم سے؟ خفا تو نہیں ہوں گے؟" میں اس پر واقعی پریشان ہو گیا۔ اور زیادہ لجاجت سے عرض کہ شاہ جی! آپ بلا تردد ارشاد فرمائیں۔ آخر سے مجھ کیا خفا سرزد ہو گئی ہے؟ شاہ جی مسکرائے اور پھر یہ بارہ، یہی بات دہرائی۔۔۔۔۔ اک بات کہیں تم سے خفا تو نہیں ہو گے؟ اب میری کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ لیکن شاہ جی نے فوراً ہی فرمایا۔۔۔۔۔ پہلو میں ہمارا دل مضطر نہیں ملتا! اب میں سمجھا کہ اوہو، شاہ جی تو شعر پڑھ رہے تھے۔ اور میری حالت سے لطف لے رہے تھے۔ شاہ جی کا شعر پڑھنا اور شعر کی معنویت اور مناسبت کو اس حسن و خوبی سے ظاہر کرنا۔ یہ سب دل پر نقش ہو گیا۔ ہمیشہ کے لئے۔

اک بات کہیں تم سے خفا تو نہیں ہو گے؟  
پہلو میں ہمارا دل مضطر نہیں ملتا۔  
(یہ شعر آغا شاعر لکھنوی کا ہے۔ ذوالکفل)

## امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

گاؤں میں جب سے شعور نے آنکھیں کھولیں سرخ وردیوں اور کلماڑیوں کو دیکھنا شروع کیا، یہ احراری حضرات کا مخصوص لباس تھا، پہلی جماعت میں ہمارے استاد صوفی عبدالرحیم صاحب مسکین تھے جو اس وقت ضلعی مجلس احرار کے صدر اور آج کل کل پاکستان مجلس احرار اسلام کے صدر ہیں، ان کی زبان سے پہلی بار سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر سنا، صوفی مسکین کا شمار گاؤں کے سربر آوردہ لوگوں میں ہوتا تھا، تقریر بھی اچھی خاصی کرتے تھے، پنجابی اور اردو کے شاعر بھی تھے، انہوں نے اپنے ارد گرد گاؤں کی اچھی خاصی جماعت جمع کر لی تھی، کبھی کبھی یہ لوگ سرخ وردیاں پہنے اور کلماڑیاں کندھوں پر رکھے گاؤں کی گلیوں سے گزرتے تو لطف ہی آ جاتا۔ نہر کے کنارے درختوں کے نیچے ان جگہ منعقد ہوتے تو پورا گاؤں اُمنڈ آتا۔ کالا باغ کے مولانا گل شیر شہید ان جلسوں کے مقبول مقرر۔ دورانِ وعظ وہ بھی شاہ جی کا ذکر ضرور کرتے، اس طرح گویا بچپن ہی سے یہ نام حافظے پر مرتسم ہو کر گیا تھا۔

۵۱ء میں مستقلاً لاہور آ گیا تو اس سے اگلے سال ۵۲ء میں پہلی مرتبہ شاہ جی کی زیارت، باغ بیرون موچی دروازہ کی تاریخی جلسہ گاہ میں ایک عظیم اجتماع انہیں سننے کے لئے جمع تھا۔ میں بھی دیکھنے اور سننے کے لئے کشاں کشاں پہنچا، وہ منظر مجھے اب تک یاد ہے جب شاہ جی شیخ برتشریفؒ سرقد، خوبصورت نقش و نگار، لمبے لمبے گیسو، بھرے بھرے چہرے پر گھٹی داڑھی، چہرے میں قرآن حکیم پڑھنا شروع کیا تو یوں لگا جیسے شجر و حجر جھوم اٹھے ہوں۔ بولے تو موتی رولے بے! ظفر علی خان کا شعر زبان پر آ گیا۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزم  
لبل چمک رہا ہے ریاض رسولؐ میں

مجلس احرار ۱۹۲۹ء میں قائم ہوئی یہ شروع شروع میں صرف مجلس احرار پنجاب تھی، ۱۹۳۲ء میں آل انڈیا مرکزی مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا۔ دونوں مرتبہ اس کے صدر مولانا حبیب الرحمن منتخب ہوئے مگر شاہ جی کا تعلق اس سے ویسا ہی تھا جیسے کانگریس سے گاندھی کا، شاہ جی اور احرار دونوں لازم و ملزوم تھے۔ ایک نام سن کر دوسرا نام خود بخود ذہن میں آ جاتا تھا، سیاسی مسلک اس جماعت کا وہی تھا جو جمعیت علمائے ہند کا تھا۔ جمعیت کانگریس کا دینی محاذ تھی تو احرار مسلمانوں میں اس کا عوامی اور سیاسی

مورچہ، احرار کے اکثر ارکان حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے عقیدت مند تھے اور بدیں وجہ سیاست میں بھی انہی کے مقلد تھے، اس لحاظ سے مجلس احرار اور شاہ جی دونوں تحریک پاکستان کے مخالف تھے مگر انگریز دشمنی اور تحریک آزادی کے لئے جو قربانیاں انہوں نے پیش کیں کوئی ریانت دار مورخ ان سے صرف نظر نہیں کر سکتا، تحریک پاکستان کی مخالفت زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کی اجتہادی غلطی تھی، پاکستان بن گیا تو مجلس احرار سیاست سے علیحدہ ہو گئی اور دل و جان سے پاکستان کی حمایت اور محافظت کرنے لگی۔ 50ء میں بھارتی فوجیں پاکستانی سرحدات پر جمع ہوئیں اور لیاقت علی خان مرحوم نے پنڈت نہرو کو مشورہ عالم مکا دکھا یا تو شاہ جی بھی میدان عمل میں آ گئے۔ انہوں نے ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا اور دفاع پاکستان کے موضوع پر یادگار جلسوں سے خطاب کیا۔

مجلس احرار نے برصغیر کی سیاست میں کوئی ٹھوس کامیابی حاصل نہیں کی مگر یہی کیا کم ہے کہ اس نے اردو زبان کے بعض ایسے قد آور نامور خطیبوں سے قوم کو روشناس کرایا جو حقیقی معنوں میں میدان خطابت کے شاہ سوار تھے۔ جس طرح سیاست میں جماعت اسلامی کا اصل اثاثہ اس کا لڑکچہ ہے اسی طرح احرار کی شہرت بھی اس کے بے مثال خطیبوں کی مرہون منت ہے۔ میں نے نہ صرف ان خطیبوں کی تقریریں سنی ہیں بلکہ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ ان میں سے اکثر کے ساتھ میں نے خود جلسہ ہائے عام سے خطاب کیا ہے۔ ہمارے ہاں کون ایسا ہو گا جس نے قاضی احسان احمد شجاع آبادی، ماسٹر تاج الدین انصاری، شیخ حسام الدین، صاحب زادہ فیض الحسن، مولانا مظفر علی اظہر، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا محمد علی جالندھری اور آغا شورش کاشمیری کا نام نہ سنا ہو، یہ سب اسی آسمان خطابت کے چاند اور ستارے تھے ان تمام مقررین کی نمایاں خصوصیات ان کا جذباتی انداز بیان، شعر و ادب کی چاشنی اور مذہب سے حد درجہ شیفنگی تھیں۔ ان کے مداحوں سے قطع نظر ان کے مخالفین بھی ان کے جلسوں میں ان کی تقریروں سے لطف اندوز ہونے کیلئے شوق سے جاتے تھے اور ان کے لطیفوں، چٹکوں اور دلچسپ انداز بیان کا دل سے اعتراف کرتے تھے۔

مجلس جماعت کے پاس اتنے بڑے بڑے عوامی خطیب ہوں اس کے اجتماعات کی کامیابی میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے؟

مگر ان چاند تاروں نے کس نور جس آفتاب سے کیا وہ شاہ جی ہی کی ذات تھی، یہ حقیقت ہے کہ بڑے بڑے جلسوں کو اپنی تقریر کے جادو سے مسح کر دینے کے فن میں کوئی شخص شاہ جی کا ہم پلہ نہ تھا وہ رات کے نو دس بجے تقریر شروع کرتے تو صبح تک کئے جاتے اور سننے والے اس طرح جم کر بیٹھے گویا تمام عمر تقریر ہوتی رہے تو تمام عمر یوں ہی بیٹھے رہیں گے، تقریر میں جذبات کی شدت پیدا کر کے لوگوں کو بے

اختیار لا دینا، ایثار اور قربانی کے بیان سے انہیں اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار کر دینا اور چٹکوں اور لطفوں سے روتی ہوئی محفل کو ہنسوانان کے بآئیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

شاہ جی کو اگر زمانہ قدیم کے خطیبوں میں سے کسی کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہے تو وہ یونان کا ”ذیماسٹھینز“ ہے جسے اس دور کے مورخین نے سب سے پہلا بڑا خطیب قرار دیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ”ذیماسٹھینز“ نے شجاعت کے موضوع پر فقط داد و خطابت دی ہے و لولہ انگیز تقریریں کیں ہیں اور وقت آنے پر میدان کارزار سے راہ فرار اختیار کرنے میں عافیت سمجھی ہے مگر شاہ جی نہ صرف کاروان شجاعت کے جدی خواں تھے بلکہ اس مقصد کے لئے انہوں نے ساری عمر مصائب اور آزمائشوں کا بھی مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وہ خود فرماتے تھے ”میری آدھی عمر ریل میں اور آدھی جیل میں کٹ گئی“۔

جماعت اسلامی والے عام طور پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے خطابت میں ایک نیا انداز اور نیا اسلوب پیدا کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر جماعت کا کتب فکر خطیبانہ جوہر نہیں رکھتا۔ جس طرح مجلس احرار خطابت کی وجہ سے آگے بڑھی ہے اس جماعت کے اکابر اپنی تحریروں کی وجہ سے معروف ہیں ان کی تقریریں خشک تحریروں کی مانند ہوتی ہیں اور ان تقریروں میں وہ ایسی لائق اور ناموس اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں جو اکثر اوقات سامعین کے سر سے گزر جاتی ہیں البتہ حضرت مولانا امین احسن اصلاحی کی شخصیت اس جماعتی رنگ سے مستثنیٰ تھی (جو مولانا مودودی مرحوم کی غیر حاضری میں امیر جماعت ہوتے تھے مگر بعد میں جماعت سے اختلافات کی بنیاد پر مستعفی ہو گئے تھے) مولانا اصلاحی نہایت بلند پایہ خطیب ہیں اور ان کی تقریریں علم اور جذبے کا حسین آمیزہ ہوتی ہیں یا پھر مولانا گلزار احمد مظاہری ہیں جن کا وعظ و خطابت میں اپنا ایک رنگ ہے مگر یہ رنگ ان میں مجلس احرار کے سابقہ تعلق کے زیر اثر پیدا ہوا ہے اس میں جماعت کا کوئی عمل دخل نہیں۔

اس مکتب فکر کے ایک ممتاز ادیب اور شاعر جناب نعیم صدیقی ہیں جو جماعت کے دائرے میں ایک اعلیٰ پائے کے مقرر بھی شمار ہوتے ہیں اور اس میں شک نہیں وہ ایک اچھے لیکچرار ہیں، اپنے موضوع پر خوب مت کرتے اور اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر عوامی خطابت کے جوہر سے وہ بھی محروم ہیں ایک بار موصوف کے فن تقریر پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم نے نہایت عمدہ اور موزوں تبصرہ کیا تھا یہ ان دنوں کی بات ہے جب 53ء میں ہم لوگ لاہور سنٹرل جیل میں نظر بند تھے۔ ان ایام اسیری کے دوران کبھی کبھی مجلس شعر بھی آراستہ ہوتی تھی۔ ایک ایسی ہی محفل میں جناب نعیم صدیقی کا تعارف ان سے کرایا گیا تو فرمانے لگے۔

”اچھا آپ ہیں نعیم صدیقی! خوب! کچھ تعارف تو آپ سے پہلے بھی ہے وہ اس طرح کہ ایک بار میں قاسم باغ کے قریب سے گزر رہا تھا وہاں کوئی جلسہ تھا جس میں ایک

تقریر جاری تھی مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی مشین بول رہی ہو پوچھنے پر پتہ چلا کہ مشین نہ تھی آپ تھے۔“

خطابت کا جادو جگانے کے لئے خطیب کو سحر آفریں شخصیت کا بھی حامل ہونا چاہئے۔ اس اعتبار سے بھی شاہ جی کا جواب نہ تھا۔ قدرت نے انہیں ایسا حسن اور مردانہ وجاہت عطا کی تھی کہ جو دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کہتے ہیں ایک انگریز فلم ساز نے انہیں تقریر کرتے دیکھ کر کہا تھا کہ اگر مجھے اپنی فلم میں حضرت مسیح علیہ السلام کا کردار ادا کرنے کے لئے کسی شخص کو لینا ہو تو اس مقصد کے لئے اس شخص سے زیادہ موزوں کوئی نہ ہو گا۔

1892ء میں پٹنہ (بہار) میں پیدا ہوئے، بعد میں امرتسر آ گئے، میس دینی تعلیم حاصل کی، پاکستان بنانا تو ملتان میں قیام پذیر ہوئے، 21 اگست 1961ء کو جان جان آفرین کے سپرد کی، انہوں نے پوری عمر اور پوری عمر کی تمام تر توانائیاں ملک و ملت کی نذر کر دیں۔ کسی اور کو یاد ہو یا نہ ہو مگر۔

ہمیں ہے یاد سرگزشتِ زندگی نہال کی  
ہوا تمام، حسنِ گلِ رخاں سے کھیلتا ہوا

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم اور شاہ جی سنٹرل جیل لاہور میں اکٹھے ہو گئے، یہ 1953ء کی بات ہے جب تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں شاہ جی دوسرے احرار راہنماؤں کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے تھے، میں ان دنوں جماعت اسلامی میں شامل اور اس کے آرگن ”کوثر“ لاہور کا ایڈیٹر تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر تھی، جماعت نے اس تحریک میں باقاعدہ حصہ نہیں لیا تھا وہ اسے آئینی حدود میں رکھنا چاہتی تھی مگر مولانا مودودی اس موضوع پر ایک کتابچہ لکھنے کی وجہ سے گرفتار ہوئے تو ان کے ساتھ دوسرے جماعتی راہنماؤں کے علاوہ میں بھی پکڑا گیا۔ شاہ جی اور ان کے ساتھی سنٹرل جیل کے جس احاطے میں نظر بند تھے وہ دیوانی گھر کے نام سے مشہور تھا، ہم جس احاطے میں تھے اسے ”بم کیس“ کہتے تھے۔ یہ ”بم کیس“ نام اس احاطے کا اس لئے پڑا تھا کیونکہ اس میں مشہور بم کیس میں ملوث بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی رہا کرتے تھے۔ بھگت سنگھ پر دہلی کے اسٹریٹی بال میں بم پھینکنے کا مقدمہ چلا اس پر ایک انگریز پولیس کپتان کے قتل کا بھی الزام تھا۔ پھانسی کی سزا ہوئی تو بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے پھانسی کا پھندا خود اپنی گردن میں ڈالا اور نعرے لگاتے ہوئے موت کو لبیک کہا۔ ”بہارستان“ میں مولانا ظفر علی خان کی یہ نظم اسی زمانے کی یاد گار ہے۔

شہیدانِ وطن کے خونِ ناحق کا جو ست نکلے  
تو اس کے ذرے ذرے سے بھگت سنگھ اور دت نکلے



توہاں میں عرض کر رہا تھا کہ شاہ جی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دیوانی گھر میں رہتے تھے اور ہم ہم کبھی میں، جیل حکام سے کہہ کر ہم نے یہ رعایت لے لی تھی کہ جمعہ کے جمعہ ہم لوگ آپس میں مل لیں۔ اس رعایت کے تحت ایک جمعہ ہم لوگ دیوانی گھر جاتے تو اگلے جمعہ شاہ جی اپنے رفقاء کے ساتھ ہم کبھی تشریف لے آتے اسی زمانے کا ایک لطیفہ اب تک یاد ہے، ہم لوگ والی بال کھیلنا کرتے تھے دیوانی گھر نیم کے پکتان صاحب زادہ فیض الحسن تھے اور ہم کبھی نیم کا میں، شاہ جی بڑی دلچسپی سے کھیل دیکھتے، کبھی کبھی خود بھی شامل ہو کر سروس کیا کرتے تھے ایک بار مولانا امین احسن اصلاحی نے شاہ جی سے کہا:

”شاہ جی آپ سروس کرتے ہیں۔“

انہوں نے کہا ”ہاں پوری زندگی سروس کرتے ہی گزار دی ہے۔“

مولانا اصلاحی بدستہ بولے ”لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ سروس اکثر فاول ہوتی ہے۔“

سنٹرل جیل کے اس زمانہ نظر بندی میں، میں نے خوب خوب شاعری کی، ایک تو میں شادی کے تیسرے ہی دن گرفتار ہوا تھا کچھ اس کالٹر اور کچھ ”رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور“ کے اصول کا نتیجہ، ہر روز ایک آدھ غزل ہو جاتی، میرے مجموعہ کلام ”زرِ گل“ کا بیشتر حصہ اسی عہد اسیری کی یادگار ہے۔ شاہ جی تشریف لاتے تو شعر و سخن کی محفل بھی جمتی۔ وہ شعر کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے خود شاعر تھے نہ ختم تخلص کرتے تھے۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں بڑے خوبصورت شعر کہے ہیں، میرے اشعار سنتے اور بزرگانہ داد سے حوصلہ افزائی فرماتے، ایک مرتبہ میں نے غزل سنائی تو اس میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

سیاد نے تیرے اسیروں کو آخر یہ کہہ کر چھوڑ دیا۔

یہ لوگ قفس میں رہ کر بھی گلشن کا نظارہ کرتے ہیں

بے اختیار رُپ گئے بار بار شعر کی تکرار کرائی، کہنے لگے مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آگیا۔ انگریز کے زمانے میں کالے پانی کے اسیر مولانا جعفر تھانوی سیری اور ان کے ساتھیوں کو سزائے موت ہوئی تو انگریز گورنر پھانسی کے دن خود یہ نظارہ دیکھنے آیا، سزائے موت پانے والوں کا عالم یہ تھا کہ وہ خوشی کے مارے نعرے لگا رہے تھے انگریز حاکم نے حیران ہو کر پوچھا ”ابھی تھوڑی دیر میں تو یہ لوگ پھانسی چڑھنے والے ہیں انہیں خوشی کس بات کی ہے؟ جیل کے حکام نے کہا ”ان کے مذہب میں یہ موت شادت ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ یہ اس طرح مر کر سیدھے جنت میں جائیں گے اسی لئے خوش ہیں۔“ انگریز کہنے لگا ”اگر یہ بات ہے تو میں انہیں خوش نہیں ہونے دوں گا، ان کی سزائے موت سزائے عمر قید میں تبدیل کر دی جائے۔“

شاہ جی نے اپنے انداز خاص میں یہ واقعہ سنایا اور کہا ”برخودار! اب شعر پڑھو“ میں نے شعر پڑھا تو شاہ جی کی اس تشریح کی روشنی میں شعر کا مزہ ابی دو بالا ہو گیا تھا۔

جیل سے رہائی ہوئی تو ایک عرصے تک شاہ جی سے ملاقات نہ ہو سکی، ایک مرتبہ لاہور تشریف لائے تو ایک دوست کی معرفت یاد فرمایا، ان دنوں وہ مشہور شیخ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو چکے تھے اور ان کا زیادہ وقت عبادت میں گزرتا تھا، حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ ایمریس روڈ لاہور کی ایک کوٹھی میں مقیم تھے، شاہ جی نے وہیں طلب فرمایا میں پہنچا تو حضرت رائے پوری مجلس آراتھے اور بہت سے لوگ باادب ہو کر ان کے ملفوظات سے مستفید ہو رہے تھے، انہی میں شاہ جی بھی تھے میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا، میں نے دیکھا جتنی دیر حضرت رائے پوری کی مجلس ارشاد قائم رہی شاہ جی اس ادب و تواضع سے بیٹھے رہے جیسے ان کے سر پر کبوتر بیٹھے ہوں کہ یہ بٹے تواڑ جائیں گے۔

دوسری مرتبہ ملتان میں ہوا، میں یہاں ایک اجتماع سے خطاب کرنے گیا تھا۔ پہنچا تو معلوم ہوا

شاہ جی بیمار ہیں دو ہفتوں کے ساتھ ان کی عیادت کی غرض سے ان کے آستانے پر حاضری دی مگر یا لمجب یہ کیا ایک کچی بستی میں کچا مکان نہ کوئی نوکر نہ چاکر، پردوں کی جگہ دیواروں پر بوریاں لٹکی ہوئیں، مجھ سے نہ باگیا کما ”شاہ جی! آپ یہاں رہتے ہیں؟“ کہنے لگے ”ہاں یہی محل تو میں نے بندوؤں کے سرمائے سے بنوایا ہے“ یہ اس الزام کی طرف اشارہ تھا جو بعض سنگ دل لوگ انہیں کاٹھنیں کا تنخواہ دار کہہ کر لگا کر لگاتے تھے، طبیعت تڑپ اٹھی میری آنکھوں میں آنسو آگئے مگر میں نے دیکھا اس بے سرو سامانی کے عالم میں بھی شاہ جی کے چہرے پر صبر و شکر کا نور بکھرا ہوا تھا۔ بقول حضرت انجم فونی بدایونی۔

اہل دل شدت غم سے کہیں گھبراتے ہیں  
اوس پڑتی ہے تو پھول اور نکھر جاتے ہیں

تیسری بار اور آخری بار انہیں مرض الموت میں دیکھا، وہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں اپنے عقیدت مندوں کی ایک کوٹھی میں بغرض علاج ٹھہرے ہوئے تھے زبان پر فالج کا اثر تھا، بول نہیں سکتے تھے اللہ اکبر! یہ منظر دیکھنا بھی تقدیر میں لکھا تھا کہ وقت کا سب سے بڑا خطیب اور زبان سے ایک لفظ ادا کرنے میں عاجز و محتاج، شاید قدرت یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ جس فصاحت و بلاغت پہ حضرت انسان ناز کرتا ہے وہ اس کا کمال نہیں کسی کی عطا ہے جب چاہے جس طوطی خوش نوا کو چاہے منقار زیر پر کر سکتا ہے، انہیں دیکھ کر بے ثباتی عالم کی تصویر نگاہوں میں کھینچ گئی۔ کچھ دیر ان کے سرمائے بیٹھ کر واپس آ گیا۔ دو ہی چار روز کے بعد شاہ جی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

وہ حلم اور وہ تواضع اور وہ طرزِ خود فراموشی  
خدا بخشے جگر کو لاکھ انسانوں کا انسان تھا

## اک مرد باکمال وہ بھی تھا

ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔ ڈک۔

"برادران اسلام! آج رات کو..... بعد نماز عشاء مسجد خیر الدین مرحوم میں..... امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری..... تقریر فرمائیں گے۔ آپ حضرات، کو چاہیے کہ جوق درجوق تشریف لا کر جلسے کی رونق کو..... دو بالا فرمائیں۔"

یہ ڈھنڈورے کے وہ الفاظ ہیں جو اکثر امرتسر کے بازاروں اور سڑکوں پر گونجا کرتے تھے۔ اور جب لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر ہے تو یہ الفاظ ڈھنڈورے سے زیادہ لوگوں کی زبانوں کے ذریعے سارے شہر میں پھیل جایا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ امرتسر میں جب بھی شاہ جی کی تقریر ہوتی تو مسجدوں میں خاص طور پر یہ خبر کسی اہتمام یا انتظام کے بغیر ہی از خود ہر نمازی تک پہنچ جاتی تھی۔ اور اگر تقریر مسجد خیر الدین میں ہوتی تو لوگ اکثر عشاء کی نماز وہیں ادا کرتے تھے تاکہ اسٹیج کے قریب ہی جگہ حاصل ہو سکے۔

میں نے لوگوں کو شاہ جی کی تقریر سننے کے لئے اس طرح ٹولیاں بنا کر جلسہ گاہ کی طرف جاتے دیکھا ہے کہ جس طرح لوگ عموماً عید کی نماز پڑھنے جایا کرتے ہیں۔ میں بھی اپنے بچپن ہی سے ہمیشہ ان ٹولیوں میں شامل ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے بچپن سے تقریریں سننے کا شوق بہت زیادہ تھا۔ اور خصوصاً سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کے لئے میرے والد اور بھائی صاحب بھی ضرور جاتے تھے۔ مختلف مشاہیر ملت کی تقریروں میں شامل ہونے کی عادت تو مجھے اپنے والد صاحب ہی سے ملی ہے جو خاص طور پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، سید داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، شیخ حسام الدین، مظہر علی اظہر، تاج الدین انصاری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کی تقریروں اور مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کے مناظروں میں ضرور شامل ہوتے رہے ہیں۔

میں ذاتی طور پر ان میں سے صرف مولانا ابوالکلام آزاد مولانا محمد علی جوہر اور چودھری افضل حق مرحوم کی تقاریر سے محروم رہا ہوں۔ میں نے جس شخصیت کی تقریریں زیادہ سنی ہیں وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ گویا اس سلسلے میں ان کا نام سرفہرست ہے۔

پاکستان بن جانے کے بعد لاہور میں شاہ جی کی جس قدر تقریریں ہوئی ہیں میں شاید ہی کبھی تقریر سے غیر حاضر رہا ہوں گا۔

شاہ جی کی ہر تقریر کے موقع پر بلا مبالغہ اگر لاکھوں نہیں تو کئی ہزار لوگ تو ضرور موجود ہوتے تھے اور

انہی تقریر جتنی دیر تک رہتی سامعین نہایت ذوق و شوق سے ہمہ تن گوش رہتے تھے۔ شاہ جی کی تقریر کے موقع پر رات کے تین تین چار چار بجے تک تو میں بھی جاگتا رہا ہوں۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب میں لڑکپن کی منزل میں طے کر رہا تھا۔ نہ جانے ان کی زبان میں کیا سر اور دلکشی تھی کہ حاضرین میں سے کسی کو خیندہ محسوس ہوتی تھی اور نہ کوئی ایک لمحے کے لئے اکتاہٹ محسوس کرتا تھا۔ اگر تقریر کو جادو کہا جائے تو بلاشبہ شاہ جی بہت بڑے ”جادوگر“ تھے۔

میرے والد مکرم شیخ عبدالعزیز امرتسری اس واقعے کے راوی ہیں کہ ایک مرتبہ امرتسر میں کنہیا لال کے منڈوے میں مرزا بشیر الدین محمود کی تقریر تھی۔ شہر کے اکثر مولویوں نے مسلمانوں کو وہاں جانے سے روکا۔ چنانچہ مرزائیوں کے علاوہ وہاں شاید بہت ہی کم لوگ گئے۔ اباجی کہتے ہیں میں نے سوچا کہ دیکھوں تو سبھی مرزا محمود آخر کچھتے کیا ہیں۔ جب تقریر کا وقت ہوا اور مرزا صاحب نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر الحمد کی تفسیر بیان کرنا شروع کی تو نہ جانے اچانک عطاء اللہ شاہ بخاری کہاں سے نکل آئے اور انہوں نے لکار کر کہا کہ مرزا صاحب آپ قرآن کی تفسیر تو غلط نہ کیجئے۔ مرزا صاحب عطاء اللہ شاہ کو دیکھ کر سنت گھبرائے، کیونکہ وہ اپنی طرف سے اس جگہ کو بہت محفوظ سمجھ کر وہاں آئے تھے۔

وہاں اس وقت محمد اعظم تھانیدار اور عزیز دین کو تو ال حفاظت پر متعین تھے۔ انہوں نے سرخ سرخ آنکھیں دکھائیں لیکن شاہ جی ان باتوں سے کب ڈرنے والے تھے۔ وہ اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ آخر لوگوں نے مرزا صاحب کو شاہ جی سے مناظرہ کرنے کو کہا۔ لیکن مرزا نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر کو تو ال اور تھانیدار نے شاہ جی سے کہا۔

شاہ جی! مرزا صاحب آپ کے ساتھ مناظرہ کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا ہے۔ اب ہم آپ سے صرف یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کو یہاں سے جانے دیجئے۔ یہاں تقریر بھی نہیں کریں گے۔ شاہ جی کہا۔  
 ”کیسے جانے دوں اگر اس میں جرأت ہے تو سامنے کھڑے ہو کر بات کرے“

اس کے بعد شاہ جی سینما ہال کے باہر آگئے۔ وہاں اتفاق سے ایک تانگہ کھڑا تھا۔ شاہ جی نے اس پر کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دی۔ اور آن کی آن میں سارا بازار ایک جگہ بند ہو گیا۔ دیکھا جائے تو شاہ جی کا جذبہ، جرأت اور دلیری محض تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں تھی۔

شاہ جی اپنی رائے کے اظہار میں بڑے بیباک تھے۔ وہ بڑے بڑوں کے منہ پر بھی حق گوئی سے باز نہ آتے۔ اور اگر کبھی مذہبی یا سیاسی اختلاف ہوتا تو لگی پٹی رکھے بغیر نہایت واشگاف الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کر دیتے تھے۔

میرے والد صاحب ہی راوی ہیں کہ ایک دفعہ سنت سیاسی بے چینی کا دور تھا اور انگریزوں کے خلاف عوام کے جذبات بہت مشتعل تھے۔ شاہ جی اپنے مرشد اول پیر مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (گوڑہ) کے

پاس گئے اور ان سے جہاد کے موضوع پر گفتگو کی۔ پیر صاحب فرماتے گئے۔ ”اچھا میں دعاء کروں گا۔“  
 شاہ صاحب جو نہایت پر جوش الفاظ لے کر وہاں گئے تھے۔ یہ سن کر کہنے لگے۔  
 ”سرکار! مجھے معاف کیجئے اگر ہر جگہ دعائیں ہی کافی ہوتیں تو رسول اکرم ﷺ بدر و احد کے میدانوں میں نہ جاتے۔

اسی طرح ایک مرتبہ مذہبی جلسہ ہو رہا تھا۔ مولانا نور احمد مرحوم (خطیب مسجد شیخ بدھا) نے رسول مقبول ﷺ کی سیرت کے بیان میں کہا کہ آپ ﷺ کو غصہ نہیں آتا تھا۔  
 ان کے بعد جب شاہ جی، تقریر کرنے کو اٹھے تو کہنے لگے۔ میں مولانا (نور احمد مرحوم) کو اپنا استاد سمجھتا ہوں۔ لیکن یہاں شاگرد اساتذ سے اختلاف کرنے کی جرأت کر رہا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ حضور ﷺ کو غصہ نہیں آتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں غصہ آتا تھا۔ وہ بشر تھے اور غصہ بشر کی فطرت ہے۔ انسان میں غصے کی غیر موجودگی اس کی غیرت کے منافی ہے۔ ہمیں اپنی محبت و عقیدت میں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ وہ انسان تھے اور انسانی تقاضے ان کے ساتھ تھے۔ اور یہی ان کی فضیلت ہے۔ کہ وہ انسان ہونے کے باوجود اس قدر بلند و بالا تھے۔

شاہ صاحب کی تقریر میں بعض اوقات بڑی دلچسپ اور معنی خیز لفظی رعایت بھی پیدا ہو جاتی تھیں۔ ایک دفعہ کہنے لگے۔

”جب کہیں بخاری کی تقریر ہو تو ان مرزائیوں کو نہ جانے کیوں بخار چڑھ جاتا ہے!“

اس طرح ایک اور موقع پر کہنے لگے۔

مجھے تو آج تک مرزا کی نبوت کے متعلق سمجھ نہیں آئی۔ یہ سطلی، بروزی، بروزی، برازی خدا جانے کیا

ہے؟

ایک سیاسی جماعت کے مقابلے میں ایک بار کہا۔ ہم انکا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں نہ ہمارے پاس زر ہے

نہ زر ہے اور نہ زور ہے!

شاہ جی نے اگست ۱۹۳۷ء کے فسادات شروع ہونے سے بہت پہلے امرتسر کے گول باغ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا تم لوگ خدا جانے کن خوش کن خوابوں میں کھوئے ہو میں سمجھتا ہوں۔ یہ وہ وقت ہے کہ میں مشورہ دوں گا۔

”سوننا پیو اور لوہا خریدو“

انکا مطلب تھا کہ اپنے دفاع کا بندوبست کرو۔ لیکن افسوس کہ عوام نے ان کے ان الفاظ کی قدر نہ کی۔

شاہ جی کی ایک تقریر انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کے موقع پر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے وسیع و عریض میدان میں ہوئی۔ جب شاہ جی جلسہ گاہ میں تشریف لائے تو اللہ اکبر۔ تاج و تخت ختم نبوت زندہ باد عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

لیکن جب صدر اجلاس میاں ممتاز دولتانہ تشریف لائے جو ان دنوں سابق پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے تو انہیں عوام کا یہ دلی تپاک نصیب نہ ہو سکا۔

شاہ جی نے دولتانہ کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے  
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مولانا احمد علی لاہوری مرحوم شاہ جی کے بڑے مداح تھے۔ جن دنوں ختم نبوت کی تحریک زوروں پر تھی۔ اور حکومت وقت اس تحریک کو دبانے میں مصروف تھی۔ مولانا احمد علی مرحوم نے خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا۔

حکومت کہتی ہے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری فساد پھیلاتا ہے۔ ان اللہ کے بندوں کو یہ معلوم نہیں کہ اگر عطاء اللہ شاہ بخاری فساد پر آمادہ ہو جائے تو مرزا نیت کا قلعہ تا دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر بخاری شام کو حکم دے دیں تو صبح ہونے سے پہلے پہلے ربوہ کی لائنٹ سے لائنٹ بج جائے۔

مجھے بتاؤ کہ ایک طرف لاہور کا ڈی سی تقرر کرے اور ایک طرف عطاء اللہ شاہ تقرر کرے تو لوگ کس کی تقریر سنیں گے؟ اگر ایک طرف وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین تقرر کریں اور ایک طرف عطاء اللہ شاہ بخاری تقرر کریں تو لوگ کس کی تقریر سنیں گے؟ اگر ایک طرف گورنر جنرل غلام محمد تقرر کریں اور دوسری طرف عطاء اللہ شاہ تقرر کریں تو لوگ کس کی تقریر سنیں گے؟

اور مولانا احمد علی کے جواب میں لوگ ایک آواز کھڑے رہے تھے۔

عطاء اللہ شاہ کو۔ عطاء اللہ شاہ کو۔

ان مثالوں سے مسلمانوں کے دلوں میں عطاء اللہ شاہ کی محبت و عقیدت کا اجازہ مشکل نہیں ہے۔ شاہ جی کا جسم بہت رعب دار اور مضبوط تھا۔ ایک بار تقریر میں انہوں نے بتایا کہ کسی زمانے میں میری صحت اتنی اچھی تھی اور بازو اتنے موٹے تھے کہ میرے کوئی ہتھکڑی پوری نہیں آتی۔ چنانچہ انگریزی حکومت کو میرے لئے خاص طور پر الگ، ہتھکڑیوں کا انتظام کرنا پڑا۔

بعض مذہبی مسائل میں انہی رائے نہایت واضح اور دو ٹوک ہوتی تھی۔ کچھ مثالیں پہلے بیان کر چکا ہوں ایک مثال اور سنئیے۔

ایک مرتبہ امرتسر میں ایک پیر قسم کے مولوی آئے اور مسجد جان محمد میں تقریر کر گئے کہ حضور ﷺ نوری تھے ان کو خاک کی یا بشر کہنا انہی تو ہیں ہے۔

شاہ جی نے مسجد خیر الدین میں اسکا جواب دیا اور کہا: بھائی مانو نہ مانو میرے نانا حضور اکرم ﷺ بشر ہی تھے میں انہی اولاد میں شامل ہوں۔ سارے سید انہی اولاد میں شامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور یہ عام بات ہے کہ نسل بدلا نہیں کرتی۔ انسان کی نسل ہی سے انسان پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور اگر میرے حضور علیہ

الصلوة والسلام بشر نہ تھے تو میں یہاں تک کہہ دوں گا کہ جو لوگ سید ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ کہاں سے آگئے ہیں۔

میں نے شاہ جی کی آخری تقریر دہلی دروازے میں سنی جو شاید لاہور میں ان کی آخری تقریر تھی۔ اس تقریر سے پہلے ان پر فلج کا حملہ ہو چکا تھا اور کچھ عرصے کے لئے افادہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس تقریر کا بیشتر حصہ ایک خط پڑھنے اور اس پر تنقید کرنے میں گزر گیا۔ جو مرزا قادیانی نے انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے لکھا تھا اور وہ شاہ جی کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

جو شخص بیک وقت لاکھوں انسانوں کے کانوں کیا، دلوں تک اپنی آواز پہنچا سکتا تھا۔ وہ اتنا بے بس تھا کہ دم آخر اپنے بیٹوں تک سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اس کیفیت کا مشاہدہ کر کے عرشی امر سرے نے وہیں یہ شعر کہا:

برق	ورعد	آسودہ	بستر	شدہ
شعلہ	جوالہ	خاکستر		شدہ

افسوس کہ وہ نادر روزگار شخصیت اب ہماری دنیا میں نہیں اور ہم ان کو اپنی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔

وے صورتیں الہی کس دیس بستیاں ہیں  
اب انکے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

شاہ جی کی بلند و بالا ہستی ہندوستان اور پاکستان میں یگانہ روزگار تھی جس کا ثننی چشم فلک صدیوں تک نہ دیکھے سکے گی۔ انہیں ہم سے رخصت ہوئے پانچ سال کا عرصہ گزر گیا۔ مگر ان کی شعلہ یانی کے اثرات اس طرح تازہ ہیں جیسے وہ ابھی ابھی گئے ہیں۔ وہ اس دنیا میں ہیں جہاں سے وہ کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے۔ اب ان کا نام نسلوں تک اور کام صدیوں تک ہمارے ساتھ رہے گا۔ ان کی موت سے جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی صرف یوں ہو سکتی ہے کہ وہ آجائیں ہمارے پاس واپس۔ مگر کیا کیا جائے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اور یہ خواہش اس لئے ابھرتی ہے کہ ساری قوم مل کر بھی دوسرا بخاری پیدا نہیں کر سکتی۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی شاہ جی کی پیاری شکل آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ ان کی موت المناک سانحہ ہے۔ ان کے مرنے سے ایک پورا دور ختم ہو گیا۔ اب دنیا میں بخاری نہیں آئے گا۔

وے صورتیں الہی کس دیس بستیاں ہیں  
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ مرحوم

## داستان اشتیاق

میں نے آٹو گراف الیم بند کر دی۔ عذہ میں نظریں آوارہ پھرنے لگیں۔ ذہن البتہ ایک خاص لفظ پر جما ہوا تھا۔ مجھے اس لیے بہت کچھ یاد آیا۔

ایک لڑکے کو ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ وہ بڑا ہڈیلا اور سر پہرا تھا مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ طبیعت ایسی پانی تھی کہ شرارت کرنے اور سزا پانے میں خوش رہتی۔ ڈانٹ کھا کر فوراً اسی کام میں لگ گیا جس سے اسے منع کیا تھا۔ یہ اس کی عادت بن چکی تھی۔ ڈانٹنے والا رنج ہو کر بولا بھلا تم کب باز آنے والے ہو، تم سے بھلنسٹ کی امید کون رکھے۔ تم تو احراری ہو احراری۔ یوں میں نے احراری کا لفظ پہلی بار سنا۔ اور اسے بدی کا ایک استعارہ سمجھ لیا۔ چند دنوں بعد میں جب میں نے سنا کہ مولانا محمد علی کو رئیس الاحرار کہتے ہیں۔ اور اقبال کے کلام میں مردوس کے ساتھ مردانِ حُر کا ذکر بھی ہے تو اس لفظ کے معنی میں شبہ پیدا ہو گیا۔ اس شبہ کو پیر جو گوٹھ کی گدی سے بڑی تقویت ملی کہ وہاں سبھی حُر کھلاتے ہیں کچھ مدت اور گزری تو یہ عقدہ کھلا کہ تشبیہ اور استعارے کا درست ہونا ضروری نہیں صرف نادر اور پُر اثر ہونا لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تشبیہات اور استعارے کا استعمال ہماری شاعری اور دشنام طرازی میں بڑی کثرت سے ملتا ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچا تو میں نے اشتباہ کو دور کرنے کی کوشش بے سود سمجھ کر ترک کر دی۔ مگر اس کوشش کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ میں نے الفاظ کی درجہ بندی کر لی ہے اور اس طرح بہت سی مشکلات آسان ہو گئی ہیں۔ الفاظ کی تین قسمیں ہوتی ہیں ایک تو وہ لفظ جو ابن الوقت اور مرزا غا ہر دار بیگ ہوتے ہیں ان کے معنی وقت اور موسم کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ظالم، مظلوم۔ دوسرے وہ معنی خیز لفظ جن کا مطلب علم اور تجربے کے ساتھ واضح اور وسیع ہوتا جاتا ہے مثلاً حسن و عشق، تیسرے وہ تہہ دار لفظ ہیں جن کا سادہ اور قطعی مضمون کبھی گرفت میں نہیں آتا مثلاً عوام اور استعمار۔ اس درجہ بندی کے بعد میں نے احرار کو دشنام کے استعارے سے خارج کیا اور تیسری قسم کے الفاظ میں شامل کر لیا۔ اب مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ جماعت احرار نے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۳ء تک کیا کھویا اور کیا پایا اور لوگ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ کم از کم میں کوئی رائے نہیں رکھتا۔ آخر یہ کہاں ضروری ہے کہ انسان ہر موضوع بحث اور ہر اختلافی مسئلہ پر قطعی اور حتمی رائے کا مالک ہو اور اپنے برتاؤ میں اتنا خشک اور درشت ہو جائے کہ احرار کی کھلانے لگے۔

جب میں ملتان میں تعینات ہوا تو صلیح کے اہم افراد کی ایک فہرست پیش ہوئی۔ اس میں سر کردہ افراد بھی تھے اور سرکش اشخاص بھی۔ بڑے سے بڑے ٹوڈی سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے باغی کا نام درج تھا۔ ایک نام دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام تھا۔ وہ اپنی ذات سے اک اجماع تھے۔ اور اس اجماع کا نام مجلس احرار تھا۔ ظفر علی خاں نے اسی مجلس احرار کا قافیہ بیزار، افسرار، عطر کار چندے کے طلبکار اور



رسوا سر بازار سے ملایا تھا۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے میں نے اس شخص کا نام جسے بہت سے لوگ امیر شریعت کہتے ہیں ذہبی کے ایک گوشے میں محفوظ کر لیا۔ ان دنوں الیکشن کے انتظامات کی مصروفیت تھی۔ چند ماہ گزرے تو الیکشن اور آئین دونوں منسوخ ہو گئے۔ مصروفیت زیادہ ہو گئی۔ بنیادی جمہوریت اور زرعی اصلاحات کی پہلی قسط کے ساتھ کسی دوسرے سرکاری اور نیم سرکاری کاموں میں یوں لگا رہا کہ سال گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ کام معمول پر آیا تو یادداشت سے ایک نقطہ ابھرا اور غلش بن گیا۔ شاہ جی سے ملاقات کی خواہش دل میں پیدا ہوئی اور میں نے اس کا اظہار منشی عبدالرحمان خاں سے کر دیا۔

مجلس احرار کو غیر قانونی قرار دیئے ہوئے چھ سال ہو چکے تھے۔ جماعت اپنے انجام کو پہنچی تو گویا جلسہ برخاست ہو گیا۔ نعرے گم، لیڈر او جمل، جلوس منتشر ایک دور تھا کہ ختم ہو گیا اور اس کی صرف دو یاد گاریں رہ گئیں۔ مجلس کی فروگزاشتیں اور میر مجلس کی خطابت۔ شاہ جی ملتان میں گوشہ نہیں ہو گئے۔ ان کی تقریریں کچھ قانون وقت نے بند کر دیں اور کچھ اس قانون قدرت نے جو ہر بورڈھے آدمی پر لاگو ہوتا ہے۔ شاہ جی کی تقریروں کا بڑا چرچا تھا۔ سننے والوں کا بیان ہے کہ عشاء سے فجر ہو جاتی مگر طبیعت سیر نہ ہوتی۔ خوش الحان اور خوش بیان تھے، عربی، فارسی، اردو اور پنجابی محاورے پر قادر تھے۔ قرأت، نثر، نظم، لطیفہ، ہجو، لور تشبیح کو حسب ضرورت استعمال کرتے تھے۔ احتیاط کا دامن اکثر ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور کبھی کبھی اسے دانستہ اپنے ہاتھ ہی سے چاک کر دیتے اور اس بات کی بھی پرواہ نہ کرتے کہ یہ کام برسر عام ہونا ہے یا برسر منبر۔

شاہ جی اپنے زمانے کے سب سے معروف و مشہور مقرر تھے۔ عوام نے انہیں سر آنکھوں پر رکھا اور خواص نے ان سے ہمیشہ خم کھسایا۔ میں نے ان کی تقریر کبھی نہیں سنی مگر اس کی تعریف اکثر سنتا رہتا اور سوچتا تھا کہ وہ خطابت کس پائے کی ہوگی۔ جسے مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد اور بہادر پار جنگ کا زمانہ ملا پھر وہ سب پر بھاری رہی۔ مولانا محمد علی، علی گڑھ اور آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ابوالکلام آزاد اللہ لکھتے اور امام احمد کھلاتے تھے۔ محمد بہادر خاں نواب اور جاگیر دار تھے۔ شاہ جی کے پاس کیا رکعتہ تاجپوشہ میں دلخوشی، بنارس میں ورق کوٹنے کی مشقت اور امرتسر میں ایک چھوٹی سی مسجد کی امامت۔ اس کے باوجود شاہ جی کو جس نے سنا اس نے یہی کہا۔

چہ جادو نیست ندانم بطرز گفتارش  
کہ باز بستہ زبان سنن طرازان را  
(فیضی)

ذاکر صاحب نے مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ابوالکلام آزاد کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی سند پیش کرنے کے موقع پر کہا تھا کہ اردو زبان کو ہمیشہ اس پر خمر ہے گا کہ وہ آپ کی زبان سے بولی اور آپ کے قلم سے لکھی گئی۔ اردو نے جب بھی اپنے سرمایہ افتخار پر ناز کیا تو اسے بہت سے لوگ یاد آئیں گے۔ ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شامل ہونگے۔ جن کے لئے سیاست دراصل ایک اسٹیج، سیاسی جماعتیں صرف منتقلین جلسہ، ملک بھر کی آبادی محض سامعین اور زندگی ایک طویل اردو تقریر تھی۔ اس خطیبانہ زندگی میں ان کے ہم عصر تو

بہت تھے مگر ہمسر کوئی نہ تھا۔

عرصہ ہوا میں نے شاہ جی کو ایک بار کراچی میں سننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ مجھے یہ فکر تھا کہ جلسہ رات گئے ختم ہوا تو واپسی کی بس نہیں ملے گی۔ اتنے میں صابطہ فوجداری حرکت میں آیا۔ جلسہ منسوخ ہو گیا اور شاہ جی غالباً پکڑے گئے بے بسی کی جگہ محرومی نے لے لی۔ یہ اوائل ملازمت کی بات ہے جب شاہ جی کے بولنے اور ہمارے سننے کے دن تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔ خطابت کی راہ میں پیری حامل ہونے لگی اور سماعت کی راہ میں ملازمت کے آداب اور صابطے حامل ہونے لگے۔ آج اگر تقریر نہ سنی تو کل کیسے سن سکیں گے جب ہم اس نظام کا حصہ بن چکے ہوں گے جہاں حسن انتظام کا معیار صرف یہ ہے کہ کسی مخالفت کی تقریر نہ ہونے پائے۔ تقریر کا جواب تقریر سے دینے میں محنت صرف ہوتی ہے۔ اور یہ اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ گول باغ اور موچی گیٹ میں پانی پھوڑ دیا جائے۔

شاہ جی کی تقریر سے محروم رہا تو تقریب بہر ملاقات نکال لی۔ یہ ملاقات منشی عبد الرحمان خاں کے ذمہ تھی۔ انہوں نے شاہ جی سے بات کی تو وہ مثال گئے۔ کہنے لگے کہ میں ساری عمر انتظامیہ سے لڑتا آیا ہوں۔ ڈپٹی کمشنر اگر بلانا چاہے تو وارنٹ گرفتاری نکالے۔ منشی صاحب نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کھما دیکھتے ہوئی نا احراریوں والی بات۔ یہ ان کی مرضی کہ وہ عہدے کو انتظامیہ کی علامت جانتے ہیں اور انتظامیہ کو ہر حال میں قابلِ ملازمت سمجھتے ہیں مگر یہ کہاں کی بالغ نظری ہے کہ عہدے اور عہدہ دار کے فرق سے بھی انکار کر دیا جائے۔ اگر مجھے ان کی سیاست سے کوئی واسطہ نہیں تو انہیں میری ملازمت سے کیا غرض۔ ایک نوجوان دور حاضر کے عظیم خطیب سے ملنے کا خواہشمند ہے اور بوڑھا خطیب اس کے اشتیاق کا حال پوچھتا ہی نہیں۔ بس اتنا سہی کر کہ وہ سرکاری ملازم ہے اسے فوراً رد کر دیتا ہے۔ رہا حفظ مراتب کا سوال تو میں نے پہلے ہی شاہ جی سے حاضری کی اجازت چاہی تھی سلام نہیں بھیجا تھا۔ پیغام بر نے یہ باتیں سنیں اور اٹے پاؤں واپس لوٹ گیا۔ اگلے ہی روز سید عطاء اللہ شاہ بخاری میرے یہاں مہمان بن کر تشریف لے آئے میں نے نئے مٹھا کار کا دروازہ کھولا۔ پہلے ایک پھر مٹھا ہوا بخاری شعر برآمد ہوا اور اس کے چپھے شعر پڑھنے والا اترا۔ ڈھیلا ڈھالا کھدر کا کرتا، سبز چار خانہ تہ بند، دیسی جوتی، دراز قد اور دراز ریش، کشادہ جبیں اور خندہ رو، شاہ جی نے ایک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا دوسرے سے کچھ بوجھ اپنے عصا پر ڈالا۔ کھر ذرا سی خم ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر گیلری سے ہوتے ہوئے بال کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ کمرے کے دوسرے سرے تک چلتے گئے اور وہاں پہنچ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ جوتی اتاری اور پالتی مارلی۔ میں نے انہیں اوپر سے نیچے تک دیکھا اور ان کی پرانی تصویروں کو یاد کیا۔ دونوں میں تصویر سی مشابہت ضرور ہے مگر مناسبت کوئی نہیں۔ کہاں وہ نسیم نسیم گیسو دراز اور عصا بردار جسے دیکھ کر دیو جالس کھبی، برنارڈ شا، ٹیگور اور ٹالسٹائی یاد آتے تھے اور کہاں یہ ستا ہوا بے وزن ڈھانچا جو میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

میں نے شاہ جی سے اپنے اشتیاق کا قصہ بیان کیا۔ ان کی تقریر کبھی نہیں سنی مگر اس کی تعریف اتنی سنی ہے کہ زبان خلق پر ایمان لے آیا ہوں۔ جس نے ان کی تقریر سنی اور پسند کی اس کے لئے علم حاضر اور

جس نے کبھی نہ سنی مگر اوروں سے زیادہ متاثر ہوا اس کے لئے ایمان بالغیب۔ شاہ جی نے میری بات کا اعتبار اور میرے جذبات کا احترام کیا وہ ذرا سی دیر میں یوں گھل مل گئے گویا میری نیاز مندی کو ایک زمانہ بیت چکا ہو۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو ان کی بیماری اور کمزوری کے پیش نظر میں نے اسے طول دینے سے احتراز کیا مگر جب باتیں ختم ہوئیں تو شام ہو چکی تھی۔ اور شاہ جی کو آنے ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ گفتگو کا سلسلہ کمر بھر کے لئے بھی منقطع نہ ہوا اور اس میں میرا حصہ اسی قدر تھا جتنا ایک میرزا باں اور ساح کا ہونا چاہیے۔ منشی صاحب محض سننے اور سر دھننے کے قائل نہیں ان کا اصول ہے کہ اچھا انسان، اچھی کتاب اور اچھی گفتگو جہاں میسر آئے اس میں دوسروں کو بھی شریک کرو۔ ان سے تنہا فائدہ اٹھانا کھم ٹرپی کی دلیل ہے۔ ملاقات شروع ہوئی تو منشی صاحب مسکرا رہے تھے۔ گفتگو شروع ہوئی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئے پھر کاغذ لکھلا اور یادداشت لکھنے میں مشغول ہو گئے وہ جو ایک نوجوان اور تمام وقت خاموش بیٹھا رہا۔ چائے دو تین بار آئی مگر یوں دبے پاؤں کہ گفتگو میں کوئی خلل نہ پڑا۔ ان تین گھنٹوں میں شاہ جی نے آیات، احادیث، اشعار اور چٹھوں سے ایک جادو جگائے رکھا۔ میں ان کی خطابت کا راز جاننا چاہتا تھا مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ موضوع اتنی تیزی سے بدلتے رہے کہ خطابت پر جم کر بات نہ ہو سکی۔ گفتگو شاہ جی کی صحت سے شروع ہوئی اور توکل سے ہوتی ہوئی سیرت تک پہنچی۔ وہاں تاریخ کا ذکر آگیا اور اس میں مختلف ترکیبیں شامل ہو گئیں۔ ہر تحریک کے ساتھ اس سے وابستہ افراد کا جائزہ شروع ہو گیا۔ اور بات ایک پورا چکر لگا کر شاہ جی کی ذات پر واپس آ گئی۔ اس مرحلے پر شاہ جی نے واپس جانے کی اجازت چاہی ملاقات ختم ہونے والی تھی۔ اس وقت شاہ جی جو تیاں اتارے صوفے پر اکڑوں بیٹھے تھے ابھی وہ پیر نیچے اتاریں گے چڑھی ہوئی آستین بھی نیچے اترے گی۔ گلے کا بٹن بند ہو گا۔ پان کی ڈبیر جیب میں ڈالی جائے گی اور پھر عصا کا سہارا لے کر اٹھیں گے جو تمام عرصہ ان کے ہاتھ ہی میں رہا تھا میں نے کہا اجازت ہو تو چند سوال پوچھ لوں اجازت ملی تو میں نے دو سوالوں سے تمہید باندھی اور جواب ملنے پر تیسرا سوال داغ دیا۔ اس سوال و جواب کے دو سال بعد میں نے منشی صاحب کو خط لکھا کہ لہجہ تحریری یادداشت مجھے بھیج دیں۔ منشی صاحب نے بہت ڈھونڈا مگر ایک مختصر ورق کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ وہ گفتو جے میں نے محفوظ سمجھا تھا اس کے الفاظ گم ہو گئے۔ اگرچہ اس کا حاصل حافظے میں محفوظ ہے۔ اور اس کا تاثر دل پر نقش ہے۔ مشاہیر کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کے سلسلے میں حافظ پر زیادہ اعتبار کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ حافظ بھی خواہشات کا تابع ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات خواب و خیال کو واقعات اور واردات میں منتقل کر دیتا ہے۔ ایسے میں اس کا کہنا مانیں تو نفس اور تاریخ دونوں کا زیاں ہوتا ہے۔

میں نے شاہ جی سے جو سوال کئے وہ سب سو دو زیاں کے بارے میں تھے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ گزشتہ چالیس برس میں جو آپ کی عوامی زندگی پر محیط ہیں آپ نے بر عظیم کے مسلمانوں کو اسلام سے قریب آتے ہوئے دیکھا ہے۔ یا دور جاتے ہوئے پایا ہے۔ جواب ملا کہ مسلمانوں میں دو طبقے پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں ایک مذہب سے قریب دوسرا اس سے کچھ دور۔ ان دونوں طبقوں کا درمیانی فاصلہ اس چالیس سال میں بہت بڑھ گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو لوگ مذہب سے بیگانہ ہیں ان کی تعداد اور قوت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ میں

نے دوسرا سوال پوچھا۔ بر عظیم کی گزشتہ چالیس سالہ تاریخ میں زندگی کے کتنے ہی شعبوں میں ایسے نامور مسلمان ایک ہی وقت میں جمع ہو گئے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر ان سب کی موجودگی میں اسلام سے بیگانہ ہو جانے والوں کی تعداد اور قوت میں اضافہ ہوا ہے تو اس مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جس کے مسائل آپ کے عہد سے زیادہ الجھے ہوئے اور رہنما آپ کے معیار سے کم یا یہ ہوں گے۔ کیا یہ بات قابل افسوس نہیں کہ جو ملی سرمایہ آپ کو اسلاف سے ملتا اس سے آپ کا ترکہ کمتر ہو گا۔ شاہ جی نے فرمایا کہ ہمیں اپنے مقصد میں اس لئے کامیابی نہ ہو سکی کہ دوسو برس کے عرصے میں فرنگی کی تعلیم اور تہذیب نے اپنا پورا تسلط جمالیا تھا۔ آسودہ حال لوگ علی گڑھ کی طرف چلے گئے اور ناکارہ آدمی دینی مدارس کے حصے آئے۔ جنگ آزادی کی ہمدہی میں سیاست دین پر اور منافقت دنیا پر غالب آئی۔ ساری توجہ اور توانائی نئی تعلیم اور نئی سیاست کی نذر ہو گئی۔ جو لوگ باقی رہے ان میں سے کچھ ہندو تمدن کے زیر اثر رہ کر گمراہ ہو گئے صرف بچے کچھے اور لٹے پٹے لوگ ہی دین کے کالے میں شامل ہوئے۔ ہمارا سرمایہ خوب تباہگر نسل ناخوب تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے آباؤی ورثہ بھی کھو اپنی کھائی بھی گنوانی اور مستقبل کو بھی محذوش بنا دیا۔ میں نے آخری سوال کی اجازت چاہی اور اسے دو طرح سے پوچھا ایک شکل یہ تھی کہ اگر قیامت کے دن آپ سے پوچھا گیا کہ اسے وہ شخص جسے بیان و کلام میں چالیس کروڑ افراد پر فوقیت دی گئی تھی اس خطابت کا حساب پیش کرو تو آپ ناکام تحریکوں کے حلوہ کیا پیش کریں گے۔ اسی سوال کی دوسری شکل یہ تھی کہ آپ نے اپنی جدوجہد کا انجام دیکھ لیا اب اگر زمانہ چالیس برس پیچھے لوٹ جائے تو آپ اپنی خطابت اور طاقت کا دوبارہ وہی استعمال کریں گے یا آپ کی زندگی بالکل نئی ہو گی۔ شاہ جی یکایک خاموش ہو گئے۔ ان کی خاموشی میں آرزوگی بھی شامل تھی۔ میں نے موضوع بدل دیا اور اپنی آٹو گرافت الہم ان کے سامنے کر دی شاہ جی نے اسے پہلو پر رکھا اور لکھا:

وہ اٹھتا ہوا اک دھواں اول اول

وہ بجھتی سی چٹھاریاں آخر آخر

قیامت کا طوفان صرا میں اول

ظہار رہ کارواں آخر آخر

چمن میں عنادل کا مسبود اول

اور گیاہ رہ گل رھاں آخر آخر

ان تین اشعار کے نیچے ایک طویل محکش کے ساتھ سید لکھا اور سید کے اوپر عطاء اللہ بخاری لکھ کر دستخط مکمل کر دیئے۔ یہ بات ۲۸ جون ۱۹۵۹ء کی ہے۔ دو تین برس بعد میں اور منشی عبدالرحمن خاں ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے۔ شاہ جی زندہ تھے تو اپنے سامعین کو کبھی بنبر زمین کبھی صرا اور کبھی قبریں کبھ کر پکارتے تھے۔ آج ہم ان کے سہرا بنے خاموش کھڑے تھے۔ قبر سے آواز آئی۔ تمہارے تیسرے سوال کا جواب اس روز نہ دے سکتا تو آج سنو، الفاظ اقبال کے ہیں قصہ مسلم ہندی کا اور حاصل ایک عمر کی خطابت کا:

مسلم ہندی چڑا سیدان گزشت ہمت او بوئے کراری نداشت!  
مشت خاکش آہنناں گردیدہ سرد گرئی آوازِ من کارے نہ کرد!

## شاہ جی کی مختار مسعود سے ملاقات

پس منظر تہہ بنظر

منشی عبدالرحمن خان مرحوم ملتان کی ایک سماجی اور علمی شہریت تھے سرکاری میں انہیں خاصا رسوخ حاصل تھا۔ یہ جولائی ۱۹۵۹ء کا واقعہ ہے۔ وہ ایک روز حضرت امیر شریعت کے ہاں تشریف لائے اور اپنی آمد کی غرض و غایت بیان کی۔ کہ ڈی سی ملتان (مسٹر مختار مسعود) آپ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ حضرت امیر شریعت نے جواب دیا کیوں؟

کیا وہ میرا مکان چھننا چاہتے ہیں کہ اطمینان سے کیوں بیٹھا ہوں؟  
منشی صاحب:- نہیں حضرت وہ آپ کا عقیدت مند ہے۔

حضرت امیر شریعت:- پھر وہ تشریف لے آئیں فقیر کا در تو کھلا ہے۔  
منشی صاحب:- وہ ڈرتا ہے کہ لوگ مجھے احراری مشہور کر دیں گے۔

حضرت امیر شریعت:- بھائی میری طبیعت ناساز ہے میں تو کہیں جا نہیں سکتا صحت بحال ہو گئی تو دیکھا جائیگا۔  
پھر منشی صاحب چلے گئے۔

اس ملاقات کے تقریباً پانچ چھ روز بعد مولانا محمد علی جالندھری تشریف لائے تو شاہ جی نے یہ بات مولانا سے کہہ سنائی مولانا نے کہا کہ آپ ضرور تشریف لے جائیں اور مجلس تحفظ ختم نبوت (شعبہ تبلیغ مجلس احرار اسلام) کے دفتر کی واگداری کے بارے میں بھی بات کریں جو تحریک تحفظ ختم نبوت کے دنوں میں سر بہر کر دیا گیا تھا۔ تقریباً پندرہ سولہ روز بعد منشی صاحب دوبارہ تشریف لائے۔ اور ڈی سی کے اشتیاقی ملاقات کا ذکر کیا شاہ جی نے فرمایا کہ ان سے پوچھ آؤ وہ کس دن فارغ ہوں گے۔ ایک دن بروز ہفتہ منشی صاحب آئے اور بتایا کہ کل اتوار کو ملاقات کا وقت طے کر آیا ہوں۔ میں صبح سات بجے آپ کو لینے کے لئے حاضر ہو جاؤں گا۔ شاہ جی اتوار کی صبح انتظار کرتے رہے دن کافی چڑھ گیا اچھی خاصی تپش ہو گئی۔ منشی صاحب آٹھ بجے سے کچھ اوپر کار لے کر آئے۔ شاہ جی نے روانگی سے قبل مجھے فرمایا کہ منشی صاحب اور مزاج کے آدمی ہیں تم میرے ساتھ چلو۔ منشی صاحب کے تاخیر سے آنے پر شاہ جی نے اظہار ناراضی فرمایا اور کہا کہ میں بیمار آدمی ہوں اور آپ نے اتنی دیر کر دی۔

شاہ جی۔ مجھے ساتھ لیکر ڈی سی کی کوٹھی پر پہنچے۔ گاڑی برآمدے کے پاس جا کر رکی۔ تو ڈی سی مختار مسعود اور ایم ایچ شاہ۔ سی ایس پی رجسٹرار کو اپرٹیو سوسائٹی مغربی پاکستان بھی موجود تھے۔ دونوں اکٹھے آگے بڑھے۔ منشی عبدالرحمن خان نے جلدی سے گاڑی سے نکل کر دروازہ کھولا۔ شاہ جی باہر نکلے تو ہر دو حضرات سے سلام و

مصافحہ کیا۔ آپ نے دھوپ سے بچنے کے لئے سر پر رومال ڈال رکھا تھا۔ منار مسعود نے آگے بڑھ کر ہاتھ پکڑا۔ شاہ جی برآمدے کی تین چار سیرٹھیاں چڑھنے کے بعد کھڑے ہو گئے۔ اور منشی صاحب کو مخاطب ہو کر پوچھا کہ یہی ڈمی سی صاحب ہیں۔ منار صاحب نے فوراً از خود جواب دیا جی ہاں میں ہی ہوں آپ کا نیاز مند۔ اسکے بعد اندر کمرے کی جانب بڑھے۔ کمرے میں قالین بچھے تھے۔ شاہ جی نے دروازے میں فٹ پیڈ پر ہی جوتے اتار دیئے۔ منار مسعود نے کہا آپ اسی طرح آجائیں کوئی حرج نہیں۔ شاہ جی نے فرمایا نہیں بھائی میں مسجد کا آدمی ہوں ایسے ہی ٹھیک ہے پھر بعد میں آپ لوگ باتیں کرتے ہیں کہ ان مولویوں کو تمیز نہیں۔ ہمارے بازوے میں کہا جاتا ہے کہ تہذیب سے ان کو آشنائی نہیں ہوئی اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں جوتے یہیں اتار دوں۔ اسکے بعد آپ صوف پر بیٹھ گئے اور دوسرے لوگ بھی بیٹھ گئے۔ چند لمحوں بعد شاہ جی نے فرمایا کہ آپ لوگ اگر محسوس نہ کریں تو میں ذرا آرام سے بیٹھنا چاہتا ہوں مریض آدمی ہوں اس لئے ٹانگیں ٹکا کر نہیں بیٹھ سکتا۔ منار صاحب نے کہا جیسے آپ کی مرضی۔ اسکے بعد گفتگو کا آغاز منار صاحب کے اس سوال سے ہوا۔

منار مسعود:- حضرت ٹھنڈا مشروب پینا پسند فرمائیں گے یا چائے؟

شاہ جی:- بھائی ذیابیطیس کا مریض ہوں صرف سادہ پانی پیوں گا۔ سٹر منار مسعود کے اصرار کے باوجود شاہ جی نے صرف سادہ ٹھنڈا پانی ہی پیا۔ باقی حضرات کی تواضع ٹھنڈے مشروب سے کی گئی۔ پھر منار صاحب ٹھنڈے آم بھی لے آئے اور شاہ جی کو پیش کئے مگر آپ نے صرف ایک دانہ اٹھایا اور سونگھ کر واپس ڈش میں رکھ دیا اور فرمایا کہ میرے معاملے نے مجھے صرف یہاں تک اجازت دے رکھی ہے اس پر بھی منار صاحب نے اصرار کیا مگر شاہ جی نے آم نہیں کھکا۔ شاہ جی نے فرمایا چونکہ آپ نے بے تکلفی کا اظہار کیا ہے اسلئے ہم بھی بے تکلف ہو کر بیٹھ گئے ہیں ورنہ ہمارا مقام تو آپ کی عدالت میں کھڑے ہونے کا ہوتا ہے۔

منار صاحب: نہیں نہیں اب آپ کو ایسی تکلیف نہیں دی جائیگی۔ جی چاہتا تھا کہ آپ کے ساتھ بیٹھ کر آپ کے خیالات سے استفادہ کیا جائے اسی لئے اس نشست کا اہتمام کیا گیا ہے۔

اسکے بعد منار صاحب نے ایک طویل سوال کیا جو اپنے اندر بہت سے پہلو رکھتا تھا۔

سوال تھا، شاہ صاحب ہمیں اپنے مسلم رہنماؤں سے یہ گلہ ہے کہ انہوں نے ہماری صمیم تربیت نہیں کی ملک کی آزادی کی تحریک چل رہی تھی تو ہم لوگ تعلیم حاصل کر رہے تھے وہاں سے فارغ ہوئے تو ملک تقسیم ہو چکا تھا البتہ اللہ کا فضل یہ ہوا کہ اس وسیع ملک میں ہمیں اچھی اچھی ملازمتیں مل گئیں۔

شاہ جی نے جواب دیا۔

نہیں آپ کا یہ گلہ درست نہیں ہے کیونکہ ہم نے اپنے بزرگوں سے جو سیاسی تربیت ورثے میں پائی تھی اور جو اپنی محنت سے پیدا کی ہے وہ بھی نئی نسل کے حوالے کی۔ لیکن نئی نسل بھی عجیب نسل ہے وہ اس امر پر توجہ ہی نہیں دیتی، اس کا کیا کیا جانے کہ لائل پور اور کیمیل پور کے شہروں میں آبادی کے اعتبار سے غیر مسلم چند تھے۔ لیکن مسلمانوں کی اکثریت نے اپنے مکانات اور جائیدادیں جو لے تک بد کرداری کے عوض

غیر مسلموں کو پہنچ ڈالیں۔

منتار مسعود نے دوسرا سوال کیا کہ شاہ صاحب کیا وجہ ہے کہ گزشتہ سدی میں ہندوستان میں اس قدر کثیر تعداد میں مسلمان رہنماء پیدا ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں کوئی دور اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انہوں نے چیدہ چیدہ رہنماؤں کے نام بھی گنوائے مگر مسلمان قوم اسکے باوجود رو بہ زوال تھے؟ شاہ جی نے فرمایا "اس کی وجہ علی گڑھ یونیورسٹی ہے۔ جب یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی تو مسلمانوں کے ایک گروہ نے سر توڑ کوشش کی تھی کہ علی گڑھ اور دیوبند کو مل کر کام کرنا چاہیے۔ لیکن ایک طبقہ پوری شدت سے اسکی مخالفت کر رہا تھا۔ اور آخر کار وہی کامیاب رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کا دولت مند اور ذہین طبقہ علی گڑھ یونیورسٹی میں پہنچ گیا، مظل اور نادار غیر ذہین طبقہ دیوبند میں پہنچ گیا اس وقت سے مسلمانوں میں مذہب اور سیاست کی تقسیم کا آغاز ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے مسلمانوں کے رہنماؤں میں دونوں خصوصیات ہوتیں تھیں بلکہ جو حکمران ہوتا تھا وہی مذہبی رہنماء بھی ہوتا تھا۔ اور اب یہ ظہج اتنی وسیع ہو گئی ہے کہ مجھے تو یہ ملتی نظر نہیں آتی۔

اسکے بعد دفتر ختم نبوت کی واگراری کی بات بھی آئی، پھر کافی دیر تک خالصتاً ادبی مظل جی رہی شعر و شاعری، اور مختلف اصناف سخن پر گفتگو ہوتی رہی اسی دوران منتار صاحب نے اقبال کے متعلق ایک ٹیکھا سوال کر ڈالا۔ کہ شاہ صاحب اقبال کے متعلق آپ کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے کلام میں پیغام کچھ دیتے ہیں اور ان کا ماحول کچھ اور بناتا ہے؟

شاہ جی نے فرمایا کہ نہیں ایسی بات نہیں۔ میں اقبال کو آپ سے زیادہ جانتا ہوں میں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے۔ جو لوگ لنگے گرد آپکو نظر آتے ہیں وہ انہوں نے اکٹھے نہیں کئے تھے بلکہ "کئے گئے" تھے۔ یا ہو گئے تھے۔

اسکے بعد منتار نے اپنے ترکش کا اصل تیر نکالا۔ اور اس بے گلفی کے ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چھے مربع اراضی ٹیوب ویل سکیم کے تحت دینے کی پیش کش کی۔

شاہ جی نے فرمایا۔

"آپ نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔"

اس پر ملاقات ختم ہو گئی۔

اور مغرب کے بعد شاہ جی گھر واپس لوٹ آئے۔ پھر منتار مسعود صاحب نے کبھی بھی ملاقات کے اشتیاق کا اظہار نہ کیا اس ملاقات میں چھے افراد شامل تھے۔

۱۔ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ

۲۔ مسٹر منتار مسعود

۳۔ ایم۔ ایچ۔ شاہ (محمود الحسن شاہ)

۴۔ منشی عبدالرحمن خان مرحوم

۵۔ سید محمد وکیل شاہ بخاری

۶۔ ایک طالب علم جو غالباً مختار مسعود صاحب کے عزیز تھے۔

جب گاڑی امیر شریعت کو لینے کے لئے آئی تو منشی صاحب کے ساتھ یہ نوجوان بھی تھا۔

مختار مسعود نے "آواز دوست" میں اس ملاقات کی جو تفصیل لکھی ہے وہ ادھوری ہے۔ شاہ جی نے لکے تمام سوالات کے جواب دیئے تھے اور وہ یہی سوال تھے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں زمین کی پیشکش کے واقعہ کو شاید دانستہ نظر انداز کیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟

مختار صاحب نے جس خاموش نوجوان کا ذکر کیا وہ میں تھا۔

### تیرے پیکر میں ہوا، روح بلالی کا ظہور

اے امیر کارواں، اے کارواں ساز وفا  
تیری پیشانی جلالِ آدمی کا آئینا  
منزلِ مقصود کی تمہید تیرا نقش پا  
تیرے دامن پر تصدقِ ماہ و انجم کی ضیا  
تجھ کو پیہم مقصدِ ہستی کا اندازہ رہا  
جراتِ افزائے تمنا، تیرا آوازہ رہا  
تیرے پیکر میں ہوا روح بلالی کا ظہور  
تیرا اندازِ کلم سر بہ سر حق کا شعور  
کس طرح آنکھیں ملانا، تجھ سے باطل کا غرور  
تیرا احساسِ خودی آسودہ تاثیر تھا  
تیرا ہر اک لفظ گویا وقت کی تقدیر تھا  
نورِ ہستی جلوہ گر تھا تیری مشقِ خاک میں  
کوئی ثانی تھا نہ تیرا جراتِ بے باک میں  
تیرا شہرہ کیوں نہ جاتا گنبدِ افلاک میں  
دیدہ و دل آگئے تھے حیطہٴ ادراک میں  
تو جہاں میں خوابِ انساں کے لئے تعبیر ہے  
تیری خاموشی سے بے شک زندگی دل گیر ہے۔



## ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ان عظیم شخصیتوں میں سے تھے جو صدیوں بعد کسم عدم سے منصف شہود پر آتی ہیں۔ اور لوگوں پر اپنی شخصیت اور کارکردگی کے انمٹ نشانات چھوڑ جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تقریر کرنے کا وہ جوہر انہیں ودیعت کیا تھا جو بہت کم لوگوں کو نصب ہوتا ہے برصغیر کے سیاسی و دینی سٹیج پر فاضل اور باکمال لوگ اپنی تقریروں سے لوگوں میں جادو جگاتے رہے مگر شاہ جی کی مثال ان میں سے کوئی نہ ہوا۔ ان کی آتش بیانی اور شعلہ زبانی کا یہ عالم تھا کہ برسوں ان کی تقاریر کا چرچا رہتا تھا۔ جمال و جلال کا یہ پیکر جب سٹیج پر نمودار ہوتا تھا تو سامعین میں ایک جوش و خروش موج زن ہو جاتا تھا اور لوگ ان کی ہر بات پر "آمنہ و صدقاً" کہہ اٹھتے تھے یہ پیغمبرانہ شان، خدائے برتر نے اس بیسویں صدی میں انہیں عطا کی تھی۔ ان کی قلندرانہ عظمت کا یہ حال تھا کہ مخالفین بھی اپنے دلوں میں ان سے خوف محسوس کرتے تھے، تمام ہندوستان میں ان کی تقاریر نے ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر تو یہاں تک کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "اگر میرا بس چلتا تو اس پنجابی جادوگر کی زبان بند کر دیتا" کیونکہ وہ عوام کو اپنی تقریر کے جادو سے جس طرف چاہیں لے جاتے تھے، حکومت کا خفیہ محکمہ جب ان کے جلسوں اور تقاریر کی رپورٹیں ارسال کرتا تھا تو کئی انگریز یہ خواہش کرتے تھے کہ کاش انہیں اردو زبان آتی اور شاہ جی کی تقاریر کی طوفان خیزیاں دیکھتے، صلیح بھٹان کے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر، مسٹر مون نے ایک مکان کی چھت پر چھپ کر ان کی تقریر سنی، شاہ جی کو کوئی انگریزی پارلیامانی رکن مسٹر برک سے اور کوئی یونان کے آتش بیاں مقرر، ڈینما سفیر سب مشغول رہتا تھا۔ لیکن وہ بہت پہلو شخصیت کے مالک تھے علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ!

ہو حلقہ یاراں تو برشم کی طرح نرم

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے موس

حضرت شاہ جی اس کی مکمل تصویر تھے، سٹیج کے علاوہ ان کی مجلسوں میں شگفتگی کی عجیب فضا ہوتی تھی، قدرت نے جس مزاج کی نعمت وافر سے نوازا تھا۔ اکثر احباب پر شگفتہ طنز کرتے تھے۔ ان کی محفلوں سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جرأت اور اعلیٰ حوصلہ کی وہ زندہ مثال تھے۔ کسی طاقت کے سامنے سر نہیں جھکایا وہ ایک شعر اکثر پڑھا کرتے تھے آج وہ ہمیں پڑھنا ہوتا ہے تو آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔

چراغوں کا دھواں، دیکھا نہ جائے

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک اکثر شاہ جی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، پروفیسر محمد علی، سید مبارک علی شاہ جی اور میں اتوار کے روزانہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو وہ مزاحیہ کہتے تھے کہ آج شہر میں کوئی اچھی فلم نہ ہوگی، اس لئے چلیں بخاری کی دماغ سوزی کرتے ہیں، لوگوں کے ایسے ایسے واقعات اور حالات، سناہتے تھے کہ شاہ جی کی مردم شناسی اور حافظہ پر حیرانی ہوتی تھی، ایک روز میں نے کہا شاہ جی آپ نے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں سرفروشانہ حصہ لیا ہے اس لئے حریت کی عمارت کی پیشانی پر آپ کا نام بھی درج ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو عمارت کی بنیاد کے روڑے ہیں۔ ہمیں کون یاد رکھتا ہے۔ پھر علامہ اقبال کا یہ شعر انہوں نے پڑھا۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش

میں زہر ہلا بل کو کبھی سمجھ نہ سکا قند

دسمبر ۱۹۵۶ء کی کوئی تاریخ تھی کہ لاہور سے میرے ایک عزیز چودھری کنول خاں میرے پاس آئے اور انہوں نے شاہ جی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ میں بعد نماز عصر، شاہ جی کے پاس انہیں لے گیا۔ شاہ جی نے پہچان لیا اور کہا آپ سے دہلی میں شوکت اللہ انصاری داماد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے یہاں ملاقات ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں چودھری کنول خاں نے ذکر کیا کہ باس، ویزا لے کر میوات جا رہا ہے اور دہلی میں بھی چند روز قیام ہوگا کسی کو کوئی پیغام دینا ہو تو اسے دے دیں، شاہ جی کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ ہم نے سوچا کہ اب مولانا احمد سعید دہلوی یا کسی اور مولوی کا نام لیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ”کیا تم چودھری شیر جنگ کو جانتے ہو؟ جس نے ایک ریلوے ٹرین پر بم پھینکا تھا۔ اور بعد میں سوشلسٹ ہو گیا تھا“ (ہم نے کہا کہ ہم اسے اچھی طرح جانتے ہیں) ”تو اسے میرا محبت بھرا سلام کہنا“۔ پھر انہوں نے چودھری شیر جنگ کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ جب اس نے ٹرین پر بم پھینکا تھا اور کئی انگریز ہلاک ہوئے تھے۔ تو موت کی سزا کا حکم سننے کے بعد ملتان ڈسٹرکٹ جیل آیا۔ اس وقت میں سیاسی قیدی تھا چودھری کی پیشانی پر ماں کا دودھ جھلکتا تھا، میں نے اسے قرآن پڑھایا۔ وہ بہت ذہین تھا۔ اس کی نوعمری کو دیکھ کر اس کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی تھی۔ اور جب اخبارات میں سزائے موت کی خبر شائع ہوئی تو ایک ہندو دو شیرہ نے چودھری شیر جنگ سے شادی کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ بعد میں چودھری شیر جنگ رہا کر دیئے گئے۔ سپرٹنڈنٹ جیل کو اس پر اتنا اعتماد تھا کہ اسے عشاء کے وقت جیل سے چھوڑ دیا جاتا تھا اور وہ پھر شہر کے مختلف نکلیں اور مزارات کی سیر کرنے کے بعد رات کو جیل آ جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک کتاب: ”اوراق پارہ نہ“ اس نے لکھی ہے۔ (۱) شاہ جی نے مزید بتایا کہ جس لڑکی نے اس سے شادی کا اعلان کیا تھا اس نے اسی کے ساتھ شادی کی اور وہ آج کل اندر پرست گرلز کالج میں پروفیسر ہے۔ چنانچہ شاہ جی کا سلام محبت لے کر جب میں دہلی پہنچا تو میں نے اپنے دوست سرور تونسوی سے جوائنٹ میٹر اخبار شان ہند تھے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے چودھری شیر جنگ کا ٹیلی فون نمبر معلوم کر کے بتایا کہ وہ آج کل پنڈت نہرو کے ایما پر گوادس دیو کی سرحدوں پر گوریلا

جنگ کے سربراہ ہیں، اس وقت گوادری دیو، بھارت میں شامل نہ ہوئے تھے۔ بعد ازیں بتایا۔ پروفیسر محمد علی اور سید مبارک علی شاہ نے بتایا کہ جن دنوں شاہ جی ملتان جیل میں تھے تو ہم دونوں ان سے ملنے گئے تو شاہ جی نے ایک چھری سے جسم کا لٹکا ملاقات کو بھیج دیا اور کہا کہ اس سے باتیں کرو میں تصویری دیر میں آتا ہوں، چنانچہ سید مبارک علی شاہ نے چودھری شیر جنگ سے کہا کہ آپ نے ٹرین پر بم کیوں پھینکا۔ تشدد سے کیا آزادی مل جائے گی۔ چودھری شیر جنگ نے کہا کہ آپ سمجھے نہیں۔ آپ کو علم ہے کہ تمام ملک میں سنہاٹا ہے، تمام رہنما جیلوں میں بند ہیں اور سیاسی محاذ پر خاموشی ہے۔ اس لئے میں نے ٹرین پر بم پھینک کر ملک میں یہ سوال پیدا کر دیا کہ بم کیوں مارا گیا۔ چنانچہ اس میں مجھے کامیابی ہوئی اور یہ سوال اور اس کا جواب لوگوں میں تازہ ہو گیا۔

### مولانا مودودی اور شاہ جی

ایک روز بات چیت کے دوران، امیر جماعت اسلامی، مولانا مودودی کا ذکر آگیا۔ شاہ جی ان دنوں میں مولانا مودودی سے ناراض تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ کہیں علماء کی مجلس میں ایک قرارداد، قادیانیوں کے خلاف یا اسلامی شریعت کے نفاذ سے متعلق تھی، منظور کی گئی لیکن دوسرے روز، اخبارات میں مولانا کا یہ بیان شائع ہوا کہ علماء کے اس اجلاس میں جس میں یہ قرارداد منظور ہوئی۔ وہ شریک نہ تھے، (۲) شاہ جی فرماتے تھے کہ وہ اجلاس میں موجود تھے ان سے ایسے بیان کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

### ڈپٹی کمشنر کی جواب طلبی

شاہ جی نے ایک روز فرمایا کہ میں نے اب سیاسی جلسوں میں شرکت کرنا ترک کر دیا ہے کیونکہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد میں نے سیاست چھوڑ دی اور صرف تبلیغ کا کام سنبھال لیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک روز ملتان کے ڈپٹی کمشنر شیخ رشید کا ایک ایلی آ یا کہ ڈپٹی کمشنر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کام کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ صوبہ کے وزیر علی حسین شاہ گردیزی کا کوئی پیغام ہے۔ میں نے کہا کہ میں سرکاری افسروں سے نہیں ملا کرتا۔ کچھ روز کے بعد وہ سرکاری ملازم پھر آیا اور مجھے نہایت انکساری اور اصرار کے ساتھ مجبور کرنے لگا کہ آپ ضرور ملاقات کر لیں۔ کوئی ضروری کام معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ڈپٹی سی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ سید علی حسین شاہ گردیزی کی یہ خواہش ہے کہ آپ ان کے جلسہ میں نہ صرف شرکت کریں بلکہ تقریر بھی کریں۔ جو قلمہ قاسم باغ پر فلاں تاریخ کو ہو گا۔ شاہ جی نے ڈپٹی سی کو مشورہ دیا کہ آپ ان الجھنوں میں نہ پڑیں۔ آپ سرکاری افسر ہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے مگر وہ نہ مانے چنانچہ میں نے صوبائی وزیر کی دہلوانی کے لئے تقریر کر ڈالی۔ اس جلسہ اور تقریر کے دو ماہ بعد ابدالی روڈ پر شیخ رشید سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ تو وہ کہنے لگے کہ شاہ جی آپ درست فرماتے تھے ابھی تک حکومت میرے پیچھے بنے جاڑ کر پڑی ہوئی ہے اور جواب طلبی پر جواب طلبی جاری ہے کہ شاہ سے تقریر کیوں کرائی تھی، گردیزی صاحب میری کوئی مدد نہیں کر پاتے۔

## علامہ اقبال اور شاہ جی

شاہ جی علامہ اقبال سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔ اور ان کے اشعار اکثر سنایا کرتے تھے علامہ اقبال کو بھی شاہ جی سے بڑی محبت تھی اور جب وہ لاہور میں ہوتے تھے تو ان کو ملازم بھیج کر بلایا کرتے تھے۔ شاہ جی نے کہا کہ آج کل ہر شخص، علامہ سے اپنے خصوصی تعلقات کا ذکر کرتا ہے حالانکہ جن واقعات کا ہمیں علم ہے۔ ان کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ علامہ اقبال، ہائی کورٹ میں جج لگنا چاہتے تھے۔ لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ، متعصب ہندو چیف جج، سر شادی لال تھے۔ اسی دوران میں۔ لاہور کے ایک مشہور خاندان کی طرف سے علامہ صاحب کے خلاف درخواست ارسال کی گئی کہ انہیں ہائی کورٹ کا جج نہ بنایا جائے کیونکہ وہ "ایرانی ذوق" کے حامل ہیں۔ شاہ جی نے فرمایا کہ یہ بات کہہ کر علامہ صاحب آبدیدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ زندگی میں کچھ گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ لیکن "ایرانی ذوق" سے بخدا مجھے کوئی سروکار نہیں رہا۔

## سجاد ظہیر کی سیاست

ایک روز ذکر چل پڑا کہ مسلمانوں میں بہترین مقرر کون کون سے ہیں تو ہم نے مولانا ابوالکلام، مولانا ظفر علی، ناظم سیو ہاروی، نواب بہادر یار جنگ اور شاہ جی کا نام لیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے شامل نہ کریں، میں اتنا اعلیٰ مقرر نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے ڈاکٹر کنور محمد اشرف کا نام نہیں لیا۔ (۳) وہ بہت اچھے مقرر ہیں بلکہ اسلامی تاریخ پر بہت عبور رکھتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہندوستان کے ایک بڑے شہر میں ایک سیاسی جلسہ تھا۔ جس میں ڈاکٹر اشرف نے تقریر کی اور امیری و غریبی کے مسئلہ پر اہم دلائل دئے ان کا مقصد سوشلزم کی حمایت کرنا تھا ان کی تقریر نے میرے پاؤں سے زمین نکال دی لیکن پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ اے عطاء اللہ ایسے سیاسی بینڈک تو ٹر کر رہتے ہی رہتے ہیں۔ تو کہاں چل پڑا۔ پروفیسر محمد علی نے پوچھا کہ ایک دوسرے اشتراکی رہنما۔ سجاد ظہیر کے بارے میں بھی کچھ بتائیں۔ شاہ جی نے فرمایا کہ آپ لوگ جو ترقی پسند دانش ور کھلاتے ہو، کیا بتا سکتے ہو کہ جو شخص کمیونسٹ پارٹی کا رکن بھی ہو کیا وہ کسی مذہبی فرقہ سے تعلق رکھ سکتا ہے۔ جبکہ ان لوگوں کا پیرومرشد لینن کہتا ہے کہ مذہب، افیون ہے۔ پروفیسر نے کہا کہ یہ منافقت نہیں ہو سکتی۔ تو شاہ جی نے فرمایا کہ اب سن لیجئے اپنے دانشور بھائی کی حرکت، سجاد ظہیر ہندوستان کی ایک جیل میں بند تھے۔ سجاد ظہیر، جیل میں خوش مذاقی اور شعر و شاعری سے دلچسپی کا اظہار کرتے تھے لیکن جب محرم کا مہینہ آیا تو ان پر اوس پڑ گئی وہ چمچ پھل سب ختم، یہاں تک کہ دس محرم کا روزہ بھی رکھا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی کہ سجاد کیسا کمیونسٹ ہے۔

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

شاہ جی نے بتایا کہ جیل سے باہر آنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری ایس کے ڈلنگے سے کسی جگہ اچانک ملاقات ہو گئی۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر اس سے کیا۔ ڈلنگے نے کہا کہ میں سجاد ظہیر سے پوچھ کر آپ کو بتاؤں گا۔ میں نے شاہ جی سے پوچھا کہ پھر ڈلنگے نے کیا جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ ڈلنگے نے کیا جواب دینا تھا میں نے بمبئی کے ایک جلسہ میں یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ شیعہ ہمیشہ شیعہ رہتا ہے خواہ کمیونسٹ پارٹی میں ہو یا کسی اور جماعت میں۔

### قادیانی رپورٹ

شاہ جی اپنی زندگی کے دو مقاصد بیان کرتے تھے۔ ایک انگریز حکومت کا خاتمہ اور دوسرا قادیانی تحریک کا انجام۔ وہ کہتے تھے کہ انگریز تو گیا مگر ابھی قادیانی فرقہ موجود ہے جس کے خلاف ہم میدان میں آئے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ شاہ جی آپ کی سرگرمیوں کا کوئی نتیجہ نظر نہیں آیا۔ انہوں نے کہا کہ برخوردار ہماری قادیانی مخالف تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ تہار سے والد قادیانی ہو گئے تو سونگے مگر تمہیں ہم نے قادیانی نہیں ہونے دیا۔ نئے قادیانیوں کی زمری مرجا گئی۔ انہوں نے بتایا کہ قادیانی کسی غیر قادیانی کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھتے ہیں۔ مگر جب اس تحریک کے زیر اثر نوجوانوں نے ان کی مریت کی تو مرزا بشیر الدین محمود نے الفصل میں ایک خبر شائع کرائی ہے کہ مرزا غلام احمد کی ایک تحریر مل گئی ہے۔ جس کے مطابق غیر قادیانیوں کے جنازہ میں شرکت کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ اگر ایک ضرب اور لگ گئی تو دوسری تحریر برآمد ہو جائے گی۔ کہ مرزا غلام احمد نبی نہیں ہیں۔ شاہ جی نے ۱۹۵۳ء میں قادیانیوں سے متعلق تحقیقاتی کمیٹی پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ وہ فیصلہ پہلے ہی لکھے بیٹھے تھے وہ ہر شخص سے جو کمیٹی کے سامنے پیش ہوتا تھا یہ سوال کرتے تھے کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے۔ شاہ جی نے کہا کہ ہیرا بیان اخبارات میں شائع ہونے سے روک دیا گیا۔ میں نے جسٹس محمد منیر سے کہا کہ یہ سوال تو آپ اس انداز سے پوچھ رہے ہیں کہ کسی شخص سے سوال کیا جائے کہ کیا تو نے اپنے باپ کو زد و کوب کرنا چھوڑ دیا ہے اگر وہ ہاں میں جواب دیتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کتنی قبیح حرکت کا مرتکب رہا ہے۔ اگر کہتا ہے کہ نہیں تو بھی مورد الزام ہے۔

### ایک مزار

شاہ جی نے فرمایا کہ ایک دفعہ مظفر گڑھ میں ایک تبلیغی جلسہ میں خطاب کرنے والے تھے کہ جب میں نے قرآن شریف کی آیات مبارکہ کے بعد حاضرین پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے ڈانگ، کلہاڑی اور پتھر اپنے ہاتھوں میں لے رکھے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ آج کوئی ہنگامہ ہو گا چنانچہ میں نے ابھی تقریر شروع کی تھی کہ ایک شخص نے کہا کہ شاہ جی آپ مزارات کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ میں نے کہا لوگو مجھے

بتاؤ کہ خدا ایک ہے یا دو۔ انہوں نے کہا۔ ایک، قرآن شریف کہتے ہیں۔ ایک، مسلمانوں کا پیغمبر اعظم، ایک، تو پھر مزار کہتے ہوئے چاہئیں لوگوں نے کہا ایک، جو مخالفین جھگڑا کرنے آئے تھے، انہیں سانپ سونگھ گیا۔

## سخن فہمی

ہندوستان میں یہ بات مشہور تھی کہ شعر کی نزاکتوں کو سمجھنے کی جو صلاحیت، اللہ تعالیٰ نے مولانا شبلی، مولانا ابوالکلام اور علامہ نیاز فتحپوری کو ودیعت کی ہے وہ کسی اور کا نصیب نہیں ہے لیکن ہم نے یہ دیکھا ہے کہ سخن فہمی میں شاہ جی ان تینوں حضرات سے کم نہ تھے۔ ایک دفعہ ان کو بخار چڑھا ہوا تھا کہ سلیبی دوا خانہ، کچھری روڈ ملتان میں حکیم عطاء اللہ خاں سے ملنے آ گئے۔ سید مبارک شاہ جی نے بیدل کا ایک فارسی شعر پڑھا، جسے سن کر شاہ جی جھومنے لگے۔ اور بار بار اس شعر کو دوہرانے لگے۔ پھر حکیم عطاء اللہ سے کہا کہ بھئی اب میری نبض دیکھو حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر کہا اب آپ کے بخار میں افادہ ہو گیا ہے۔ جب آپ نے آتے ہی نبض دکھائی تھی اس وقت نبض زیادہ تیز چل رہی تھی۔

## زبان دانی

ایک روز میں نے پوچھا شاہ جی آپ نے اتنی پر زور اور شگفتہ اردو کہاں سے سیکھی۔ انہوں نے کہا، شاید آپ لوگ ہمیں "پنجابی ڈھگہ" سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اردو کہاں سے سیکھی، آپ مولانا ظفر علی خاں سے یہ سوال کیوں نہیں کرتے، پھر شفقت سے فرمانے لگے کہ آپ اردو کے کلاسیکل شاعر، شاد عظیم آبادی کو جانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اچھی طرح انہوں نے کہا کہ جب شاد صاحب کو اردو کے کسی محاورہ یا لفظ کے بارے میں شک ہوتا تھا تو وہ ایک خاتون سے اس سلسلہ میں استفسار کرتے تھے، پتہ ہے وہ خاتون کون تھی۔ وہ میری نانی تھی، چنانچہ اردو ہماری گھٹی میں پڑی ہے۔

## پنجاب کی تقسیم

ایک روز، بہاولپور سے کوئی شخص آئے ہوئے تھے۔ شاہ جی نے کہا کہ ان کی بات سنو یہ کیا کہتے ہیں۔ اس شخص نے جس کا نام میں اب بھول گیا ہوں علامہ رحمت اللہ ارشد کے حوالہ سے بتایا کہ انہوں نے خضر حیات کا بیونہ کے صوبائی وزیر۔ محمد ابراہیم برقی سے یہ بات سنی تھی کہ پنجاب کے وزیر اعظم خضر حیات ٹوانہ کو ۱۹۴۶ء غالباً ۱۹۴۶ء میں دہلی طلب کیا گیا وہ اپنے ہمراہ ابراہیم برقی کو ساتھ لے گئے۔ نئی دہلی میں انہیں کہا گیا کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملیں۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات، مولانا آزاد سے ملے۔ مولانا آزاد نے کہا کہ پنجاب کو تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اور کانگریس کی بانی کھان نے یہ فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لئے آپ پنجاب کے مسلم لیگی

رہنماؤں پر زور ڈالیں کہ وہ مسٹر محمد علی جناح سے کہیں کہ پنجاب کو کسی صورت تقسیم نہ کیا جائے اور اگر وہ نہ مانیں تو خضر حیات خاں وزیراعظم کا عہدہ چھوڑ دیں کیونکہ تقسیم پنجاب ہونے سے جو فساد پھوٹے گا۔ اس کی ذمہ داری ان پر نہیں ہوگی۔ چنانچہ سر خضر حیات خاں نے دہلی میں مرکزی مسلم لیگی وزیر راجہ غنصفر علی خاں سے بات کی۔ راجہ صاحب نے کہا کہ مسٹر جناح کب کسی کی بات مانتے ہیں۔ اگر پنجاب کی تقسیم ہو رہی ہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔ چنانچہ سر خضر حیات نے لاہور آتے ہی وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور لاہور میں یہ نعرہ گونج گیا کہ تازہ خبر آئی ہے خضر ہمارا بھائی ہے۔ شاہ جی نے فرمایا کہ مولانا آزاد، تقسیم پنجاب میں مسلمانوں کا نقصان دیکھتے تھے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے ایسا کیا ہو۔

### حفیظ جالندھری

شاہ جی نے ایک دفعہ سنایا کہ یوپی کے شہر بنہور میں دو سیاسی جلسے تھوڑے سے فاصلے پر منعقد ہو رہے تھے۔ ایک جلسہ کے مقرر، سید الاحرار مولانا حسرت موہانی اور دوسرے جلسہ کے مقرر وہ خود تھے، مگر جب انہوں نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کی تو مسلم لیگی جلسہ کے آدمے حاضرین، ان کے جلسہ میں آگئے اور جب تقریر شروع ہو گئی تو بہت کم لوگ رہ گئے، چنانچہ حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام پر پڑھنا شروع کر دیا مگر لوگ پھر بھی نہ رکے، میں نے بلند آواز سے کہا کہ اب جو باقی رہ گئے ہوا دھڑ آ جاؤ چنانچہ مولانا حسرت موہانی آگئے اور حفیظ جالندھری اپنی بانسری بجاتے رہے۔

### پہلی گرفتاری

شاہ جی نے اپنی پہلی گرفتاری کا حال بتاتے ہوئے کہا کہ مجھے بیرٹیاں اور سسکڑیاں دونوں پہنائی گئی تھیں۔ کوئٹہ ایکسپریس سے علی الصباح، ملتان ریلوے سٹیشن پر اتارا گیا۔ پلیٹ فارم پر پولیس کے حلاقہ شہری بھی بہت زیادہ موجود تھے۔ چنانچہ ملتان کے لوگوں میں سے چند افراد نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ مجھے غصہ آ گیا میں نے کہا مجھے حوصلہ اور ہمت دینے کی بجائے میرا دل کمزور کرنا چاہتے ہو۔

### سائنس کمیشن کا بائیکاٹ

شاہ جی نے فرمایا کہ تمام ہندوستان میں سائنس کمیشن کے خلاف ایسی ٹیشن جاری تھا اور ہر بڑے شہر میں احتجاجی جلسے ہو رہے تھے۔ کانگریس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو نے الہ آباد میں ایک جلسہ کر دیا جس کی

صدارت وہ کر رہے تھے۔ چنانچہ کمیشن کے خلاف، تمام مقررین سے انہوں نے تقریر کرائی تو آخر میں میرا نام پکارا، میں نے دل میں سوچا کہ اس پنڈت نے آج مجھے بدنام کرنے کا موقع نکالا ہے۔ کیونکہ موضوع سے متعلق تمام باتیں مقررین کہہ گئے اور میرے لئے اب کہنے کو کیا باقی رہ گیا ہے۔ حسن اتفاق کہ ابھی میں تقریر کے لئے کھڑا ہوا تھا کہ سائن کمیشن کی اترتی اٹھانے ہوئے کچھ رونا کار سامنے سے آتے دکھائی دیے۔ مجھے اسی وقت مرزا غالب کا شعر یاد آگیا اور میں نے بلند آواز سے کہا۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا  
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

پنڈت جی فوراً کرسی صدارت چھوڑ کر میرے پاس آئے اور مجھ سے لپٹ گئے اور کہا کہ ارے، ارے شاہ جی آپ نے کمال کر دکھایا۔

### مہاتما گاندھی سے ملاقات

پروفیسر محمد علی نے پوچھا کہ شاہ جی مہاتما گاندھی سے بالمشافہ کوئی ملاقات ہوئی ہے انہوں نے کہا ہا ہا۔ جلسوں میں ان سے ملاقات ہوتی رہی ہے اور ۱۹۴۶ء میں جب کریس مشن آیا ہوا تھا، تو شورش کاشمیری نے گاندھی جی کے پرائیوٹ سیکرٹری خرم سے ملاقات کا نام لے لیا۔ میں نے جب شورش کو باہر جانے کی تیاری کرتے دیکھا تو میں نے پوچھا کہاں کی تیاری ہے۔ اس نے جواب دیا کہ آج مہاتما گاندھی سے ملنے جا رہا ہوں، چنانچہ میں نے کہا مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ گاندھی جی سے ملے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا ہے۔ چنانچہ جب بھنگی کالونی میں گاندھی سے ملاقات کی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا کہ شاہ جی، اب بھی آپ پانچ پچھ گھنٹے مسلسل تقریریں کر سکتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ ہم اپنا اصول کیوں چھوڑیں۔ جب تک انگریز یہاں سے اپنا بستر گول نہیں کرے گا، یہ تقریریں جاری رہیں گی۔ گاندھی جی اس بات سے بہت مظلوم ہوئے۔

### میاں افتخار الدین

میاں افتخار الدین اور سردار شوکت حیات نے مسلم لیگ کو چھوڑ کر ایک علیحدہ سیاسی پارٹی، آزاد پاکستان پارٹی، کے نام سے بنائی، چنانچہ وہ احرار رہنماؤں کو اس جماعت میں شامل کرنے کے خواہش مند تھے، شاہ جی نے بتایا کہ وہ اس سلسلہ میں میرے پاس آئے۔ میں نے کہا کہ افتخار ہم نے پاکستان میں اب سیاست کرنی چھوڑ دی ہے اور اب کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں ہے۔ میاں صاحب نے کہا کہ اب آپ جیل سے ڈرنے لگے ہیں۔ میں نے کہا کہ بھائی آپ سچ کہتے ہیں۔ میں انگریز کی جیل تو برداشت کر سکتا ہوں مگر پاکستان کی نہیں۔ جو بھی سیاسی رہنما اور کارکن ان جیلوں میں جاتا ہے کوئی نہ کوئی زندگی کا روگ لے کر اٹا ہے۔ آپ



کو سیاسی جماعتیں بنانے کا شوق ہے وہ پورا کرتے رہیں۔ یاد رہے کہ میاں افتخار الدین، پہلے پنجاب کانگریس کے صدر تھے، پھر مسلم لیگ میں آگئے اور اس کے بعد آزاد پاکستان پارٹی قائم کی۔

## اللہ اکبر کا نعرہ

شاہ جی نے بتایا کہ پشاور میں ایک سیاسی جلسہ تھا، جس میں ہندو اور سکھ بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ آج ان سے اللہ اکبر کا نعرہ گلوانا چاہیے چنانچہ میں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کیا خدا عظیم اور بڑا نہیں ہے، لوگوں نے کہا کہ عظیم ہے اور ہمارے ہندو اور سکھ بھائی بھی اللہ تعالیٰ کو بڑا مانتے ہیں، تو وہ اللہ اکبر کیوں نہ لگائیں گے۔ چنانچہ جب نعرہ لگایا گیا تو ہندو اور سکھوں نے بھی پر زور نعرہ لگایا۔

## اراضی کی پیشکش

مسٹر منتار مسعود صاحب ۱۹۵۶ء میں ملتان میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ انہوں نے منشی عبدالرحمن کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ امیر شریعت عطاء اللہ شاہ جی بخاری سے ان کی ملاقات کرائیں۔ چنانچہ منشی صاحب۔ شاہ جی کے ”دربار“ میں حاضر ہوئے اور اپنی گزارش پیش کی۔ شاہ جی نے فرمایا کہ ڈپٹی کمشنر سے میری غرض نہیں ہے اگر انہیں ملنا ہے تو خود تشریف لائیں غریب خانہ اور بوریا حاضر ہے۔ منشی عبدالرحمن نے کہا کہ وہ سرکاری فرائض کے باعث آپ کے یہاں آنے سے گریز کرتے ہیں۔ شاہ جی نے کہا کہ غالباً وہ زمین پر بورے پر بیٹھنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ نوا بزاہہ لیاقت علی خاں کا پرائیویٹ سیکرٹری اور مشرقی پنجاب (بھارت) چیف سیکرٹری پر بودھ یہاں زمین پر بیٹھے ہیں۔ منشی صاحب نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ چنانچہ منشی صاحب ایک ہفتہ کے بعد پھر تشریف لائے۔ اور اصرار کرنے لگے کہ مسعود صاحب سے ایک ملاقات ہو جائے۔ شاہ جی نے کہا کہ اچھا پھر کسی دن چلیں گے۔ چنانچہ کارمن شاہ جی اپنے ایک عزیز (۴) کے ہمراہ ڈی سی کی کوٹھی پر بیٹھے، تو ڈی سی

صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا۔ شاہ جی نے پھر رے بدن کے نوجوان کو خیر مقدم کرتے دیکھا تو انہوں نے کہا کہ مختار مسعود کیا اندر کوٹھی میں ہے، انہوں نے کہا کہ میں ہی مسعود ہوں۔ چنانچہ کوٹھی میں اندر گئے تو وہاں قالین اور صوفہ تھا۔ اور ایک سرکاری افسر بھی وہاں موجود تھا۔ شاہ جی قالین پر بیٹھ گئے۔ مسٹر مسعود نے اصرار کیا کہ آپ صوفے پر تشریف رکھیں۔ شاہ جی نے کہا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ قالین دے وہ قالین پر کیوں نہ بیٹھے۔ چنانچہ مسعود صاحب بھی قالین پر بیٹھ گئے۔ شاہ جی نے کہا کہ آج آپ لوگوں کو اس اعلیٰ عہدہ پر دیکھ کر دلی خوشی ہوتی ہے۔ ہم نے ان عہدوں پر قیام پاکستان سے قبل، ہندوستانی افسروں کا مطالبہ کیا تھا

مسٹر مختار مسعود صاحب، چونکہ ادبی آدمی اور ادب دوست انسان ہیں۔ انہوں نے ایک تہید باندھی کہ جب میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا تو آپ کی تقریروں کا بہت زور و شور تھا۔ مگر افسوس کہ میں آج تک آپ کے کسی جلسہ میں شریک نہ ہو سکا اور نہ کبھی تقریر سنی۔ شاہ جی نے پوچھا کہ میرے بلانے کا مقصد کیا ہے۔ ڈی سی صاحب نے بتایا کہ آپ کی کچھ مدد کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ آزادی ملک کے لئے آپ کے عظیم جذبات ہیں۔ شاہ جی نے پوچھا کہ کیسی امداد، انہوں نے بتایا کہ بطور ڈپٹی کمشنر میں نے غلہ لگاؤ سکیم کے تحت جو مریج زمین دے دوں گا، شاہ جی نے کہا کہ بنبر زمین آباد کرنے کے لئے رقم کی ضرورت ہوگی، مسٹر مسعود نے کہا کہ وہ بینک سے قرضہ دلا دوں گا۔ شاہ جی نے کہا کہ مسعود تم نے گھر بلا کر اچھی بات نہیں کی۔ تم نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ اگر مجھے اراضی قبول کرنی ہوتی تو کیا انگریز سے نہیں مل سکتی تھی۔ میرے امیر میں دو مکان تھے۔ ان کے بدلہ میں پاکستان میں آج تک کوئی مکان نہ مل سکا اور میرا لڑکا، (۵) بجالیات کے دفتر کے چکر لگاتا ہے میں کہتا ہوں کہ انہیں چھوڑ دے مجھے مکان نہیں ملے۔

### اچھی تقریر

شاہ جی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے بلکہ بعض دفعہ میں گستاخ بھی ہو جاتا تھا، ایک روز میں نے اپنی حماقت کے باعث، باغ لنگے خاں میں کی گئی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ شاہ جی کل آپ نے جو تقریر کی ہے اس سے آپ کی شہرت کو نقصان پہنچا ہے اچھی تقریر نہ تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ تبلیغی جلسہ تھا وہاں حاضرین کے مطابق ہی تقریر کی جاتی ہے، پھر پورے جوش میں آکر کہا کہ اگر میری تقریر سننی ہے تو دہلی، لکھنؤ یا الہ آباد کا پاسپورٹ دلاؤ اور پھر میری تقریر سن کر اپنی رائے کا اظہار کرو۔

### وضع داری

شاہ جی جس مکان میں رہتے تھے، اس کا مالک مکان، کرایہ میں اضافہ کرتا رہتا تھا، انہوں نے بتایا کہ یہ مکان غالباً پندرہ روپے ماہوار کرائے پر لیا تھا اور اب وہ چالیس روپے کرایہ طلب کر رہا ہے کیونکہ جب بھی نلکے لگانے اور بجلی لگانے پر کچھ خرچ کرتا ہے تو کرایہ بڑھا دیتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ اس مکان کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ انہوں نے کہا کہ وضع داری بھی کوئی چیز ہے۔ یہ انسان کے کردار کا ایک حصہ ہوتی ہے چنانچہ ۱۹۶۱ء میں اسی شکستہ مکان میں ان کا انتقال ہوا۔

### مولانا ظفر علی خان

ایک روز، سید مبارک علی شاہ نے پوچھا کہ شاہ جی آپ اپنی سیاسی زندگی میں کسی سے مرعوب ہوئے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا، لیکن جب مولانا ظفر علی خاں، مجلس احرار کے خلافت ہو گئے اور نظمیں اخبار زمیندار میں شائع ہونے لگیں تو وہ گلی درگلی مقبول ہو جاتی تھیں۔ اور یہ اندیشہ رہتا تھا کہ کل کو کیا نظم شائع ہوگی۔ چنانچہ ہمارا ایک جلسہ ہو رہا تھا کہ پوسٹر تقسیم ہونے شروع ہو گئے۔ جس پر مولانا ظفر علی کی ایک نظم موجود تھی۔ جس کے دو شعر مجھے یاد ہیں۔

طفلِ پری رخ کی شریعت افگنی نے  
کل رات نکالا مرے تقویٰ کا دیوالا  
مسجد کا اگر تجھ کو بنانا ہے شوالا  
احرار کے بت خانے سے مظہر کو بلالا

شاہ جی نے فرمایا کہ میں نے اس پوسٹر کو ہاتھ میں لے کر تقریر شروع کی اور کہا کہ کل رات ہی نہیں بلکہ یہاں ہر شب تقویٰ کا دیوالا نکلتا ہے کیونکہ ہم کسی کے بجٹ نہیں ہیں۔

امیر شریعت کو کیا ہوا

پروفیسر محمد علی بخاری نے سودا کی زمین میں کہ "اے کشتہ بستہ تری حیرت کو کیا ہوا" ایک غزل لکھی جو انہوں نے اپنے دوستوں کو سنائی۔ مطلع تھا کہ

پیمانِ حفظِ دین و شریعت کو کیا ہوا  
کچھ تو کھو امیر شریعت کو کیا ہوا  
پھر ہم ہیں بت ہیں اور عقیدت کے پھول ہیں  
جانے بتوں سے پہلی صداوت کو کیا ہوا

(۶)

دراصل غزل کے مطلع کا دوسرا مصرعہ یہ تھا

تقدیر دو جہاں کی امانت کو کیا ہوا

اور اسی طرح ان کی مطبوعہ کتاب میں بھی چھپا ہے مگر دوستوں کی مغفول میں دوسرے مصرعہ کو بدل کر پڑھتے تھے۔ اب شعر تو پروفیسر نے کچھ دیا مگر شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہونے سے کترانے لگے۔ ہم نے کہا کہ شاہ جی ایسی باتوں سے پریشان ہونے والے نہیں ہیں۔ آپ ان سے مل لیں۔ چنانچہ سید مبارک علی کو ساتھ لے کر وہ شاہ جی کے پاس گئے۔ میں نے سنا کہ شاہ جی نے بھی اس کے جواب میں کوئی شعر کہا تھا۔ جو مجھے یاد نہیں ہے۔ (۷)

شاہ جی کی باتوں کو یاد کر کے لوگ سرد چھٹتے ہیں۔ اور حافظ شیرازی کے شعر ان کے بارے میں پڑھتے ہیں۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بخت  
ثبت است بر جریدہ عالم دوام

(۱) شیر جنگ کی دوسری کتاب "انقلاب روس" ہے۔  
شاہ جی کی روایت ہے کہ شیر جنگ محمد سے ترجمہ قرآن بھی پڑھتا تھا۔ ایک دن کہنے لگا۔ "شاہ جی! اس کتاب میں کہیں علامی کا لفظ نہیں۔ جس قوم کے پاس یہ کتاب ہو وہ غلام نہیں ہو سکتی (مدیر)

(۲) ۱۹۵۲ء میں کراچی می سی آل پارٹیز مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کا اجلاس ہوا تھا۔ جس میں قادیانیوں سے متعلق قرارداد اقلیت اور "راست اقدام" کا فیصلہ ہوا۔ مولانا سودودی اس اجلاس میں شریک تھے مگر منبر انکوائری کمیشن میں انکار فرما دیا شاہ جی کا بیان تھا کہ وہ اجلاس میں میرے گفتنے سے گھٹنا ملائے بیٹھتے۔ (مدیر)

(۳) شاہ جی روایت ہے کہ ڈاکٹر کے ایم اشرف نے ایک مرتبہ ان سے کہا "آپ کی تقریروں سے انقلاب کی بو آتی ہے۔ آپ کا علاج گولی ہے۔" (مدیر)

(۴) شاہ جی کے داماد پرو فیسر سید محمد وکیل شاہ (مدیر)

(۵) سید عطاء الحسن بخاری

(۶) ایک روایت کے مطابق یہ شعر اس طرح بھی سنایا گیا۔

سلک بدل کے آج قیادت کے ساتھ ہے  
کس سے کہیں امیر شریعت کو کیا ہوا

اس شعر میں دراصل شاہ جی کی طرف سے لگی قیادت کے ساتھ مخالفت پر طنز ہے۔ (مدیر)

(۷) پرو فیسر محمد علی بخاری نے اپنا شعر شاہ جی کو سنایا تو شاہ جی نے فی البدیہہ جواب دیا۔ اور ان کی ترقی پسندی پر بھرپور طنز کیا۔ شاہ جی کا شعر ان کے کاغذات میں سے مجھے مل گیا جو یہ ہے۔

سید کے ہالکے کا بھی کعبہ ہے ماسکو  
سادات کی حیثیت و غیرت کو کیا ہوا

محمد عرفان حق کے قلم سے ایک تاریخی دستاویز

فدائے احرار

قیمت = 150 روپے

مولانا محمد گل شیر شاہید

اسلام کے نامور سپہ سالار و تحریک آزادی کے عظیم مجاہد کے سوانح

انکار، احوال و آثار، سیرت و کردار اور بے مثال جدوجہد

بخاری اکیڈمی، میرپور، کالونی، ملتان۔

## شاہ جی کا سحر خطابت

الیاس رشیدی، دلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں پلے بڑھے۔ ان کے بڑے بھائی محمد عثمان آزاد دلی کے نامور صحافیوں میں سے تھے۔ روزنامہ "قومی گزٹ" اور روزنامہ "انجام" کے مالک و مدیر تھے۔ تحریک آزادی میں عملاً شریک رہے۔ اور نیشنلسٹ مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ تحریک پاکستان میں وہ مسلم لیگ کے ساتھ ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد "انجام" کو کراچی سے شائع کیا اور ایک طویل عرصہ تک اسے زندہ رکھا۔

الیاس رشیدی، فلمی صحافت میں چلے گئے۔ اور عمر بھر کے لئے اسی کوچہ رسوائی کے ہو رہے۔

مسلمانوں کی ایک جماعت مجلس احرار اسلام تھی۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اس کے سربراہ تھے۔ یہ جماعت لاہور میں قائم ہوئی تھی مگر اس کی شاخیں پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو اللہ تعالیٰ نے بڑی فصاحت و بلاغت عطا فرمائی تھی۔ وہ اسلامی موضوعات پر ایسی فصیح و بلیغ تقریر کرتے تھے کہ دلی کا مشہور پریڈمیدان، ناکافی موسس ہوتا تھا۔ اعلان ہوتا تھا کہ آج بعد نماز عشاء فلاں جگہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا خطاب ہے تو لوگ دور دور سے ان کی تقریر سننے کے لئے آتے تھے اور اپنے ساتھ رات کا کھانا بھی لے کر آتے تھے کیونکہ شاہ جی تقریر شروع کرتے تو پھر صبح ہی ہو جاتی تھی۔ لوگ صبح تک ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے لوگوں کو کسی نے باندھ کر بٹھا دیا ہو۔ ان جلسوں میں، میں بھی شریک رہا ہوں اور رات بھر جاگ کر ان کی تقریریں سنی ہیں۔ دراصل انہیں تقریر کرنے کا ہنر آتا تھا، وہ سننے والوں کو مسحور کر لیتے تھے۔ سامعین کو یوں مسحور ہوتا تھا جیسے وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ اگرچہ میں ان دنوں بہت نو عمر تھا پھر بھی ان کی تقریروں کا دیوانہ تھا۔ سیاست کی طرح اس زمانے کی صحافت بھی بہت مختلف تھی۔ آج کی طرح ان دنوں بہت سی سولتیں نہیں تھیں مگر اخباری کارکن بہت محنت کیا کرتے تھے۔ ان کی محنت اور کام کرنے کی لگن کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اکثر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں کی رپورٹنگ چار چار اخباری صفحوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اس زمانے کے بعض اخبار چار صفحوں کے ہوتے تھے جو مولانا کی تقریر کے بعد چاروں صفحات پر ان کی تصویریں شائع کرتے تھے۔ اس زمانے میں آج کی طرح ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کی سہولت تو تھی نہیں۔ اس لئے چار چار اور چھ چھ رپورٹر مولانا کے جلسے کی رپورٹنگ کیا کرتے تھے۔

اس زمانے میں لاوڈ اسپیکر آگئے تھے۔ مگر ان کا استعمال عام نہیں ہوا تھا۔ یہ صرف بڑے بڑے لیڈروں کے جلسے جلوسوں میں استعمال کئے جاتے تھے۔ قائد اعظم، بہادر یار جنگ یا عطاء اللہ شاہ بخاری، جس جلسے میں شریک ہوتے، اس کے لئے لاوڈ اسپیکر کا انتظام کیا جاتا تھا۔  
 انٹرویو..... الیاس رشیدی، مدیر ہفت روزہ "نگار" کراچی  
 ماہنامہ "سرگزشت" کراچی مارچ ۱۹۹۴ء



نظیر نود میا نودی

## وہ حاملِ سوز و تپش سینہٴ احرار

وہ سیفِ زباں فاتحِ اقلیمِ خطابت  
 وہ واعظِ شیریں سخن و عالمِ یکتا  
 وہ حافظِ دیں، گنجِ شریعت کا نگہدار  
 آزادیِ جمہور کا وہ عاشقِ جانباہ  
 تحریکِ خلافت کا وہ بے باک علمدار  
 انیس سو انیس کے ہنگاموں کا شاہد  
 الفاظ سے جس نے کیا عالم تہ و بالا  
 انگریز کی ہیبت کو جو خاطر میں نہ لایا  
 بیدار کیا جس نے ہمیں خوابِ گراں سے  
 جس نے غمِ دوراں کو دعاؤں میں کیا گم  
 نعمت تھی جسے پیرویِ ختمِ رسالت  
 خم جس نے ہمیں بادۂ یثرب کے چلائے

وہ سرِ بیاں، بلبلِ بستانِ فصاحت  
 وہ ساحرِ اعجازِ فن و مصحفِ گویا  
 وہ حاملِ سوز و تپش سینہٴ احرار  
 ہر دم جسے اسلام کی تعلیم پہ صد ناز  
 وہ معرکہٴ ترکِ موالات کا سالار  
 ملت کا فدائی صفتِ اول کا مجاہد  
 تصویر کشِ حادثہٴ جلیانوالہ  
 آزادی کا نقارہٴ دلیرانہ بجایا  
 ڈالی تن بے روح میں جاں زور بیاں سے  
 تاریکیِ زنداں کو نواؤں میں کیا گم  
 کی نصفِ صدی قوم اور اسلام کی خدمت  
 میخانہٴ توحید کے آداب سکھائے

سرمایہٴ تاب و تب پنجاب تھا گویا  
 آزادی کی تاریخ کا اک باب تھا گویا

## امیر شریعت کے ساتھ چند لمحے

تیس برس پہلے کی بات ہے جب میں مرحوم خاکسار تحریک کا ایک بہر گرم سپاہی تھا۔ علامہ عنایت اللہ مشرقی مرحوم کی کتاب "قول فیصل" میں نام لے بغیر احراری رہنماؤں کا تذکرہ کچھ نامناسب الفاظ میں کیا گیا تھا۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ یہ اشارہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی طرف ہے۔ اس طرح حضرت امیر شریعت سے میرا غائبانہ تعارف "قول فیصل" کے اسی پیرا گراف کے ذریعے ہوا۔

قیام پاکستان سے پیشتر احرار رہنماؤں علامہ سید محمد داؤد غزنوی، آغا شورش کاشمیری، خواجہ عبدالرحیم عاجز اور مرزا جانناز سے میرے نیاز مندانہ اور دوستانہ مراسم ضرور قائم ہو گئے تھے۔ لیکن احرار کے بارے میں حسن ظن نے میرے ذہن میں کبھی جگہ حاصل نہ کی۔

قیام پاکستان کے بعد میرا حلقہ احباب لائل پور میں زیادہ تر احرار دوستوں کا بنا جن میں خواجہ جمال دین بٹ صاحب، مولانا عبدالغفار غزنوی مرحوم اور مولانا عبید اللہ احرار شامل تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۵۲ء کے آخر میں ان دوستوں نے ترجمان احرار روزنامہ آزاد لاہور کے لئے مجھے اغوا کر لیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے دفتر احرار کی سیرٹھیوں پر قدم رکھا۔ جہاں حضرت مجاہد الحسینی سے میرا سامنا ہوا۔ اور اس کے بعد دوسرے احرار رہنماؤں سے شرف نیاز حاصل ہوتا رہا۔

روزنامہ آزاد کی ادارت سنبھالے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے۔ ایک دوپہر میں اپنے کمرے میں بیٹھا مصروف کار تھا کہ مجاہد الحسینی صاحب زبردستی مجھے کھینچ کر دفتر سے نیچے لے گئے۔ جہاں ایک کار کھڑی تھی۔ اس کار میں حضرت امیر شریعت تشریف فرما تھے۔ میں سلام عرض کر کے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ شاہ جی کار سے نکلے۔ مجاہد صاحب نے موزوں الفاظ میں میرا تعارف کرایا۔ شاہ جی نے مصافحہ کے بعد معائنہ بھی فرمایا۔ بڑے پیار سے تھپکی دی۔ اور فی البدیہہ فرمایا۔

"اچھا تو آپ ہیں ہمارے نئے ایڈیٹر آزاد شیرازی

اگر آزاد شیرازی بدست آرد دلِ مارا  
بخالی ہندوش بنشتم سر قند و بخارا را

شاہ جی تشریف لے گئے لیکن میں اس ملاقات کا مزاکنی دن تک لوٹتا رہا۔ اور آج بھی جب کبھی شاہ جی کا تذکرہ ہوتا ہے۔ میرے سامنے اس پہلی ملاقات کا نقشہ کھینچ جاتا ہے۔

روزنامہ آزاد لاہور کی ادارت کا زمانہ میری صحافتی زندگی کا بلاشبہ سنہری دور تھا۔ مجاہد صاحب کی

برادرانہ دوستی اور دوسرے احرار رہنماؤں کی شفقت و محبت نے میرے نظریات میں اہم انقلاب پیدا کر دیا۔ لیکن

زندگی پیار کی دوچار گھڑی ہوتی ہے

چاہے تھوڑی سی ہو یہ عمر بڑی ہوتی ہے

یہ دور مختصر ثابت ہوا اور تحریک تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں آزاد پایند ہو گیا۔ شاہ جی اور دوسرے احرار رہنما اسیر ہوئے اور میں دوبارہ روزنامہ سعادت کی ادارت سنبھالنے لاکل پور پہنچ گیا۔

تحریک جلی اور ختم ہو گئی۔ مقدمات چلے اور بالآخر شاہ جی اور دوسرے رہنما رہا ہوئے جس کے فوراً بعد پیپلز کانونی لاکل پور کے وسیع میدان میں شاہ جی نے ایک عظیم اجتماع سے وہ تاریخی خطاب کیا جسے حرفِ حرف قلمبند کرنے کی سعادت راقم الحروف کو حاصل ہوئی۔ یہ خطاب شاہ جی کے علم و اجتہاد ہی نہیں، ان کے خلوص، نیک نیتی، جرأت و شجاعت کا سند بولتا ثبوت تھا۔ اور اسے سننے کے بعد شاہ جی کی ذات سے جو والہانہ عقیدت اور مجذوبانہ محبت ہوئی ہے۔ وہ ناقابل بیان ہے۔

یہی عقیدت اور محبت تین سال بعد مجھے ترجمان تحفظ ختم نبوت، روزنامہ "نوائے پاکستان" کی ادارت کے لئے لاہور کھینچ لائی۔ اور اس زمانے میں شاہ جی بیمار ہو کر لاہور میں حکیم نبی جمال سویدا صاحب کے زیر علاج حاجی دین محمد صاحب کے یہاں صیب کچ بادامی باغ میں مقیم ہوئے۔ جہاں حسن اتفاق سے بندہ پانچ برس سے مطب کر رہا ہے۔

میں روزانہ یا ہر دوسرے روز وقت نکال کر شاہ جی کی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔ جہاں جلوت و خلوت میں ان کے ارشادات عالیہ سے مستفیض ہوتا رہا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شاہ جی تہ بند باندھے ڈیوڑھی میں کرسی پر تشریف فرما ہوتے۔ درویشی و سلاطانی کو شاہ جی کی ذات میں جمع ہوتے جیسے میں نے دیکھا ہے۔ وہ احاطہ تحریر سے باہر ہے۔

شاہ جی کو میں نے جوانی میں نہیں بڑھاپے ہی میں دیکھا ہے لیکن ان کے چہرے کے نقوش، پیشانی کے نور کو دیکھتے رہنے کی خواہش ہمیشہ بیدار رہی۔ شاہ جی خاموش رہتے تو کسی قدیم یونانی فیلسوف کا مجسمہ دکھائی دیتے، بولتے تو زبان سے پھول برساتے، روتے تو آنکھوں سے خون دل بہاتے اور سکراتے تو جلیاں گزرتے تھے شاہ جی، برطانیہ میں پیدا ہوتے تو لوگ شیکسپیر کو بھول جاتے۔ ایران میں پیدا ہوتے تو بزرگمہر ہوتے۔ یونان میں پیدا ہوتے تو سقراط ہوتے لیکن وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ جہاں کے لوگ پیغمبروں کا نام تک نہیں جانتے شاہ جی پیغمبر تو بہر صورت نہ تھے۔ لوگ انہیں کیسے پہچانتے۔ انہیں کیوں یاد کریں؟ ان کا ذکر کیوں کریں؟

شاہ جی عمر بھر قرآن سناتے رہے۔ قبرستانوں میں اذانیں دیتے رہے لیکن ان مُردوں کو نہ جگا سکے، ان قبرستانوں کو زندہ نہ کر سکے اور بالآخر خود ان قبرستانوں میں جا بے ہرگز، ہمیرد آگئے۔ دیکش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام



## حضرت امیر شریعت

برادر عزیز و محترم مولانا سید عطاء الحسن بخاری سلمہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کے والد گرامی قدر اور اپنے مرشد و پیشوا حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اپنی یاداشتیں سپرد قلم کریں۔

زباں پہ بار خدا یا یہ کس کا نام آیا  
کہ میرے لفظ نے بوسے مری زباں کے لئے

قدرت نے شاہ جی کو بیشمار کمالات سے نوازا تھا۔ جس زمانے میں برصغیر ہند ان کی رہنمائی کی بلا امتیاز کے زمزموں سے گونج رہا تھا وہ دور اس خطہ ارض کا تاریخی دور تھا۔ ان دنوں زندگی کے ہر شعبے میں بلا امتیاز مذہب و ملت ایسے ایسے نابغہ روزگار لوگ موجود تھے جن پر یہ دھرتی ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ ہم بلا تامل عرض کر سکتے ہیں کہ گذشتہ ایک ہزار سال میں بیک وقت اتنے باکمال لوگ شاید ہی کہیں پیدا ہوئے ہوں مگر شاہ جی اس زمانے میں بھی سب سے انوکھے اور سب میں منفرد تھے۔ ان کو قدرت نے جس شان مبہوت و مقبولیت سے سرفراز فرمایا تھا وہ کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی۔ ہر طرف ان کے نام کا ڈنکا بجاتا تھا اور پورے ہندوستان میں ازراہ کے چاہنے والے موجود تھے۔

ہم نے ایک اچھا خاصا وقت ان کے قدموں میں رہ کر گزارا اور ان کی رفاقت میں دور دراز کا سفر کیا۔ ہم جہاں بھی گئے ان کے دیوانوں کی کچی کہیں موس نہ ہوئی۔ شاہ جی کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ کسی جھگڑا میں بھی ان کی تقریر کا اعلان ہو جاتا تو جھگڑا میں مغل کا ساں بندھ جاتا۔ وہ جس جلسہ میں شریک ہوتے وہاں کسی بھی بڑے سے بڑے خطیب اور عالم دین کا چراغ نہ جل پاتا۔ ان کا وجود ایسی شمع فروزاں کی طرح تھا جس پر نثار ہونے کے لئے پروا نے سینکڑوں میل سے کھینچے چلے آتے۔ کبھی کبھی ان کی یہ مقبولیت خود ان کے لئے پریشانی و پشیمانی کا سامان بن جاتی۔ غالباً ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے بہاولپور میں مجلس حزب اللہ اور جمعیت المسلمین کا جلسہ تھا۔ شاہ جی کے علاوہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ، موجود تھے۔ حضرت مدنی تقریر فرما رہے تھے کہ شاہ جی بھی احتراماً حضرت کا بیان سننے کے لئے جلسہ گاہ میں چلے آئے۔ آپ جو غصہ سامنے آئے لوگوں نے زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھالیا اور تقریر کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ادھر شاہ جی ضرر و ندامت کے احساس سے پانی پانی ہو رہے تھے، ادھر حضرت مدنی حیران و پریشان تھے۔ ان کے مزاج کا دھیمہ پن خاصا مشہور تھا مگر وہاں ان سے ضبط نہ ہو سکا اور غصے میں آکر فرمانے لگے کہ جن

جلسوں میں شاہ صاحب موجود ہوں وہاں ہم لوگوں کو بلا کر ہماری تعین کرانا مناسب نہیں ہے، جب شاہ جی رہائش گاہ پر واپس آئے تو کافی دیر تک فکر مندی اور دل گرفتگی کی حالت میں مہربان بیٹھے رہے۔

غالباً یہ سن بیالیس کے آخر یا تینتالیس کے ابتدائی دنوں کی بات ہے، لاہور میں آل انڈیا جمعیت العلماء کا نفرنس ہو رہی تھی۔ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد بھی خاص دعوت پر تشریف لائے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر ان کے فقید المثال استقبال کا منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ جس نشست میں حضرت امام الہند کا خطاب تھا اس میں شاہ جی بھی موجود تھے اور حضرت کی کرسی کے بالکل قریب دوڑا نو بیٹھے پورے انہماک سے تقریر سن رہے تھے۔ امام الہند کی تقریر کیا تھی، فصاحت و بلاغت کا ایک سیل رواں تھا مگر اچانک جلسہ گاہ کے مختلف حصوں سے بخاری۔ بخاری کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جب شور کچھ بڑھا تو حضرت نے اپنا بیان روک دیا اور حیرت و استعجاب کے ساتھ حاضرین کو کھٹکنے لگے۔ اتنے میں شاہ جی دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور مولانا آزاد سے عرض کیا کہ حضرت ان جاہل لوگوں کی گستاخی کی میں معافی مانگتا ہوں لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو خاموش ہو گئے۔

کمال تو یہ ہے کہ آپ کے ساتھ محبت و شفقت کی اس کیفیت میں سب لوگ یکساں مبتلا تھے اس سلسلہ میں علماء، وکلاء، تعلیم یافتہ، ان بڑھ شہری یا دیہاتی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ اس دور میں مجلس احرار اسلام کی صفوں میں خطابت کے ایسے ایسے شہسوار موجود تھے جن کی مثال ملنا ناممکن ہے۔ قاضی احسان احمد، شورش کاشمیری، مولانا گلشیر، صاحبزادہ فیض الحسن، شیخ حامد الدین کے علاوہ متعدد دوسرے رہنما تھے مگر شاہ جی کی مقبولیت کو کوئی نہ چھو سکا بلکہ یہ سب خود بھی ان کے حلقہ ارادت و محبت میں شامل تھے۔ حتیٰ کہ لاکھوں کروڑوں ہندو بھی آپ کے عقیدہ مند تھے۔ خیر پور میں ڈاکٹر رگھوناتھ رائے بہت لکھے پڑھے اور سردو گرم چشیدہ انسان تھے۔ مقامی ہندو سبھا کے جنرل سیکرٹری تھے۔ انہوں نے رات کو شاہ جی کی تقریر سنی تو اگلے روز ہم سے کہا کہ میں نے زندگی میں یہ واحد خطیب دیکھا ہے جو اپنی تقریر کے دوران پہلے خود مستی میں آتا ہے اور پھر سامعین کو مست و مینود بنا دیتا ہے۔

جب سے سابق ریاست بہاولپور کی عدالت نے مرزائیوں کو کافر قرار دیا شاہ جی بہاولپور والوں سے بہت محبت کرنے لگے۔ جلسوں میں آتے تو مزید دو تین روز کے لئے یہاں ٹھہر جاتے۔ شاہی بازار میں واقع مجلس حزب اللہ کے دفتر میں خوب محفلیں سببتیں۔ ایک دن فرمانے لگے کہ بہاولپور کے علماء خصوصاً جامعہ عباسیہ کے مدرسین چھپ چھپا کر لے آتے ہیں اور رات کی تاریکیوں کی آڑ لیتے ہیں کیا حکومت سے ڈرتے ہیں؟ ہم نے عرض کیا کہ حضرت یہ لوگ مولانا غلام محمد گھوٹوی شیخ الجامعہ سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ آپ کو پسند نہیں کرتے یہاں تک کہ مدرسین اور طلبہ کو منع کر رکھا ہے کہ وہ آپ کی تقریر بھی نہ سنا کریں بلکہ انہوں نے راقم الحروف کو جامعہ عباسیہ سے نکلنے پر اسی لئے مجبور کر دیا تھا کہ ہمارا آپ سے تعلق خاطر ہے۔ یہ سننا تھا کہ شاہ جی نے کپڑے تبدیل کئے، کلباشی ہاتھ میں لی اور جامعہ عباسیہ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم نے

راستے میں بہت روکا مگر وہ کب کسی کی ماننے والے تھے۔ جب ہم دونوں مدرسے کے صدر دروازے میں داخل ہوئے اور مدرسین و طلبہ نے دیکھا تو دنگ رہ گئے، ہمارے بعض سابق اساتذہ نے ہمیں گھور کر دیکھا اور خفگی کا اظہار کیا کہ ہم نے یہ کیا حماقت کی ہے کہ شاہ جی کو ساتھ لے کر مدرسہ میں پہنچ گئے۔ حضرت شیخ الہامہ دارالحدیث میں بڑے سے تخت پر بیٹھے طلبہ کو سبق پڑھا رہے تھے ان میں گولڑہ شریف کے موجودہ سجادہ نشین حضرت معین الدین، ان کے برادر خورد حضرت شاہ عبدالحق، ان کے ایک خدمت گار رفیق حافظ خدا بخش اور حضرت مولانا فاروق احمد کے صاحبزادے مولانا محمد احمد بھی شامل تھے کہ شاہ جی نے اچانک کمرے میں داخل ہو کر السلام علیکم کہا اور حضرت شیخ کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ جو شیخ الہامہ صاحب نے مڑ کر دیکھا بوکھلا گئے۔ جسم پر کچلی طاری ہو گئی، غصے میں صرف اتنا کہہ سکے کہ تم تم تم..... یہاں کیوں آئے ہو؟ شاہ جی نے کمال اطمینان سے جواب دیا کہ میں ان آنکھوں کو دیکھنے آیا ہوں جنہوں نے حضرت مہر علی شاہ صاحب کو دیکھا ہوا ہے۔ بس پھر کیا تھا حضرت شیخ اچھلے اور تخت سے نیچے گر کر مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ کافی دیر تک یہ کیفیت طاری رہی پھر سنبھلے اور اٹھ کر شاہ جی کا منہ جسم اور ہاتھ جو سننے لگے۔ جب انہیں کچھ قرار آیا تو شاہ جی اٹھے اور السلام علیکم کہہ کر وہاں سے روانہ ہو گئے صحن اور برآمدے میں مدرسین اور طلبہ جو اس ڈر سے سسے ہوئے تھے کہ ابھی کوئی دھماکہ ہو گا واپسی پر ہم دونوں کو ہنستا مسکراتا دیکھا تو انہیں کچھ اطمینان نصیب ہوا۔ راستے میں شاہ جی ہم سے فرمانے لگے کہ دیکھا حضرت شیخ کو کیسا تڑپایا ہے۔

یہ کم لوگوں کو علم ہو گا کہ حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی رحمۃ اللہ علیہ کو درس گاہ سے نکال کر خطابت اور سیاست کے میدان میں لانے کا سہرا بھی شاہ جی کے سر ہے ورنہ زندگی کا بیشتر حصہ انہوں نے درس و تدریس میں گزاریا۔ ابتداء میں کبھی کبھار جلسوں میں وہ مختصر خطاب کیا کرتے تھے مگر تقرر کے دوران مسلسل و متواتر احادیث پڑھنے کا انداز دیکھ کر شاہ جی نے ان سے کہا کہ آپ بیٹیک درس کا سلسلہ جاری رکھیں مگر جلسوں میں ضرور شرکت فرمایا کریں بلکہ ضلع رحیم یار خان سے جب کبھی آپکو کسی جیلے کی دعوت ملتی منتظرین کو ہدایت کرتے کہ مولانا درخواستی کو ضرور مدعو کیا جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ مستقبل میں قدرت نے ان سے جو کام لینا تھا شاہ جی کو اس کا ذریعہ بنایا۔ یہ آپکا معمول تھا کہ جب کہیں کوئی جوہر قابل دیکھتے اسے ترغیب دے دلا کر منبر کے راستے اسٹیج تک کھینچ لاسکتے۔ حضرت مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد شریف بھاولپوری اور مولانا عبدالرحمن میانوی رحمۃ اللہ علیہم کے علاوہ اور بھی کئی شخصیات تھیں جو آپ کے توسط سے شہرت و مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچیں۔ ہمیں یاد ہے جب عام خاص باغ میں منعقدہ ایک احرار کانفرنس میں شاہ جی نے خود مولانا محمد علی جالندھری کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ میں جالندھری سے ملتان کے لئے ایک ایسا تحفہ لایا ہوں جو ایک دن ملتان کی شناخت بن جائے گا۔

یہ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ ان دنوں ہم صرف نو کی درسی کتابوں کے طالب علم تھے کہ خیر پور ٹائیپوگرافی میں شاہ جی تشریف لائے۔ ساوی مسجد میں آپ نے خطبہ جمعہ دیا اور نماز کے بعد خطاب فرمایا

یہ تقریر نہ صرف خیر پور والوں کے لئے بلکہ خود شاہ جی کے لئے بھی یادگار تھی جو اس وقت ختم ہوئی کہ اگر دس پندرہ منٹ مزید جاری رہتی تو عصر کا وقت ٹل سکتا تھا۔ رہائش گاہ پر پہنچنے کے بعد ملاقاتیوں نے اس تقریر کی تعریف کی تو شاہ جی نے فرمایا کہ آج عجیب کیفیت تھی نہ صرف دل و دماغ حاضر تھے بلکہ ایک خاص قسیم کا جذبہ تھا جو بے اختیار بولنے پر مجبور کر رہا تھا۔ محترم سید غلام محی الدین شاہ صاحب ہمدانی بولے کہ حضرت اس مسجد کا سنگ بنیاد حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھا تھا اس پر شاہ جی بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ الحمد للہ ہمارے بزرگوں کی روحانی برکتیں ہم پر ہر وقت سایہ فگن ہیں۔

خیر پور کے حوالے سے یاد آیا کہ یہاں شاہ جی کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ آپ یہاں تشریف لاتے تو کوئی کئی روز تک قیام پذیر رہتے۔ راقم الحروف کے علاوہ برادر م سید عباس علی شاہ ہمدانی مرحوم، برادر م حکیم نصیر الدین اور بعض دوسرے احباب کے ہاں دعوتیں ہوتیں اور شاہ جی کی بزم آرائیاں جاری رہتیں۔ ایک مرتبہ راقم الحروف کی والدہ ماجدہ مرحومہ نے اعلیٰ درجہ کی کستوری دے کر ہمیں ہدایت کی کہ ہم شاہ جی کو پیش کریں آپ یہ تحفہ وصول کر کے بے حد خوش ہوئے۔ بار بار اس کی خوشبو سونگھتے اور سبحان اللہ پڑھتے رہے۔ آپ فرمایا کرتے کہ خوشبو میری کمزوری ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ شاہ جی کو خوشبو بہت پسند تھی اور بدبو سے اتنی نفرت تھی کہ ہلکی سی بدبو بھی خاطر پذیر ناگوار گذرتی۔ گھوڑے کی سواری بے حد پسند تھی۔ سب موسموں میں آپکو برسات کا موسم بہت پسند تھا۔ ساون ببادوں کے مینہ میں دل کھول کر نہاتے رہتے اس دوران اگر نماز کا وقت ہو جاتا تو برستے مینہ میں تہ بند کے ساتھ نماز ادا کرتے البتہ بادل کی زبردست گھن گرج اور بجلی کی چمک سے بہت ڈرتے تھے اور بجلی چمکتی اور کپکپ کر کمرے کے اندر چلے جاتے (حضور علیہ السلام بھی ایسی کیفیت میں پریشان ہو جاتے تھے اور اللہ سے رحمت کی پھلنگتے تھے) شاہ جی کی اس کمزوری کو دیکھ کر ان کے تمام دوست حیران رہ جاتے۔

شاہ جی سراپا محبت و اخلاص تھے انہیں مذہب و ملت اور رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی بھی انسان سے نفرت نہ تھی۔ فرماتے تھے کہ میں صرف انگریز اور مرزائی سے نفرت کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ہندو آپ کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ اس سلسلہ میں ایک ہندو پروفیسر سے ملاقات کا واقعہ سنئے۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مترجم قرآن مجید میں اسم "حمد" کا ترجمہ نرا دھا کر کیا ہے۔ شاہ جی فرماتے تھے کہ انہوں نے بہت جستجو کی مگر کوئی بھی اس لفظ کا مضمون نہ سمجھا سکا۔ جیل میں آپ کی ملاقات ایک ماہر لسانیات سے ہوئی وہ شخص ہندوستان کی قدیم زبانوں کا سالار تھا۔ آپ نے جب یہ سوال اس پروفیسر سے کیا تو وہ حیرت سے آپ کا منہ نکلنے لگا۔ بولا کہ آپکو یہ لفظ کہاں سے ملا۔ بہر حال پروفیسر مذکور نے وضاحت کی کہ جو اپنے کسی کام میں کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو، اور جس کی مدد کے بغیر کسی کا کوئی کام

انجام نہ پا سکے اسے نرا دھار کھتے ہیں۔ فرمایا کہ پروفیسر مذکور کے ساتھ جیل میں قید کی مدت بڑی آسانی سے کٹی کیونکہ اس کے ساتھ ہر وقت علمی ادبی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ آپ دہلی شریف لے گئے رات کو شاہی قلعہ کے سامنے جگہ گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ حاضرین و سامعین کا اتنا ہجوم تھا کہ ہم نے اس سے قبل اتنا بڑا مجمع کبھی نہ دیکھا تھا۔ یوں محسوس ہوتا کہ پورا شہر اٹھ آیا ہے۔ شاہ جی نے اپنے مخصوص انداز میں خطاب فرمایا اور دہلی والوں کے دل لوٹ لئے۔ جامع مسجد کے قریب ہی دوسری منزل پر مجلس احرار اسلام کا دفتر تھا۔ جہاں آپ کا قیام تھا۔ دن میں کسی بھی وقت روانگی تھی مگر دفتر کے نیچے چل چل گئی۔ پتہ چلا کہ محترم بیرسٹر آصف علی اور بیگم ارونا آصف علی آئے ہیں۔ دونوں پوری نیاز مندی کے ساتھ آپ سے ملے اور کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ دفتر کے انچارج میاں عبدالستار نے مہمانوں کی خود تواضع کی۔ پتہ چلا کہ رات کو دونوں میاں بیوی موٹر میں بیٹھ کر شاہ جی کی تقریر سنتے رہے تھے اور بیگم صاحبہ کی خواہش پر ملاقات کے لئے آئے تھے۔

آپ کو قدرت نے خطاب و بیان کی ایسی صلاحیتیں عطا کی تھیں کہ سامعین مسحور ہو کر رہ جاتے۔ حسن بیان کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ بہاولپور کی پرانی جامع مسجد کے صحن میں جلسہ تھا رات کو ایک گھنٹہ تک قاضی احسان احمد صاحب کا بیان ہوا علامہ انور صابری کی نظم کے بعد شاہ جی کی تقریر شروع ہوئی۔ کسی کو ہوش نہ رہا کہ کتنا وقت گذر چکا ہے کہ اچانک جامع مسجد کے مرحوم مؤذن احمد بخش کی آواز گونجی اللہ اکبر اللہ اکبر تب جا کر پتہ چلا کہ رات بیت چکی ہے۔ شاہ جی نے اپنے مخصوص لہجے میں ترنم کے ساتھ یہ شعر پڑھا

دی مؤذن نے اذان وصل کی شب پہیلی رات

ہائے کھمبنت کو کس وقت خدا یاد آیا ۔

شاہ جی اپنی تقریر کے دوران موزوں و مناسب شرعیہ موقع پر چست کرتے کہ حاضرین و سامعین بار بار فرمائش کر کے وہی شعر سنتے۔ ہمیں یاد ہے جب مجلس احرار اسلام نے برصغیر میں منعقد ہونے والے آخری عام انتخابات (۱۹۳۶ء) میں حصہ لینے کا اعلان کیا تو شاہ جی اپنی اہلیہ محترمہ کے ہمراہ جوان دنوں علیل تھیں کشمیر میں قیام فرماتے اور جماعت کے اس فیصلے سے ناراض بھی تھے۔ امرتسر مسلم لیگ کا انتخابی جلسہ ہوا جو بہت زور دار تھا۔ میاں افتخار الدین نے تقریر کی وہ اس زمانے میں کانگریس کو چھوڑ کر پنجاب مسلم لیگ کی صدارت قبول کر چکے تھے انہوں نے اپنی تقریر میں یہ الزام لگایا کہ احرار کانگریس کے تنخواہ دار ہیمنٹ ہیں۔ جن دنوں وہ صوبہ پنجاب کانگریس کے صدر تھے ان لوگوں کو اپنے ہاتھ سے تنخواہ ادا کیا کرتے تھے۔ ان کے اس الزام نے پورے شہر میں آگ لگا دی۔ گلیوں بازاروں میں چھ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ احرار رضاکار بے حد مایوس و ملول ہو چکے تھے۔ کہ شیخ حسام الدین اور مولانا مظہر علی اظہر نے آفاشورش کو کشمیر بھیجا کہ وہ

صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کر کے اور شاہ جی کو منا کر اپنے ہمراہ واپس لائیں۔ آغا صاحب شاہ جی کو واپس لانے میں کامیاب ہو گئے جماعت نے اپنا پہلا انتخابی جلسہ امرتسر میں کیا۔ شیخ صاحب نے صدارت فرمائی شاہ جی نے اس روز تاریخی تقریر کی۔ انسانوں کا شائیں مارتا ہوا سمندر جلسہ گاہ میں موجود تھا جب آپ نے میاں افتخار الدین کے الزام کا ذکر کیا تو یہ شعر پڑھا

حضرت زاہد نے سے پی کر یہ اچھی چال کی  
مختب سے جا ملے رندوں کے مخبر ہو گئے

یقین کیجئے اس شعر نے جادو کا اثر دکھایا۔ کئی غمزدہ لوگوں کی جبین نکل گئیں، کئی لوگ قہقہے لگا رہے تھے، کچھ لوگ شعر کی معنویت کی داد دے رہے تھے اور کچھ لوگ اس کے بر محل استعمال پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے تھے۔ لوگوں نے بار بار فرمائش کر کے سات مرتبہ یہ شعر پڑھوایا۔ اگلے روز میاں صاحب کے الزام کی دھجیاں بکھر چکی تھیں اور جگہ جگہ شاہ جی کی معرکتہ افلاں تقریر کے چرچے پورے تھے۔

شاہ جی کو عوام کی نفسیات کا پورا پورا ادراک تھا خود فرماتے تھے کہ میں لوگوں کی آنکھوں سے تقریر کے لئے موضوع تلاش کرتا ہوں۔ تقریر کے دوران اپنے مقربین کو اپنے سامنے بٹھاتے تھے۔ فرمایا کرتے کہ "یتلو علیم میں شامل ہو کر بیٹھو۔ تقریر سے قبل چند لمحوں تک کچھ پڑھتے پھر دائیں ہتھیلی پر پھونک کر چہرے پر ہاتھ پیرتے اس کے بعد مجمع پر نظر جو ڈالتے تو دلوں کو کھینچ لیتے ہم اور ہم جیسے آپ کے نیاز مندوں نے بہت پوچھا کہ آپ اس دوران کیا پڑھتے ہیں تو ہنس کر ٹال جاتے۔ ایک مرتبہ ہم نے کہا شاہ جی آپ پڑھتے وڑھتے کچھ بھی نہیں یہ آپکا محض نفسیاتی حربہ ہے تو مسکرا کر فرمایا تم بھی یہ حربہ استعمال کر کے دیکھ لو۔

آجکی معجزیاتی کا یہ کمال تھا کہ جس طرح کوئی شہسوار پیرے ہوئے گھوڑے کو رام کر لیتا ہے اس طرح بگڑے ہوئے مجمع کو قابو کر لیتے اور لوگوں کے دل جیت لیتے تھے۔ کھروڑ کے علاقے میں ایک قصبہ ہے رانے واہن۔ وہاں احرار کا جلسہ تھا یہ پورا علاقہ بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا علاقہ ہے اس کے قریبی مواضع میں جوئیہ برادری کی ہزاروں مربع اراضی واقع ہے۔ ان زمینداروں کو احرار کارکنوں کی یہ جرات ناگوار گزری کہ یہاں ان کی اجازت و مرضی کے بغیر جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی تقریر میں کچھ زیادہ ہی تلخی آگئی جس پر وہ لوگ پھر گئے اور جلسہ کا بائیکاٹ کر کے کچھ فاصلے پر جا کر بیٹھ گئے۔ شاہ جی نے اپنی تقریر اس تہید کے ساتھ شروع کی۔

"ہم لوگ اسلام کے چاروب کش ہیں دینی مسائل کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر جمنے والے اس گردو غبار کی صفائی ہمارا فریضہ ہے جو گناہ و معصیت یا غفلت و جہالت کی وجہ سے دلوں کو آلودہ کر دیتا ہے۔ قاضی احسان نے جذبات میں آکر عجلت سے کام لیا ہے اس لئے اس کے جھاڑو سے اٹھنے والی گرد نے آپ

کے کپڑے میلے کر دیے ہیں۔ میں تجربہ کار صفائی کنندہ ہوں پہلے پیار و محبت کے پانی سے اس مٹی کو گیلوا کروں گا، پھر جھاڑو چلوں گا انشاء اللہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔

اتنا سنا تھا کہ پھر اہوا مجمع سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا پنڈال میں آگیا۔

شاہ جی کا پیغام، پیغام محبت تھا جب کہیں ان کی تقریر کے دوران کوئی معترض بول پڑتا اور اس کا بوجھ سخت بھی ہوتا تو شاہ جی کمال شفقت و مہربانی سے پیش آتے۔ ایک مرتبہ سیلی میں آپ کی تقریر جاری تھی کہ کرم پور کا ایک کھسار جو ملک کھلاتا تھا کھڑا ہو گیا اور یہاں تک گستاخی کی کہ آپ کو دشمن رسول ﷺ کہہ دیا۔ احرار رضا کار اس پر جھپٹے مگر شاہ جی نے سختی سے روک دیا اور اسے اپنے پاس اسٹیج پر بلایا اپنی کرسی کے پاس بٹھا کر فرمایا کہ تقریر سے فارغ ہو کر آپکی بات سنو گا پھر چشم فلک نے یہ منظر دیکھا کہ وہ شاہ جی کے خطاب کے دوران بن پانی کی مچلی کی طرح ٹپ رہا تھا اور بار بار شاہ جی کے پاؤں چومنے کی کوشش کرتا۔ ہم لوگوں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھال رکھا تھا۔

سفر کے دوران بھی آپ سے کئی لوگ ٹکرائے۔ جہاں ہزاروں مسافر آپ کو گاڑی میں موجود پا کر اظہار عقیدت کیا کرتے تھے وہاں کئی مخالفوں سے بھی آمتنا سامنا ہو جاتا تھا۔ ہم نے بار بار ان لوگوں کی آنکھوں میں نفرت کے رنگ کو محبت کی قوس قزح میں بدلتے دیکھا۔ آپ نے پوری زندگی ریلوے کے تیسرے درجے میں سفر کیا عقیدت مند لوگ آپ کے لئے اونچے درجے کا ٹکٹ لے لیتے تو آپ اسے واپس کر دیتے۔ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ کراچی سے روانگی کے وقت کسی دوست نے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ ان تک کا ٹکٹ لادیا تھا مجبوراً مجھے بھی آمادہ ہونا پڑا راستے میں جہاں جہاں گاڑی رکتی پیٹ فارم پر لوگوں کو جاگ دوڑ میں مصروف دیکھتا تو ایک گونہ عجب کا احساس ہوتا کہ میں آرام سے بیٹھا ہوں اور یہ بے چارے سیٹیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ فرماتے کہ وہ دن اور آج کا دن میں نے تباہ کر لیا کہ پھر کبھی اونچے درجے میں سفر نہیں کروں گا تاکہ احساس تفاخر سے دل محفوظ رہے۔

ایک واقعہ یاد آیا کہ شاہ جی حیدر آباد سندھ سے لاہور کے لئے روانہ ہوئے ہم بھی آپکے ہمراہ تھے یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب تحریک پاکستان عروج پر تھی مسلم لیگ کے ایک سرگرم رکن اور ہمارے عزیز دوست منشی عبدالحمید مرحوم بہاولپور کے لئے رحیم یار خاں سے اسی ڈبے میں سوار ہوئے جس میں شاہ جی موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر منشی صاحب کتراتا چاہ رہے تھے کہ ہم پر ان کی نظر پڑی۔ فرماتے لجاوے ہمارے پاس آگئے۔ ہم نے حضرت سے ان کا تعارف کرایا باتوں باتوں میں منشی صاحب نے طنز کیا کہ شاہ جی آپ لوگوں نے زندگی بھر قیدیں کاٹیں مگر انگریز کو ہندوستان سے نہ نکال سکے۔ شاہ جی مسکرائے اور سودا کا یہ قلم پڑھا

سودا قمار حلق میں خسرو سے کو بکن  
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو نہ سکا





## دیاردل کی رات میں چراغ سا جلا گیا

میں پانچ چھ برس کا بچہ تھا جبکہ ان کی بھرپور جوانی تھی۔ پورا فرنگی انڈیا ان سے سمور تھا۔ ہمارے ہاں ان کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔ ضلع مظفر گڑھ میں ان کے مرید لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ میری پھوپھی نے بہت بعد میں مجھے بتلایا کہ ایک دن مشہور ہو گیا کہ امیر خریعت کو فرنگیوں کے کسی کارندے نے شہید کر دیا ہے۔ اس دن میرے والد صاحب، میاں خدا بخش ہاشمی شکار پر گئے ہوئے تھے۔ اور تو کچھ نہ سوچی میں نے اپنے والد صاحب کی تلوار اپنے کندھے پر رکھی جو میرے قد سے بھی بڑی تھی اور گھر سے باہر نکل پڑا اور زبان سے اعلان کیا کہ جس کسی نے بھی میرے بچا کو شہید کیا ہے آج میں اسے قتل کر دوں گا میری پھوپھی نے ملازمین کو کہا کہ فوراً جاؤ اور اس سے تلوار چھین کر اور پکڑ کر گھر واپس لاؤ۔ میں ابھی گھر سے کچھ فاصلے تک ہی پہنچ پایا تھا کہ وہ لوگ پہنچ گئے اور مجھے زبردستی گھر لے آئے۔ میں سارا دن روتا رہا شام کو میرے والد صاحب گھر آئے انہیں جب حقیقت حال بیان کی گئی تو انہوں نے مجھے پیار کیا۔

پھر ایک روز مجھے بتایا گیا کہ میں نے تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے گھر سے تقریباً پانچ چھ سو میل دور، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی جانا ہے ان دنوں یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ بڑے بڑے زمیندار اور پیسے والے لوگ بھی اپنے بچوں کو، صرف تعلیم کے لئے اتنی دور نہیں بھیجتے تھے۔ اور اگر بھیجتے بھی تھے تو میٹرک کے بعد۔ اور پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ تو فرنگی حکومت کے خلاف ایک ادارہ تھا۔ جہاں پنجاب کے بہت کم مسلمان زمیندار اپنے بچوں کو داخل کرانے کی حرات کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ دور و نزدیک کے لوگ آکر میرے والد صاحب کو اس کام سے منع کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر انہیں تو شاہ جی کے حکم کی پاسداری تھی۔ جنہوں نے فرمایا تھا کہ بچوں کو انگریزی حکومت کے کسی بھی ادارے میں داخل کرانے کا نتیجہ انہیں غلامی میں پختہ کرنا تھا۔ اسی بنا پر تیسری جماعت تک کتابیں میں نے ایک پرائیوٹ استاد سے پڑھیں اور پھر چوتھی جماعت میں دہلی جا کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لے لیا۔ جہاں ابتدائی مڈر سے کے استاد بھی ہائیڈ برگ، آکسفورڈ اور کولمبیا یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے اور جامعہ میں پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ خود ڈاکٹر ذاکر حسین خان جوان دنوں شیخ الجامعہ تھے اور آزادی کے بعد بھارت کے صدر منتخب ہوئے، ابتدائی مڈر سے میں چھٹی جماعت کے بچوں کو انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔

میرے جیسے اور بھی سینکڑوں ہزاروں بچوں اور ان کے والدین کو جامعہ ملیہ میں دلچسپی کی ترغیب دیتے۔ بعض لوگ بات مان لیتے اور بعض نہیں مانتے لیکن شاہ جی نے کبھی بھی جامعہ ملیہ میں جا کر وہاں کی انتظامیہ پر کوئی احسان نہ جتلیا کہ وہ ان کے لئے کچھ کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض خیر حضرات کو اس ادارے کے لئے

چندہ بھینسے کو بھی کہتے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ جامعہ والوں کو بعد میں پتہ چلتا کہ وہ رقم کس کی معرفت وہاں پہنچی تھی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری، تمام جنوبی ایشیا میں واحد عالم دین تھے جنہوں نے اپنے نام کے ساتھ نہ کبھی

مولانا کا لقب پسند کیا اور نہ ہی علامہ کا، لوگوں نے انہیں از خود امیر شریعت کا لقب دیا جبکہ انہوں نے اس لقب کو بھی اپنے نام و نمود کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ تقریر ہو یا کسی مغل میں گفتگو وہ ہر مقام پر اپنے آپ کو یا تو صرف بخاری کہتے تھے۔ اور یا پھر عطاء اللہ شاہ۔ فرنگی حکومت ہو یا ہندو کانگریس، انہوں نے کبھی بھی ان کے کسی التفات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا، یہاں تک کہ انہوں نے عوام سے بھی اپنے لئے نہ کبھی چندہ مانگا اور نہ ہی کسی وظیفے کے خواستگار ہوئے ان کی شیر جیسی سرخ آنکھیں اس دنیا میں کسی کی بھی ممنون نہیں ہوئیں۔ اور نہ ہی جھکیں، دین ہو یا دنیا، انہوں نے اپنی ہر بات پروردگار پر چھوڑ رکھی تھی اور یہ سیر اذاتی خیال ہے کہ اور تجربہ ہے کہ انہوں نے اپنے رب سے بھی کچھ مانگا تو اس کی رضا مانگی، تسلیم مانگی، اور قناعت مانگی، وگرنہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن ہمارے ہاں "قریشی مظفر گڑھ" میں تشریف فرما تھے، ان کے چند مرید بھی بیٹھے تھے کہ باتوں میں سے بات نکلی اور کہنے لگے کہ بعض اوقات میرے اوپر ایسی واردات بھی آتی ہیں کہ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اگر میں کسی دیوار کو بھی کھوں تو وہ آگے کی طرف پٹنے لگے۔

ان کی بے مثل خود داری نے انہیں قناعت عطاء کی اور اسی قناعت کی بنا پر نہ وہ کسی کے احسان مند ہوئے اور نہ ہی ممنون یہاں تک کہ جب ان کی وفات کے بعد ان کا جنازہ پڑھا جا چکا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہزاروں لوگوں نے شور مچا دیا کہ انہیں ملتان کے قلعہ کبہ پر دشمن کر کے ان کا اونچا مزار تعمیر کیا جائے۔ اس بات کے لئے بہت سے با اثر افراد جو وہاں پر موجود تھے کہنے لگے کہ وہ ابھی جا کر کشمیر ملتان سے سرکاری طور پر اجازت لے آتے ہیں لیکن ان کے صاحبزادے سید عطاء السئم ابو معاویہ مدظلہ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ان کے ابا جی نے اپنی زندگی میں کبھی بھی کوئی چیز حکومت سے نہیں مانگی اور اب ان کی رحلت کے بعد ہم انہیں سرکاری اراضی کا مہوں منت نہیں ہونے دیں گے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ تقریر کے بادشاہ تھے، اردو، پنجابی، فارسی، یہاں تک کہ عربی چاروں زبانوں کے الفاظ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہتے تھے اور وہ انہیں جس طرح چاہتے استعمال میں لاتے۔ عشاء کی نماز کے بعد جب ان کی تقریر شروع ہوتی تو صبح کی اذان ہو جاتی مگر نہ الفاظ ختم ہوتے اور نہ ہی معافی۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں ہوتے اور مسور ہو کر بیٹھے رہتے۔ شاہ جی جب چاہتے تمام اجتماع کو ہنسنا دیتے اور جب چاہتے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو کی جھڑیاں لگا دیتے۔ ان کی زبان ایک ایسی دودھاری ذوالفقار تھی کہ کاٹ کرتی تو انگریز اور ہندو، دونوں کی گردنیں اڑا دیتی اور طنز کرتی تو پانچوں کے سینوں میں اتر جاتی لطیفے بیان کرنے پر آتے تو سننے والے پہلے ہنس پڑتے اور پھر جب انہیں ان لطیفوں کی حقیقت کا علم ہوتا تو رو پڑتے۔

اور جب کسی ایسے کی داستان چھڑتے تو اس کے آخر میں کوئی ایک ایسا قدم چسپاں کر دیتے کہ لوگوں کو امید کی کرنیں دکھائی دینے لگتیں۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے اور نہ ہی اپنی قوم کو کبھی مایوسی کی طرف دھکیلنے کی کوئی کوشش کی انہیں اپنے خدا پر بھروسہ تھا۔ انہیں اپنے ہادی ﷺ پر مکمل ایمان تھا۔ صحابہ کرامؓ کے پیروکار تھے اہل بیت ازواج رسول ﷺ کی تعظیم کا انہیں پاس تھا اور اولیاء کرام کی خدمات کے پورے طرح قائل تھے وہ بدعت کو بدعت کی حد تک رکھتے اور جیسا قیام پاکستان کے بعد علماء غلو پر اتر آئے جن میں سے بعض، بدعت کی مذمت میں حد سے بڑھ گئے اور بعض دوسرے بدعت کو بدعت کہنے سے ہی انکاری ہو گئے۔ شاہ نجی نے ان دونوں کو ہمیشہ سمجھانے کی کوشش کی۔ شاہ جی فرماتے تھے کہ سب کو مل کر مرزائیت کے کفر کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کے دور میں تمام مکاتب فکر کے لوگ ان کے آگے زانوں تلخڑے کرتے۔ دیوبندی اور بریلوی جھگڑے کی جو شکل قیام پاکستان کے بعد نظر آنے لگی ہے وہ ان کے دور میں کبھی نہیں تھی۔ بلکہ میں نے اپنی آنکھوں سے بہت سارے شیعہ مسلک کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ ان کی تقریریں سنتے اور ان کی محفلوں میں آکر بیٹھتے۔

دہلی ہی کی بات ہے کہ ایک دفعہ مجھے پتہ چلا کہ شاہ جی وہاں آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں جمعہ کی چھٹی والے دن ان کے پاس پہنچ گیا۔ باتوں باتوں میں مجھے حکم فرمایا کہ کاغذ قلم سنبھالو اور جو کچھ میں کہوں لکھ کر اخبارات میں میری طرف سے بیان بھجوا دو۔ جب لکھوا کچے تو فرمایا کہ اب مجھے پڑھ کر سناؤ۔ وہاں ایک جگہ گاندھی کا لفظ تھا جس کے آگے میں نے از خود مہاتما لکھ دیا تھا۔ فرمانے لگے اسے کاٹ دو اور صرف گاندھی جی لکھو۔ یہ واقعہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انکا کانگریس کی طرف جھکاؤ ضرور تھا لیکن اتنا نہیں جتنا بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ تقسیم ہند کے فارمولے سے اختلاف اٹھا اپنا تھا نہ کہ کانگریس کی پیروی میں تھا۔

وہ تو تمام جنوبی ایشیا کے برصغیر میں وادی کشمیر سے لیکر اس کھاری تکسکھ خلیج بنگال سے لیکر ورہ خیبر تک ان کے مرید اور معتقد لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ لیکن ان کے پیروکار جتنے جنوبی پنجاب میں تھے اتنے کبھی اور نہ تھے۔ میں بچہ تھا اور میرے والد صاحب مجھے ان کے جلسوں میں اکثر ساتھ لے جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انہی تقریر ختم ہوتی تو لوگوں کا ہجوم ان کی بیعت کے لئے تیار ہو جاتا تو ان کے حکم پر لوگ اپنی پگڑیاں اتار کے ایک دوسری سے گانٹھ لیتے اور اس طرح ایک طویل قطار بن جاتی شاہ جی کلہ پڑھاتے اور لوگ ان پگڑیوں کو ہاتھ لگا کر کلے کو دہراتے اور اس طرح خوش ہو کر مرید بن جاتے۔ دور دراز کے دیہاتوں میں حضرت شاہ جی جتنا سر کنڈے کے جھوپڑوں میں رہ کر خوش ہوتے اتنا کچے مکالوں میں نہ ہوتے بلکہ ہمارے ہاں جب بھی آتے تو سر کنڈے کے ایک چھپر میں رت بچا دی جاتی، پھر اس پر پانی کا چھر کاؤ کر دیا جاتا جس سے ہاڑ کی لوبھی ٹھنڈی ہو جاتی جہاں آپ قیام فرماتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔

اب ایک آخری بات۔ گرمیوں کے دن تھے اگست کا مہینہ تھا اور سال ۱۹۶۱ء تھا۔ میں جب صبح کو جاگا تو مجھے قبلہ شاہ جی کی یاد آنے لگی۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ آج ملتان جا کر ان سے ضرور ملاقات کروں گا۔

تیار ہونے میں ذرا دیر ہو گئی۔ ان دنوں میرے پاس ایک موٹر سائیکل تھی۔ دن کے تقریباً اسی بجے میں ملتان پہنچ گیا۔ کوٹ تعلق شاہ کے پاس جب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ لوگ جوق در جوق وہاں اکٹھے ہو رہے تھے۔ مجھے ایسے لگا کہ کوئی بڑا حادثہ ہو چکا ہے۔ میں نے جب ایک راگبیر سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے میری طرف دیکھا اور بتلایا کہ آج حضرت شاہ جی انتقال فرما گئے ہیں۔ میں خوف زدہ ہو کر رہ گیا دکھ ضرور ہوا اور بہت زیادہ لیکن اطمینان اس سبب ہوا کہ آج شاہ جی نے مجھے اپنے جنازے میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر بلایا ہے۔ ان کے بڑے فرزند سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں مجھے بھی شرکت کا اعزاز نصیب ہوا یہ واقعہ میری زندگی کا ایک بیش قیمت اثاثہ ہے کیا یہ ایک ولی اللہ کی کراست تھی؟

(الاحرار لاہور، امیر شریعت نمبر اگست ۱۹۹۳ء)



شورش کاشمیری

## دور تک جرات گفتار کی بجلی کوندی

ہم نشینانِ رسالت کی دعا یاد آئی	غائب از چشم بخاری کی صدا یاد آئی
شوق پھرنے کے چلا کوچہ قاتل کی طرف	پھر کوئی بات بہ عنوانِ قصا یاد آئی
پھر کوئی شعلہ بیاں تیغ بکفت آپہنچا	پھر محمد کے گھراپنے کی صدا یاد آئی
جب کبھی اس کی خطابت کا تصور باندھا	قرن اول کے خطیبوں کی ادا یاد آئی
جب کبھی معرکہ بدر و اُحد یاد آیا	خاکِ لاہور کی گلگونہ قبا یاد آئی
جب کبھی خون شیدانِ وغا بول اٹھا	نقشِ آرائی تسلیم و رضا یاد آئی
دور تک جرات گفتار کی بجلی کوندی	دیر تک شوخیِ نقشِ کفِ پایاد آئی

شورش اس کشمکش دہر کے ویرانے میں  
ایک محبوب قلندر کی ادا یاد آئی

## شاہ جی سے وابستہ یادیں

محترم رازی پاکستانی حضرت امیرِ شریعت کے اراوت مندوں میں سے ہیں۔ اپنے زمانہ طالب علمی میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ انہوں نے شاہ جی سے آٹو گراف بھی لیا اور اس موقع پر لکھتے ہوئے شاہ جی کی تصویر بھی بنائی۔ مرحوم آغا شورش کاشمیری سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ شاہ جی کی یہی تصویر اور آٹو گراف شورش مرحوم نے شاہ جی کی سوانح حیات کے پہلے ایڈیشن میں شائع بھی کئے۔ رازی ان دنوں لندن میں مقیم ہیں۔ میرا ان سے قلمی رابطہ ہے مگر ملاقات سے محروم ہوں۔ ان کی عنایت ہے کہ میری درخواست پر ذیل کی سطور انہوں نے کلمہ بھیجیں اور شاہ جی کی وہ تصویر بھی عطا فرمائی جو ان کی ایک بیٹی گلوں فیلو نے ہانگ کانگ میں بنائی تھی۔ رازی صاحب کے شکریہ کے ساتھ ان کی تحریر قارئین کی نذر کرتا ہوں۔ (مدیر)

۱۹۵۳ء میں جب ختمِ نبوت کی تحریک زوروں پر تھی دوسرے شہروں کی طرح ہمارے شہر میانپنوں میں بھی سرِ نظر اللہ کی وزارتِ خارجہ سے سبکدوشی اور میرزائیوں کو اقلیت قرار دلوانے کے لئے جلسے، جلوس نکل رہے تھے۔ شہر کے بزرگ عالمِ دین مولانا محمد ابراہیم بگراٹوئی، چوہدری محمد طفیل شاہین (اب اسکاٹ لینڈ کی مشہور کاروباری شخصیت) اور ملک محمد منور وغیرہ گرفتار ہو چکے تھے۔ میں تو ہانگ کانگ کے لئے تیار ہی کر رہا تھا۔ کالے کے باقی ساتھی بشیر خاں کی معیت میں مختلف کالوں کی ایک انجمن بنا کر گرفتاریاں دینے کی کوشش میں تھے۔ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ (وائیں) کے ذاتی حجام کا تعلق قادیان سے تھا۔ شہر کے نوجوان طلباء اکٹھے ہو کر ان سے ختمِ نبوت کے متعلق سوال کرتے۔ انہی دنوں تھان کے تھانہ کپ میں کسی پولیس انچارج کی جلد بازی سے گولی چل گئی۔ کئی جانوں کا نقصان ہوا تو درویش شاعر ساغر صدیقی نے سرکہ الہِرا نظم لکھی۔

بیٹے کہاں ہیں میرے، تھان پوچھتا ہے؟

کیوں چھا گئے اندھیرے، تھان پوچھتا ہے؟

تب ہم شاہ جی سے ملنے تھان گئے تھے۔ میں نے اب تک ان کو دور سے دیکھا تھا بہت پہلے ان کی تقریریں خیر الدین صاحب کے سالانہ اجلاس میں والد صاحب کی معیت میں سنی تھی۔ ان دنوں اتنی سوجھ بوجھ تو نہیں تھی لیکن شاہ جی یا قاضی احسان احمد کی باتیں اچھی لگتی تھیں۔ اور آج ہم اس عظیم شخص کے ہاں بن بلائے ممان بنے بیٹھے تھے۔ اور وہ شخص زندگی بھر کے تجربے اور پوری بزرگانہ شان کے باوصف آئے سائے بیٹھے اٹھارہ بیس سال کے کھنڈر سے لڑکوں سے گھل مل کر باتیں کر رہا تھا۔ اور مختلف کالوں کے یہ طالب علم بھی شاہ جی کو اپنا سہو کر کھلی کھلی باتیں کر رہے تھے۔ اب وہ عظیم انسان ہمیں چائے پلانے پر اصرار کر رہا تھا۔ تب یوں ہی کہیں مولینا ابوالکلام آزاد کی ہمارے حلقہ و ملی جانے کا ذکر ہوا تو انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھنا تو وہ جانے شاید ہمیں میں ملتی ہو؟ اس کے بعد میں ہانگ کانگ چلا گیا۔ وہاں کبھی کبھار چینی دوستوں کے ساتھ کسی کینے میں ایسی جانے

بغیر دودھ اور شکر کے، پیٹے تو شاہ جی کی بات یاد آجاتی۔

ہیکنگ میں پاکستان کے پہلے تو فضل شیخ تاج اندین اب ہانگ کانگ میں مقیم تھے۔ ان سے مشورہ کے بعد میں نے پاکستانی سفارتخانہ کے ایک صاحب کی معرفت وہ خاص جانے شگنائی یا ہیکنگ سے منگوالی۔ پارسل سے بھیج رہا تھا کہ کامریڈ مبارک ساغر نور ابو سعید، نور ہانگ کانگ پہنچ گئے۔ وہ دفتر ”چٹان“ سے میرا ایڈریس اور فون نمبر لے آئے تھے۔ بہر حال وہ جانے شاہ جی کو پہنچ گئی۔

۱۹۵۶ء میں واپس ملک آیا تو دوستوں کے ساتھ شاہ جی کے ہاں حاضری دی۔ وہ جانے کی بات کرنے ہی لگے تھے کہ میں نے جرات سے کام لے کر کہا کہ نہ تو آپ ”اس غیر ضروری شے“ کے لئے شکر یہ ادا کریں اور نہ ہی آپ ایسے ”جفاکش انسان“ کو مولانا آزاد کی پیروی میں آئندہ کے لئے ایسے چسکوں میں پڑنا چاہیئے۔ (میں نے آغا شورش سے اتنے قریبی تعلقات کے باوجود ان کی تقریر کبھی نہیں سنی۔ لاہور میں میرا قیام ۱۹۵۶ء میں آغا صاحب کے ہاں تھا۔ وہ ہر کسی کو ”سیرا بھائی ہانگ کانگ سے آیا ہوا رازی“ سے تعارف کراتے تھے۔ ہماری یہ پہلی ملاقات تھی۔ ان کے بعد بھی خاندان سے یہ رشتہ اب تک قائم ہے) لاہور واپس آکر میں یہ بات آغا صاحب کو بتا رہا تھا تو حمید نظامی اور شیخ حامد محمود بھی وہاں بیٹھے تھے۔ شورش پوچھے تھے کہ شاہ جی نے تب کیا کہا۔ میں نے کہا کہ اس عظیم شخص کی وہی مسکراہٹ تھی۔ جس سے آپ بھی ششامہوں گے۔ (پنجابی میں کھی گئی بات سے الفاظ تو بدل ہی جاتے ہیں)

اس دن شاہ جی نے مجھے اور میرے بھائی اکرام آصفی کو بھی آٹو گراف دیئے تھے۔ اکرام کی آٹو گراف بیک پر انہوں نے یہ شعر تحریر فرمایا کہ:

کائناتوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول

پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے، کیا خوش مزاج ہے

میں نے روسی کیرد سے ان کی تصویریں بھی لی تھیں اور ان کو تو سستی سے منہ کر دیا کرتے تھے لیکن میرے ”غیر ملکی“ ہونے اور آغا شورش کی وجہ سے وہ ٹال سا گئے تھے۔ انہیں دنوں مظفر گڑھ کے ڈپٹی کمشنر مسعود کھدر پوش نے ان کی کوئی تصویر یا باتیں ٹیپ کر لی تھیں۔ شاہ جی نے اپنی باتیں ٹیپ شدہ سنیں تو میرے انداز سے کے مطابق کافی متاثر ہوئے تھے۔ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ تم بھی ایسا آکر لائے ہو؟

میں شاہ جی کو بتا رہا تھا کہ میں نے قیام پاکستان سے پہلے بارہ تیرہ سال کی عمر میں ان کی تقریریں سنی تھیں۔ اور ایک جلسہ میں انہوں نے ”کھٹاں دیاں فصلان پکیاں نیں“ کی بڑی لمبی تشریح کی تھی۔ وہ عظیم انسان شاید اس وقت کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے تم دن میں بھی ہوا اور شرارتی بھی۔ علم ختم نہیں ہوتا بہت ہی زیادہ علم حاصل کرنا۔ تم واپس لوٹو گے تو شاید ہم نہیں ہوں گے۔ لیکن جہاں کہیں بھی رہو مذہب، ملک اور قوم کو یاد رکھنا۔ اس ملاقات میں میرے کالج کے ساتھی جو محکمہ بحالیات ملتان میں متعین تھے ہمراہ تھے۔ وہ شاہ جی کو کسی بہتر علاقے میں اچھا مکان الاٹ کرنے کی خواہش دکھتے تھے۔ لیکن اشارہ بھی گئی بات کا جواب بھی نفی میں ملا تو سب غاموش ہو رہے۔ حالانکہ ملتان کے وہ چار پانچ دوست بچے مکان کو کوٹھی میں تبدیل کر سکتے تھے۔

میں نے شاہ جی سے ان کی ایک تصویر کا ذکر کیا جو ہانگ کانگ میں سیری ایک چینی کوس فیلو نے بنائی تھی۔ تو انہوں نے فارسی کا ایک مصرع کہا کہ بازی بازی ----- ترجمہ شاید ایسے تاکہ (ہم بوڑھے لوگوں کی دوا دمیوں سے کھینلو) بہر حال وہی تصویر شاہ جی کے نواسے سید محمد کفیل بخاری صاحب کو میں بھجوا چکا ہوں۔ اب تو یادیں باقی ہیں۔۔۔۔۔ جب تک زندہ ہیں شاہ جی یاد آتے رہیں گے۔

## سفیر رسالت، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

سفیر	رسالت	امیر	شریعت
خطیب	نبوت	امیر	شریعت
صدائے	حقیقت	امیر	شریعت
حروف	طریقت	امیر	شریعت
رضا کار	سلطان	ختم	نبوت
سراپا	ارادت	امیر	شریعت
رہا	فتنہ	قادیان	کے
امیر	شریعت	امیر	شریعت
جلاتا	رہا	جبر	کی آندھیوں میں
چراغ	ہدایت	امیر	شریعت
ترے	سوگ	میں چُپ	ہیں محراب و منبر
کمال	خطابت	امیر	شریعت
زباں	بندیوں میں	بھی دیتا	تھا ذوقی
اذان	صداقت	امیر	شریعت

علامہ ذوقی مظفر نگری

## قرنِ اول کے عزائم کی پکار

شاہ جی تھے قرنِ اول کے عزائم کی پکار  
عصرِ حاضر میں اساطیرِ کمن کے پاسدار  
اس گئے گزرے زمانے میں فقیرِ کج کلاہ  
جاں نثارانِ شیرِ کون و مکان کی یادگار  
کشمگانِ خنجرِ تسلیم کے سیرِ سپاہ  
غازیانِ سرِ بکت میں خوشِ نساہ و خوشِ وقار  
خواجه گیسوں کے میخانے میں رندِ لم یزل  
عرصہٴ جہاں میں پیشانیوں کے رازدار  
چال میں ان کی عزِ لہائے رواں کا زمرہ  
تال میں ان کی انیس و میر و غالب کا بھار  
ان کا اسلوبِ خطابت گویا شمشیرِ رواں  
ان کا اندازِ سخن مانندِ سحرِ آتشبار  
ان کے پرِ نغمہٴ تکلم میں رجز کا ولولہ  
دنگ رہ جاتے تھے سن کر طوطی و دراج و سار  
لاد و گل کی لبک سے تھی لب و لہجہ کی آب  
کوثر و تسنیم کی موجیں طلاق پر نثار  
خواجه کونین کی اُن پہ رہی شورشِ نگاہ  
رحمت باری سے بہرہ یاب ہے ان کا مزار!



اک بار تو لوٹ آ کہ مصائب کا سماں ہے  
دل درد میں ڈوبا ہے زباں نوہ کناں ہے  
ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں بخاری تو کہاں ہے  
اے خطہٴ فردوس کے راہی تو پلٹ آ  
رحلت پہ تری غفلتِ آہ و فغاں ہے  
آواز تو دے خانہ خرابانِ وفا کو  
اک بار تو لوٹ آ کہ مصائب کا سماں ہے  
کس حال میں ہیں پیشِ رساںِ عدم آباد  
معلوم تو ہو گا تجھے اب کون کہاں ہے؟  
ہیں نوکِ زباں کا نسیم و محمود کی باتیں  
ان میں بھی کبھی تذکرہٴ ہمِ نفساں ہے؟  
ہم نے تو جلائے ہیں چراغِ اپنے لبو سے  
لیکن یہ جہاں کارِ گہ شیشہ گراں ہے  
یہ کون اٹھا مظلِ ہستی سے عزیزو؟  
خورشید جہاں تاب بھی خونابہ فشاں ہے  
"جاتے ہوئے کھتے ہو قیامت کو ملیں گے"  
کیا خوب! قیامت کا کوئی اور نشان ہے  
اس عقدہٴ برہنچ پہ منوم ہوں شورش  
کیا چیز یہاں کشمکشِ عمرِ رواں ہے



## شاہ جی سے ایک ملاقات

اگر انسانی خواہشات کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو مشہور اور عظیم شخصیتوں سے ملنے کی خواہش ایک امتیازی مقام کی حامل نظر آئے گی۔ ہر باشعور اور صاحب ذوق آدمی چاہتا ہے کہ وہ بڑے آدمیوں سے ملاقات کرے اور اگر ملاقات کے مواقع میسر نہ آئیں تو کم از کم ان صاحب عظمت انسانوں کو ایک نظر دیکھ ہی لے۔ اس بات سے انسانی خواہشات کی عظمت ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ان اہل عظمت بزرگوں کی بڑائی جھلکتی ہے۔ جو لبیسی پروقار سیرت کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے ہیں۔

مجھے بھی حضرت شاہ جی کو زندگی میں صرف ایک دفعہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اور میں اپنے ایک دوست حافظ عبید الرحمن کے ساتھ جب شاہ جی کے مکان پر گیا تو چٹائی پر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اور شاہ جی کے ذہن مبارک سے چند کلمات کو نہایت آہستگی کے ساتھ ٹکٹے ہوئے دیکھا۔ اس وقت شاہ جی اپنے معیار کے مطابق نہ تھے اور وہ نہایت آواز کے ساتھ قاطب فرماتے تھے۔ شاہ جی کی اس حالت کو دیکھ کر مجھے محلے کے ایک شخص کے وہ الفاظ یاد آ گئے جنہیں شاہ جی کو یاد کر کے اکثر دہرایا کرتا تھا۔ الفاظ تھے۔

”کیا کوئی ماں عطاء اللہ شاہ جیسا لال جسے گی۔؟“

ہر گز نہیں!

شاہ جی نے اپنی شفیق نظروں کو میری طرف موڑا اور میرے دوست سے میرے متعلق دریافت کیا۔ اور چند لمحوں کے بعد میری حیثیت کالج کے ایک طالب علم کی سی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاہ جی کچھ طنزیہ انداز میں مجھے نشانہ ہدف بنائیں گے۔ اور مجھے انگریزی تعلیم کی علامت سمجھ کر اپنی شکایت کو الفاظ کا جامہ پہنائیں گے۔

لیکن یہ گمنام ایک خیال خام کی صورت میں میرے دماغ میں کچھ دیر جلوہ گر رہ کر اپنی موت آپ ہی مر گیا۔

مجھے مذہب سے بچپن سے ہی لگاؤ رہا ہے لیکن جب میں اپنے مذہب کی علامتوں میں وہ خصوصیات نہیں پاتا جو اسلامی تعلیمات کا نتیجہ ہونا چاہئیں تو مجھے ایک رنج اور قلق موس ہوتا ہے۔ شاہ جی سے نہ تو میں نے اپنے متعلق کوئی شکایت سنی اور نہ ہی اس رنج و قلق نے مجھ میں جنم لیا۔

دراصل عظیم انسانوں کا ظرف بہت وسیع ہوتا ہے ہر چیز کے دونوں پہلوؤں سے آگاہ ہو کر ذمہ دارانہ طریقے سے اظہار خیال کرتے ہیں اور ڈرامی دیکھ کر ”لا“ اور ڈرامی نہ دیکھ کر لمحہ نہیں پکارنے لگتے۔ وہ زندگی کے

بیچ و خم اور نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور اپنے تجربات کی بنا پر اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالیں تو وہ جواہر سے زیادہ بے بہا ہوتا ہے۔ اور شخصیات کی غیر موجودگی میں ان الفاظ ہی کو قومیں اپنے لئے قندیل راہ تصور کرتی ہیں۔ شاہ جی کے قریب بیٹھنے سے کم از کم بھرپور وہ خوف طاری نہیں ہوا تھا جو آج کل کے صاحب مذہب لوگوں کے پاس بیٹھ کر بعض حالات میں ہو جاتا ہے ان کی باتیں سکر ہی دل ان کی عظمت و شفقت کا اعتراف کر رہا تھا۔ اور مجلس میں وہ بات نظر آرہی تھی جو اقبال کے خیال میں مردِ قلندر کی بارگاہ میں اکثر ملتی ہے۔

دراصل شاہ جی کی ذات کے لوگ اتنے گرویدہ جو ہو گئے تھے اس کی ایک وجہ تو ان کی وہ خطبہانہ صلاحیتیں تھیں جن کو مذہب کی محبت نے جلانہی تھی۔ اور دوسرا وہ خلوص تھا جو شاہ جی کی زندگی کے دینی و دنیاوی معاملات میں نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے ان شعروں میں شاہ جی کی پرکشش ذات کی تصویر جھلکتی ہے۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق  
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق  
ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں  
فقط یہ بات کہ پیر مغال ہے مردِ ظہیق

پہلا مصرع ان کی تمام سیاسی زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے جو تمام تر انگریز کے خلاف گزری۔ عوامی زندگی میں جو تمام مصرع لکے حسنِ خلق کی عکاسی کرتا ہے۔  
شاہ جی کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل تھے۔ ان کی باتیں دلفریب اور نگاہیں دلنواز تھیں۔ اپنی تمام زندگی میں وہ اقبال کے اس شعر کے مصداق تھے۔

زرم دل گفتگو گرم دم جستجو  
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

قسط 60ء

مفکرِ احرار چو ہمیری افصل حق

## تاریخ احرار

پسندوں اور احرارِ جگر داروں  
کی داستانِ استقامت

بخاری اکیڈمی، میرپور کالونی، ملتان۔

## محفل بخاری کے چند لمحات

شید گنج ابھی ٹیشن عروج پر تھی۔ انگریز مجلس احرار ایسی فعال جماعت کو ہمیشہ ختم کرنے کے لئے مختلف محاذوں سے شیطنت، عیاری، اور ریشہ دوانیوں کے بم برسارہا تھا۔ مجلس احرار چاروں اطراف سے مصائب و آلام میں مبتلا تھی۔ مرکزی دفتر احرار لاہور جہاں ہزاروں روپے تبلیغ اور مقابلہ مرزائیت کی خاطر ہر وقت جمع رہتے تھے۔ وہاں ہر کارکن کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا۔

چودھری افضل حق مرحوم کی تحریک پر شاہ جی کوڈا بھیل جہاں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم خطیب تھے۔ بھیجنے کا پروگرام مرتب ہوا۔ اور شاہ جی کی معیت میں خاکسار کو جانے کا حکم ہوا۔ ڈا بھیل میں ہفتہ عشرہ قیام کے دوران خربائے سات تقریریں شاہ جی کی ہوئیں۔ اور کچھ رقم جمع ہوئی۔ واپسی پر شاہ جی امرتسر آ رہے۔ اور میں لاہور احرار کے صدر دفتر پہنچا۔ چودھری صاحب مرحوم نے دریافت فرمایا۔ کوئی چندہ ہوا۔ میں نے عرض کی ہاں لیکن وہ ٹرنک جس میں رقم تھی۔ شاہ جی امرتسر اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ مجھے وہ روپیہ لانے کے لئے امرتسر بھیجا گیا۔ شاہ جی کے گھر پہنچا۔ آواز دی۔ آواز پہنچاتے ہی اندر سے فرمانے لگے بھی جلدی آؤ۔ ہم ساری رات سوئے نہیں۔

میں نے عرض کی کیا ہوا؟ فرمایا میری بیوی کو رات خواب آیا ہے کہ ہمارے صحن میں غلاظت کا ڈھیر لگا ہوا ہے تین بجے رات سے اس وقت تک ہم میاں بیوی پریشان ہیں کہ ایسا خواب کیوں آیا۔ اور ہمارے گھر میں یہ ڈھیر کیسا؟ ایسا معلوم ہوا کہ چندہ کی رقم قوم کی امانت تھی۔ جو ہمارے گھر میں پڑی تھی۔ اسے لے جاؤ اور میری پریشانی کو دور کرو۔ چنانچہ میں رقم لے کر روانہ ہوا اور شاہ جی نے خدا کا شکر ادا کیا۔

۱۹۳۵ء میں زلزلہ سے کوئٹہ برباد ہو چکا تھا۔ تباہ شدہ، خانما برباد زخمی، بیمار مسلمان دھڑا دھڑلاہور پہنچ رہے تھے۔ شمالی ہندوستان میں مہاجرین کوئٹہ کی سب سے زیادہ موثر اور ٹھوس خدمت مجلس احرار نے کی۔ لاکھوں روپے نقد تقسیم کئے گئے۔ دہلی دروازہ کے باہر زخمیوں اور بیماروں کے لئے کیمپ کھول دیئے گئے۔ جہاں ہزاروں زخمی اور مریض ہر وقت موجود رہتے تھے بیوگان، یتیم، مفکوک الحال مسلم مہاجرین کوئٹہ کی کماحقہ خدمت کی گئی یہاں تک کہ مجلس احرار کے شدید دشمن انگریز پر بھی اس بے لوث خدمت کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس وقت کے انگریز وائسرائے نے مجلس احرار کو چشمی لکھی کہ حکومت آپ کی اس خدمت خلق سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ اس لئے مجلس احرار کے تین چار معتبرین دہلی کے قصر حکومت میں پہنچو۔ تاکہ ہم مجلس احرار کا شکریہ ادا کریں۔ اس پر فیصلہ کرنے کے لئے مجلس احرار کی میٹنگ ہوئی۔ جس میں فیصلہ کیا جانا تھا کہ وائسرائے کے پاس شکریہ وصول کرنے کے لئے کس کس صاحب کو منتخب کیا جائے۔ اتنے میں شاہ جی

تشریف لے آئے۔ بات سن کر فرمایا۔

"اللہ کا خوف کرو۔ غضب خدا کا، قوم ہماری، ملک ہمارا، خدمت ہماری اور شکر یہ ادا کرے گورنر جنرل۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ملک اور قوم کا مالک انگریز ہے۔ اور انگریز ہماری خدمت کے صلہ میں ہمارا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ یہ ظالم فرنگی بڑا چالباز ہے۔ بے ایمان ہے یہ شیطان کا بچہ۔

دوسری دنیا میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی فعال جماعت مجلس احرار بھی انگریز کو ملک کا صحیح حاکم اور مالک تصور کرتی ہے۔"

شاہ جی کی گونج سے تمام حاضرین دم بخود ہو گئے اور واسرائے کو یہ جواب دیا گیا۔ کہ ملک ہمارا ہے۔ قوم ہماری ہے جس کی ہم نے خدمت کی ہے تمہارے شکر یہ کے کیا معنی؟

شاہ جی نے فرمایا۔ "جو لوگ بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، بچے میری دعوت پر کسی تحریک یا مرحلہ میں موت کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کے خون کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں اللہ سے ان کی مغفرت کے لئے دعا کرتا ہوں..... اگر ان کا خون دشمنوں کی داستان سرائی کے مطابق رائیگاں گیا ہے تو اس کے ایک ایک قطرہ کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں نے تحریک استقلال وطن اور ناموس رسول ﷺ کی حفاظت کے لئے اتنے مسلمان مروائے اور جیل میں بھجوائے ہیں کہ ہر نقصان کی مسئولیت قبول کرتے ہوئے مجھے اطمینان ہوتا ہے۔"

کھمبہ کی ہم نشینی آوارہ کتوں کی قے چاٹنے کے برابر ہے۔

میں نے دلی کی جامع مسجد اور لاہور کی شاہی مسجد میں نماز پڑھنے سے حتی الامکان گریز ہی کیا۔ کیونکہ غلامی کے زمانے میں مجھے یہ خلش مضطرب رکھتی ہے۔ کہ آزاد انسانوں کی بنائی ہوئی سجدہ گاہوں کو اپنے غلام وجود کے سجدوں سے مجروح کیوں کروں؟ مجھ سے نہ کبھی دلی کے لال قلعہ کی بے بسی دیکھی گئی ہے اور نہ میں نے انگریزوں کے زمانہ میں لاہور کے قلعہ کو آنکھ اٹھا کر دیکھا ہے۔ ان کا اٹھا ہوا طنطنہ مجھے غلاموں کے حق میں اکثر بددعا دیتا ہوا نظر آیا ہے۔

لوگ کتابیں پڑھتے ہیں اور میں انسان پڑھتا ہوں۔ میں نے تمام عمر انسانوں کے چہرے پڑھے۔ ان کی پیشانیوں سے مضمون چنے اور ان کے کانوں میں شہد و شکر کے قطرات ٹپکائے ہیں۔ لیکن اب جی یہ چاہتا ہے کہ سنائوں میں چلا جاؤں اور وہاں اپنی لٹکار کو گونجاتا رہوں، اندھیروں میں نکل جاؤں اور وہاں اپنی آنکھوں کے نور چھڑکتا رہوں لیکن میں ان لوگوں میں عمر گزار رہا ہوں جن کے ہاں دولت کی پوجا ہوتی ہے۔ اور طاقت کو سجدے کئے جاتے ہیں۔

اگر میں زندہ رہا تو پاکستان کی سرحدیں پکار اٹھیں گی کہ..... بخاری اور اس کے سپاہیوں کو اس مٹی کے ذروں سے کہاں تک وابستگی و شیفگی ہے۔

## دیکھا تقریر کی لذت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے میری پہلی ملاقات قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں راولپنڈی مدرسہ تعلیم القرآن کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ہوئی۔ شاہ جی نے کمپنی باغ میں ایک بڑے اجتماع کو خطاب کیا۔ میں اس وقت گارڈن کالج راولپنڈی کا طالب علم تھا۔ تحریک پاکستان سے وابستگی کی وجہ سے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک مخصوص متعصبانہ نکتہ نگاہ کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچا۔ شاہ جی نے تلاوت قرآن پاک سے تقریر کا آغاز کیا۔ شاہ جی قرآن پڑھ رہے تھے، تو شور شرکاشمیری کے "بونے گل"، کے الفاظ پر یقین آیا۔

"شاہ جی کا موضوع تھا دینی مدارس اور انکی خدمات"، پہلی بار مجھے ان دینی مدارس اور علماء کی خدمات کا صمیم شعور پیدا ہوا، تقریر میں وہ جادو تھا کہ میں مسحور ہو کر رہ گیا۔ دوسری صبح شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا، موضوع سخن کے لئے میں نے جرأت کرتے ہوئے علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

شاہ جی نے اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ دین و سیاست کی جدائی کا ذکر تاریخی واقعات کی روشنی میں اس طرح کیا کہ خلافت راشدہ سے سقوط بغداد کی پوری تاریخ کا نقش آنکھوں کے سامنے کھینچ گیا۔ علامہ اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا۔ حاضرین مجلس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ بوٹھا انسان اپنے خدا کے کس قدر قریب ہے؟ اور اپنے نانا کا کس قدر وجہ حلقہ بگوش ہے۔ بچنے لگے بھائی میں نے کتابیں نہیں پڑھیں انسانوں کو پڑھا ہے۔ میں مولانا سید انور شاہ، مولانا حسین احمد مدنی، حکیم محمد اجمل، مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد کے قافلہ سے پچھڑ ہوا ایک راہی ہوں۔ جو اس بڑھاپے میں بھی منزل مقصود کی طرف چلا جا رہا ہوں۔ سب ساتھی ایک ایک کر کے چھوٹ گئے۔

۱۹۵۱ء میں احرار دفاع کانفرنس لوکارڈ میں مولانا محمد علی جالندھری کی دعوت پر شریک ہوا۔ آخری اجلاس جس کو شاہ جی نے خطاب کرنا تھا۔ مولانا محمد علی جالندھری کے حکم سے مجھے بھی تقریر کرنا پڑی۔ شاہ جی کی عظمت اور ان کی شخصیت کا رعب سامنے تھا۔ عرض کیا کہ شاہ صاحب کی موجودگی میں میرے لئے تقریر کرنا مشکل ہے۔

شاہ جی نے فرمایا۔

"بھائی میری عظمت یہ نہیں کہ اپنے بھائیوں میں خوف و ہراس پیدا کروں، میری موجودگی نے بہروں کو کان دیے۔ گونگوں کو قوت گویائی بخشی، لنگڑوں کو چلنا سکھا دیا۔ میں باعث رحمت نہیں، باعث

رحمت بنا ہوں۔ تم تقریر کرو، میں سنوں گا۔

شاہ جی کے ان الفاظ نے قوت بخشی، میں نے تقریر کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے بارہا میں بڑے بڑے معمول کو خطاب کر چکا تھا۔ گورو داسپور اور دنیا نگر کے درو دیوار آج تک گواہ ہیں کہ اس پندرہ سالہ مقرر نے دوستوں اور دشمنوں سے اپنی خطابت کی داد لی۔ لیکن اوکاڑہ کے جلسہ کی تقریر..... رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر، صمت الفاظ کا خیال رکھتے ہوئے جاری رکھی جب میں اس مقام پر پہنچا کہ۔ ۹۹۹

”یہ ملک اسلام کے لئے حاصل کیا گیا ہے، یہاں اسلام ہی ہمارا صابطہ حیات ہو گا۔ اور اسلام ہی کے لئے اس ملک کا تحفظ کرنا ہے“

دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت  
ہے ایسی تجارت میں مسلمان کا خسارہ

شاہ جی نے تقریر کی خوب داد دی۔ جنہوں نے شاہ جی کو کبھی داد دیتے دیکھا ہے وہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان کی اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اکثر کانفرنسوں میں شاہ جی کے ساتھ شریک ہوا اور خطاب کرنے کی سعادت حاصل کی۔ آج میں جب سوچتا ہوں کہ شاہ جی ایسا عظیم خطیب اور مجدد ایسے نو آموز مقرر کی تعریف، تو صیح معنوں میں ان کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرے متعلق اکثر فرماتے کہ۔

”وہ نوجوان جو جدید تعلیم سے آراستہ ہیں، اگر دین کی طرف آجائیں تو تبلیغ دین زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ ہم مولویوں نے دین کو محفوظ رکھا کیا یہی کم ہے، اب تم لوگ اسے سنبھال لو اور دور دور تک پہنچا دو؟“

۱۹۵۳ء کے بعد ناگزیر وجوہات کی بنا پر شاہ جی سے ملاقات نہ کر سکا۔ وقفہ زیادہ ہو گیا۔ اس لئے جاتے ہوئے ڈرتا کہ شاہ جی ناراض ہوں گے، نہ ملنے کا کیا جواز پیش کروں گا۔ لیکن حافظ لدھیانوی جو ان دنوں ملتان میں تھے سے معلوم ہوا کہ جب بھی میرا ذکر آیا۔ بڑے درد کے ساتھ فرماتے کہ۔

”اعجاز ایک عرصہ سے نہیں ملا۔ نہ جانے مجھ سے کیا خطا ہو گئی ہے؟“

میں شاہ جی کی خدمت سے میں حق نوازاں قر کی معیت میں حاضر خدمت ہوا۔ اس طرح پیش آئے جس طرح ایک حقیقی باپ اپنے گم شدہ بچے کو پا کر خوش ہوتا ہے۔ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن ایک جملہ ایسا نہ کہا جس سے یہ ظاہر ہو کہ میں قصور وار ہوں۔ بار بار یہ مصرعے دہراتے رہے۔

مجھ کو تو تم پسند ہو، اپنی نظر کو کیا کروں

اور یہی کہتے رہے کہ بھائی اکثر سوچتا کہ مجھ سے کیا قصور ہوا جو تم ملاقات سے گئے..... یہ بات صرف میرے ساتھ ہی مخصوص نہ تھی، بلکہ ہر ملنے والے دوست کے ساتھ ان کا یہی حسن سلوک تھا۔ دوسری طرف استغناء کا یہ عالم کہ پاکستان کے ایک سابق صدر نے اپنے زنا نہ ہدایت میں بہت کوشش کی کہ کسی طرح شاہ جی

سے ملاقات کرے۔ لیکن شاہ جی اس کے پاس جانے کو تیار نہ ہوئے اور نہ اس بات پر ہی آمادہ ہوئے کہ وہ ان کے ہاں خود آکر مل لے، فرماتے تھے۔

”مجھ فقیر سے صدر مملکت کا کیا کام ہے، اگر جماعتی بات ہے تو صدر مجلس سے کی جائے۔“

ایک دفعہ لائل پور سے چند مل والے شاہ جی سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ شاہ جی چند عام ساتھیوں سے مو گفتگو تھے۔ سلسلہ کلام جاری رہا۔ چند منٹ بعد ایک ساتھی نے کہا کہ شاہ جی یہ فلاں مل والے ہیں اور آپ سے ملنے آئے ہیں۔ ”شاہ جی نے برجستہ فرمایا کہ۔

”بھائی کسی دل والے کی بات کرو، مل والے مجھ فقیر سے کیا لینے آئے ہیں۔“

شاہ جی بعض اوقات ایک ہی جملہ میں ایسا نکتہ بیان کر جاتے جو ہزاروں تحقیقی کتابوں پر حاوی ہوتا۔ ”مل والے اور دل والے“ اس ایک جملہ میں کیا کچھ نہیں کہہ گئے۔ اسی طرح ایک دفعہ قیام پاکستان سے قبل اسلامیہ کالج کے چند طلباء شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باتوں باتوں میں ڈرامی کا ذکر آگیا۔ شاہ جی کو قسم کے ٹٹا نہ تھے۔ ایک طالب علم نے کہا:

”شاہ جی آج کل کالوں میں ڈرامی رکھنا مشکل ہے۔“

شاہ جی فرمانے لگے کہ

”ہاں بھائی! خالصہ کالج میں ڈرامی رکھنا آسان ہے اور اسلامیہ کالج میں مشکل ہے۔“

شاہ جی نے زندگی بھر کسی کی غیبت نہیں کی اور ان کا مسلک پردہ پوشی تھا۔

ایک بار شاہ جی سے ایک مشہور غزل گو شاعر عبد الحمید عدم جو لہی خراب نوشی کے لئے مشہور ہیں، مل کر گئے تو حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ:

”شاہ جی آپ تو خرابیوں کو بھی منہ لالیتے ہی۔“

شاہ جی فرمانے لگے کہ

”بھائی تم نے اے خراب پیٹے دیکھا ہے۔؟“

اس شخص نے کہا

”نہیں“

فرمانے لگے

پھر غیبت کیوں کرتے ہوں؟“

ایک دوسرے صاحب درمیان میں بول اٹھے۔

”شاہ جی میں نے اے خراب کے خٹے میں بدست دیکھا ہے۔

فرمانے لگے۔

”پھر پردہ پوشی سے کام لو۔“

ان کی باتیں دلوں میں اتر جاتیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے کیا خوب کہا ہے۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے  
بلبل چمک رہا ہے ریاض رسول میں

ہزار رحمتیں ہوں اس مرد و درویش پر..... انکے اس طرز عمل سے بہتوں نے اصطلاح پائی اور دشمن دوست بن گئے۔

شاہ جی دین و سیاست کے علاوہ شعر و ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے شعر فہمی کا جو مکمل انہیں حاصل تھا۔ وہ اکثر اہل فن کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ ایک عمدہ شعر ان پر کیفیت و سرور کی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔ بقول حافظ لدھیانوی:

"شاہ جی شعر کی دادیوں دیتے تھے کہ آنکھوں کی بناوٹ اور ہونٹوں کی سجاوٹ شعر کے حسن کا پتہ دیتی تھی، شعر کے معنی انکے چہرے پر بکھر جاتے تھے۔"

مختلف مدرسہ ہائے فکر کے شعراء کا شاہ جی سے عمر بھر گہرا رابطہ رہا۔ اختر، انبی، تاثیر، سالک، فیض، ساحر اور حافظ لدھیانوی انہی صحبت میں بیٹھنا سادات خیال کرتے تھے۔ شعراء ان کی داد کو آج تک بطور سند پیش کرتے ہیں۔ شاہ جی خود شاعر تھے ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ شعراء کا کلام اپنی تقریروں میں اس طرح استعمال کرتے، گویا یہ اشعار انہی نوک زبان تھے۔

شاہ جی کے بدترین دشمنوں کو بھی اقرار ہے کہ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ انہی وہ نسل زندہ ہے جس نے شاہ جی کی خطابت کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ انہی خطابت کا موضوع آزادی، احیائے دین اور تحفظ ختم نبوت تھا، بولتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ شاہ جہاں کے ذہن میں تاج محل کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے یا ابوالہول کی آواز اہرام مصر سے مگر رہی ہے۔ انہی موجودگی میں کسی دوسرے مقرر کا چراغ نہیں جلا، خود مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر ان کی عظمت کے معترف تھے۔ تقریر کرتے تو سارے مجمع پر چھا جاتے اور میر کے اس شعر کی مجسم تصویر بن جاتے۔

سارے عالم پر ہوں میں چایا ہوا  
مستند ہے میرا فرمایا ہوا





## کہاں سے آئیں گے ایسے خلوص کے پیکر

خالق کائنات نے بعض شخصیات کو اتنی فراواں خوبیوں سے نوازا ہوتا ہے کہ انہیں احاطہ تحریر میں لانا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی ایسی ہی نابغہ شخصیات میں سے ایک ہیں۔ مجھے آج بھی یاد آتا ہے کہ ساتھی، رفقاء، احباب اور طلبہ کس پیار سے "شاہ جی" سمجھ کر مخاطب ہوتے تھے گویا غنچہ دہن کھل اٹھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی حسین و جمیل صورت عطا کی تھی کہ گفتگو ہستی میں ایسا بکھرا ہوا پھول کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ انہیں دیکھ کر اسلاف کے بارے میں ابھرتا ہوا تصور عملی شکل دھار لیتا تھا۔ پرکشش چہرہ، خوبصورت آنکھیں اور چوڑی پیشانی وجاہت کی درخشاں مثال۔ جو دیکھتا دل کی دنیا بدلتی محسوس کرتا۔ واللہ کتنی کشش تھی انکے چہرے میں اور کتنا جاذب نظر تھا انکا عارض گلگونہ۔

میں نے انہیں اپنے طالب علمی کے زمانے میں دیکھا۔ یہ غالباً سن پچاس، باون کی بات ہے۔ میں اس وقت نویں، دسویں جماعت کا ایک طالب علم تھا۔ ایں۔ اے ہائی سکول احمد پور شرقیہ اس علاقے کی مشہور درسگاہ تھی۔ اور اس سے ملحقہ مسجد میں مولانا دوست محمد درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ہم چند مہاجر طلبہ نماز فجر کے بعد ان سے قرآن مجید کا درس لیا کرتے تھے بے حد شفیق اور مہنتی استاد ہونے کے ناطے سے مولانا ہم جیسے انگریزی پڑھنے والے طلبہ کو عربی کی تعلیم سے روشناس کرتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے ہم نے صرف پہلے دو پارے ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ ان سے پڑھے تھے۔ اس طرح ہماری ابتدائی زندگی پر اسلامی تعلیمات کے اثرات انہی کی منت سے مرسم ہوئے۔ اسی زمانے میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو قریب سے دیکھنے اور جن من موہنی باتیں سننے کا موقع ملا۔

احمد پور شرقیہ میں تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں ایک جلے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اب یہ تو یاد نہیں اس کے منصرم اور مستتم کون تھے لیکن یہ جملہ گورنمنٹ ہائی اسکول کی گراؤنڈ میں بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوا تھا۔ جلسہ عشاء کی نماز کے بعد شروع ہونا تھا چنانچہ شاہ جی اور انکے ساتھیوں کے طعام کا اہتمام مغرب کے بعد تھا۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی کا نام یاد ہے جو اس وقت شاہ جی کے ساتھ تھے باقی چار پانچ حضرات بھی شاہ جی کی مصاحبت میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ جس وقت لذت کام و دہن کے لئے شاہ جی اور انکے رفقاء بیٹھے تو بڑی پر لطف گفتگو سننا نصیب ہوئی۔ ادب کے شاہکار جملے، محبت سے لبریز چٹکے اور طامنت سے بھرے ہوئے طنزیہ ٹکاوے۔ گویا ایک دبستان کھل گیا تھا۔ ایک حسین انداز تو آج بھی میری یادوں میں محفوظ ہے۔ جس سے رسول اکرم ﷺ کی صحبت کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ سب احباب کھانا کھاتے ہوئے ہڈیاں شاہ جی کے سامنے رکھتے جاتے۔ "شاہ جی" مسکراتے ہوئے دیکھتے جاتے۔ کھانا ختم ہوا۔ سب احباب اسی شگفتہ انداز میں گویا ہوئے "ہم نے تو کچھ نہیں کھایا۔۔۔ سب کچھ تو شاہ جی نے تناول فرمایا ہے"

سبحان اللہ کیا جواب ملا۔ شاہ جی کے حسن جواب کی مثال نہیں۔ مکرانے ہوئے فرمایا "ہاں بھئی میں نے تو کہا: اکھاتے ہوئے ہڈیاں چھوڑ دیں۔ لیکن آپ سب تو ہڈیاں بھی چٹ کر گئے۔" پھر کیا تھا مصلحت زعفران بن گئی۔ کیسی پاکیزہ خست تھی۔ آج بھی وہ سماں یاد آتا ہے۔ تودل کی کھیاں کھل اٹھتی ہیں۔ مشام جاں معطر ہو جاتا ہے۔

رات کے جلنے کی ایک جھلک بھی شاہ جی کی جاودہ پائی اور عمیق نظری کی عمدہ مثال ہے۔ جو آج تک مجھے یاد ہے۔ ایک بحرِ موانع ہے۔ جو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ تلاطم خیرِ موصیٰ بلند ہوتی ہیں اور سب کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہیں۔ ابھی خلافت کے زور سے سامعینِ مسرت سے جھوم رہے ہیں تو دوسرے لمے آنکھوں سے برسات جاری ہو جاتی ہے۔ آواز کا زیر و بم ہے کہ کبھی لنگراتا ہوا کھائی دیتا ہے تو کبھی نسیمِ سحر کی طرح خرماں خرماں رواں دواں ہے۔ جلسہ گاہ میں لوگوں کا جم غفیر ہے۔ لہن داؤدی سے قرآن حکیم کی آیات سن کر مسرور ہو رہا ہے سچ پوچھیے تو فضا جھوم رہی ہے۔ کائنات دم بخود ہے۔ کہ شاہ جی ایک تمثیل بیان فرماتے ہیں۔

"ذرا اس شخص کا تصور کرو جو دن کے اس لمے میں جب مہرِ عانتاب لبِ بام ہے۔ اسکی شعائیں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ مورِ ناتواں دور سے دکھائی دیتی ہے۔ کہ شمع کو کانپتے ہاتھوں میں تارے میدان میں آنکلتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ وہ تاریکی کو دور کرنے نکلا ہے۔ اور روشنی پھیلا رہا ہے۔ آپ اس شخص کے بارے میں کیا تصور کریں گے۔"

جلسہ گاہ سے آوازیں گونجتی ہیں۔ "وہ پاگل ہے دیوانہ ہے۔ بے وقوف ہے، پاچی ہے۔"

"تو صاحبو! سن لومرزا غلام احمد قادیانی یہی کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ کون ہے؟۔۔۔۔۔"

اسکے بعد شاہ جی نے سراپا سنیرا کی آیت ہے وہ سماں باندھا کہ مجمعِ نعرہ تکبیر کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ ایسے شعلہ بیان اور آتش نوا خطیب کو دنیا کیسے بھلا سکتی ہے۔ جسکی سرطرازی کے واقعات قلب و نظر کو خیرہ کرتے تھے۔ جودلوں کی دھڑکن بن جاتا تھا۔

کہاں سے آئیں گے ایسے خلوص کے پیکر  
زباں میں جن کی محبت کی چاشنی دیکھیں

قیمت 35 روپے

چودھری افضل حق  
کی تین کتابوں کا مجموعہ

ڈرامہ

افسانہ

داستانِ دروستان

\* شعور،

\* دیہاتی رومان،

\* معشوقہ پنجاب،

بخاری اکیڈمی مہربانہ کالونی ملتان۔

## مجاہد تحفظ ختم نبوت

ہم اس غم کی ترجمانی سے قاصر ہیں۔ جو حضرت امیر شریعت مرحوم کے ابدی فراق سے ہمارے دلوں میں پیدا ہوا ہے۔ جہاں تک رشتہ و پیوند کا تعلق ہے، شاہ جی مرحوم کے افراد خانہ کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ مگر ان کی نگاہ ناز کے گھاتلوں کا شمار ممکن نہیں۔ مسلمان تو ہزار جان سے آپ کے حلقہ بگوش تھے ہی غیر مسلموں میں بھی لاکھوں آنکھیں ایسی ہوں گی۔ جو آج آپ کی وفات حسرت آیات پر خون کے آنسو رو رہی ہوں گی۔

اسے ہمارے آقا:-

دل وہ کیا جس کو نہیں تیری تمنائے وصال  
آنکھ وہ کیا جس کو تیری دید کی حسرت ہی نہیں

ہم عام لوگ جو شاہ جی مرحوم کی حسین و جمیل صورت کے شید اور صرف ان کی سربیان کے دل و جان سے قائل ہیں۔ ہماری یہ حالت ہے کہ ہم ان کی اس جدائی کو بڑی مشکل سے برداشت کر سکیں گے۔ مگر وہ حضرات جنہوں نے مجاہد ختم نبوت کو زیادہ قریب سے دیکھا، سفر و حضر اور قید و بند میں ان کی معیت کا شرف حاصل کیا۔ آج ان کے قلوب کی کیفیت کا نقشہ ہم سے مختلف ہے۔ ہمارے مخدوم و محبوب امیر شریعت حق یقین کی تمام شرائط کے ساتھ ان علمائے امت اور صلوات ملت کے سرخیل تھے۔ جن کے حق میں خاتم الانبیاء ﷺ کا ارشاد گرامی صادق آتا ہے۔ کہ

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔

سید احرار حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو ہم پیغمبر نہیں کہتے۔ اور نہ ہی حسین ابن علیؑ مانتے ہیں۔ مگر زبان مصطفیٰ ﷺ کی روشنی میں یہ بھی کہنے کا استحقاق رکھتے ہیں کہ پروردگار عالم نے جہاں باقی علماء خیر میں فکر و عمل کے لحاظ سے بنی اسرائیل کے نبیوں کی صلاحیتیں رکھیں ہیں۔ وہاں اس مجاہد ختم نبوت کو صدیقیت کے انوار، فاروقیت کی نگاہ خدا داد، عثمانی جود و سخا، اور علوی شجاعت، حسنی تدبیر اور سیاست معاویہ سے بڑی حد تک نوازا تھا ہم نہیں کہتے جائیے غیر مسلم دنیا سے پوچھئے کہ شاہ جی مرحوم لاکھوں کے مجمع میں اپنی خطابت کے سر جلال سے قلوب و ارواح کو کس قدر مسحور کر لیتے تھے۔ قرآن حکیم کی ملکوتی اور فردوسی تائیں جب سامعین پر کیف و سرور کی بارش برساتی تھیں۔ تو ان کے دل بلا امتیاز مذہب و ملت، کتاب اللہ کی الہامی عظمت سے جمو جاتے تھے۔

ہائے ہائے ۳۱ اگست کی شام۔ چھ بجکر چند منٹ پر ہم نے کیا گنوا یا؟ ہم کس رہنما کی قیادت سے ہمیشہ کے

لئے مرموم ہو گئے؟ ہم اس آسمان کے نیچے اور اس سر زمین کے اوپر اس عظیم المرتب خطیب کا بدل کب پائیں گے؟ کیا ہماری زندگی میں یا ہماری آئندہ نسلوں کے سامنے پروردگار عالم کی طرف سے کوئی انسان شاہ جی ماحسن و جمال، شاہ جی ماسر خطابت، شاہ جی سی جرات مومنانہ لے کر آئے گا؟ پھر اپنوں اور غیروں کو اپنی نگاہوں کا یوں شکار کرے گا۔ اور شاہ جی کی طرح دلوں پر حکومت کرے گا۔ یہ کچھ ایسے سوالات ہیں۔ جن کا جواب دینے سے ہم قاصر ہیں۔ بعض اوقات غم و اندوہ جنوں و دیوانگی پر منتج ہوتے ہیں۔ خدائے علیم و خبیر کو ہی خبر ہے کہ اور کتنے شاہ جی منصف شہود پر جلوہ گر ہونے والے ہیں۔ لیکن ہم اندوہ رسیدہ خیالات اور زخمی جذبات کا کیا کریں۔ پھر خیال آتا ہے کہ لاکھوں انسان ارض ہند و پاک میں اپنی زندگی کے آخری دم تک جب شاہ جی مرحوم کا خیال کریں گے تو ان کے دل میں ایک ہوک اٹھے گی۔ جو روح کو لرزہ بر اندام کرے گی، جذبات کو نشتر فرقت سے مبروح کرے گی، اور آنکھوں کو اشک ہائے عنابی سے تر کرے گی۔ اور جب ہم جلسوں میں بیٹھ کر اوروں کے منہ سے وعظ سنیں گے تو یقیناً ہم کو شاہ جی کی الہامی آواز اپنی یاد دلانے لگی۔

جب سامنے ساغر آتا ہے اک ہوک سی اٹھتی ہے دل میں  
ساقی کی ادا یاد آتی ہے مفضل کا خیال آ جاتا ہے

## ساقی کی ادا

اللہ! اللہ! شاہ جی کا وہ جلال خطابت، وہ لمن داؤدی، وہ حسن ملکوتی، وہ ہیبت غازیانہ، وہ فصاحت کی اثر آفرینی، وہ بلاغت کی دلربائی، وہ سامعین کا سراپا چشم و گوش بن کر شاہ جی کی تھاریر کا کسی کسی گھنٹے مستانہ وار جھوم جھوم کر سننا، وہ ظرافت کی چاشنی، وہ متانت کا دبدبہ، وہ تبسم و رقت کی ہم آہنگی، وہ آیات قرآنی کی شیریں تلاوت، وہ اشعار کی برجستگی اور جلال فصول کاری۔ وا خسرنا۔ وا نصیب! ہم اس حسی و حسیٰ منظر سے مرموم ہو گئے۔ گلابی چہرے پر زلفوں کی لٹک، ایک ہاتھ میں کلہاڑی، دوسرے ہاتھ کا آٹس ہاتھ پر ایک خاص انداز سے مارنا، گردن کا مہربانہ طریق سے بلانا، بیٹھے بیٹھے جوش خطابت سے کھڑے ہو جانا، ننگا سر اور گلے میں گیروی رنگ کا اسماعیلی پیر بن یا یوں کہیے۔ کعبہ شہادت کے حاجی کا جامہ احرام! زبان پر مذہب و سیاست کے نکات و حقائق اور دل میں خاتم المرسلین ﷺ کے دین کی والہانہ محبت۔ سبحان اللہ نہ حاضرین سے مرعوب نہ حکومت کا خوف۔ بلکہ سی آئی ڈی والوں کی طرف اشارہ کر کے فرمانا۔

اکثر ہم لا یعقلون۔ (اکثر کم عقل ہیں)

اور پھر نہایت اطمینان سے مسکرا دینا۔ خدا شاہد ہے کہ شاہ جی مرحوم حریت کا مجسمہ تھے۔

مردِ حر محکم زور ولا تنف  
ما بمیدان سر بیب او سر بکف

ہاں ہاں۔ اسے دورِ حاضر کے نوجوانو اور رسول ہاشمی ﷺ کی غلامی میں اپنی نجات کے متلاشیو! وہ کون تھا۔ جو

لاکھوں افراد میں بغیر تعارف سید وقائد نظر آتا تھا؟ اس کی آواز بھی شیر زیاں کی گرج تھی۔ اس کی آنکھوں میں عقاب کی نگاہوں کی چمک تھی۔ وہ زندگی کے ہر لمحے میں ناموس مصطفیٰ کی حفاظت کی خاطر ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار تھا۔ جس کا عہد شباب تا عالم کھولتے نو سال تک قید و بند میں گزارا تا کہ حضور اکرم ﷺ کی یہی زندگی کی فیروسی کا حق ادا ہو سکے۔ انگریزوں کی سنگینیں، ٹانما سازشیں، خوف و دہشت کے گھناؤنے ناحول، مخالفوں کی معاندانہ حرکات، خفتہ مسلمان قوم کی بے حسی اور بے مروتی پر جلتا، ہمراہیوں کی کس سپر سی، خود غرضوں کی منافقانہ چیرہ دستیایں اور مخلصوں کا فقدان اس کو اپنے عزم محکم سے پیچھے نہ ہٹا سکا۔ فرمایا کرتے تھے۔

قدم اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں! وہ طوفان میں ابھرنے والا وہ سیلابوں میں چلنے والا، اور چار دانگ عالم کو آگ برساتے پا کر بھی باواز بلند پکارتا رہا۔

حادثہ! کچھ بھی توقف نہ کرو آنے میں  
ہم تو تیار ہیں ہر موج طوفان کے لئے  
ساتھی سم جائے مگر وہ ان کو یہ کچھ کراہا کرتا!

موجوں سے جو کھیلنے والے ہیں وہ یہ بھی اشارہ کرتے ہیں طوفان  
ہی ڈبویا کرتے ہیں طوفان ہی ابھارا کرتے ہیں

ہم نے شاہ جی کی فطرت کو جس قدر خطر پسند پایا اس کی نظیر قرون اولیٰ کے سوا بہت کم ملتی ہے۔ ان کا ضمیر ان کو ہمیشہ ہی بکھتا رہا۔

اے ذوقِ اذیت مجھے منہ ہار میں لے چل  
سائل پہ کچھ اندازہ طوفان نہیں ہوتا

المختصر! آج ہمارے محبوب شاہ جی اپنی آخری آرام گاہ میں مواصلتِ راحت ہیں مگر ہم کو یقین کامل ہے کہ خاکِ قبرش از سن و تو زندہ تر!

آئیے۔ اب عالمِ مویّت میں آنسو بہالیں۔ اہل دل کو جتنا خاموشی سے آنسو پیئے اور بہانے میں مڑا ہے۔ باتوں میں نہیں۔



شورش کاشمیری مرحوم  
آج بھی روح بخاری یہ صدا دیتی ہے

فلاش ہیں مجھ پہ کئی سال سے اسرارِ دروں  
سوچتا ہوں کہ سیرِ عام کھوں یا نہ کھوں  
کوئی ہنگامہ بہ عنوانِ وفا ہو جائے  
کوئی ترمیم اُبھر آئے بہ عنوانِ جنوں  
کیا ضروری ہے کہ ہم بستہ زنجیر رہیں  
دن وہ آتا ہے کہ ٹوٹے گاشبِ غم کا فوں  
رات نے گاڑ کے خورشید کے سینے میں سناں  
جگمگاتے ہوئے تاروں کا اھاڑا ہے سکوں  
وہ ذرا پردہٴ تاریخ سے باہر آئیں  
جن کی یلغار سے عشاق ہوئے خوار و زبون  
جن کے چنبے اٹھے دلمانِ گل و لالہ پر  
جن کی گردن پہ ہے قربانی و لیشار کا خون  
ہم نے جو کچھ بھی کیا اس کا خلاصہ یہ ہے  
توڑ ڈالے ہیں فرنگی کی سیاست کے ستوں  
تم نے جو کچھ بھی کیا سامنے لے کر لکھو!  
ہاں! وہ افسانہٴ شب تاب ذرا میں بھی سنوں  
آج بھی روح بخاری یہ صدا دیتی ہے  
"تیز رکھو سر ہر خار کو اسے دشتِ جنوں  
شام آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد"

## درویش صفت عالم

۳۱ اگست ۱۹۶۱ء کی وہ صبح زندگی کی شام تک یاد رہے گی۔ کہ جب ایک عہد آفرین تاریخ ساز شخصیت کی المناک موت کی خبر اپنے دامن میں لئے اخبارات میں شائع ہوئی اور ملک بھر میں صفت ماتم بھج گئی۔ صدر مملکت محمد ایوب خاں سے لے کر ایک عام پاکستانی شہری تک کے دل سے غم و الم کی ٹیسیں اٹھیں۔

صبح کی نماز کے بعد سیر کر کے واپس آ رہا تھا کہ ریلوے اسٹیشن حافظ آباد کے پلیٹ فارم پر عزیز دوست فضل کریم خاں ملے۔ انہوں نے دور ہی سے مجھے دیکھ کر بے ساختہ کہا کہ مجازی صاحب آپ یہاں ہیں،

مٹان نہیں گئے۔ میں نے کہا کیوں خیر ہے؟ اور ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

خاں صاحب نے فرمایا کہ رات ریڈیو کی خبر ہے کہ تمہارے استاد حضرت شاہ جی انتقال فرما گئے ہیں۔ اور خبر سنتے ہی یہاں سے چودھری محمد شریف، سالار فتح محمد اور متعدد دوست بذریعہ ٹرک ملتان چلے گئے ہیں۔ تاکہ ملت اسلامیہ کے اس عظیم مجاہد کا آخری دیدار کر سکیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان دوستوں نے مجھے تلاش بھی کیا۔ مگر وائے بد قسمتی اس سعادت سے محروم رہا۔ جس کا مجھے آج تک سنت قلق ہے۔ میں بادیہ گریاں افسردہ و پریشان وہیں سے گھر لوٹ آیا۔ گھر والوں نے مجھ سے یہ وحشت اثر خبر سنی تو اندوہ و ملال کی تصویر بن کر رہ گئے۔ چونکہ حضرت شاہ جی کے ساتھ ہمارے جو قدیم مراسم اور تعلقات تھے وہ نہایت خلوص و محبت پر مبنی تھے۔ حضرت شاہ جی نیاز مند کے صرف مشفق استاد ہی نہ تھے۔ بلکہ والد مرحوم کے نہایت گھرے دوست تھے۔ کانوں سے خبر سنی تھی۔ مگر دل کو پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ لہذا عالم اضطرار میں بازار گیا تو لوگ تازہ اخبارات پڑھ رہے تھے۔ شہ سرخیوں کے ساتھ حضرت امیر شریعت کی الم ناک وفات کی شائع شدہ خبر عقیدت مندوں کے قلوب مجروح کر رہی تھی صبح کے آٹھ بج چکے تھے۔ ظہر تک ملتان پہنچ کر شریک جنازہ ہونے کی کوئی ممکن صورت نہ تھی۔

یہ پر ملال خبر سننے کے بعد مجھے دکان کھولنے کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ بیانی عبد الحمید نے فوراً اخبارات کی بجھنی اور اشال کو بند کر دیا۔ اور میرے ساتھ ادبی مرکز (صدر دفتر مجلس بہار سنن) میں آکر بیٹھ گئے۔ دوستوں نے سنا تو وہ میرے پاس آنے شروع ہو گئے۔ اہل محلہ اور عزیز و اقارب بھی دفتر پہنچ گئے۔ ان دنوں اردو کالج جاری تھا۔ وہ بھی بند کر دیا گیا۔ بورڈ الٹا دیے گئے۔ شام تک دعائے مغفرت اور اظہار افسوس کا سلسلہ جاری رہا۔ احباب کے ساتھ حضرت شاہ جی کے اوصاف و کمالات کے موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ انجمن صحافیوں حافظ آباد، مجلس بہار سنن اور اردو کالج کی انتظامیہ کمیٹی نے قرارداد پائے تعزیت منظور کیں۔ ان دنوں

قومی مدرسہ مسلم ہائی سکول کے ساتھ نیاز مند کاہدرے تعلق باقی تھا۔ وہاں حضرت شاہ جی کی مجاہدانہ زندگی پر محترم نور احمد صاحب، عزیزم ناصر مجازی ایم اے نے تقاریر کیں۔ اور سکول میں چھٹی کر دی گئی۔ عصر کی نماز کے بعد کمیٹی باغ حافظ آباد میں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی اور بعد ازاں عصر حاضر کے سب سے بڑے خطیب اور عاشق رسول ﷺ کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

حکیم محمد شریف مسلم، حکیم محمد ابراہیم صاحب، مولانا محمد یحییٰ محترم فیروز فتح آبادی اور نیاز مند طالب مجازی نے قافلہ سالار آزادی، شیدائی تاج و تخت ختم نبوت کے محاسن و فضائل مختصر طور پر بیان کئے۔ سارے دن کی مصروفیات کے بعد جب رات کو تنہائی ہوئی تو اس وقت طبیعت کا عجیب عالم تھا۔ عالم تصور میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک پانچ چھ سالہ بچہ ہوں۔ اور اماں جی (حضرت شاہ جی کی اہلیہ محترمہ) اللہ تعالیٰ آپ کی عظمت و تقدیس میں بیش از بیش اضافہ فرمائے۔ "کی خدمت اقدس میں دورا نوید تھا۔ بندادی قاعدہ پڑھ رہا ہوں اور حضرت شاہ جی باہر سے کشریف لاتے ہیں۔ مجھے اور میرے ہم سبق بچوں کو دیکھ کر زیر لب مسکرائے اور پھر فرمایا۔ کہ تم سب نے سبق یاد کر لیا ہے۔ کہ میں آؤں۔ اور پھر قاعدہ لے کر ہمارے ساتھ بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میری آواز کے ساتھ آواز ملا کر پڑھو۔ محترمہ اماں جی کبھی ہمیں دیکھ کر مسکراتیں اور کبھی شاہ جی کو دیکھتیں۔ اتنے میں شاہ جی فرماتے کہ بھئی جلدی جلدی کرو۔ پھر یہ (شکر چڑھے چنے یا مسٹائی کی طرف اشارہ کر کے) کھائیں گے۔ سارے بچے اونچی اونچی آواز میں تیزی کے ساتھ سبق یاد کرنا شروع کر دیتے اسی عالم استغراق میں چشم تصور نے دیکھا کہ حضرت شاہ جی ان چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ جو اماں جی سے قاعدہ، پہلا دوسرا پارہ پڑھ رہی ہوتیں۔ پاؤں کے سہارے بیٹھ کر کھلی کامعروف کھیل کھیل رہے ہیں۔

کھلی کلیر دی۔ یک میرے وردی

استغراق کے بعد میں رات گئے تک سوچتا رہا۔ شاہ جی کتنے عظیم انسان تھے۔ انگریز کے عہد غلامی میں اس قدر جامع کمالات انسان کا پیدا ہونا معجزہ سے کم نہیں۔

شاہ جی کے گھر سے جانے کتنے گھروں میں قرآن کریم کی مقدس تعلیمات کا فیض پہنچا۔ اور جس محنت و خلوص اور نفسیاتی اسلوب سے شوخ، ضدی اور کند ذہن بچوں کو آپ کے طریق تدریس اور مشفقانہ انداز سے قرآنی فیوض و برکات سے بہرہ یاب کیا ہے۔ آج کے مادی دور میں اس کی مثال ملنی دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ آپ کے شاگردوں میں سے کئی ادیب بنے کئی خطیب۔ بی شمار اونچے اونچے مناصب تک پہنچے متعدد تجارت و صنعت کی شاہراہوں پر چلے گئے۔ آپ نے اس فقیرانہ عالم میں زندگی کا سفر طے کیا جو اہل اللہ کا گھر امتیاز ہے۔ آپ فقر و استغناء اور عشق رسول ﷺ کی دولت لئے ہوئے خدائے بزرگ و برتر کے حضور میں پہنچ گئے۔



## قافلہ سالار خطابت

رات کے دو بج چکے تھے۔ کافی ہاؤس میں ابھی زندگی کی ہما بھی جاری تھی۔ فٹ پاتھ پر کرسیاں بچھائے کچھ لوگ مذہبی مسئلوں پر بحث کر رہے تھے۔ گیلری میں چند صحافی صبح کی خبروں پر تبصرہ کرنے میں مصروف تھے۔ جوہنی میں کافی ہاؤس میں داخل ہوا میری نظر میز پر پڑے ہوئے ایک مقامی اخبار پر جا پڑی۔

پہلی خبر جس پر میری توجہ منعطف ہوئی "اسیر شریعت کی موت" کی خبر تھی۔ میں اخبار لے کر ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ اور زندگی کے تلخ حقائق کے متعلق سوچنے لگا۔ ذہن کے پردے پر یادوں کے دھندلے سے نقوش ابھرنے لگے۔ اپنے مکان کی چھت پر "سرخ پھریرے" کا ہلکا سا کھس دکھائی دیا اور پھر اپنے بچپن کی وہ گھڑیاں یاد آنے لگیں۔ جب احرار رضا کاروں کے ساتھ قدم ملانے کی سعی کیا کرتا تھا۔

احرار کے اس بوڑھے جرنیل سے میری عقیدت قدرتی تھی۔ اس میں نہ کسی بڑے فلسفہ داں کو دخل ہے نہ کسی مذہبی آمر کو۔ اور میری اس عقیدت کو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی مجھ سے نہیں چھین سکتی۔

۱۹۴۹ء میں مجاہدین اسلام کی اٹھنے والی تحریکیں جنہوں نے برطانوی سامراج سے ٹکری۔ ان میں شاہ جی پیش پیش تھے۔ اور پھر جب احرار رضا کار برطانوی استعمار سے ٹکرائے۔ تو وہ

نغمہ حب وطن سولی پہ گایا جائے گا!

کی زندہ تصویر تھے۔

حتیٰ کہ جب ۱۹۴۷ء کا آختاب نصف النہار پر پہنچا تو ہندوستان سے برطانوی استعمار کا سورج غروب ہو گیا۔ شہنشاہیت کے ان حامیوں کو جن کا سورج روئے زمین پر غروب نہیں ہوتا تھا۔ اپنے چھوٹے سے ملک میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔

برطانوی سامراج کی لعنت ہندوستان سے ختم کرنے میں شاہ جی کا کردار سب سے نمایاں ہے۔ اور ان کے اس کردار کی بدولت ہر شخص غیر متعصبانہ طور پر یہ شعر پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کچھ ایسے لوگ بھی اس جہاں میں ہوتے ہیں

ستارے ٹوٹتے ہیں جن کی جستجو کے لئے

شاہ جی اگر چاہتے تو خدا ان ملک و ملت کی طرح جاگیروں کے مالک بن سکتے تھے۔ مگر میری قوم کے اس مجاہد نے ضمیر کے خلاف کام کرنے میں عار مموس کی۔ ضمیر کی موت انسانیت کی موت ہوتی ہے۔ پٹنا نچے اس نے قوم کو گرداب میں پھنسی ہوئی کشتی کو کنارے پر لانے کی جدوجہد کی اور اس میں وہ کافی سے زیادہ

کامیاب بھی رہا۔

دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں جمال الدین افغانی کے بعد صحیح معنوں میں ایک ہی مجاہد تھا جو برطانوی استعمار سے ٹکرایا۔

شاہ جی کی سب سے پہلی تقریر میں نے دعویٰ گھاٹ لالپور کے وسیع پنڈال میں سنی تھی۔ اس وقت شاہ جی کافی سن رسیدہ تھے۔ اس کے برعکس خطابت میں وہی بجلی کی سی تیزی موجود تھی۔ آپ گزشتہ نصف صدی کی تاریخ دہرا رہے تھے۔ ہنسانے پر آتے تو گھنٹوں ہنساتے رہتے۔ اور جب آپ گزشتہ ٹوٹے ہوئے برہمن کے تاروں کو چھیرٹے تو سامعین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ اور ان کی نظروں کے سامنے پانچ دریاؤں کی پاک سرزمین آ جاتی جس پر کبھی ہندوستان کے راجے ہیروں کی یاد میں بنسری کی لے پر، ہجرو وصال کے نغمے چھیر کر رہے تھے۔

شاہ جی متعدد بار گرفتار ہوئے اور جیل پہنچے۔ جیل میں بھی اپنے مقصد کو نہ بھولتے بلکہ قیدیوں کو توحید و رسالت کا سبق دیتے رہے۔ آپ کی باغ و بہار طبیعت جیل کو گلستان بنا دیتی۔ ادنیٰ، ثقافتی، سیاسی مضامین جتیں۔ مشاعرے ہوتے۔ قوالیاں ہوتیں اور جیل کی زندگی کا طویل عرصہ گزارتے ہوئے تکلیف مموس نہ ہوتی۔ اور جب آپ رہا ہو کر آتے تو اکثر لوگ آپ کو یاد کرتے رہ جاتے۔ جس نے ایک دفعہ بھی آپ سے ملاقات کی وہ آپ کا گرویدہ ہو کر آپ کی شخصیت و کردار سے بے حد متاثر ہوتا۔ اور ہمیشہ کے لئے آپ ہی کا ہو کر رہ جاتا۔

آپ خود کہتے تھے:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنئیے گا  
کہتے کسی کو سنئیے گا تو در تک سر دھنیے گا

اور ان کے اس قسم کے الفاظ میرے ذہن کو اتنا غم کی گھرائیوں میں پھینک دیے ہیں کہ آہ اب یہ مردِ مجاہد ہم سے ہمیشہ کے لئے پھر چھڑ جائے گا۔

اور پھر سوچتا ہوں کہ قدرت کا یہی قانون ہے اور ازل سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ بڑے لوگ اپنی یادوں اور اپنے عقیدت مندوں کو روتا ہوا جھوٹ جاتے ہیں۔ مگر پھر دوسرا خیال آتا تھا کہ احرار کا یہ بورٹھا جرنیل ابھی ہمیں روتا ہوا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ قدرت اتنی ستم گر نہیں کہ ابھی ہم سے اس مجاہد کو چھین لے۔

شاہ جی نے کہا تھا دنیا میں مجھے ایک چیز سے محبت ہے وہ ہے قرآن اور دنیا میں مجھے ایک چیز سے نفرت ہے وہ ہے انگریز۔

شاہ جی اپنے اس قول کو صداقت میں انگریز کے مظالم سے نہیں ڈرے۔ بلکہ بھانگ دہل اس کے خلاف میدان جنگ میں آئے۔ جسے دنیا متحیر ہو کر دیکھتی رہ گئی۔ ایسا مجاہد ہم سے ہمیشہ کے لئے نہیں چھین سکتا۔ کہ ہم اس کے خلاف کو جہاں بھی ابھرتا ہوا مموس کریں اس کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ حتیٰ کہ انسان کو

اس تاریکی سے روشنی میں لے آئیں۔ وہ روشنی جو کہ سرکارِ مدینہ کے سبز گنبد سے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کے سینوں میں اجالا کئے ہوئے ہے۔

کا دیانیت ہمیشہ سے شاہ جی کا محبوب موضوع رہا ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر آپ اس فتنے کے خلاف لڑے ہیں۔ یہ فتنہ جس کا پودا انگریز کے ایماء پر ہندوستان کی سرزمین پر اس لئے بویا گیا تھا تاکہ ہندوستان کا مسلمان متحد نہ ہو سکے۔

شاہ جی کو رسول اکرم ﷺ اور قرآن سے بے پناہ عشق تھا اس لئے انہوں نے ختم نبوت کی تحریک کو شروع کیا آج انہیں ہم سے جدا ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے مگر لگتا ہے وہ جیسے جلسہ عام سے اب بھی خطاب فرما رہے ہیں۔ مگر نہیں یہ میرا وہم ہے۔ ایسے لوگ دوبارہ نہیں آتے۔

### سوزِ دروں

آنا شورش کا شیریں مرحوم

کہاں سوزِ دروں اس کا کہاں عشقِ جواں اس کا  
 خطابت کے نگر میں اب کوئی ثانی کہاں اس کا  
 نہ اٹھ پھر کوئی ایسا مقرر اس گلستاں سے  
 فضا میں مرعش ہے آج تک حسنِ بیاں اس کا  
 گزرتا ہی رہا دار و رسن کی شاہراہوں سے  
 خدائے ذوالنن تھا ہر ڈگر پر پاساں اس کا  
 جبیں اسکی درخشاں ہی رہی ہر آزمائش میں  
 لیا گردوںِ گرداں نے ہمیشہ استمال اس کا  
 دماغ و دل کے ویرانوں سے اکثر ہوک اٹھتی ہے  
 کوئی باقی نہیں اب اس چمن میں رازداں اس کا  
 وہ رخصت ہو گیا تو اک خلاِ موس ہوتا ہے  
 ہر اک سینے سے اب مفقود ہے سوزِ نہاں اس کا  
 سیاسی زلزلوں کی رو میں سینہ تان کر ٹھلا  
 رہا برقِ تپاں کی زد میں اکثر آشیاں اس کا  
 خطبہاں جہان نو سے استفسار کرتا ہوں  
 کوئی مردِ خدا ہے اس فضا میں ترجمان اس کا  
 وہ جس مقصد کی خاطر عمر بھر کوشاں رہا شورش  
 گزشتہ سال اس منزل کو پہنچا کارواں اس کا

## امیر شریعت سے۔!

آزاد شیعری

عاشقِ حُسنِ ازل! آگاہِ اسرارِ حیات      السلام اے قافلہ سالارِ احرارِ حیات

جانشینِ بوذرْ و سلمانِ تیری ذاتِ تمی      ذاتِ تیری منبعِ انوارِ صدِ برکاتِ تمی

عمر بھر آواز کا جادو جگاتا ہی رہا      اک سیما تھا جو مُردوں کو جلاتا ہی رہا

دلغ وہ تو نے جدائی کا دیا احرار کو      ڈھونڈتی ہے قوم اپنے قافلہ سالار کو

ڈھونڈتے پھرتے ہیں تمہ کو تیرے پروانے یہاں      کُوی بتلا تمہ کو پائین تیرے دیوانے کہاں

تیرے دستِ خصال کے جو لوگ ریزہ چھین تھے      یاد جن لوگوں کو تیرے دیں کے آئین تھے

تیری تربت کے مجاورین گئے یا گور کن      بیچ ہی ڈالیں نہ یہ اکبہ دلہ ترا گورو کن

ان کے ذہنوں پر مسلط ایسی بے ہوشی ہوئی      خود فراموشی کے بدلے حق فراموشی ہوئی

دیدہ بیدار ہیں وہ یا ہمہ تن گوش ہیں      بند ہیں ان کی زبانیں اور لب خاموش ہیں

ان زبانوں کو خدا را! قوتِ گفتار دے

حضر جو کر دے بپا۔ وہ جذبہ احرار دے

## گا ہے گا ہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک جماعت حزب الاحناف قائم تھی جسکے صدر جناب نواب سیف اللہ خان خواجگرنی مرحوم نہایت ہی نیک سیرت انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت فرمائے۔ انہوں نے شہر میں منادی کرادی کہ ڈیرہ اسماعیل خان میں حزب الاحناف کی طرف سے ایک جلسہ میدانِ جمال میں منعقد ہوگا جس میں بطلِ حریت امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر زیندار اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اپنے اپنے خیالات سے سامعین کو مظلوظہ فہمائیں گے۔ چونکہ یہ واقعہ دورِ برطانیہ کا تھا۔ اور اس وقت ڈیرہ اسماعیل خان میں ڈپٹی کمشنر جان بل انگریز تھا اور سپرنٹنڈنٹ پولیس ڈانڈلے بھی انگریز تھا۔ جوں ہی اس منادی کی خفیہ پولیس نے ان کو اطلاع دی تو جان بل ڈپٹی سی نے ڈانڈلے ایس پی کو حکم دیا کہ ان سب کو دریاخان میں روک دیا جائے۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں انہیں داخل نہ ہونے دیں۔ چنانچہ ڈانڈلے ایس پی نے ڈپٹی ایس پی جگنا نام گلی مست خان آفریدی تھا۔ اسے حکم دیا کہ تو اور غلام حسین خان بلبل پنجاب فوراً دونوں دریاخان چلے جاؤ اور جو نیسی یہ ریل سے اتریں تو ان سے کہو کہ تم سب کا داخہ ڈیرہ اسماعیل خان بند ہے۔ اور ان سے دستخط کراؤ۔ چنانچہ ڈیرہ شہر سے تمام مسلم، ہندو، سکھ، عیسائی وغیرہ منادی سی کر دریاخان پہنچ گئے کہ ایسے معتبر ممانوں کا شاندار استقبال کر کے انہیں شہر ڈیرہ لایا جائیگا۔ اور گل مست خان ڈپٹی۔ ایس۔ پی۔ بلبل پنجاب غلام حسین خان پہنچ گئے۔ جو نیسی یہ ممان لیڈر حضرات ریل گاڑی سے اترے تو گل مست خان اور بلبل پنجاب نے گل مست خان کو حکم ڈی۔ سی اور ایس پی کا حکم سنایا اور دستخط لینے کے لئے آگے بڑھے تو حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نور اللہ مرقدہ نے کہا لاؤ حکم..... یہ میں نے سب کی طرف سے دستخط کر دیے۔ جاؤ ہم ڈیرہ اسماعیل خان نہیں آئینگے۔ اور نواب صاحب سے کہا نواب صاحب ڈیرہ میں منادی کراؤ کہ جو اجلاس ڈیرہ میں ہونا تھا۔ اب دریاخان ہوگا۔ اور اجلاس ہو کر رہے گا۔ چنانچہ دریاخان میں یوں سمجھئے کہ ڈیرہ اسماعیل خان شہر کے علاوہ گردو نواح کے لوگ بھی نہایت کثیر تعداد میں پہنچ گئے۔ اس زمانے بجلی ابھی نہیں آئی تھی اور آئیشیوں پر گیس جلانے جاتے تھے۔ جنہیں زنجیر کے ذریعہ اوپر لے جایا جاتا تا کہ روشنی ہر طرف پھیلتی رہی۔ دریاخان شیشیں پر دونوں طرف سے گاڑیوں میں سوار اکثر لوگ اتر آئے کہ یہ عظیم الشان اجلاس سی کر جائیں۔ چنانچہ سب سے پہلے مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر زیندار جو فی البدیہہ اشعار کہنے میں یکتائے روزگار تھے۔ انہوں نے موقعہ کی مناسبت سے یہ اشعار پڑھے۔

اٹک کی موج کی مے گونیاں دیکھ  
 ہیں دریا خان ببل مست و گل مست  
 چڑھا ہے نشہ سیف اللہ خان کو  
 ظفر مست بخاری مست و گل مست  
 چائینگے انہیں گنگنی کا ہم ناچ  
 کریچ رقص ہو کر جان بل مست  
 ہلاینگے مسیت کی بنیاد  
 اگر اس بات پر چائینگے نل مست  
 الہی خانہ انگریز گر جا  
 چائینگے لب دریا یہ نل مست

اس کے بعد جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی شیخ پر تشریف لائے اور اس جوش سے  
 تقریر فرمائی جیسے برطانیہ پر گولہ باری ہو رہی ہو۔ ان کے بعد مولانا حفظ الرحمن وقت کی نزاکت کے پیش نظر  
 مختصر مگر دلپذیر تقریر فرما کر بیٹھ گئے۔ اب حضرت امیر شریعت لٹھے اور اٹھتے ہی الحمد للہ کے خطبہ مسنونہ سے  
 حاضرین کو تڑپا دیا ریلوے لائنوں کے دونوں طرف کی سواریاں شاد جی کی تقریر دلپذیر سننے کو اتر آئیں جہاں  
 تک نظر کام کرتی تھی پہلک ہی پہلک نظر آتی تھی سبحان اللہ شاد جی کی جوانی، سیاد گھنگریالے بال، روشن  
 آنکھیں دیکھنے والے سننے والے مبسوت تھے اور کسی کو ہوش تک نہ تھا حتیٰ کہ صبح کی اذان گونجی اور شاد جی نے  
 فرمایا

ذرہ شہرنا مؤذن میرا دل لرز رہا ہے  
 کہیں کعبہ گر نہ جائے تری مستی اذان سے

اس شعر کے بعد فرمایا کہ حضرات اب یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلایا آگیا ہے۔ اور اب میں بھی مجبور  
 ہوں ورنہ آپکو معلوم ہونا چاہیے کہ بخاری کا بخارا بھی ٹکڑا نہیں تھا۔  
 افسوس کہ ایسی نعمت عظمیٰ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بخشی تھی مگر ہم اس کی قدر نہ کر سکے۔



## شبِ سیاہِ غلامی میں نور کی قندیل

برصغیر کے ایک بہت بڑے مستغرب نے ایک بار آخرت کے لئے اپنے زاوراہ کے بارے میں کہا۔ "جب اللہ مجھ سے یہ پوچھے گا کہ دنیا میں آخرت کے لئے کیا سامان کیا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مددس حالی (مدو جزر اسلام) لکھوا کر لایا ہوں" مدو جزر اسلام کا اسم بامعنی ہونا قطعاً لاریب ہے۔ لیکن اگر یہی سوال مجھ سے ہوا تو میرا جواب یہ ہوگا۔ "اے اللہ میں نے شاہ جی کی صحبت اگرچہ نہیں پائی لیکن ان کے مشن کو حق سمجھا۔ ان کے افکار پر غور و فکر اور ان کے ارشادات پر عمل کرنے میں لپسی سی سسی ضرور کی۔"

یہ تقریباً ساٹھ برس اوچر کی ایک بہت خاموش وسطِ شب کا واقعہ ہے کہ فضاء اچانک لعرہ ہانے تکبیر فلک صافات صدائوں سے لرزاٹھی۔ پیر اہل لاہور نے دس ہزار افراد کے ایک ہجوم کو باطنان پورہ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اسی ہجوم پر ایک نظر ڈالنے سے گٹھ جھمکتی ہوئی، بڑی برسی آسمانوں، سرخ و سفید نورانی چہرہ، لنگی ڈاڑھی، اور لمبے بالوں والے ایک کھدر پوش بزرگ پر جا کر رک جاتی تھی۔ یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے جو ابھی چار گھنٹے قبل نماز عشاء پڑھانے کے بعد لوگوں سے چند باتیں کہنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ تھوڑے سے لوگ ایک بڑے مجمع میں بدل گئے۔ بات انجینئرنگ کالج لاہور کے پرنسپل سے متعلق تھی۔ جس پر الزام تھا کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عالی میں گستاخی کا مرتکب ہوا ہے۔ پرنسپل کی اس مذموم حرکت پر چند غیور مسلمان طبع مشتعل ہو گئے۔ اور اس اشتعال نے بڑھتے بڑھتے چند ہی روز میں ایک بڑی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ جس کی قیادت کی پاداش میں مولانا احمد علی لاہوری، اور مولانا داؤد غزنوی کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ یہ رات کے کوئی ایک بجے کا عمل ہوگا۔ جب ناموس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر ایک مدلل اور متنوع تقریر لوگوں کو تڑپا رہی تھی۔ پھر ایک مجمع اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ طے یہ پایا تھا کہ نماز فجر کالج کے سامنے ادا کی جائے اور وہیں سے ناموس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے اپنا فرض ادا کرنے کا آغاز کیا جائے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ انسانوں کے اس ٹٹاٹٹیں مارتے سمندر میں کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جس کے قدم انجینئرنگ کالج کی بجائے اپنے گھر کی طرف اٹھے ہوں۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری جنہیں چاہنے والے شاہ جی اور سامنے والے مجددِ خطابت، سلطانِ الشکلیں، امامِ المجاہدین، سید الاحرار اور موسسِ تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کہتے تھے۔ یکم ربیع الاول (یعنی چاند رات) ۱۳۱۰ھ مطابق ۲۳ ستمبر ۱۸۹۴ء کو جمعہ کی سمر ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ دھیال سے عطاء اللہ اور نخیال سے شہر الدین احمد نام تجویز ہوا۔ والد گرامی کا نام سید ضیاء الدین اور دادا کا نام سید نور الدین شاہ تھا۔ نسب نامہ چھتیسویں پشت میں حضرت سیدنا حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ سے جاتا ہے۔ آپ کے خلع الرشید حضرت سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری مدظلہ، العالی کی تالیف "سواطع الانام" کے مطابق آپ کے

خاندان میں سید اللویاء حضرت سید عبدالقادر جیلانی اور سید محمد شاہ جیسے جلیل القدر بزرگ ہو گزرے ہیں۔ ایک اور خاندان سید بزرگ سید عبدالرسول تھے۔ جن کے بارے میں مؤرخ شمس الدین محمد دین فوق نے لکھا ہے۔ "تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ مرغی کا انڈہ اور مرغی صرف اس لئے نہیں کھاتے تھے کہ یہ دانہ دیکھا لوگوں کے گھروں میں بھی جا کر کھالیا کرتے ہیں" شاہ جی کی والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ اندرابی کا شجرہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے جاملتا ہے۔

۱۹۱۴ء تک آپ نے قرآن پاک کے حفظ کے ساتھ ساتھ صرف و نحو اور فقہ کی بعض کتب کی تعلیم مکمل کی۔ اسی سال آپ کا عقد آپ کے والد کے چچیرے بھائی سید مصطفیٰ شاہ کی دختر گرامی سے ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں آپ نے امرتسر کو مستقر بنالیا۔ اور حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ آغاز تعلق کے ایام کے بارے میں فرماتے تھے کہ "اس زمانہ میں بے حد وظائف کرتا تھا۔ طبیعت میں بہت جلال تھا۔ جب کہیں گزرتا تھا تو درخت اور دیواریں پیچھے ہٹتی نظر آتی تھیں" اسی زمانہ میں شاہ جی حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کے درس میں شامل ہوئے۔

شاہ جی کے قرآن مجید پڑھنے کا منفرد انداز جب عام ہوا تو یہ آواز لگی کوچوں پر شہر کے بازاروں تک آن پہنچی۔ جب لوگوں نے حضرت قاسمی کو مجبور کیا کہ وہ سید عالی کو کھٹے میدان میں تقرر کی اجازت دیں۔ چنانچہ پہلی تقرر اندرون گولائی دروازہ بازار کھماراں امرتسر میں ہوئی۔ ایک اور صاحب آپ کو نواحی قصبہ سلطان ونڈلے گئے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں خلافت کانفرنس امرتسر کے گول باغ میں منعقد ہوئی جس میں پہلی مرتبہ شاہ جی نے سیاسی تقرر کی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستانی خفیہ پولیس کی جانب سے تیار کردہ ایک فتویٰ پر مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کے مقتدر علماء سے اس مضمون کے دستخط حاصل کئے گئے تھے کہ آل عثمان خادم حرمین شریفین ہونے کے باوجود برطانوی استعمار سے برسر جنگ ہونے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج اور کافر ہیں۔

رولٹ ایکٹ کی وجہ سے ملک کی سیاسی فضا میں ایک گونہ ارتعاش اور حدت پیدا ہوئی جس سے متاثر ہو کر مسلمانان ہند نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ اپنے جیا لے رصا کار اور بہترین داغ پروانہ وار فدا کر دیئے۔ چند ہی یوم میں یہ عوامی تحریک محلات اور کوٹھیوں سے جھونپڑیوں، مساجد، پانچہ شالوں اور گوردواروں تک پھیل گئی۔ ایسے ہمہ گیر جذبہ بانی دور سے ناممکن تھا کہ شاہ جی متاثر نہ ہوتے۔ جوانی کا عالم تھا۔ قدرت نے خوش رونی کے علاوہ خوش گلوئی کی نعمت بھی ودیعت کر رکھی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۹ء کا واعظ اور خطیب تمام آساکوں کو تیاگ کر میدان عمل میں اس بے جگرگی سے کود پڑا کہ ماضی قریب، بعید کے بزرگان عظمت و استقلال کی درخشندہ تاریخ کو ایک نعرہ عشق سے روشن اور اجاگر کر دیا۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی محلے کی مسجد سے اٹھا کر انہیں سیاست کی سیٹیج پر لے آئے۔ اور ابھی چند ماہ نہ گزرے تھے کہ حضرت شاہ جی کی شہرت اکناف ہند میں پھیل گئی۔



سیاسی اور اصلاحی مد و جز میں وہ کون سا مقام آیا جہاں کلہ حق کو بہانگ دہل بلند کرنے کی حاجت ہوئی اور یہ شیر خدا خاتج سے یکسر بے نیاز ہو کر وقت کے فراعنہ اور نماردہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے سب سے اونچے مقام پر نہ دیکھا گیا ہو۔ آزادی کی جنگ ہو یا انگریز کی اسلام دشمنی کے خلاف جہاد، سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس پر حملوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ہو یا بدعات کے خلاف تحریک۔ شاہ جی کا عمل سرفروشی کے لباس میں معاصرین میں سب سے زیادہ افضل اور موثر نظر آتا ہے۔ فتنہ شام رسول ﷺ راج پال ہو یا مغلیہ پہلی ٹیشن، کوئٹہ کے مفلوک الحال زلزلہ زدگان کی امداد ہو یا بے کس و مظلوم مسلمانان کشمیر پر ڈوگرہ شاہی مظالم، انتخابات کی سرگرمیاں ہوں یا تحفظ ختم نبوت کے لئے جان کی بازی، غرض ہر مقام اور ہر منزل پر شاہ جی سالار قافلہ کی حیثیت سے رجز خوانی کرتے ملے۔ اور ساتویں اور جاہانوں کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ سزا کو ہنستے ہوئے قبول کرتے نظر آئے۔ وہ ایک ایسے بے باک اور مضطرب دل لے کر آئے تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا۔ ان کی آواز اتنی ہر درد تھی کہ برصغیر اور بلاد اسلامیہ کے لئے بے اختیار بلند ہو جاتی۔ آنکھیں عالم اسلام کی ہر تکلیف پر اشک آکود ہو جاتیں۔ ناممکن تھا کہ مظلوم کو شکنجہ میں جکڑا دیکھ کر خاموش رہیں۔ وہ قوم کی تکلیف پر خود روتے اور دوسروں کو رلاتے تھے۔ انہوں نے مصر، ترکی، حجاز الغرض ہر خطہ کے مسلمانوں پر ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور ان کے مصائب و آلام پر نوحہ خواں ہوئے۔

زور خطابت کا جب تذکرہ ہوتا ہے تو ہمارے زمانے کے لوگ شیکسپیر کے ڈرامہ جو لسنس سبزر میں انتونی کی تقریر پر سر دھتے نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ اس تقریر کا حقیقت میں کتنا اثر ہوا تھا۔ لیکن سب اپنے اور غیر بارہا اس بات کا مشاہدہ کر چکے ہیں کہ ناسوافن ماحول میں جب بھی شاہ جی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے عوام کے غم و غصہ کو نم نہ ہائے تمہیں و آفریں میں بدل دیا۔ جو لوگ جوتے لے کر آئے تھے۔ اپنی جیب سے آخری پائی تک نکھار کر بیٹھے۔ جو کفر کا فتویٰ صادر کر چکے تھے پھر ان کے ہاتھ تاحیات دعا کے لئے اٹھ رہے۔ ایک بار شاہ جی نے فرمایا۔ "میں وہاں چلا جاؤں گا جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔ پھر تم مجھے پکارو گے لیکن تمہاری آواز تمہارے ہی کانوں سے نکلا کر تمہیں بلکان کر دے گی۔ مگر تم مجھے نہ پاسکو گے۔" حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی دل و دماغ پر حکمرانی کرتے تھے۔ وہ واحد شخص تھے جو سیاسی اقتدار، جماعتی رقابت اور تنظیمی خطوط کے بغیر اپنی ذات میں ایسا جادو رکھتے تھے کہ لوگ فقط ایک اشارہ پر سر دینے کو تیار ہو جاتے۔ بخاری کی تقریر کسی ہستی میں ہو اور لوگ رات گھروں میں سو کر گزاریں۔ یہ ممکن نہ تھا۔ آپ نے فصاحت و بلاغت، خطابت اور علم کلام کی توہیوں کے دہانے انگریز کے شاہی قلعہ پر مرکوز کئے تھے۔ اختلاف عقیدہ کے علاوہ کادیانیوں سے غیر فانی کہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بانی سلسلہ مرزائیت (مرزا غلام قادیانی) نے انگریزی حکومت کو ابر رحمت قرار دے رکھا تھا (ازالہ لوہام ص ۱۳۲) اس وجہ سے انگریزی استعمار اور مرزائیت دو ایسے نشانے تھے جن پر حضرت شاہ جی کے میزائل ہمیشہ لگتے رہے۔ قادیانیت کا ابطال دراصل ختم نبوت کا اثبات ہے جو آپ کے ایمان کا مرکز تھا۔ وہ حق اور حق پرستوں کی گویا ایسی تلوار تھے کہ جس باطل کے سر پر

پڑتی اسے شق کر ڈالتی۔ وہ خدائی بجلی یا آسمانی صاعقہ تھے کہ کفر و صلاحت کے جس خرمن پر پڑتے۔ اسے بھسم کر ڈالتے۔ وہ لہن داؤدی کا ایسا نمونہ تھے کہ حبیب و رقیب سب کو مصور کر دیتے۔ وہ صور اسرافیل تھے جس کی حیات بخش دعوت سے مردہ دلوں میں جان بڑھ جاتی۔ جس کی ایک آواز پر پچاس ہزار رضا کار آزادی کشمیر کے لئے سر پر کفن باندھ کر نکل آتے۔ جس کے ایک اشارے پر متحدہ ہند کے جیل خانے بھر جاتے جس کا داخلہ ایوان مرزائیت قادیان میں زلزلہ ڈال دیتا۔ جنگ آزادی کے کارکنان سے پوچھیے کہ ان کی امر و نہر والی تقریر ضرب النمل کے طور پر آج بھی یاد کی جاتی ہے کہ اس نے جنگ آزادی کو نیا رخ دیا۔

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دنوں میں لاہور سنٹرل جیل میں جب مارشل لاہ کے قیدیوں سے آپ کی ملاقات کرانی گئی۔ تو آپ نگے پاؤں اور نگے سران کے استقبال کے لئے دوڑے۔ آپ نے سب کو گلے لگایا۔ ایک ایک کی بیڑی اور ہتھکڑی کو ہوسہ دیا۔ اور یوں گویا ہونے "تم لوگ میرے سرمایہ حیات ہو۔ میں نے دنیا میں لوگوں کو روٹی یا پیسٹ یا کسی مادی مفاد کے لئے نہیں نکارا۔ لوگ اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دیتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے تحفظ کی دعوت دی ہے۔ میں نے جب کراچی جیل میں گولی چلنے کے واقعات سنے اور معلوم ہوا کہ کسی بوڑھے باپوں کی لاشیں ٹوٹ گئیں، ماؤں کے چراغ گل ہو گئے، اور کئی سہاگ اجڑ گئے تو مجھے اس کا بہت صدمہ ہوا۔ میں نے وہاں سمجھا تھا کہ کاش مجھے کوئی باہر لے جائے یا رباب اختیار تک میری آواز پہنچا دی جائے کہ تحفظ ناموس رسول ﷺ کے سلسلہ میں اگر کسی کو گولی مارنا مقصود ہو تو وہ گولی میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دی جائے اور کاش اب تک جتنی گولیاں چلائی گئیں مجھے کھٹکی باندھ کر میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دی جاتیں۔"

راقم کے دادا مولوی محمد صدیق اسیری کے ان ایام میں شاہ جی کے ہمراہ تھے۔ ان دنوں آپ ۱۳ فروری ۱۹۵۳ء کو بیرون دہلی دروازہ والی تقریر کے سلسلہ میں اسیر تھے۔ یہ وہی تقریر تھی جس میں آپ نے اپنی ٹوپی اتار کر کہا تھا۔ "کوئی ہے تم میں جو یہ ٹوپی خواجہ ناظم الدین (وزیر اعظم پاکستان) کے پاؤں پر جا کر رکھ دے اور یقین دلادے کہ وہ مجھے اپنا سیاسی حریف نہ سمجھیں۔ اگر وہ ناموس رسول کا تحفظ کریں تو میں پوری زندگی ان کا خدمت گار رہوں گا"

جلیلانوالہ باغ کے حادثہ اور قبیح رسوم کے خلاف جہاد نے شاہ جی کو وہ مقام دیا کہ جہاں وعظ فرماتے انسان ہی انسان نظر آتے۔ اسی عہد میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا تھا۔ مذہب کے گرد حصار کی نئی استوار ہونے والی دیوار کو گرگانے کے لئے شب و روز مشورے ہونے لگے۔ اور ایک ایسی جماعت کی تنظیم ہو گئی جس کے رزق کا انحصار کذب کے شجر کی آبیاری پر تھا۔ آپ کبھی کبھی بڑے جلال سے فرمایا کرتے تھے "ایک وقت آئے گا کہ تم لوگ ہماری قبروں پر آکر روؤ گے اور کہو گے کہ تمہیں لوگ سچے تھے" انہیں ایام میں ایک تقریر میں فرمایا۔

"میں ان سورتوں کا ریوڑ بھی چرانے کو تیار ہوں جو برٹش امپیریلزم کی کھینٹی کو ویران کرنا چاہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا ایک فقیر ہوں اپنے نانا ﷺ کی سنت پر مرثنا چاہتا ہوں۔ اور اگر کچھ چاہتا ہوں تو صرف اس

ملک سے انگریز کا اغلاہ دو ہی خواہشیں ہیں میری زندگی میں۔ یہ ملک آزاد ہو جائے یا میں تختہ دار پر لٹا دیا جاؤں۔

ایک بار صلح سورت میں سکھوں اور ہندوؤں کی دعوت پر ایک تقریر منظور فرمائی۔ اس تقریر کی تاثیر اور صلاوت نے سکھوں اور ہندوؤں سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرائے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی بھی موجود تھے۔ اسلام کی حقانیت، اللہ کی عظمت، توحید اور بت پرستی کی قباحتوں پر حیرت انگیز بیان تھا۔

وہ بھی عجیب منظر تھا جب مئی ۱۹۳۰ء میں انجمن خدام الدین کے اجلاس میں حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری نے آپ کو امیر شریعت کا خطاب دیا اور اپنے دونوں ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے کر بیعت کی۔ حضرت شیخ خود بھی زار و قطار رو رہے تھے۔ اور شاہ جی کی آنکھوں سے بھی گویا آنسوؤں کا سیل رواں جاری تھا۔ آپ لاکھ انکار کرتے تھے اور حضرت شیخ اصرار کرتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد آپ کی شخصیت میں مقبولیت اور جاذبیت کا وہ دور شروع ہوا جو اس سے قبل کبھی نہ تھا۔

وہ حریت و مساوات کی جنس گراں بار اٹھائے زندگی کے بازاروں میں تقریباً نصف صدی تک لوگوں کو ہر لفظ بلائے رہے۔ انہوں نے اس گورستان میں برسوں اذانیں کہیں۔ لیکن غلام رگوں کے سبب خون کو اپنی گرم گفتاری سے حرکت میں نہ لاسکے۔ اور یوں یہ بد نصیب لوگ اب شاید ہمیشہ کے لئے غلام ہو گئے۔ اگر بخاری پہاڑوں کو پکارتے تو شاید خاک راہ بن کر دامن سے لیٹ جاتے۔ اگر ستاروں کو آواز دیتے تو وہ یقیناً اپنی قدیمیں زمین کے حوالے کر دیتے مگر آہ! بخاری نے ان کے دروازوں پر سر پٹکا جن کے دل خون سے تھے، آنکھیں بصارت سے محروم اور کان صدائے حق سے نا آشنا تھے۔ یا بالفاظ دیگر وہ لوگ

ختم اللہ علی قلوبہم وعلی سمعہم وعلی ابصارہم غشاوة۔  
کی حقیقی تفسیر تھے۔ دردناک اور فلک شگاف آواز کے ساتھ قرآن کا پڑھنا، عالم و جاہل اور مخالف و موافق سب کا یکساں طور پر متاثر ہونا ان کی وہ خصوصیات ہیں کہ کوئی ان کی، ہماری کنبی نہیں سکتا۔ مخالفین کو ہم خیال بنانا ان کے بامیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بعض اوقات تو بولنے سے قبل ہی مجمع کو ایک ساحرانہ نگاہ سے مسح کر دیتے تھے۔ اپنے مخالف پر یوں حملہ آور ہوتے کہ ایسا خطیب کسی نے دیکھا ہو گا اور نہ سنا۔ فکری تحلیل سے وہ نقشہ کھینچتے تھے کہ دنیا کا کوئی مقرر ان کی نقالی نہیں کر سکتا۔ احرار کی قیادت کے زمانہ میں آپ کے دین مبارک میں دو دھاری زبان اور باطن میں قلب جبار تھا۔ جس نے قادیانیت کا جنازہ نکال دیا۔ مولانا محمد علی جوہر کی خطابت اور قیادت دونوں مسلم الثبوت ہیں۔ ایک بار شاہ جی کے بارے میں فرمایا۔ "ظالم سے نہ پہلے تقریر کی جاسکتی ہے نہ بعد میں۔ اس کے بعد تقریر کرنے والے کا رنگ نہیں جتنا اور اگر اس سے پہلے تقریر کریں تو اس کے اثر کو آکر یہ مٹا دیتا ہے۔"

لہذا رام والے کئیس کے سلسلہ میں ایک گواہ سید مقبول شاہ جوان دونوں اللہ موسیٰ نہیں ہیذا کشمیل تھا کہتا ہے۔ "جب میں ہائی کورٹ میں شاہ جی کے خلاف شہادت دینے کے لئے گیا تو لاہور کے سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی کہ دوران شہادت شاہ جی سے آنکھ نہ ملانا۔ اگر آنکھ مل گئی تو شہادت نہ

دسے سکو گے۔ یہ واقعہ حضرت مرحوم کی مقناطیسی شخصیت کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

شاہ جی دوسروں کی عیوب کی پردہ پوشی فرماتے تھے۔ کسی کی دل آزاری ان کا شیوہ نہ تھا۔ صلح کل ان کا مسلک تھا۔ ان کے منہ سے کسی نے جھوٹی بات نہیں سنی۔ وہ اس بات یا روایت کو ہرگز بیان نہ کرتے جس کی صحت میں انہیں ذرہ برابر بھی شک ہوتا۔ بے حد منکسر المزاج تھے۔ آخری ایام میں ایک بار فرما رہے تھے۔ "سیری زندگی ہی کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ نہ نبی ہوں نہ ولی۔ خدا کی مخلوق میں سب سے برا اور عاجز!!"

سیرے گناہوں پر سیرے مالک نے پردہ ڈال دیا۔ ورنہ عطاء اللہ جیسے کوڑوں مارے مارے پھرتے ہیں جنہیں کوئی جاننا تک نہیں۔ یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے قرآن کی کچھ خدمت مجھ سے لے لی۔ اور اس پر بھی کوئی دعویٰ نہیں۔ استغفر اللہ! پوری زندگی میں کہا ہوا کوئی ایک حرف بھی قبول ہو گیا تو نجات ہو جائے گی۔ ان شاہ اللہ۔ نجات کی امید ضرور رکھنا ہوں۔ کیونکہ اتنا مجھے یقین ہے کہ میں نے اس کے سوا کسی کو خدا نہیں مانا۔ اور میاں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو ان کا حریف بنتے دیکھنا میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اور کوئی عمل سیرے پہنچے نہیں۔ بس اسی کے فضل و کرم کے سہارے جی رہا ہوں۔"

۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی شب اہل ملتان نے یہ دغراش خبر سنی کہ محفل عزم و عمل کا وہ چراغ جو کئی برس سے مرض و ضعف کے شدید جھونکوں سے مجھ-مجھ کر سنبھل جاتا تھا۔ ۷۲ برس کی حنا گستریوں کے بعد بالاخر آج شام چھ بج کر پچھپن منٹ پر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ وہ جس کے دروازے پر بڑے بڑے روسا، آفیسرز، وزراء، علماء اور صوفیاء حاضری دینا باعث صد افتخار گردانتے تھے کرائے کے ایک بوسیدہ مکان میں اپنی زندگی گزار کر خوش رہا۔ بڑے بڑے بادشاہوں کے جنازے یوں نہ اٹھے ہوں گے جیسے اس فقیر کا جنازہ اٹھا۔ جنازہ اٹھائے جانے کے وقت دو لاکھ سے زائد خوش قسمت عقیدت مندوں نے ایمر سن کالج گراؤنڈ ملتان میں آپ کے بڑے فرزند اور جانشین حضرت ابو معاویہ ابو ذر بخاری مدظلہ العالی کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی۔ ڈپٹی کمشنر ملتان نے حکومت کی جانب سے قلمہ ملتان میں تدفین کی پیش کش کی۔ جسے شاہ جی کے اہل خانہ نے مسترد کر دیا اور عام قبرستان میں دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔ آخری ایام میں آپ اکثر فرماتے تھے۔ "اللہ مجھے ایسے مقام پر قبر نصیب کرے جو سر راہ ہو اور آتے جاتے لوگ فاتحہ پڑھ جایا کریں" ۲۲ اگست کی شام چھ بجے جلال باقری قبرستان میں برب سرک آپ کو سپردِ دلہ کیا گیا۔ شاہ جی ہمیشہ کے لئے منوں مٹی تلے سو گئے۔ لوگوں کی گریہ و زاری کی انتہا ہو گئی۔ برصغیر کی تحریک آزادی اور جہاد دین کا ایک نہایت منور باب اپنے اختتام کو پہنچا اور دنیا اس بلبل ہزار داستان کی نغمہ طرازیوں اور خوش الحانیوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔ جو خرسن باطل پر بھلی کی مانند ٹوٹتی تھی۔

آج مٹی کا وہاں دھیر سا ہو گا ساغر

سر جھکاتی تھی جہاں لوح و قلم کی دنیا

## عصرِ نو کی ظلمتوں میں روشنی کی موت ہے

(ردج بخاری کے نام)

اے عطاء اللہ اے شیر نیتان رسول  
 نور چشم مرتضیٰ ، بنویر ایمان رسول  
 تیری صورت میں جمال سید کونین تھا  
 ہر عمل تیرا مراد سیرت حسنین تھا  
 قلب النور شاہ کا پرتو تری تقریر تھی  
 تجھ سے وابستہ عروج عشق کی تقدیر تھی  
 موج کوثر کی روانی تھی ترے الفاظ میں  
 زندگانی کی جوانی تھی ، ترے الفاظ میں  
 تو خیابان محمد کا گل خوش رنگ تھا  
 تجھ کو حاصل قرن اول کا شعور جگ تھا  
 حق نے دی ختم نبوت کی مہمبانی تجھے  
 تھی میر دولت اسرار قرآنی تجھے !  
 تو لب روح الامین کا نعرہ بکبیر تھا

وَقَدْ الْقَوَانِ تَوَقُّلاً کی خود تفسیر تھا  
 تیری صحبت میں نظر آئی صحابہ کی حیات  
 اک شجاعان سلف کا آئینہ تھی تیری ذات  
 گلشن احرار کی روح چمن بندی تھا تو  
 ہر آزادی مجسم آرزو مندی تھا تو  
 آج تک ممنون ہے ہر ذرہ تری آواز کا  
 تو حسیں نغمہ تھا حریت کے دلکش ساز کا  
 کانپتا تھا ملتہ افرنگ تیرے نام سے  
 خاص نبت تھی تجھے پیغمبر اسلام سے  
 تو نے سکھائے جہاں کو آدمیت کے اصول  
 طبع دشمن بھی نہ ہوتی تھی کبھی تجھ سے ملول

جز بے محمود تیری پاک شریانوں میں تھا  
 تو امیر الہند کے جانباز دیوانوں میں تھا  
 عمر نو کی فطرتوں میں روشنی کی موت ہے  
 موت تیری درحقیقت زندگی کی موت ہے  
 میں سبھی حسن عقیدت کو بھلا سکتا نہیں  
 تیری دیرینہ رفاقت کو بھلا سکتا نہیں  
 مفضل ، پیار ، رنجیدہ ہوں ، افسردہ ہوں میں  
 زندہ جاوید! تیری یاد میں مردہ ہوں میں  
 خون دل برسائے گی تاجر چشم انگبار  
 مٹ نہیں سکتی مرے دامن سے تیری یادگار  
 درد ملت کی شبیہ بے قراری مر گیا  
 ہر نفس تصویر ماتم ہے بخاری مر گیا  
 اپنے سینے میں چھپائے سوز جان برق طور  
 آخرش جنت میں پہنچا اپنے تاتا کے حضور  
 کاروانِ جاوہِ ماضی کے اے مخلص امام  
 ہر ورق بھیجے گا تجھ پر مصحفِ دیں کا سلام

حضرت شاہ جی مرحوم ان محدودے چند ہستیوں میں سے تھے جنہوں نے گذشتہ نصف صدی میں برصغیر ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں صحیح سیاسی شعور پیدا کیا۔ مگر افسوس کہ مسلمان ان کی اقدار کو نہ صرف فراموش کر چکے ہیں۔ بلکہ سیاسی طور پر اسی سطح پر پہنچ چکے ہیں جہاں آج سے پچاس سال پہلے تھے۔

ہماری نااہلی اور بد قسمتی کی انتہا ہے کہ ہم نے ایسی نامور ہستیوں سے کما حقہ استفادہ نہیں کیا، دراصل یہ قدرت کا اصول ہے کہ جب کسی قوم کے اعمال و افکار بہت پست ہو جاتے ہیں تو بہت عظیم شخصیتیں بھی ان کو اس قدر ذلت سے نہیں نکال سکتیں۔ اور ان کی تمام تر کوششیں بیکار ثابت ہوتی ہیں۔ خدا کرے میرا یہ اندازہ غلط ہو مگر حضرت شاہ جی مرحوم جیسے مخلص اور بہادر رہنما کے ساتھ جو سلوک ہماری قوم نے ان کی زندگی میں اور ان کی یاد کے ساتھ ان کی وفات کے بعد کیا ہے اس سے میں مایوس ہوں۔ اور یہ ہماری قومی زندگی کے لئے ایک المناک سانحہ ہے۔

میر عبد القیوم مرحوم ایڈووکیٹ

## تحفظ ختم نبوت کا داعی

بچپن سے ہی میں مذہبی جلسوں میں جایا کرتا تھا۔ اور مواعظِ حسنہ سے مستفیض ہوتا۔ کئی علماء کرام کو سننے کو اتفاق ہوا۔ جو کیفیت و سرور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سے حاصل ہوتا وہ دیگر مواقع پر کم ہی نصیب ہوا۔ اگرچہ اور علماء بھی علمی اعتبار سے بحرِ بیکراں تھے لیکن تقریر کرنے کا مکملہ ایک قدرتی عطیہ ہے۔

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی شخصیت بڑی رعب دار تھی۔ گھنی داڑھی، گندی رنگ، مناسب جسم، کشادہ چہرہ، ہاتھ میں اکثر عصار کھتے۔ آواز سوز سے معمور تھی۔ اگر کسی وقت لاؤڈ سپیکر خراب ہو جاتا تو آپ کی آواز اتنی اونچی اور پاٹ دار تھی کہ دور بیٹھے ہوئے سامعین کو بھی صاف سنائی دیتی۔

جب تقریر کرتے وقت قرآن پاک کی آیات کی تلاوت کرتے تو مجمع پر سکوت طاری ہو جاتا اور لوگ عیش و عشرت کر اٹھتے۔ ہر ایک یہی چاہتا کہ مولانا قرأت جاری رکھیں اور وہ سنتے رہیں۔ فرمایا کرتے میری عمر کا بہت سا حصہ جیل میں گزرا یا ریل کے سفر میں۔ عمر بھر تحریکِ تحفظ ختم نبوت کے زبردست داعی رہے۔ اپنے ملک پر چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ اس راہ میں قید و بند کے مصائب خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلے۔ یہ امر نہایت خوش آئند ہے کہ جو نصیب العین عمر بھر ان کے پیش نظر رہا۔ بالآخر مرزا نیوں کو غیر مسلم قرار دیئے جانے پر منتج ہوا۔ اس طرح وہ جدوجہد جو عرصہ سے جاری تھی اور جس کی خاطر شیع رسالت کے بے شمار پروانوں نے جانوں کے نذرانے پیش کئے کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

حاصل عمر نثار رہ یارے کرم

شادم از زندگی خویش کے کارے کرم

ایک دفعہ حاضرین کے سامنے اپنا اور مرزا غلام قادیانی کے کردار کا موازنہ پیش کیا۔ فرمایا کہ اگر مرزائی حضرات ایسے کردار کے مالک شخص کو نبی ماننے پر مصر ہیں تو پھر انہیں نعوذ باللہ نعوذ باللہ مجھے خدا ماننا پڑے گا۔ فروعی مسائل میں الجھنا پسند نہ کرتے۔ ایک شخص نے استفاد کیا کہ کیا مردہ افراد سنتے ہیں یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ مردوں کا کیا ذکر ہماری بات تو زندہ بھی نہیں سنتے۔

تقریر کرتے وقت سامعین کو دلاتے اور ہنساتے بھی۔ کئی معروف شعرائے کرام کے اشعار یاد تھے۔ تقریر کے دوران جہاں جہاں موضوع سخن تھا صاف کرنا مناسب اشعار سناتے۔ اس سے ان کی تقریر کی چاشنی دگنی ہو جاتی۔

بذلہ سنچ اور حاضر دماغ تھے۔ دہلی میں ایک جلسہ سے خطاب کر رہے تھے کہ سامعین میں سے ایک نے اٹھ کر پوچھا کہ مولانا آپ نے جو پچھلے سال گلگتہ کے قحط زدگان کے لئے چندہ جمع کیا تھا اس کا حساب دیں۔

مولانا نے فرمایا کہ ہم سے حساب کا تقاضا ایسے حضرات کرتے ہیں جنہوں نے بذات خود کسی نیک کام کے لئے ایک دھیلا بھی نہیں دیا ہوتا۔ سوال کنندہ سے کہا کہ وہ حلفاً بیان کریں کہ اس نے کتنا چندہ دیا تھا۔ اس پر وہ خاموش رہا اور کھسپانا ہو کر بیٹھ گیا۔ شاہ جی نے فرمایا کہ ہم حساب دیں گے ضرور لیکن قیامت کے دن اُنہم الما کہیں کو۔

تر دامنِ پہ شیخ ہماری نہ جانید  
دامنِ نیوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

لاہور میں سوچی دروازہ کے باہر ایک پرہجوم جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا لاہور یو! میں تم سے خوب واقف ہوں۔ تقریر تم میری سننے ہو اور ووٹ مسلم لیگ کو دیتے ہو۔ میری تقریر پر تعریف کے ڈونگرے برساتے ہو اور کہہ اٹھتے ہو واہ اور جب میں پابند سلاسل کیا جاتا ہوں تو تم کہتے ہو آہ اس آہ اور واہ میں میں ہو گیا تباہ۔ (لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ہماری آہوں اور جہد مسلسل سے کفنوں کے مقدر سنور گئے) گویا۔۔۔

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجران  
ہمارے اشک تری عاقبت سوزِ دل

ایسا کئی بار ہوا کہ شاہ جی نے اپنی تقریر کا آغاز عشاء کی نماز کے بعد کیا اور جب سر کی اذان فضا میں بلند ہوئی تو آپ نے اپنا بیان ختم کیا۔ اس طویل دورانیے میں مجمع سرزدہ رہتا اور ان کی تقریر سننے میں اتنا مومک بوریت یا نیند اس کے نزدیک نہ بیچکتے۔

خفیہ پولیس کا سٹاف سایہ کی طرح ان کے تعاقب میں رہتا۔ ایک مرتبہ کسی گاؤں میں تقریر کرنے جا رہے تھے۔ ٹانگے پر ایک اور شخص ان کا ہمسفر تھا۔ شاہ جی نے ہانپ لیا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ جب ٹانگے سے نیچے اترے تو اس شخص سے کہا کہ کتابوں کا بھاری بندل جو وہ اپنے ساتھ لے ہوئے ہیں پیرانہ سالی کے سبب وہ اسے اٹھانے سے معذور ہیں۔ اس لئے کیا ہی اچھا ہوا اگر وہ اسے اٹھا لے لے فلاں گاؤں تک جو وہاں سے تین میل دور ہے پہنچا دے۔ اس نے بادل نمواسہ حامی بھر لی۔ جب منزل مقصود پر پہنچے تو ساتھی تحکات کے مارے نڈھال ہو چکا تھا۔۔۔

جب مملکت پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو شاہ جی نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ وہ اور ان کی جماعت اس نوزائیدہ اسلامی سلطنت کا دل و جان سے دفاع کریں گے۔

مولانا نے طویل عمر پائی جب انتقال فرمایا تو انکے جسد خاکی کو بلتان کی سرزمین نے جس میں اور بھی کئی علم و معرفت کے درخشندہ ستارے آسودہ خاک ہیں اپنی آغوش میں لیا۔

رع آسمان تیری لہد پر شبنم افشانی کرے

(”صدف ریزے“ صفحات ۸۶ تا ۸۹)



## آزادی کا داعی۔ ایک مجاہد عالم دین

کتنے دور آئے اور ختم ہو گئے۔ کتنی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں اور عدم آباد میں ابدی نیند سو گئیں۔ کتنی حکومتیں بنیں اور انقلابات کی نذر ہو گئیں۔ تاریخ کے اوراق میں ان کے کارناموں کی مناسبت سے ان کا ذکر ہو تو لیکن گردش زمانہ نے عوام کے دماغوں سے ان کی یاد مٹ کر دی ہے لیکن کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہیں جنہیں انسان بھولنا بھی چاہے تو بھول نہیں سکتا۔ شاہ جی کے کارنامے ان کی قربانیاں، ان کا ایثار، ان کی بارخ و بہار طبیعت، ان کے لطافت، ان کے ادب پارے، ان کی طنز، ان کا مزاج اور پھر فارسی، عربی اور اردو کے شعراء کے ہزاروں اشعار جو انہیں از برتھے ان اشعار کی ادا کیگی۔ ان کی قادیان شکن تقریریں، برطانوی جبر و استبداد کے سامنے خم ٹھونک کر ہر قسم کے نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر ان کی ہندوستان گیر جدوجہد، یہ وہ واقعات ہیں جنہیں کوئی شخص آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری بلبل گلستانِ رسالت ﷺ تھے۔ اللہ رب العزت نے انہیں لمن داودی عطاء کر رکھا تھا۔ وہ جب اپنی تقریر کے دوران تلاوت قرآن مجید کرتے تو شہر و جہد میں آجاتے۔ شاہ جی کا عربی فارسی اور اردو، کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انہیں اردو، فارسی اور عربی کے اساتذہ کے ہزاروں اشعار نوک زبان تھے۔ الفاظ و معانی کا ایک سیلاب تھا جو ان کی تقریروں میں ادا چلا آتا تھا۔ شاہ جی نے ابتدائی تعلیم اپنے نہال کے ہاں عظیم آباد (پٹنہ) میں مکمل کی۔ عظیم آباد اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ اس کے چپہ چپہ پر تاریخ اسلام کے اوراق بکھرے ہوئے ہیں۔ عظیم آباد کی سرزمین نے بڑے بڑے اداء فضلہ علیہ اور شہر ایدہ اکتے جن کے رشحات قلم نے ہمارے سرمایہ ادب میں بے پناہ اصناف کیا۔ شاہ جی کے نہال کا گھرانہ خود علم و فضل کے میدان میں بہت شہرت رکھتا تھا۔ اس لئے شاہ جی پر اپنے نہال کا ادبی اور علمی اثر ہمیشہ غالب رہا۔ آپ کے ددھیال کشمیر سے ہجرت کر کے گجرات میں آباد تھے۔ اور روحانی طور پر اس گھرانے کی بہت عزت تھی۔ آپ عظیم آباد سے گجرات اور پھر امرتسر میں آ گئے۔ یہاں حضرت مفتی محمد حسن رحمہ اللہ سے حدیث کا درس لینے لگے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری بے حد ذہین تھے۔ انہوں نے اپنی قابلیت اور ذہانت سے مفتی صاحب کا دل موہ لیا۔ ایک روز مفتی صاحب نے اپنے حلقہ درس میں فرمایا۔  
"عطاء اللہ شاہ مستقبل میں ایک تاریخی شخصیت ثابت ہو گا۔ اور ملت اسلامیہ کے مردہ قلوب میں زندگی کا نیا جوش، نیا ولولہ اور نیا خون دوڑا دے گا۔"

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ پیش گوئی حرف بحرف درست ہوئی۔ امیر فریعت سید عطاء

اللہ شاہ بخاری نے مسلمانانِ ہند کے قلوب میں نیا جوش، نیا ولولہ، نئی تڑپ پیدا کرنے میں جو عظیم کردار ادا کیا وہ برصغیر کی تاریخ میں حریت کا قیمتی سرمایہ ہے۔

جب شاہ جی امرتسر کی مسجد خیر الدین میں پڑھا کرتے تھے ان دنوں مولانا ابوالکلام آزاد امرتسر کے اخبار ”وکیل“ کے مدیر اعلیٰ ہوا کرتے تھے۔ آغا حشر عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے مناظرے کیا کرتے تھے۔ آغا حشر اپنے دور کے بہت بڑے مناظرے تھے۔ وہ عظیم شاعر بلند پایہ ڈرامہ نویس ہی نہیں تھے بلکہ ایک شعلہ نوا مقرر اور جادویمان خطیب بھی تھے۔

شاہ جی مولانا ابوالکلام آزاد کی ان دنوں کی جبکہ وہ ”وکیل“ میں مدیر تھے۔ تصویر کچھ اس طرح سے کھینچا کرتے تھے۔

”ایک سرو قد رعنا صورت، بڑی بڑی مدھ بھری آنکھوں کا نوجوان، لباس صاف ستھرا اور اجلا، اور اس کی نفاست طبع کا آئینہ دار، باتوں میں ٹھہراؤ اور قلم میں الٹا رے مضمر تھے۔ کسی مسئلہ پر بات کرو تو معلومات اور دلائل و براہین کا سمندر شائیں مارنے لگے۔ خطابت کا شنہاد، تحریر کا دھنی، ایک عظیم شخصیت، دینی، علمی، ادبی، شری، سیاسی، بین الاقوامی، اور بین الملکیتی کوئی معاملہ ہو۔ اس پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتا کہ اس کا ہر الجھاؤ دور ہو جاتا اور اس کی ہر گتھی سلجھ کر سامنے آجاتی۔ علم و ادب کا یہ آفتاب پوری آب و تاب سے آسمانِ ہند پر چکا۔ اس کے سامنے سب کی قندیلیں مدھم پڑ گئیں۔

وہ امامِ اہلِ ہند تھا۔ اس کا مقام مذہب و سیاست میں بہت بلند تھا۔ وہ ایک گلِ شگفتہ تھا جس کی بو باس سے گلستانِ ملت کو تروتازگی ملی۔

ایک روز باتوں باتوں میں کہنے لگے

”میں نے آغا حشر کو اس عالم میں بھی دیکھا ہے۔ کہ وہ ایک پھرے شیر کی طرح عیسائی، آریہ، سماجی اور دہریہ مبلغوں پر چپٹا۔ آغا حشر محمد شاہ بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ جب وہ تقریر کرتا تو الفاظ و معانی کے دریا بہا دیتا تھا۔ جب دلائل و براہین سے کام لیتا تو اس کے مخالف اس سے پناہ مانگتے۔ اسے مختلف مذاہب کی کتابیں از بر تھیں۔ اس نے آریہ سماجی اور عیسائی لٹریچر کا عمیق نظروں سے مطالعہ کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عیسائی پادری اور آریہ سماجی اس کے مقابلے میں آنے سے کتراتے تھے۔ شکوہ یورپ کا یہ مخالف ہر طرف دندناتا پھرتا۔ کوئی مقابلہ پر نہ آتا۔ افسوس کہ حشر ایسا مناظر۔ خطیب، مقرر، محقق ڈراموں کی دلدلوں میں چا پٹنا۔ حشر جب تک زندہ رہا۔ ڈرامہ نویسی کی دنیا میں اس کا طوطی بولتا رہا۔ یقیناً وہ اپنے وقت کا شیگسیر اور کالی داس تھا۔“

شاہ جی ابھی حضرت مفتی محمد حسن کے حلقہ درس میں ہی شامل تھے کہ جنگ عظیم شروع ہو گئی اور پھر

انگریزوں نے عراق، دمشق، فلسطین، اردن وغیرہ عرب ملکوں پر قبضہ کر لیا۔ مشرق وسطیٰ پر ہلالی پرچم کی جگہ تثلیث کا جھنڈا لہرانے لگا۔ مقامات مقدسہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اتحادیوں نے خلافت عثمانیہ کے لہادے کو تار تار کر دیا۔ ترک جو پانچ سو سال تک یورپ کے سینے پر مونگ دلتے رہے تھے۔ شکست کھا گئے۔ استنبول پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ عثمانی خلیفہ کی حیثیت ایک محکوم حکمران کی ہو کر رہ گئی۔ ان واقعات نے مسلمانوں کے قلوب میں انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت کا ایک طوفان موجزن کر دیا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو سیاسی حقوق اور آزادی دینے کے سلسلہ میں جو وعدے جنگ کے دوران کئے تھے۔ وہ اپنے ان وعدوں سے منحرف ہو گیا۔ اس نے ہندوستانیوں کی وفاداری اور قربانی کا یہ صلہ دیا کہ ملک میں رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا۔ برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کے ساتھ بالعموم اور مسلمانوں کے ساتھ بالخصوص جو سلوک کیا اس کے نتیجہ میں سارے ملک میں حکومت کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان مظاہروں نے شدت اختیار کی تو جلیا نوالہ باغ کا خونى واقعہ رونما ہوا۔ مسلمانوں نے احیائے خلافت کے سلسلہ میں تحریک شروع کی اور انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ وہ تمام مقامات مقدسہ کو مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ ترکی اور عرب ممالک سے اتحادی فوجوں کو کال لیا جائے اور ترکی اور عرب ممالک کی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے۔

تحریک خلافت کو چلانے کے لئے ملک میں خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ خلافت کمیٹی میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، مولانا ظفر علی خاں، عبدالرحمن صدیقی، سید راغب احسن اور مولانا ثناء اللہ پانی پتی۔ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین، چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر اور صوفی غلام محمد فرنگی محل سب ہی شامل تھے۔ یہ تحریک آندھی کی طرح اٹھی اور طوفان کی طرح پورے ملک میں چھا گئی۔ مسلمانوں نے تحریک خلافت شروع کی تو گاندھی جی نے جو جنوبی افریقہ سے ہندوستان آنے کے بعد گوکھلے تلک اور سی آر داس ایسے لیڈروں کی قیادت کے گھروندے گرانا چاہتے تھے۔ ملک میں عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی۔ ترک موالات اور خلافت تحریک کے الحاق نے برطانوی حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔

تحریک خلافت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری میدان سیاست میں تشریف لائے۔ انہوں نے مسجد خیر الدین میں ایک زنائے دار تقریر کی۔ ان کی تقریر کیا تھی ایک لاوا تھا، جس نے ہر طرف آگ لگا دی۔ ان کی دوسری تقریر موجی دروازہ کے باغ میں ہوئی۔ اس جلسہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، مولانا ظفر علی خاں، نے بھی تقریریں کیں۔ یہ وہ رہنما تھے جن کی خطابت پر کوئی شخص انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ جن کی خطابت مسلم تھی لیکن جب ان تقریروں کے بعد سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقریر شروع کی تو ہر شخص شاہ جی کو حیرت کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ گورے چٹے رنگ اور دوہرے بدن کا ایک نوجوان تھا جس نے چوڑی آستینوں کا کھدکا کرتہ پہن رکھا تھا اور تہبند زیب تن تھا۔ سر پر رومال لپیٹ رکھا تھا۔ ہاتھوں میں ایک ڈنڈا

تلاوت قرآن مجید کرنے کے بعد جب شاہ جی نے تقریر شروع کی تو ان کے ایک ایک فقرہ پر ساری فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ انہوں نے برطانوی سامراج کے بنیے ادھیڑ کر رکھ دیے۔ اس تقریر کے بعد شاہ جی کی دھاک بڑے بڑے لیڈر بھی مان گئے۔ اور ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں میں ہونے لگا۔

تحریک خلافت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں نے نہ صرف پنجاب اور سرحد میں بلکہ پورے ہندوستان میں آگ لگا دی۔ علمائے فرنگی محل نے ان دنوں فوج اور پولیس کی نوکری حرام کا فتویٰ دیا۔ یہ تحریک انتہائی پر جوش تھی۔ اس کی وجہ سے طلباء نے سرکاری سکول اور کالج ترک کر دیے، وکلاء نے پریکٹس چھوڑ دی۔ پولیس اور فوج کے سینکڑوں افسروں اور سپاہیوں نے ملازمت ترک کر دی۔ اپنے زمانہ میں شاہ جی کی تقریر سے متاثر ہو کر چودھری افضل حق نے جو پولیس میں ایس ایچ ایچ اوتھے۔ ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور تحریک میں شامل ہو گئے۔

چودھری افضل حق اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے میدان سیاست میں لانے کا سہرا شاہ جی کے سر ہے۔ جن کی تقریر نے مجھے گرویدہ کر کے اسلام اور ملک و ملت کا شیدائی بنا دیا۔

تحریک خلافت میں شاہ جی کو تین سال قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ ان کے خلاف اس تحریک کے دوران اور بھی مقدمات چلائے گئے لیکن سزا صرف ایک مقدمہ میں ہوئی۔

تحریک خلافت اور ترک موالات کے بعد ملک میں ہندو مہاسابائیوں نے شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں شروع کر دیں۔ راجپال، سوامی شرودھانند، بھولا ناتھ اور ناتھورام نے لاہور، دہلی، کلکتہ اور کراچی سے ایسی کتابیں شائع کیں جن میں مسلمانوں کے آقا و مولا رسول خدا ﷺ کی شان اقدس میں گستاخیاں کی گئی تھیں۔ شاہ جی عاشق رسول ﷺ تھے۔ وہ بھلا یہ کب برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے دہلی دروازہ کے باہر تقریر کرتے ہوئے کہا۔

”وہ زبان گدی سے نکال لی جائے گی جو میرے نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کرے گی۔ مہاشاؤں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایسی کتاب اور مضامین کی اشاعت کر کے آگ کے شعلوں سے کھیل رہے ہیں۔ مسلمان ہر چیز برداشت کر سکتا ہے لیکن اپنے آقا و مولا کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔“

آپ نے اس جلسہ میں اپنی ٹوپی کو ہاتھ میں لے کر فرمایا۔

”ہندو فطرتاً غلام واقع ہوا ہے۔ وہ ایک ہزار سال سے غلام چلا آ رہا ہے۔ وہ آزادی کا تصور تک نہیں لاسکتا لیکن مجھے تو آج بھی اپنی اس دوپٹی سے بادشاہت کی بو آ رہی ہے۔“ پھر فرمایا

”ہندو اور مسلمان کے درمیان اتحاد کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہندو جس گائے کو اپنی ماما مانتا ہے۔ اس کے پید شاب کو پوتر سمجھتا ہے۔ میں اس کو کھروں تک چبا جاتا ہوں۔ ہندو کی تہذیب الگ،

تمدن الگ، مذہب الگ وہ ہزاروں بتوں کو پوجتا ہے۔ وہ شولنگ کے سامنے ہاتھ مار گڑتا ہے لیکن میں توحید کا علمبردار ہوں۔ میں ایک خدا کا پجاری ہوں۔ بت پرستی اور توحید کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ ظلمت اور روشنی میں کبھی ملاپ نہیں ہو سکتا۔

ہم مسلمان، بت شکن محمود غزنوی اور اورنگ زیب عالمگیر کی روایات کے حامل ہیں۔ ہندو یہ کیوں بھول گیا کہ اس نے ایک ہزار سال تک ہمارے آستانہ جلال پر خاصہ فرسائی کی ہے یہ قوم جو ڈوٹے دے کر جاگیر داری کی بھیک مانگتی رہی ہے۔ آج مسلمانوں کو آنکھیں دکھا رہی ہے۔ ان کی زبان درازیاں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ مسلمانوں کے آقا و مولا ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کرنے کی جرأت کر رہی ہے۔ یاد رکھو وہ ہاتھ توڑ دیئے جائیں گے جو مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ کے خلاف قلم کو جنبش میں لائیں گے۔ وہ زبان کاٹ لی جائے گی۔ جو ہمارے آقا و مولا کی شان میں گستاخی کرے گی۔

شاہ جی کو اس تقریر کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا اور دو سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔

سامن کمیشن کی آمد کے بعد ملک کی سیاست نے ایک بار پھر ہٹا کھایا۔ ان ہی دنوں پنڈت موتی لال نہرو آنجنابی نے فرد وارانہ مسئلے کے حل کے سلسلہ میں ایک دستاویز شائع کی۔ جسے نہرو رپورٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اس رپورٹ کو مسلمانوں کے لئے ضرر رساں قرار دیا اور نہایت واضح طور پر یہ کہا کہ نہرو ایسی رپورٹ پیش کر سکے کہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت ہی انگریز کی صحیح جانشین ہے۔ ہندو مسلمانوں کو اجیر اور اچھوت بنانے کی سازش کر رہے ہیں۔ ان دنوں مجلس خلافت دو گروپوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک کی قیادت علی بردران کے ہاتھوں میں تھی۔ دوسری طرف پنجاب کے خلافتی لیڈر تھے۔ جنہیں علی بردران ہمیشہ پنجابی ٹولہ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ پنجابی ٹولہ نے جس میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، جودھری عبدالعزیز بیگو والوی، جودھری افضل حق، مولانا عبدالقادر قصوری، شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی اظہر، وغیرہ شامل تھے۔ نہرو رپورٹ کو تسلیم کر لیا۔

اس کے بعد پنجاب میں سخت ہنگامے ہوئے۔ نہرو رپورٹ کے حق میں اور مخالفت میں جلے ہوئے۔ مظاہرے ہوئے۔ ان ہنگاموں کے بعد لاہور میں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس دریائے راوی کے کنارے پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس سے قبل پنجاب کے خلافتی مولانا ظفر علی خاں کی صدارت میں جہازی بلڈنگ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں ایک جلسہ منعقد کر کے مجلس احرار اسلام قائم کر چکے تھے۔ کانگریس کے اس اجلاس میں نہرو رپورٹ کو رد کیا اور مکمل آزادی کی قرارداد منظور کی گئی۔ جس کی تائید میں سردار عبدالرب نشتر، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مسز سروجنی نیٹو کی ہمیشہ مسز میک نے جو

سوشلسٹ لیڈر تھیں بڑی زور دار تقریریں کیں۔ ملک میں تحریک نمک سازی شروع ہوئی تو مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری دو سال کے لئے پھر جیل بھیج دیئے گئے لیکن گاندھی ارون سمجھوتہ کے تحت دوسرے لیڈروں کے ساتھ ایک سال کے بعد رہا کر دیئے گئے۔

کراچی کانگریس کے اجلاس میں مولانا ظفر علی خان کے اس مطالبہ کی بنا پر کہ اگر گاندھی جی کی پرار تمنا کے لئے کانگریس کا اجلاس ملتوی کیا جاسکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ نماز کے لئے کانگریس کا اجلاس ملتوی کیا جائے۔ مولانا ظفر علی کے اس مطالبہ کو ہندو لیڈروں نے ماننے سے انکار کر دیا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ فرمایا کہ جس شخص کو نماز پڑھنا ہو وہ اجلاس سے باہر جا کر نماز ادا کر سکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے ان الفاظ سے پنجاب کے احرار بھرک لٹھے۔ مولانا ظفر علی خان اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے۔ مولانا آزاد نے مولانا ظفر علی خان کے جانے کے بعد احرار لیڈروں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن شاہ جی اور جودھری افضل حق نے کانگریسیوں کی اس ذہنیت کے خلاف بطور احتجاج کانگریس سے استعفیٰ دیدیا اور مجلس احرار اسلام من حیث الجماعت کانگریس سے الگ ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد اسلامیہ کالج حبیبیہ ہال لاہور میں احرار کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور شیخ حسام الدین نے بڑی زور دار تقریریں کیں۔ اس اجلاس میں مسلمانوں کے جداگانہ طریق انتخاب کی قرارداد منظور کی۔

کشمیر میں ڈوگروں کے مظالم اور فارنگ کی وجہ سے درجنوں مسلمان شہید اور سینکڑوں زخمی ہو گئے خانقاہ معلیٰ میں داخل ہو کر ڈوگروں نے قرآن مجید کی بے حرمتی کی۔ اس واقعہ نے مسلمانوں میں اضطراب پیدا کر دیا۔ مظلومین کشمیر کی امداد کے لئے کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمیٹی پر مرزائیوں کا قبضہ تھا۔ علامہ محمد اقبال نے حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی فہمائش، ترغیب و تحریک پر اس کمیٹی کی شدید مخالفت کی اور مطالبہ کیا کہ مرزائی ایک الگ فرقہ ہے۔ اسے مسلمانوں کے معاملات میں نہ داخل کرنے کا کوئی حق نہیں۔ کشمیر کمیٹی میں ان کی موجودگی ملت اسلامیہ ہند کے وسیع تر مفاد اور کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کے منافی ہے۔ مرزائی اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اور کشمیریوں میں مرزائیت کی تبلیغ کر کے انہیں مرتد بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ موچی دروازہ کے باہر برکت علی محمد ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں مرزائیوں کو کشمیر کمیٹی سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد انجمن حمایت اسلام لاہور سے بھی مرزائیوں کا اخراج عمل میں لایا گیا۔ اس جلسہ میں شاہ جی نے ساڑھے تین گھنٹے تقریر کی۔ جس کی وجہ سے مرزائیوں کی رشہ دوانیاں اور سازشیں مسلمانوں پر واشفاق ہو گئیں۔

تحریک کشمیر (۱۹۳۰ء) شروع ہوئی اور ہزاروں احرار رضاکار جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ درجنوں احرار سرخپوش اپنے کشمیری بھائیوں کی آزادی کے لئے شہید ہوئے جن میں چنیوٹ کے شیخ الہی بخش بھی شامل تھے۔ جن کی شہادت نے مسلمانوں میں قریانی و ایثار کا نیا ولولہ اور جذبہ پیدا کیا۔ وہ اس تحریک کے پہلے شہید تھے۔ تحریک کشمیر کے زمانے میں شاہ جی کو دہلی کی جامع مسجد میں ایک تقریر کی بنا پر گرفتار کر کے اڑھائی

سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔

کمپوئل ایوارڈ کے نفاذ سے مسلمان ناراض تھے اور اسے مسلمانوں پر ہندو اکثریت کو مسلط کرنے کی ایک برطانوی سازش قرار دے رہے تھے۔ کانگریس نے انتخابات میں حصہ لے کر چھ سات صوبوں میں وزارتیں بنالی تھیں۔ ان صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک رکھا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کے مذہب اور روایات میں مداخلت کی جا رہی تھی۔ اور پنڈت نہرو ایسے لیڈر انگریزوں کو لٹکار رہے تھے کہ انگریزوں نے اختیارات حکمرانی منتقل کرنے میں تو وہ کانگریس کو کرنے ہوں گے۔ کیونکہ کانگریس ہی اس ملک کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس سے واضح تھا کہ پنڈت نہرو کہہ رہے تھے کہ اختیارات حکمرانی ہندوؤں کو منتقل کئے جائیں۔ نہرو کی اس دھمکی نے مسلمانوں کو خبردار اور ہوشیار کر دیا۔

پھر مسٹر محمد علی جناح کو لندن سے بلایا گیا اور لکھنؤ کی آل پارٹیز کانفرنس میں انکو لیڈر تسلیم کر لیا گیا اور ملک میں مسلم لیگ کی تحریک شروع ہو گئی۔ مسلم لیگ اور پاکستان کی تحریک میں مجلس احرار اسلام کا یہ موقف تھا کہ پہلے ہندوستان کو آزاد کرایا جائے پھر ہندوؤں سے بٹھا جائے تقسیم میں انگریز کو فیصلہ تسلیم کیا جائے۔ لیکن قلبی اور ذہنی طور پر ان کا موقف واضح تھا کہ جو قوم گائے کو مانتا بھکتی ہو اور اس گائے کو میا کھروں تک چبا جاؤں اس قوم کے ساتھ میرا اتحاد ناممکن ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شاہ جی نے تحریک پاکستان کی مخالفت میں اپنی تقریروں میں اظہار خیال کیا لیکن قیام پاکستان کے بعد واقعات نے ثابت کر دیا کہ شاہ جی وطن عزیز پاکستان کی سرزمین سے کس قدر محبت رکھتے تھے۔

۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء میں جب پنڈت نہرو نے پاکستان کی سرحدات پر فوجیں جمع کر دیں اور پاکستان کی آزادی کے لئے شدید خطرہ پیدا ہو گیا تو نے احرار کانفرنس کے اجلاس میں جو دہلی، روارہ لاہور میں منعقد ہوا۔ تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"پاکستان بن چکا ہے اب اسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی۔ یہ میرا وطن ہے اس کا ذرہ ذرہ میرے نزدیک مقدس ہے۔ اس کی حفاظت میرا جزو ایمان ہے۔ اگر بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو وطن عزیز پاکستان کی آزادی کی حفاظت میں لڑنے والوں میں سب سے آگے سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہو گا۔ اس مقدس سرزمین کی آزادی کی حفاظت میں جس شخص کا سب سے پہلے خون بہے گا وہ عطاء اللہ شاہ بخاری ہو گا۔"

آپ نے اعلان کیا کہ پوری قوم لیاقت علی خاں کے ساتھ ہے۔ آپ نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ سرکف اور کفن بردوش ہو کر پاکستان کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور اگر دشمن حملہ کرے تو اس کا منہ پھیر دیں۔"

شاہ جی جب تک زندہ رہے انہوں نے پاکستان کی خوشحالی، استحکام اور سر بلندی کے لئے بھرپور جہد و جد کی۔ شاہ جی نے مجموعی طور پر ساڑھے نو سال جیل کاٹی۔ علامہ انور شاہ قدس سرہ آپ کو بلبل ریاض رسول (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ مرزا نیت کے خلاف شاہ جی تمام عمر مصروف رہے۔ اس سلسلہ میں آپ کے خلاف مسٹر جی ڈی کھوسہ سیشن جج کی عدالت میں مقدمہ چلا اور اس مقدمہ میں کھوسہ نے تاریخی فیصلہ دیا۔ اس کے علاوہ مرزا نیت کے خلاف تحریکوں میں آپ کے خلاف تین چار ایسے مقدمات چلائے گئے جن میں عمر قید اور پھانسی کی سزائیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن آپ ان مقدمات سے بری ہو جاتے رہے۔ آخری دفعہ آپ خواجہ ناظم الدین کی وزارت (۱۹۵۳ء) کے عہد میں تحریک تحفظ ختم نبوت میں دوسرے علماء ہنکے ساتھ گرفتار ہوئے۔ بعض چودہ چودہ سال قید کی سزا دی گئی لیکن سال ڈیڑھ سال کے بعد آپ کو دوسرے علماء کے ہمراہ باعزت طور پر چھوڑ دیا گیا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب طریقت تھے اکثر سنا کرتے تھے کہ میں حضرت پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو لٹوی کامرید ہوں۔ روحانی طور پر مجھے ان سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ لنگے انتقال کے بعد آپ نے اپنا تعلق بیعت شیخ المشائخ حضرت عبدالقادر راسپوری قدس سرہ سے جوڑ لیا۔ اور پھر تاحیات انہیں سے منسلک رہے۔ میانوالی، مظفر گڑھ، ملتان اور ڈیرہ غازی خاں میں آپ کے ہزاروں مرید تھے۔ پاکستان بننے کے بعد آپ امرتسر سے ہجرت کر کے ملتان آکر آباد ہو گئے۔ ملتان سے انہیں محبت تھی اور اکثر ملتان کے متعلق کہا کرتے تھے۔

"ملتان ولیوں، قطبوں اور عالموں کی سرزمین ہے۔ اس سرزمین پر محمد بن قاسم کے قدم آئے اور اسلام کا جو پہلا شکر برصغیر میں محمد بن قاسم کے ہمراہ آیا۔ اس نے ملتان ہی میں اپنا ڈیرہ جمایا۔ اس میں کئی بزرگ بہت مرتبہ کے تھے جن کے نقوش کف پا کے نشان مجھے بھی نظر آ رہے ہیں۔"

"ملتان سے مجھے محبت ہے اس کا ماحول بالکل ایسا ہے جیسا عرب کا ہے۔ دور تک پھیلی ہوئی قبریں، کھجوروں کے جھنڈ، اولیاء اللہ کے مقابر، غازیوں اور مجاہدوں کے مزارات مجھے اسلام کے قرن اول کی یاد دلاتے ہیں۔ جب ہم کٹور کشائے عالم بن کر عرب کے ریگزاروں سے ٹکراتے اور ہمارا سیل رواں کسی سے ٹھم نہ سکا تھا۔

"ملتان کی سرزمین ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ جب اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلے تو تمام جغرافیائی وابستگیاں بھول جاؤ۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ وسیع دنیا مسلمانوں کی میراث ہے۔



## آفتابِ خطابت

بیٹے ہوئے دن کچھ ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے۔

یہ دلفریب موسم تھا، سورج کی کرنوں کی چبھن کم ہو رہی تھی شاموں کا حسن نکھر رہا تھا، ان لمبھی شاموں کو باغوں اور پارکوں میں، ہجوم بٹھنے لگا تھا، سبزہ بھوٹ رہا تھا، ہریالی آ رہی تھی ٹنڈ ٹنڈ درختوں پر پتے پھر سے نمودار ہو رہے تھے۔ باغوں اور میدانوں میں خوشبوئیں پھیلنی شروع ہو گئیں تھیں۔ مجھے آج ایک ایسے ہی موسم اور ایسے ہی دنوں کی بات کرنی ہے۔

آج بھی یہ موسم آتا ہے، آج بھی کونسلیں پھوٹی ہیں، ہریالی آتی ہے۔ آج باغوں اور پارکوں میں سرشام لوگوں کے ہجوم جمع ہوتے ہیں تاکہ وہ اس حسن سے لطف اندوز ہو سکیں۔ لیکن جو بات میں بتانا چاہتا ہوں وہ بات اب نہیں ہوتی۔

ان نئی بہاروں پر، ان نئے نظاروں پر  
اک رند ہی کے رو رہے ہیں میٹانے  
بہت برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں کی یاد کو سینے میں دبائے ایک مدت گزر گئی ہے۔ اب بھی جب یہ دن یاد آتے ہیں توجہ بات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ماضی کی ان یادوں میں کھو جانے کو جی چاہتا ہے۔

ایسے ہی موسم میں جب شاموں کا حسن نکھر آیا تھا اور راتیں خنک ہونی شروع ہو گئی تھیں تو قادیان میں مجلس احرار نے تبلیغ کانفرنس (اکتوبر ۱۹۳۴ء) کے انعقاد کا اعلان کیا تھا۔ صرف انعقاد کا اعلان اور وہ بھی مجلس احرار کی طرف سے ایک زبردست ہنگامے کو دعوت تھی۔ آج اتنے برس گزرنے کے بعد شاید نئی پود ان ہنگاموں کو سمجھ ہی نہ سکے اور نہ ہی کوئی مؤرخ بیان کرنے کے لئے تیار ہو۔ لیکن اس کے باوجود خطابت کی تاریخ اور شعلہ نوائیوں کی داستان میں یہ کانفرنس اپنا عنوان ڈھونڈ کر ہی رہے گی۔ ہاں تو جن دنوں اس کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہوا۔ اس وقت پنجاب میں مجلس احرار کا طوطی بول رہا تھا۔ اس شعلہ بیان خطیبوں کی جماعت نے مسلمانان پنجاب کو بہت حد تک متاثر کر لیا تھا۔ یہ کشمیر چلو تحریک کا مرکز سر کر چکے تھے۔ سر فضل حسین کی پوری کامیابیوں اور کامرانہیوں کے باوجود مسلمانوں کے درمیانی طبقے میں مجلس احرار انہی ساکھ پر ایک گھری چوٹ لگا چکی تھی۔ غرضیکہ چاروں طرف شہر اور قریہ میں ان شعلہ نواؤں کے چرچے تھے۔ میں بھی ان چرچوں سے متاثر تھا۔ نویں جماعت کا طالب علم مولانا داؤد غزنوی کے خطبوں سے شدید طور پر

مناظر، احرار کے جلوس کا رسیا، اب یہ موقع کیسے کھو سکتا تھا چنانچہ کچھ بزرگ دوستوں کے ساتھ قادیان روانہ ہو گیا۔

اب اڑیسٹھ برس بعد میں یہ یادیں دھندلا گئی ہیں صرف امیر شریعت کے الفاظ آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں، کہ قادیان میں ایک ہجوم تھا۔ جس کو، یہ قریہ جس نے "نبوت" کو تو منہاں لیا لیکن وہ امیر شریعت کے چاہنے والوں کو سیٹھنے سے قاصر تھا، کوئی گاڑی، کوئی بس، کوئی بیل گاڑی، کوئی ٹم ٹم، کوئی ٹانگہ، کوئی سائیکل ایسی نہ تھی۔ جو قادیان کی طرف نہ آرہی ہو، اور رضا کار دونوں پہلے پیدل چل دیئے تھے۔ جیسے جیسے یہ مختلف دیہات میں گزرتے دیہات والے بھی ان کے ساتھ ہو جاتے اور قادیان پہنچتے پہنچتے یہ خود ایک جگہ بھی ہوتے اور ایک جلوس بھی۔ یہ پہلی تحریک تھی جس نے یہاں کے مسلمانوں کے دونوں جذلوں کو بیک وقت متاثر کیا، ان کے نعرے ان کے جذبہ عشق رسول ﷺ کو بھی متاثر کرتے تھے اور ان کی انگریز دشمنی اور حب الوطنی کے جذبے کی بھی ان نعروں سے تشفی ہوتی تھی۔

اس کانفرنس کا انعقاد اکتوبر ۱۹۳۳ء کے تیسرے ہفتے میں ہوا اور ۲۱، ۲۲، ۲۳ اکتوبر کی تاریخوں کا اعلان کیا گیا تھا۔ کانفرنس کے لئے ایک سکھ زمیندار کی اراضی حاصل کی گئی تھی اس زمیندار کا نام ایشر سنگھ تھا، اس اراضی پر پنڈال بھی تیار ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن مرزائیوں نے اس اراضی پر قبضہ کر لیا۔ اب احراریوں کے لئے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ یا تو وہ اس اراضی کے لئے لڑتے یا پھر شہر سے دور کانفرنس منعقد کرتے۔ احرار نے جھگڑا کرنے سے گریز کیا، کیونکہ اس وقت مرزائیوں کے ان ارادوں کو بھانپتی تھی چنانچہ اس اشتعال کے باوجود مجلس احرار نے ایشر سنگھ کی اراضی پر کانفرنس منعقد نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے بعد قادیان سے ایک میل کے فاصلے پر ڈیڑی۔ اے وی سکول کے پہلو میں پنڈال تیار کیا گیا۔

کانفرنس سے دو دن پہلے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نامہ نگار نے قادیان سے خبر بھیجی تھی جس میں اس کانفرنس کے ضد و خال اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"مجلس احرار اکیس، بائیس اور تینیس اکتوبر کو ایک تبلیغی کانفرنس قادیان میں منعقد کر رہی ہے۔ اس کانفرنس کے لئے بڑے وسیع پیمانے پر تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مرزائیوں کی طرف سے مسلسل یہ مہم چلائی جا رہی ہے کہ اس کانفرنس سے انکا جان و مال خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ چنانچہ مرزائیوں نے اپنی حفاظت کے لئے لاتعداد دیہاتیوں کو اور اپنے مریدوں کو قادیان میں جمع کرنا شروع کر دیا ہے اور احرار کی اس کانفرنس میں بیس سے لے کر پچاس ہزار کا ہجوم پہنچا ہے۔ مزید برآں کانفرنس کے منتظمین کا مطالبہ ہے کہ ان کو کانفرنس کے صدر کا جلوس نکالنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ اور یہ جلوس قادیان شہر میں سے گزرے۔"

اس کانفرنس کے پیش نظر آج صبح پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس خود بہ نفس نفیس

قادیان آئے۔ ان کے ہمراہ پولیس کی بھی ایک بھاری جمعیت تھی۔ چنانچہ انسپکٹر جنرل پولیس نے کانفرنس وغیرہ کا موقع دیکھا اور احکام جاری کر دیئے گئے ہیں کہ اگر اس کانفرنس کے دوران میں قادیانیوں نے کوئی اجتماع منعقد کرنے کی کوشش کی تو یہ اجتماع خلاف قانون تصور ہوگا۔ انسپکٹر جنرل نے احراریوں اور ان کی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کو بھی متنبہ کر دیا ہے کہ وہ کانفرنس میں کسی قسم کے ہتھیار کے ساتھ شرکت نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ لاکھوں کو ساتھ لائے ہوئے بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ مزید برآں کانفرنس میں شرکت کے لئے آنے والے لوگوں کے لئے ایک خاص راستہ متعین کر دیا گیا ہے۔ نیز اگر کسی قسم کا جلوس نکالا جائے تو اسے شہر میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آج شام تک قادیان میں امن و امان بحال رکھنے کے لئے چار سو پولیس کے سپاہی پہنچ جائیں گے لیکن میرا اندازہ یہی ہے کہ یہ تمام پیش بندیاں بالکل غیر ضروری ہیں کیونکہ احراری ہر حالت میں کسی قسم کے جھگڑے سے اجتناب کرنا چاہتے ہیں۔ انہی کانفرنس کا پنڈٹال ڈی۔ اے۔ وی سکول میں بننا شروع ہو گیا ہے۔ اور ارد گرد کے تمام علاقے میں ۱۴۴ نافذ کر دی گئی ہے۔ مزید لاکھیاں نہ لانے کی بھی منادی کر دی گئی ہے۔"

اس اقباس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پورے پنجاب میں اس کانفرنس کے کس قدر چرچے تھے اور کتنے گوشوں سے اس کانفرنس کی کامیابی اور ناکامی کی خبروں کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ اس فضا میں یہ کانفرنس ہوئی اس کے صدر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ چنانچہ رات جب اپنا پورا سایہ ڈال چکی، لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہو چکے تو صدر کانفرنس سید عطاء اللہ شاہ بخاری شریف رحمۃ اللہ علیہ ہزار ہا انسان کا ہجوم اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی پنڈٹال میں آمد اور کون کون سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سر زمین میں دفن ہونے والا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نہیں، وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نہیں جس کی زبان گنگ ہو گئی تھی، جس کے چہرے کا بھریوں نے احاطہ کر لیا تھا جس کے بالوں میں بڑھاپے کی سفیدی آ گئی تھی، یہ وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے جن کا شباب اور شعلہ بیانی دونوں اپنے عروج پر تھے، جو لالہ سپیکر کے بغیر لاکھوں کے ہجوم کو سحر کر سکتا تھا، جس کا حسن اور بیان دونوں الگ الگ جادو جگاتے تھے۔ پچاس ہزار کا مجمع، رات کی خاموشی، قلموں کی روشنی اور لستے میں حسن و نور کے پیکر، شعلہ بیان خطیب اور شریعت کے امیر کی آمد تم آگئے تو از سر نو زندگی ہوئی

بس پھر کیا تھا مجمع میں کہاں ایک خاموشی اور ہو کا عالم تھا کہ اب وارفتگی اور دیدار یار کی بے تابی نے سب کو آن گھیرا ہے اور اس بے تابی اور وارفتگی کا اظہار نعروں کی گونج میں ہوتا ہے، شاہ جی ہیں کہ مسکراتے ہوئے مجمع کو چیرتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اسٹیج پر پہنچے، چاروں طرف نگاہ مست انداز میں دیکھا بس

پھر کیا تھا نعروں کا ایک اور سیل ٹوٹ پڑا۔ اور امیر شریعت فاتحانہ انداز میں مسکرا رہے ہیں۔ مجمع خاموش ہوا۔ تلاوت ہوئی نظم ہوئی۔ اب سے اڑھتھ برس پہلے کی تفصیلات کو دہرائیے اور انہی تفصیلات کو جن پر شاہ جی کی تاریخی تقریر کی دبیز تہیں چڑھی ہوئی ہوں، شاہ جی نے یہی کوئی نو ساٹھ سو نوے تقریر شروع کی ہوگی اور رات تھی کہ وہ بھی دم بخود گزرے جا رہی تھی لیکن شاہ جی کی شعلہ بیانی بڑھتی جا رہی تھی، اس شعلہ بیانی اور آتش نوا کی کوہدم قدم پر نعروں، قہقروں اور آنسوؤں کے ذریعے خراج عقیدت پیش ہو رہا تھا۔ یہی وہ تقریر تھی جس میں شاہ جی نے اپنا مشہور جملہ کہا تھا۔

”تم اپنے بابا کی ”نبوت“ لے کر آؤ اور میں اپنے نانا کی نبوت لے کر آتا ہوں تم حرر و دیا زیب تن کر گئے آؤ اور میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق کھدر پہن کر آؤں۔ تم یا قوتی اور پلور کی شراب کے خم لٹھا کر آؤ اور میں روکھی سوکھی روٹی کھا کر آؤں اور پھر زمانہ فیصلہ کرے کہ کون سچے نبی کی اولاد ہے۔“

یہ تقریر جو رات کی خاموشی میں شروع ہوئی تھی۔ جو عشاء کی نماز کے بعد جب ابھی رات کا آغاز تھا لوگوں نے سننی شروع کی تھی۔ یہ تقریر پوری رات ہوتی رہی اور مجمع بیٹھا رہا۔ ایک بھی ذی نفس ایسا نہیں تھا جس نے ٹھکن کا اظہار کیا ہو، جس کے چہرے سے اکتاہٹ کی غمازی ہوئی ہو۔ ملتے میں صبح کا نور پھیلنا

شروع ہو گیا۔ اور مؤذن نے اذان دے دی۔ تقریر تھی کہ اس وقت بھی اپنے عروج پر تھی لیکن مؤذن نے اس سیل رواں کو روک دیا اور خطابت کے دریاؤں کو بند مار دیا۔ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں بہت کم خطیب اور مقرر ایسے گزرے ہیں جنہوں نے رات رات بھر تقریر کی ہو جنہوں نے لوگوں کو اس قدر مسحور کیا ہو جیسا کہ امیر شریعت نے کیا ہے۔ کوئی آیا نہ آئے گا لمیسکن کیا کریں گے نہ انتظار کریں

اور غالباً اسی موضوع کو حسرت موبانی نے کہا تھا۔

بلاکشان غم انتظار ہم بھی ہیں

خراب گردش لیل و نہار ہم بھی ہیں

آج تقریباً صدی گزرنے کے بعد جب ہم اس عظیم ہستی کی یادیں سمیٹ رہے ہیں تو کچھ حلقوں میں یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ آخر یہ ہستی اتنی اہم کہاں تھی کہ اسکی یاد میں آنسو بہائے جائیں، صفحات سیاہ کئے جائیں اخبارات اور رسالوں کے نمبر لگالے جائیں۔ آخر احرار یا بخاری نے کون سے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ کہ لٹکے کارناموں کی فہرست افتراق و انتشار انگیز تحریکوں سے بھری پڑی ہے۔ اس لئے انکو دوبارہ ہوا و نہا کہاں کی خدمت اور کہاں کی نیکی ہے۔

یہ سب سوالات آج کل بہت سے حلقوں میں اٹھائے جا رہے ہیں کہ ان سوالات کے جواب دیئے جائیں تاکہ تاریخ کی گریں کھل سکیں۔ اور جن تحریکوں کو افتراق و انتشار کا مظہر بتایا جاتا رہا ہے۔ یا آج بتایا جا رہا ہے اس کے متعلق مورخ کو مواد مل سکے۔

مجھے اس صحبت میں صرف ایک مختصر سے سوال کا جواب دینا ہے۔ یہ سوال پچھلے پچاس ساٹھ برس سے اٹھایا جا رہا ہے کہ قادیانیوں یا احمدیوں کے خلاف تحریک مسلمانوں میں افتراق پھیلنے کے مترادف نہیں ہے.....؟ ایک اور طبقے کی طرف سے بھی یہ سوال اٹھایا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی سیاست کو مذہب کا تابع بنایا جا رہا ہے۔ اور اس طرح غلط اقدار اور رجعت پسند نظریات کو شدہ دی جا رہی ہے؟ ان سوالوں کا جواب تفصیل چاہتا ہے اور ان کا جواب پچھلے پچاس برس کی تحریکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک بات واضح ہے کہ قادیانیوں کے خلاف تحریک مسلمانوں کی ایک بہت اور بالخصوص پنجاب کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی سامراج دشمن تحریک تھی اور پنجاب میں سامراج اور اس کے مسلمان خلیفوں کو شکست دینی اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک قادیانیوں کا ظلم نہ توڑا جاتا اور عوام کو انکی اصل حقیقت سے آگاہ نہ کیا جاتا۔ باقی دوسرے سوال کا جواب بھی یہی ہے کہ سامراج اور رجعت پسند طاقتیں اکثر و بیشتر غلط مذہب اور لوگوں کی توہم پرستی سے فائدہ اٹھا کر اپنے اثر کو عوام میں پھیلاتے ہیں اس لئے سامراج دشمن تحریکوں اور جماعتوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ سامراج کی ان سازشوں کو بھی بے نقاب کریں۔ اور آج یہ حقیقت ہے کہ پنجاب میں اس وقت میں مجلس احرار نے سامراج کی اس سازش کو بے نقاب کیا تھا۔ اس سلسلے میں تاریخ لکھنے والوں کو بہر حال توجہ کرنی چاہیے۔

امیر شریعت کی اس تقریر کی بنا پر ۱۵۳ الف کے تحت ان کی گرفتاری عمل میں آئی اور ان پر مقدمہ چلا اور ان کو ماتحت عدالت نے سزا سنائی لیکن جی۔ ڈی۔ کھوسلہ جو ان دنوں گوئڈاس پور میں سیشن جج تھے نے امیر شریعت کی سزا کو گھٹا کر تاہر خاست عدالت تک رہنے دیا اور اپنے فیصلے میں قادیانیوں کے متعلق بہت ہی سفت تجزیہ کیا۔ اور قادیانیوں نے قادیان میں اپنے مخالفین پر مظالم کو تسلیم کیا۔ اس فیصلے پر زبردست لے دے ہوئی اور قادیانیوں نے بالاخر ان رہبر کس کو حذف کروانے کے لئے ہائیکورٹ کی طرف رجوع کیا۔ یہ مقدمہ بذات خود ایک داستان ہے۔ اسے کسی اور وقت مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔



## عزم تیرا کوہ کن، جرأت تری باطل شکن

باغِ منت پر ہے طاری کیوں خزاں کا سا اثر کیوں فسرده ہر جوان و پیر آتا ہے نظا  
آنکھ کیوں ہر فردِ امت کی نظر آتی ہے تر گم نظر آتا ہے اپنی بے خودی میں ہر بشر  
آ رہی ہے یہ ہر اک جانب سے کانوں میں خبر

کر گئے ہائے بخاری آج دنیا سے سفر  
عمر گزری جس کی جیلوں اور ریلوں میں تمام کر دیا زیر و زبر افزنگ کا جس نے نظام  
حفظِ ناموسِ رسالت میں گزارے صبح و شام بادۂ توحید کے بھر بھر دئے امت کو جام  
کر لیا بے خدمتِ دیں نفس پر بیٹنا حرام

تھا مسلمانوں کے ہر طبقے میں جس کا احترام  
آل و اصحابِ نبی کی آن و حرمت کے لئے زندگی بھر دشمنانِ دین سے لڑتے رہے  
جتنے فتنے ہند و پاکستان کے اندر اٹھے اے بخاری تو نے سب کے سر کچل کر رکھ دئے  
جس طرف بھی قادیانی غول کے پیچھے بڑھے

دُم دبا کر بھاگ نکلے قادیانی بُوزنے  
جب کبھی تقریر فرماتے کسی موضوع پر بے تکلف بولتے رہتے اسی پر رات بھر  
اٹھ کے جانے کا نہ لیتا نام کوئی تا سمر کر دیا ہو جیسے جادو آپ نے پنڈال پر  
تجھ کو بخشی تھی خدا نے دولتِ حسنِ کلام

اے علم بردار ختم الانبیاء تجھ پر سلام  
بُو تُرابی خون تھا تیری رگوں میں موجزن دیکھ کر تجھ کو عدو کا کناپ جاتا تھا بدن  
عزم تیرا کوہ کن جرأت تری باطل شکن مسکراہٹ تھی لبوں پر ہر گھمٹی جلوہ فگن  
زندگی بھر پرچمِ اسلام لہراتا رہا

قلبِ مسلم جوشِ ایمانی سے گرماتا رہا

## وہ مرد درویش

نہ جانے میں کس خیال میں تھا کہ خطیب چادو بیان اور مقرر شیوہ نوار نیس الاحرار امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر سن کر ایک بیکراں سکوت کے عالم اور ہیبت ناک سناٹے کے سمندر میں کھویا ہوا جب شاہ جی کی زندگی کے چالیس سالہ شبانہ روز رفیق شیخ حسام الدین کی طلب میں نکلا۔ کہ شاہ جی کے انتقال کی خبر کی تصدیق کر سکوں تو مجھے گوالندھی کے میلاد النبی ﷺ کی تقریب کے لئے جے ہوئے درودیوار اور جیسے کسی سیلے میں شریک انسانوں کی بھیڑ بھی ایک شہرِ خوشاں محسوس ہوئی مجھے یوں لگتا تھا جیسے لوگوں سے آج ان کی قوت گویائی اور طاقت بیانی جھین لی گئی ہے۔

شاہ جی کے دیرینہ رفیقوں میں شیخ حسام الدین کو ایک خاص درجہ حاصل ہے وہ کم و بیش چالیس سال شاہ صاحب کے رفیق زندگی رہے ہیں۔ اور اس اثنا میں بہت کم لمحے آئے ہیں جب دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہوں۔ ان دونوں بزرگوں نے برطانوی سامراج کے خلاف جنگ کرتے ہوئے متعدد بار جیل کی کال کو ٹھہری کورونق بخشی۔ لیکن شیخ صاحب کے قول کے مطابق ان کی زندگی میں صرف چار مواقع ایسے آئے ہیں جب انہیں زنداں کے درودیوار میں بھی شاہ جی کی مصاحبت نصیب رہی ہے۔

۱۸ اگست کو شاہ جی ابھی بقید حیات تھے۔ شیخ صاحب ان کی تشویشناک حالت کی خبر سن کر عیادت کے لئے ملتان تشریف لے گئے۔ اور اسی شام کو جب واپس لاہور پہنچ گئے۔ تو ایک گونہ دل کو تسلی ہوئی کہ شیخ صاحب کا اتنی جلدی ملتان سے واپس چلے آنا ضرور شاہ جی کی طبیعت کی بحالی کی غمازی کرتا ہے۔ انہی خوش کن خیالات کی رو میں بتا ہوا شاہ جی کی صحت کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لئے جب شیخ صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ گاؤ نکلیے پر ٹیک لگائے کسی گھری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اور ان کے سرخ و سپید بوڑھے چہرے پر حزن و ملال لے گھٹا ٹوپ اندھیرے چارہے تھے۔ میرے دریافت حال پر انہوں نے کروٹ لی۔ اور بمشکل تمام آنسوؤں کو روکتے ہوئے لپکپائی آواز میں گویا ہوئے۔ کہ

”کیا بتاؤں بھئی شاہ جی کی طبیعت کیسی ہے۔ میں آج ان کے پاس اس لئے نہیں ٹھہر سکا۔ کہ مجھ سے ان کی حالت دیکھی نہیں گئی۔ آہ خطیب شیوہ بیان۔ وہ مقرر نکتہ سنج جو ہزاروں نہیں لاکھوں کے مجمع میں اکیلے ہی بو لے چلا جاتا تھا گھنٹوں نہیں پہروں بلکہ اگر جائز ہوتا تو دنوں،

ہفتوں اور مہینوں وہ مسلسل بو لے چلا جاتا۔ اور کسی کو اس کی تقریر میں بولنے تو کیا کوٹ لینے کی مجال نہ ہوتی۔ آج ایک تصویرِ حیرت ہے۔ وہ عطاء اللہ شاہ بخاری جس کی موجودگی میں بڑے بڑے

مقرر تقریر کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ آج اپنے تیار داروں اور ہمدردوں کو دیکھتا ہے پر نہ تو ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے۔ اور نہ ہی اپنی قلبی کیفیت بیان کر سکتا ہے۔ اس نے زندگی کا ایک طویل عرصہ تبلیغ اسلام اور عشق رسول کی لگن میں گزارا ہے۔ اور آج مایوسی و دل شکستگی کے عالم میں پکار رہا ہے۔

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی  
دہن بر چہرہ زخے بود و بہ شد

انتا کھنے کے بعد شیخ جی نے اپنے آپ کو کچھ منجلا اور شاہ جی کی زندگی کے جلی عنوانات پر گفتگو کا آغاز کر دیا۔ شاعر مشرق حکیم الامت علامہ اقبال کے ساتھ شاہ جی کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے بتایا کہ کبھی کبھار ہم جب لاہور میں قیام پذیر ہوتے تو میری یا کسی دوسرے کی خواہش پر شاہ جی ہمارے ساتھ علامہ کے ہاں چلتے اور جب علی بخش کی زبانی علامہ کو شاہ جی کی آمد کا پتہ چلتا تو وہ جیسے لباس میں بھی اندر بیٹھے ہوتے اٹھ کر جلدی سے باہر چلے آتے۔ اور آتے ہی شاہ جی سے کہتے "شاہ جی آپ اس طرح قصرِ یف لا کر مجھے شرمندہ کیوں کر دیتے ہیں۔ کم از کم اپنی آمد سے پہلے مجھے اطلاع تو کر دیا کریں۔

اس پر شاہ جی اپنے مخصوص انداز میں فرماتے۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کو نہیں معلوم ہماری نظر میں آپ کیا ہیں۔ میں ایک فقیر ہوں اور فقیر یہاں اپنی کٹیا میں آتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ فقیر کو اپنی کٹیا میں اسی طرح بے تکلف چلے آنا چاہیے۔"

"نہیں شاہ جی میں کس کام کا آدمی ہوں۔ آپ تو مجاہد ہیں کہ تبلیغ اسلام ایسے نہایت ہی اہم اور اس دور میں دشوار ترین فریضے کو انجام دیتے ہیں۔"

علامہ کے یہ ارشادات سن کر شاہ جی صرف کہتے کہ "ڈاکٹر صاحب! ہم مسلخ بھی تو آپ ہی کے ہیں" اور سلسلہ کلام کو قطع کرنے کے لئے علامہ سے شعر سنانے کی فرمائش کر دیتے۔

علامہ کے معتمد اور مشہور خدمت گزار بابا علی بخش نے اس ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ

"شاہ جی اکثر علامہ کو ملنے آیا کرتے تھے۔ اور ان کی آپس میں گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ

ان کے درمیان نہایت خوشگوار تعلقات استوار ہیں۔ بابا علی بخش کہنے لگے۔ کہ ایک دفعہ میں ریل میں سوار پانی پت کو جا رہا تھا۔ کہ راستے میں شاہ جی بھی گاڑی کے اس ڈبے میں سوار ہو گئے سلام و دعا کے بعد سب سے پہلے تو انہوں نے مجھ سے علامہ کے حالات دریافت کئے۔ اور پھر فرماتے لگے۔ علی بخش تجھے خبر نہیں کہ ہم جو کچھ اپنی تقریروں میں کہتے ہیں وہ علامہ ہی کے افکار ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہی بات جب ہم شیخ پر کہتے ہیں تو انگریز کی نظر میں گردن زدنی تک ہو جاتے



ہیں جو علامہ اشعار کی صورت میں فرما دیتے ہیں اور انہیں کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔  
یہاں شیخ صاحب نے اس امر پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ علامہ کی وفات کے بعد ان سے اپنا رابطہ  
ثابت کرنے کے لئے لوگوں نے کیا کیا نہیں لکھا۔ اور چونکہ ہمارا علامہ کے ہاں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ جس کی  
بنا پر ہمیں معلوم ہے کہ علامہ کس قسم کے لوگوں سے تعلقات استوار رکھتے تھے۔ اس لئے بعض لوگوں پر  
سخت حیرت ہوتی ہے کہ آخر انہیں ایسا کرنے میں کیا مزا ملتا ہے۔  
کھم و بیش ساٹھ سالہ شیخ حسام الدین اپنی فعال اور محرک زندگی کے تجربات اور مشاہدات بیان کرتے  
ہوئے کہنے لگے کہ

ایک انسان کی حقیقی تصویر دیکھنے کے لئے مسافرت اور معاملات کے علاوہ قید و بند کی  
رفاقت بھی بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اور قید خانہ بھی ایک گوشہ زندگی ہے۔ جس کے در و دیوار  
میں بٹھنے پھولنے والی دوستیاں اور نفرتیں بڑھی مضبوط ہوتی ہیں۔ آدمی کسی کی مصاحبت میں دو چار  
دن اپنے آپ کو مصنوعی تکلفات کے لحافوں میں لپیٹے رکھ سکتا ہے لیکن چونکہ جیل کی رفاقت اتنی  
منتصر نہیں ہوتی۔ اس لئے ایک نہ ایک دن مجبوراً آدمی کو یہ لباذہ اتار کر نگاہ ہونا ہی پڑتا ہے اور پھر  
انسان کی حقیقی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے قید خانے میں بھی شاہ جی کی  
صحبتوں کے لطف اٹھائے ہیں وہ کبھی بھی انہیں فراموش نہیں کر سکیں گے۔

شاہ جی کی باغ و بہار اور شرعی احکامات میں ڈوبی ہوئی زندگی جیل کی چار دیواری میں اور اجاگر  
ہو جاتی تھی۔ وہ بیچ و قسہ نمازوں اور اپنی قرآن خوانی کے اوقات کے علاوہ بیشتر ہر دم شعر و سخن اور  
بذلہ و طرب کی محفل سجا دیتے تھے۔ اور کیسے کیسے اشعار کس مرزے سے سناتے تھے یہ انہیں کا حصہ  
تھا۔ اور پھر جب لطیفہ گوئی پر آتے تو تاریخی واقعات کو ایسا لطیف رنگ دے کر بیان کرتے کہ یہ  
انہیں پر ختم ہو گیا۔

شاہ جی کی زندگی کا روشن ترین پہلو ان کی اسلام کے ساتھ شیخگی اور نبی اکرم ﷺ کے  
ساتھ والہانہ محبت کے جذبات میں پوشیدہ تھا۔ وہ زندگی کی ہر بڑی سے بڑی مصیبت اور تکلیف کا  
ہنستے کھیلنے مقابلہ کر جاتے تھے۔ لیکن جہاں اسلام اور حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس کے متعلق  
(معاذ اللہ) کسی نے غیر محتاط بات کہہ دی۔ شاہ جی اسی وقت شعلہ جوالا بن جاتے تھے اس معاملے میں  
وہ بڑی سے بڑی طاقت کے ساتھ بھی ٹکرا جانے میں اپنے آپ کو کمزور نہیں پاتے تھے۔ وہ جس  
طرح حضور پر نور ﷺ کے والد و شہید تھے۔ اسی طرح اسوہ حسنہ کے ساتھ بھی انہیں دلی لگاؤ تھا اور حتی  
المقدور شریعت کی جزئیات تک پر عمل پیرا رہتے تھے۔

شاہ جی کے اتباع شریعت کے کردار کے بارے میں شیخ حسام الدین نے حسب ذیل واقعہ سنایا تو ان  
کی پر اسرار آنکھوں میں آنسوؤں کے جگنو چمکنے لگے۔ اور دنیا کے انداز دیکھ دیکھ کر ان کے اکٹائے اور ٹٹکے

ہوئے چہرے پر حزن و ملال کے تہہ بہ تہہ بادل چھا گئے۔ فرمانے لگے

"کہ ابتداء میں جب شاہ جی کا میرے ساتھ تعلق خاطر بڑھا تو وہ مجھے نماز کی ادائیگی میں مداومت کی تلقین کرنے لگے۔ اور پھر جب میری عادات میں کچھ زیادہ تغیر نظر نہیں آیا تو یہ اصرار و ابرام یہاں تک بڑھا کہ جیل کی رفاقت میں ایک دن میرے سامنے بیٹھے ہوئے انہوں نے اپنی ٹوپی سر سے اتاری اور میرے پاؤں پر رکھ کر کہنے لگے۔ "حسام یہ ٹوپی کسی بڑے سے بڑے فرعون اور نمرود کے پیروں پر بھی نہیں پڑ سکتی۔ میری تم سے صرف یہی التجا ہے کہ اس ٹوپی کی ضرر م رکھ لو اور پہنچ وقت نماز کی ادائیگی میں سستی اور کاہلی نہ کیا کرو۔"

اس سلسلے میں شیخ صاحب نے بتایا کہ شاہ جی کے قرابت داروں میں سے کسی نے اپنی جوان لڑکیوں کو بے پردگی کی اجازت دیدی تو شاہ جی ایسے کبیدہ خاطر ہوئے کہ ان سے عمر بھر کے لئے علاقہ تعلق ختم کر دیا۔

یہاں پہنچ کر شیخ صاحب کے ذہن کے پردہ پر شاہ جی کی زندگی کے مختلف عنوانات ایک تصویر کی طرح چلنے لگے۔ اور وہ پھر بحر فکر میں ڈوب گئے۔ ایک طویل وقفے کے بعد جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو نہایت نو میدی و یاس کے ساتھ کہنے لگے۔ بس! باقی باتیں کسی دوسری خست میں ہوں گی۔"

معلوم ہوتا تھا کہ شاہ جی کی شیعہ زندگی کے عقرب ہی جھرک اٹھنے کے اندیشے نے ان کے دل و دماغ کو جیسے سخت مضطرب اور بے چین کر دیا ہے اور اب ان میں تاب گفتار نہیں رہی ہے۔ میں نے ان سے اجازت لی اور بے کلی کے عالم میں انہیں تکیہ پر کوٹیں لیٹے ہوئے چھوڑ کر اٹھ آیا۔

۲۱۔ اگست کی شام کو شاہ جی کے انتقال کی خبر فضاء کو سو گوار کر گئی تو میں نے لاکھ کوشش کی کہ شیخ صاحب سے مل کر اس گفتگو کو مکمل کر لوں۔ لیکن باوجود کہ شیخ صاحب ابھی لاہور ہی میں تھے۔ ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اور وہ پریشان و خستہ حال ایسے کھوئے رہے کہ ان کی خبر تک نہیں لگ سکی کہ کہاں ہیں؟

حضرت امیر شریعت کی تجہیز و تکفین کے بعد ۲۳ اگست کو شیخ صاحب جب لاہور پہنچے تو انہیں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا گویا وہ آج ملتان میں واصل جہاڑ آئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے شاہ جی کو ذرا بھی نزدیک سے دیکھا ہے۔ اور ان کی مفلوں کے مزے لوٹے ہیں ان کی ساری متاع حیات ہی شاہ جی کی ذات گرامی تھی۔ اور شاہ جی کے زیر زمین جاتے ہی ان کی نظر میں دنیا اگرچہ اندھیر ہو گئی۔ لیکن ان کے دلوں میں شاہ جی کی زندگی کے مشن کی شمعیں اور زیادہ نور دینے لگی ہیں۔

شاہ جی کے جنازے کے جلوس کی مظہر کشی کرتے ہوئے متعدد بار شیخ صاحب کے ضبط و تحمل کا پیمانہ لہریز ہوا۔ لیکن ان کی آنکھوں میں آنسو اب رہ ہی کہاں گئے تھے جو چمک پڑتے۔ انہوں نے بتایا کہ ملتان کی سرزمین نے آج تک اتنا عوامی اجتماع نہیں دیکھا تھا۔ کراچی سے لے کر پشاور تک کے لوگ وہاں پہنچے ہوئے

تھے کہ اس دیوانہ نام محمد ﷺ کی آخری زیارت کا حشر حاصل کریں۔ کوئی آنکھ نہیں تھی جس سے سیل سرشک نہ بہہ نکلا ہو گوئی دل نہ تھا جس کی بے قراری اور بے تابی سے دھڑکنیں صاف سنائی نہ دیتی ہوں۔ کوئی زبان نہ تھی جو دبے دبے گھٹے گھٹے نالہ و فغاں میں مصروف نہ ہو۔ اور پھر جب اس درویش بے کلیم کا جنازہ اٹھا تھا اور آخری آرام گاہ کی طرف چلنے لگے تو فرط غم سے لوگوں کے پاؤں اس قدر بوجھل ہو چکے تھے کہ چلنا محال ہو گیا تھا۔ ملتان کے باشندے اتنا بڑا مجمع دیکھ کر سنت حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ لیکن جب کسی ملتان سے کہا کہ "اے پیر سائیں! اے پیر سائیں! اے پیر سائیں!" تو ان کا تحیر ٹوٹا۔ اور اب سب کی زبان پر تھا کہ

"ہاں اے پیر سائیں! اے پیر سائیں! اے پیر سائیں!"

آج شاہ جی اس دار فانی میں نہیں ہیں اور صرف ان کی یاد مونس الارواح ہے۔ لیکن ان کی زندگی کے مجاہدانہ کارنامے اور عتیق رسول ﷺ کے بے پناہ جذبات اس مرد درویش کو ہمیشہ ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھیں گے۔ اور کوئی طاقت بھی ان کے نام کو صفحہ ہستی سے نابود نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ تاریخ کے صفحات اس نام کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں جو عوام کے لوح دل پر ثبت ہوں اور شاہ جی کا نام گونا گوں اوصاف کے باعث لوگوں کے دلوں پر اس طرح نقش ہے۔ کہ مٹائے نہیں مٹ سکے گا۔

## شاہ جی دے نات

قوم دے درد نوں جان والا اج اوہ ساڈے کول نتیں  
 جھوٹ تے سچ نوں وکھ کر دسیا، مارے ایس وچ جھول نتیں  
 اُس دی سوچ تے فکر سنبھا ساڈے لئی اے بانگ درا  
 ایہ موتی انمول نے سمجھ پیراں دے وچ رول نتیں  
 لعنت اوس ورتارے اُتے کرے جو کمر فریاں لئی  
 شاہ جی دا اکھان ہے یارو، تیرا میرا بول نتیں  
 اوہدے گروں کیہہ ورتی، کیہہ پچھو، کیہہ دساں میں  
 یاد اوہدی تڑپاوے ساہنوں، ہجر کھانی پھول نتیں  
 عزت، غیرت، ازکھ دی خاطر آہدا لا خدا راں نال  
 دین ایمان دی خاطر سبناں، پھر تلوار، کنگول نتیں  
 ظلت دے ایس موسم دے وچ سورج بن نتیں سکدا  
 جیڑا بندہ یار عزیزا، ہمت رکھدا کول نتیں!  
 عزیز سندھو (ملتان)

۴۸۴  
ظلم کے آگے ترا سر خم ہوا؟ ہرگز نہیں!

پروفیسر نذیر احمد خواجہ

تھی فضا خاسوش حرکت میں نہ تھی باد صبا  
لطمہ امواج سے خالی تھا دامنِ بحر کا  
ظلمتوں کے جال میں انجم تھے سب رشتہ بہ پا  
ایک سناٹے کا حاکم گشتِ ملت پہ تھا  
تھے خزاں کی گرد سے سب پھول کھلانے ہوئے  
باغبانوں کے بھی دل تھے سخت مرجھائے ہوئے  
اس طرح اغیار نے لوٹی بہارِ زندگی  
نے یقینِ مرگ تھا نے اعتبارِ زندگی  
کوئی باقی ہی نہ تھی وجہ قرارِ زندگی  
بجھ چلا تھا قلبِ ملت سے ضرارِ زندگی  
ظلمتِ باطل نے یوں مستور نورِ حق کیا  
زمرموں سے عشق کے خاسوش طورِ حق کیا  
ایک ہنگاموں کی دنیا اپنے دامن میں لئے  
آگیا ایسے میں کوئی تیغِ حق عریاں کئے  
اُس کی پھونکوں سے چمک اٹھتے تھے ایماں کے دیئے  
سوزِ تدبیر سے سب چاکِ دل اُسنے سنے  
اس مجاہد کا عطاء اللہ بخاری نام تھا  
راستی پر ڈٹ کے جاں دنا یہ اس کا کام تھا  
اے کمالِ عظمتِ ملت کے تابندہ نشان  
اے شریعت کے علیبردار اے غازی جواں  
ٹو تو نہ تھا اک بلبلِ رنگیں نوا شیریں بیاں  
شعلہ آواز میں تیرے نہاں تھیں بجلیاں  
تو مثالِ ابرِ غزاں چھا گیا افلاک پر  
اور برسا صورتِ شبنمِ وطن کی خاک پر  
اے غلامِ مالکِ ہر دو جہاں صاحبِ یقیں  
ظلم کے آگے تیرا سر خم ہوا؟ ہرگز نہیں  
یہ کبھی ممکن نہ تھا اے کافلہ سالارِ دس  
تورِ دے زنجیرِ آہن تیرا عزمِ آہنیں  
جذبہ آزادی توحیدِ زنداں کھم نہ کرد  
ذوقِ سیرِ راہِ حق خارِ مغیلاں کھم نہ کرد

## حامل سنت نبوی

امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم و مغفور کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اگر برصغیر پاک و ہند کی تحریک آزادی کا جائزہ لیا جائے تو حضرت شاہ جی مرحوم کا نام نامی اور اسم گرامی آسمان سیاست پر چمکتا اور دکھتا نظر آتا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سارے برصغیر اور خصوصیت سے سابق پنجاب کے عوام میں روح آزادی کو جاری و ساری کرنے کا کام جتنا جی صاحب نے کیا ہے کوئی دوسرا مقامی سیاسی لیڈر ان کے پاسنگ نظر نہیں آتا۔

عوام میں موافق ہو یا مخالف جو عزت، شہرت اور عظمت شاہ صاحب کو نصیب ہوئی۔ وہ کم سیاسی زعماء کو ملتی یہ جی صاحب کا کمال تھا کہ سامعین گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوتے تھے اور حسن تقریر کا یہ عالم کہ عشاء کی نماز کے بعد شروع کرتے تو صبح کی نماز کے وقت ختم ہوتی۔ اور وہ اس لئے کہ صبح کی نماز پڑھنی ہوتی تھی۔ اور جلسہ گاہ میں عوام کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ جیسے ان پر جادو کر دیا گیا ہو ہزاروں نہیں لاکھوں کا مجمع یوں ساکت و صامت ہوتا جیسے پتھر کے بت جلسہ گاہ میں نصب کر دیئے گئے ہوں۔

مجھے ذاتی طور پر صاحب سے بہت ہی کم شرف نیاز حاصل ہوا۔ لیکن کبھی کبھی ان کی خدمت میں شرف ہار بانی نصیب ہو جاتی ان میں سے ایک دن کی بات جواب تک میرے ذہن میں محفوظ ہے عرض کرتا ہوں۔

حضرت شاہ محمد غوث کی مسجد کے سامنے مجلس احرار کا ملحقہ دفتر تھا۔ حضرت شاہ صاحب وہاں مقیم تھے میں اور عطاء اللہ شاہ ہاشمی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حسن تقدیر کہ اہل مجلس منظور ہو رہے تھے اور شاہ جی کے لطائف و ظرائف کبھی کبھی مجلس کو کشت زعفران بنا دیتے۔

یہ ایک بات کارخ پٹلا اور مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری پر بات چل نکلی بہت سے لوگوں نے اس میں حصہ لیا۔ یہ ایک شاہ جی نے اپنے زانوں پر ہاتھ مارا اور فرمانے لگے یارو! افضل حق چودھری نے جو بات کہہ دی ہے اس نے میری آنکھوں سے اقتصادیات کے سارے پردے اٹھا دیئے ہیں۔ چودھری افضل حق نے کیا بات کہہ دی جس کی طرف کسی مسلمان کو دھیان ہی نہیں گیا۔ واہ چودھری تو نے کیا بات کہہ دی۔ اور میں تو اس بات کو یاد کر کے اکثر روتا رہتا ہوں۔

اس وقت شاہ جی پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو رہی تھی سب سامعین شاہ جی کی بات سننے کے لئے سراپا گوش بنے ہوئے تھے۔ شاہ جی نے فرمایا۔ چودھری نے ایک ایسی سنت کی طرف مجھے متوجہ کیا جو ہمارے

ذہن تک میں نہ تھی۔

سنت رسول ﷺ پر عمل کرنے پر مسلمان اپنی نجات خیال کرتا ہے اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ سنت رسول ﷺ کے باہر کوئی بات نہ ہو۔ لیکن جو سنت چودھری نے بتائی اس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی کسی نے اس کے متعلق سوچا تک نہیں۔

سنت کیا ہے؟ چودھری نے کہا شاہ جی آپ یہ تو بتائیے کہ جب نبی آخر الزماں ﷺ کا وصال ہوا تو حضور کے گھر میں کیا تھا میں چوٹکا اور کہا حضور کے گھر میں کیا ہوتا؟ حضور نے فرمایا اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہوتا تو اس وقت تک مسجد نبوی سے نہ اٹھتا جب تک اس کا ریزہ ریزہ مسلمانوں میں تقسیم نہ کر دیتا۔

چودھری نے کہا۔ شاہ جی! حضور ﷺ کی اس سنت پر کوئی عمل کرتا ہے؟ کہ جب وہ مرے تو حضور کی سنت میں اس کے گھر میں کچھ نہ ہو۔

شاہ جی فرمانے لگے چودھری کی اس بات نے مجھ پر وجدانی کیفیت طاری کر دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاہ جی نے اس کے بعد اس سنت نبوی ﷺ پر پوری طرح عمل کیا۔ امر تسمیر میں ان کا ایک عمدہ مکان تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد ملتان میں کرائے کے مکان میں زندگی بسر کر دی اور واقعی جب شاہ جی کا انتقال ہوا تو ان کے گھر میں کچھ نہ تھا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

## اک ضربِ کلیمانہ

تھی طبع سلیم ان کی اور ذوق کلیمانہ  
احباب سے ملتے یا اغیار سے وہ ملتے  
راخ تھے عقیدہ میں اور عزم کے پختہ بھی  
اسرارِ لطیفانہ در بابِ نصیحت وہ  
گفتار بھی شیریں تھی اور لہن بھی داؤدی  
تحریر میں تھا ان کے اندازِ ادبانہ  
روقتوں کو ہنساتے تھے اور ہنستوں کو رلا دیتے  
وہ قوم کے خادم تھے احرار کے تھے قائد

شفقت میں جھلکتی تھی اگل شانِ کریمانہ  
ہنکوں پہ بٹھاتے تھے اپنا ہو کہ بیگانہ  
دنیا نے عمل میں بھی یکتاؤ یکدانہ  
کرتے جو بیاں ہوتا اندازِ فصیحانہ  
تقریر میں ہوتا تھا اک رنگِ خطیبانہ  
تھا طرزِ کلم کیا؟ اک ضربِ کلیمانہ  
تھی ان کی خطابت میں تاثیرِ طلسمانہ  
وہ مرد مجاہد تھے، تھی شانِ شجاعانہ

اللہ نے بخشا تھا اک ذہن رسا ان کو

تھا نام "عطاء اللہ" اوصافِ بزرگانہ!

## شاہ جی اور ان کا مشن

زندہ قومیں اپنے جلیل القدر رہنماؤں اور بزرگوں کی یاد ہمیشہ تازہ رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت امیر شریعت کو جنہیں شاہ جی کے پیارے نام سے یاد کیا جاتا ہے خلافت کا وہ ملکہ عطاء کیا تھا کہ پورے ایشیاء میں انہی نگر کا کوئی خطیب نہ تھا "سمر بیان" اگرچہ اردو ادب میں ایک اصطلاح بہت پہلے سے وضع ہے لیکن اس کا صحیح اطلاق صرف شاہ جی پر ہوتا ہے۔ اور چونکہ شاہ جی نے اپنی اس خدا داد صلاحیت کو صرف اعلیٰ کلمۃ الحق کے لئے مختص کر کے برصغیر پاک و ہند کے چپہ چپہ میں حضور سرور کو نبین ﷺ کی مدح سرائی کی اور ان کے اس فرمان کہ "میں نبیوں کا سلسلہ ختم کرنے والا ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا" کی گونج سے میدانی، سمرانی اور پہاڑی علاقوں کو آشنا کیا اسی لئے حضرت امیر شریعت مر کر بھی نہیں مرے ہیں بلکہ اپنی زندگی کے انٹ لٹوش باقی چھوڑ گئے ہیں۔

شاہ جی کتنے سادہ طریقہ سے مسلمانوں کو بتایا کرتے تھے کہ حضور اکرم ﷺ آخری نبی ہیں اور جلی نبوت کا کاروبار چلانے والے مسلمانوں کے سوا اعظم کے خلاف انگریزوں کی بدترین چال ہیں۔ زبان و بیان سے اس کی تعریف و تمجید ممکن نہیں اور مسلمان بھی انگریزوں کے اس خود کاٹ پودے کی سازشوں سے باخبر ہو کر اپنے ایمان میں نقب لگانے والوں کی چالوں سے اپنے آپ کو محفوظ کر چکے تھے۔ ہر شخص یہ بات پوری طرح سمجھ چکا تھا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ابراہیم کو خلیل اللہ کا درجہ ملا۔ حضرت اسماعیل ذبیح اللہ ٹھہرے اور حضرت عیسیٰ روح اللہ قرار پائے تو پھر حضور سرور کو نبین کو رسول اللہ کا نام نامی کیوں عطا کیا گیا؟ ظاہر ہے رسول اللہ کا لقب ملنے کے بعد رسالت کا روازہ بند ہو گیا اور حضور اکرم میں وہ تمام محاسن و محامد جمع ہو گئے جو آپ ﷺ سے پہلے آنے والے نبیوں کی خصوصیت تھے۔ حضور اکرم ﷺ کے آخری نبی ہونے کی یہ بڑی ہی واضح دلیل ہے اور پھر اگر نبوت کا دروازہ کھلا ہی ہوتا تو حضور اکرم کے وصال کے بعد جب سلسلہ کذاب نے اپنی "نبوت" کا اعلان کیا تو حضور ﷺ کے یار خاں اور خلیفۃ المسلمین حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس جھوٹے نبی (سلسلہ کذاب) کی سرکوبی کیوں کی؟ کیا حضرت صدیق اکبر نے اس جلی نبی کا قلع قمع کر کے یہ ثابت نہیں کر دیا تھا کہ اب کوئی نبی نہ آئے گا بلکہ حضور اکرم ﷺ آخری نبی ہیں اور قرآن مجید میں "خاتم النبیین" کا جو لفظ استعمال ہوا اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد باب نبوت بند ہو چکا ہے۔

کوڑھ کوڑھ رحمتیں ہوں حضرت شاہ جی کی روح پر جنوں نے حضور اکرم کی ختم نبوت کے بارے میں بڑے ہی سادہ سلیس اور عام فہم انداز میں مسلمانوں کو سمجھایا اور انگریزوں نے برصغیر پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈالنے کی خاطر جلی نبوت کا جو ڈھونگ رچانے کے لئے اپنے پس خوردہ پر گزر

بسر کرنے والوں کو آگہ کار بنایا تھا وہ بے نیل و مرام رہا اور مسلمان پوری طرح سمجھ گئے کہ خانہ ساز نبوت کے لئے برصغیر پاک و ہند میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت شاہ جی کی اس بے مثال جدوجہد کے باعث ان کا نام تاریخ اسلام کا ایک سنہری ورق بن گیا ہے۔

آج ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ پاکستان میں جعلی نبوت کا ڈھونگ رچانے والوں کا سختی سے محاسبہ کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ لیکن کیا یہ نمائشی جلسے، حلق کے اوپر اوپر سے کی گئی دھواں دھار تقریریں اور چند قرار دادیں کافی ہیں۔ اور ان سے ہم اصل مقصد پالیں گے یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے یہ سب باتیں محض وقتی ہیں جب کہ اسلام کو بہرہ ویوں کی سازشوں سے بچانے کے لئے منظم اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ مسلمان راہ نماؤں کی بے حسی بڑی ہی اندوہناک ہے۔ شاہ جی کی روح تڑپ رہی ہوگی۔ کیونکہ اگر شاہ جی زندہ ہوتے تو رسول اللہ کے پروانے ملک کے گوشے گوشے سے مجسم صدائے احتجاج بن جاتے۔ وہ کمال اور آج کے دور کا یہ زوال

فاعتبرو یا اولی الابصار

کوئی نہیں سوچتا کہ قادیانیوں کے برگ و بار پھل پھول کیوں رہے ہیں؟ اور مسلمان رہنماؤں کا اثر و رسوخ کیوں سمٹتا جا رہا ہے؟ اب یہ بات ہی موم ہوتی جا رہی ہے کہ جب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کی بادشاہت ختم کر کے ہندوستان پر سیاسی اقتدار حاصل کیا تو مسلمانوں کی ایک جیتی ختم کرنے کے لئے ان میں نئے سے نئے فرقے پیدا کرنے کی ناپاک سازش کی اور بالآخر مسلمانوں میں روح جہاد ختم کر۔ اور اپنے آپ کو شرعی حاکم تسلیم کرانے کے لئے اسلام سے قطعی طور پر خارج مرزائیوں کا طائفہ بھی پیدا کر دیا اور پھر خود ہی اس پودے کی آبیاری بھی کی۔ قلع ہے تو صرف اس بات کا کہ مسلمان اپنی تاریخ بھی بھول گئے ہیں۔ شاہ جی کیا باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ وہ بڑی بڑی باتوں کو چٹکی بجانے میں حل کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت علیؑ اور حضرت عمرؓ میں درجہ میں کون افضل ہے۔ شاہ جی مسکرائے اور فرمایا کہ "جانی حضرت عمرؓ کے لئے حضور ﷺ نے قبول اسلام کی دعا کی تھی اور حضرت علیؑ نے خود اسلام قبول کیا یعنی حضرت عمرؓ مراد تھے اور حضرت علیؑ مرید اب آپ خود فیصلہ کر لیں کہ مراد اور مرید میں کون افضل ہے؟"

انکے عظیم مشن اور بے مثال جدوجہد کے پیش نظر بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ:

وہ لوگ تو نے ایک ہی شوفی میں کھو دیئے

ڈھونڈا تھا آسمان نے جنہیں خاک چھان کر

واقعہ یہ ہے کہ شاہ جی کسی تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔ ایسے لوگ صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

وقت کا اہم ترین امتحان یہ ہے کہ ہم اپنی نبی سرگرمیوں کو محدود کر کے دین کی سر بلندی کے لئے کام کریں۔ انگریزی ذہن کی تعلیم نے مسلمانوں میں دینی بے حسی کی جو لہر پیدا کر دی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس میٹھے زہر کے اثر کو زائل کیا جائے۔ یہ زہر تبھی بے اثر ہو سکے گا جب مسلمانوں کو صحیح دینی و



دنوی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے گا۔ اور انہیں دین مبین کی بنیادی اقدار سے بھی پوری طرح متعارف کرایا جائے گا۔ اور دنیا میں دنیا کے طور پر زندہ رہنے کا اسلامی قرینہ سیکھایا جائے گا۔

لوگ پیاسے ہیں وہ صبح دین کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جعلی نبوت کا کاروبار چلانے والے لوگوں کی اسی بے عملی کا فائدہ اٹھا کر ان کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں چونکہ صبح دین کا انہیں پتہ نہیں ہوتا اس لئے ان کے سامنے جو کچھ بھی پیش کیا جاتا ہے وہ انہیں قبول کر لیتے ہیں۔ یہ بڑا ہی نازک دور ہے۔ اس میں ان لوگوں کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں جو حضرت شاہ جی کے نائبین ہیں اور دین اسلام کی شمع کو فروزاں رکھنے کے خواہشمند ہیں۔ کیا ہم سب اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے لئے تیار ہیں؟ اس سوال کا جواب اپنے دل سے پوچھیے:

شاید کہ اتر جائے کسی دل میں میرے بات



وہ ایک مومن جو لطف احمد کی برکتوں سے قمر بنا تھا

فضا کے سینے پہ خونی کر گس کے تیز بجنے بھل رہے ہیں  
چراغ علم و عمل کی لو سے دھوئیں کے باذل اہل رہے ہیں  
کہ آج احرار کا نگہاں جو تخت علی پہ تھا فروزاں  
حیات فانی سے ہو کے گریاں سدھارا سوئے بھان بیزاں  
وہ ایک عالم جسے جہاں نے خراج تمغیں ادا کیا تھا  
وہ ایک مومن جو لطف احمد کی برکتوں سے قمر بنا تھا  
وہ ایک رہبر کی جس کی نظروں میں ساری دنیا تھی کونہ گل  
وہ اک معلم کہ جس کے صدقے میں رہ نوردوں نے پائی منزل  
وہ اک مفسر دلوں سے جس نے نکالے شبہات نودمیدا  
وہ اک مقرر کہ جس کے طرز بیاں میں شعلوں کا سوز پیدا  
اسی چراغ سربہ پہلو کے غم میں عالم یہ رو رہا ہے  
مگر وہ باد قضا سے بھج کر زمین کے پہلو میں سو رہا ہے۔  
(فانی مراد آبادی)

پروفیسر خالد بزنی

## جاں نثار سید الابرار وہ درویش تھا

مذہب حق کا علمبردار وہ درویش تھا  
 مسلک نبوی کا پیروکار وہ درویش تھا  
 جو رسول اللہ کے ارشاد سے منہ موڑ لے  
 اس کے حق میں عمر کی تلوار وہ درویش تھا  
 کفر و باطل کے مقابل، شرک و بدعت کے خلاف  
 دہر میں توحید کی لکار وہ درویش تھا  
 کیفِ حُبِ مصطفیٰ سے بے خود و سرشار تھا  
 بادۂ توحید سے سرشار وہ درویش تھا  
 دین کی حفظ و اشاعت اس کا پہلا فرض تھا  
 راہِ حق میں ہر گھڑی تیار وہ درویش تھا  
 کوہِ کوہِ قریہ بہ قریہ، بستی بستی، شہر شہر  
 دینِ حق کی تیغِ جوہردار وہ درویش تھا  
 اختلاف و انتشار اس کو کبھی بجائے نہ تھے  
 دین کے نقصان سے بیزار وہ درویش تھا  
 اتحاد و اتفاقِ قوم پر مرتا تھا وہ  
 الغرض اسلاف کا کردار وہ درویش تھا  
 حفظِ ارشادِ پیغمبر اس کا عین ایمان تھا  
 جاں نثار سید الابرار وہ درویش تھا

## سیاہی بھی سپہ سالار بھی

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی جدوجہد آزادی وطن اور اقامت دین کے لئے رہی۔ مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم سے انگریزوں سے معرکہ آراء رہے اور اس وجہ سے زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند میں گزارا۔ جب جیل سے نکلے تو ان کی شعلہ بیانی کی بدولت قہر حکومت میں زلزلہ آجاتا۔ وہ ملک کے طول و عرض میں سفر کر کے اپنی قہریروں سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے اور پھر حکومت کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا کہ انہیں بند کر دے۔ اس طرح یہ فقرہ ان کے مناسب حال ہے کہ ان کی آدمی زندگی جیل میں گزری اور باقی زندگی ریل میں۔

مولانا نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے جنگ کی بلکہ کشمیر کے پشردہ مسلمانوں کو اٹھانے میں بھی انہوں نے زبردست حصہ لیا۔ جس وقت شیخ عبداللہ اندرون کشمیر میں مہاراجہ کی زبردست طاقت سے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ اس وقت پنجاب اور دیگر صوبوں سے مولانا نے اپنی شعلہ بیانی کے ذریعہ ہزاروں رضا کار جمع کر کے کشمیر بھیجے۔ تاکہ مہاراجہ کی طاقت سے ٹکڑی جائے۔ مہاراجہ نے میزور ہو کر حکومت کے لئے مدد طلب کی۔ حکومت ہند نے مدد تو کی اور اپنی فوج کشمیر کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے بھیج دی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ جسے بھی ٹیشن کے اسباب پر اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ کمیشن نے رپورٹ دی کہ ریاست کے عوام کی حکومت میں کوئی آواز نہیں ہے۔ اور برطانوی ہند میں رفتہ رفتہ اصلاحات نافذ ہو رہی ہیں۔ ان کے اثر سے کشمیر کے عوام بھی خواہش مند ہیں کہ ان کے یہاں بھی اس طرح کی اصلاحات ہوں۔ چنانچہ برطانوی حکومت کے دباؤ سے کشمیر میں اصلاحات کی بنیاد پڑ گئی۔ اسی طرح شاہجی نے اپنی پرہیزگار کوششوں سے پاکستان میں قادیانیوں کا زور بھی توڑ دیا۔ پاکستان میں پہلے کے مقابلہ میں ان کے اثرات کم ہیں۔ اس از بر آرائی زبان و قلم میں مولانا اور ان کے رفقاء دار و رسن کی منزل کے قریب پہنچ گئے۔

آزادی سے پہلے ہندوستان میں مولانا کی شخصیت معروف اور مسلم تھی۔ وہ جہاں بھی پہنچ جاتے ان کے مخالفین بھی ان کی تقریر سننے آجاتے۔ وہ گھنٹوں بھی بولتے رہتے تو لوگ مسرور ہو کر سنتے رہتے۔ فیاض ازل نے گفتگو اور تقریر کی غیر معمولی ہدایت سے انہیں نوازا تھا۔ مولانا ایک اجتماع میں پنجاب کے امیر شریعت منتخب ہوئے تھے۔ لیکن انہی ہنگامی زندگی نے ان کو موقع نہیں دیا کہ اپنی امارت کو منظم کریں۔ یہ ایک تھکدیری بات تھی ورنہ امارت شریعہ ہندوستان گیر پیمانہ پر بن چکی ہوتی۔ مولانا تھے تو پنجاب کے۔ لیکن ان کی ناناہل پٹنہ سٹی میں تھی۔ انہوں نے اپنے لڑکپن کا حصہ اور عنفوان شباب تک کا زمانہ ”گیا“ میں گزارا۔ پٹنہ میں ان کے رشتہ دار اور ”گیا“ میں ان کے جاننے والے موجود تھے۔

مولانا کا حافظہ غضب کا تھا۔ ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا کہ وہ ”گیا“ آئے جامع مسجد پہنچ کر وہ توجہ المسجد پڑھنے لگے

سامنے ایک آدمی آگے کھڑا ہوا جو بہت معمولی شکل و صورت اور معمولی لباس میں تھا۔ مولانا نے سلام پیر کر اس سے معافہ کیا اور کہا کہ آپ کو چالیس برس کے بعد دیکھا ہے۔ جب کہ اٹکا لڑکپن تھا۔

پاکستان بننے کے بعد مولانا کا تعلق ہندوستان سے نہیں رہا۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں خان عبدالغفار خان، مولانا عبید اللہ سندھی کی طرح مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے نام کو بھی بھلایا نہیں جاسکے گا۔

مولانا کو میں نے "گیا" میں قریب سے دیکھا تھا۔ انہی جرأت اور انگریزی حکومت کی مخالفت میں ان کی مجاہدانہ زندگی اور غیر مصالفا نہ روش مجھ سے کبھی تھی کہ تو بھی نہ ڈر اور بے خطر اس آتش نرود میں کود جا۔ مولانا نے جس طرح ساری زندگی جہاد آزادی میں گزاری اور مسلسل قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اس کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی ہے۔ وہ آزادی کی لڑائی کے سپاہی بھی تھے اور سپہ سالار بھی اور تنہا لشکر جہاد بھی۔ ان کے نفس گرم کی تاثیر نے ہزاروں اشخاص کے دلوں میں آزادی کا جوش بھر دیا۔ اس دور کو دیکھنے والی نسل ہی اب تیزی کے ساتھ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

"ٹوٹے ہوئے تارے" (صفحات ۱۳۶ تا ۱۳۸)

بخاری عید تمنا تیرے بیان میں ہے  
کسی کی آنکھ میں جادو تیری زبان میں ہے

سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ اردو زبان جب سے معرض وجود میں آئی ہے اس وقت سے لے کر آج تک سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا خطیب اعظم پیدا نہیں کر سکی۔ اور مستقبل قریب میں بھی شاہ جی کی مثال کی کوئی امید نہیں ہے اور خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اسنے یہ زبان کا جادو اس شخص کو عطا فرمایا جو کہ عقیدہ اور مسلک کے اعتبار سے اکابر اہل سنت والجماعت کے صحیح ترجمان تھے۔ حضرت شاہ جی خود اپنی تقریروں میں ارشاد فرمایا کرتے کہ میں مسلک کے اعتبار سے چاہے وہ دینی ہو یا سیاسی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور محدث العصر علامہ انور شاہ کشمیری کو اپنا امام ماننا ہوں۔ اور انہیں کے مسلک پر قائم ہوں اور اس پر مٹنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے عقیدہ اور مسلک جان سے زیادہ عزیز ہے۔ درحقیقت یہی وہ مسلک ہے جس کے تحفظ اور بقا کے لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کر دیں۔ اور جس پر ان کے متعلقین اور متوسلین اور اولاد و احفاد نے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔

جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور رحمہ اللہ

## یاد میں باتیں شاہ جی کی

میرے مدوح حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ان مقدس و پر خلوص شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں جن کے افکار و کارہائے نمایاں سے تاریخ کے اوراق روشن ہیں۔

غالباً ۱۹۴۲-۴۳ء میں بہل ضلع میانوالی میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھا تو حضرت شاہ جی ایک تبلیغی جلسہ میں تقریر کے لئے تشریف لائے۔ درویشانہ سادہ طرز، جسمانی لحاظ سے نہ سجدہ لیم شمیم اور نہ کمزور، متوسط بدن ڈاڑھی میں سفید و سیاہ بالوں کا اشتراک۔ سر پر سفید کپڑے کی ٹوپی، سادہ سفید لباس اب بھی اگر آنکھ بند کرول تو ان کی نورانی اور پاکیزہ صورت تصور پر چھا جاتی ہے۔ سفر میں بالکل تنہا، سامان مختصر بلکہ نہ دار بقول شاعر

فر و ناز و عیش و نعمت اہل دولت کو نصیب  
قرر و صبر و شکر ہے دائم شعارِ عارفان!

اتفاقاً جمعہ کا دن تھا۔ آپ نے جامع مسجد میں جمعہ پڑھایا۔ خطبہ اولیٰ و ثانی جس دلکش اور سر آفریں لہجہ میں ادا فرمایا۔ اس کی گونج اب تک راقم کے کانوں کو سنائی دے رہی ہے۔ آخری خطبہ میں تمام ممالک اسلامیہ کے لئے نام لے لے کر درد آفریں اور پرسوز رنگ میں دعا لے کامرانی و ترقی فرماتا اور اے اسلام کی تباہی و ناکامی کے لئے عربی میں دعا طلب کرنا پھر خطبہ کے بعد نماز میں قرآن کی تلاوت کا اثر۔ بس ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ قرآن اب ہی اتر رہا ہے۔ نماز کے بعد جلسہ میں اس آیت سے تقریر کا آغاز فرمایا۔

ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولكن رسول الله و خاتم النبیین وکان الله بکل شئی علیماً

تقریر کیا تھی ہر لفظ بلکہ ہر حرف اپنے اندر جاذبیت کا ایک سمندر رکھتا تھا۔ آپ کا پسندیدہ موضوع "ختم نبوت" تھا۔ لفظ خاتم النبیین کی توضیح و تشریح یوں فرمائی۔ "خاتم النبیین کے معانی قادیانی حضرات کے کہنے پر اگر نبوت کی انگوٹھی یعنی مہر کی جائے تو یہی "ختم نبوت" پر کوئی حرف نہیں آتا۔ گورنمنٹ کے مقرر کردہ محکمہ کی طرف سے جس مکان کے دروازے پر سیل یعنی مہر لگ جائے تو عوام کا کوئی شخص اسے نہیں توڑ سکتا۔ اسی طرح محکمہ ڈاک کے جس قبیلے پر مہر لگا دی جاتی ہے اسے راستے میں کوئی کھول نہیں سکتا۔ تاوقتیکہ منزل مقصود پر افسر جاکم نہ پہنچے مگر یہ سب دنیا کے نظام ہیں۔ خدائی نظام کے تحت نبوت کے جس تصدیق پر خاتمے کی مہر ثبت ہو چکی ہے۔ اسے کھولنے کا تاقیاست کسی بشر کو اختیار اور طاقت نہیں ہے۔" غرض خطابت کا رنگ اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ عہد حاضرہ پر تبصرہ فرمایا۔ اور اصلاح اخلاق و عمل پر موثر انداز اور قرآنی روشنی میں اپنا جوہر دکھایا۔ سامعین وجد میں جھوم رہے تھے ایک اور موقع پر کروڑوں سالین صلیع مظفر گڑھ (اب ضلع لیہ) کے میلہ چودھویں کے اجتماع عظیم میں آپ کو وجد آفریں اور ایمان افروز لہجہ میں قرآن شریف

تکلات فرماتے دیکھا۔ اس دفعہ آپ کا موضوع "السلام علیکم اور وعلیکم السلام کا مسلمانوں میں ترویج" تھا۔ آپ نے فرمایا۔ "اگر سارے مسلمان ہم ملاقات میں یا راہ گزر میں السلام علیکم اور وعلیکم السلام کو التزام سے اپنالیں تو یقیناً ہے نجات حاصل ہو جائے گی" غرض آپ کی تقریر دلپذیر ہندو پاکستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے قلوب پر یکساں اثر انداز تھی۔ آپ بلا کے حاضر جواب تھے۔ آپ کا دلچسپ مزاح دہشی اصلاح کا موجب ہوا کرتا تھا۔ ہمل صلیح سیانوالی (اب صلیح بیکر) میں قیام کے دوران ایک دیہاتی سفید ریش حضرت شاہ جی کی مجلس میں آیا اور بجائے السلام علیکم کہنے کے بسم اللہ بسم اللہ کہہ کر پاؤں چھونے لگا۔ حضرت نے فوراً ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔ "میاں بسم اللہ عام طور پر دو جگہ پڑھی جاتی ہے۔ روٹی کھانے سے پہلے یا اپنی منکوحہ عورت کے پاس جانے سے پہلے۔ تم نے مجھے کیا سمجھا روٹی یا منکوحہ عورت"۔ نو دوا رفت نام ہوا۔ آپ نے محبت آمیز لہجہ میں اسے سمجھایا کہ "مسلمان جب کسی مجلس میں آئے تو پہلے السلام علیکم کہے۔ جو شریعت کا حکم اور کارِ ثواب ہے" آپ نے ملک و ملت کے لئے قید ہو کر جو کارنامے سرانجام دیئے وہ بے حد و حساب ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور ہمیں ان کے اتباع کی توفیق ارزانی کرے۔ آمین

## عندلیبِ نغمہ پیرا

بہاریں پھوٹی تھیں ان کے اندازِ تکلم سے  
خطیب سر سامان تھے، جلسِ مغل آرا تھے  
وہ جب تر تیل کرتے تھے گمانِ وحی ہوتا تھا  
تلفظ میں وہ کامل، حسنِ قرأت میں وہ یکتا تھے  
شریعت کا امیر اُن کو سمجھا جاتا ہے تو سچ ہے  
کہ شرع و دین کے اسرار ان کے لفظِ چر و وا تھے  
نبیِ کسیم کر لیتے وہ کیسے قادیاںی کو  
نقوشِ پائے ختمِ الرسل پر وہ جبیں سا تھے  
نظرِ بندی رہی ان کا مقدر فصلِ گل میں بھی  
اگرچہ وہ چمن کے عندلیبِ نغمہ پیرا تھے  
پڑا تھا قومِ کلی طبعِ کمدر کا غبار ان پر  
بہارستان تھے پہلے بالآخر ایک صرا تھے  
نہیں سمجھے ہیں ہم منہوم اب تک ان کے نغموں کا  
وہ تھے تو نے نفسِ جعفر مگر خاموش گویا تھے

## سید والا حشم

اے سید والا حشم اے خادم ملت  
تھا تیرا وجود اس کے لئے رحمت باری  
نبت ہو تری کیے کسی شہر و وطن سے  
تو ضنیفم اسلام تھا، ہندی نہ بخاری

ڈھلتے تھے تری بارگہ نطق میں خورشید  
اٹھتے تھے ترے چرخِ تمیل سے اُجالے  
ہوتے تھے مصاحب ترے جم جاہوں کے ہمسر  
بنے تھے تری بزم میں بیکس بھی جیالے

تیرے کرتے تھے عقابوں کا تعاقب  
آہو ترے شیروں کی کچھاروں پہ بھی لپکے  
پتھر بھی ترے پاؤں تلے بن گئے سنباب  
قطرے تری صبا کے چناروں سے بھی ٹپکے

تھا تیرے لئے صیدِ زبوں قیصرِ افرنگ  
ہر دامن سے بچ نکلا ترے فقر کا شہباز  
بارانہ کسی معرکہ دار و رسن میں  
روکی نہ تری بند و سلاسل نے تگ و تاز

ناموسِ پیسبر کا تحفظ ترا ایمان  
وابستگیِ خواجہ بطحا تری لکار  
بچ کر کہاں جاتا ترے احرار کی زد سے  
گستاخِ رسالت کوئی بدگو و بداطوار

اے میرِ شریعت تری آواز کا جادو  
یوں سر پہ چڑھا ہے کہ ابھی بول رہا ہے  
اس وقت بھی ہندی مستنبتی کا سنگھا سن  
ہیت سے تری صبح و ما ڈول رہا ہے  
سجادہ نشینوں کی کج آموزی کے اصنام  
لاریب ترے نعرۂ تکبیر سے ٹوٹے  
کیا جانے یوں کتنے اسیرانِ ضلالت  
ہر مبتدعِ دین کی تزویر سے چھوٹے

صبحوں نے سیٹی ہے تری آنکھ کی شبِ نم  
راتوں نے بھی لوٹی ہے گل افشانیِ گفتار  
رک جاتے تھے آہو ترے نعمات کی لے پر  
جھک جاتے تھے قرآن کی آیات پہ اشجار  
کیا میری زباں اور کہاں تیرے محاسن  
کھینچنے کا قلم کیا ترے ایام کی تصویر  
میں نے تجھے دیکھا بھی مگر خواب کی صورت  
ہاتھ نے بیاں اس طرح کی خواب کی تعبیر -

اک حکمت و برہاں کا سمندر تھا بخاری  
لوئے معارف کا وہ اک گنجِ نہاں تھا  
اک پیرِ شباب آور و دارائے تہور  
ابلاغ و خطابت کا وہ دریائے رواں تھا  
گزرے ہوئے طوفان کی اک موجِ سبک سیر  
ڈوبے ہوئے سورج کی شعاعِ افق افروز  
اک آتشِ پشمرده کا تابندہ شرارہ  
اک لوٹے ہوئے قافلے کی آہِ جگر دوز



## شاہ جی! کچھ یادیں کچھ باتیں

..... یہ ۱۹۵۹ء کے اواخر کا ذکر ہے! ان دنوں میں روزنامہ کوهستان (اب مرحوم) ملتان میں بطور سب ایڈیٹر کام کر رہا تھا۔ کوهستان ملتان سے ۲۱ اپریل ۱۹۵۹ء کو جاری کیا گیا۔ میرے استاذ محترم جناب اقبال زبیری (جو روزنامہ مشرق کے چیف ایڈیٹر اور چیف ایگزیکٹو کے عہدہ پر کئی سال فائز رہنے کے بعد اب ریشٹر ہو چکے ہیں) کوهستان ملتان کے ریڈیڈنٹ ایڈیٹر اور نامور صحافی جناب ایثار راعی (اب ملتان سے شائع ہونے والے روزنامہ "قومی آواز" کے مالک و مدیر اعلیٰ ہیں) کوهستان کے چیف رپورٹر تھے۔

پہلے چند ماہ تو نیا اخبار نکالنے کی باؤ میں گزر گئے۔ جب ذرا سکون ہوا تو ملتان شہر پر زیادہ توجہ دینے کا آغاز ہوا۔ کبھی کوئی علاقہ، کبھی کوئی بازار، کبھی کوئی محلہ ہم لوگوں کی "سیرگاہ" بنتا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ صبح تقریباً دس بجے ایثار راعی صاحب تیار ہو کر نکلنے کے موڈ میں تھے۔ میں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے تو بولے آج اسیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) سے ملنے کا قصد ہے۔

میں شاہ جی کے نام اور کارناموں سے واقف تھا۔ لاہور میں اپنی تعلیم کے دوران شاہ جی کی تقریریں سن چکا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے یہ علم نہ تھا کہ ملت کا یہ نقیب اعظم ملتان کے کس گوشہ میں فروکش ہے۔ شاہ جی چند سال سے عملی زندگی سے گویا ریشٹر ہو چکے تھے اور ذیابیطس اور بعض دوسرے امراض کے باعث گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ قبل ازیں وہ خان گڑھ میں مقیم رہے تھے۔ شاہ جی کا نام سن کر میرے دل میں بھی تحریک آزادی کے اس شعلہ بیاں مقرر کی زیارت کا شوق ابھرا اور میں نے ایثار صاحب سے درخواست کی کہ اگر وہ چند منٹ رک جائیں تو میں بھی ان کے ساتھ شاہ جی کی خدمت میں حاضری کے لئے تیار ہو جاؤں۔

"چل چھیتی کر" (چلو جلدی کرو) ایثار راعی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور میرے کمرے میں ہی بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگے۔ ان دنوں روزنامہ امروز (اب مرحوم) اوز نوائے وقت بھی ملتان سے نکل آئے تھے۔ نوائے وقت ابھی تک ملتان سے نکل رہا ہے۔ اور پھل پھول رہا ہے۔

میں نے جلدی جلدی شیعہ کیا، لباس تبدیل کیا اور ایثار صاحب کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ ان دنوں کوهستان کا پورا عملہ حسن پروانہ کالونی کی ایک کوٹھی میں رہتا تھا جو دو منزلہ تھی۔ ہم اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ گھر سے نکلے اور پرانے شہر سے ڈیرہ اڈہ کی طرف جانے والی سرگرم پر آکر تانگہ پکڑا اور شاہ جی کی خدمت میں حاضری کے لئے روانہ ہوئے۔ کوئی بیس منٹ بعد ہم محلہ ٹبی شیر خان پہنچے۔

ٹبی شیر خان ملتان شہر کے شمال مشرقی کونے میں واقع ایک پسماندہ سا محلہ تھا۔ اگرچہ ۳۵ برس کے

شب و روز نے سیری اس دور کی یادوں پر کافی گرد ڈال دی ہے لیکن میرے ذہن کے پردے پر آج بھی بعض تصاویر بڑی روشن ہیں جسے میں شاہ جی کی خدمت میں حاضری کی سعادت کا پر تو تصور کرتا ہوں۔ بات ہو رہی تھی ٹی شیر خان کی۔ یہ پختہ، نیم پختہ اور کچے مکانوں کا ملغوبہ سا محلہ تھا۔ شاہ جی جس مکان میں مقیم تھے وہ بھی ایک حام سا نیم پختہ مکان تھا۔ مکان سے کچھ دور ہی ہم تانگہ سے اتر گئے

کوئی ڈیڑھ دو سو قدم چلنے کے بعد ہم شاہ جی کے ڈیرہ پر تھے۔ یہ یاد نہیں کہ شاہ جی کو ہم نے اپنی آمد کی اطلاع کس طرح پہنچائی ہاں یہ یاد ہے کہ اجازت ملنے پر ہم مکان کے اندر داخل ہوئے۔ بیرونی دروازے سے چند قدم پر ہی بائیں طرف وہ چھوٹی سی نیم پختہ کوٹھری (بیٹھک) تھی جس میں برصغیر کی اقلیم خلافت کا بے تاج بادشاہ آرام فرما رہا تھا۔

شاہ جی کوٹھری کے ایک طرف، مشرق و مغرب کے رخ حاتم سے بستر پر آرام فرما تھے۔ ایثار راعی صاحب کا شاہ جی سے خاص تعلق تھا۔ کوٹھری میں ایثار راعی پہلے اور میں بعد میں داخل ہوا۔ ایثار صاحب کو دیکھ کر اور ان کے سلام کے جواب میں "و علیکم السلام" کہتے ہوئے شاہ جی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے بھی آگے بڑھ کر سلام کیا۔ ایثار صاحب نے میرا تعارف کرایا تو شاہ جی نے مسکراتے ہوئے دایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے شاہ جی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا۔ میں ایک پینڈو ہوں اور گاؤں کے رہنے والوں کی مخصوص کیفیات (بلکہ عادات) سے اب تک پہچا نہیں چھڑا سکا۔ اور آج سے ۳۵ برس قبل۔۔۔۔۔ آپ خود ہی اندازہ لگائیں۔۔۔۔۔ میں نے جھک کر دست بوسی کی کوشش کی مگر انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور میرے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "بیٹھو بیٹھو"

اس کے بعد بھی میں ایثار صاحب کی رفاقت میں کئی بار شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کبھی کوئی سوال کرنے کی توجہ نہ ہوتی ہاں ان کی باتوں کو غور سے سننا رہتا۔ ایثار صاحب کے ساتھ شاہ جی ملک کی صورت حال اور سیاست پر بھی باتیں کرتے۔ کبھی کبھار شاہ جی اپنے احوال بھی بیان کرتے اور اس بات پر دکھ کا اظہار کرتے کہ بعض لوگ جو ان کے طفیل معاشرے میں معزز بنے پھرتے ہیں، ان کو ملنے تک نہیں آتے۔

ان دنوں شاہ جی کو تنہائی کا دکھ کھائے جا رہا تھا۔ ذیابیطس کا مرض بھی زوروں پر تھا اور بعض دیگر عوارض بھی، لیکن لاکھوں کے مجھے کو مہسوت کر کے بٹا دینے والا یہ شعلہ نوا خلیفہ تنہائی کے دکھ سے زیادہ کسی اور تکلیف کو محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ایک بار تو انہوں نے لہسنی زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا جب تک یہ بولتی تھی سہمی آگے چپھے پھرتے تھے مگر اب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شاہ جی خاموش ہو گئے تنہائی کا گہرا دکھ ان کے چہرے سے عیاں تھا اور کبھی بات یہ ہے کہ شاہ جی کی کوٹھری بھی غم میں ڈوبی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

ایک دن ہم گئے تو شاہ جی خوشگوار موڈ میں تھے۔ غالباً مرض میں کچھ افادہ تھا۔ ذیابیطس کا ذکر بھی کیا اور

فرمایا کہ اس مرض میں مبتلا افراد کو جاسن کھانے چاہئیں۔ وہ خود بھی جاسن کھا کر فارغ ہوئے تھے جو شاید ان کے کسی عقیدت مند نے بھجوائے تھے۔ خوشگوار موڈ میں باتیں کرتے ہوئے شاہ جی نے دوستوں اور دشمنوں کے متعلق بعض پتے کی باتیں کھیں۔ ان کی ایک بات جو آج تک میرے دل پر نقش ہے وہ یہ ہے کہ "جب کسی دوست سے ملنے جاؤ، لباس خواہ کیسا بھی ہو، منہ خوب دھو کر اور بال سنوار کر جاؤ کہ دوست تمہارے چہرے کو سب سے پہلے دیکھتا ہے اور شگفتہ چہرے کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔ اسے آپ کے لباس وغیرہ سے کم ہی دلچسپی ہوتی ہے۔ لیکن جب کسی دشمن سے ملاقات کے لئے جاؤ تو لباس اچھا اور خاص طور پر جوتا چمک دار، صاف ستھرا پہن کر جاؤ کہ دشمن سب سے پہلے آپ کے پاؤں کو دیکھتا ہے۔ شاہ جی کے اس فلسفے کا مجھے کئی بار عملی تجربہ ہوا اور میں نے اسے سچ پایا۔

شاہ جی نے ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ اگلے روز تیسرے پہر اس بے مثال خطیب اور شعلہ نوا مقرر کی نماز جنازہ غالباً ایمرسن کالج کی گراؤنڈ میں ادا کی گئی۔ جنازہ میں دو لاکھ کے لگ بھگ انسان شریک تھے۔ بہت سے لوگ جن میں حضرت شورش کاشمیری بھی شامل تھے، زار و قطار رو رہے تھے۔ شاہ جی کو جلال باقری قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اتنا بڑا جنازہ ملتان کی تاریخ میں اس سے قبل اور اس کے بعد دیکھنے میں نہیں آیا۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۹۳۴ء میں شاہ جی۔ نے ملتان میں معراج النبی ﷺ کے ایک عظیم جلسہ سے جو بارخ لائنگ خاں میں منعقد ہوا خطاب کیا۔ محقق رسول ﷺ میں ڈوب کر شاہ جی نے جو تقریر کی ہوگی اس کا حال سنانے والا اب شاید کوئی ہو، لیکن مشہور ہے کہ شاہ جی کی تقریر سن کر جلسہ میں شامل ایک مجذوب نے نعرہ مستانہ بلند کیا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر ملتانی زبان میں کہا "سید! اٹھ! اٹھ! میں دفن تھیں" (اے سید زادے، خدا کرے تو یہیں دفن ہو، اور مجذوب کی یہ دعا ربّی بعد قبول ہوئی اور ملتان کی مٹی کو ہی یہ سعادت نصیب ہوئی کہ بیسویں صدی کا یہ فقید المثال اور عظیم خطیب موحواب ہے۔

سید عبدالحمید عدم (مرحوم) نے شاہ جی کی وفات پر ایک حیرت انگیز نظم لکھی۔ اس کے آخری دو اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ادا	کر	کے	فرض	اپنی	خدمات	کا
سر	دم	جاگا	ہوا	رات	کا	کا
اید	کے	نگر	کو	روانہ	ہوا	ہوا
مکمل	سفر	کا	فسانہ	ہوا	ہوا	ہوا

## توحید اور رسالت کا انتہک مناد

آج بخاری سید کی پھر آئی یاد  
وہ اپنا اک راہ نمائے پاک نہاد  
عشق اساس و عشق سرشت و عشق نژاد

زندہ باد امیر شریعت زندہ آباد

ظاہر میں احرار کا ایک سالار تھا وہ  
اصل میں ساری ملت کا غم خوار تھا وہ  
اس کا تابندہ دل تھا اسلام آباد

زندہ باد امیر شریعت زندہ آباد

ملت بیضا پر وہ خدا کا احسان تھا  
ناشر ختم نبوت، شارح قرآن تھا  
توحید اور رسالت کا ان شک مناد

زندہ باد امیر شریعت زندہ آباد

بہر نماز عشق اذال دینے والا  
آزادی کی خاطر جاں دینے والا  
یعنی مجسم ایتقان و ایثار و جہاد

زندہ باد امیر شریعت زندہ آباد

سر سنن سے ایسے نقش اگاتا تھا  
لہن اور لفظ سے وہ تصویر بناتا تھا  
پھیکے پڑ جاتے تھے مانی اور بہزاد

زندہ باد امیر شریعت زندہ آباد

ذکر امیر شریعت یا رب اور بڑے  
اس کی عزت و عظمت یارب اور بڑے  
یارب اس پر اپنی رحمت کر ایزاد

زندہ باد امیر شریعت زندہ آباد

## عند لیبوں کا سوز اور شیروں کی گرج

زندگی میں بڑے بڑے خلیبوں کو دیکھا اور بارہا دیکھا۔ لیکن سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو صرف ایک بار دیکھا۔ اور پھر کسی کو دیکھنے کی حاجت نہ رہی۔ اگر جمود کی ضد حرکت ہے تو حرکت کا اطلاق صرف سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی حرکت تھے جن کے ساتھ ہر شے متحرک ہو جاتی تھی۔ انہوں نے اپنی ۷۱ سالہ مستعار زندگی میں کروڑوں انسانوں کو متحرک بنا دیا۔ اگر تاریکی کی ضد روشنی ہے تو بلاشبہ سرزمین ہندوستان کے تاریک اور سرزدہ ماحول میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہی وہ چراغ تھے جن سے لاکھوں چراغ روشن ہو کر مسجد و منبر کی زینت بنے۔ ایسے بست سے مقرر دیکھنے میں آئے، میں جو جمع کو ہنسانے اور رلانے پر قادر تھے۔ لیکن اشکوں کے طوفان میں مسکراہٹوں کی تہلیاں اور چمنوں کے شور میں قہقروں کا استرجاع صرف شاہ جی کے سامعین میں نظر آتا تھا۔ ادھر شاہ جی وارد ہوئے مجمع ساکت و جامد ہوا۔ ادھر شاہ جی نے تلاوت شروع کی ادھر آنسوؤں کی ایک جھڑی برسنے لگی۔ ادھر شاہ جی نے سر کو ذرا جنبش دی ادھر مسکراہٹوں کی ہیلیاں چمکنے لگیں۔ ادھر شاہ جی نے ایک گرج دار آواز سے پکارا ادھر پہلو سے دل ٹھٹھنے لگے۔ ادھر شاہ جی نے ذرا لہجہ ڈال دیا ادھر دلوں کی حرکتیں بند ہونے لگیں۔ ادھر شاہ جی نے ایک لطیفہ چھوڑا ادھر آہ و فغاں میں قہقروں کا ایک لانتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ غرض شعلہ و شبنم کا یہ اجتماع بھی صرف شاہ جی کے سامعین کا حصہ تھا۔ شاہ جی واقعی شہنشاہِ خطابت تھے۔ لفظوں کو موقع محل کے مطابق استعمال کرنا اور قہقروں کی نوک پلک سنوارنا ان کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ناخن تدبیر کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا اور ان کے گچھر کی پابندی، محاورہ خانہ زاد اور خطابت لونڈی تھی۔ فی الجملہ اس باب میں وہ یکتائے روزگار تھے۔ ان کی تقریر میں تلواروں کی جھنکار، جذبہ ایشار، اخلاق بیدار، زمین کی عاجزی، فلک کا مذاق، سرکشی، آفتاب کا تبسم، صبا کا خرام ناز، گھٹاؤں کی رقت، بجلی کی ترپ، کھمکشاں کی بیداریاں، چمنوں کی بیتابی، پہاڑوں کی استواری، کانٹوں کی غلش، گلوں کی لطافت، پہاڑوں کا استقلال، سمندروں کا سکوت، آتش کی گرمی، دریاؤں کی روانی، زرگس کی حیرانی، عندلیبوں کا سوز، شیروں کی گرج، صوفیوں کا مزاج عارفانہ، سب ہی کچھ موجود تھا۔ بخاری ایک ایسا دان تھا جسے آفتاب کی حاجت نہ تھی۔ ایک ایسی رات جسے چاند ستاروں کی ضرورت نہ تھی۔ وہ آن کی آن میں جلسہ گاہ کو قرون اولیٰ کے ماحول میں لے جاتے اور پلک چمکنے کی دیر میں میدانِ محشر کا سماں پیدا کر دیتے۔ ان کے سامعین کی سوچ و سمجھ کی صلاحیتیں اس وقت تک سلب رہتی تھیں جب تک وہ بخاری کا چہرہ دیکھتے رہتے۔ بخاری کو قہقہہ کرنے کے لئے دشمن بارہا جلسہ گاہ میں آئے لیکن جیب و دامان کی آخری محتاج بھی بخاری پر نشانہ نہ کر گئے۔ بخاری، ان کے سامعین کے دل پہلو سے ٹکل کر بخاری کے ہاتھوں میں آجاتے تھے۔ وہ پوری پوری رات انہیں گراتے اور بڑپاتے رہتے تھے۔ بخاری کی خطابت کی کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ اصحابِ صفہ کی

سادگی، عثمانؓ کی حیاداری، خالد کی جرأت، قہمان کی حکمت، ارسطو کی دانش، حاتم کی سخاوت، سکندر کا دبدبہ، غزالی کا علم و فضل اور فلسفہ حکمت، لام بخاری کا تقویٰ، ابن حجر عسقلانی کی ذہانت و خطابت، ابن تیمیہ کا علم و تبحر، لام رازی کی عمدہ کثافتی، شاہ ولی اللہ کا فہم و ادراک، شاہ اسماعیل شہید کا جلال جھلکتا نظر آتا ہے۔

اس وقت میں ایسے مقام پر بیٹھ کر یہ سطور لکھ رہا ہوں جہاں میرے پاس ایسی کوئی کتاب نہیں جس سے بخاری کا نمونہ تقریر پیش کر سکوں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی نصف سے زائد حرریں و جہیل میں کٹی۔ یہ انہیں کا اعجاز تھا کہ اپنے پرانے سبھی کو ساری زندگی گئے گائے رکھا اور دینی پرچم تلے سنی، بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث، تمام ہی کو اکٹھا کر دکھایا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طنیت را

## اب تک دل و جاں اُس کی محبت سے ہیں سرشار

اک مردِ خود آگاہ و خدا بین و خداست  
اس عہد میں میراثِ نبوت کا سرزاوار  
اسلام کی پاکیزہ روایات کا حامل  
ناموسِ رسالت کا نگہبان و نگہدار  
حم خانہ توحید کا اک زندہ بلا نوش  
مے خانہ سنت کا سدا مست قدحِ خلل  
بت خانہ بدعت کے لئے ضربِ براہیم  
اسلام کی تائید میں اللہ کی تلوار  
حق گوئی و بے باکی میں شہبازِ خطابت  
غنیور و جبری مردِ خدا پیگرِ اشار  
لیلائے خطابت کے سنورتے گئے گینو  
منبر پہ ہوا جب بھی وہ آمادہٗ گفتار  
مخفل میں وہ بیٹھا ہو تو جھوٹا تھا صبا کا  
منبر پہ کھڑا ہو تو تھا تلوار کی جھنکار  
نس نس میں سایا ہے ریاض اس طرح وہ شخص  
اب تک دل و جاں اس کی محبت سے ہیں سرشار  
ریاضِ رحمانی

## بول بالا رہے بخاری کا

اے قلم! اے ذریعہ اظہار  
اپنے سینے کو اس طرح کر چاک  
ذرا احساس کی تباہی کا  
طرز تحریر نا اسید ہوا  
خاشی - کو پکارتا ہوں میں  
وقت کیا دار پر چڑھا دے گا  
اشک آنکھوں میں تھم کے رہ جائے  
کارواں آس کا ٹٹا کیسے  
کون تھا میرے کارواں میرا  
سب مرے راز دار ہیں لیکن  
میرے دن شوق وصل سے مرموم  
میں ہلاکِ غم جدائی ہوں  
مجھ کو یارا نہیں سنن کیا!  
شمع خاموش ہو گئی جب سے  
کوئی پروانہ جان کیا دے گا  
کان ترسیں گے اس کھانی کو  
جس نے پیری کو آبرو بخشی  
جس کا عنوان تھا کوئی درویش  
کون درویش؟ مجھ کو کیا معلوم  
اس کی تصویر میں دکھاتا ہوں  
اس کی تصویر کا سوال نہیں

آج کاغذ پر اپنا سر دے مار  
لفظ ڈالیں خود اپنے سر پر خاک  
نام روشن نہ ہو سیاہی کا  
خون کاغذ کا کیوں سفید ہوا  
دل میں خبر اتارتا ہوں میں  
بات کو اس قدر بڑھا دے گا  
آہ ہونٹوں پہ جم کے رہ جائے  
کیا بتاؤں اگر کوئی پوچھے  
کیا نہیں کوئی رازداں میرا  
اپنی راتیں ہیں اور اپنے دن  
میری راتیں فراق سے مغموم  
پیکرِ رنج بے نوائی ہوں  
مجھ کو اب شوقِ انجمن کیسا  
لب جدا ہو سکا نہ پھر لب سے  
عشق کو اب زبان کیا دے گا  
اوج جس نے دیا جوانی کو  
جس نے اعلاص کو نو ہستی  
جس کا ہر سانس تھا سعادت کیش  
کیا کھلے تہہ پر اے غم مرقوم  
اس کی باتیں تجھے سناتا ہوں  
اس میں وہ قال اور حال نہیں

اشک کیسے، سو رلائے گی  
 آؤ ماتم کریں بخاری کا  
 وہ بخاری کہ تھا صدا حق کی  
 جس کو باطل دبا سکا نہ کبھی  
 جس کے دل میں تھا عشق تابندہ  
 نغمہ برب رہا یہاں کیا کیا  
 پھر بھی پیدا تھے صبر کے آثار  
 خوف دل میں خدا کا رہتا تھا  
 وہ جہاں تھا وہاں اجالا تھا  
 اس کا چہرہ مدار تابانی  
 اس کی آنکھیں سُردور کی کشیب  
 وہ ہمہ حسن تھا ہمہ دل تا  
 اب اسے ہم کہاں سے لے آئیں  
 دل کی دھڑکن زبان میں آئی  
 بولا سر چڑھ کے نطق کا جادو  
 زیت مرکز کی ست گھوی ہے  
 حق کی آواز سرفراز ہوئی  
 کوئی لب کھول کر دکھائے اب  
 سیل کی طرح آگے بڑھتا ہے  
 اس کے رستے میں کوئی ٹھہرے خاک  
 بند ہے ناطق فصاحت کا  
 چہرہ دونوں کا ایک سا ہے فق  
 اس نے الحمد سے کیا آغاز  
 چھٹ گئی ہر طرف گھٹنا غم کی

اس کی ہر بات یاد آئے گی  
 کس کو دعوتے تھا غم گساری کا  
 وہ بخاری کہ تھا عطا حق کی  
 جس کو باطل جھکا سکا نہ کبھی  
 جس کے پہلو میں تھا دل زندہ  
 عشق دارو رسن سے بے پروا  
 کنتی اونچی تھی جبر کی دیوار  
 وہ ستم آدمی کے سستا تھا  
 بے نوا تھا مگر نرالا تھا  
 منج نور اس کی پیشانی  
 اس کے گیسو جمال کی ترتیب  
 ہائے وہ آب تھانہ وہ گل تھا  
 اب کہاں اس کو ڈھونڈنے جائیں  
 سن، وہ آواز کان میں آئی!  
 ایک ستاٹا چھا گیا ہر سو  
 جیسے ہستی فضا میں جھوی ہے  
 دل جھکے عشق کی نماز ہوئی  
 چپ ہے کیوں، بول کر دکھائے اب  
 وہ خدا کا کلام پڑھتا ہے  
 اس کو روکیں گے کیا خس و خاشاک  
 لو، بہرم کھل گیا بلاغت کا  
 گنگ ہے نغمہ ہے یا منطق  
 عرش سے لائی کیا اثر آواز  
 ہے ثنا خالق دو عالم کی



ایک تکسین کا تصور ہوا  
 دھل گیا داغ بے تیزی کا  
 ہائے اب وہ صدا نہیں آتی  
 اس کی قربت تھی دل کی آبادی  
 دل لرزتا تھا اس سے غمی کا  
 بھوک اور پیاس کی سزا کیا تھی  
 قید میں بھی رہا سدا آزاد  
 کوئی فرعون جب ہوا دوچار  
 شکست عشق کی نمایاں تھی  
 وہ گدا تھا درِ محمد کا  
 حق و باطل میں امتیاز رہا  
 اس کا ثانی کہاں سے لائے گا  
 فکر میں بودو باش ہے اس کی

دل کو حاصل عجب سرور ہوا  
 بول بالا رہے بخاری کا  
 غم سے کیا پھٹ نہ جائے گی چھاتی  
 وہ سراپا تھا درس آزادی  
 پاؤں نکلتا نہ تھا غلامی کا  
 اس کو معلوم تھا وفا کیا تھی  
 اس کا منہ نکلتا تھا ہر اک خدا  
 بڑھ گیا اور جذبِ دل کا وقار  
 کوئی منزل تھی، اس کو آسماں تھی  
 پاس تھا اس کو عظمتِ جد کا  
 وہ فقیری میں بے نیاز رہا  
 کیا اسے کوئی بھول جائے گا  
 زیت کو خود تلاش ہے اس کی



اہرار کے عظیم رہنما اور  
 تحریکِ آزادی کے ایک مجاہد  
 کے آپ بیتی  
 قیامِ پاکستان کے وقت  
 مسلمانوں پر کیا بیتی

قیمت 12 روپے

بخاری اکیڈمی، مہربان کالونی، ملتان۔

سرخ لکیر

ماسٹر تاج الدین انصاری

## اگر دعاؤں سے کام چل سکتا تو..... (چند یادیں)

ایک دفعہ میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے حسب عادت آٹو گراف کے لئے بک ان کی طرف بڑھائی۔ شاہ جی فرمانے لگے، میں تو ایک درویش آدمی ہوں۔ یہ باتیں لیڈروں کو زب دہتی ہیں۔ بھائی، میں لیڈر نہیں ہوں۔ میں نے بہت اصرار کیا، مگر شاہ جی نہ مانے۔ شاہ جی، لاہور تشریف لے جانے کے لئے ملتان اسٹیشن پر فروکش تھے۔ راقم نے تصویر لینے کی خواہش ظاہر کی تو فرمایا نہیں بھائی! میرے انکار ہی میری تصویر ہیں۔ انہیں اپنالو تو ابی ہی میں میرا عکس نظر آنے لگا۔

ایک صاحب شاہ جی سے باتیں کر رہے تھے۔ دوران گفتگو انہوں نے کہا، شاہ جی! اس دور کے انسانوں کو سکون کی زندگی نصیب نہیں ہے۔ ہر شخص مصائب کی چکی میں پس رہا ہے۔ فرمایا... بھائی مسلمان قرآن اور حدیث پڑھنے کی بجائے شکسٹیر کے ڈرامے پڑھنے لگے ہیں۔ مصائب سے نجات کیوں ہو؟ سکون نصیب ہو تو کیسے؟ تحریک ختم نبوت کے زمانے میں شاہ جی سے کسی نے کہا۔ شاہ جی ایسے کام نہ کیجئے جن سے آپ کو تکلیف برداشت کرنا پڑے۔ اب آپ ضعیف ہیں۔ ضعیف العمری کا تقاضا ہے کہ اب آپ آرام کریں۔ شاہ جی نے بڑے جلال سے کہا۔ ناموس رسالت ﷺ خطرے میں ہے۔ اغیار، شمع رسالت بجھانے کے درپے ہیں اور تم ہو کہ مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے رہے ہو؟ بھائی تم مجھے یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میں خود کشی کر لوں؟ بخاری زندہ ہو اور خاموش رہے؟ بجلا یہ کیسے ممکن ہے؟ ان صاحب کی یہ حالت تھی کہ..... کاٹو تو ہونو نہیں بدن میں!

شاہ جی اپنے مکان کی بیٹھک میں تشریف فرما تھے۔ ان کے قریب ہی بہت سے عقیدت مند فروکش تھے کہ اتنے میں ایک بڑھیا آئی اور کہا۔ میری بیٹی جوان ہے۔ پیسے نہیں ہیں۔ میں اس کی شادی کیسے کروں؟ شاہ جی فوراً اندر تشریف لے گئے اور کپڑے کی ایک تھیلی بڑھیا کے حوالے کر دی۔ وہ دعائیں دہتی ہوئی چلی گئی۔

اور یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے..... تب میں روزنامہ "سٹیج" بہاول پور میں سٹاف رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا، اشتہارات کے فقدان اور نیوز ایجنٹوں کے عدم تعاون کی بناء پر روزنامہ "سٹیج" مالی بحران کا شکار ہو گیا۔ پہلے یہ اخبار چار صفحات پر چھپتا تھا، پھر دو پر آ گیا۔ پھر ایک دن ایسا بھی طلوع ہوا کہ مسٹر علی احمد رفعت نے روزنامہ "سٹیج" کو بند کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی کیونکہ ان کے پاس جو بھی پونجی تھی وہ اس کی نذر کر چکے تھے۔ میری ملازمت ختم ہو گئی اور مجھے یہاں سے رخصت ہونا پڑا۔

اس وقت ملتان سے صرف روزنامہ "نوائے وقت" نکلتا تھا اور اس کے ریڈیڈنٹ ایڈیٹر مسٹر مہایوں اویس تھے۔ میں بہاولپور سے ملتان پہنچا۔ ملازمت چلی جانے سے ذہنی طور پر بے حد پریشان تھا۔ میں ریلوے اسٹیشن سے سیدھا شاہ جی کے دولت کدہ واقع کوئٹہ تو لے جاں پہنچا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے دروازہ پر دستک دی۔ چند ساعتوں کے بعد دروازہ کھلا اور شاہ جی کو بنفس نفیس اپنے سامنے پا کر میرا دل بلبلیا اچھلنے لگا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایشیا کا سب سے بڑا خطیب مجھے اس سعادت سے نوازے گا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے اپنا تعارف کرایا اور اپنے والد مرحوم کا نام بتایا تو شاہ جی نے جذباتی انداز میں مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور آبدیدہ ہو گئے۔ بڑی شفقت سے کافی دیر تک میرے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔

شاہ جی اپنے کمرے میں دری پر تشریف فرما ہو گئے۔ میں بھی دو زانو ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ شاہ جی مرحوم ماضی میں کھو گئے اور ایام رفتہ کا تذکرہ کرنے لگے۔ پھر فرمایا کہ کیسے آنا ہوا؟ میں نے عرض کیا کہ شاہ جی ملازمت سے جواب مل گیا ہے۔ بیروزگاری سے سنت ذہنی کرب و اذیت میں مبتلا ہوں۔ اب ملازمت کے لئے ملتان آیا ہوں۔ دعا فرمائیں کہ مجھے اخبار میں ملازمت مل جائے۔

شاہ جی نے میری بات سن کر خاموشی اختیار کر لی۔ پھر تھوڑے توقف کے بعد فرمایا کہ میرے بھائی! دعاؤں پر تکیہ کرنے کی بجائے جدوجہد کیجئے۔ اس کے ساتھ ساتھ رب العزت کی بارگاہ میں دعا کیجئے میں شاہ جی کا یہ جواب سن کر افسردہ سا ہو گیا۔ انہوں نے میری پریشانی کو بھانپ لیا اور فرمانے لگے کہ میرے نانا (حضور اکرم ﷺ) کو شاہ جی ہمیشہ نانا ہی کہا کرتے تھے) کا اسوہ حسنہ قیامت تک نوع انسانی کے لئے شعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی پوری عملی زندگی جدوجہد کا بہترین نمونہ ہے۔ حضور اکرم نے قدم قدم پر مصائب برداشت کیے، کفار سے جنگیں لڑیں حتیٰ کہ ایک جنگ میں آپ کے دندان مبارک شہید ہو گئے۔

یہ درست ہے کہ مسلمان کے لئے دعا آخری ہتھیار ہے لیکن اس ہتھیار کو استعمال کرنے کے علاوہ عملی زندگی میں سنی و جہد بھی نہایت ضروری ہے۔ اسلام اور حضور ﷺ کی تعلیمات بھی یہی ہیں لیکن پیشہ و پیروں اور دنیا دار درویشوں نے آقاؐ نے نامدار ﷺ کی ان مقدس تعلیمات کے علی الرغم تعویذ گندلوں کو جلب زر کا ذریعہ بنالیا اور وہ مشکلات میں گرفتار لوگوں کی جیبوں پر خوب ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اس ملت میں ایسے بھی پیر پیدا ہوئے جنہوں نے عربوں کے خلاف انگریز کی حمایت میں لڑنے والے سپاہیوں کو تعویذ دیئے کہ انہیں بازوؤں پر باندھ لینے سے دشمن کی گولی ان پر اثر نہیں کرے گی۔ ایسے لوگ دین کی پیشانی پر ایک بد نما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بھائی! میں ان میں شامل نہیں ہوں۔

شاہ جی فرمانے لگے کہ بھائی! اگر صرف دعاؤں سے کام چل سکتا تو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی اور اس کے بعد قیام پاکستان تک چلنے والی تحریکوں میں لاکھوں مسلمان نہ تیغ نہ ہوتے، ہزاروں کی املاک برباد نہ ہوتیں اور نہ انگریزی سامراج سے اتنی طویل جنگ لڑنا پڑتی بلکہ ہم بہت پہلے انگریز کو برعظیم سے کھال چکے ہوتے۔ بھائی! وقتی مصائب سے گھبرانے کی بجائے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ یہی شیوہ مردانگی ہے۔ جانیے

جدوجہد کیجئے اور اس کے ساتھ دعا بھی! اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہیں۔ جلد وہ رزق کی بہم رسانی کا کوئی نہ کوئی ذریعہ بنادیں گے۔ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔

میں جب شاہ جی سے مصافحہ کر کے باہر نکلا تو بے روزگاری کی وجہ سے میرے دل و دماغ پر جو پریشانی غالب تھی وہ کافور ہو چکی تھی اور میں ہشاش بشاش ہو کر ملازمت کی تلاش میں نکل پڑا۔ تب سے میں نے محنت کو، جدوجہد کو اپنا مقصد حیات بنالیا۔ ہر موقع پر خدا کی نصرت میرے شامل حال رہی اور آج تک کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھا۔ اب جب بھی استغلو آزمائش کا کوئی مرحلہ پیش آتا ہے تو میں یوں محسوس کرتا ہوں کہ جیسے شاہ جی مجھے ہمت و استقلال کی تلقین فرما رہے ہوں اور میں مشکلات سے دل برداشتہ اور دل گرفتہ ہونے کی بجائے اپنے ان کا مقابلہ کرنے کی نئی قوت اور توانائی کا رفا پاتا ہوں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے میرے والد مرحوم کے سالہا سال سے تعلقات تھے۔ اور جس وقت شاہ جی نے میدان سیاست میں قدم رکھا اور تحریک خلافت کے سلسلہ میں جدوجہد شروع کی اس وقت والد صاحب پنجاب میں خلافت کمیٹی کے صدر تھے۔ یہ تعلقات ۱۹۲۱ء میں شروع ہوئے اور میرے والد صاحب کی زندگی تک قائم رہے۔ والد صاحب کی وفات سے پانچ سال قبل میں بنے ۱۹۳۷ء میں لاہور میں وکالت شروع کر دی تھی۔ مگر شاہ جی کی شفقت میرے ساتھ اس سے سالہا سال پہلے سے تھی۔ اور مجھ پر ان کی عنایت آخری ایام تک رہی۔ آخری زمانہ میں شاہ جی سیاست سے دست کش ہو چکے تھے۔ اور ملتان میں سکونت نے مستقل صورت اختیار کر لی تھی۔ اس زمانہ میں بھی جب بھی مجھے ملتان جانے کا موقع ملا۔ شاہ جی نے اکثر یاد فرمایا۔ اور مجھے فیضِ صحبت سے مستفیض کیا۔

میرے لئے شاہ جی کی حیثیت سیاسی رہنما سے بڑھ کر ایک مُشفق بزرگ کی تھی۔ جس کا چالیس سال میں نے احترام کیا۔ اور جنہوں نے مجھ سے محبت کی۔ میں نے جب سیاست میں دخل دینا شروع کیا تو ہماری راہیں ایک نہ تھیں مگر اس کے باوجود نہ ان کی عنایات میں فرق آیا نہ میرے احترام میں۔ میں نے شاہ جی کے خطبات بھی سنے ہیں۔ میں اب بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ زور بیانی کے ساتھ جو شیرینی ان میں موجود تھی وہ بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ ہزارہا لوگ گھنٹوں ان کی تقریر سنتے۔ اور ان کی خوبی تقریر پر سر دھنتے تھے۔ غالباً اپنے زمانہ میں وہ اور نواب بہادر یار جنگ مسلمانوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ مقرر رہے تھے۔ گودونوں کا رنگ جدا تھا۔ مگر درازی تقریر اور شیریں مقامی دونوں میں مشترک تھی۔ ذاتی زندگی میں درویشی ان کی نمایاں تھی۔ خلقِ رسول کے ساتھ توحید پر اصرار انہی خصوصیات تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مرتبہ انہوں نے قید و بند کے مصائب کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ اور تحریک تحفظ ختم نبوت میں سپہ سالاری کے فرائض انجام دیئے۔

انہیں تو لازماً مرنا تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ آج ہماری قوم نہ صرف ایسی جلیل القدر ہستیوں کو اہستہ آہستہ فراموش کر رہی ہے بلکہ موجودہ دور میں ایسے اصحاب کے وجود سے محروم بھی ہو رہی ہے۔

میاں محمود علی قصوری مرحوم بارائٹ لاء

## پیشانی افکار کا جھومر

تہذیب و شرافت کا سمندر تھے بخاری  
 اخلاق و مروت کے شناور تھے بخاری  
 وہ کام سرانجام دیا زیت میں اپنی  
 دنیا نے کہا مرد قلندر تھے بخاری  
 احساس کی قندیل جلاتے رہے ہر سو  
 ایثار کا نایاب شرور تھے بخاری  
 تقریر میں ثانی نہیں ملتا کوئی ان کا  
 پیشانی افکار کا جھومر تھے بخاری  
 دنیا کو صداقت کا سبوت دے گئے ہیں  
 لاریب مقدر کے سکندر تھے بخاری  
 وہ دولت بیدار عطا کی گئی ان کو  
 ہر منزل احساس کے رہبر تھے بخاری  
 باطل کا کوئی خوف نہ موجود تھا دل میں  
 ہر حال میں سچائی کا پیکر تھے بخاری  
 منہ بولتی تصویر تھے نکریم و حیا کی  
 اور واقف تعظیم پیغمبر تھے بخاری  
 پیغام دیا قوم کو حب الوطنی کا  
 اک شاعر خوش طینت و خوش تر تھے بخاری  
 راہی انہیں کیونکر نہ کرے یاد زمانہ  
 پاکیزہ خیالات کا محور تھے بخاری

## وہ شخص جو حدیقہ دیں کی بہار تھا

وہ شخص جو حدیقہ دیں کی بہار تھا اللہ کی عطا تھا، شریعت مدار تھا  
شعلہ بھی تھا، شمع تھا، برق و شرار تھا مانند شیر ز تھا، فرنگی شکار تھا

ابلیسیوں پہ اس کے تریڑے شہاب وار

یوں پڑ رہے تھے جیسے بتوں پر خدا کی مار

جو مٹ کے بھی کبھی نہ مٹے وہ نشان تھا جو کٹ کے بھی کبھی نہ رکے وہ زبان تھا  
ابنائے دیں کے حق میں ردائے امان تھا اعدائے دیں کے حق میں کڑکتی کمان تھا

دشمن بچان پر تھے مگر ہانپتے ہوئے

اپنے لہو سے اپنے تیر ڈھانپتے ہوئے

وہ شخص تھا سپہرِ خلافت کا آفتاب مٹھی میں جس کی موم صفت، شیخ ہوں کہ شاب  
لفظوں کا بادشاہ، تراکیب کا شباب لہجے میں رس، بیان میں قیامت کا التہاب

اس کے سنی میں شعلہ و شبنم تھے یوں بہم

"کا الطیر فی الحدیقۃ واللیث فی الاعم"

وہ طنطنہ کہ ارض و سما بولنے لگیں! بے جاں پرند لفظوں کے پر تولنے لگیں  
جب حروف و صوت اپنے صدف کھولنے لگیں پھر لب، کہ بے ٹکان گھر رولنے لگیں

تکرار لفظ وہ کہ بیان کو خبر نہ ہو

گویا وہ تیغ جس کی میاں کو خبر نہ ہو

تو کیا گیا مزاج حکومت بگڑ گیا تو کیا گیا کہ نخل شجاعت اکھڑ گیا  
یوں لگ رہا ہے، قوط سا جذبوں کا پڑ گیا تو کیا اٹھا کہ قرق خطابت اجڑ گیا

یہ وضع دہنی ہو گئی ہمرہ جناب کے

"اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے" پروفیسر ڈاکٹر تمین فراقی (لاہور)



ہے کہ کون نواب کالا باغ اور بھٹو کے دور میں مقتل کو سرخو کرتا ہے اور کون منسوب و جاہ کو!  
ایک اور بات جس پر ہم چونکے اور ٹھٹھکے، ----- ہے وہ بھی سخن گسترانہ! الطاف، صاحب روای ہیں کہ  
نواب کالا باغ نے ان سے کہا۔

”ایک دفعہ عطاء اللہ شاہ بخاری میانوالی تشریف لائے، ان کی جادو بیانی کا یہ اثر ہوا کہ صلح بھر کے  
لوگ رات رات بھر بیٹھے ان کے ارشادات سنتے اور سر دھتے، انہوں نے اعلان کیا کہ وہ نواب کالا باغ کے  
ظلم اور جبر کے خلاف جہاد کا علم لے کر نکلے ہیں، نواب صاحب کے مخالفین نے شاہ صاحب کو اور چڑھا  
دیا۔ بے شمار لوگ اس جہاد میں ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جمعرات کی شام کے جلسے میں انہوں نے اپنے  
جاں فردوں کو اطلاع دی ”کل جمعہ کی نماز کے بعد میں سرپرکھن باندھ کر کالا باغ روانہ ہو جاؤں گا، کیا  
آپ میرے ہمراہ چلیں گے؟“ حاضرین جلسہ نے بیک زبان کہا ”ہاں چلیں گے“ اس اعلان کی گونج نواب  
کالا باغ کے کان بھی پڑی۔ انہوں نے اپنے ایک معتد کے ہاتھ عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمت میں یہ پیغام  
بجھوایا کہ حضور شاہ صاحب بڑی خوشی سے کالا باغ تشریف لائے، جو کفن آپ سر پر باندھ کر آئیں گے ہم  
آپ کو وہی کفن پہنا کر واپس بھیج دیں گے“ نواب صاحب کے قول کے مطابق شاہ صاحب نے یہ پیغام  
کے بعد کالا باغ آنے کا ارادہ ترک کر دیا، تو جبر کی سائنس یہ ہے کہ مد مقابل کو پہچانا اور جب اس کے  
مگر بہانہ پر ہاتھ ڈالو تو یہ اطمینان کر لو کہ تمہارے پاؤں زمین پر جے رہیں، اور وار کو تو ایسا کہ رقیب روسیہ  
جائزہ نہ ہو سکے۔ کسی کمزور آدمی پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔“

اب میں کیا عرض کروں، کہ یہاں تو جبر کی سائنس، استائے لاغری سے دکھائی بھی نہیں دے رہی۔  
و دعویٰ، دلیل، روایت اور درایت کی رو سے بلکہ درعایت سے بھی، اس حکایت کو پایہ ثنابت تک پہنچانا محال  
ہے۔ پایہ ثنابت کہاں، اسے پایہ ثبوت تک بھی نہیں پہنچایا جاسکتا۔ وہ کیوں؟ اس لئے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری،  
ایک دفعہ نہیں، بہت دفعہ میانوالی تشریف لے گئے۔ لیکن یہ کفن والی بات تو کبھی نہیں سنی گئی۔ بالکل بھی  
نہیں۔ ہاں، شاہ صاحب کے ایک ساتھی تھے مولانا محمد گل شیر! احراری خطیبوں کی سنگت میں بہت نمایاں  
تھے۔ یہ ”مردحر“ تھا جس نے ۱۹۴۳ء میں نواب کالا باغ کے مظالم کے خلاف عوامی تحریک کا آغاز کیا اور  
۱۹۴۴ء کے وسط میں، نواب صاحب کے حسب الارشاد، کفن اوڑھ کر، آسودہ خاک ہو گیا۔ اس اجمال کی کچھ  
تفصیل عرض کر دینا یوں بھی ضروری ہے کہ آج کی نسل تو نواب کالا باغ سے بھی کچھ زیادہ واقف نہیں ہے  
جائیکہ اسے مولانا گل شیر اور عطاء اللہ شاہ بخاری کے افکار و سونخ سے کچھ علاقہ ہو۔

یہ مولانا گل شیر صلح ایک کے ایک گاؤں (لمووالی) کے رہنے والے تھے۔ شمالی پنجاب میں ایک، کیسبل  
پور، میانوالی، سرگودھا، خوشاب، جہلم وغیرہ کے علاقوں میں یہی ایک آواز تھی جو گجیر داروں، وڈیروں،  
نوٹوں، کاسہ لیسوں اور فرنگیوں کے لئے، ۱۹۲۸ء سے سوہان روح بن گئی تھی۔ خوف، مولانا کی چہڑی میں نہیں  
تھا۔ مستزاد یہ کہ غضب کے خوش بیان، خوش الحان اور خوش شکل بھی! یہ واقعہ ہے کہ خلقت ان کی دیوانی  
تھی۔ پروفیسر مرزا محمد مہر کے الفاظ ہیں کہ

”میں مولانا گل شیر کو عطاء اللہ شاہ بخاری سے برتر مقرر جانتا ہوں۔ ان کے بیان میں جو سوز اور درد





اتنا ہی یقین تھا "اپنے نواب صاحب، نواب ہی تو تھے، یا پھر مغربی پاکستان کے گورنر ہو گئے۔ جبکہ سکندر مرزا صاحب تو گورنر جنرل اور صدر مملکت بھی ہوئے۔ ان کی تب و تاب جابرانہ کا کیا کسنا۔ چودھری محمد علی، حسین شہید سہروردی، آئی آئی چندرپور، ملک فیروز خان،۔۔۔۔۔ یہ سب وزراء اعظم انہوں نے یکے بعد دیگرے یوں بھگتائے اور چلتے کئے کہ۔۔۔۔۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ ان کے مزاج کی رنگینی اور دماغ کی سنگینی کی داستانیں، الطاف گوہر صاحب کے علم میں بھی یقیناً ہوں گی۔ بہر حال میں یہاں شورش کاشمیری کی ایک روایت نقل کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"شیخ حسام الدین، حسین شہید سہروردی کے ساتھ عوامی لیگ میں شامل ہو گئے۔ ایک دن سہروردی صاحب نے ان سے کہا۔۔۔۔۔ شیخ صاحب! سکندر مرزا (صدر مملکت) کو مجلس احرار کے بارے میں غلط فہمی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کا ذہن صاف ہو جائے لیکن آپ کی اس سے ملاقات مفید ہوگی۔ غرض شیخ صاحب اور ماسٹر تاج الدین انصاری، سکندر مرزا سے ملاقات کیلئے گورنمنٹ ہاؤس لاہور، میں گئے۔ سکندر مرزا، اپنے صدارتی جاہ و جلال کے ساتھ برآمد ہوا اور خانا بے نیازی کے ساتھ فروکش ہو گیا۔ ڈاکٹر خان صاحب، صوبہ کے وزیر اعلیٰ، ہمارے ساتھ۔ سہروردی نے مرزا سے کہا "دونوں احرار رہنا، شیخ صاحب اور ماسٹر جی، آئے ہیں۔" مرزا نے حثارت سے جواب دیا "احرار؟ پاکستان کے غدار ہیں۔"

ماسٹر جی، شہنزی طبیعت کے مالک، کہنے لگے۔ غدار میں تو پچاسی پر کھنچو دیجئے، لیکن الزام کا ثبوت ہونا چاہیئے۔ سکندر مرزا نے اسی رعوت سے جواب دیا۔

"بس میں نے کہہ دیا ہے کہ احرار غدار ہیں۔"

ماسٹر جی نے محل کا رشتہ نہ چھوڑا لیکن مرزا نے سرکش گھوڑے کی طرح پٹھے پر ہاتھ ہی نہ دھرے دیا۔۔۔۔۔ وہی ڈاڑھا خانی!

شیخ صاحب نے غصہ میں کروٹ لی۔ مرزا سے پوچھا، کیا کہا آپ نے؟

میں نے؟

جی ہاں!

"احرار، پاکستان کے غدار ہیں۔" مرزا نے مضی بھینچتے ہوئے کہا۔

شیخ صاحب کہاں رکتے۔ گورنمنٹ ہاؤس، گورنر موجود، وزیر اعلیٰ موجود، وزیراعظم موجود، صدر مملکت کی بارگاہ! فوراً جواب دیا۔۔۔۔۔ "احرار، غدار ہیں کہ نہیں۔ اس کا فیصلہ ابھی تاریخ کرے گی۔ تمہارا فیصلہ تاریخ کر چکی ہے کہ تم غدار ابن غدار ہو۔ تمہارے جد امجد میر جعفر نے سراج الدولہ سے غداری کی تھی۔ تم اسلام کے غدار ہو۔" ڈاکٹر خان نے شیخ صاحب کو آغوش میں لے لیا اور سکندر مرزا سے پشتوں میں کہا۔ "میں نے تمہیں پہلے کہا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ شریکانہ لہجہ میں بولنا۔ یہ بڑے بے ڈھب لوگ ہیں۔" ظاہر ہے کہ ہلی، ایک ہی جھگے میں سپر انداز ہو جاتی ہے۔ یکایک اس کا لب و لہجہ ہی بدل گیا۔

مجھے اس روایت پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا اور نہ کوئی حاشیہ چڑھانا ہے۔ عیاں راہیہاں! لیکن ایک



اصل میں مجھے بھی حیرانی یہ ہوئی ہے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری سے متعلق نواب کالا باغ کے بیان کو الطاف صاحب نے یوں پیش فرمایا ہے کہ (معذرت کے ساتھ) گویا اس کی Credibility کا اشتہار ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ان سے بہتر کے انداز ہو گا کہ یہ، اصول روایت کے سراسر منافی ہے۔ پھر، عطاء اللہ شاہ بخاری اور اس کیڈٹس کے دوسرے لوگوں کے متعلق یہ باور کر لینا کہ وہ حریف اور مد مقابل سے یوں آسانی سے ہار مان گئے ہوں گے "انتہائے سادگی" ہی تو ہے۔ یہ لوگ تو جس مٹی کے بنے ہوئے تھے اس میں ظلم کے مقابلے میں Diplomacy کی بجائے Contumacy کا عنصر پوری طرح (بلکہ بری طرح) غالب و حاوی تھا۔

یہاں سوال یہ نہیں کہ ایسی روایتوں اور حکایتوں کا سامنے آنا کس سطح کے لوگوں کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ اس اشتغال سے گریز و احتراز کس حد تک لازم ہے۔؟ خود الطاف گوہر صاحب کو آج بھی بہت سے نوابانِ سبز باغ، مجیب الرحمن کے چھ نکات کا مصنف بتلاتے ہیں۔ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو سے گوہر صاحب کو جو تعزیر و تعذیب پر مبنی تعلق رہا ہے، اس کے Second Phase کے متعلق راول عبدالرشید فرماتے ہیں کہ "بھٹو صاحب نے ان کو انٹینیشنل کیا۔ ان کے بجائے (تجمل حسین) کو سفیر بنا کے بھیجا۔ انکوریٹ پلانٹ کا ٹھیکہ دیا۔ آخر الطاف گوہر نے بھٹو صاحب کے ساتھ سمجھوتہ اصولوں پہ کیا۔" کیا یہ سب کچھ مان لیا جائے؟ اور کیوں نہ مان لیا جائے؟۔۔۔۔۔ امید ہے گوہر صاحب میرا لکھتے سمجھ گئے ہوں گے۔

ہفت روزہ "لاہور" لاہور (مرزاوی جریہ)

### ان کا بدل شاید ہی پیدا ہو سکے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات دراصل سابق علاقہ پنجاب کے عوامی نفسیات کے ماہر ایک ایسے شعلہ بیان مقرر کی وفات ہے جس کا بدل شاید ہی پیدا ہو سکے۔ پنجاب کے عوام کو تو محض طور پر ان کا تقریروں کا ایسا لپکا بلکہ چکا تھا کہ وہ نظریاتی مخالفت کے باوجود رات گئے تک بیٹھ کر آپ کی تقریریں سنتے اور چمکے لیتے رہتے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل جب احرار کا کانگریس سے سا جھا ہو چکا تھا اور یہ جماعت اس نئی اسلامی مملکت کے قیام کو نا ممکن بنانے کے لئے ہر ممکن سعی میں مصروف تھی۔ احرار نے حب معمول شاہ صاحب کے حسنِ خطاب کو آلہ کار بنایا اور اس دور کی سیاست میں عملی دلچسپی لینے والے گواہ ہیں کہ مسلم لیگ کے لکٹے ہی شیدا والہ ان کی تقریریں اسی ذوق و شوق سے سنتے آتے تھے جتنے ذوق و شوق سے وہ اپنے ووٹ مسلم لیگ کو دیتے تھے۔

نئی زندگی میں شاہ صاحب نہایت ہی سادہ اور پُر خلوص، بذلہ سنج اور ملنسار انسان تھے۔ جماعت احرار نے ہمیشہ آپ کی سادگی کو اپنی سیاسی اغراض کے لئے اکسپلاٹ کیا اور وہ اپنی ان کمزوریوں یا صفات کے باعث ہمیشہ اکسپلاٹ ہو جاتے رہے۔ شاہ صاحب کے گلے میں ایک عجب و غریب قسم کا رس تھا جس کا حسن و جذب عام طور پر اس وقت ظاہر ہوا کرتا تھا جب اپنی تقریروں سے پہلے تلاوتِ کلام پاک کیا کرتے تھے۔

## جناب الطاف گوھر کی خدمت میں

جناب الطاف گوھر نے یکم دسمبر ۱۹۹۳ء کے روزنامہ نوائے وقت میں اپنا کالم ”لکھتے رہے جنوں کی حکایت“ نواب کالا باغ مرحوم کے حوالے سے لکھا ہے۔ ان کی یادداشتوں پر مبنی اس کالم میں نواب کالا باغ مرحوم کی ایک روایت نقل کی گئی ہے

”ایک دفعہ عطاء اللہ شاہ بخاری میانوالی تشریف لائے، ان کی جادو بیانی کا یہ اثر ہوا کہ ضلع بھر کے لوگ رات بھر بیٹھے ان کے ارشادات سنتے اور سر دھنتے رہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ نواب کالا باغ کے ظلم و جبر کے خلاف، جہاد کا علم لے کر نکلے ہیں۔ نواب صاحب کے مخالفین نے شاہ صاحب کو اور بھی چڑھا دیا۔ بے شمار لوگ اس جہاد میں ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جمعرات کی شام کے جلسے میں انہوں نے اپنے جاں فروشوں کو اطلاع دی، کل جمعہ کی نماز کے بعد میں سر پر کفن باندھ کر کالا باغ روانہ ہو جاؤں گا کیا آپ لوگ میرے ساتھ روانہ ہوں گے؟“ جلسہ نے بیک زبان کہا ”ہاں چلیں گے“ اس اعلان کی گونج نواب کالا باغ کے کان بھی پڑی انہوں نے اپنے معتد کے ہاتھ عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمت میں یہ پیغام بھجوایا کہ ”حضور شاہ صاحب! بڑی خوشی سے کالا باغ تشریف لائے جو کفن آپ سر پر باندھ کر آئیں گے۔ ہم آپ کو وہی کفن پہنا کر واپس بھیج دیں گے“ نواب صاحب کے قول کے مطابق شاہ صاحب نے یہ پیغام ملنے کے بعد کالا باغ آنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ توجہ کی سائنس یہ ہے کہ مد مقابل کو بچاؤ اور جب اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالو تو یہ اطمینان کر لو کہ تمہارے پاؤں زمین پر جے رہیں اور وار کو تو ایسا کہ رقیب روسیہ جابر نہ ہو سکے۔ کسی کمزور آدمی پر ہاتھ نہ اٹھاؤ“

یہ روایت شاید الطاف گوھر صاحب کے زور قلم کا حاصل ہے یا نواب امیر محمد خاں کی افسانہ تراشی ’بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو اس وضی روایت پر کلی طور پر اجماع کرنا تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجلس احرار اسلام الہی بہادر قومی و دینی جماعت کے زعمائے جب بھی کوئی موقف اختیار کیا اور اس پر ہر طرح سے یقین و اطمینان کر لیا تو اس کے بعد مصمم قلب سے ڈٹ گئے۔ پھر کوئی جبر و طاغوت ان کے آہنی عزائم کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ تاریخ کے اوراق اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ کشمیر کے ڈوگرہ راج کے مسلمانوں پر مظالم کے خلاف جب مجلس احرار اسلام نے علم جہاد بلند کیا تو پچاس ہزار سے زائد احرار و اسیروں نے گرفتاری دی اور ہلاختم مارا جب

کشمیر کو کشمیری مسلمانوں کو حقوق دینا پڑے اسی طرح پور تھل کی تحریک ہو یا فرخ نگر کے فسادات، فوجی بھرتی پائیکٹ مسم ہو یا تحریک تحفظ ختم نبوت، احرار کے جیالوں نے جماعت مرکزیہ کے حکم پر اپنی جانوں کو داؤ پر لگا دیا۔ یہی وجہ تھی کہ مجلس احرار اسلام متحدہ ہندوستان کی تمام دینی و سیاسی جماعتوں پر قربانی و ایثار اور عزم و ہمت کے میدان میں بازی لے گئی جس کا اعتراف آج بھی باشعور دانشمند اور غیر جانبدار مورخین کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے

جس طرح الطاف گوہر صاحب نے اپنی روایت کے سہارے بانی احرار حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اجلے دامن کو داغدار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان کی یہ مذموم سعی دراصل جماعت احرار کے شاندار تاریخی کردار کو مجروح کرنے کے ٹپاک پروگرام کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے

میں حیران ہوں کہ ادیب احرار آغا شورش کشمیری جب تک زندہ رہے الطاف گوہر ایسے بزم خویش و دانشور اور بے علم سیاسی تجزیہ نگار کیوں منہ میں گھٹکتھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ شورش مرحوم نے جناب الطاف گوہر کے بعض ”روشن اعمال“ کو جب ”چٹان“ میں موضوع بنایا تھا تو گوہر صاحب کا بے لگام قلم اس وقت حرکت میں کیوں نہ آیا۔ ان کی رحلت کے بعد شاید وہ یہ سوچ کر کہ اب جواب دینے والا کوئی نہ رہا تھا جو منہ میں آئے کہہ دیا جائے یا قلم سے قرطاس پر منتقل کر دیا جائے۔ لیکن یہ محض ان کی خوش فہمی اور خام خیالی ہے۔

مجلس احرار میں یوم تاسیس سے لیکر آج تک تاریخی حقائق پر نظر رکھنے اور انہیں قلم کے ذریعے عوام الناس تک پہنچانے والے باشعور اور صاحب نظر لوگوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ چودھری افضل حق سے لیکر جاناہز مرزا تک ایسے ہر ہنما اور کارکن نے علم و ادب اور دین و سیاست میں وہ قلمی جواہر برزے بکھیرے کہ جن کی چمک و دمک آج بھی نام نہاد محققین اور کور بھر لکھاریوں کی آنکھوں کو چکا چوند کر رہی ہے

دوسری بات یہ ہے کہ الطاف گوہر صاحب نے جس روایت کو پیش کیا ہے وہ خود پکار پکار کر اپنی حقیقت آشکارا کر رہی ہے اولاً ”سید عطاء اللہ شاہ بخاری قیام پاکستان سے قبل غالباً دو تین دفعہ ہی ضلع میانوالی تشریف لے گئے اور تقسیم ہند کے بعد بھی اتنی ہی بار۔

ثانیاً ”شاہ جی نے اپنی تقاریر میں میانوالی کے قوانین اور وزیر شاہی کو اپنی آتش نوائیوں کا موضوع ضرور بنایا لیکن روایت مذکورہ میں یہ اعلان کہ ”کل جمعہ کی نماز کے بعد میں سر رکھن باندھ کر کالا باغ روانہ ہو جاؤں گا“ شاہ جی نے کسی بھی جلسہ عام میں نہیں فرمایا آج بھی ان لوگوں کی کثیر تعداد ضلع میانوالی میں بقید حیات ہے جنہوں نے شاہ جی کے تمام جلسوں میں شرکت کی، مگر انہوں نے بھی مذکورہ روایت کو کذب و افتراء پر مبنی قرار دیا۔

ثالثاً ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ذمہ دار دینی و سیاسی جماعت کا ایک ذمہ دار رہنما کسی پروگرام کا اعلان کرے اور پھر کسی وزیر کے کی دھمکی سے مرعوب ہو کر پروگرام ملتوی کر دے۔ نواب آف کالا باغ اپنی جگہ قلم و خوشنواری

میں مجسم غیظ و غضب سی لیکن کالا باغ قصبے کا محدود اربعہ کشمیر کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ مجلس احرار اسلام ملکی معاملات بالخصوص تحریک فوجی، بھرتی بایکٹ میں ایسی انجھی کہ وہ کالا باغ کی طرف بحیثیت مجموعی نظر نہ کر سکی و مگر نہ کالا باغ کے ”ملکوں“ کو اپنے جاہ و مرتبے اور خوف و دہشت کا بخوبی اندازہ کرادیا جاتا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ان خوفناک حالات میں بھی اس ضلع میں گئے جن کا تصور کرنا بھی محال ہے شورش کاشمیری نے لکھا ہے۔

”ضلع میانوالی کی ایک تحصیل (مسی خیل) میں شاہ جی پہلی مرتبہ تقریر کے لئے گئے تو کسی مسلمان نے اپنے ہاں نہ ٹھہرایا۔ ایک ہندو نے شب ب سری کے لئے جگہ دی تو اسے گاؤں چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ازاں بعد اس کے مکان کو آگ لگا دی گئی“ (سوانح سید عطاء اللہ شاہ بخاری ص ۹۸)

وہ حضرات جو برطانوی سامراج کی کسین گاہوں، انک، سرگودھا، راولپنڈی، جہلم اور میانوالی کے اضلاع کی سیاسی صورت حال پر گہری نظر رکھتے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان تمام اضلاع اور بالخصوص میانوالی پر انگریز کے کاسر لیس جاگیرداروں کی گرفت کتنی مضبوط تھی۔ اس دور میں انگریز کے خلاف کوئی کلمہ نکانا قاتل گردن زدنی تھا چہ جائیکہ اپنے وقت کے برطانوی حکومت کے سب سے بڑے باغی کی یعنی خیل میں تقریر! لیکن شاہ جی جس دل گردے اور شجاعت و محض اللہ کے سارے پر جو فروتن تنہا صدائے حق بلند کرنے کے لئے یہاں آسکتا ہے اور وہ بھی اس وقت جبکہ یہاں مجلس احرار اسلام کا قیام بھی عمل میں نہ آیا ہو اور شب ب سری کے لئے کسی میں ہمت بھی نہ ہو کہ وہ انہیں اپنے مکان میں ٹھہرائے وہ جگہ دار اور حریت فطرت عظیم رہنما اگر کالا باغ جانے کا عزم کر لیتا، چاہے اس راہ میں کچھ ہو جاتا اسے روکنے کی جرات کس میں تھی؟

شاہ جی کو تحریک کشمیر کے دوران کشمیر میں داخل ہونے سے روکا گیا تو وہ دریائے توی تیر کر کشمیر میں داخل ہوئے۔ تقریریں کیں اور گرفتار ہو گئے۔ قادیان میں داخل ہونے کے تمام راستے بند کئے گئے تو وہ پانچ لاکھ مسلمانوں کا جم غفیر لیکر قادیان میں داخل ہو گئے۔ تین دن تقریر کی اور پھر گرفتار ہو گئے۔ ملتان کے گیلانیوں اور قریشیوں نے شہر میں داخل ہونے سے منع کیا اور تقریر کرنے کی صورت میں جان سے مار دینے کی دھمکی دی مگر شاہ جی نہ صرف ملتان میں داخل ہوئے بلکہ گیلانیوں کے مرکز ”پاک گیٹ“ میں تقریر کی اور انگریز سامراج کے مذہبی دلالوں کی غداریوں کو موضوع بنایا اور ان کے پرچے اڑا دیئے۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں شاہ جی کی مجاہدانہ زندگی کا روز مرہ تھیں۔

لہذا الطاف گوہر کی روایت افتراء اور اتہام محض ہے جو کسی طور حقیقت سے میل نہیں کھاتی بالفرض اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ اس روایت کا راوی ایک فرد ہے جو روایت کا سامع ہے، واقعہ کا معنی شاہد نہیں۔ جبکہ اس کی تائید میں کوئی قول کسی دیگر فرد کا نہیں ملتا۔ اور سینکڑوں لوگ جو شاہ جی کی تقاریر

کے سامع ہیں ایسی ہر روایت کا انکار کرتے ہیں۔ لہذا الطاف گوہر صاحب کی روایت مکذوبہ و مجہول ٹھہرتی ہے۔  
نواب کالا باغ زندہ نہیں ورنہ انہیں مخاطب کیا جاتا۔ اگر نواب نے شیخی میں آگریہ کہہ بھی دیا ہو تو الطاف گوہر صاحب پر لازم تھا کہ وہ اس علاقہ کے کسی واقف حال سے اس کی تصدیق کر لیتے۔ اسلام آباد میں بیسیوں افراد میاٹوالی کے باستانی مل سکتے ہیں اس طرح ان کے ”نظریہ جبری سائنس“ کا بھی تجربہ ہو جاتا۔  
”احرار اور کالا باغ“

جہاں تک نواب آف کالا باغ کے خلاف جہاد کرنے کا معاملہ ہے تو الطاف گوہر صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ضلع میاٹوالی میں بالعموم اور کالا باغ کے خلاف بالخصوص جہاد کرنے میں مقامی مجلس احرار اسلام کارول تاریخ کا دریں باب ہے۔ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے دست راست اور مجلس احرار اسلام ہند پنجاب کے نائب صدر مولانا گل شیر خاں شہید نے نواب آف کالا باغ کے خلاف اس وقت جہاد کا آغاز کیا جب نواب کی پشت پر انگریز کا دست تعاون موجود تھا مگر اس مرد حق آگاہ نے تمام خطرات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حق و صداقت کی مشعل فروزاں کی۔

جب مولانا گل شیر شہید پہلی دفعہ کالا باغ تشریف لے گئے تو آپ نے اپنی پہلی تقریر میں ہی جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کو موضوع بنایا اور نواب کالا باغ کے ظالمانہ ہتھکنڈوں کی مذمت کی نسیحا ”آپ کو دعوت دینے والے حضرات غائب ہو گئے اور آپ کو پیدل ریلوے اسٹیشن تک سفر کرنا پڑا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور آپ کئی مرتبہ کالا باغ تشریف لے گئے یہاں تک کہ آپ نے کالا باغ میں مجلس احرار اسلام کی شاخ قائم کر دی جس کے ناظم ڈاکٹر غلام حیدر اور ان کے بھائی غلام قادر بلوچ سالار مقرر کیے گئے (جو نواب کالا باغ کے ذاتی معالج ڈاکٹر اللہ جوایا کے بیٹے تھے) ڈاکٹر غلام حیدر نواب کے مظالم سے تنگ آکر بعد میں کراچی ہجرت کر گئے اور وہیں انتقال ہوا کالا باغ میں مجلس احرار کا قیام رئیس کالا باغ کی امارت کو کھلا چیلنج تھا۔ یہاں تک کہ کالا باغ کا تحصیلدار احرار کارکنوں سے کہہ اٹھا کہ ”میرا حکم ہے۔ تمہیں احرار چھوڑنا پڑے گی“

لیکن احرار سرفروشوں نے نواب کے غرور و تکبر کو پاؤں تلے روندنے کی جسارت کر ڈالی، ظلم کی چکی میں پس گئے مگر احرار کا دامن نہ چھوڑا۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں باقاعدہ تحریک کالا باغ کا آغاز کر دیا گیا جس کی تفصیلات انگریز گورنر پنجاب کی گورنر جنرل ہند کے نام خط و کتابت 7-23-page-246-1، file No-1، انڈیا آفس لاہوری لندن میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

عوام نے احرار کی تحریک پر نواب کے عائد کردہ ظالمانہ ٹیکس دینے بند کر دیئے جس کے نتیجے میں احرار کارکنوں اور نواب کے کارندوں میں ٹکڑ ہو گئی کئی رضا کار غنڈوں کے ہاتھوں سخت مجروح ہوئے اور بالاخر انہیں کالا باغ سے ہجرت کرنا پڑی۔



۲۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو آل انڈیا مجلس احرار اسلام کے حکم پر پنجاب اور سرحد میں "یوم کالا باغ" منایا گیا۔ حکومت نے دونوں صوبوں میں دفعہ ۳۳ نافذ کر دی اور احرار رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ۲۸ نومبر ۱۹۳۳ء کو احرار پارک لاہور میں "کالا باغ مہاجرین کانفرنس" ہوئی جس میں تحریک کی دیکھ بھال مولانا مظفر علی اظہر کو سونپی گئی۔ اور انہوں نے مولانا غلام غوث ہزاروی کو ایک سوارضا کاروں کے ہمراہ کالا باغ بھیج دیا۔ عین سوارضا کار میانوالی سے مولانا کے ہمراہ کالا باغ میں پہنچے تو پولیس نے کارکنوں سے زبردستی کلباڑیاں چھین کر انہیں ہٹا کر دیا کارکن ایک مسجد میں جمع ہوئے تو پانی بند کر دیا گیا اور نواب کے پالتوؤں نے مسجد کا مکمل گھیراؤ کر لیا۔ احرار رہنماؤں نے تمام صورتحال دیکھ کر رضا کاروں کو مزاحمت کرنے سے روک دیا کیونکہ انہیں ہتھیاروں سے پہلے ہی ہٹا کر دیا گیا تھا۔

مولانا غلام غوث ہزاروی حالات کا تفصیلی مشاہدہ کرنے کے بعد لاہور تشریف لے گئے مولانا گل شیر خاں شہید اگرچہ پابندی کی وجہ سے کالا باغ نہ آ سکے لیکن باہر سے رضا کاروں کو کالا باغ بھیجنے میں مصروف رہے (مولانا پر تحریک کے آغاز میں ہی ضلع میانوالی میں داخلہ پر پابندی عائد کر دی گئی تھی)

مرکزی مجلس عاملہ احرار، تحریک کالا باغ کے بارے میں ابھی کسی فیصلے پر بندہ پہنچی تھی کہ ڈپٹی کمشنر نے ضلع میانوالی میں احرار کے تمام اجتماعات اور جلوسوں پر غیر معینہ مدت کے لئے پابندی عائد کر دی۔ احرار سرگرمیاں پابندیوں کے باوجود کسی نہ کسی طور جاری رہیں جن کی وجہ سے نواب آف کالا باغ نے اپنی امارت کے لئے خطرہ محسوس کیا۔ چونکہ اس تحریک میں مرکزی کردار مولانا گل شیر خاں کا تھا اور وہ نواب آف کالا باغ کے خلاف کالا باغ کے مظلوم عوام کو بیدار کرنے اور ان میں باغیانہ جذبات ابھارنے میں موثر قوت ثابت ہو رہے تھے اس لئے مولانا کا وجود نواب اور اس کے کارپردازوں کے لئے خطرے کا نشان بن گیا۔

آخر کار نواب امیر محمد خان کے اشارے پر ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو مولانا گل شیر خاں کو سوتے میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا جس کی بڑی وجہ یہ بھی سامنے آئی کہ مولانا گل شیر خاں شہید پر عائد پابندی ان کی شہادت کے دوسرے روز ختم ہو رہی تھی۔ اور وہ کالا باغ میں احرار کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر چکے تھے۔ اس لئے نواب کالا باغ نے متوقع بغاوت کی بو سونگھ لی اور مولانا کو اپنے راستے سے ہٹا دیا۔

مگر افراد کے ختم ہو جانے سے نظریات تو نہیں مٹتے بلکہ جس تحریک کی جو مخلصانہ انداز میں چلائی جا رہی ہو خون سے آبیاری ہو جائے وہ گوہر مقصود حاصل کر رہی ہوتی ہے چاہے اس میں کچھ دیر ہو جائے۔ مولانا کی بپا کردہ تحریک اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر رہی۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۲ جون ۱۹۳۳ء کو فیصل آباد میں نواب کالا باغ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "امیر محمد خاں" تو نے ایک مسلمان حافظ قرآن، اسلام کے مبلغ اور میرے رفیق

مولانا گل شیر خاں کو اپنے راستے کا کاٹنا سمجھ کر قتل تو کروادیا لیکن یاد رکھنا تیری قبر بھی تجھے پناہ نہیں دے گی

شاہ جی کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور نواب کالا باغ اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور اس کی لاش کو دریائے سندھ میں بہا دیا گیا۔ بے شک اللہ ہی زبردست انتقام لینے والا ہے۔

جناب الطاف گوہر نے بھی دبے لفظوں میں اقرار کیا کہ ”شبہ یہ تھا کہ ان کے (نواب کالا باغ کے) چھوٹے بیٹے نے کسی اختلاف کی بنا پر باپ کے سر میں گولی پوسٹ کر دی“ (روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی یکم دسمبر ۱۹۹۳ء) مولانا گل شیر خاں کی شہادت پر تحصیل تھانگ ضلع چکوال کے قصبہ لاہ میں ۹ جولائی ۱۹۳۳ء کو عظیم الشان ”یوم گل شیر“ منایا گیا چونکہ میانوالی میں احرار اجتماعات پر پابندی تھی اس لئے میانوالی اور انک (اب چکوال) کے اضلاع کی مشترکہ حدود پر یہ جلسہ منعقد ہوا۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا

”گل شیر خاں کا قتل معمولی قتل نہیں کہ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ گل شیر خاں کا خون رنگ لا کر رہے گا پھر تمہاری نوابی اور سرداری بھی تمہارا تحفظ نہیں کر سکے گی۔ گل شیر نے انگریز کو غاصب اور تم جاگیرداروں کو وطن کا غدار کہا اور تمہارے کروٹوں کا پروہ چاک کیا۔۔۔ لو سنو! آج اسی مقام پر جہاں کل تمہیں گل شیر نے لٹکارا تھا اور تمہیں قوم و ملک کا بے وفا اور نمک حرام قرار دیا تھا بخاری بھی تمہیں اور تمہارے فرنگی آقاؤں کو ڈنکے کی چوٹ پر غاصب، لٹیرا غدار، نوؤی، دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن اور امت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا باغی کہتا ہے۔ تم نے جو تعزیر مجھ پر جاری کرنی ہے ابھی کرلو سید حاضر ہے۔۔۔۔۔۔!“ (مولانا محمد گل شیر شہید سوانح و خدمات ص ۲۵۹)

الغرض احرار رہنماؤں کی تقاریر نے اس علاقے میں آگ لگا دی۔ عوام الناس کے خیم خستہ جذبات یہڑک اٹھے اور کالا باغ کے خلاف تحریک نے نئی راہیں تلاش کر لیں۔ اگرچہ مولانا گل شیر شہید اس جہان فانی میں نہ رہے لیکن ان کی سلگائی ہوئی چنگاری شعلہ جوالہ بن گئی ان کی جاری کردہ تحریک اسی انقلاب کی خشت اول تھی جس کے مقابل کالا باغ کے رئیس نہ ٹھہر سکے۔ اس تحریک کے اثرات ماضی کی نسبت آج واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ کالا باغ کے رئیسوں کو جس طاقت پر گھمنڈ تھا عوام نے اسے اپنے پاؤں کے نیچے مل ڈالا جس کے ذمہ دار خود رؤسا تھے بقول جاناب مرحوم

”کالا باغ کے رئیسوں نے خدا کی زمین پر خدا کے بندوں سے نا انصافیاں کیں۔ مکافات عمل کا وقت آیا تو بیوپروں کی آگ سے نہیں بلکہ محلات کی اپنی آگ سے وہ سارا کچھ جل کر راکھ ہو گیا جس کے مان پر حاکمانہ غرور رقص کرتا تھا۔ قدرت ڈھیل تو دیتی ہے لیکن معاف نہیں کرتی“

آج کالا باغ کے صاحبزادگان نشان عبرت ہیں اور وہی کالا باغ کا قصبہ جہاں کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں تھی

وہاں کلاباغ کے رئیس قدم نہیں رکھ سکتے۔ فاعتریو اولی الابصار!

تاریخ کے یہ ابواب اس لئے دھرانا پڑے کہ الطاف گوہر صاحب ایسے ابن الوقت لکھاریوں کی طرف سے تاریخ کے تابناک چہرے پر پھیلانے گئے گردوغبار کو صاف کیا جائے اور حقائق کی نقاب کشائی کی جائے۔

مجلس احرار اسلام کے تمام قائدین اور کارکنان نے ۱۹۴۹ء میں جس موقف کو اختیار کیا تھا بھلا اللہ آج بھی احرار اسی کو مد نظر رکھ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ کبھی ان کے پائے استقامت لرزش و لغزش سے آشنا نہیں ہوئے۔ جو فرد مگر وہ یا جماعت ان درویش منش قائدین احرار کے بے داغ وجود پر انگشت نمائی کرتا ہے اور اپنی بے رحم اور متعصب تنقید کا نشانہ بناتا ہے وہ تاریخ سے نابلد، ضمیر سے نا آشنا اور قلم کا سوداگر ہے۔ تاریخ نے ایسے کور چشموں سے ہمیشہ انماض برتا ہے۔ وقتی شہرت، مالی مفادات اور ارباب اقتدار کی نظر کرم کے طلب گار قلم کار جب اپنی غیرت کو بچ چوراہے میں نیلام کر چکے ہیں تو ان کے اذعان و قلوب کی کثافت اور ضنوت قلم کی ابکائیوں کی صورت میں غلیظ اور متعفن جراثیم پھیلانے کا باعث بن جاتی ہے جس کے ترجمان عاشق حسین بنالوی میاں محمد شفیع (م۔ ش) حمید نظامی عبداللطیف، سہمی اور الطاف گوہر ٹھہرتے ہیں۔ ضمیر کی سچائی ہی وہ قوت ہے جس کے ذریعے اظہار میں بے باکی، کردار میں نکھار اور قلم میں وقار پیدا ہوتا ہے اور حقائق کے سامنے آنے میں کسی قسم کی مصلحت، حالات کے تقاضے اور شخصیت پرستی کے پر فریب نظریے حائل نہیں ہو سکتے۔ وارورسن کی آزمائش اور کسی کار عبور و عنوت بھی حق گوئی و حق پرستی سے باز نہیں رکھ سکتے اسی کا نام مجلس احرار ہے۔ جس کا ماضی و حال مذکورہ صفات کا حامل ہے

### کتابیات

۱) کاروان احرار، جانباز مرزا (۲) مولانا گل شیر شہید، سوانح و خدمات، محمد عمر فاروق (۳) سید عطاء اللہ شاہ بخاری، شورش کشمیری

صاحب طرز ادب، انشاء پرداز اور منکر  
چودھری افضل حق کی آپ بیتی۔  
حصول آزادی کے لئے مجاہدہ و ریاضت  
کی دلچسپ روداد

میر افسانہ

بخاری اکیڈمی ممبران کالونی ملتان۔

قیمت 60 روپے

## عجب آزاد مرد تھا!

امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی چوبیسویں برسی ان کے عقیدت مندوں نے پنجاب کے مختلف مقامات پر منائی مگر افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان کی موجودہ نسلوں کو ان کی شخصیت اور جہاد آزادی میں ان کی خدمات اور قربانیوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ وہ بے یاک اور سرانگیز مقرر تھے اور عالم دین بھی تھے مگر ان کا دین کا تصور انقلابی تھا جس میں سامراج دشمنی کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ وہ اسلام کو محض رسوم و قیود کا گوشوارہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے عملی زندگی کا قابل عمل ضابطہ قرار دیتے تھے۔ اپنی حیات مستعار انہوں نے اسی کی جدوجہد میں گذاری۔ رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی ان کا آئیڈیل تھی اور وہ ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس میں مساوات اور عدل کا دور دورہ ہو۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے اپنا وطن الگ کر لیا تو ہندوؤں کو اتنی بڑی سلطنت مل جائے گی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملے گی اور یہ بات انہوں نے دہلی کے ایک ایسے جلسے میں بھی جس کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو کر رہے تھے۔ ان کا نظریہ غلط نکلا اور پاکستان معرض وجود میں آگیا تو انہوں نے اس کی وفاداری کی قسم کھائی اور اس کے استکام کے لئے دعائیں کرنے لگے۔ مجلس احرار نے حالات کے پیش نظر عملی سیاست سے کنارہ کشی کر کے تبلیغ دین کو اپنا مقصد حیثیت قرار دے دیا مگر سامراج دشمنی انہوں نے نہ چھوڑی اور اس حوالے سے انہوں نے احمدیوں (مرزائیوں) کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے آخری سال کس مہر سی میں گزرے۔ انہوں نے رسول کی قید کاٹی، فائدہ کشی کی اور طرح طرح کی مصیبتیں اٹھائیں مگر اپنی زندہ دلی پر حرف نہ آنے دیا۔ وہ عاشق رسول کھلاتے تھے اور دنیا میں اللہ کی بادشاہی کے علمبردار تھے جس میں آزادی اور انصاف کو بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ انہوں نے اپنی پرانی سیاست کے داغ کو بعض دوسری دینی سیاسی پارٹیوں کی طرح تاویلات کے ذریعے دھونے کی کوشش نہیں کی اور آخری دم تک تسلیم کیا کہ میں پاکستان کی تخلیق کے خلاف تھا اتنی ہمت ایک مرد مجاہد ہی کر سکتا ہے جسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہو۔ آج اگر ہم انگریز کے پنپے استبداد سے آزاد ہیں تو اس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے سرفروشل کا بھی حصہ ہے۔ تحریک آزادی کے حوالے سے ہمیں ان کا احترام کرنا چاہیے۔ ان کی چوبیسویں برسی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ پاکستان آزاد ہو چکا ہے مگر سامراجی غلبے سے رہائی کا کام ابھی باقی ہے۔۔۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

محمد ازہر شاہ قیسر  
ابن علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

## اور شاہ جی نے غزل سنائی.....!

۱۹۳۶ء میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری دیوبند آئے۔ ہمارے یہاں باہر مردانہ میں تشریف فرما تھے، اچھا خاصا مجمع تھا، ان دنوں انظر سلسلہ، (مولانا انظر شاہ کشمیری) استاذ تفسیر دارالعلوم نہیں تھے بس ہر طرف نظر، چھوٹی عمر تھی، انہوں نے سن رکھا تھا کہ شاہ جی کی آواز میں جادو ہے، شاہ جی سے فرمائش کی کہ شاہ جی کچھ گانا سنائیے۔ شاہ جی انکار کیسے کرتے، استاد زادہ کی فرمائش تھی۔ انظر کو سامنے بٹھا لیا۔ فرمایا کہ گوجرانوالہ میں ایک سرحدی طالب علم نے مسجد کے حجرہ میں میری دعوت کی۔ انٹی سیدھی چائے، گڑ اور آٹے کا حلوہ۔ یہ کھلا پلا کروہ طالب علم کھنے لگا کہ حضرت میں آپ کی اور بھی ضیافت کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ مردہ بدست زندہ، اور جو کچھ بھی تمہاری تمنائیں ہیں وہ پوری کر لو، اس نے کہا کہ میں غالب کی غزل سناتا ہوں اور لمک لہک کر غالب کی یہ غزل اس طرح سنائی۔

کوئی امید بر نہیں آتے کوئی ضرورت نظر نہیں آتے  
موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتے  
آگے آتے تھی حال دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتے  
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب  
شرم تم کو مگر نہیں آتے

غالب کے یہ دو چار شعر شاہ جی نے ان ہی الفاظ میں اس سرحدی طالب علم کے ترنم کے ساتھ سنائے، پھر فرمایا کہ قریب قریب ایسے ہی الفاظ کی ایک غزل قطب شاہ دکنی کی مجھے یاد ہے۔

غم دل کسی سے کہا جائے نا کہا جائے بھی تو سنا جائے نا  
یہ ے کی لطافت یہ نازک سے ہاتھ پیالہ بھی ان سے دیا جائے نا  
قطب شہ نہ دے اب دوانہ کو پند دوانہ کو کچھ پند دیا جائے نا



## صاحبِ حُسن و جمال اور صاحبِ فضل و کمال

چھپ گیا زیرِ زمین اسلام کا اک شہسوار  
مجلسِ احرار دیں کا سب سے بڑھ کر شاہکار  
غازی و نیک و ولی کوہِ شجاعت باوقار  
عاجزوں بیکس، یتیموں، مظلوموں کا علمگار  
ان کی صفوںِ خوبیوں کا ہو نہیں سکتا شمار  
اور تھا وہ گلشنِ اسلام کی تازہ بہار  
قادرِ مطلق نے بٹھے تھے فضائلِ بے شمار  
جس نے ساری زندگی اسلام پر کر دی نثار  
ان کا مقصد خدمتِ اسلام تھا لیل و نہار  
کھینچ لیتا تھا دلوں کو دین کا وہ شہسوار  
سنگدل روتے تھے اکثر ہم نے دیکھے زار زار  
کیا فصاحت کیا بلاغت ان پہ تھی یارو نثار  
انکی نظروں میں خس و خاشاک نہ تھی سب تاجدار  
خاتمِ مرسل کی الفت میں وہ ہر دم بیقرار  
انکی فطرت میں تواضع و عبزوِ حلم و انکسار  
ایسا مشکل ہے ملے گا دین کا خدمت گزار  
انکی پونہی ان کا سرمایہ یہی ہے یاد گار  
کوئی مشکل سے ملے گا ان کا ہمسر نامدار  
حق پرستی فاقہ مستی بس یہی ان کا شعار  
قوم و ملت، دین کا ہمدرد حامی پاسدار  
بس یہی دنیا میں تھا ان کا عزیز و روزگار

کیا سنائوں کیا بتاؤں رنج و غم کی داستان  
بیکرِ صدق و صفا اور معدنِ مہرو وفا  
خوبصورت نیک سیرت خوش سال و خوش مزاج  
صاحبِ صبر و تحمل، بردبار و دین دار  
صاحبِ حسن و جمال اور صاحبِ فضل و کمال  
وہ بخاری گوہرِ نایاب تھا حق کی قسم  
وہ شرافت اور نجابت میں تھا خود اپنی مثال  
کیا کروں میں خوبیاں مردِ مجاہد کی بیاں  
حُبِ دنیا حُبِ زر سے ان کا سینہ پاک تھا  
سر سے لیکر پاؤں تک اسلام کی تصویر تھا  
ان کو بختا تھا خدا نے اس قدر حُسنِ بیاں  
حافظِ قرآنِ نمازیِ مونس و غمخوار قوم  
انکے دل میں خالق و مالک کا بس اک خوف تھا  
سرورِ کونین کی طاعت میں وہ سرشار تھا  
مصطفیٰ کے عشق سے دل سینہ پر انوار تھا  
ہر رگ و ریشہ میں ان کے جذبہِ اسلام تھا  
زندگی ان کی کٹی کچھ ریل میں کچھ جیل میں  
فقر و فاقہ تو ملا تھا ان کو ورثہ میں عزیز  
سادگی تو ان کے جسم و جان پر قربان تھی  
وہ صحیح معنوں میں تھا اسلام کا ماہرِ طیب  
کیا اسیری کیا فقیری انکے دل کی تھی غذا

پرچم ختم نبوت کو وہ لہراتا رہا  
انکو بخشا تھا خدا نے اس قدر محکم یقین  
بغض و بخل و کبر و کینہ سے وہ بالکل پاک تھا  
سر سے لیکر پاؤں تک وہ ہر صفت موصوف تھا  
فرد واحد تھا مگر تھی انجمن کی انجمن  
ساری دنیا میں ہمیں دکھلاؤ تو ایسا خطیب  
جب سر منبر کھڑا ہوتا وہ دنیا کا خطیب  
جب پڑھا کرتا تھا منبر پر وہ قرآن عزیز  
دیکھنے والوں کو پھر تو یونہی آتا تھا نظر  
پاک فطرت نیک طینت نیک خصلت خوش مقال  
خندہ پیشانی سرو قد دین کا اک پہلواں  
قوم کے محبوب تھے مقبول و منظور خدا  
اب نہیں امید کوئی جو ملے ایسا خطیب  
روندا تھا دشمنوں کی فوج کو مرد جواں  
خاک سمجھے گا بخاری کا عزیز، وہ مقام  
مال دنیا شان و شوکت کچھ نہیں میرے عزیز  
باغیوں کا مال و دولت دیکھ کر نہ بھولنا  
دین اور ایمان جیسی کوئی بھی دولت نہیں  
شاہ بخاری خدمت اسلام پوری کر گیا  
قوم افزنگی سے آخر دم رہا سینہ سپر  
گورے گورے رنگ والوں کے وہ آگے ڈٹ گیا  
رات دن جو انکے دشمن درپے آزار تھے  
سوچتے رہتے تھے جو تدبیر انکے قتل کی

کوہ استقلال تھا غازی مجاہد بدوبار  
دین کے دشمن نظر آتے انہیں مثل غبار  
ان کی پیشانی پہ بل دیکھا کبھی نہ ایک بار  
وہ بخاری تھا بزرگان سلف کی یاد گار  
گویا سمجھو فوج کو لایا ہوا تھا درکنار  
نوجواں جادویاں، شیریں زباں، پرہیز گار  
صد سے بڑھ جاتا تھا سب کا شوق و ذوق و انتظار  
دم بنود مدہوش ہو جاتی تھی مجلس بے قرار  
ہو رہا ہے آج ہی نازل کلام کر دگار  
طور و اطوار و طریقہ سب کا سب ہی شاندار  
کانپتے تھے انکی صورت، دیکھ کر سب ہلکار  
انکی حق گوئی و بیباکی ہے سب پر آشکار  
گرچہ عالم اور واعظ پاؤں گے تم بے شمار  
آج تک دیکھا نہیں ہم نے کوئی ایسا سوار  
جڑھ گیا ہو جس کو کفر و شرمک صدعت کا بخار  
عمل صلح، زہد و تقویٰ پر ہے بخشش کا مدار  
کافروں کے واسطے دنیا ہے جنت کی بہار  
کوٹھیاں بیٹھے نہیں ہیں کوئی جائے افتخار  
حشر میں بدل ملے گا نیکوں کا بے شمار  
چھوڑ کر جانا پڑا ان کو یہاں سے زینہار  
چھوڑ کر وہ بھاگ نکلے ہند کی تازہ بہار  
ہو گئے وہ خود ہی آخر قعر ذلت کا شکار  
ان کو اپنائی پڑی پھر ایک دن راہ فرار

مسد ختم نبوت میں رہے وہ استوار  
 سو گئے مقصود میں اپنے وہ آخر کا مگر  
 جس نے شیرازہ فرنگی کا کیا ہے تار تار  
 اس لئے روتی ہے دنیا آج ان کو زار و زار  
 انبیاء، نہ اولیاء، نہ مالدار و خاکسار  
 سب کے سر پر موت کا ڈنکا ہے بھنا ایک بار  
 ان کو بھی جانا پڑا دنیا سے تنہا ایک بار  
 قبر پر اب حسرتیں روتی ہیں ان کو زار و زار  
 اونچے اونچے خاک پر دیکھیں گے نیچا ایک بار  
 جوڑ سارے ٹوٹ جائیں گے عزیز و ایک بار  
 پیس ڈالوں گی میں تیراز و رسارا ایک بار  
 ساز ہستی کر دیا ہے موت نے اب تار تار  
 اب نہیں امید کوئی آئے گلشن میں بہار  
 ان کی حق گوئی کے نفعے گا رہا ہوں بار بار  
 مصطفیٰ کے حق سے رہتا تھا ہر دم مستوار  
 کیونکہ حالات زمانہ اب نہیں ہیں سازگار  
 ماننے والوں کو ان کے طور پہ رکھ برقرار  
 ان کی تربت پہ ہو سایہ رحمت پروردگار  
 یا الہی بخش دینا سب کے سب روزِ شمار  
 حشر کے میدان میں کرنا نہ ہم کو شرمسار  
 ہر بشر اسلام کا غازی بنے خدمت گزار

ڈٹ گیا دشمن کے آگے دین کا غازی عزیز  
 دشمنان دین سے غازی نے بازی جیت لی  
 اس مجاہد کا سنو اس قوم پر احسان ہے  
 کم بہت ہوتے ہیں پیدا نامور ایسے خطیب  
 موت کے چنبے سے کوئی آج تک چھوٹا نہیں  
 "کل نفس ذائقۃ الموت" ہے فرمانِ حق  
 تمت شاہی جن کا اڑتا تھا ہوا کے دوش پر  
 چل دے دارِ فنا سے بادشاہان جہاں  
 کوٹھیاں بٹگے یہیں پر سب کے سب رہ جائیں گے  
 تاج والے راج والے خاک میں مل جائیں گے  
 موت کھتی ہے نہ اترا زور پر تو اس قدر  
 "موتِ عالم موتِ عالم" ہے یہ فرمانِ رسول  
 چل بسا سونے عدم وہ چھوڑ کر ہم کو یتیم  
 شاہ بخاری دین حق کا تھا وہ اک زندہ نشان  
 شاہ بخاری سے وحدت کے تھے سے مست تھا  
 یا الہی قوم کو فتنوں سے تو محفوظ رکھ  
 یا الہی شاہ بخاری پر ہو رحمت کا نزول  
 مانگتا ہوں ہاتھ پھیلا کر خدا سے یہ دعا  
 ان کے فرزند و عیال اور جسدِ احباب ہیں  
 یا الہی بیکوں پر کیجئے نظرِ کرم  
 یا الہی مومنوں کی دستگیری کیجئے

ان کی جرأت اور قناعت کے ہیں سب قائل ظہیر

قوم کے چھوٹے بڑے سب مردوزن ہیں اشکبار



فرشِ زمیں کی بات نہیں عرشِ ہل گیا  
 محفل سے جب وہ اہلِ نظر، اہلِ دل گیا  
 پیکِ اجل بھی موت پہ اُس کی مچل گیا  
 ”یہ رتبہ بلند ملا جس کو ہل گیا“

بزمِ صحافت      ماتم ماتم

## "جہاد آزادی کا ایک اور سالار اٹھ گیا"

وہ شعلہ نوا اٹھ گیا ہے جس نے رجب صدی تک سپاہ آزادی کا دل گرائے اور حوصلہ بڑھائے رکھا۔ دنیائے خطابت کو اس پر ناز تھا اور اس کی یہ صلاحیت ملک و ملت کی خدمت کے لئے وقف رہی لیکن وہ صرف خطیب ہی نہیں تھا عمل کا دھنی بھی تھا۔ وہی کچھ کہتا جس پر کاربند تھا۔ وہی کچھ کرنے کی تلقین کرتا جو اس کے نزدیک عاصیوں کی سرفرازی کا وسیلہ بن سکتا تھا امیر شریعت کے سیاسی عقائد کیلئے۔ یہ موقع اس بحث میں پڑنے کا نہیں۔ یہ حقیقت ہے ان سے اختلاف کی گنجائش تھی اور لوگوں نے ان سے اختلاف کیا۔ البتہ اس بات سے مجال انکار نہیں کہ مرحوم دل میں آزادی کی تڑپ رکھتے تھے۔ آزادی کی راہ میں انہوں نے ہر کڑی مصیبت پہ خندہ پیشانی جھیلی۔ آزادی کے نام پر جو بھی افتاد پڑی اسے بطیب خاطر قبول کیا۔ اٹھارہ برس تک قید و بند کی سختیاں سہیں اور زندگی کے اس حصہ کو حاصل زندگی جانا، کوئی مصلحت ان کا دامن نہ پکڑ سکی۔ بوریائیں پری پر قانع رہے۔ موٹا جھوٹا پہنا۔ کھانے کے لئے جو مل گیا کھایا۔ ٹکف، ریا اور تصنع سے کوسوں دور رہے۔ محبت اور شفقت ان ہی کا حصہ تھی۔ اگر دشمنی بھی کی تو نظریہ کی بنیاد پر۔ ذات کا سوال آیا تو دشمنوں کے لئے بھی دیدہ و دل فرخ راہ کئے۔ لیلائے آزادی کے لئے اگر مشتاق جھیلیں، غیر ملکی حکمرانوں سے ٹکری اور اس کی پاداش میں قید ہوئے۔ تو دوسری طرف زندگی کے لطیف پہلوؤں پر بھی نظر رہی۔ یہ نہ تھا کہ سیاست میں ان کی طبیعت کا تنوع چھن گیا ہو۔ ان میں وہ روکھا پن پیدا کر دیا ہو جس کا عموماً سیاست سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ وہ شعر و ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے سنی فہم تھے اور مبدع فیاض سے انہوں نے طبیعت بھی موزوں پائی تھی۔ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے اور اپنی تقریر میں شریوں لاتے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔

اگر ہم ان بزرگوں کی فہرست مرتب کریں جنہوں نے دور غلامی میں برطانوی سامراج کے خلاف گفتار و کردار سے رائے عامہ کو بیدار کیا تھا تو امیر شریعت کا نام سب سے پہلے آئے گا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد برصغیر کے مسلمان بری طرح شکستہ دل اور مایوس تھے۔ انہیں احساس کمتری اور احساس شکست سے نجات دلانے کے لئے امیر شریعت ایسے مجاہدوں کی ضرورت تھی جو قلب و ذہن کو بھی متاثر کریں اور اپنے کردار سے عمل کے لئے مثال بھی قائم کر دیں۔ یہ خدمت انجام دے کر انہوں نے قوم پر بہت بڑا احسان کیا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایسے ہی بزرگوں کی جرات، استقامت اور ارشاد کا انعام ہے کہ ایک موخواب قوم بیدار ہوئی۔ جہاد آزادی کے لئے ان گنت رصا کارٹے اور ہم غیر ملکیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔

شاہ صاحب کی زندگی کا یہ پہلو خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ وہ صرف سیاست کے ہو کر نہیں رہ گئے تھے۔ اسلام کی تبلیغ کا فرض سعید بھی ہمیشہ ان کی نظروں میں رہا تھا۔ دین فطرت کی سر بلندی ان کی سب سے

بڑی تمنائیں اور ناموس رسول ﷺ کی پاسبانی اور ملت کا اتحاد ان کا مقصد حیات تھا۔ زند و پاکبازی اور مذہب کے گھرے مطالعہ اور علم کی بناء پر وہ امیر شریعت کے منصب پر فائز ہوئے تھے اور اس منصب پر اپنا حق ثابت کر دیا تھا۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی رحلت سے قوم ایک بے مثال خطیب اور تحریک آزادی کے ایک نمائندے سے محروم ہو گئی ہے اور ایک ایسی شخصیت کھو بیٹھی ہے جس کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ایسی شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ واقعی ہی ایک المیہ ہے کہ ہم ایسے بزرگوں سے تو محروم ہوتے جا رہے ہیں جو اپنی دھن کے لیے تھے ثابت قدم تھے ایثار پسند تھے اور دل میں ملت کا درد رکھتے تھے۔ مگر ان کی رحلت سے قومی زندگی میں جو فشتیں خالی ہو رہی ہیں انہیں پر کرنے کے لئے ہمیں مخلص اور بے لوث شخصیتیں نہیں ملتی۔ قومیں محض اپنے پیش روؤں کے کارنامے گنوا کر یا ان کا ماتم کر کے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ حال کے مسائل، مصائب اور ضرورتیں زندہ اصحاب سے قربانی اور ایثار کا تقاضا رکھتی ہیں۔



روزنامہ ”کوہستان“ لاہور مقالہ خصوصی

## اک چراغ اور بجھا.....

ملک میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی موت کی خبر انتہائی رنج و ملال سے سنی جا سکی۔ انا لہ وانا الیہ راجعون۔ اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں تو ہماری آزادی کی شاہراہ رجب صدی قبل کے ان تنگ و تاریک اور ناہموار راستوں سے جلتی ہے جہاں چند اولوالعزم انسان در ماندہ مسافروں کو آوازیں دے رہے ہیں۔ کبھی ان کی شعلہ نوائی سے مردہ زندگی کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے اور اپنے حال سے پریشان اور مستقبل سے مایوس مسافر یکایک نئے حوصلوں اور ولولوں سے سرشار ہو کر ان کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں اور کبھی کبھی آزمائشوں کے دور میں ان کے پیچھے چلنے والے قافلوں کی ہمت جواب دے جاتی ہے لیکن ان کو ہیکر انسانوں کے عزم و ثبات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ آزادی کی تمنا کرنے کے جرم کی پاداش میں ان کے لئے قید خانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ان کی زبانوں پر سنگینوں کے پھرے بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ہر مصیبت، ہر ناکامی اور ہر آزمائش ان کے سینے میں امیدوں کے نئے چراغ روشن کرتی ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرنگی استبداد کے خلاف اس وقت علم بغاوت بلند کیا تھا۔ جب سلطنت برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور آزادی کی خواہش ایک دیوانے کا خواب سمجھی جاتی تھی۔

مرحوم برصغیر کے وہ بے مثال خطیب تھے۔ جن کی شعلہ نوائی نے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں آزادی کا ولولہ پیدا کیا تھا۔ ان کی عظمت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ رات جس میں

انہوں نے سفر کا آغاز کیا تھا کتنی تاریک تھی اور ایمان و یقین محکم کی وہ قندیل جو انہوں نے بلند کی تھی کس قدر تابناک تھی۔ اگر ان کے راستے میں آلام و مصائب کے پہاڑ کھڑے تھے تو انہوں نے کس قدر جرأت و پامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی کا مقصد کروڑوں انسانوں کو آزادی کی تڑپ عطا کرنا تھا۔ اگر ہم آزادی کے ایک نڈر مبلغ کی حیثیت سے ان کے حالات پر غور کریں تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ ہمیں ان کے طریق کار سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن کوئی بھی ان کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ آنے والی نسلیں جب برصغیر پاک و ہند کی آزادی کی تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق اکٹھا کریں گی تو اس وقت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو فراموش نہیں کر سکیں گی۔ جنہوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال قید و بند کی صعوبتوں میں گزارے تھے۔ ہم پورے صدق و خلوص کے ساتھ یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہمیں اس سعادت مند قوم کا جذبہ عطا کرے جو کسی بھی حالت میں اپنے مسمون کو فراموش نہیں کرتی۔



روزنامہ "آفاق" لائلپور، تعزیتی شذرہ

## ایک "روایت" کا انجام!

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات ایک روایت کے انجام کا اعلان ہے۔ وہ اُس روایت کی پیداوار تھے جس میں لفظ گرمی آواز کے ساتھ آدمی اور آدمی کے درمیان رشتہ گردانا جاتا تھا۔ انسانی رشتہ کے اس تصور نے خطابت کو جنم دیا۔ جسے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ہندی مسلمانوں کے ایک بھرے پرے دور میں پیدا ہوئے۔ اس دور میں قد آور رہنماؤں کے ہوتے ہوئے انہوں نے اس طرح ایک منفرد مقام پیدا کیا کہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو سیاسی زندگی سے مربوط کرنے کی کوشش کی اور خطابت کو طریق اظہار کے طور پر اپنایا جو مسلمانوں کی مذہبی زندگی اور سیاسی زندگی دونوں میں ایک مقبول اور موثر طریق اظہار کا مرتبہ رکھتی تھی۔ خطابت ان کے ہاتھوں میں کلمہ و بیش ایک تخلیقی ذریعہ اظہار بن گئی تھی۔ ان کی ذات کو ہماری خطابت کا آخری سنبھالا کھنچا چاہیے بلکہ ان کے سفر آخرت کے ساتھ ساتھ یہ روایت ہماری اجتماعی زندگی سے سفر کرتی نظر آتی ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک ایسے خطیب تھے جنہیں بیک وقت مذہبی عالم اور ایک سیاسی رہنما کی حیثیت حاصل تھی۔ ۱۹۲۰ء کو ۲۹ برس کی عمر میں وہ تحریک خلافت میں شامل ہوئے۔ مجلس احرار اسلام کے بانیوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں اس جماعت کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کے سیاسی نقطہ نظر سے

اختلافات کی بہت گنجائش ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ ان کے سیاسی خیالات سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی ہم ان کے ذاتی اوصاف کے ملی جذبہ کی قدر و منزلت کریں۔



روزنامہ ”عوام“ لائلپور / تعزیتی شذرہ

ان کے الفاظ موتیوں کی طرح وکتے اور فقرے پھولوں کی طرح ہوتے

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات کی خبر ایک برق بے اماں ہے۔ جس نے صبر و سکون کے ہر خرمن کو جلا دیا ہے۔ خطیب اعظم سید عطاء اللہ شاہ بخاری گزشتہ چالیس پچاس سال سے برصغیر پاک و ہند کے اقصاد و اکناف پر چھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے کوئی بڑی بڑی مرعوب کن علمی اسناد حاصل نہیں کی تھیں۔ مگر یہ فضیلت انہیں حاصل تھی کہ وہ ہر علمی و ذہنی مجلس میں سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے۔ مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو شعور اس وقت حاصل ہوا۔ جب غیر منقسم ہندوستان پر انگریزی استبداد پورے ذوروں پر تھا۔ انہوں نے علمائے عظام پر حکومت کے عتاب کو دیکھا اور اس سے تڑپ اٹھے۔ انگریز کو سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ اس لئے کہ انگریز نے اپنی سنگدلانہ پالیسی سے غیر منقسم ہندوستان ہی نہیں پورے مشرق میں دین اسلام کے ستونوں کو گرانے کی کوشش کی تھی اور اس نے ان بزرگوں پر عتاب و عذاب کے دروازے کھولے تھے جو ہر اعتبار سے قابل احترام تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایسے وقت میں اپنی عملی زندگی شروع کی۔ خدا تعالیٰ نے انہیں خلافت و تقریر اور اثر آفرینی کی دولت وافر عطا کی تھی۔ وہ گھنٹوں ہزار ہا کے مجمعے کو مسور رکھ سکتے تھے اور منٹوں میں لوگوں کو جدھر چاہتے بہا لے جاتے تھے۔ ان کے الفاظ موتیوں کی طرح وکتے تھے اور فقرے پھولوں کی طرح ہوتے تھے جن کی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی تھی۔

مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے قید و بند اور سزا و تعزیر کی مصیبتیں بار بار جھیلیں مگر ان کے پائے استقلال میں کبھی جنبش نہ آئی تھی۔ ان کا انداز اور مسلک قطعی درویشانہ تھا۔ انہیں کسی سے ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ البتہ وہ اپنے تمام عقائد میں شدید تھے اور جسے ان کے عقائد سے اختلاف ہوتا وہ اسے خدا کا دشمن سمجھتے تھے۔ اس لئے اس کے خلاف شدت اختیار کرتے تھے۔ مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری میں یہ وسعت قلبی موجود تھی کہ وہ اپنے کسی اقدام یا فیصلہ کو جب غلط سمجھ لیتے اس پر اصرار نہ کرتے۔ چنانچہ پاکستان کے متعلق آپ نے یہی طریقہ اپنایا تھا۔

مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے دفتر مطلوب ہے۔ وہ ایک جاذب شخصیت تھے۔ خطیب اعظم اور مقرر شیوا بیان ہونے کے باوجود وہ انتہائی منکسر المزاج تھے۔ کارکنوں کا ان

سے بڑھ کر اور کوئی ہمدرد نہ تھا انہوں نے مصیبتیں برداشت کیں مگر اپنے لئے نہ بھی رحم کی بھیک مانگی نہ وسائل چاہے۔ غریب اور مخلص کارکنوں کے لئے انہوں نے کوئی مدد کرنے میں کبھی تاثر سے کام نہیں لیا تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم نہایت سچے ہوئے اور سخن فہم بزرگ تھے۔ اشعار کے ہزار ہا گینے ہر وقت ان کے ساتھ رہتے اور وہ جب چاہتے محفل احباب میں یا مجمع عام میں کسی بہترین گینے کو الفاظ کی انگشتی میں جڑ دیتے۔ افسوس کہ ان کی سیلاب صفت طبیعت نے انہیں جم کر بیٹھنے اور اپنے وسیع ذخائر کو مدون کرنے کی فرصت نہیں دی۔ اس طرح کوئی جامع کتاب ان سے یادگار نہیں ہے۔ لیکن برصغیر پاک و ہند کی نصف صدی کی تاریخ کلی اور کامل طور پر ان کی شخصیت سے متاثر ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات ایک بڑا ملی صدمہ ہے۔ آج ہر پاکستانی کو موسس ہو رہا ہے کہ شاہ جی کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے کہ وہ کبھی پر نہیں ہو سکے گا۔

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دئے  
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

ملت پاکستان پر یہ بہت بڑی آزمائش کا دور ہے۔ ابھی مولوی عبدالحق کی وفات کی خبر فضاؤں میں تھی کہ ایک اور صدمہ عظیم ملک کو برداشت کرنا پڑا۔ یہ لوگ جو بجائے خود ایک تاریخ ہیں۔ ایک ایک کر کے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے اور ملت پاکستان کو اس قابل بنائے کہ ان کے رہنما ان مرحومین کی خوبیوں کو اپنا کر، اس خلا کو پورا کر سکیں۔



ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور، ۱۷ فروری ۱۹۷۷ء

## تقریر کا جادو۔ استعارہ نہیں حقیقت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحلت کر گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ عجب سانحہ ہے کہ اس دور میں جو بھی بزرگ اٹھتا ہے اس کے ساتھ ایک تہذیب کی علامت اٹھ جاتی ہے۔ ایک درخشاں روایت کی مشعل گل ہو جاتی ہے اور اس کے مرنے سے اک دور مرجاتا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کی صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں تقریر کا جادو استعارہ نہیں مرحوم کی ذات میں ایک حقیقت تھا۔ وہ اپنی سربانی سے لاکھوں کے مجمع کو گھنٹوں موحیرت رکھتے۔ ہنساتے، رلاتے، تڑپاتے اور آمادہ عمل کرتے۔ اتنا بڑا شعلہ نوا اور معجز بیاں اب پیدا نہ ہوگا اور وہ اس لئے کہ بقول ایک معاصر

..... وہ روایت جس میں لفظ گرمی آواز کے ساتھ آدمی اور آدمی کے درمیان رشتہ گردانا جاتا تھا اور وہ روایت جس نے خطابت کو جنم دیا۔ کمزور ہو چکی ہے۔

شاہ صاحب مرحوم نے سیاسی تحریکات کے ایک بھرے پرے دور میں آنکھ کھولی۔ جلد برصغیر کے طول و عرض میں برطانوی غلامی کے خلاف بغاوت اور حریت کی علامت بن گئے۔ یہ موقع ان تحریکات پر تبصرہ اور افراد کے سیاسی مسلک پر تنقید کا نہیں۔ لیکن شاہ صاحب مرحوم کے لئے یہ کچھ کم نہیں کہ مسلمان قوم کو، جو ماضی کی شاندار روایات کے تصور میں گم تھی یا حال کی شکست اور درماندگی میں مبتلا، خواب سے بیدار کیا۔ ان میں جوش عمل پھوٹا اور کچھ کر گزرنے کی ترغیب دی۔ مسلمانوں میں حقیقت پسندی اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی جو کاوش سرسید مرحوم اور ان کے رفقاء نے کی تھی تحریک آزادی کے عہد شباب میں اسی کاوش کی تکمیل اپنے طور پر شاہ صاحب نے بھی کی۔ مرحوم کے سیاسی مسلک سے بجا طور پر اختلاف کیا گیا۔ لیکن ان کے جذبہ حریت سے انکار ممکن نہ تھا۔ لوگ مرحوم کی شعلہ بیانی پر عرش عرش کرتے تھے حالانکہ وہ محض ان کی ذات کی نمونہ نہ تھے۔ وہ آزادی کے انشک سپاہی تھے اور جب قربانیوں کے دعوے کرتے اور کڑی آزمائشوں کو دعوت دیتے تو رسماً یا لطف بیانی کے لئے نہیں۔ مرحوم جب یہ کہتے کہ تین چوتھائی زندگی ریل میں (شہر شہر کا دورہ کرتے) کٹ گئی اور ایک چوتھائی جیل میں تو حقیقت بھی یہی ہوتی تھی، وہ محض ایک سیاسی رہنما نہ تھے، ایک مکمل شخصیت تھے، مجاہد بھی اور رند بھی! جس طرح لاکھوں کے مجمع میں گرجتے اسی طرح احباب کی مظل میں چمکتے اور اپنی بذلہ سخی اور خوش گفتاری سے ہر ایک کا دل مسخی میں رکھتے! شعروادب کا مذاق نہایت پاکیزہ رکھتے تھے۔ محبت و مروت، اخلاص اور ارشاد و رواداری اور دوست داری کا پیکر تھے اور یہ صفات اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔



ہفت روزہ "اقدام" لاہور / تعزیتی شذرہ

## رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز!

اگلے روز لہٹان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے انتقال سے تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا ہے شاہ صاحب مرحوم و مغفور ایک سچے مخلص اور پکے مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی انگریز کے خلاف جہاد میں بسر کی، وہ اس حد تک تن من دھن سے اس جہاد میں شریک تھے کہ انہیں تاریخ کے ایک نازک موڑ پر یہ بات سوچنے کی بھی فرصت نہ ملی کہ انگریز کے بوریا بستر گول کر جانے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۷ء کے بعد جب ہندوستان میں سیاسیات جدید کا دور شروع ہوا تو متوسط طبقہ کی فعال سیاسی جتہ بند مجلس احرار اسلام جس میں شاہ صاحب ایک گرم اور تڑپتے ہوئے دل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اجتہادی غلطی کا شکار ہو گئے اور تحریک پاکستان کا یہ ہراول دستہ بننے کی بجائے سیاسی بھمبھل بھوسوں میں گر خوار ہو گئے اگر اس وقت مسلم لیگ کو مجلس احرار اسلام ایسی فعال جتہ بند اور جانبدار جماعت کی تائید حاصل ہو گئی

ہوتی تو کم از کم پنجاب کی..... شہرگ کے قریب سے تقسیم نہ ہوتی۔ خیر یہ تو اب تاریخ کی بات ہے اور آئندہ کا مورخ ہی لکھ سکے گا کہ کس بے کماں پر غلطی کھائی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اردو اور پنجابی کے بے مثال خطیب تھے۔ انہوں نے اپنی فصاحت اور بلاغت خطابت اور علم کلام کی توہینوں کے بدلے انگریز شاہی قلعہ پر مرکوز کئے تھے۔ انہیں اختلاف عقیدہ کے علاوہ احمدیوں (مرزائیوں) سے غیر فانی کد کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ بانی سلسلہ نے انگریز سلطنت کو ابر رحمت قرار دے رکھا تھا (خدا تعالیٰ ابر رحمت کی طرح ہمارے لئے انگریز سلطنت کو دور سے لایا اور ہم اور ہماری ذریت پر یہ فرض ہو گیا کہ اس مبارک گورنمنٹ برطانیہ کے ہمیشہ شکر گزار ہیں۔ ازالہ اوہام صفحہ ۱۳۲)

اس وجہ سے انگریزی استعمار اور احمدیت دو ایسے نشانے تھے جن پر شاہ صاحب نے ہمیشہ گولہ باری جاری رکھی اور دونوں کو خاصا نقصان پہنچایا۔

ہمارے خیال میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اس وقت جبکہ ان کے بے شمار نیاز مند طول و عرض ملک میں موجود ہیں ان کی مدد سے ان کی ایک مستند سوانح عمری تیار کی جائے جس میں لفظی کی بجائے اس دور کی تاریخ کے پس منظر میں ان کی صحیح حیثیت کا یقین کیا جائے۔ ایسی کتاب لکھنے کے لئے شاعر کی ضرورت نہیں بلکہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو علم تاریخ کے اصولوں سے آگاہ ہو۔



ہفت روزہ "قندیل" لاہور، تعزیتی شذرہ

## ایک جبار سپاہی

برصغیر ہندوپاک کے ممتاز دینی رہنما اور مشہور سیاسی لیڈر سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کی علالت کے بعد ملتان میں انتقال فرما گئے ہیں۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری گزشتہ پانچ ماہ سے شدید بیمار تھے۔ نشتر ہسپتال ملتان اور پھر لاہور میں زیر علاج رہنے کے باوجود جب آپ کی بیماری میں کوئی افادہ نہ ہوا تو حکیم عطاء اللہ خاں نے یونانی علاج شروع کیا۔ لیکن مرض الموت کا کیا علاج۔ سید صاحب اپنے مولا کو پیارے ہو گئے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک سربان، شعلہ مقال اور آزادی وطن کے ایک جبار سپاہی تھے۔ ان کی تمام زندگی قومی خدمت میں گزری۔ زندگی کے آخری ایام میں ان پر فالج کے کئی حملے ہوئے پھر ملتان میں وہ ایک ایسے بوسیدہ مکان میں رہائش پذیر تھے جو فالج کے مریضوں کی رہائش کے بالکل ناقابل رہائش تھا۔ شاہ صاحب انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ برسے حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ صدر پاکستان کو جب ان کی آخری بیماری کا علم ہوا تو انہوں نے ماہرین کو ہدایت کی وہ شاہ صاحب کا طبی معائنہ کریں اور علاج میں خاصی دلچسپی لیں۔ لیکن یہ ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور آخری وقت آن پہنچا۔



صدر پاکستان نے شاہ صاحب کی وفات پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پیغام تعزیت میں کہا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات حسرت آیات سے مجھے بے حد رنج ہوا ہے۔ آپ جنگ آزادی اور اسلام کے ایک زبردست مجاہد تھے اور قدرت نے آپ کو علم و فصاحت کی نعمتیں ودیعت کی تھیں۔ موت نے ہم سے ایک عظیم شخصیت جدا کر دی۔ خدا آپ کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔



پنجاب یونیورسٹی کا اردو مجلہ "مہمور" (ستمبر ۱۹۶۱ء) تعزیتی شذرہ

### اس دور کا سب سے بڑا المیہ!

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ المیہ اس لئے کہ نئی نسل یہ تو جانتی ہے کہ برک نے برطانوی پارلیمنٹ میں کیا کچھ کہا۔ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ روم میں انطونی نے کس طرح اپنی خطابت سے بروٹس کے اقتدار کا تختہ الٹ دیا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ شاہ صاحب نماز عشاء کے بعد تقریر شروع کرتے تھے اور ہزاروں سامعین رات بھر بیٹھنے کے بعد فجر کی نماز ان کی امامت میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کی خطابت کا سر راہ چلتے لوگوں کو کھینچ کر جلسہ گاہ میں لے آیا کرتا۔

ایک بار انجینئرنگ کالج مظہرہ کے انگریز پرنسپل کے خلاف لاہور میں جلسہ ہو رہا تھا۔ رات کے دو بجے تقریر کرتے ہوئے شاہ صاحب نے فیصلہ کیا کہ ابھی موچی دروازہ سے جا کر سب لوگ کالج کے سامنے مظاہرہ کریں اور دس ہزار کا مجمع نعرے لگاتا ہوا شاہ صاحب کے پیچھے چل پڑا۔

یہ آواز کا جادو اس لئے تاریخی حیثیت اختیار نہ کر سکا کہ انطونی کی طرح انہیں کوئی شکستیر نہ ملا۔ اور پھر اس لئے بھی کہ بعد میں ان کا سیاسی مسلک انہیں مسلم لیگ سے دور لے گیا اور وہ تحریک حصول پاکستان سے کٹ گئے۔ وہ غلط راستہ پر تھے مگر اس اختلاف کے باوجود ان کی دیانت، خلوص اور بے غرضی شبہ سے بالاتر تھی۔

ان کی درویشی اہل بصیرت کے لئے آج بھی چراغ راہ ہے۔



ہفت روزہ "ایشیا" لاہور / تعزیتی شذرہ

### جامع کمالات شخصیت

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کا صدر ابھی تازہ تھا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۷۲ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شاہ صاحب کو مرحوم لکھتے وقت کلیجہ کانپتا ہے لیکن موت

سے کس کو رسنگاری ہے۔ وہ اپنے معین وقت پر آتی ہے اس سے فرار کسی کو ممکن نہیں۔  
شاہ صاحب مرحوم گزشتہ پانچ ماہ سے شدید علالت کا شکار تھے مختلف ہسپتالوں میں قابل ڈاکٹروں کی زیر نگرانی ان کا علاج ہوتا رہا۔ لیکن شاہ صاحب کی حالت روز بروز گرتی گئی اور آخر ۲۱ اگست کو شام چھ بج کر ۱۵ منٹ پر ان کی زندگی کا پسیمانہ بسریز ہو گیا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم جامع کمالات شخصیت تھے۔ برصغیر میں اس پائے کا خطیب پیدا نہیں ہوا۔ جنگ آزادی میں شاہ صاحب نے نمایاں طور پر حصہ لیا اور عمر عزیز کا ایک حصہ تقریباً ۱۸ سال جیل میں بسر کئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری زندگی بھی کیا تین چوتھائی ریل میں کٹی اور ایک چوتھائی جیل میں۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۸ء میں ہوا۔ یہ زمانہ تحریک خلافت کے شباب کا تھا تھوڑے ہی عرصہ میں شاہ صاحب مرحوم نے اپنی شعلہ بیانی کے ذریعہ عوام میں وہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل کی جو بہت کم لیڈروں کو نصیب ہوئی۔ ان کی تقریر سراسر اعجاز تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ عشا کی نماز کے بعد تقریر شروع کرتے اور فجر کی نماز تک تقریر جاری رہتی۔ ان کی تقریر کے دوران کسی شخص کو جملہ سے اٹھ کر جانے کا ہوش نہ رہتا تھا۔ مخالف سے مخالف مجمع کو شاہ صاحب اپنی سحر بیانی سے مسور کر لیتے تھے۔ ہزار ہا افراد کو بیک وقت لادینا اور ہنسنا دینا ان کے ہائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

۱۹۲۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے شورے کے مطابق مجلس احرار قائم کی گئی۔ شاہ صاحب مرحوم جماعت کے روح و رواں تھے۔ چوہدری افضل حق مرحوم کو جماعت کا دماغ اور شاہ صاحب کو زبان سمجھا جاتا تھا۔ جرأت، ہمت اور استقلال میں شاہ صاحب مرحوم اپنی مثال آپ تھے۔ غیرت حق اور روح ایمانی سے ان کا سینہ ہمیشہ معمور رہتا تھا۔ اسلام کے بنیادی عقائد اور نبی اکرم ﷺ کی آبرو پر جب کوئی دشمن دین ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تو شاہ صاحب بے دھڑک اس کے آگے سینہ سپر ہو جاتے۔ اور پھر یہ نہیں دیکھتے تھے کہ مخالف کتنا طاقتور اور با اثر ہے۔ برطانوی سامراج کے ہاتھوں انہیں بارہا صعوبتیں سہنا پڑیں۔ لیکن ان کے پائے استقلال کو کبھی لغزش نہ ہوئی۔

قیام پاکستان کے بعد وہ عملاً سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ لیکن تحریک ختم نبوت کے دوران وہ پھر اسلام کی آبرو بچانے کے لئے میدان میں اتر آئے تھے۔ شاہ صاحب ایسی جامع کمالات شخصیتیں روز بروز پیدا نہیں ہوتیں۔ افسوس ہے کہ پرانے بادہ کش ایک ایک کر کے اس مظل ہستی سے اٹھتے جاتے ہیں اور کوئی ان کی جگہ پر کرنے والا نظر نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔



ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور / تعزیتی شذرہ

## مجاہد اعظم رحمۃ اللہ علیہ

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو یہ جگر خراش خبر سارے ملک نے انتہائی رنج و قلق سے سنی کہ ملک کے مایہ ناز فرزند بطل جلیل، مجاہد اعظم، جنگ آزادی کے شیر دل رہنما، مقب و محبوب اولیاء اللہ، شمع ختم نبوت کا پروانہ..... امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت شاہ صاحب حق اور حق پرستوں کی گویا ایسی تلوار تھے کہ جس باطل کے سہر پر پڑتی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی، وہ خدائی بجلی یا آسمانی صاعقہ تھی کہ کفر و ضلالت کے جس خرمن پر گرتی اس کو راکھ کر دیتی۔ وہ لمن داودی کا اس دور میں نمونہ تھے کہ دوست و دشمن سب کو مسور کر لیتے۔ وہ صور اسرافیل تھے جس کی حیات بخش دعوت سے مردہ دلوں میں جان پڑ جاتی۔ جس کی ایک آواز پر ۵۰ ہزار رضا کار آزادی کشمیر کے لئے سر پر کفن باندھ کر چل پڑتے۔ جن کے ایک اشارے پر متحدہ ہندوستان کے برطانوی جیل خانے بھر جاتے۔ جن کا داخلہ قادیان کے ایوان مرزائیت میں زلزلہ ڈال دیتا۔ جو علم و عمل، شعر و ادب، اخلاق و مزاج، ظرافت و لطافت، شریعت و طریقت اور رزم و بزم کے مجمع کمالات تھے۔ وہ جو تقریر و خطابت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ جہاں کہیں آپ کی تقریر ہوتی۔ مسلمان تو مسلمان ہندو سکھ آپ کی زبان سے قرآن کی تلاوت سننے آ جاتے۔ مخالفین تقریر سے معظوظ ہونے کو شریک ہوتے اور خدام و معتقدین پروگرام لینے کے لئے حاضر ہوتے۔ آپ کے توشہ آخرت کے لئے یہ قابل فرسامان بس ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عطاء اللہ کی باتیں تو عطاء اللہی ہوتی ہیں۔

۲۔ حضرت شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری مدظلہ کے آپ منظور نظر تھے۔ یک بار مرزا آغا فرمایا

"یہ میرے مرید نہیں ہیں۔"

۳۔ خاتم المحدثین حضرت علامہ محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کشمیری نے آپ کو امیر شریعت بنایا۔

۴۔ مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی صاحب نے آپ کو چھاتی سے لگایا اور دل میں جگہ دی۔

۵۔ شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مفتی اعظم کفایت اللہ صاحب اور حضرت شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی سب اکابر امت اور اولیاء ملت آپ کو محبوب رکھتے۔

۶۔ قطب زمان حضرت مولانا احمد غاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ سراجیہ مجددیہ، نقشبندیہ کندیاں شریف نے۔ جب سنا کہ امیر شریعت پر سکندر حیات کی حکومت نے مسلح بغاوت کا مقدمہ بنایا ہے تو وہ بے چین ہو کر متوجہ ہوئے اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا مانگی۔

غرض کہ حضرت امیر شریعت سب کی آنکھوں کا تار تھے۔ اب وہ اپنے حقیقی آقا کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ جہاں زودیا بدر ہم سب کو پہنچنا ہے اور جہاں سے پھر کبھی کسی کو واپس نہیں آنا۔ بے شک یہ سانحہ ایک قومی حادثہ ہے۔ صاحبزادگان محترم کو ہم سے زیادہ صدمہ ہے۔ ان کے متعلقین بلکہ سارے ملک کو صدمہ ہے..... رونے والو! ان پر نہ روؤ۔ وہ اپنا سفر کامیابی سے طے کر چکے۔ اپنی حرمِ نصیبی پر آنسو بہاؤ کہ اس نازک دور میں ہم ان مبارک ہستیوں سے محروم ہو گئے۔ اپنے ایمان کی خیر مناؤ۔ ان لقوسِ قدسیہ کے شہنشاہ کو زندہ کرو۔ علماء حق کا ساتھ دو۔ اسلافِ امت کی اتباع کرو اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس کی رضا مندی کے راستوں پر چل پڑو۔ بے شک وہ حضرات ہم سے جدا ہو گئے مگر ان کی روشنی کی ہوئی مشعل ابھی تک روشن ہے۔ اس کی روشنی میں چلو۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل عطاء فرمائے اور ان کے فرزند ان رشید کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔



ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور اتعزیتی شذرہ

## محفل عزم و عمل کا روشن چراغ

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی شب کو بلتان سے یہ اندوہناک اطلاع موصول ہوئی کہ محفل عزم و عمل کا وہ چراغ جو کئی سال سے مرض و ضعف کے مسلسل اور شدید جھونکوں سے بھج بھج کر سنبل جاتا تھا۔ ۷۳ سال حنا گسریوں کے بعد ۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ کی شام کو جھج کر ۵۵ منٹ پر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی تھی سودہ بھی خاموش ہے

یعنی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فلاح، تقوہ اور یرقان کی تکلیف وہ بیماریوں میں متواتر چار سال مبتلا رہنے کے بعد اس دنیائے فانی کو الوداع کیا اور اپنے بے شمار دوستوں، مریدوں اور معتمدوں اور مستفیدوں کو محزون و مہلون چھوڑا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اُن کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۹ء میں ہوا سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ بڑا سنگامہ خیز اور پر آشوب تھا۔ اور تحریکِ خلافت پورے شباب پر تھی۔ اس زمانہ میں شاہ صاحب مرحوم امرتسر کی ایک مسجد میں خطابت و امامت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ منصبِ ذمہ داری کے اعتبار سے عام طور پر ان کے زیر بحث اگرچہ مذہبی مسائل ہی رہتے تھے۔ لیکن اس ابتدائی دور میں ان کی تقریر میں بڑی روانی بڑا زور اور بڑا اثر تھا۔

مولانا سید داؤد غزنوی کا شمار اس دور میں خلافت کے مصروف اور ذمہ دار لیڈروں میں ہوتا تھا۔ شاہ صاحب کی تقریر کی تاثیر پذیر یوں اور ان کے اندازِ بیاں کی بے پناہیوں کی اطلاع مولانا غزنوی کو پہنچتی رہتی

تھی۔ اسی اثناء میں ایک روز انہوں نے شاہ صاحب کو یاد فرمایا وارکھا کہ مسجد کی چار دیواری سے باہر نکلیں۔ خطابت و امامت کی محدود ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو آزاد کریں۔ ملک کے وسیع تر اور غیر محدود مفادات کا جائزہ لیں اور سیاسیات کی دنیا میں قدم رکھیں۔ آج ملک کو آپ کی بے لوث اور مخلصانہ خدمات کی بے حد ضرورت ہے چنانچہ شاہ صاحب میدان میں اترے اور اپنی تمام تر خدمات ملک و قوم کے حوالے کر دیں۔ یہ ان کی بھرپور اور ہر جوش جوانی کا زمانہ تھا۔

سیاسیات کے کوچے میں قدم رکھتے ہی ان کی تحریریں ہونے لگیں اور نتیجتاً ۳ سال کے لئے جیل بھیج دیے گئے۔ اس کے بعد ان پر سنگین سے سنگین مقدمے چلے، زبردست آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا۔ پٹانسی اور عمر قید کے منصوبے بنائے گئے۔ بارہا جیل گئے اور عمر عزیز کے کئی سال زندانوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں گزار دیے۔ آخری دفعہ وہ ۱۹۵۳ء میں پاکستان کی مشہور اور ہمہ گیر تحریک ختم نبوت میں ماخوذ ہوئے۔

مدیر الاعتصام کو ایک سلسلہ میں مولانا مجاہد الحسینی کی معیت میں مارچ ۱۹۵۶ء میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ وہ لاہور تحفظ ختم نبوت کی ایک کانفرنس میں تشریف لائے تھے اور دہلی دروازے کے باہر دفتر احرار میں قیام فرماتے۔ مولانا مجاہد الحسینی نے تعارف کرایا تو اس عاجز کو اپنے پاس چارپائی پر بیٹھایا اور الاعتصام کی تعریف کی۔ بعض مضامین کی تو بہت تحسین کی اور فرمایا میرے کھنے سے ملتان کی تحفظ ختم نبوت نے ان کو کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ مختلف عنوانات پر باتیں ہوتی رہیں۔ مولانا داؤد غزنوی کی خیر و عافیت دریافت فرمائی اور کھما میں تو ایک گوشہ نشین فقیر تھا اور مجلس میں خطابت و امامت کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ خلافت کے زمانہ میں مجھے داؤد غزنوی ہی مسجد کے گوشہ عافیت سے کھینچ کر سیاست کے خاردار میں لے آئے تھے۔

شاہ صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے۔ ان کی موت تنہا ایک شخص اور ایک فرد کی موت نہیں ہے۔ ایک عہد ایک دور اور ایک جماعت کی موت ہے۔ وہ ایسا بے تاب و مضطرب دل لے کر آئے تھے جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے قرار ہو جاتا تھا۔ ان کی آواز اتنی پُر درد اور پُر سوز تھی کہ برصغیر پاک و ہند اور عالم اسلام کے ہر سانحہ میں بے اختیار بلند ہو جاتی تھی۔ ظلم کے خلاف ان کی صدا اتنی موثر تھی کہ ایک آن میں صور اسرافیل بن جاتی تھی۔ ان کی آنکھیں اسلام اور اہل اسلام کی ہر تکلیف پر اشک آلود ہو جاتی تھیں۔ مسلمانوں کی ادنیٰ سے ادنیٰ تکلیف بھی نہ وہ خود برداشت کر سکتے تھے اور نہ یہ گوارہ کرتے تھے کہ کوئی برداشت کرے۔ ناممکن تھا کہ وہ مظلوم کو ظلم و ستم کے شکنجہ میں جکڑا ہوا دیکھیں اور خاموش رہیں۔ وہ ملک و قوم کی تکلیف کے وقت خود روتے اور دوسروں کو رلاتے تھے۔ انہوں نے غلام آباد ہندوستان میں انگریز کے خلاف زبردست نگرانی اور اس کی حکومت کو اپنا سب سے بڑا حریف قرار دیا۔ وہ دنیا بھر کے مسلمانوں پر ماتم کناں ہوئے اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی مصیبت پر بھی مضطرب ہو گئے۔ انہوں نے

عراق، ایران، نجار، حجاز مصر، شام، ترکی، بیت المقدس غرض ہر خط ارض کے مسلمانوں کی مظلومیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔ اور ان کے مصائب و آلام پر نوحہ خواں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج صرف ہندوستان ہی نہیں، پورا عالم اسلام کا ان کا عزادار ہے اور ہر مسلمان کی آنکھیں ان کی موت پر اشکبار اور ہر شخص کا دل مزنون و غمگین ہے۔ وہ قادر الکلام مقرر تھے جو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ وہ بلبل خوش نوا تھے جس کے ترانے اب کبھی نہ سننے جائیں گے۔ وہ آتش زبان خطیب تھے جو قیامت تک نہ بول سکیں گے۔ وہ بہادر اور بے خوف انسان تھے جواب کبھی اپنی بہادری کے جوہر نہ دکھا سکیں گے۔ وہ جنگ آزادی کے ایسے بے پاک اور نڈر سپاہی تھے جو ہمیشہ میدان جنگ میں دشمن سے لڑتے تھے اور اب ایسے گرے ہیں کہ کبھی نہ اٹھ سکیں گے وہ ایک مردم آفریں عہد اور خاص دور کی پیداوار تھے۔ اب نہ وہ دور واپس آئے گا اور نہ اس قسم کے اولوالعزم اور باہمت و جری لوگ پیدا ہوں گے۔ "الوداع عطاء اللہ شاہ بخاری الوداع"



ماہنامہ "الصدیق" ملتان  
ربیع الاول ۱۳۸۱ھ / تفریق شذرہ

## میر کارواں

دنیا فانی ہے۔ اس میں جو آیا اس نے جام فنا پینا ہے۔ اس میں سکندر رہا نہ دارا۔ نہ شاہان عرب رہے۔ نہ سردارانِ عجم۔ امیر ہوا غریب۔ بچہ ہوا بوڑھا۔ کمزور ہوا توانا۔ اس دنیا میں پل بھروم لینے والے مسافر کی مانند ہے۔ جس کا دور ٹھکانہ ہے۔ پل بھر سنانے کے وقفہ میں اسے اختیار ہے کہ غفلت کی نیند سو جائے یا بیدار رہ کر دوسرے ساتھیوں کی معیت میں عیش و عشرت، لہو لعب اور غلط کاریوں میں وقت کاٹ دے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی خوش قسمت مسافر خدمت پر کمر بستہ ہو جائے۔ ساتھیوں کی مشکلات حل کرے۔ انہیں مفید مشورے دے۔ ان کی الجھنوں کی گھتیاں سلجھا دے۔ بکھرے ہوئے مردوں میں وحدت کا جذبہ ابھار دے۔ اور انہیں انفرادی سفر کی بجائے قافلہ کی شکل میں سفر کی تعلیم دے کر راستہ کی کھٹن منزلوں کو آسان بنا دے۔ اپنے عزم و استقلال کی وجہ سے قافلہ کو دشوار گزار گھاٹیوں سے صحیح سلامت لیکر پار اتر جائے۔

اس آخری نوع کے مسافر کے لئے میر کارواں کا خطاب زیبا ہے۔ اور اسی بنا پر میں نے سید عطاء اللہ شاہ صاحب کو مذکورہ بالا خطاب کا ستمن قرار دیا ہے۔ پڑھوں تک سید عطاء شاہ صاحب ہم میں تھے۔ کل ان کا جنازہ اٹھا۔ نماز ادا ہوئی۔ اور سپرد خاک کئے گئے۔ شاہ صاحب ایسا مرد آہن، ان شک مجاہد، بیدار مغز، مستقل

مراج، حق گو، حق پرست، بر عظیم ہندوپاک کی سرزمین نے مشکل سے دیکھا ہو گا۔ سب سے بڑھ کر فریضہ خطابت اور قرآن دانی کی خوبی میں شاہ جی ممتاز ترین شخصیت کے مالک تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ عشاء کی نماز ہوئی اور شاہ جی نے منبر مصطفویٰ پر قرآن سنانا شروع کیا۔ پھر کیا ہوا؟ شاہ جی کا ذوق تلاوت بڑھتا گیا۔ اور سامعین کا شوق سماعت بھی یہاں تک کہ صبح کی اذانیں صدائے مرغ بے ہنگام تصور ہونے لگیں۔ اور لوگ بے ساختہ پکار لٹھے کہ کیا ہوا ابھی سے اذانیں کیوں؟ کیا رات چھوٹی ہو گئی ہے؟ حقیقت میں نہ رات چھوٹی تھی نہ بانگ بے ہنگام۔ بلکہ قاری و سامعین کی شب وصال تھی جس کے پھر گھنٹے، گھنٹے منٹ اور منٹ سیکندہ ہو کر رہ گئے۔

انگریز بہادری میں جبکہ آزادی کا نام لینا بھی جرم تھا۔ مجاہدین آزادی کو بے دلیل واپیل جیل میں ٹھونس دیا جاتا تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں ۱۸۵۷ء کا بھیانک نقشہ تھا۔ اور آزادی کا لفظ منہ پر لانے سے کانپ اٹھتے تھے۔ ان دنوں شاہ جی ہی کی ذات گرامی تھی۔ جس نے چپہ چپہ زمین پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اہل باطل کو اہل حق پر حکومت کرنا کوئی حق نہیں ہے۔ شاہ جی کی بلند ہمتی اور مخلصانہ جدوجہد کے نتیجہ میں ہزاروں علماء کے اجتماع میں آپ کو امیر شریعت مانا گیا۔ اور پاک و ہند میں شریعت کی باگ ڈور حضرت شاہ جی کے متبرک ہاتھوں میں دے دی گئی۔ ادھر یہ ہوا۔ ادھر انگریزی راج کے عذاب میں جوش آیا۔ نت نئے مقدمے بننے لگے۔ ایک مقدمہ سے رہائی ہوئی۔ تو دوسرے میں پھنسا دیئے گئے۔ مگر حضرت شاہ جی ہر سٹیج پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ الفاظ دہراتے گئے۔

فاقص مانت قاض انما تقضى هذه الحیوة الدنيا۔

شاہ جی کو خریدنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ تب آپ یوسف علیہ السلام کے یہ الفاظ نقلی فرمایا کرتے۔

معاذ اللہ انہ، ربی احسن مثوی۔ انہ لا یفلح الظالمون۔

شاہ جی یہ جوابات کیوں نہ دہراتے جبکہ آپ میں جلال موسوی اور حسن یوسفی دونوں بیک وقت جمع تھے۔ آخر کار جموٹے مقدمے بنا کر شاہ جی کو عمر قید میں دینے کی کوششیں کی گئیں۔ مگر مرد مجاہد تائید ایزدی سے ان تمام مصائب کی پروا نہ کرتے ہوئے صدائے حق بلند کرتا گیا۔ شاہ جی فرمایا کرتے تھے کہ خدا یا میری ان دو دعاؤں میں سے ایک ضرر مقبول فرمائے یا تو انگریزی راج کو بر عظیم ہندوستان سے ٹکٹے ہوئے مجھے میری آنکھوں سے دکھا دے (اور یہی میری دلی خواہش ہے) یا پھر توفیق دے کہ ملک کی آزادی کی خاطر بنی خوشی تختہ دار پر چڑھ کر مجاہدانہ جان دے دوں۔ چنانچہ بارگاہ ایزدی میں ان کی پہلی دعا ہی منظور و قبول ہوئی۔ اور شاہ جی نے اپنی صحت و سلامتی میں انگریز کی روائی دیکھ لی۔

شاہ جی صرف آپ ہی مجاہد نہ تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان میں مجاہد گری کی خاصیت بھی ودیعت فرمائی

تھی۔ اور عموماً ایسا ہوتا تھا کہ جو شخص بھی شاہ جی کی خدمت میں چند دن تک رہا اس نے تحریک آزادی کے لئے سر دھڑکی بازی لگا دی۔ اور صرف جیل ہی نہیں۔ دارورسن تک کو چوسنے کے لئے تیار ہو گیا۔ آج جالندھری و شجاع آبادی، کاشمیری و لاہوری، سرحدی و میانوی، جس فلک کے درخشاں ستارے نظر آتے ہیں۔ شاہ جی اس فلک کے نیر اعظم تھے۔

آج شاہ جی ہم سے جھمن گئے۔ آج ہم ان کے مفید مشوروں اور مخلصانہ دعاؤں سے محروم ہو گئے ہیں۔ مگر وہ ہمیں اپنی زندگی کا ایک لائحہ عمل دینے گئے ہیں۔ خدا ہمیں ان کی پیروی کی توفیق دے۔ اور انہیں اخضر الخاص جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ (عید الوہاب ابراہیمی ملتان۔)

ماہنامہ "تدریس القرآن" ہری پور ستمبر ۱۹۶۱ء



"ملت کا ترجمان..... شیوا بیان!"

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو ملت اسلامیہ کا وہ عظیم و جلیل ترجمان شیوا بیان دار فانی سے منہ موڑ کر رفیق اعلیٰ سے جاملے

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جو بچوں کا رفیق، جوانوں کا سپہ سالار اور بوڑھوں کا غمگسار تھا۔ اور جس کا نام عطاء اللہ شاہ بخاری تھا۔ جو ہر دلعزیزی اور محبوبیت کا گویا عنوان اعتباری تمامات اور مسائل مشکلہ کے صدر الصدور کی جگہ خالی ہو تو وہ مولانا بخاری کے ذریعہ پر ہو سکتی تھی۔ اور اگر صدر مجلس مولانا آزاد، شیخ الہند، انور شاہ وغیرہ جہاں علم و فضل موجود ہوں تو عطاء اللہ شاہ بخاری عسکری سالار کی حیثیت سے ان کی پر نور مجلس کے لئے وسیلہ قوام و قیام تھا۔ صحافیوں اور ادیبوں کا قبیلہ علوم عربیہ کے طالب علموں کی طرف بہ نگاہ استغاف دیکھنے کی جرات نہیں کر پاتا تھا کہ جب تبلیغ و دعوت اور مسائل دینیہ سے فرصت حاصل کر کے ادیبوں کی طرف حضرت مولانا بخاری رخ انور کو پھیر لیتے تھے تو ملک کے ادیب سر پھیرنے لگتے تھے کہ مساجد کے تعلیمیہ انتظامات مستشف عالمان دین کے شدید ضبط کے پابند و وفادار لوگوں میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو سکتے ہیں جو شعر کہنے والے، شعر کے تنقید کرنے والے اور چست و برجستہ کلام سے دھاک بٹھا دینے کی صلاحیت رکھنے والے ہوں؟ جب مستقبل کا مورخ انگلستان کی سرزمین سے اٹھنے والے فتنوں کی دست برد سے یشرنی در یتیم ﷺ کی مشرق و مغرب میں بکھیری ہوئی دولت ایمانی کو بچانے والے مجاہدین کے اعمال کا جائزہ لے گا تو سید الاحرار حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے نام کو سر خیل جانبازان جیش محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں پائے گا۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کی ایک خصوصیت جس نے ان کے حسین و جمیل نامہ اعمال پر مہر تکمیل ثبت کی ہے، یہ ہے کہ انہوں نے وسائل پر قدرت پانے کے باوجود اپنی اولاد کو تہذیب جدید کی اندھی تقلید سے بچانے کی سعی فرمائی۔ چنانچہ ان کے بچے عربی علوم کے فاضل، حافظ قرآن اور ماہر تجوید ہیں اور یہ بشارت بھی سن لیتے کہ مرحوم کے صاحبزادہ اکبر عطاء اللہ عظیم بلاغت و فصاحت، اور خطابت و شجاعت میں باپ سے کم نہیں۔ اور انشاء اللہ اب ان کے آگے بڑھنے کا وقت ہے دعا ہے کہ مرحوم کو اعلیٰ علیین کا مقام اور وارثین کو صبر جمیل کا انعام نصیب ہو۔



### عاصی کرنالی

ایک شعلہ جو بہت بے تاب و برہم ہو گیا۔

ایک شعلہ جو بہت بے تاب و برہم ہو گیا  
 شاہ صاحب کی خطابت میں مجسم ہو گیا  
 آندھیوں کا زور، بادل کی گرج، طوفان کا جوش  
 سیل کی آہٹ، کڑکتے صاعقے جیسا خروش  
 زلزلہ، صرصر، تلاطم، آگ، لہوا، ہانگِ صور  
 موت کی لٹکار، برزخ، نعرۂ یوم النشور  
 کاش میں ایک ایک لہوِ خنجرِ باطل نکلن  
 گشتگو کی تیغِ برآں اور فرمانِ "بزن"  
 جانِ باطل کے لئے ہر لفظِ مرگِ ناگہماں  
 اہلِ ایمان کے لئے آبِ حیاتِ جاوداں  
 ایک جانب ہر خطابِ آتشیں حق کا جلال  
 ایک جانب ہر کلامِ دلِ نشیں حق کا جمال  
 ابرِ رحمت، رشتہِ الطاف، بارانِ کرم  
 شاخِ زمک، برگِ گل، بادِ سرِ گاہی کا نیم  
 علم، قرآن، آگہی، ایقان، تفکر، اعتقاد  
 شمع، ایمان، معرفت، حکمت، تفقہ، اجتہاد  
 رمز، ایما، طرفگی، لہجہ، تشبیہ و مثال  
 بدلتہ نسبی، خوش دلی، نکتہ طرازی، اعتدال  
 قول، مصرع، صلیح، دوبا، کلمہ کمرنی، چٹکے  
 طب و حکمت، ہنیت و ساتس، شعر و فلسفہ  
 ایک کھسارِ بلاغت، محکم و گردوں نشیں  
 ایک دریائے فصاحت جس کی کوئی حد نہیں  
 جب تلاوت آشنا ہوتے تھے وہ گل ہائے لب  
 جگمگا اٹھتے تھے مانندِ سرِ رخسارِ شب

سب پہ چھا جاتے تھے وہ شاداب موسم کی طرح  
 آہستہ ذہنوں کو تر کرتی تھیں شبنم کی طرح  
 ہاں تو اے اربابِ مجلس! ان کا اندازِ خطاب  
 جو دلوں میں تیر جاتے وہ صدائے انقلاب  
 زندگی جاگی نوائے مردِ حق آگاہ سے  
 جی اٹھے دل اس صدائے تم باذن اللہ سے  
 ہم سے خاک آسودگاں کو جسم و جاں دیتے رہے  
 شاہ جی جا جا کے قبروں پر اذان دیتے رہے  
 اس خطابت کے جلو میں دوسرا منظر بھی تھا  
 لفظ کے آئینے میں کردار کا جوہر بھی تھا  
 سختیاں، آلام، بیماری، مصائب، زجر دہند  
 ظلم، تعزیرِ وفا، دشنام، زنداں، قید و بند  
 جبر کی ایک ایک آندھی کے مقابل ٹٹ گئے  
 ہرچہ بادا باد، زندہ بچ گئے یا کٹ گئے  
 یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے مرے مضمون سے  
 حریت کی داستان لکھی گئی ہے خون سے  
 ملتِ اسلام! اے روشن نصیب و خوش نظر  
 دیکھ اس انمول آزادی کی ظالم! ہدر کر  
 خطِ ارضِ وطن اک مشترک تعبیر ہے  
 شاہ جی کا خونِ دل بھی شاملِ تعبیر ہے

(پروفیسر عاصی کرنالی بنام حفیظ رضا پسروی)

## امیر شریعت قلندر، فقیر

وہ سامنے جلوہ گرتے۔ جیسے شمع اور گرد مریدان صادق اور مہمان وفا کیش جیسے جانثار پروانے۔ کیا عالم نور و ظہور تھا اور شہود و حضور کی کیسی دل نواز مہمفل تھی۔

زبان حال سے پروانہ بسمل یہ کہتا ہے  
حضور ہی ہو اگر حاصل مزا ہے نیم جانی ہے  
(اکبر)

اور شاہ جی علیہ الرحمۃ سامنے مشکین تھے اس لئے حضور کے انوار و تجلیات کی بارش ہو رہی تھی میری نظر ان کے رونے اقدس پر تھی۔

خوشا نگاہ کہ گلچین صد تماشا ہے  
(عاصی)

اور رومی کے اس شعر کی حکومت تھی

اے لقاے تو جواب ہر سوال  
نکتہ حل می شود بے قیل و قال

میں ایسی انجمنوں کی جلوہ آفرینی اور سعادت اندوزی کا ذکر آپ سے کیوں کروں۔ آپ صاحب غیاب تو نہیں، آپ کو تو خود حضور و تجلی کا مقام حاصل ہے اور ان خدائی چراغوں سے اکتساب نور و ضیا کا شرف اور توفیق آپ کو بخشی گئی ہے۔ کیا یہ عالم نہیں ہوتا تھا کہ شاہ جی..... جیسے نور کا ایک بے کراں سمندر ہے اور ہم ان اسواج تجلی میں غرق ہو گئے اور ہماری ارواح نے غسل نور کیا ہے..... اور یہ لوگ اٹھ گئے تو یہ حالت ہو گئی۔

رات انجمن میں ایک ترے پر تو بغیر  
کیا شمع، کیا پتنگ، ہر اک بے حضور تھا  
(میر)

ہاں تو شاہ جی مسند نشین تھے اور ہم ان کے قدم بوس خوشہ چین جمال و کمال۔ میں نے عرض کی شاہ جی!..... چند شعر آپ پر ہوئے، میں اجازت ہو تو سناؤں۔

مسکرائے شعر پڑھا،

برو ایس دام بر مرغ و گرہ  
کہ عنقارا بلند است آشیانہ

میں نے کہا شاہ جی! میں دام ضرور پھیلانوں گا۔ آپ عنقا ہونے کے باوجود اس میں پھنسیں گے۔ اس لئے کہ یہ دام عقیدت ہے جو ارادت و نیاز کے تانے بانے سے تیار ہوا ہے۔ اجازت مل گئی۔ شعر سنانے لگا۔ اس وقت میری حالت کا تصور کیجئے، سنا ہے سیدنا حسان بن ثابتؓ جان دو عالم ﷺ کے سامنے جمال کے تراہنے گاتے تھے۔ یہاں، ایک جانب اس نبی کی اولاد، ایک سید زادہ کہ مرکز مہر و وفا اور قرار دل و نظر تھا اور دوسری جانب حسانؓ کا ایک ادنیٰ سا شاگرد جسے اس کے جذب و نیاز نے مدح طرزای کے لئے دل آمادہ کیا تھا۔ کیا کیفیت تھی۔ مجھ پر اس وقت..... محبوب سامنے ہو اور عاشق بمصدق..... دراز دستی ایس کو نہ آستیناں بین!..... مدح کے مصنفین ادا کر رہا ہو۔ اس خوف کے ساتھ کہ کہیں فکر کی نارسائی اور سلیقے کی کوتاہی اس مدح سرائی کو سونے ادب کی تعریف میں نہ لے آئے۔ الحمد للہ۔ شعر شاہ جی کو پسند آئے اور خاستے پر فرمایا۔ اگر یہ شعر پہلے ہونے لگے تو "سواطع الالہام" (شاہ جی کا مجموعہ کلام) میں صوفی تبسم کی غزل کے ساتھ چھاپتا۔ یہ حدیث بخاری سیرزی نجات و مغفرت کا پروانہ ہے۔ انشاء اللہ العزیز

میرا جی بے اختیار چاہتا تھا کہ یہ شعر آپ کو لکھ بھیجوں۔ اس لئے ایک تو آپ میرے پیر بانی ہوئے۔ دوسرے آپ کا مرتبہ فی شناسی اور منصب شعر گوئی اس کا مستقاضی تھا اور تیسرے ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے! اور سب سے بڑی بات یہ کہ درد کی بات درد آشنا ہی سے کہی جاسکتی ہے۔ آپ اسے بے شک شاہ جی کے ایک مخلص عقیدت مند جناب عبداللہ ملک کے روزنامے میں دے سکتے ہیں۔ امید ہے یہ شعر آنکھوں کو نمناک اور شبنم افشاں کر دیں گے۔ کہ یہی شبنم اشک ہے جو اہل درد کے دل کی کھیتی کو ہرا کر دیتی ہے۔

والسلام خاکپائے اہل دل..... حاصی کر نالی

(روزنامہ "آزاد" لاہور، ۲۱ اگست ۱۹۷۱ء، ص ۴)



## نُطق کا سیلِ رواں

واعظِ شیریں بیاں سید عطاء اللہ شاہ  
 نطق کا سیلِ رواں سید عطاء اللہ شاہ  
 دینِ حق کا پاسباں سید عطاء اللہ شاہ  
 قائد و میرِ شریعت نکتہ سنج و نکتہ داں  
 اپنی تقریروں میں ہر عنوان و ہر موضوع پر  
 نام سونے کا نہ لیتا پورے مجمع میں کوئی  
 اہلِ مجلس کو ہنسا دیتے، رلا دیتے کبھی  
 ہو گیا وہ بندہ بے دام جس نے سن لیا  
 مفضل صاحبِ دلاں میں بادۂ توحید کے  
 رزم گاہِ حق و باطل میں نظر آئے سدا  
 زندگی بھر حق و باطل کی لڑائی میں رہے  
 حفظِ ناموس رسالتِ روز و شب کرتے ہوئے

طوطی شکر فشاں سید عطاء اللہ شاہ  
 قائدِ شعلہ بیاں سید عطاء اللہ شاہ  
 اہلِ حق کا ترجمان سید عطاء اللہ شاہ  
 قوم کی روح و رواں سید عطاء اللہ شاہ  
 باندھ دیتے تھے سماں سید عطاء اللہ شاہ  
 صبح تک کرتے بیاں سید عطاء اللہ شاہ  
 تھے بڑے جادو بیاں سید عطاء اللہ شاہ  
 آپ کا کوئی بیاں سید عطاء اللہ شاہ  
 ساقی و پیرِ مغاں سید عطاء اللہ شاہ  
 شیرِ نر، پیلِ دماں سید عطاء اللہ شاہ  
 کامیاب و کامراں سید عطاء اللہ شاہ  
 ہو گئے خلد آسماں سید عطاء اللہ شاہ

جب پیامِ موت آپہنچا تو ہنس کر ہو گئے  
 داخلِ باغِ جنان سید عطاء اللہ شاہ



## سر شاخ طوبی تھا جس کا نشیمن

امیرِ شریعت وہ مردِ قلندر وہ شہازِ اسلام وہ مردِ تہیں  
 وہ باغِ نبوت کا ایسا تھا بلبل سرِ شاخ طوبی تھا جس کا نشیمن  
 بہارِ فصاحت نگارِ بلاغت سفیرِ رسالت ضمیرِ شرافت  
 نثارِ نبوت مدارِ عزیمت، وہ بنارِ عظمت پہ تھا جلوہ آگن  
 وہ تنویرِ جذبات صدیقِ اکبر، وہ تصویرِ اخلاقِ شیر و شیر  
 وہ شمعِ رسالت پہ جل بھنے والا وہ سینائے توحید پر جس کا مسکن  
 وہ شورِ سلاسل پہ زورِ خطابت، وہ جوشِ شجاعت پہ ہوش و فراست  
 وہ شوقِ شہادت پہ ذوقِ نکالوت وہ سوزِ محبت سے دل مثلِ گلشن  
 وہ زندانِ آفرنگ کے صحن میں لمبی داؤدی سے لگناتا جو قرآن  
 تو جھوم اٹھتے تھے ناشتائیں حمد لرز اٹھتے تھے دین و ایمان کے دشمن  
 شب و روز عشقِ محمد میں تڑپے، دلِ شیرِ اس کے سینے میں دھڑکے  
 دھڑکے تو ڈھے جائیں باطل کے قلعے جو بولے تو کھل جائیں گلشن کے گلشن  
 وہ قرآن کی لوریاں دے کے نعت کی بے چین گھڑیوں کے تسکین پٹے  
 سمندر کی سپہری ہوئی موج بن جائے ظالم لگائیں زباں پر جو قدغن  
 وہ تقریر کی موسلا دھار سے دل کی بنبر زینوں کو شاداب کرتا  
 مگر برقِ عشقِ نبوت سے دُزدانِ ختمِ نبوت کے جل جاتے خرمن  
 سرازار حضرتِ مرے پاس ارادات کے گوہر کھان نجم، پھر بھی کروں پیش  
 خراجِ عقیدت بالفاظِ شورش "جوشِ جی" کے عنوان سے ہے معنون  
 کہ اٹھے تو آندھی جو گرے تو بادل جو کڑکے تو بجلی جو بولے تو ہے شیر  
 نگہ بھر کے دیکھے تو کانپ اٹھیں دشمن ذرا سکرائے تو بن جائیں ساجن

عبدالستار نجم ابوالخیری (جھنگ)

## تمہارے ہر سوال کا جواب قرآن میں موجود ہے۔

۱۹۳۸ء کا زمانہ ہے۔ محلہ لال جمانیاں میلیں شہر (ضلع وہاڑی) کے احاطہ قبرستان میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے عقیدت مندوں اور ارادت کیشوں نے تبلیغی جلسہ اہتمام کیا ہے۔ زبنداروں اور جاگیرداروں کا علاقہ، جعلی بیروں اور اندھے مریدوں کی شکار گاہیں اس پر مستزاد شاہ جی کی آمد اور تقریر اسے سہ آتش ہی کہہ سکتے ہیں۔ ایسے ماحول میں شاہ جی کی تقریریں جاگیرداروں کے ظلم اور بیران درہم و دینار پر گرز البرز شکن سے کم نہ ہوتی تھیں۔ تقریر کا اعلان سننے ہی یہ لوگ احتیاطی تدابیر سوچنے لگے۔ چنانچہ علاقہ کے پیر مولوی سید کریم حیدر شاہ نے اپنے ایک مرید محمد شعبان کھمار کو تیار کیا کہ جو نبی شاہ جی تقریر شروع کریں تم کھڑے ہو کر سوال جڑو۔ "آپ رسالت، معراج، اولیاء اور درباروں کے منکر ہو؟ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس سوال پر شاہ جی کے عقیدت مند اٹھ کھڑے ہوئے اور مخالف بھی، ارادت مند سائل پر غضبناک ہوئے اور مخالف خوشی سے قل غیاطہ کرنے لگے۔ مجمع میں ایک ارتعاش پیدا ہوا اور لوگوں کی اکثریت سائل کی اس حرکت پر مشتعل ہو گئی۔ پولیس "شعبان" کی گرفتاری کے لئے جلسہ گاہ میں پہنچ گئی۔ اسی شور و غل میں یکایک ایک نعرہ مستانہ بلند ہوا، دلوں کو ہلادینے والی گرجدار صداسنی گئی، شاہ جی پورے جلال کے ساتھ فرار ہوئے تھے۔

"لوگو! بیٹھ جاؤ، میں دیدہ بینا رکھتا ہوں۔ جس شخص نے مجھ سے سوال کیا ہے اس کا جواب دینا صرف میرے ذمہ ہے آپ کے نہیں۔ اگر آپ لوگ خاموش ہو کر نہ بیٹھے تو میں تقریر کئے بغیر چلا جاؤں گا۔" اس کے ساتھ ہی فضا پر سکون تھی، لوگ گوش بر آواز اور شاہ جی ان سے مخاطب۔ آپ نے محمد شعبان کو سیٹج پر بلایا اور میز پر بٹھادیا۔

پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرمایا!

"میرا موضوع تو کچھ اور تھا مگر "شعبان" تم جانتے ہو۔ فقیر کے میکدے کی روایت ہی کچھ اور ہے۔ یہاں صراحتی، بڑا اور جام کش لبوں کے منتظر اور ساقی فیاض ہے۔ آج تمہیں نہ مناؤں گا تو لوگ مجھے کیا کہیں گے؟" شاہ جی نے ان جملوں کے بعد سائل سے فرمایا

"دیکھو! تم میرے مسلمان بھائی ہو آؤ میں تمہیں قرآن سناؤں"

مختصر خطبہ کے بعد آپ نے سورہ کلمہ کی ابتدائی چار آیات اس انداز میں تلاوت فرمائیں کہ مہذب پر بیٹھے ہوئے محمد شعبان پر بے خودی اور وجد کی کیفیت طاری ہو گئی پھر سورہ نجم کی تلاوت شروع کی تو شعبان میز سے زمین پر آگرا اور جب

فکان قاب قوسین او ادنی

پر پہنچے تو پیر مرید دونوں زمین پر بے خود پڑے تھے۔ پیر اپنے مرید کے سوال پر ہونے والا تماشا دیکھنے کے لئے بیٹج کے قریب ہی جگہ گاہ میں موجود تھا۔ کچھ دیر بعد حواس بحال ہوئے تو تقریر ختم ہو چکی تھی اور رات بیت چکی تھی مؤذن کی پکار کفر و شرک کی تارکیوں کو چیرتی ہوئی مومنوں کو بیدار کر رہی تھی اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ پیر مرید دونوں شاہ جی کے قدموں پر گر پڑے۔ شاہ جی نے فرمایا

”یہ سر صرف اللہ کی بارگاہ میں جھکاؤ اس لئے کہ عظمت آدم مومن انسانیت ﷺ بھی اسی ذات وحدہ لا شریک لہ کے سامنے سر بسود ہیں“

پیر نے کہا! شاہ جی مجھے معاف کر دیں میں آپ کو غلط سمجھتا تھا مگر آپ نے قرآن سن کر مجھے غلط ثابت کر دیا ہے۔ مرید نے کہا! مجھے بھی معاف کر دیں میں تو پیر کے اکسانے پر سوال کے لئے کھڑا ہوا۔ شاہ جی نے فرمایا! جاؤ قرآن پڑھو، قرآن سنو، قرآن سناؤ اور قرآن کی دعوت کو گھر گھر پہنچاؤ۔ تمہارے ہر سوال کا جواب قرآن میں موجود ہے۔ شاہ جی کی تبلیغی جدوجہد سے بھرپور زندگی کے بے شمار واقعات ہیں جو صفحہ قرطاس پر نہیں دلوں میں محفوظ ہیں۔

یہ واقعہ حافظ شمس الدین صاحب (ساکن چک نمبر ۶۹/B-W دہلی) کی روایت ہے ان کے بقول مولوی سلطان محمود صاحب اور مولوی غلام قادر صاحب بھی اس منظر کے حینی شاہد اور جلسہ میں موجود تھے۔

حافظ ارشاد احمد دیوبندی

## عدوہائے محمد کا شکاری دیکھتے جاؤ

کسی سلطانِ جاہ کو کبھی حق بات کہنے سے نہ خاطر میں کبھی لایا کسی کی جاہ و شمت کو امیروں سے یہ بے پرواہ شہنشاہوں سے مستغنی خدا کی راہ میں جھیلے مصائب طیب خاطر سے گزاری ریل میں یا جیل میں کل زندگی اپنی نہ چھوٹی ان سے ہر گز بھی کسی حالت میں جلّ اللہ خدا نے پاک کے امر و نواہی کی اشاعت میں رگ مرزائیت کو کاٹ ڈالا جذبہ حق سے غلامی کو مٹانے میں لگائی جان کی بازی نبوت کی حفاظت میں اٹھائی تیغ حق گوئی رخِ زہا سے ہوتا ہے ہویدا نور ایمانی ملک صورت فلک رتبہ سراپا اسوۂ حسنہ بہت دل گیر ہے ارشاد ان کے ہجر میں دائم ہوا ہر گز نہ دل پہ خوف ظاری دیکھتے جاؤ منال و مال سے پرہیز گاری دیکھتے جاؤ فقیروں سے مروت انکساری دیکھتے جاؤ یہ عبرت خیز ان کی بڑدباری دیکھتے جاؤ رہ مولیٰ میں یہ دیوانہ واری دیکھتے جاؤ صراطِ حق پہ ان کی پائیداری دیکھتے جاؤ رہی ہے عمر بھر تک جد جاری دیکھتے جاؤ ذرا ابنِ علی کی ذوالفقاری دیکھتے جاؤ مسلمانوں کی سچی علمگاری دیکھتے جاؤ عدوہائے محمد کا شکاری دیکھتے جاؤ مجاہدِ مرد کی صورت پیاری دیکھتے جاؤ گزاری جس نے حق پر عمر ساری دیکھتے جاؤ تاسف، حزن، حسرت انکساری دیکھتے جاؤ



## آج تک مہکے دماغوں میں

اور پھر بار بار کیا کہیئے  
جو تھے باغ و بہار کیا کہیئے  
خوبیاں بے شمار کیا کہیئے  
اور اپنوں سے پیار کیا کہیئے  
وہ رہا شعلہ بار کیا کہیئے  
منزل و رہ گزار کیا کہیئے  
جان و دل سے نثار کیا کہیئے  
اس نے دیوانہ وار کیا کہیئے  
ہر جگہ شہسوار کیا کہیئے  
ہائے وہ حسنِ یار کیا کہیئے  
گیسوئے مشکبار کیا کہیئے  
مرگِ احسنِ شعار کیا کہیئے  
ہم ہیں سب سوگوار کیا کہیئے  
آنکھیں ہیں اشکبار کیا کہیئے  
اب نہیں باز گار کیا کہیئے  
ہر کوئی بے قرار کیا کہیئے  
یاس سے ہمکنار کیا کہیئے  
شبِ تیرہ و تار کیا کہیئے  
ہر تنفس ہے بار کیا کہیئے  
کب نئے گا پکار کیا کہیئے

اے دل بے قرار کیا کہیئے  
ذکر کرنا پڑا مجھے ان کا  
تصنیں ستودہ صفات کے اندر  
دشمنوں کے لئے قیامت تھا  
خرمنِ ارتدار پر برسوں  
ہیں شناسا قدم سے اسکے  
اپنے نانا کی ہر ادا پر وہ  
کب نہ دار و رسن کو چوم لیا  
وہ خطابت ہو یا سیاست ہو  
وہ جلال اسکا وہ جمال اسکا  
آج تک ہے مہک دماغوں میں  
اک قیامت تھا اس کا جانا بھی  
اے امیرِ وطن تیرے غم میں  
دل ٹپتے ہیں سینوں کے اندر  
یہ فضائے چمن پرندوں کو  
ہر طرف جس ہے گھٹن سی ہے  
ہر کھلی شاہ جی، گلستان کی  
روشنی کی تلاش ہے ہمکو  
ضبط کا حوصلہ نہیں باقی  
اے خداوندِ بیقراراں کو



## "ڈیمیاگاک"....؟

عربی زبان کا ایک محاورہ ہے۔ الفضل باشدت بہ الاعداء کہ عظمت وہ ہے جس کا اعتراف دشمن بھی کریں۔ اور اس محاورہ کی یاد اس نسبت سے آئی کہ پچھلے دنوں مشہور انگریز مصنف ڈبلیو سی اسمتھ (W.C. Smith) کی کتاب "ماڈرن اسلام ان انڈیا" (Modern Islam in India) مطبوعہ ۱۹۴۶ء پڑھ رہا تھا۔ اس میں وہ احرار پارٹی کے زیر عنوان حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نور اللہ مرقدہ کے بارے میں لکھتا ہے۔

"This remarkable man might lay claim to being India's most effective demagogue" (1)

"ڈیمیاگاک" Demagogue یونانی لفظ ہے۔ Demos یونانی زبان میں عوام کو کہتے ہیں اور agoagos رہنمائی یا رہنما کو۔ انگریزی زبان میں یہ لفظ "a popular and a factious orator" کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ (۲) یعنی ایک مقبول عوام رہنما اور زبردست مقرر۔ Collins English Gem Dictionery میں اس کے معنی "Mob leader or agitator" کے دیے گئے ہیں۔ (۳) یعنی ایک بڑا رہنما یا ہیٹیئر۔

شاہ جی اپنی ذات میں واقعی ایک زبردست "ڈیمیاگاک" Demagogue تھے۔ آپ کی زندگی ایک بہت بڑے انقلاب اور مجاہد کی زندگی ہے۔ جس نے انگریزی استبداد کے پہاڑ سے ٹکرا کر اسکی ہیبت مٹا دی۔ دنیا ان کی بوقلموں شخصیت پر ایک عرصہ تک لکھتی رہے گی اور ہر بار ایک تشنگی سی موس کرے گی۔ شاہ جی اپنے سوانح خود لکھتے تو ٹالٹالانی کی خود نوخت یا ابوالکلام کے غبار خاطر کی برابر کی چیز ہوتی۔ اب مستقبل کا سوانح نگار جو کچھ بھی لکھے گا وہ اس کی تمام تر منت کے باوجود شاید مکمل نہیں ہوگا۔

شاہ جی کی تحریروں کی کمیابی کے دو باعث ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاہ جی بہت کم لکھتے اور غیر ضروری خط و کتابت سے اجتناب برتتے تھے۔ دوسرا انہیں چھپنے چھپانے سے طبعاً بعد تھا۔ آغا شورش کاشمیری ان کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔ "تمام عمر کسی عنوان سے اخبارات میں کوئی بیان نہ دیا۔ اس اعتبار سے ان کی زندگی میں ایک دلچسپ خوشی تھی۔ مجلس احرار نے اپنا اخبار جاری کیا لیکن وہاں بھی ان کی منشا تھی۔ قلم نہیں!راقم کے علم میں صرف ایک مثال ایسی ہے جو اس سے مستثنیٰ ہے اور وہ ایک خط ہے جو پاکستان بن جانے کے بعد روزنامہ آزاد میں ان کے قلم سے نکلا۔" (۴)

سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا وہ بھی زمانہ کی دست برد کی نذر ہو چکا اور اب لے دے کے اک حسرت نامہ باقی ہے۔

شاہ جی جب زندہ تھے تو ان کے حریف استعمار کو اعتراف کرنا پڑا کہ "یہ غیر معمولی انسان،

ہندوستان کی سب سے زیادہ اثر آفریں شخصیت ہونے کا نہایت قوی دعویٰ کر سکتا ہے۔"

اور جب استقلال ہوا تو اپنی قوم کے سربراہ، ایوب خاں نے کہا

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات حسرت آیات پر مجھے بے حد صدمہ ہوا ہے۔ شاہ جی جنگ آزادی اور اسلام کے زبردست مجاہد تھے۔ قدرت نے آپ کو علم و فصاحت کی نعمتیں ودیعت کی تھیں۔ موت نے ہم سے ایک عظیم شخصیت چھین لی ہے۔"

(۱) "ماڈرن اسلام ان انڈیا" ص ۲۲۶ از ڈبلیو سی اسمتھ مطبوعہ لندن ۱۹۳۶ء

(۲) چیمبرز ڈکشنری لفظ ڈیمآگگ (Demagogue) مطبوعہ ۱۹۶۰ء

(۳) کولنز انگلش جیمز ڈکشنری ص ۱۳۰ (مطبوعہ ۱۹۶۹ء)

(۴) "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" ص ۱۱۹ از شورش کاشمیری، اشاعت جدید ۱۹۷۳ء

سید عطاء الرحمن بخاری

وہ ایک شخص.....

وہ سادہ سا، دلیر سا

وہ ایک شخص... شیر سا

کہاں گیا؟

زمین کھا گئی اسے

کہ یا سے نکل گئے

وہ میرا دل اجاڑ کر

کہاں گیا؟

محبتوں کی تیز لو جلا گیا

لطفاتوں کی نرم رو بہا گیا

کتنا فتوں کو چیرتا، دلوں کو نور دے گیا

کہ وہ شعور دے گیا

جو آج بھی جہاں نو میں

فاصلوں، مسافتوں، جہالتوں کے باوجود

سعی و جہد کے سفر میں

قافلوں کی رہ گز میں

اک منار نور ہے

ماہنامہ نقیب ختم نبوت کا امیر شریعت نمبر (جلد اول)

## آراء و افکار

کی روشنی میں

لندن سے مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کا مکتوب گرامی

محترم سید کفیل بخاری صاحب۔ سلام سنوں!

ماہنامہ نقیب ختم نبوت کے امیر شریعت نمبر (جلد اول) سے نوازنے کی عنایت آپ نے فرمائی اور اس سے یہ انکشاف ہوا کہ آپ مولانا عطاء الرحمن بخاری صاحب کے بھائی نہیں ان کی ہم شیر ہکے فہمند ہیں۔ اور پھر اسی انکشاف کے ساتھ بچپن کی ایک یاد بھی ذہن میں ابھری کہ بریلی میں شاہ جی رحمہ اللہ ہمارے مکان پر ایک دفعہ شریعت لائے تھے تو اس سے پہلے یا اس کے بعد میں نے گھر میں ایک خوبصورت پلنگھرمی (شاید مع کیے اور بستر کے) دیکھی تو والدہ ماجدہ (مرحومہ) سے پوچھا کہ یہ کس کے لئے ہے؟ انہوں نے مجھے بتایا کہ: "یہ شاہ عطاء اللہ صاحب بخاری کی بیٹی کے لئے تمہارے والد نے منگوائی ہے۔ بتاتے ہیں کہ وہ اُن کی بست چیمٹی بیٹی ہیں۔" یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ کی والدہ ہی تھیں۔ (۱) میں نے سب سے پہلے آپ کی والدہ ماجدہ کا مضمون پڑھا ہے۔ اللہ اُن کا سایہ آپ بھائیوں پر سلاست رکھے۔ تاہم جن شاہ صاحب کی بیٹی کے لئے میرے والد ماجد (۲) نے بس محبت کا اظہار فرمایا ان کے کسی نواسے بلند اقبال کے لئے میری طرف سے بجز دعائے خیر کے اور کسی چیز کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ بلکہ یہ یاد نہ بھی آتی تب بھی محض یہ انکشاف جو امیر شریعت نمبر سے ہوا اس کا بھی حکم ناظرین

۱۔ حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی ایک ہی بیٹی زندہ رہیں جو میری والدہ ہیں۔ باقی بیٹیاں کم سنی میں ہی انتقال کر گئی تھیں۔ (مدیر)

۲۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ۔

میرے لئے یہی ہوتا۔ کیونکہ ہم لوگوں نے ہمیشہ شادی کے لئے اپنے دلوں میں عزت اور محبت ہی موسیٰ کی ہے۔ اور پھر ان کی اولاد کے سلسلے میں اس عزت و محبت کا پاس کرنا تو وہ عام انسانی فطرت یا کمزوری ہے کہ اس کے زور پر شیعہ کا جادو ہم سنیوں کے سر پر چڑھ کے بولا ہے۔

امیر شریعت نمبر کی دوسری جلد کے لئے کچھ لکھنے کی آپ کی فرمائش میرے لئے اعزاز ہے۔ تین چار بار انہیں دیکھا اور سنا۔ میرا حافضہ بہت خراب ہے تاہم پورے بھروسے کے ساتھ ان کی دو باتیں یاد ہیں۔

ایک۔ بریلی میں طے کے دوران میں سالار اعظم احرار سے (غالباً محمد لطیف اُن کا نام تھا) اسٹیج ہی سے مخاطب ہو کر باواز بلند فرمانا کہ: "لطیف وردی اتار لوں گا"۔ اور دوسری لکھنؤ کی احرار کانفرنس (غالباً ۱۹۳۶ء) میں (جبکہ میری عمر ۹-۱۰ برس کی ہوگی) اُن کا دورانِ تقریر اپنی داڑھی پر ہاتھ لے جا کر فرمانا کہ: "تمہیں یہ جڑواں گنگاماں پسند آئے گا۔ تمہیں تو چھلی گندیری چاہیئے"۔

حقِ مغفرت کرے عجب آزار و دعا

اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور دنیا و آخرت کی کامرانیاں نصیب کرے۔ (آمین)

والسلام

عتیق الرحمن سنہلی لندن



ماہنامہ نقیب ختم نبوت کے امیر شریعت کی یاد میں خصوصی اشاعت پر ہدیہ تہنیت پیش کرتا ہوں۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجلس احرار اسلام کو ۳۸ء میں ختم کر دیا تھا اس کذب و افتراء کی اشاعت میں بعض شرعی جہرے بھی پیش پیش ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ "صاحبِ الہیت اور بی مافیہ" کے اصول کے مطابق فائدہ ان امیر شریعت کا قول اس بارہ میں قبول فیصل کی حیثیت کا حامل ہے۔ پھر آپ نے اس خصوصی اشاعت میں شاہ جی رحمہ اللہ تعالیٰ کے اُن خطوط کو شائع کر کے جن میں شاہ جی نے جماعتی پالیسی کو بیان کیا اور ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "مجلس کا قیام و بقا بہر حال ایک شرعی امر ہے" ان حضرات کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا ہے۔

۵۸ء کو جب جماعت سے پابندی ختم کر دی گئی تھی تو شاہ جی رحمہ اللہ تعالیٰ نے چوک گھنٹہ گھر ملتان میں اپنے ہاتھ سے پرچم کشائی کی تھی۔ یہ گنگار اپنے طالب علمی کے زمانہ میں اس تقریب میں خود موجود تھا۔ پھر ماسٹر تاج الدین انصاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی سٹیج پر تقریر کی تھی اور ان کی تقریر سے قبل برادر محترم مولانا سید عطاء الرحمن بخاری زید لطف نے قرآن مجید کی تلاوت کی تھی۔ اور پھر یہ بھی اتفاق ہو گیا کہ اسی یوم باغ لاگے خان میں جماعتِ اسلامی کا جلسہ بھی تھا۔ جو لوگ جماعتِ اسلامی کی پالیسی سے متاثر تھے وہ یہ کہتے تھے کہ مجلس احرار اسلام سے حکومت نے پابندی اس لئے ختم کی ہے تاکہ یہ لوگ جماعتِ اسلامی کا مقابلہ کریں کیونکہ حکومت جماعت کی سیاسی قوت سے خوف زدہ ہے۔ پھر انہی دنوں میں مجلس احرار اسلام نے دوسرا جلسہ حسین آگاہی میں منعقد کیا۔ جس میں محترم شیخ حسام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ تشریف لائے تھے۔ لیکن اس رات سنت بارش ہونے کی وجہ سے جلسہ جلد ہی برخاست ہو گیا۔ اور انہی دنوں روزنامہ "آزاد" کی ایک خصوصی اشاعت میں شاہ جی کی یہ پرچم کشائی والی تصویر بھی ثبت تھی۔

ہر حال آپ نے یہ ضمیمہ نمبر شائع کر کے نہ صرف حضرت امیر شریعت کی حیات کے مختلف گوشوں کو نئی نسل کے سامنے اٹھا کر کیا ہے بلکہ ان کی جماعت مجلس احرار اسلام کی تاریخ بھی محفوظ کر دی ہے۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مولانا عبدالحق - رحیم یار خاں



حضرت شاہ جی فرمایا کرتے تھے کہ علماے دیوبند نے یہ کب کہا ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری مانند ہیں۔ آپ علیہ السلام کا اپنا فرمان ہے کہ:

ایکم مثلی۔

”کون ہے تم میں میری مثل؟“ شاہ جی اس پر مزاحاً فرماتے تھے کہ میں کھتا ہوں:

ایکم مثلی۔

”تم میری مثل لے آؤ۔“ جب ایک اسی کی مثل نہیں ہے تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثل کہاں ہے؟

اگرچہ حضرت شاہ جی اپنے متعلق یہ بات مزاحاً کرتے تھے مگر آج سوچئے کہ حقیقت میں آپ کتنی ہی بات فرما گئے ہیں۔ شاہ جی کی مثل تو الگ بات ہے کہ یہ ناممکن ہے۔

کل یوم ابتر۔

مگر جن اسلاف کے ہم اخلاف ہیں خدا کرے کہ ہمارا یہ روحانی تعلق تازیت بلکہ تاخیر کا نام ہے۔ جب یہ بڑی بات سوچنا ہوں تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ ایمان اور اسلام کے ڈاکو ہر دن نئے ہتھیاروں سے لیس ہو کر ابلتھی فتنوں کی بھرمار کر رہے ہیں۔ وی سی آر اور ویڈیو فلم صالحین کے گھرانوں تک کو ویران کر رہی ہیں۔ استغفر اللہ۔ سچ فرمایا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے:

یصبح الرجل مومنًا ویمسی کافرًا، ویمسی مومنًا ویصبح کافرًا۔

”کہ آدمی صبح کو مومن اٹھے گا شام کو کافر ہوگا۔ شام کو مومن ہوگا صبح کو کافر اٹھے گا۔“ اذھما قال علیہ السلام۔

ارشاد احمد دیوبندی ظاہر پیر صلح رحیم یار خاں



یوں تو امیر شریعت نمبر کا ایک ایک لفظ سچے سوتیوں کی مانند ہے مگر! محترمہ و مکرمہ بنت امیر شریعت سیدہ ام کفیل مدظلہا کی تحریر ”تری حیات ہے قدیل رہ دکھاتی ہے“ میں پیار و محبت، خلوص و شفقت کا ایک سمندر موجزن ہے۔ پاکباز و عفت باب بیٹی نے اپنے انتہائی شفیق و عظیم باپ کا تذکرہ کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ میں اس تحریر کو بمشکل چار قسطوں میں پڑھ سکا۔ ایک دو بیر سے پڑھتا تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور ہچکی بندھ جاتی۔ مزید پڑھنے کی ہمت نہ رہتی۔ یہ سب خاندان امیر شریعت کے خلوص اور للہیت کا نتیجہ ہے۔ خدا کرے ہم سب زندگی کے آخری سانچوں تک حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے راستے پر چلتے رہیں اور قیامت کے دن ان ہی کے ساتھ ہمارا احشر ہو۔

ابوسفیان نائب حاصل پور منڈی

”امیر شریعت نمبر“ موصول ہوا۔ از حد فکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ پر عنایت خاص فرمائی۔ اللہ پاک آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ نمبر میں آپ کا لولہ یہ اور محترمہ خالد جان (بنت امیر شریعت) کا مضمون لاجواب ہیں۔ اگرچہ مضمون اشاعت سے پہلے میری نظر سے گزر چکا تھا لیکن اس کے باوجود میں اسے چار پانچ دفعہ پڑھ چکا ہوں۔ بالخصوص سکھر جیل میں ملاقات کا واقعہ بہت زیادہ اثر انگیز ہے۔ اور اسے پڑھ کر کئی دفعہ پنجابی کا یہ ماہیا بے اختیار زبان پر آیا کہ:

بیری      نال      بور      ہوسی

ساڈے ول کنڈ کر کے ماہیا رویا ضرور ہوسی

اُن کی شاہ جی سے روح کی گھمرائیوں میں ڈوبی ہوئی اٹوٹ محبت پورے مضمون پر جا بجا پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ پھر حافظ ایسی نعمت خدا داد کا بھر پور اظہار اور اس پر اسلوب نگارش مستزاد ہے۔ اللہ پاک انہیں صحت کاملہ عاجلہ سے نوازے اور اُن کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر سلاست رکھے (آمین)۔ میں پہلے بھی کئی دفعہ آپ سے گزارش کر چکا ہوں اور اب بھی دست بستہ تہی ہوں کہ:

”خدا! ان کی یادداشتوں کو محفوظ کرنے کا اہتمام کریں۔ شاہ جی سے وابستہ یادیوں اور مجلس احرار اسلام اور اکابر احرار سے متعلق حالات و واقعات کا ایسا ذخیرہ ہمیں کمال سے میسر آئے گا۔ اُن کا دم غیبت ہے اور اُن سے پوری طرح استفادہ کرنے کا اہتمام ہر لحاظ سے ضروری ہے۔

محمد عرفان قریب      تہ گنگ



دینی عیافت میں منقر وقت میں ذبیح نام و مقام پانیوالے ماہنامہ ”نقیب تم نبوت“ ملتان کا ۶۴۰ صفحات پر مشتمل امیر شریعت نمبر، بلاشبہ رئیس ادارہ حضرت مولانا سید عطاء الرحمن بخاری اور نوجوان فاضل ریہ پنجاب سید محمد کفیل بخاری کے لئے وجہ اعزاز و تبریک ہے۔

حضرت امیر شریعت قدس سرہ تاریخ کی اُن نابغہ روزگار اور بے غری شخصیات میں سے ایک تھے جو تاریخ کا صرف حصہ نہیں بنیں بلکہ خود تاریخ اُن کے کارناموں سے مرتب ہوتی اور سنورتی ہے حضرت شاہ صاحب اقدم خطابت کے دو فرمانروا اور تاجدار تھے کہ برصغیر کے بڑے بڑے خطباء و سحر طراز مقررانہی بارگاہ میں ایک ادنیٰ درباری کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مقرر کو شادابی کے بعد تقریر کا حوصلہ ہوتا تھا۔ برصغیر کے شعلہ بیاں اور آتش نوا خطباء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ، نواب بہادر یار جنگؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے حضرات کے نام ضرور آتے ہیں لیکن ان ائمہ خطابت میں بخاری کا مقام سب سے برتر اور بلند تر ہے۔ آپ بلاشبہ پچھلی صدی میں آیہ ”من آیات اللہ کا مصداق تھے، قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ انسانیت کے لئے باعث رشک صفات کو عطاء اللہ شاہ کا وجود دے دیا تھا۔ ایمان و ایقان، توکل و عزیمت، بصیرت و فراست، حجت و غیرت، اخلاص و ہمت، تہذیب و شجاعت، ایثار و ریاضت، نظم و خطابت، احساس لطافت

محبت و شرافت، فخر و استغناء، علم و حیا، جو و وسوسا، فقر و رضا — کوئی ایسی نعمت تھی جس سے اس درویش سنی آگاہ کا دامن مالا مال نہ تھا اور پھر اس مردِ حُر نے دین و ملت اور قوم و وطن پر اپنے دامن کے ان موتوں کو یوں بچھا دیا کہ کوڑوں افراد کو بخاری کی حیثیت شجاعت اور حرارت ایمانی کی روانے جیل اوڑھا دی۔ نصف صدی پر غیظ اس عبقری صفت مجاہد کی خدمات کا احاطہ، "نقیب ختم نبوتہ کی ایک شامت کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس پورے نمبر کے مطالعہ کے بعد بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید ابھی کتاب بخاری کا ایک ہی ورق سنے آیا ہے۔ ہر ورق تمام جہاں اور مدح باقی ہے۔" امیر شریعت نمبر میں یوں تو ایک ایک مضمون بڑھ کر ہے مگر جس مضمون پر ان بطور کا عاجز و راقم بھی اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا، وہ نہایت امیر شریعت سیدہ ام کفیل زید مجدہا کا تری حیات ہے قذیل .... ہے۔ اس مضمون میں اس مجاہدِ حریت کے صبر و استقامت، تسلیم و رضا اور پھر زندگی کے آخری لمحات کی بے بسی کی تصویر کچھ اس انداز سے کھینچی ہے کہ بڑھ کر آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی حضرت شاہ صاحب کی عظمت و محبت کا نقش کچھ اور گہرا ہو جاتا ہے۔ امیر شریعت نمبر میں اگر صرف یہی مضمون ہوتا تو بلاشبہ یہ "نمبر کھلائے کا مستحق تھا مگر مدیر محترم نے امیر شریعت کی زندگی پر ایک "سوانح تاریخی مضامین اور ہم کے قریب معیاری نگہیں جمع کر کے اسے تاریخی حیثیت دے دی ہے اور پھر یہ نوید بھی سنائی ہے کہ عنقریب امیر شریعت نمبر حصہ دوم بھی منظرِ عام پر آئے والا ہے۔ ہر خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ہم اس تاریخی دستاویز کے مطالعہ کی درخواست ہر اس قاری سے کرتے ہیں جو گزشتہ پچاس سالہ حفاظتِ دین اور استغلاصِ وطن کی تحریکِ جدوجہد سے شعوری اقیقت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

(مولانا محمد اظہر مدیر ماہنامہ "الخان" ملتان)

رئیس الاحرار، امیر شریعت  
سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے  
سوانحی نقوش، انگریزی میں پہلی بار

بخاری اکیڈمی، میرپور کالونی، ملتان

قیمت 50 روپے





## امیر شریعت کا خطبہ مسنونہ

حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اپنے خطاب اور تقریر سے پہلے اپنے مخصوص وجد آفرین اور سحر طراز لہجے میں عموماً یہ خطبہ مسنونہ پڑھا کرتے تھے۔

الْحَمْدُ لِلّٰهِ ، الْحَمْدُ لِلّٰهِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۔ نَحْمَدُهُ وَنُثَنِّئُهُ  
وَلَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا  
وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مِنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمِنْ يُضِلُّهُ فَلَا  
هَادِيَ لَهُ ۔ وَلَنُثْهَكُنَّ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ ۔ وَحْدَهُ ، وَحْدَهُ  
لَا شَرِيكَ لَهُ وَلَا نَصِيرَ لَهُ ، وَلَا مِثْلَ لَهُ وَلَا مِثَالَ لَهُ وَلَا مِثِيلَ  
لَهُ وَلَا نِدْلَ لَهُ وَلَا ضِدْلَ لَهُ وَلَا إِلَهَ غَيْرُهُ وَلَنُثْهَكُنَّ أَنْ سَيِّدَنَا  
وَسَدَنَنَا وَشَفِيعَنَا وَرَحِيمَنَا وَكَرِيمَنَا وَهَادِيَنَا وَمُرْشِدَنَا وَمَوْلَانَا  
إِمَامَنَا الْأَتَقِيَاءَ وَسَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَخَاتَمِ الْأَنْبِيَاءِ إِمَامِ الْمُتَّقِينَ  
وَسَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ وَخَاتَمِ النَّبِيِّينَ بِالْيَقِينِ مُحَمَّدًا أَمِيرَ الْمُرْسَلِينَ  
وَخَاتَمِ النَّبِيِّينَ بِالْيَقِينِ مُحَمَّدًا عَبْدَهُ وَرَسُولَهُ لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ  
وَلَا رَسُولَ بَعْدَهُ وَلَا أُمَّةَ بَعْدَ أُمَّتِهِ وَصَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ  
خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَآزْوَاجِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ صَلَوةٌ  
تَكُونُ لِلتَّجَاةِ وَمِيسَلَةً وَلِعُمَلَاءِ الدَّرَجَاتِ كَيْفُتَّةٌ ۝ اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى

سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى  
 أَصْحَابِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى أَزْوَاجِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَوةٌ تُفَرِّجُ بِهَا  
 الْكُرْبُ وَتُعَلِّقُ بِهَا الْعُقُودُ وَتُقْضَى بِهِ الْحَوَائِجُ اللَّهُمَّ صَلِّ  
 عَلَى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَ  
 عَلَى أَصْحَابِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى أَزْوَاجِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ  
 صَلَوةٌ تَكُونُ لَكَ رِضَاءً أَوْ لِحِفْهِ آدَاءً - وَصَلِّ عَلَى جَمِيعِ الْأَنْبِيَاءِ  
 وَالْمُرْسَلِينَ وَالْمَلَائِكَةِ الْمُقَرَّبِينَ وَعَلَى عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ ه

يَا رَبَّ جَبَلٍ وَسَلَمٍ وَإِيمَانٍ أَبَدٍ  
 عَلَى حَبِيبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ  
 مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الْكَوْنَيْنِ وَالْثَقَلَيْنِ  
 وَالْفَرِيقَيْنِ مِنْ عَرَبٍ وَمِنْ عَجَمٍ  
 جَاءَتْ لِدَعْوَتِهِ الْأَشْجَارُ مُسَاجِدَةً  
 تَمْشِي إِلَيْهِ عَلَى سَاقٍ بِلَا قَدَمٍ

وَقَالَ حَسَّانُ بْنُ سَابِثٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فِي مَكْحَدِ النَّبِيِّ الْكَرِيمِ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

وَأَحْسَنُ مِنْدَلٍ لَمْ تَرْقُطْ عَيْنِي  
 وَأَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

خَلَقْتَ مُبْرَأً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ  
كَانَتْكَ فَتَدْخُلُوتُ كَمَا تَشَاءُ  
مُحَمَّدٌ بَشَرٌ وَلَيْسَ كَالْبَشَرِ  
بَلْ هُوَ يَا قُوتَةُ النَّاسِ كَالْحَجَرِ

أَمَّا بَعْدُ

فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ  
النَّبِيِّينَ ۝ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝

صَدَقَ اللَّهُ مَوْلَانَا الْعَظِيمَ وَصَدَقَ رَسُولُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيمُ وَ  
نَحْنُ عَلَى ذَلِكَ مِنَ الشَّاهِدِينَ وَالشَّاكِرِينَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

امیر جمع ہیں احباب درِ دل کہ لے

پھر التفاتِ دلِ دوستان رہے نہ رہے

اگر کسی مدد سے کا جملہ ہوتا تو عموماً یہ شعر پڑھا کرتے تھے

خوشا مجلس و مدرسہ و خانقاہ ہے

کہ دروے بود قیل و قالِ مُحَمَّد!

صدرِ محترم، بزرگانِ ملت، برادرانِ عزیز، میری قابلِ صدا احترام ماؤ! بہنو! اور بیٹو!



# سلاسلِ طریقت

- ۱ امیر المومنین ابوالحسن علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ (وصال ۲۱ رمضان ۳۰ھ)
- ۲ حضرت خواجہ ابی النصر حسن بصری (وصال ۴ محرم ۱۱۱ھ)
- ۳ حضرت خواجہ ابی الفضل عبدالواحد بن زید (وصال ۲ صفر ۱۷۰ھ)
- ۴ حضرت ابی الفیض فضیل ابن عیاض (وصال ۳ ربیع الاول ۱۷۰ھ / مزار جنت المعلی مکہ مکرمہ)
- ۵ حضرت خواجہ سلطان ابراہیم ادھم علی فاروقی (وصال ۲۶ جمادی الاول ۱۸۰ھ / مزار بلاد روم)
- ۶ حضرت خواجہ سید الدین حذیفہ مرغشی (وصال ۲۴ شوال ۲۵۲ھ.....)
- ۷ حضرت خواجہ امین الدین ابی ہبیرہ بصری (وصال ۷ شوال ۲۷۹ھ)
- ۸ حضرت خواجہ مشاد علودینوری (وصال ۴ محرم ۲۹۹ھ)
- ۹ سرسلسلہ چشتیہ حضرت خواجہ ابی اسحاق شامی چشتی (مرزا..... ملک..... شاہ..... / وصال ۳۴۳ھ)
- ۱۰ حضرت خواجہ سید ابی احمد ابدال ابن سلطان فرسافہ چشتی سید حسنی (ولادت ۳۶۰ھ وفات..... غرہ جمادی الثانی ۳۵۵ھ / مزار قصبہ چشت)
- ۱۱ حضرت خواجہ سید ابی محمد ابن خواجہ ابی احمد ابدال حسنی چشتی (وصال ربیع الثانی ۴۱۱ھ / مزار چشت)
- ۱۲ حضرت خواجہ سید ناصر الدین ابی یوسف نقوی چشتی خواہر زادہ حضرت ابی محمد (وصال ۴۵۹ھ / مزار چشت)
- ۱۳ حضرت خواجہ سید قطب الدین سوود ابن حضرت ابی یوسف نقوی چشتی (وصال غرہ رجب ۵۲۷ھ / مزار چشت)
- ۱۴ حضرت خواجہ مخدوم حاجی شریف زندنی (وصال ۱۰- رجب ۶۱۲ھ / عمر ۱۲۰ سال)
- ۱۵ حضرت خواجہ عثمان ہارونی (وصال ۵ شوال ۶۱۷ھ / مزار مکہ مکرمہ)
- ۱۶ حضرت خواجہ سید معین الدین حسن سنجر اجمیری رضوی (وصال ۱۳ ربیع الاول ۶۳۳ھ)
- ۱۷ حضرت خواجہ سید قطب الدین بختیار اوشی کاککی نقوی (وصال ۱۳ ربیع الاول ۶۳۳ھ- مہرولی)

شریف-دہلی)

- ۱۸ حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر اجدہنی فاروقی (۵۶۳ھ تا ۶۵۹ھ ۵۱ محرم پاک پتن)
- ۱۹ حضرت خواجہ سلطان الشائخ سید نظام الدین محمد بدایونی بخاری رضوی (۶۳۳ھ تا ۷۱۷ھ ۱۷ ربیع الثانی امزار مصافات دہلی)
- ۲۰ حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ اودھی دہلوی (۶۷۷ھ تا ۷۵۷ھ- ۱۳ رمضان- مزار دہلی)
- ۲۱ حضرت خواجہ کمال الدین دہلوی (وصال ۷۵۶ھ مزار دہلی.....)
- ۲۲ حضرت خواجہ سراج الدین بن خواجہ کمال الدین (وصال ۷۷۰ھ مزار پیران پٹن برکات پورہ گجرات)
- ۲۳ حضرت خواجہ علم الدین بن خواجہ سراج الدین (وصال ۸۹۵ھ مزار پیران پٹن گجرات)
- ۲۴ حضرت خواجہ محمود راجن بن خواجہ علم الدین (وصال ۹۰۰ھ مزار پیران پٹن گجرات)
- ۲۵ حضرت خواجہ جمال الدین جمن بن خواجہ محمود راجن (وصال ۹۸۰ھ مزار احمد آباد گجرات)
- ۲۶ حضرت خواجہ جمال الدین حسن محمد نوری (وصال ۹۸۲ھ مزار احمد آباد گجرات)
- ۲۷ حضرت خواجہ قطب شمس الدین محمد بن خواجہ حسن محمد (وصال ۱۰۴۱ھ مزار احمد آباد.....)
- ۲۸ حضرت خواجہ بجلی مدنی نبیرہ خواجہ محمد (وصال ۱۱۲۲ھ بمر ۱۱۲ سال مزار جنت البقیع مدینہ منورہ.....)
- ۲۹ حضرت خواجہ کلیم اللہ جہان آبادی (وصال ۲۴ ربیع الاول ۱۱۳۲ھ مزار دہلی.....)
- ۳۰ حضرت خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی (وصال ۱۱۳۲ھ مزار اورنگ آباد دکن)
- ۳۱ حضرت خواجہ فر الدین بن خواجہ نظام الدین (۱۱۳۲ھ تا ۱۱۹۹ھ- ۱۷ جمادی الثانی- مزار مہرولی شریف مصافات دہلی)
- ۳۲ حضرت خواجہ نور محمد مہاروی (۱۱۳۳ھ تا ۱۲۰۵ھ- ۳ ذی الحجہ- مزار چشتیاں بہاولپور)
- ۳۳ حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی (۱۱۸۳ھ تا ۱۲۶۷ھ- ۷ صفر- مزار تونسہ ضلع ڈیرہ غازیخان)
- ۳۴ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی (وصال ۱۳۰۰ھ- ۲۴ صفر- مزار سیال ضلع سرگودھا)
- ۳۵ حضرت پیر سید مہر علی شاہ حسنی گیلانی (۱۲۷۵ھ تا ۱۳۵۶ھ- ۲۹ صفر- گڑھ ضلع راولپنڈی)
- ۳۶ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ حسنی بخاری (یکم ربیع الاول ۱۳۱۰ھ تا ۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ- بمٹان)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

# سلسلہ عالیہ چشتیہ صابریہ امدادیہ

(۱)

شیخ المدنیین رحمۃ اللہ علیہم قائم النبیین حضرت سیدنا مولانا محمد رسول اللہ ﷺ



- |   |   |
|---|---|
| ۱ حضرت امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ | ۲۲ حضرت شیخ احمد عبدالمقن روولوی                    |
| ۲ حضرت خواجہ حسن بصری                                   | ۲۳ حضرت شیخ عارف روولوی                             |
| ۳ حضرت خواجہ عبد الواحد بن زید                          | ۲۴ حضرت شیخ محمد روولوی                             |
| ۴ حضرت خواجہ فضل بن عیاض                                | ۲۵ حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی                        |
| ۵ حضرت سلطان ابراہیم ادھم بلخی                          | ۲۶ حضرت شیخ جلال الدین سائیسری                      |
| ۶ حضرت خواجہ حدیث مرعشی                                 | ۲۷ حضرت شیخ نظام الدین بلخی                         |
| ۷ حضرت خواجہ ابومیسرہ بصری                              | ۲۸ حضرت شیخ ابوسعید گنگوہی                          |
| ۸ حضرت خواجہ مشاد علودینوری                             | ۲۹ حضرت شیخ محبوب اللہ آبادی                        |
| ۹ حضرت خواجہ ابواسحاق شامی                              | ۳۰ حضرت سید شاہ محمدی                               |
| ۱۰ حضرت خواجہ ابواحمد ابدال چشتی                        | ۳۱ حضرت شاہ محمد کی                                 |
| ۱۱ حضرت خواجہ ابو محمد چشتی                             | ۳۲ حضرت شاہ عہد الدین امرہوی                        |
| ۱۲ حضرت خواجہ ابویوسف چشتی                              | ۳۳ حضرت شاہ عبدالہادی امرہوی                        |
| ۱۳ حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی                      | ۳۴ حضرت شاہ عہدالبارہ امرہوی                        |
| ۱۴ حضرت خواجہ حاجی شریف زندنی                           | ۳۵ حضرت شاہ عبد الرحیم شہید ولانی                   |
| ۱۵ حضرت خواجہ عثمان ہارونی                              | ۳۶ حضرت میانہو نور محمد جھنجھانوی                   |
| ۱۶ حضرت خواجہ معین الدین حسن سنہری                      | ۳۷ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ ماجری           |
| ۱۷ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی                     | ۳۸ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی         |
| ۱۸ حضرت شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر                    | ۳۹ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری  |
| ۱۹ حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر                  | ۴۰ قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری |
| ۲۰ حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی                      | ۴۱ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری          |
| ۲۱ حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی           |   |



## سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ گیسو درازیہ قدوسیہ امدادیہ

شیخ الذہبی رحمۃ اللہ علیہ قاتم النبیین حضرت سیدنا مولانا محمد رسول اللہ ﷺ



- |  |   |
|--|---|
| ۲۲ حضرت شیخ صدر الدین اودھی                        | ۱ حضرت امیر المؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ |
| ۲۳ حضرت شیخ علاء الدین اودھی                       | ۲ حضرت خواجہ حسن بصری                                   |
| ۲۴ حضرت شیخ ابن حکیم اودھی                         | ۳ حضرت خواجہ عبدالواحد بن زید                           |
| ۲۵ حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی                       | ۴ حضرت خواجہ فضیل بن عیاض                               |
| ۲۶ حضرت شیخ جلال الدین تانیسری                     | ۵ حضرت سلطان ابراہیم ادھم بلخی                          |
| ۲۷ حضرت شیخ نظام الدین بلخی                        | ۶ حضرت خواجہ حذیفہ مرعشی                                |
| ۲۸ حضرت شیخ ابوسعید گنگوہی                         | ۷ حضرت خواجہ ابومبیرہ بصری                              |
| ۲۹ حضرت شیخ مہذب اللہ آبادی                        | ۸ حضرت خواجہ مشاد علودینوری                             |
| ۳۰ حضرت سید شاہ محمدی                              | ۹ حضرت خواجہ ابواسحاق شامی                              |
| ۳۱ حضرت شاہ محمدکی                                 | ۱۰ حضرت خواجہ ابواحمد ابدال چشتی                        |
| ۳۲ حضرت شاہ عہد الدین امروہی                       | ۱۱ حضرت خواجہ ابو محمد چشتی                             |
| ۳۳ حضرت شاہ عبدالبادی امروہی                       | ۱۲ حضرت خواجہ ابو یوسف چشتی                             |
| ۳۴ حضرت شاہ عبدالباری امروہی                       | ۱۳ حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی                      |
| ۳۵ حضرت شاہ عبدالرحیم شید ولایتی                   | ۱۴ حضرت خواجہ حاجی شریف زندنی                           |
| ۳۶ حضرت میانمیر نور محمد جھنجھانوی                 | ۱۵ حضرت خواجہ عثمان ہارونی                              |
| ۳۷ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجرکی        | ۱۶ حضرت خواجہ معین الدین حسن سنہری                      |
| ۳۸ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی        | ۱۷ حضرت خواجہ قطب الدین مختار کاکلی                     |
| ۳۹ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری  | ۱۸ حضرت شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر                    |
| ۴۰ قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری | ۱۹ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء بدایونی                   |
| ۴۱ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری         | ۲۰ حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی                  |
|  | ۲۱ حضرت سید محمد حسین گیسو دراز گلبرگوی                 |

- ۱ حضرت امیر المؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ۱۹ حضرت سید احمد قدسی
- ۲ حضرت خواجہ حسن بصری ۲۰ حضرت مولانا محمد مغربی
- ۳ حضرت خواجہ حبیب عجمی ۲۱ حضرت سید عبدالحق
- ۴ حضرت خواجہ داؤد طائی ۲۲ حضرت سید الیاس مغربی
- ۵ حضرت خواجہ معروف کرخی ۲۳ حضرت سید شاہ قیص الا عظم قادری
- ۶ حضرت خواجہ سری سقطی ۲۴ حضرت سید شاہ محمد
- ۷ حضرت خواجہ جنید بغدادی ۲۵ حضرت سید ابو محمد
- ۸ حضرت شیخ ابوبکر شبلی ۲۶ حضرت سید محمد طوٹ
- ۹ حضرت عبد الواحد بن عبد العزیز تمیمی ۲۷ حضرت سید عبدالحق
- ۱۰ حضرت شیخ ابوالفرح طرطوسی ۲۸ حضرت سید عبد الرزاق
- ۱۱ حضرت شیخ ابوالحسن علی البکھاری ۲۹ حضرت سید رحم علی شاہ قیصی
- ۱۲ حضرت شیخ ابوسعید مزوی ۳۰ حضرت سید حاجی عبد الرحیم نعید ولایتی
- ۱۳ طوٹ الثقلین حضرت سید عبد القادر جیلانی ۳۱ حضرت میانجو نور محمد جھنما نوی
- ۱۴ حضرت سید عبد الرزاق القادری ۳۲ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ ماجرکی
- ۱۵ حضرت سید زین الدین ۳۳ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی
- ۱۶ حضرت سید یحیی زاهد ۳۴ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم راسپوری
- ۱۷ حضرت سید عبد الوہاب ۳۵ قطب الارشاد حضرت شاہ عبد القادر راسپوری
- ۱۸ حضرت سید عبد القادر ۳۶ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

# سلسلہ عالیہ قادریہ مجددیہ غفوریہ رحیمیہ

(۴)

شیخ المذنبین رحمۃ اللہ علیہم عالم الشیخین حضرت سیدنا مولانا محمد رسول اللہ ﷺ



- ۱ حضرت امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ
- ۲ حضرت خواجہ حسن بصری
- ۳ حضرت خواجہ حبیب عجمی
- ۴ حضرت خواجہ داؤد طائی
- ۵ حضرت خواجہ معروف کرخی
- ۶ حضرت خواجہ سرری سقنی
- ۷ حضرت خواجہ جنید بغدادی
- ۸ حضرت شیخ ابوبکر شبلی
- ۹ حضرت شیخ عبدالواحد بن عبدالعزیز تلمیسی
- ۱۰ حضرت شیخ ابوالفرح طرطوسی
- ۱۱ حضرت شیخ ابوالحسن علی البکری
- ۱۲ حضرت شیخ ابوسعید غزوی
- ۱۳ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی
- ۱۴ حضرت سید عبدالرزاق
- ۱۵ حضرت شاہ شرف الدین قتال
- ۱۶ حضرت سید عبدالوہاب
- ۱۷ حضرت سید بساؤدہ دہلوی
- ۱۸ حضرت سید شاہ عقیل
- ۱۹ حضرت شاہ شمس الدین عسکرائی
- ۲۰ حضرت شاد گدار محمد بن ابی الحسن
- ۲۱ حضرت شمس الدین عارت
- ۲۲ حضرت شاد گدار طین ثانی
- ۲۳ حضرت شاہ فضیل
- ۲۴ حضرت شاہ کمال کیستلی
- ۲۵ حضرت شاہ سکندر کیستلی
- ۲۶ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی
- ۲۷ حضرت سید آدم بنوری
- ۲۸ حضرت شاہ حبیب پٹاوری
- ۲۹ حضرت شاہباز پٹاوری
- ۳۰ حضرت شاہ مومن لکڑی
- ۳۱ حضرت محمد صدیقی شیرازی
- ۳۲ حضرت حافظ محمد صاحب
- ۳۳ حضرت محمد شعیب تورڈھیری
- ۳۴ قطب الدار فین حضرت خاندہ عبدالغفور صاحب سوات
- ۳۵ قطب الاقطاب حضرت سیاحید عبدالرحیم سہانپوری
- ۳۶ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری
- ۳۷ قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری
- ۳۸ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

رحمت اللہ علیہم اجمعین

# سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ آفاقیہ اوراد و سہ

شیخ الذہبی رحمۃ اللہ علیہ خاتم النبیین حضرت سیدنا مولانا محمد رسول اللہ ﷺ

- |  |  |
|--|--|
| ۱۸ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار                      | ۱ حلیف رسول اللہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ |
| ۱۹ حضرت مولانا محمد زاہد                           | ۲ صاحب رسول حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ      |
| ۲۰ حضرت خواجہ درویش محمد                           | ۳ حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر                 |
| ۲۱ حضرت مولانا خواجگی بکلی                         | ۴ حضرت جعفر صادق                               |
| ۲۲ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ                      | ۵ حضرت سلطان بایزید بسطامی                     |
| ۲۳ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی              | ۶ حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانی                   |
| ۲۴ حضرت خواجہ محمد معصوم                           | ۷ حضرت خواجہ ابوعلی فارمدی                     |
| ۲۵ حضرت خواجہ محمد نقشبند ثانی                     | ۸ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی                       |
| ۲۶ حضرت خواجہ محمد زبیر                            | ۹ حضرت خواجہ عبدالخالق غمدوانی                 |
| ۲۷ حضرت خواجہ ضیاء اللہ                            | ۱۰ حضرت خواجہ عارف ریوگری                      |
| ۲۸ حضرت شاہ محمد آفاق دہلوی                        | ۱۱ حضرت خواجہ محمود انجیر فغنوی                |
| ۲۹ حضرت مولانا نصیر الدین دہلوی                    | ۱۲ حضرت خواجہ عزیزان علی رامیتنی               |
| ۳۰ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجرکی        | ۱۳ حضرت خواجہ محمد بابا ساسی                   |
| ۳۱ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی        | ۱۴ حضرت سید میر کھل                            |
| ۳۲ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری  | ۱۵ حضرت سید بہاء الدین نقشبند                  |
| ۳۳ قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری | ۱۶ حضرت خواجہ علاء الدین عطار                  |
| ۳۴ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری         | ۱۷ حضرت مولانا یعقوب چرنی                      |

# سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ ولی اللہیہ امدادیہ ⑥

شیخ المذنبین رحمۃ اللعالمین خاتم النبیین حضرت سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ

- |    |  |    |  |
|----|--|----|--|
| ۱  | قلید رسول اللہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ | ۲۲ | حضرت سید بہاء الدین نقشبند                       |
| ۲  | صاحب رسول حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ      | ۲۳ | حضرت خواجہ علاء الدین عطار                       |
| ۳  | حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر                 | ۲۴ | حضرت مولانا یعقوب چرخ                            |
| ۴  | حضرت جعفر صادق                               | ۲۵ | حضرت خواجہ عبید اللہ احرار                       |
| ۵  | حضرت موسیٰ کاظم                              | ۲۶ | حضرت مولانا محمد زاہد                            |
| ۶  | حضرت علی رضا                                 | ۲۷ | حضرت خواجہ درویش محمد                            |
| ۷  | حضرت خواجہ معروف کرخی                        | ۲۸ | حضرت مولانا خواجہ مکی المکھی                     |
| ۸  | حضرت خواجہ سرسقطی                            | ۲۹ | حضرت خواجہ محمد باقی باہد                        |
| ۹  | حضرت خواجہ جنید بغدادی                       | ۳۰ | حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد البت ثانی              |
| ۱۰ | حضرت خواجہ ابوبکر شبلی                       | ۳۱ | حضرت سید آدم بنوری                               |
| ۱۱ | حضرت خواجہ ابوالقاسم لصر آبادی               | ۳۲ | حضرت سید عبد اللہ اکبر آبادی                     |
| ۱۲ | حضرت خواجہ ابوعلی وقاق                       | ۳۳ | حضرت شاہ عبد الرحیم دہلوی                        |
| ۱۳ | حضرت امام ابوالقاسم قشیری                    | ۳۴ | حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی                     |
| ۱۴ | حضرت خواجہ ابوعلی فارمدی                     | ۳۵ | حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی                   |
| ۱۵ | حضرت خواجہ یوسف ہمدانی                       | ۳۶ | حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی                   |
| ۱۶ | حضرت خواجہ عبد الحاق غدوانی                  | ۳۷ | حضرت میانجو نور محمد جھنجھانوی                   |
| ۱۷ | حضرت خواجہ عارف ریوگری                       | ۳۸ | قلب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی       |
| ۱۸ | حضرت خواجہ محمود انجیر فغنوی                 | ۳۹ | قلب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی         |
| ۱۹ | حضرت خواجہ عزیزان علی رامیتنی                | ۴۰ | قلب العالم حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری  |
| ۲۰ | حضرت خواجہ محمد بابا ساسی                    | ۴۱ | قلب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری |
| ۲۱ | حضرت سید میر کلال                            | ۴۲ | حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری          |

رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

سید محمد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ۲۲ حضرت مولانا یعقوب چرخ

سید محمد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ۲۳ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار

۱ حضرت امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ۲۲ حضرت مولانا یعقوب چرخ

۲ حضرت خواجہ حسن بصری ۲۳ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار

۳ حضرت خواجہ حبیب عجمی ۲۴ حضرت مولانا محمد زاہد

۴ حضرت خواجہ داؤد طائی ۲۵ حضرت خواجہ درویش محمد

۵ حضرت خواجہ معروف کرخی ۲۶ حضرت مولانا خواجہ امجدی

۶ حضرت خواجہ سری سقطی ۲۷ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ

۷ حضرت خواجہ جنید بغدادی ۲۸ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی

۸ حضرت خواجہ ابوبکر شبلی ۲۹ حضرت سید آدم نبوری

۹ حضرت خواجہ ابوالقاسم لصر آبادی ۳۰ حضرت شیخ سعدی بخاری لاہوری

۱۰ حضرت خواجہ ابوعلی دقاقی ۳۱ حضرت شیخ محمد بنی امی

۱۱ حضرت امام ابوالقاسم قشیری ۳۲ حضرت شیخ محمد عمر چکینی پشاور

۱۲ حضرت خواجہ ابوعلی فارمدی ۳۳ حضرت سید شاہ محمد سدوی

۱۳ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی ۳۴ حضرت خواجہ محمد صدیق بنیری

۱۴ حضرت خواجہ عبدالحق مجدوانی ۳۵ حضرت حافظ محمد صاحب

۱۵ حضرت خواجہ عارف ریوگری ۳۶ حضرت خواجہ محمد شعیب قورڈھیری

۱۶ حضرت خواجہ محمود انجیر فغنوی ۳۷ قطب المار فین حضرت اخوند عبد الغفور صاحب سوات

۱۷ حضرت خواجہ عزیزان علی راستی ۳۸ قطب الاقطاب حضرت میانجو عبد الرحیم سہانپوری

۱۸ حضرت خواجہ محمد بابا ساسی ۳۹ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائپوری

۱۹ حضرت سید میر کمال ۴۰ قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبد تقادر رائپوری

۲۰ حضرت سید بہاء الدین نقشبند ۴۱ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

۲۱ حضرت خواجہ علاء الدین عطار

رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

# ۸) سلام عالیه سهروردیه قدوسیه ولی التائبه ابدیه

شفیع الدین رحمت اللعالمین قائم السنین حضرت سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ

- ۱ حضرت امیر المؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ۱۹ حضرت سید بدیع ہمدانی
- ۲ حضرت خواجہ حسن بصری ۲۰ حضرت شیخ درویش بن قاسم اودھی
- ۳ حضرت خواجہ حبیب عجمی ۲۱ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی
- ۴ حضرت خواجہ داؤد طائی ۲۲ حضرت شیخ رکن الدین گنگوہی
- ۵ حضرت خواجہ معروف کرخی ۲۳ حضرت شیخ عبداللہ سرہندی
- ۶ حضرت خواجہ نسری سقطی ۲۴ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی
- ۷ حضرت خواجہ جنید بغدادی ۲۵ حضرت سید آدم بنوری
- ۸ حضرت خواجہ ممشاد علود بنوری ۲۶ حضرت سید عبداللہ اکبر آبادی
- ۹ حضرت شیخ احمد بنوری ۲۷ حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی
- ۱۰ حضرت شیخ ابو محمد بن عبداللہ ۲۸ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
- ۱۱ حضرت شیخ وجیہ الدین عبدالقادر سهروردی ۲۹ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی
- ۱۲ حضرت شیخ ضیاء الدین ابوالنعب سهروردی ۳۰ حضرت سید احمد شیدائے بریلوی
- ۱۳ حضرت شیخ شہاب الدین سهروردی ۳۱ حضرت میانجو نور محمد جمنجانوی
- ۱۴ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ۳۲ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجرکی
- ۱۵ حضرت شیخ صدر الدین عارف ملتانی ۳۳ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی
- ۱۶ حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح ملتانی ۳۴ قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم راسپوری
- ۱۷ حضرت سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیان ۳۵ قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر راسپوری
- ۱۸ حضرت سید اجمل ہمدانی ۳۶ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

## مدارس احرار اور مستقبل کے منصوبے

مجلس احرار اسلام، دینی انقلاب کی داعی جماعت ہے۔ یہ انقلاب دینی مزاج اور دینی ماحول پیدا کئے بغیر ممکن نہیں۔ اُکا بر احرار نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ یہ کام دینی مدارس میں ہی باحسن انجام دیا جاسکتا ہے۔ نئی نسل کی ذہن سازی اور تربیت کے لئے ان مدارس میں ایسا ماحول پیدا کیا جائے جو دینی انقلاب کی منزل کو قریب تر کر دے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے شعبہ تبلیغ کے ساتھ ساتھ شعبہ تعلیم بھی سرگرم عمل ہے اور درج ذیل مدارس تعلیم و تدریس میں مصروف ہیں۔

۱	مدرسہ ختم نبوت	مسجد احرار	ربوہ ضلع جھنگ فون: 211523
۲	بخاری پبلک سکول	" "	" "
۳	مدرسہ معورہ	جامع مسجد ختم نبوت	دار بنی ہاشم، مٹان فون: 511961
۴	مدرسہ معورہ	مسجد نور	تعلق روڈ مٹان
۵	مدرسہ محمودیہ	مسجد المعور	ناگڑیاں، گجرات
۶	دائر العلوم ختم نبوت	جامع مسجد چچا وطنی	فون: 2112
۷	احرار ختم نبوت مرکز	مسجد عثمانیہ	چچا وطنی
۸	مدرسہ ختم نبوت	مسجد ختم نبوت	شہزاد کالونی صادق آباد
۹	مدرسہ ختم نبوت	مسجد ختم نبوت	نواں چوک، گڑھا موڑ
۱۰	مدرسہ العلوم الاسلامیہ	جامع مسجد	گڑھا موڑ (دہاڑی) فون: 13
۱۱	مدرسہ ابو بکر صدیق	جامع مسجد ابو بکر صدیق	تہ گنگ (چکوال)
۱۲	بستان خائشہ (برائے طالبات)		دار بنی ہاشم، مٹان فون: 511356
۱۳	مدرسہ البنات (برائے طالبات)		گڑھا موڑ
۱۴	سادات اکیڈمی (برائے طلباء)		دار بنی ہاشم، مٹان
۱۵	مدرسہ احرار اسلام		بستی شام دین (قائم پور)
۱۶	مدرسہ احرار اسلام رحیمیہ		بستی گودڑی (حاصل پور)
۱۷	مدرسہ احرار اسلام		مسجد سیدنا علی المرتضیٰ، چکوالہ، ضلع میانوالی
۱۸	مدرسہ مسجد معاویہ	جھنگ روڈ	ٹوبہ ٹیک سنگھ

ان میں سے بعض مدارس اپنے اخراجات کے سلسلہ میں خود کفیل ہیں اور جماعت کی سرپرستی میں ہی کام کر رہے ہیں۔ جن مدارس کا کفیل مرکز ہے ان میں ہاشمہرہ تعلیم و تدریس اور دیگر امور سرانجام دینے والے افراد کی کل تعداد ۲۰ ہے۔ ان مدارس کے اخراجات کا سالانہ بجٹ دس لاکھ روپے ہے۔ مستقبل کے تعلیمی، تنظیمی اور تعمیراتی منصوبوں کی تکمیل پر تقریباً تیس لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔ تعاون آپ کریں دعا اور کام ہم کریں گے۔ اجر اللہ پاک دیں گے۔

ابن امیر شریعت، سید عطاء الحسن بخاری، دار بنی ہاشم، مہربان کالونی مٹان۔

انکوائٹ نمبر 29932 حبیب بینک حسین آگاہی مٹان۔

ترسیل زر کے لئے:





مخلوق میں جیتے فانی کا نکلنا نہیں چلا با جائے //

دینا بین اس نہ ہو گا -

عبدالغفار  
۲۵  
۸۸

بہشتی دفتر ملال نو